رُوحِ اِسلام

Spirit of Islam

سید امیر علی

ترجمہ

محمد ہادی حسین

اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲ - کلب روڈ ، لاہور

طبع دہم	اپریل ۱۹۹۹ء

ناشر: ڈاکٹر رشید احمد (جالندھری)
ناظم ادارۂ ثقافت اسلامیہ
۲۔ کلب روڈ، لاہور

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت: ۳۰۰ روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد اور محکمہ اطلاعات و ثقافت، حکومت پنجاب کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی ہے۔ شکریہ!

باسمہٗ

حرفِ آغاز

رائٹ آنریبل سید امیر علی کی شہرۂ آفاق تصنیف سپرٹ آف اسلام علمی اور اسلامی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ایک مغربی اہلِ قلم نے ۱۹۴۳ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عہدِ حاضر کے مصری ادب میں مذہب کے متعلق کسی جدید کتاب کے اتنے حوالے نہیں ملتے جتنے سید امیر علی کی سپرٹ آف اسلام کے۔ ایک اور راہبِ علم کی رائے ہے کہ اسلام کے خلاف اعتراضات کے جواب میں اور اسلام کے حق میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا، اسے بڑی خوش اسلوبی سے سپرٹ آف اسلام میں کہہ دیا گیا ہے۔ دنیائے اسلام میں اس کتاب کو بجا طور پر بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کے ترجمے عربی، فارسی اور ترکی میں شائع ہو چکے ہیں۔ جدید دنیائے اسلام کی اہم علمی زبانوں میں شاید اردو ہی ایک ایسی زبان ہے، جس میں چند ابواب کے سوا اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہیں ملتا۔

سپرٹ آف اسلام کی اہمیت کے پیشِ نظر ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے اس کے مکمل اردو ترجمہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں اس مقصد کے لیے ملک کے مشہور اہلِ قلم محمد ہادی حسین صاحب کا تعاون حاصل ہو گیا، جنھیں انگریزی زبان پر بھی کامل عبور حاصل ہے اور جو اردو زبان کے بھی ایک کہنہ مشق نثر نگار ہیں۔ انھوں نے ترجمہ بڑی محنت سے اور دل لگا کے کیا ہے اور زبان و اسلوب کی نزاکتوں کو اس طرح ملحوظ رکھا ہے کہ ترجمہ میں اصل تصنیف کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

سپرٹ آف اسلام میں کئی دقیق مذہبی، فلسفیانہ اور علمی مباحث آتے ہیں۔ ایک دو مسائل ایسے ہیں، جن کے متعلق عامۃ المسلمین میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں جو نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے اور جن خیالات کا اظہار

ہوا ہے، وہ مصنف کے ہیں۔ ادارہ کے نہیں۔ دو ایک مقامات پہ جہاں مزید تحقیق کے پیش نظر، توضیح حقیقت کی خاص طور پہ ضرورت تھی، مختصر حواشی بڑھا دیے گئے ہیں اور اس امر کی نشان دہی دی گئی ہے کہ یہ حواشی ادارہ کی طرف سے ہیں۔

ا

فہرست مضامین

مقدمہ

صفحہ ۱ تا ۷۰

حصّہ اوّل

پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی اور رسالت

پہلا باب: صفحہ ۷۲ تا ۱۲۳

محمدؐ رسول اللہ

ساتواں باب: صفحہ ۱۸۸ تا ۱۹۷

اشاعتِ اسلام

یہود کی مسلسل معاندت۔ مہم خیبر۔ یہودیوں کی درخواستِ عفو۔ عمرۃ القضا۔ اہلِ مکّہ کا صلحنامۂ حُدیبیہ کی خلاف ورزی کرنا۔ سقوطِ مکّہ۔ اہلِ مکّہ کے ساتھ سلوک۔ دین کی اشاعت۔

آٹھواں باب: صفحہ ۱۹۸ تا ۲۰۶

عام الوفود

مدینہ میں متعدد وفود کی آمد۔ اہلِ یونان کے حملے کا خطرہ۔ مُہمِ تبوک۔ عروہ کا قبولِ اسلام۔ اُن کی شہادت۔ بنی طے اور اُن کا قبولِ اسلام۔ کعب ابنِ زہیر کا قبولِ اسلام اور رسول اللہ کی شان میں قصیدہ پڑھنا۔ مشرکوں کے ورودِ کعبہ پہ پابندی۔

نواں باب: صفحہ ۲۰۷ تا ۲۲۲

رسالتِ محمدی کی تکمیل

پیغمبرِ اسلام کی فوقیت سابق رسولوں پر۔ آپ کا عقل و فکر سے استشہاد۔ خطبۂ حجۃ الوداع۔ حکام کو آپ کی ہدایات۔ جھوٹے مدعیانِ نبوّت۔ رسول اللہ کا مرض الموت اور وصال۔ آپ کا اسوۂ حسنہ۔

دسواں باب: صفحہ ۲۲۳ تا ۲۳۳

مسئلۂ خلافت

امامت۔ سُنّی نظریۂ خلافت۔ سلاطینِ عثمانی کا حقِ خلافت۔

حصۂ دوم

پہلا باب: صفحہ ۲۳۶ تا ۲۷۰

اسلام کا مثالی نصب العین

اسلام اور اس کے معانی۔ اسلام کے اخلاقی اصول۔ مختلف مذاہبِ عالم میں

مجوسی زرتشتیوں اور ہندوؤں کے یہاں عدمِ رواداری۔ اسلام علیحدگی پسندی کا مخالف ہے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد اسلام کے جنگی معرکے مسلمانوں اور صلیبی جنگجوؤں کی تسخیرِ یروشلم کا موازنہ۔

پانچواں باب: صفحہ ۳۵۸ تا ۴۰۳

اسلام میں عورتوں کی حیثیت

تعددِ ازدواج اور اس کی ابتدا۔ یہ رسم تمام قدیم قوموں میں رائج تھی۔ عیسائیوں کے یہاں تعددِ ازواج۔ سینٹ آگسٹین اور جرمن مصلحین کی رائے۔ عربوں اور یہودیوں کے یہاں تعددِ ازدواج پیغمبرِ اسلام کے احکام۔ وحدتِ ازدواج کا دستور رفتہ رفتہ قائم ہوا۔ قرآن کے احکام انسانی ارتقا کے ہر مرحلے سے مطابقت رکھتے ہیں۔ رسول اللہ کے نکاحوں کا جائزہ۔ ابتدائی عیسائیت میں عورتوں کی حیثیت۔ شادی کے بارے میں حضرت عیسٰی کا تصور۔ رومنوں اور یہودیوں کے یہاں طلاق۔ عیسائیوں کے یہاں طلاق۔ طلاق کے بارے میں شارعِ اسلام کے احکام۔ جاریہ بازی کی ممانعت۔ عورتوں کے پردہ اور تخلیہ کا رواج۔ اسلام میں نسوانیت کی تعظیم۔ نبوّت اور جوانمردی صحرائی زندگی کی پیداوار ہیں مسلمان عورتیں۔ شارعِ اسلام نے عورتوں کی حیثیت کو کہاں تک بہتر بنایا۔

چھٹا باب: صفحہ ۴۰۴ تا ۴۱۷

اسلام اور غلامی

غلامی تمام قدیم قوموں میں تھی۔ رومنوں اور یہودیوں کے یہاں غلاموں کی حیثیت۔ عیسائیوں کے یہاں غلامی۔ غلامی کے بارے میں شارعِ اسلام کے احکام۔ غلامی اسلام کے منافی ہے۔

ساتواں باب: صفحہ ۴۱۸ تا ۴۴۴

اسلام کی سیاسی روح

ظہورِ محمدی کے وقت نوعِ انسانی کی زبوں حالی۔ زرعی غلامی۔ انسانی آزادی اور مساوات کا فقدان۔ عیسائیت کا تعصب۔ میثاقِ مدینہ آزادی و مساوات کا منشور تھا۔

نجران کے عیسائیوں کے نام رسولِ خدا کا پیغام - ابتدائی جمہوریہ مدینہ کی خصوصیات - حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت - اسلام نے انسانی مساوات کی تعلیم دی ہسپانیہ عربوں کے دَورِ حکومت میں -

آٹھواں باب : صفحہ ۴۴۵ تا ۵۳۰

اسلام میں مذہبی اور سیاسی فرقہ بندیاں

ان کی ابتدا صحرائی زندگی کے قبائلی جھگڑے سے ہوئی، جنھیں خاندانی رقابتوں نے ہوا دی - حضرت عثمانؓ اور بنی امیّہ - حضرت عثمانؓ کی شہادت - حضرت علیؓ کی مسند نشینی - امیر معاویہ کی بغاوت - جنگِ صفین - عمرو بن العاص اور ابوموسیٰ اشعری کی تحکیم - حضرت علیؓ کی شہادت - امیر معاویہ کا خلافت پر قبضہ - شہادتِ کربلا - شرک و الحاد کی بالادستی - تباہیٔ مدینہ - عباسیوں کا خروج - سُنی مذہب کی ابتدا - مامون الرشید - مسئلۂ امامت - شیعہ مذہب - سُنی مذہب - بڑے بڑے شیعہ فرقے - زیدیہ - اسمٰعیلیہ - اثنا عشریہ - بالی - عبداللہ ابن میمون القداح کے عقائد - قاہرہ کا اسمٰعیلی مرکزِ دعوت - الموت کے حشیشین - اثنا عشریہ کے ذیلی فرقے : اصولی اور اخباری اور ان کے عقائد - سنیوں کے ذیلی فرقے : حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی - خارجی - بہائی -

نواں باب : صفحہ ۵۳۱ تا ۵۸۷

اسلام کی ادبی اور سائنسی روح

رسولِ عربی کا شغف علم اور سائنس سے - آپؐ کے ارشادات - حضرت علیؓ کے ارشادات - مسلمانانِ سلف کے یہاں علوم و فنون - درس گاہِ مدینہ - امام جعفر صادق - بغداد کا قیام - مامون الرشید مسلمانوں کا آگسٹس تھا - المعز لدین اللہ - قاہرہ کا دارالحکمت - عربوں کے یہاں ہیئت (فلکیات) اور ریاضیات - فنِ تعمیر - تاریخ - شعر و شاعری - قرآن - مسلمانوں کے علم و دانش کے میدان میں کارنامے - اُن کا موجودہ جمود اور اس کے اسباب - تاتاریوں کی تباہ کاریاں - صلیبی جنگوں کے نتائج - اُزبک اور افغان -

دسواں باب: صفحہ ۵۸۸ تا ۶۴۷

اسلام کی عقلی اور فلسفیانہ روح

انسانی اختیار اور حاکمیتِ الٰہی کے بارے میں قرآن کی تعلیمات - رسول اللہ کے ارشادات - حضرت علی اور متقدمینِ اہلِ بیت کی حکیمانہ نکتہ سنجیاں - جبریہ - صفاتیہ - معتزلہ - اعتزال اور حکمائے اہلِ بیت کی تعلیمات مماثل ہیں - اسلام میں عقلیت - خلافتِ مامون مسلمانوں میں فلسفہ - ابن سینا اور ابن رشد - اسلام میں عقلیت اور فلسفہ کا زوال - اس کے اسباب، متوکل - قدامت پرستی کے ساتھ اس کا گٹھ جوڑ - قدامت پرستی کا دور دورہ - ابوالحسن الاشعری - الاشعری کی رجعت آموز تعلیمات - ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور ابن حنبل - علم الکلام - اخوان الصفا - اُن کی تعلیمات -

گیارہواں باب: صفحہ ۶۴۸ تا ۶۷۶

اسلام کی مثالی اور صُوفیانہ رُوح

اس کی ابتدا خود پیغمبرِ اسلام سے ہوئی - قرآنی افکار و تصورات - حضرت علی کی حکمت آموزی - افلاطونیتِ جدیدہ - پہلے صوفیا - امام الغزالی - اُن کی زندگی اور تصنیفات - بعد کے صوفیا - زاویے اور تکیے - مسلم مثالیت -

---

آیۃ الکرسی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا
فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا
بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ
هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

خدا (وہ معبودِ برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ زندہ۔ ہمیشہ رہنے والا۔ اُسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔ کون ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے۔ جو کچھ لوگوں کے رُوبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہو چکا ہے اُسے سب معلوم ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے (اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے) اس کی بادشاہی (اور علم) آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دُشوار نہیں وہ بڑا عالی رُتبہ (اور) جلیل القدر ہے۔

دیباچہ

ذیل کے صفحات میں مَیں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ ایک عالمی مذہب کی حیثیت سے اسلام کی تاریخ پیش کروں اور یہ بیان کروں کہ وہ کتنی سُرعت سے دنیا میں پھیلا اور اس نے کیونکر ایک قلیل مُدت میں کروڑوں انسانوں کے ضمیروں اور ذہنوں پر ایک حیرت انگیز غلبہ حاصل کر لیا۔ اسلام نے نوعِ انسانی کی نشوونما کو جو فروغ بخشا اُس کا تو عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے نوعِ انسانی کی حالت بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اُن میں یا تو تجاہل برتا جاتا ہے یا اُن کی کما حقہٗ قدردانی نہیں کی جاتی۔ اسی طرح اس کی عقلی اساس اور اس کے مقاصدِ غائی کو پوری طرح سمجھا نہیں جاتا۔ میں نے اسلام کا جو تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ تاریخِ ادیان میں اس کا جو حقیقی مقام ہے اُسے واضح کروں۔ اسلام کی عقلی اساس اور اس کے مقاصدِ غائی کا جو مرقع میں نے کھینچا ہے وہ ہے تو بالکل سرسری لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو جو حال ہی میں واقع ہونے والے حادثۂ عظیمہ کی پیدا کی ہوئی کشمکشوں کے بعد کسی ایسے تعمیری نظامِ عقائد کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو نفسِ انسانی کو قرار بخش سکے۔ میری یہ بھی اُمید ہے کہ جو لوگ دینِ اسلام کے پیرو ہیں یہ جائزہ انھیں اپنے عقائد کی اساس کے سمجھنے اور دوسروں کو سمجھانے میں مدد دے گا۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے سوانحِ حیات اور رسالتؐ کا جو خاکہ مَیں نے کھینچا ہے وہ کسی حد تک ابنِ ہشام کی سیرۃ الرسولؐ پر مبنی ہے، جس نے پیغمبرِ اسلامؐ کی وفات کے قریباً دو سو سال بعد (۲۱۳ ہجری مطابق ۸۲۸-۲۹ عیسوی میں) وفات پائی اور کسی حد تک ابن الاثیر کی ضخیم تاریخ (الکامل) طبری کی تاریخ الامم والملوک، الحلبی کی انسان العیون (المعروف بہ سیرۃ الحلبیہ) اور دیگر کتابوں پر مبنی ہے۔ موجودہ ایڈیشن میں دو نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے، ایک امامت پر اور دوسرا اسلام کی مثالی اور صوفیانہ روح پر۔ مقدمے میں اور حصۂ دوم کے دسویں باب میں بھی مزید مواد شامل

کیا گیا ہے۔ میں اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اپنے محترم دوست کیمبرج کے پروفیسر ای جی براؤن کا، جن کا شمار مستشرقین کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے کتاب کے آخری باب پر ناقدانہ نظر ڈال کر مجھے اپنے بیش بہا مشوروں سے مستفید فرمایا۔ میں مسٹر محمد اقبال کا بھی، جو کیمبرج میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ریسرچ سکالر ہیں، ممنون ہوں کہ انھوں نے نہایت تن دہی سے کتاب کے پروف پڑھے اور اس کا اشاریہ بھی تیار کیا۔ اسی طرح میں مسٹر عبدالقیوم ملک کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے نئے ابواب کی عربی عبارات کو پرنٹر کے لیے نقل کیا اور قرآنی حوالوں کی تصدیق کی۔ میں اپنے پبلشروں کا بھی ممنون ہوں کہ ایسی کتاب کی طباعت میں جو دقتیں لازمی طور پر پیش آتی ہیں اُن کے باوجود وہ میرے ساتھ ہر وقت خوش خُلقی اور تحمّل سے پیش آئے۔

کتاب مصروفیتوں کے ایک بے پناہ ہجوم کے درمیان چھپی ہے۔ اس بنا پر میں قارئین سے مستدعی ہوں کہ اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں تو وہ براہِ کرم اُن سے چشم پوشی کریں۔

امیر علی

مقدمہ

اے کہ در ہیچ جاندار ی جبا
بو العجب ماندہ ام کہ ہر جائی (وصالی)

کفر و دیں ہر دو در رہت پویاں
وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں (سنائی)

نوعِ انسانی کی ذہنی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے وہ ایک ایسا موضوع ہے جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسِ انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیطِ کائنات ارادے کو پہچاننا، اندھیرے میں بھٹکتے پھرنے کی جو زحمتیں کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیشتر کہ ان کے ذہنوں پر ایک ایسی رُوحِ مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا جو تمام موجودات میں جاری و ساری اور نظامِ فطرت کو قاعدہ و قانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہے — یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ جس عمل کے ذریعے نوعِ انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادتِ الٰہی تک پہنچی ہے وہ معرضِ تعویق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہراہِ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشاتِ نفسانی کے غولِ راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہدِ طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے جو محض اُن کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسّمے تھے لیکن خدا کی آواز چاہے کوئی اُسے سنتا یا نہ سنتا، ہمیشہ دعوتِ حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگانِ خاص نے اُٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگانِ خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے، جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف

کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو روحِ انسانی میں ودلیعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے : نکھارے اور ابھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدّن کی تعلیم دینے کے لیے آئے، جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالمگیر پیغام لے کر آئے، ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا، بلکہ ساری نوعِ بشر کے لیے۔ محمد صلعم کا شمار موخرالذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کے لیے نہ تھا۔ آپ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے، بلکہ سارے بنی آدم کے لیے، اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگانِ خدا ہیں اُن سب کے لیے۔ اس معلّمِ اعظم کا ظہور، جس کے سوانح حیات اس کی بعثت کے لمحے سے لے کر آخیر تک مصدقہ طور پر قلم بند ہو چکے ہیں، محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبانِ حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں ساری کائنات میں جاری وساری ایک قدرتِ مطلقہ پر یقینِ محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں گلیلی کے کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے جس کی زندگی ایک المیہ تھی، وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے، اور اب کی پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے، ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا۔ اس میں جو مظاہر رونما ہوئے وہ ویسے ہی تھے جیسے مثبت ایمان وایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بنتے ہیں، تاکہ آوارہ و سرگرداں قوتوں کو مذہبی ارتقا کے اس ناگزیر راستے پر لایا جائے جس کی منزلِ مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل و تنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر اس پر دلالت کر رہے تھے کہ یہودیت یا عیسائیت نے خدا کی مملکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے کسی زیادہ مربوط مرقع کا صورت پذیر کیا جانا ضروری تھا۔ زرتشت، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے جو شمع روشن کی تھی اس کی لو انسانی خون کے چھینٹوں سے بجھائی جا چکی تھی۔ ایک گڑی ہوئی زرتشتیت نے اور ایک اُس سے بھی

زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت نے جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھیں، انسانی ضمیر کی ناطقہ بند کر رکھی تھی اور کرۂ ارض کے بعض شادماں ترین خطّوں کو لہو کی ندیوں کا سنگم بنا رکھا تھا۔ بالادستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں، دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگاتار چپقلشوں نے قوموں کا خونِ زندگی نچوڑ لیا تھا اور روئے زمین کے باشندے جو ایک بے جان شائع پرستی کی آہنی ایڑیوں سے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک نجات دہندہ کی اس سے زیادہ ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی تھی اور نہ کبھی اس کے ظہور کے لیے اس سے موزوں تر وقت آیا تھا۔ چنانچہ محمد صلعم نے دنیائے اخلاق میں جو کچھ کر دکھایا اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی خاطر ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے اور طلوعِ اسلام کے وقت اقوامِ عالم کے جو مذہبی اور معاشرتی حالات تھے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

باختر (Bactria) کی سطح مرتفع، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے اُمّ البلاد کا موزوں نام دیا ہے، نوعِ انسانی کا گہوارہ، مذہبوں اور قوموں کا مرزبوم خیال کی جاتی ہے۔ نوعِ بشر کے بچپن پر تقابلی علم الاقوام جو مدھم سی روشنی ڈالتا ہے وہ روشنی ہمیں نسلِ انسانی کے اس ابتدائی مسکن میں خاندانوں کے چند در چند گروہ دکھاتی ہے، جو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے ناطے جوڑ کر جرگوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے تحت موج در موج باہر نکل کر زمین کے مختلف خطّوں کو آباد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اس قدیم وطن کو خیرباد کہی، وہ غالباً حامی (Hamitic) نسل کے لوگ تھے۔ ان کے بعد جو لوگ نکلے وہ تورانی تھے یا، جیسا کہ انھیں کبھی کبھی ملقّب کیا جاتا ہے، اُگرو فنّی (Ugro-Finnish) نسل کے لوگ، جو یافثی (Japhetic) خاندان کی ایک شاخ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر نوعِ انسانی کی موجودہ منگولی (Mongolian) شاخ کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ ایک اور شاخ مغرب کی طرف چل نکلی اور آذربائیجان، ہمدان اور گیلان میں آباد ہو گئی۔ جو بحیرۂ خزر کے جنوب اور جنوب مغرب میں ہیں اور جو تاریخِ قدیم میں (Media) کے نام سے نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصّے نے

کچھ مدت کے بعد سرزمینِ بابل کے زرخیز میدانوں میں جا کر اپنے سے پہلے کی حامی نوآبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ اُن میں مل جُل کر اکادی (Accadian) قوم کی شکل اختیار کی جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں کوشتی (Kushite) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخلوط نسل نے بابل کی بنیاد ڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطحوں پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہ تھا لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ دیوات (Pan-daemonism) کا عقیدہ تھا اور سورج دیوتاؤں اور چاند دیوتاؤں کی پُوجا تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لِنگ پُوجا تھی، جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھیں، بعل Moloch اور دیوتاؤں پر بچّوں کی قربانیاں تھیں، بلتیس Beltis اور اشتورث (Ashtoreth) دیویوں پر کنوارپن کی بھینٹ چڑھانے کی ریت تھی۔ چنانچہ بابل کا مذہب ایک ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجے کی مادّی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی، جسے مذہب کی سندِ قبول حاصل تھی۔

اس کے بعد جس نشاخ نے اُمّ البلاد سے کُوچ کیا وہ سامی (Semitic) نسل تھی۔ سامی بھی تورانیوں کے نقشِ قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (Mesopotamian) ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ بہت جلد انھوں نے تعداد اور قوّت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کا سکّہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (Assyrians) نے جو دارالحکومت بنایا اس میں جو مذہب رائج تھا وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصوّرِ توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے یہاں جو ساوی سلسلۂ مراتب تھا اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

اِدھر ڈیلٹے کے شمالی حصّے میں سامی نوآبادوں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی، اُدھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (Ur) کے علاقے میں داخل ہو گیا، جو

کلدانی سلطنت[1] کے زیرنگیں تھا۔ اس قبیلے کا شیخ، جس کی خود اختیاری جلاوطنی اور بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصوں کا مضمون بن گئی ہے، مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جدّ امجد بنا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصلی وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی نشیمن سے جُدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں، اُسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشوونما پا رہی تھی۔ لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہو گئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے یکے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہو گئے، نہ جانے اس فطری بے چینی کے باعث جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی یا اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین ان کے راعیانہ مشاغل کے لیے ناکافی ہو گئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے ان میں پلیجین the pelargians اور کلٹ (the Celts) تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوسِ رحلت بجایا تا آنکہ بالآخر صرف خالص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ان کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا اور دوسرا بلخ کے نزدیک۔ جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور ان کے جنگ وجدل اور نقل وحرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بود وباش کرتے رہے۔ نہ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے وہ زمین کے ان قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے جس میں ان کے بہت سے قبیلے اس سطحِ مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالمگیر مجرّد ذات کا مُبہم سا احساس ان کے ذہنوں میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔ اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطری کی پرستش کرتے رہے تھے ان کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں۔

1-Rawlinson, *Ancient Monarchies*.

2- عربی روایتوں میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام آذر بیان کیا گیا ہے جو صریحاً اشور کی ایک دوسری صورت ہے۔ آذر کے بنائے ہوئے خوبصورت بتوں کا ذکر اسلامی ادب میں اکثر آتا ہے۔ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اشوری النسل تھے۔

بعض قبیلوں کے یہاں مجرد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے، یعنی نور اور ظلمت۔ زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک واحد خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے، لیکن آخر الامر اپنے مخالف اصول یعنی ظلمت اور شر پر غالب آجائے گی۔ دوسرے قبیلوں کے ہاں یہ صورتِ حال ہے کہ وہ اپنے معبود بتوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں وہ خیالی ہستیاں ایک دوسری میں مدغم ہو رہی ہیں کبھی تو وہ جدا جدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یکجا ہو کر ذی حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھندکے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب وقبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہو گئے ہیں، زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے، دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے۔ اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل و اعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر بزور داخل ہو رہا ہے۔ کیومرس، ہوشنگ اور دوسرے شاہان پاستان جن کے گیت ایک حیرت انگیز قادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں، ایک روبہ ترقی تہذیب کے اوّلین نشان بردار ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے یہاں بادشاہی کا آغاز ہوا، اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرزبوم سے جلاوطن ہو گئی۔ مغربی آریوں میں ایک معلّم نے، جو اپنے مذہب کی کتابوں میں سپتامہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کشمکش پیدا کی اس کے نشان ان منتروں میں ملتے ہیں جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن "جرد شتی" پر بھیجے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا وہ ناموں کے غیر معمولی تواردسے بھی بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علیحدہ ہو جانے کا فوری اور بلا واسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں، جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی، مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (dualist) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو، جن کا مذہب تعددِ ارباب (polytheism) اور وحدت الوجود (pantheism) کی ایک معجونِ مرکب تھا، پیمیسادا (Paropamisadae)

کی سرحدوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے، جہاں انھوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا یا قتل کر دیا یا غلام بنا لیا۔ اور انھیں ہمیشہ اپنے سے کمتر ہستیاں یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہرحال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کی بجائے ان کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا، اس نے انھیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا اہورا کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور "زرتشت" پر دل کھول کر سب وشتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا یہ پردۂ لاعلمی میں مستور ہے۔ بہرحال داریوش ہستاسپ کے عہد میں اسی نام کا ایک اور معلم گزرا، جس نے پرانی تعلیمات کی تجدید، تدوین اور توسیع کی۔

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور اپنے قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے، زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا۔ یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطری کی پرستش۔ پنجاب میں روحانی تصور نے مزید نشو و نما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے تا آنکہ ہم اُپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اُپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں، جو ایک ایسا تصور ہے جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی، بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے ہیں کہ روحِ مطلق تریم آتما، تمام موجودات کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے، وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخر الامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے، تو انسانی

روح پر کالبدِ خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں وہ ان سب کا شعور کھو دیتی ہے لیکن انسانی ترقی کی ان دلچسپ دستاویزوں میں بلاشک وشبہ رُوحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے جنھوں نے بہت جلد ارتقاء کے عمل کا رُخ پلٹا دیا۔ چنانچہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزّل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُران حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنزلوں کا طریق پرستش پُرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دُہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اسی سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا۔ جس طرح مغربی غیر اہلِ کتاب کا فلسفۂ کائنات نفسِ عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور اُن کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو، اسی طرح اُپنشدوں کے موحّدانہ دلولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ انھوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیرو یا تا ڈھونڈ نکالا، جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہو گیا کہ وہ بنفسہٖ پرماتما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنی حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی وہ نہ صرف اس امر کی پُرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا بلکہ اس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا[1] کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہنوں اور عوام کے خیالات وجذبات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے، اُن آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے یا ان کے پروہتوں اور مذہبی معلّموں نے بہت سخت قاعدے وضع کئے تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں نے اپنے طول طویل فاتحانہ کُوچ کے دوران جن قوموں کو مطیع و منقاد بنایا تھا ان میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ ان قوموں کو سماج کے

---

[1] زمانۂ حال کا ایک مصنف کہتا ہے کہ بھگوت گیتا میں بیشک وحدانیت کے نشان پائے جاتے ہیں لیکن وہ غیر موحدانہ عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔

اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی، اُن کو اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اُونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں وہ اُن کے لیے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مدوجزر آئے ہیں اُن سب کے دوران ارواحِ اسلاف کی پرستش مذہبی و معاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے۔ یوں تو شُودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں، لیکن اگر کوئی برہمن ان کی پوجا میں شریک ہوتا تو اُسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سن پاتا تو اس کے لیے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو گرم لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تینوں اُونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بےرحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں۔ لیکن اس قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے سے نہ روک سکیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں داخل ہو گئے اور ان کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی رسموں میں شامل ہو گئی۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام، نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفر صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظامِ خیال کے ارتقا میں مصروف تھے اس میں ابتذال آ گیا۔

جب تک تابعینِ اسلام نے وہ پردہ نہ اُٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پُراسرار زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ واسودیو کرشن کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی۔ اُس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں، جو بے سروپا اور لچر معلوم ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں پیشہ ور دھنتوں نے گھڑیں، جو دیوتاؤں سے اُونچے نہیں تو ان کے ہمسر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام کے دلوں کو لبھائے اور رجھائے رکھیں۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیومالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی جو بھگتی سے تعلق رکھتا ہے

مرکزی شخصیت ہے۔ وہ بدیہی طور پر ایک جامعِ شخصیات دیوتا ہے۔ اس کی ایک شخصیت منبش دیوتا، وہ رنگیلا کنھیا ہے جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور برندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا۔[1]

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مُکتی یعنی نجات کی کنجی ہے جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے اسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسومات اور عقائد کو جنم دیا جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں۔ چونکہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں بسا لیا جائے اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگا لی جائے، اس لیے عام لوگ بیراگ اور سنیاس کو مہاپُن تصور کرنے لگے۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سالہا سال تک جنگل میں بیٹھے رہنا، برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا، بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر ادھر گھسٹتے پھرنا، یہ سب ایسے کام تھے جو سب پاپ دھو ڈالتے تھے۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منّت ماننا منظور ہوتا تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اُس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے۔ بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری بُرائیاں، دوش اور پاپ دُھل جاتے تھے۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر جو سکہ جما رکھا ہے وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعّال تخلیقی پہلو ہے۔

---

[1] سری کرشن کو عموماً گوپال کرشن (یعنی کرشن گوالا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی ہمجولیوں کو گوپیاں (یعنی گوالنیں) کہا جاتا ہے۔ اہیروں، یعنی شمالی ہند کے گوالوں، کے اس شور مادیوتا کے بارے میں بہت سی پُر لطف کہانیاں مشہور ہیں۔ بعض لوگوں نے اُسے ہندوؤں کے اپالو کا لقب دیا ہے لیکن یہ لقب کچھ جچتا نہیں۔

شوجی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے جو پاربتی، بھوانی، کالی، مہاکالی، درگا، چنڈا، اور دوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اس دیوی کی پوجا، جیسے کہ وہ بھوا بھوتی کے ڈرامے ہیں، جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا، بیان کی گئی ہے، انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اُسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے، اس میں عیسائی مذہب کی "مادرِ غمخوار" (mater dolorosa) کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اسکندریہ کے پجاری آئی سس (Isis) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دُکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوفناک دیوی میں موجود نہیں۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور، جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیداوار ہے، صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہلِ کتاب مذاہب میں نہیں ملتی۔ اور تو اور سیبلی (Cybele) یعنی اہلِ رُوما کی مادرِ کبریٰ (magna mater) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دُکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی جتنی تباہی کے دیوتا شو کی شکتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا تنتروں کی رسوبات کے مطابق کی جاتی ہے جو گویا شکتی دھرم کی بائیبل ہیں۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھگتی اور رساو صنا سے بھرے ہوئے ہیں اور دیوی سے جو پیار تمنائیں کی گئی ہیں ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں، عام لوگ ان کی بتائی ہوئی پوجا پر لغواً عمل کرتے ہیں۔[1]

---

[1] تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں: دکھنا چاری اور برمچاری، یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی ریتوں پر عمل کرنے والے دکھنا چاریوں کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں، مثلاً وشنو دیوتا کی شکتی لکشمی یا مہالکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ برمچاریوں کی پوجائیں، جیسے خاص طور پر تنتر لیکا کہا جاتا ہے، کالی دیوی بلا شرکتِ غیرے معبود ہوتی ہے۔ یہ پوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں۔ سارے ہندوستان میں برمچاری پنتھ کے پیرو بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ درگا پوجا میں، جو عموماً اگست (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶ پر دیکھیں)

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے، جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجہ راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے، ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتہ چل جاتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقا یافتہ معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ چنانچہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے خروج سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی، جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیزگاری نہیں بلکہ پروہت (جس کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ گوتم بدھ اور مہابیر نے جو بغاوت کی وہ خود غرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اٹھنے والی ایک آواز تھی۔ دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقلِ کل حکمراں ہے جو اس کا نظام چلا رہی ہے لیکن دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندو مت سے وابستہ رہا ہے اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے۔ لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو مکتی کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی نے عمر بھر عمل کے میدان میں جد و جہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) کے مہینے میں منائی جاتی ہے، درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیا رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے، اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سروں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا منہ پیچھے کو مڑا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ انسان کی بجائے اسے بکری جب بلی چڑھائی گئی تو اس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا۔

میں بدھ مت کا جو تصور تھا وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا اور اس کا سرّی تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شاندار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اُسے جو سنگین سزائیں دیں اُن کی رُوداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیروؤں کے دل موہ لیے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی جزائیں اور سزائیں آئندہ زندگی میں راحت و سعادت کے وعدے، اس زندگی میں فرائض نہ ادا کرنے کے نتیجے، سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر اُن کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کر دے یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اس نے کوشش کی تھی اس سے سمجھوتہ کرے۔ چنانچہ اسے اپنے پیروؤں کو یہ اجازت دینی پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں مگن ہو جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تزک رسومات اختیار کریں۔ اُسے اپنے اصلی وطن میں نہایت ناموافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کر سکے، اگرچہ یہ درست ہے کہ اس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوئے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوستان سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا۔ جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا اس زمانے میں برہمن دھرم نے جو بُرے دن دیکھے تھے اُن سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اُس کے روحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی چنانچہ وہ بے جان رسم پرستی جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی۔ آگے سے بھی زیادہ اُستوار بنیادوں پر از سرِ نو قائم ہو گئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگیوں پر ایک ایسے مذہب کا آگے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے رُوحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا؟ البتہ وہ ان کے حواس اور غالباً ان کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بیہودہ رسموں کا ایک روزانہ چکّر بن گئی۔ ان کے معبود پر دہشت تھے،

اگلوں کی رُوحیں تھیں اور محض ظاہرداری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بت پرستی ہندوؤں نے سیکھی تھی اسے نہ ان کا فلسفہ نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کر لیا۔ درخت، پتھر، دوسری اشیائے فطری اور بُت، جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پُرانے دیوتاؤں کی علامتی مورتیاں تھے، عام لوگوں کے معبود بن گئے۔ منّو کا دھرم شاستر، جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا ایک ایسی مملکت کا ضابطۂ آئینی ہے جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقوں کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجہ بھی دیوتا بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں اگرچہ منوسمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کی جگہ وِشیان گر دیجنولکیہ کی تفسیر نے لے لی۔ اُس کے نزدیک ذات پات کا فرق اُتنا ہی پتھر کی لکیر تھا جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شُودر اتنے ہی ملیچھ تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی جتنی دورِ جہالت کے عربوں میں تھی۔ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی، لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہرحال بیوائیں یقیناً جیتے جی چتا میں جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی، کیونکہ اگر ان کے اولاد نہ ہوتی تو ان کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں یا اگلوں کی رُوحوں کو جو بھوگ دیئے جاتے تھے ان کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں اُن کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی سیوا کرے، اور اس کا جگ جگ کا سکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا۔ جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی اسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے، بلکہ اکثر اسے دیوی بنا کر اس کی پُوجا کرتے تھے۔

اگرچہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی ان رکیک رسموں میں کوئی گہرے معانی

نظر آتے تھے اور اُن کی رُوحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں پرواز کرتی تھیں، لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بے بس اور معصوم بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔ بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آگئی تھیں جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاکبازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں۔ جو مختلف دیوتاؤں کو پُوجتی تھیں۔ اُن کے اراکین ہمیشہ دھرمسالوں میں جمع ہوتے تھے جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سنیاسیوں کی ان منڈلیوں میں جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آئیں کنوارپن کا بچن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا۔ جوگیوں کے جتھے مندروں اور رنگھوں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطیٰ کے بھیک منگے راہبوں کی طرح یا فلیوین (Flavians) کے بھٹکے تارک الدنیا کلبیوں (Cynics) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر اُدھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں ان کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟ ـــ اُن کے گُندھے ہوئے لمبے لمبے بال، اُلجھی ہوئی گھنی داڑھی، گیروے رنگ کا کُرتا، بھبوت ملا ہوا بدن، کشکول اور ڈنڈا۔

چونکہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے، اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں ہوتی تھیں، جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں، ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (Tertullian) کے تعصب آمیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے:

"عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں۔ وہ ارادے کی کچّی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انھیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔"

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا، اس نے تقریباً (Pandects) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انھیں غلام پیدا کیا ہے اور اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی

وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چونکہ غلامی اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اُسے کون اس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات اس وقت جب پیغمبرِ اسلام نے اپنا پیغام دنیا کو دیا۔

آئیے اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجّہ کا مستحق ہے، ایک تو اس لیے کہ وہ اسلام کے مرز بوم سے اتنا قرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس نے نہ صرف دینِ موسوی اور دینِ عیسوی کے مزاج پر بلکہ فکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر اور روحانی نشو و نما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور اُن علاقوں میں جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کوشی (Kushite) نسلوں کے جو باشندے تھے انھوں نے ان کو مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے۔ جہاں وہ حامیوں اور کوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے جو ماد اور سوسیانہ (Susiana) میں آباد تھے لیکن اس سے پیشتر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بناتے وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقۂ بگوش ہو گئے، جو یا کوشی تھا یا اشوری (اغلب یہ ہے کہ اشوری تھا) اور بڑی مدت تک اس کے زیرِ فرمان رہے۔[۱] ان غیر ملکی فاتحین کے نکال دیئے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی جس میں کبھی ایک فریق غالب آ جاتا تھا کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ (Susiana) میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی۔ افراسیاب اور کیکاؤس کے پیروؤں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے

---

[۱] ایرانی روایات کے مطابق ضحاک نے ایک ہزار سے زیادہ سالوں تک ایران پر حکومت کی بہت سے محققوں نے اشوریوں کے اقتدار کی بھی یہی مدت بتائی ہے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو فریدون کا خروج اور نینوا کا سقوط دونوں ایک ہی زمانے میں ہوئے۔

Lenormant, *Ancient History of the East*, P.54 [۱]

بسا اوقات جو سابقہ پڑا اُس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت اُن کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کرنے کے لیے مُعیّنہ رہی۔ ایرانیوں نے ماد کے قدیم آبادکاروں پر غلبہ تو پالیا۔ لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش ان کے مذہب میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ جہاں ایران میں صرف ہرمزد کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا، وہاں ماد میں خیر و شر کے ان دونوں نمائندوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمزد پر ترجیح دیتے تھے۔

مادیوں اور بابلیوں کے ایک تعاونی معاہدے کی بدولت، جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے، اشوری سلطنت کا تختہ اُلٹ گیا، لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریوں نے فتح کئے اتنی مدت تک مسلّط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک قدسی سلسلہ مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمزد کی ایک اشوری ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی، اور ایرانیوں نے روشنی کے خدائے مہربان کو مجسّم کرنے کے لیے جو علامتی نشان انتخاب کیا وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا، جو ہاتھ اُوپر کو اُٹھائے اور ایک کمان تھامے سنسار چکّر میں محصور کھڑا تھا۔ اُن کے یہاں جو جھاڑ نشو و نما کی علامت تھا پہلے اس کی اُوپر کو اٹھی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں، اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں۔ اس سے قبل کہ کسریٰ نے آکر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سالمیت بخشی، ابتدائی مہاجروں اور آبادکاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی وہ عوام کے یہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

آشور کا شہر جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنۂ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی، طاقت ور سارگون اور عظیم سنجاریب (Sennacherib) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا۔ اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اسے اقوامِ عالم میں سر اٹھانا

نصیب نہ ہوا۔ بابل، جو شروع شروع میں نینوا کا حریف مدِ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آگیا تھا پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس نے ان تمام علوم و فنون کو جو ایک ہزار سالوں کی نشوونما کا حاصل اور "قوموں، مذہبوں، مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے" اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانۂ سلف کے بےجان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف ان کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ اُن کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل جس کی عظیم ترشان و شوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا، ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا بنوخذنصر (بخت نصر) کے عہدِ حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوجِ اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلمرو میں آگیا اور اس کے چیدہ و برگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیئے گئے۔ تاکہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہوداہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقت ور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس نے سوریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں، تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہ کیں جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں جو ان سے کیا گیا۔ جب تک شباتِ و ہندہ نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی اُس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی لیکن جب انہیں رہائی مل گئی تو انھوں نے سب و شتم، بددعاؤں اور ملامت و نفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا۔ "بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کے رو دئیے۔ اے دخترِ بابل! خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو تیرے ننھے بچوں کو پتھروں پر پٹک دیگا۔"[1]

بنوخذنصر کے عہدِ حکومت میں بابل بلاشک و شبہ اس دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اس کے پروہتوں کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہو گیا۔

---

[1] Ps. cxxxvii

یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی موبدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری، بعض عبرانیوں کو شاہِ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا، ان سب نے یکجا ہو کر قرونِ اُخریٰ کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے جو نظریات و عقائد میں ترقی یافتہ، بڑھے ہوئے حوصلوں سے مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔

فتحِ بابل سے مذہب کے ارتقاء کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہبِ ثنویت کی حکومت قائم ہو گئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی اس کے صلے میں انھوں نے قدرتی طور پر اسے "مسیحا"، "نجات دہندہ" اور "شفیعِ عالم" کے القاب دیئے۔ عبرانی قبیلوں کی اسیری، ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب اُن کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت اُن کا ایرانیوں سے اختلاط، یہ چیزیں بھی غالباً زرتشتیوں کی اس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں جو دارا یوش ہستاسپ کے تحت ظہور میں آئی۔ فعل و انفعال کا دو طرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیطِ کل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائیدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انھوں نے ایرانیوں سے ایک ساری سلسلۂ مراتب اور خیر و شر کی تخلیق کے اصولِ دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی رُوح داخل کر دیتا ہے۔ اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی و اخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہدِ حکومت ملک گیری کا دور تھا، تنظیم کا دور نہ تھا۔ دارا یوش کا عہدِ حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہرمزد کا پکا پرستار تھا۔ اپنی ساری فتوحات کو اس کا احسان گنتا تھا۔ چنانچہ اس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے، مادیوں کی مجوسیت کا قلعہ مسمار کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دے۔ لیکن اختلاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا وہ کسی کے روکے رُک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال گزرنے

پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں جن کا اس نے اپنے عہدِ طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بُت پرستوں کے لیے عذاب کے فرشتے تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انھوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (Apis) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، انھوں نے بہت جلد ہُرمزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پُرانی مجوسی عناصر پرستی از سرِ نو تازہ ہوگئی، اور دارا یوشش کے ایک قریبی جانشین اردشیر میمون (Artaxerxes Mnemon) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پوجا رائج کرائی۔ یہ کلدانی دیوتا ملیتا یا انائی تیس کا متبنٰی تھا اور اس کے ساتھ لِنگ پوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پوجا کا نشو و نما پاکر خوبصورت سورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہو جانا تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سورج پہاڑوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا، بیل کو باڑے میں لے جاکر ہلاک کرتا ہوا اور اس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفّارہ ادا کرتا ہوا، یہ ایک ایسا تصور ہے جو دنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ متھرا کی پوجا کو رومی لشکری وادیٔ فرات سے یورپ کے دُور ترین گوشوں میں لے گئے اور قیصر ڈائیوکلیشین (Diocletian) کے زمانے میں وہ روما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے جو حالات تھے اس سے بدتر اور کبھی نہ ہوئے تھے۔ وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں۔ منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت قاعدہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا، اس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملات میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہ تھے۔ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا (Ionia) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (gynaikonitis) میں بند رہتی تھیں۔ جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے، اور انھیں سرِ عام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہرحال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس نہ کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لیے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آرہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی

یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا اور معاشرے کے رگ و پے میں ساری تھا۔ بہرحال ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کے یہاں کوئی الفرڈوائٹ پینڈیموس (Aphrodite Pandemos) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اس اخلاقی وبا میں بھی مبتلا نہ تھا، جو تمام بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور جو یونان میں عام تھی اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کر سکی۔[1]

جب ہخامنشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشتیت دنیا کی ترقی میں ایک قوتِ محرکہ نہ رہی۔ فاتحوں کے اُن ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے معاشرتی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندرِ مقدونی کا ظفرمندانہ حملہ، وہ بھانت بھانت کے جتھے جو اس کے جلو میں آئے، ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ سلیشی، سوری، پمفیلی، فریجی اور لاتعداد دوسری قوموں کے لوگ، نیم یونانی، نیم ایشیائی، جو گدھ کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آکر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج ـــ ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ قومی زندگی کے نمائندے موبد فاتح کی چیرہ دستیوں کے تختۂ مشق بنے کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہابِ ثاقب کی طرح تھی۔ قصے کہانیوں کا جو تانا بانا اس کی شخصیت کے گرد بُنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے اُسے ہٹا بھی دیا جائے تو اُس صورت میں بھی وہ مجسم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس میں اعلےٰ درجے کی اولوالعزمی تھی، ایک ایسی زبردست فطانت تھی جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آ جاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی جس کی بدولت وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایک اجتماعِ ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے

---

[1] Dollinger, *The Gentile and the Jew*, Vol. ii, P. 239

اورخود ساری دنیا سے خراجِ عبودیت وصول کرے اور دوسرے وہ فلاسفہ وحکماء کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز زیادتیوں سے مملو تھی۔ اس کا ایک مداح ذیل کے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے :" حضور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوقِ غلامی پہنانا، ہندوستان اور باختر میں اس نے جو ہنگامہ قتال برپا کیا، کلائٹس کا قتل، فلوٹس اور وفادار پارمینیو کی موت کے فرمان جو اس نے جاری کیے، طوائفوں کے کہنے پر تختِ جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانے کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا، یہ سب ایسے کام تھے جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکی" سکندر کی فتح یابی اور ہخامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایات نے لے لی۔ اساطیر الصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی جو محبت اور اسے ایک نئی، قوی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب وعقائد اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سلیوکی حکمرانوں کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل ثابت قدمی سے جاری رہا، انٹیوکس ایپی فینیز کو، جس نے یہودہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے، یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسرِ اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سُرعت آگئی۔ سلیوکی فرماں روا دجلہ اور دریائے فرات کے کناروں پر حکمران تھے۔ پارتھیوں نے ہخامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قائم کی، یونانی، باختری خاندان مشرقی علاقوں، یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذاہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ پارتھیوں کے تحت مزدکیت اگرچہ بالکل ختم نہ ہوگئی، پھر بھی حکمرانوں کی نظر سے بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگئی۔ جن علاقوں میں امن وامان تھا وہاں زرتشتیت مادیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہوگئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اُسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی جو ملک کے دُور دراز علاقوں میں رُوپوش تھے، لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے جبر و تعدّی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔

چنانچہ مجوسی زرتشتیت نے ازسرِنو مذاہب عالم کی صف میں سر اٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے موبدوں کو اعیانِ مملکت کے منصب عطا کئے۔ ایک قریبِ مرگ مذہب کے یہ آخری نمائندے اُن تمام اُمیدوں کا مرجع تھے جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیرِ سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزمانہ اُمنگیں کہاں تک پوری ہوئیں، یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی، یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہو گئی، لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اُس کا احیا، حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں، لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رستم کی طرح مُردہ ہو چکی تھیں۔

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے۔ بارہا انھوں نے روما کی فوجوں کو شکست دی، اس کے شہروں کو تاخت وتاراج کیا، اس کے قیصروں کو قیدی بنایا، اور اس کی رعایا کی دولت لُوٹی، لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتشکدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی، لیکن لوگوں کے دلوں میں بُجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی۔ اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذہبوں کو دبانے کی کوشش کی، اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا، اس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے، اُس کے اشراف واعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اس کے موبد اور گشنیش جس تکبّر کا شکار تھے، ان سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کئے جاتے تھے، وہ رعایا کی جان و مال پر کُلّی اختیار رکھتے تھے، اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اس اشتراکیت کا پرچار کیا جس سے یورپ حالی ہی میں آشنا ہوا ہے اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ آگ، پانی اور گھاس کی طرح دولت اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں نجی املاک کو ختم کر دیں؛

اور دُنیا کی اچھی اور بُری چیزوں میں برابر کے شریک ہوا۔ مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور خون کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی ناجائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چنانچہ مزدک جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا، قتل کر دیا گیا، لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں۔ اس فالِ بد کو کسریٰ انوشیروان کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روکے رکھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہر حال ایک معلّمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جسے دنیا کے جسدِ مردہ میں نئی رُوح پھونکنی تھی۔

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور ان کے حالات میں بڑے بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جو قیامتیں ملّتِ موسوی پر یکے بعد دیگرے ٹوٹیں ان میں قیامتِ کبریٰ قیصران ٹائی ٹس (Titus) اور ہیڈرین (Hadrian) کی جنگیں تھیں۔ روم نے ان کے ہیکل کو مسمار کر دیا اور تیغ و آتش سے اُن کا بحیثیت ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے ان کو مظالم کا نشانہ بنایا۔ لیکن انھوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انھوں نے شقی القلب جابروں کے ہاتھوں جو اذیتیں اُٹھائی تھیں اُن سے انھوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر، قبرص اور سیرینی (Cyrene) کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بود و باش کر رہے تھے، انھوں نے جو انسانیت سوز مظالم کئے وہ اُن کی حالتِ زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قومِ اسرائیل کا گھر اُجڑ گیا، اس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور انھیں کہیں دُور تک امان نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی قساوتِ قلب،

---

[1] "دبستانِ مذاہب" از محسن فانی۔ سَر محمد اقبال کی کتاب Development of Metaphysics in Persia بھی ملاحظہ کیجئے

جن کی مذمت اُن کے انبیاء کیے بعد دیگرے کر چکے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں انھیں پناہ ملی انھوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم اُمیدوں پر زندہ تھی، لیکن اُن امیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی حضرت عیسیٰ آکر جا چکے تھے، لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے حضرت عیسیٰ نے ان کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اس معلّم کے دل پر جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا، کتابِ دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا جو قوم کے سیاہ ترین ایّام میں لکھی گئی تھی اور جو اس کی آرزوؤں کا اظہار اور اس کے لیے اُمید کا ایک پیغام تھی۔ پہاڑوں میں پناہ گزین زیلٹوں (Zealots) کا شدید تعصب، سدوقیوں کی بے جان رسم پرستی، فریسیوں کی ظاہر دارانہ آزادمنشی، اسینیوں کا ایک بازو اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلا کے اُمیدوں بھرے خواب دیکھنا، اُس درویشِ پر جوش کے ملامت آمیز وعظ جس کی زندگی ہیرودیس (Herod) کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی، ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰ کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عتاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور روم کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اُٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ راست خدا کے ہاتھوں قائم کی جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُرآرزو خواب انھوں نے دیکھا، دونوں ان کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ کسی سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالمگیر اخوّت اور محبت کے پیغامبر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھُری قوم میں رہ کر انھوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا شیوہ بنایا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مودت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیرؤں کی بہبودی کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقتور، دولت مند اور حکمران طبقوں کے سینوں میں انھوں نے صرف نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کیے تھے، لیکن غریبوں، جاہلوں، ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انھوں نے شکر گزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ دل میں یہ اُمید لے کر کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے اس میں انھیں کامیابی حاصل ہونے ہی

والی تھی یہودی تعصّب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ دو ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور زندگی پر افسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کو ہٹایا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اور ان کا پیغام بھی غریبوں ہی کے لیے تھا۔ وہ ربانی علوم میں بڑی دسترس رکھتے تھے، لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں، یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں، کے لیے وقف رہی۔ اُن کے حواری بھی غریب اور ان پڑھ لوگ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ زُود اعتقاد تھے اور اس پر طرّہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ کے پُراسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انھیں حیرت میں ڈال دیا، پھر بھی ان لوگوں نے انھیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ ان کے مجسّم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصوّر تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مؤرخ موشیم کہتا ہے کہ اگرچہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا، تاہم "یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علماء اور غیر اہلِ کتاب فلاسفہ کا مقابلہ خود اُن کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے خود ایک آوازِ غیبی کی ہدایت پر ایک تیرھواں شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا جس کا نام ساؤل تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی"[1]

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بُدھ مت کے پیرو ایک مجسّم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے، جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا، اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک "نیم خدا" کا نظریہ ایجاد کیا۔ اوسائرس (Osiris) کی پیدائش، موت اور دوسری زندگی کے سِرّی تصوّرات، آئی سس سیریز (Isis-Ceres) کا تصوّر یعنی اس کنواری ماں کا تصوّر جو نوزائیدہ سورج دیوتا ہورس

---

[1] Mosheim, *Ecclesiastical History*, vol.ii,p.63

[2] ملاحظہ کیجیے مسٹر ارنسٹ ڈی بنسن (Mr. Ernest de Bunsen) کی

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

(Horus) کو گود میں لیے ہوئے ہے ۔۔۔ یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں بھی عام تھے ۔
پال، جو ایک صاحبِ علم فریسی تھا، اُن نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔
وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹراس (Strauss) کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں مبتلا تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ اسے حضرت عیسٰی سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسٰی کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دے یا اُنھیں ایک مجسّم فرشتہ کہے ۔ اس نے حضرت عیسٰی کی سیدھی سادی تعلیمات میں غالباً غوسیت جدیدہ کے پُر اسرار نظریے داخل کر دیئے، جن میں مشرقِ بعید سے مستعار لیے ہوئے عقولِ سماویہ اور نیز واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے ۔
ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی اس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسٰی کے دو شاگردوں، پطرس اور پال کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا[1]۔
ابیونی (Ebionites) غالباً بنی ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے مقلد سے تھے ۔ حضرت عیسٰی نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انھوں نے حضرت عیسٰی کو "عقلی اور حیوانی زندگی" کے تمام اعمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا۔ انھوں نے حضرت عیسٰی کو بچپن، نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں کا حضرت عیسٰی کے بارے میں جو عقیدہ تھا وہ اُن کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا، جس کی قابلِ ذکر کڑیاں دوسیتی[2] (the Docetes)، مارشونی (The Marcionites) پتری پاسی (The Patripassians) اور ان سے اخیر میں نیس کی کونسل ہے جو ۳۲۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذاتِ باری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) مضمون بعنوان محمدؐ کا مقام کلیسا میں Asiatic Quarterly Review, April 1889

[1] Milner, *History of the Church of Christ*, vol. i, pp. 26, 27

[2] دوسیتی حضرت عیسٰی کو خالص خدا سمجھتے تھے۔ مارسیونیوں پر باقی حاشیہ صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے اُس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے، بالخصوص انھوں نے جنھوں نے حضرت عیسٰی کو دیکھا تھا نہ ان کی انسانی شخصیت سے آشنا ہوئے تھے اور نہ اُن کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ کی تھی، اُن کی الوہیت کا نظریہ قیل وقال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسٰی نے تبلیغ شروع کی اُس وقت روما کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اس کے زیرنگیں تھا۔ تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پود کیاری اور مخالف فرقوں کا میدانِ کارزار بن گئی۔

فریجیوں کی دیوی سبلی (Cybele) [1] کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیشتر بطلیموس سوتر، جو اسکندر کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دُور اندیش جرنیلوں میں تھا، مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریقِ عبادت ایجاد کرے جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں، یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبرِ اعظم کو سوجھا تھا، لیکن جہاں اکبر ناکام رہا وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی، کیونکہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی، زیوس، دمیتر اور اپالو یا ڈایونیسیس کی پوجا کرتے تھے۔ مصری اوسائرس، آئی سس اور ہورس کی؛ عقیدۂ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اوسائرس اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور رستخیز تھا اور یونانی مذہب کا مدار ڈایونی سس کی اذیت کشی اور رستخیز۔ یونان کے شہر ایلیوسس (Eleusis) میں بھی پرستش کے پراسرار طریقے رائج تھے جن میں نواردوں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) کا عقیدہ تھا کہ "وہ سب سے زیادہ خدا سے مشابہ ہے، اس کا بیٹا یسوع مسیح ہے، اور جسم کی ایک سایہ نما سی شباہت کا جامہ پہنے ہوئے ہے تاکہ انسانی آنکھیں اسے دیکھ سکیں۔" پتری پاسی اس کے قائل ہیں کہ آسمانی باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ صلیب پر اذیت سہی (مورشیم اور گبن (مزید ملاحظہ کیجیے نبینڈر)

[1] سبلی کی پوجا ہندوؤں کی مشہور دیوی درگا یا کالی کی پوجا سے قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔

کی جاتی تھیں۔ مصری سرِشتش بھی آئی سس کی پر اسرار پرستش کی پیشوائی اسی قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں ان کے نام کیا تھے۔ انھیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا، ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم (ɯnodɐɹəS) کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس (Serapis) نے یونانیوں کے یہاں زیوس (Zeus) کی اور مصریوں کے یہاں اوساٸی رس (Osiris) کی جگہ لے لی۔ آئی سس (Isis) نے اسکندریہ کے مسلک کی "مادرِ غمخوار" بن کر ڈیمیٹر (Demeter) کو برطرف کر دیا اور ڈایونیشیس کو اب تک جو خراجِ عبودیت پیش کیا جاتا تھا وہ اب ہورس ہیپوکریٹیز (Horus Happocrates) کو پیش کیا جانے لگا۔ بہرحال ڈایونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا، چنانچہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس (Isis) جس کی شان و شوکت کے سامنے اس کے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے اسّی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی! اس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات، اس کے سر منڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پروہت، اس کے سفید پوش نوعمر اونٹے پروہت، جو مشعلیں اٹھائے چلتے تھے، اس کے باوقار جلوس، جن میں اوسائی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم و اندوہ کے پُرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا، اُس کی صوفیانہ معانی سے مملو پُراسرار عبادات اور ان سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارتیں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ

آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا۔[1]

اگرچہ "دکھیاروں پر ایک ماں کی مامتا نچھاور کرنے والی" آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلط رہی، لیکن حسین سورج دیوتا متھرا (Mythra) کے نسبتاً زیادہ مردانہ وار مسلک نے، جس میں پُراسرار رسومات کے ساتھ ساتھ کفارۂ گناہ کا نظریہ اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہِ راست تعلق پر اصرار بھی تھا، رومی لشکریوں میں خاص ہر دلعزیزی حاصل کر لی جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ متھرا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آئے۔

عیسائیت کا جو دعویٰ ہے کہ اسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوعِ انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرماں روائی کرے اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ اُن اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں ممد و معاون ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوش خبری نے کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی جس میں غریبوں کو سرفرازی حاصل ہو گی اور دولت مند ڈائیوز (Dives) کی جگہ غریب لعزر (Lazarus) جنت کی نعمتوں کا لطف اُٹھائے گا، ادنیٰ طبقوں کے دلوں میں اُمیدوں کی ایک ہل چل برپا کر دی۔ حضرت عیسیٰ کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کی ولولوں سے بھری ہوئی اُمیدوں نے آس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پُرجوش عقیدہ دُور دراز علاقوں میں پھیلتا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدم مساوات، زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا عوام میں فوراً ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آنے ہی

---

[1] Dill's *Roman Society from Nero to Marcus Aurelius*, chapter V

and rivals of chiristiancity vol (ii) p. 87.

خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس ... کا ایفا، جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جانے گا، مستقبل کی دھندلی دوریوں میں آنکھوں سے دور ہٹتا چلا گیا۔ تاہم جن توقعات اور امیدوں کو اس نے جنم دیا تھا اُن کا زور اُس وقت تک کم نہ ہوا جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد، جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دور تھی، دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے جو عیسائیت کے اس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے جو اس نے حضرت عیسیٰ کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدے کے مطابق اُن کے پردۂ غیب میں چھپ جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک، شام اور جزیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکر جیتے ہوئے خدا اور ایک تثلیثِ قدسیہ کا تصور عام تھا۔ مصریوں کے سرآپیسی مذہب کا یہ ایک لازمی رکن تھا۔ لہٰذا آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا چنانچہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقائد کی صورت اختیار کر لی ان کے مانے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رکاوٹ تھی۔

ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی۔ اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقائد سے واقف ہوئے بغیر۔ انھوں نے فطرتِ الٰہی اور حیات بعد الممات کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں اُن کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے پُراسرار اور ریا۔ نہ مسلکوں کی رسومات و عبادات پر بہت سے صاحبِ فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا، لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے ان کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط قائم کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت

اَن پڑھ اور غیر متمدّن طبقوں تک محدود رہی۔ جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے ایمانیاتی مسائل اور اُن کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ادارے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عبادتی نظام میں داخل نہ کیے اس وقت تک اُسے اصحابِ فرہنگ و ثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سُلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے کر آئے جنھوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی ہے[1]۔ بہرحال دینِ عیسوی کی نشو ونما کے ابتدائی دور میں اُس بے پناہ جبر و تشدد نے جو صدیوں تک جاری رہا، عقائد و نظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم مصری دیوی کی جگہ "امن کا ملجا" اور "رحم کا ماویٰ" بن گئیں۔ اب ان کی پرستش "خدا کی ماں" (Modre'de dios) کے طور پر ہونے لگی، جیسی کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترکِ دنیا خدایانِ اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثاغورس اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے اور انھوں نے اُسے گنگا کے ڈیلٹے کے پروہتوں سے، جن کے یہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اُسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اُسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنّا کے یہاں بپتسمہ کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی۔ آئی سس پوجا کے زیرِ اثر وہ ایک پُر تکلّف اور پُر اسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکتِ عشائے ربّانی کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ اور تو اور، آئی سس کی سرّی عبادات سے جو یہ عقیدہ متعلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سر منڈے

---

[1] Dill's *Roman Society from Nero to Marcus Aurelius*, Chapter, V.

سفاچٹ داڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش خادموں کو، رسومات کی شان و شوکت کو عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں اور ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ میں عینک لگا کر دیکھئے تو وہ قدیم تر مذہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی اپنے سارے طمطراق اور دھوم دھڑکے کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں (litanies) میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی غیر اہلِ کتاب دنیا کی "مادرِ غمخوار") کے حضور گایا کرتے تھے اور سینٹ پیٹر یا سینٹ پال کے گرجا سے سراپیوم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

حضرت عیسیٰ کے بڑے بڑے حواریوں نے ان کے مذہب کو جس صورت میں پیش کیا اس میں صرف یہ مستعار دلکشیاں ہی نہ تھیں، بلکہ وہ بذاتِ خود بھی چند ایسی امتیازی صفات سے متصف تھا جو ایسے لوگوں سے خراجِ عقیدت وصول کر سکتی تھیں جو روحانی تصورات اور مذہبی عقائد کے طوفان میں اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر کوئی ایسی امان گاہ ڈھونڈ رہے تھے جہاں اعلیٰ اور ادنیٰ، عالم اور جاہل سب ہمسری کی سطح پر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے اعلیٰ پہلو آئی سس اور متھرا کے مسلک کی بہ نسبت زیادہ پُر زور طور پر نہیں تو زیادہ یقینی طور پر ضرور نوعِ انسانی کے اشرف ترجبلّی تقاضوں سے خطاب کرتے تھے۔ زندگیٔ معاد کے بارے میں اس کا وعدہ اُن کے وعدوں سے کم مبہم اور پُراسرار تھا، اور اس کے نظریے فلسفیوں کی مجرد قیاس آرائیوں کی بہ نسبت زیادہ ٹھوس اور مثبت تھے۔ وہ تمام پامالِ ستم لوگوں کے لیے راحت و تسکین کا پیغام اور ساری نوعِ بشر کے لیے اخوت و مساوات کا وعدہ لایا، (اگرچہ یہ وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا) علاوہ بریں اس نے تمام ایمان لانے والوں کو چاہے وہ امیر ہوں یا غریب، نجاتِ اخروی کا یقین دلایا۔ اگرچہ اس کے مبلّغوں کی اذعانیت اور ادعائیت نے کبھی ملکی قوت کی مدد سے اور کبھی اس کی مدد کے بغیر استفسار کرنے والوں کے ہونٹ سی دیئے۔ پھر بھی جو لوگ پُرانے مذہبوں کی سرّیت اور فطرت پرستی کی مسنور بے حیائیوں سے متنفّر ہو کر اس یقین کے متلاشی تھے کہ دنیوی زندگی کسی وسیع تر زندگی

کا ایک حصہ ہے اُن کی تمناؤں کی اس نے تسکین کی مختصر یہ کہ ساری مغربی دنیا کسی مثبت اور بلا واسطہ الہامی انکشاف کے لیے چشم براہ اور گوش برآواز تھی، اور ماضی کی تمام تعلیمات نے اسے دعوت حق پر لبیک کہنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ دینِ گلیلی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے پیشرووں اور حریفوں کی چھوڑی ہوئی رسوماتی و نظریاتی میراث کو اپنا کر رفتہ رفتہ اُن قوموں کو جو روما کی حلقہ بگوش تھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ آیا حضرت عیسیٰ کی سیدھی سادی تعلیمات کی یہ تحریف جو اس مقصد سے کی گئی کہ انھیں زیادہ قابلِ قبول بنایا جائے، ترقی تھی یا رجعت، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم سردست نہیں دیتے، لیکن مسلمان حضرت عیسیٰ کے تابعین کو جو الزام دیتے ہیں کہ انھوں نے دینِ عیسوی کا حلیہ بگاڑ دیا وہ الزام بالکل بے بنیاد نہیں۔

حضرت عیسیٰ کی تبلیغ کے بے وقت خاتمے نے اور اس امر نے کہ اُن کی تعلیمات میں کوئی ترکیبی نظام نہ تھا ایک طرف تو تخیل کو زیادہ وسیع میدان بہم پہنچایا اور جیسا کہ ابتدائی عیسائیوں کی زندگی سے ظاہر ہے، عقیدہ و عمل کی زیادہ آزادی عطا کی[1] لیکن دوسری طرف مسائل و عبادات کے بارے میں ہی نہیں بلکہ خود حضرت عیسیٰ کی فطرت کے بارے میں بھی بحث و نزاع کا معرکہ زار مہیا کر دیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا یروشلم سے نکالا جانا جہاں حضرت عیسیٰ کے بارے میں ایک انسان کی حیثیت سے بہت سی روایات تھیں، حضرت عیسیٰ کے تابعین کا غیر یہودی لوگوں سے مخلوط ہو جانا، جو انھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور جن کے یہاں نظم و نسق کائنات سے متعلق نوفیثا غورسی یا افلاطونی خیالات رائج تھے، حضرت عیسیٰ کی شخصیت کا جو دھندلا نقشہ اُن کے تابعین کے تصور میں تھا ___ ان سب چیزوں نے مل کر طرح طرح کے نظریوں اور فرقوں کو جنم دیا۔ قرنہا بعد قرن حضرت عیسیٰ کا ایک ایسا خیالی بت تراشا گیا جس کے نقش و نگار انسانوں سے کوئی مشابہت نہ رکھتے تھے اور جس کا سراپا محض مثالی اور خیالی صفات کا ایک مجموعہ اور ایک اوتار کا سراپا تھا۔ اُن کی دردناک داستانِ حیات جنّوں اور پریوں کی کہانی بن گئی اور ان کی زندگی کے گرد افسانوں کا ایک ایسا تار و پود بُن دیا گیا کہ اب ہمارے لیے یہ جاننا ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ

---

[1] Mosheim, P. 121

درحقیقت کیسے بنتے اور بگڑتے نے کیا کیا گیا۔

ظہورِ اسلام سے پہلے کی صدیوں میں عیسائیت نے جو عجیب وغریب رُوپ بدلے وہ دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غناسطی عقائد، جو یہودی الاصل عیسائیوں کے خیالات کی عین ضد ہیں، پہلی صدی عیسوی کے اختتام کے لگ بھگ رائج ہوئے، یعنی تقریباً اس زمانے میں جب قیصر ہیڈرین (Hadrian) نے یروشلم کو فتح اور برباد کیا۔ سرِنتھس (Cerinthus) نے جو اس صدی کے غناسطی معلموں میں سب سے ممتاز تھا، اپنے پیروؤں میں آسمانی باپ اور آسمانی بیٹے کی دوگانہ پرستش رائج کی۔ وہ باپ اور بیٹے کو یسوع، یعنی دنیا کے پیدا کرنے والے، سے بالکل جُدا ہستیاں سمجھتا تھا۔

سینٹ پال کی تنگ نظر عیسائیت نے اور اس نے اپنے نظریوں اور اسکندریہ کے دلستانوں کے فلسفے میں مطابقت پیدا کرنے کی بے لاحاصل کوششیں کیں اُنھوں نے اسی زمانے کے لگ بھگ ایمونیس ساکس (Ammonius Saccas) کی نوافلاطونی اخذیت (Eclecticism) کو جنم دیا، جسے بعد میں اوریجن (Origen) اور دوسرے ممتاز عیسائیوں نے اختیار کیا۔ اس ہرفن مولا مصنف نے، جس کا اثر ابتدائی صدیوں کے تقریباً تمام عیسائی مفکرین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے، تمام فرقوں اور عقیدوں میں ایک عام مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بعض باتوں کے اعتبار سے ایمونیس مانی کا پیشرو تھا اور اپنے تمام ہمعصروں میں سربرآوردہ تھا۔ اس نے ایک دبستان قائم کیا، لیکن اس کی تعلیمات نے کسی خاص جماعت کے اخلاق یا عقائد کی تشکیل نہ کی۔

دوسری صدی عیسوی کی ابتدا کش مکش اور بدامنی سے ہوئی۔ عیسوی کلیسا میں فرقہ بندی اور بدعت کا بازار گرم تھا۔ غناسطیت کا بول بالا تھا اور اس نے عیسائیت پر ایک اَن مٹ نقش مرتسم کیا۔ اس صدی میں جو فرقے قائم ہوئے اُن میں سے بعض ایک نگاہِ گزراں کے مستحق ہیں، کیونکہ وہ نہ صرف اُن خرابیوں کا پردہ کھولتے ہیں جو کلیسا کی تعلیمات سے پیدا ہوئیں، بلکہ اس اثر کو بھی ظاہر کرتے ہیں جو زرتشتیت، فیثاغورسیت جدیدہ اور کلدانیوں کی قدیم

صابیت نے عیسائیت پر ڈالا۔

مارشونی (The Marcionites) ، جو غالباً ابتدائی غناسطیوں میں سب سے نمایاں تھے، دو اصولوں کے وجود کے قائل تھے، ایک خیرِ کُل اور دوسرا شرِ کُل۔ ان دونوں کے درمیان نیم خدا (The Demiurge) تھا، جو ایک طرح کا متوسط خدا تھا، نہ تو کاملاً نیک اور نہ کاملاً بد، بلکہ خیر و شر کا مرکب، جو جزائیں اور سزائیں دیتا تھا۔ مارشونی عقائد کے مطابق یہ نیم خدا اس دنیائے سفلی کا خالق تھا اور دائماً اصولِ شر سے برسرِ پیکار رہتا (یہاں زرتشتی خیالات کا اثر قابلِ ملاحظہ ہے) اصولِ مطلق نے اس کش مکش کو ختم کرنے اور انسانی رُوح کو، جو قدسی الاصل ہے، ان مخالف اصولوں کی غلامی سے نجات دلانے کی خاطر یہودیوں کے پاس ایک ایسی ہستی کو بھیجا جو خدا سے قدیم ترین مشابہت رکھتی تھی یعنی خدا کے بیٹے یسوع مسیح کو جس نے انسانی مشابہت کا ایک سایہ نما سا پیراہن پہن رکھا تھا تاکہ انسانی آنکھ اسے دیکھ سکے۔ اس آسمانی پیغمبر کو جو کام تفویض کیا گیا وہ یہ تھا کہ وہ اصولِ شر اور اس دنیا کے خالق دونوں کی سلطنت کو تباہ کر دے اور بھٹکی ہوئی روحوں کو راہِ حق پہ لائے "اس وجہ سے اصولِ شر نے اس پر ناقابلِ بیان خونخواری اور غضب ناکی سے حملہ کیا" اور اس حملے میں نیم خدا اصولِ شر کا شریک تھا، لیکن یہ حملہ ناکام رہا، کیونکہ صرف ایک مجازی جسم رکھنے کی بدولت آسمانی پیغمبر دُکھ درد سے مصئون تھا۔

ویلنٹینی (The Valentinians) جن کا اثر و نفوذ زیادہ دیرپا ثابت ہُوا، یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ خدائے برتر و بالا نے اپنے بیٹے یسوع کو اجازت دی کہ طبقاتِ علوی سے اُتر کر زمین پر آئے تاکہ وہ انسانوں کو اُن کے گناہوں سے پاک و صاف کرے اور جب وہ اُتر کر آیا تو اس نے ایک واقعی جسم کا نہیں، بلکہ ایک سماوی و ہوائی جسم کا جامہ پہن رکھا تھا۔" ویلنٹینی حضرت عیسیٰ کو ذاتِ باری کا ایک صدور سمجھتے تھے، جس کا نزول اس دنیا پہ تاریکی کے بادشاہ کی حکومت کو تاراج کرنے کی خاطر ہوا۔

اوفی (The Ophites) ، جو مصر میں گزرے، جگوں، مادّے کی قدامت، دنیا کے خلافِ رضائے الٰہی پیدا ہونے اور نیم خدا کی ستم پیشگی کے قائل تھے، حضرت عیسیٰ کے

بارے میں اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ "خدا وند مسیح اور یسوع نامی بشر ایک ہو گئے ہیں تاکہ غاصب کی باطل حکومت کا قلع قمع کریں۔" ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ سانپ جس نے آدمؑ و حوا کو ورغلایا یا تو خود مسیح تھا یا سانپ کے بھیس میں صوفیا (Sophia)

اُدھر کلدانی فلسفے کے زیرِ اثر غناسطی مذاہب وجود میں آ رہے تھے، اُدھر یونانی اس کوشش میں مصروف تھے کہ "باپ، بیٹے، روح القدس اور دو فطرتوں کے مسیح کی صورت میں اتحاد" کے بارے میں سینٹ پال کے جو عقائد تھے اُن میں اور نظامِ عالم سے متعلق اپنے خیالات میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ پرکسیس (Praxeus) عیسائیت کے ان سوفسطائی مبلغین میں پہلا تھا اور اس نے آغازِ کلام یہ کہہ کر کیا کہ "باپ، بیٹے اور روح القدس" میں کوئی حقیقی فرق نہیں اور آسمانی باپ اپنے بیٹے مسیح سے اس درجہ متحد تھا کہ وہ بیٹے کی مصیبت بھری زندگی کے رنج والم اور اس کی شرمناک موت کی اذیت میں برابر کا شریک بنا!

موشیم (Mosheim) کہتا ہے: "یہ فرقے فلسفے کی پیداوار تھے عیسوی کلیسا پر مونتانس (Montanus) فرقے کی صورت میں ایک اور مصیبت آنے والی تھی۔" اس شخص نے جو علم و دانش سے نفور تھا، اپنے آپ کو وہ فارقلیط کہا جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسٰی نے دی تھی۔ بہت سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس کی پیرو بن گئی۔ ان میں سب سے مشہور پرسیلا (Priscilla) اور مکسیملا (Maximilla) تھیں۔ یہ دونوں اپنے آپ کو نبیہ کہتی تھیں اور ان کا سرمایہ پاکبازی سے بڑھ کر دولت مندی تھا۔" انھوں نے شمالی ایشیا کو ایک مذبح بنا دیا اور اپنی خون آشامی اور غضبناکی سے نوعِ انسانی پر ہولناک مصیبتیں نازل کیں۔

جس زمانے میں مارشیونی، ویلینٹینی، مونتانی اور دوسرے غناسطی فرقے ساری رومی سلطنت میں اپنے عقائد کی اشاعت کی خاطر مصروفِ کار تھے اُسی زمانے میں ایران کی سرزمین سے ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس کی شخصیت دو برّاعظموں کے فلسفے پر ایک اَن مٹ نقش ثبت کر گئی ہے۔ مانی بہمہ وجوہ اپنے زمانے کے فرہنگ و دانش کا کامل ترین نمائندہ تھا۔ وہ ہئیت دان تھا، وہ ماہرِ طبیعیات تھا، موسیقی کا اُستاد تھا اور اعلیٰ درجے کا نقّاش تھا۔ نگار خانۂ مانی کی مشہور

معروف تلمیح اُسی کی یادگار ہے۔

وہ یہودیوں کے قبلہ (Cabbala) یعنی باطنی علم اور غناسطی اُستادوں کی تعلیمات سے پوری طرح واقف تھا۔ مشرق کا فلسفہ اور تصوف اُس کی گھٹی میں تھا۔ نسلاً تو وہ مجوسی تھا، لیکن تعلیماً عیسائی۔ اس کے ارد گرد اختلاف و افتراق کا جو ہنگامہ برپا تھا اُس نے اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا اور عقائد کے انتشار کے اندر سے ایک ایسا مذہب ایجاد کرنے میں کوشاں ہو گیا جس سے تمام لوگوں کے دلی تقاضوں اور آرزوؤں کی تسکین ہو سکے۔ اس نے بڑی جسارت سے کام لے کر متداول مذہبوں کی جڑیں کھوکھلی کیں۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ جس مذہب کو وہ اپنا نشانہ بناتا بظاہر اس کا اقرار لیکن درپردہ اس پر نہایت لطیف انداز سے نکتہ چینی کرتا جس سے لوگوں کے ایمان میں خلل آ جاتا۔ یہی طریقہ اس کے ہم مشرب اسماعیلیوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس جسارت نے اور مانی نے باطنیوں کی طرح تمام مذہبی عقائد کے مخفی معانی کا رمز آشنا ہونے کا جو دعوےٰ کیا اس نے تمام مذہبوں اور فرقوں کو اس کا مخالف بنا دیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں کہیں وہ اور اس کے پیرو جاتے، ایسے ایسے مظالم کے مورد بنائے جاتے کہ تاریخ اُن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مانی کا مسلک عیسائیت کے عقائد اور ایرانیوں اور کلدانیوں کے قدیم فلسفے کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ مادہ اور نفس دائمی طور پر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ مادہ دو فطرتوں کا مالک ہے، ایک قدسی اور دوسری مادی۔ اوّل الذکر آسمانی نور یا رُوح کا ایک جزو ہے۔ مادے اور نفس میں جو تنازعہ ازل سے جاری ہے اُس کے دوران مادے نے انسانوں کو تخلیق کیا۔ رُوحِ قدسی کو اس زندان سے آزاد کرانے کی خاطر جس میں وہ قید تھی، خدائے بزرگ و برتر نے اقلیمِ شمسی سے ایک ایسے وجود کو بھیجا جس کی ساخت خود اس کے جوہر سے ہوئی تھی اور جس کا نام مسیح تھا۔ چنانچہ مسیح انسانی جسم کا ایک موہوم سا لباس پہنے یہودیوں میں نمودار ہوا اور اس نے اپنی تبلیغ کے دوران فانی انسانوں کو یہ سکھایا کہ وہ کیونکر نفسِ ناطقہ کو فاسد جسم سے علیحدہ کر سکتے ہیں اور کیوں کر مادے کے شر پر قابو پا سکتے ہیں۔ تاریکی کے سردار نے یہودیوں کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ مسیح کو ہلاک کر دیں چنانچہ مسیح کو سُولی پر چڑھا دیا گیا، لیکن یہ محض آنکھ کا دھوکا تھا۔ درحقیقت

مسیح اپنا کام انجام دے کر اقلیمِ شمسی میں واپس چلا گیا اور وہاں جا کر اپنے تخت پر بیٹھ گیا۔

چنانچہ مانوی مسیح نہ کھا سکتا تھا، نہ پی سکتا تھا نہ دکھ اٹھا سکتا تھا، نہ مر سکتا تھا، وہ ایک مجسم خدا یا اوتار بھی نہ تھا، بلکہ محض ایک پیکرِ خیالی تھا، یعنی "ایک حاوی کل عنصرِ نور جو فطرت کے زندان میں قید تھا لیکن فطرت کی کسی شکل میں نمودار نہ ہوا، بلکہ اس سے نجات پانے کے لیے کوشاں رہا"۔ یہ عقائد کتنے ہی کفر آمیز اور خلافِ عقل کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں مسلمانوں کو استحالۂ عشائے ربانی کا مسئلہ اور یہ عقیدہ کہ عشائے ربانی کے اجزاء فی الواقع خدا کے گوشت اور خون میں تبدیل ہو جاتے ہیں ان سے بھی زیادہ کفر آمیز اور خلافِ عقل معلوم ہوتے ہیں۔

مانی نے اپنے مریدوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا؛ یعنی "برگزیدگان" اور "شنوندگان"۔ برگزیدوں کے لئے گوشت اور نشہ آور مشروبات قطعاً حرام تھے اور ان پر شادی اور تمام لذاتِ حسی سے پرہیز واجب تھا۔ "سننے والوں" کے لیے جو پابندیاں تھیں وہ نسبتاً کم سخت تھیں۔ انھیں اجازت تھی کہ مکانوں، زمینوں اور زر و مال کے مالک بنیں، گوشت کھائیں اور شادی بیاہ کریں لیکن ان مباحات پر بہت سی حدیں عائد تھیں اور ان کے بارے میں اعتدال اور میانہ روی کی سخت تاکید تھی۔

مانی بہرام گور کے حکم سے قتل کیا گیا، لیکن اس کے عقائد عیسائیت میں داخل ہو گئے، اور آگے چل کر کلیسا میں جو جدال انگیز تفرقے پیدا ہوئے ان میں ان عقائد کے اثرات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

تیسری صدی عیسوی کے وسط میں سابلیوں (the Sabellians) کا فرقہ نمودار ہوا، جو دینِ عیسوی میں ایک نئی تحریک کا موسس تھا۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کو ایک انسان تصور کرتے تھے، لیکن اس کے قائل تھے کہ بزرگ و برتر آسمانی باپ سے ایک خاص قوت صادر ہو کر یسوع نامی بشر میں داخل ہو گئی اور اس طرح وہ خدا کا بیٹا بن گیا۔ یہ عجیب و غریب نظریہ جسے گبن (Gibbon) عیسوی موحدیت سے مشابہ خیال کرتا ہے عیسوی کلیسا میں بڑے خلفشار کا باعث بنا اور اس کی تردید کی خاطر اوریجن (Origen) نے چوتھی صدی عیسوی کی ابتداء میں خدا کی تین جدا گانہ شخصیتوں کا عقیدہ رائج کیا۔ تین خداؤں کا عقیدہ وہی

پُرانا غیر اہلِ کتاب کا عقیدہ تھا جسے عیسائیت کے پیروؤں کے مزاج کے مطابق ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا گیا تھا۔ کثرت پرستی ان کی گھُٹی میں تھی، چنانچہ تین خداؤں کی پرستش حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور لاتعداد خداؤں کی قدیم پرستش میں ایک قسم کی مصالحت تھی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ تین خداؤں کی پرستش عقیدۂ تثلیث میں ضم ہوگئی۔ لیکن اس واقع سے پیشتر اس نے عیسائیوں کے سب سے زیادہ فلسفی مزاج فرقے کو جنم دیا۔[1]

ایریوسیّت (Arianism) کا خروج بڑی حد تک اس بغاوت کا نتیجہ تھا جو عقلِ انسانی نے عیسوی کلیسا کی منافیٔ عقل تعلیمات کے خلاف کی۔ ایریوس (Arius) نے اسکندریہ میں، جو اس وقت عیسائی دنیا کا سب سے زیادہ تعصب زدہ شہر تھا، اپنے بشپ سے اختلافِ رائے کرکے یہ تعلیم دینے کی جرأت کی کہ حضرت عیسیٰ خدا کے ہم جوہر نہ تھے۔ ایریوسی مسلک بہت جلد مصر اور شمالی افریقہ میں پھیل گیا اور بے حد ستم کیشانہ مخالفتوں کے باوجود ان علاقوں پر مسلّط رہا۔ بالآخر اس کے پیرو حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔[2]

ایریوس کے فرقے نے جو ابتری پھیلائی تھی اس کے تدارک کے لیے شہنشاہ قسطنطین (Constantine) نے ۳۲۵ء میں بتینیا (Bithynia) کے مقام پر نیس کی کونسل (The Council of Nice) منعقد کی۔ اس مجلس میں طرفین کے زبردست مجادلوں کے بعد ایریوس کے نظریے کی تردید کی گئی اور حضرت عیسیٰ کو آسمانی

---

[1] Mosheim p.411

[2] سولھویں صدی عیسوی کے اواخر میں سی اینا کے سوسی نس (Socinus) نے ایریوس کے عقائد کی تجدید و توسیع کی۔ آج کل کے عیسائی موحدین سوسی نوسیوں (The Socinians) کے بلاواسطہ رُوحانی جانشین ہیں۔ سوسی نوسی حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے منکر تھے۔ وہ فطری معصیت اور کفّارہ کے بھی قائل نہ تھے۔ اُن کے نزدیک صرف خدا قابلِ پرستش تھا۔

باپ کا ہم ذات وہم جوہر قرار دیا گیا۔[1]"

عیسوی کلیسا کی حالت اس سے پہلے کچھ بھی رہی ہو، اس کے بعد اس کی تاریخ ابتری، تشدد، خانہ جنگی، ہولناک جبر و تعدی، زہر آلود نفرت اور انسانوں کے دلوں سے عقل اور انصاف کو خارج کر دینے کی دائمی کوششوں کی ایک مسلسل اور تاسف انگیز روداد ہے۔ کلیسا کے منصب داروں کی سیاہ کاریاں حد سے گزر گئیں اور مشائخ کلیسا کی عیش پرستی، کبر و نخوت اور شہوت رانی کے افسانے زبانوں پر آنے لگے۔ ابتدائی دور کے ترکِ دنیا کی جگہ رہبانیت نے لے لی اور راہبوں کی اوباشی ضرب المثل بن گئی۔ یہ لوگ کلیسا کے آزاد سپاہی تھے اور ان کا مشغلہ ہر جگہ کھلبلی مچانا اور افراتفری پھیلانا تھا۔ ان کی بدعنوانیوں کے طفیل قسطنطنیہ، اسکندریہ اور رومہ کے کوچہ و بازار میں آئے دن خون کی ندیاں بہتی تھیں۔

ہائی پیشیا (Hypatia) کے قاتل سِرل (Cyril) کے ساتھ نسطوریس (Nestorius) کا مناقشہ عیسائیت کی تاریخ کا ایک نمایاں باب ہے۔ ایفسیس (Ephesus) کی دوسری کونسل کا ایک مقصد یہ تھا کہ کلیسا میں جو مخالف گروہ پیدا ہو گئے تھے اُن کی آپس میں مصالحت کرائی جائے، لیکن گبن (Gibbon) کے الفاظ میں "بطریقِ اسکندریہ کی آمریت نے پھر ایک بار آزادئ رائے کا گلا گھونٹ دیا۔ یسوع مسیح کی دو فطرتوں کے نظریے کی باقاعدہ طور پر تردید کی گئی"۔ "جو لوگ کلیسا کے ٹکڑے کرتے ہیں تلوار اُن کے ٹکڑے کرے"۔ "ان کے پُرزے اُڑیں"۔ "وہ زندہ جلا دیے جائیں"۔ یہ تھیں کلیسا کی ایک مجلسِ عالیہ کی کریم النفسانہ دعائیں"۔

کالسیڈون (Chalcedon) کی کونسل میں، جو رومہ کے لشپ کی فرمائش پر منعقد ہوئی، یہ عقیدہ حتمی طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے اوتار کی حیثیت سے تھے تو ایک شخصِ واحد لیکن ان کے اندر دو فطرتیں جمع تھیں۔

مونوفیزیوں (The Monophysites) اور نسطوریوں،

---

[1] گبن Gibbon, vol. iv

(The Nestorians) نے حضرت عیسٰی کے مجسّم خدا ہونے کے نظریے سے اختلاف کر کے کالسیدون کے فتوے کے خلاف موقف اختیار کیا۔ لیکن راسخ العقیدہ لوگ اپنے معلّم کی فطرت کا مسئلہ حل کر چکے تھے، اور یہ اہلِ بدعت اُن کے شدید حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ یروشلم پر راہبوں کے ایک لشکر نے قبضہ جما لیا اور ایک واحد الفطرت اوتار کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ چنانچہ حضرت عیسٰی کا مزار انسانی خون سے داغ داغ ہو گیا۔ اسکندریہ کے عیسائی ایک عورت کا قتل تو کر ہی چکے تھے، اب انھوں نے اپنے بطریق کو بھی بپتسمہ گاہ میں ذبح کر ڈالا اور اس کی تکا بوٹی لاش کو جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اُڑا دی۔

چھٹی عیسوی کے وسط میں مونو فیزیوں کی قسمت کا ستارہ اُن کے ایک رہبر یعنی اوڈیسہ odessa کے بشپ جیکب (Jacob) کی قیادت میں دوبارہ چمکا۔ اُس کے اور اس کے جانشینوں کے زیرِ سایہ انھوں نے مشرقی سلطنت میں بالادستی حاصل کی۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے نسطوریوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے اور کالسیدونیوں کے ساتھ جھگڑے کر کے عیسوی کلیسا کو خانہ جنگی اور کُشت و خون میں غرق کر دیا۔ مونوفیزیوں کا یہ عقیدہ کہ "مسیح کی قدسی اور بشری نوعوں کی سرشت کچھ ایسی تھی کہ وہ ایک واحد فطرت کی صورت میں مجتمع ہو گئی تھیں لیکن ایسی طرح کہ اُن میں نہ کوئی تغیّر ہوا تھا، نہ کوئی اشتباہ، نہ کوئی امتزاج" ایک غیر عیسائی کو کالسیدون کی کونسل کے طے کیے ہوئے عقیدے سے ذرّہ برابر مختلف دکھائی نہیں دیتا۔ بایں ہمہ یہ تمیز بلا تفریق انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے مصیبتوں کا باعث بنی۔ بالآخر ۶۳۰ء میں ہرکلیس (Heraclius) نے اس خلفشار کو ختم کرنے کے لیے ایک نیا فرقہ قائم کیا، یعنی مونوتھیلیوں (The Monothelites) کا فرقہ، جس کے عقائد اتنے ہی مہمل اور عقل سوز تھے۔ ان لوگوں کا ایمان تھا کہ "مسیح کامل خدا بھی تھا اور کامل بشر بھی اور اس میں دو مستقل فطرتیں جمع تھیں، جو اس طرح متحد ہوئی تھیں کہ نہ کوئی امتزاج واقع ہوا تھا اور نہ کوئی اشتباہ۔ البتہ ان کے اجتماع سے ایک واحد شخصیت پیدا ہو گئی تھی۔" بہر حال اس فرقے کے خروج نے عیسوی کلیسا میں امن قائم کرنے کی بجائے تفرقہ و فساد کو اور بھی بڑھا دیا۔ چنانچہ مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور یورپ کے بہت سے حصوں میں کُشت و خون کا ہنگامہ برپا رہا اور حضرت

عیسائی کے نام پر بربریت کے انسانیت سوز مظالم ہوتے رہے۔

یہ تھی عیسوی دنیا کی مذہبی حالت اُن صدیوں میں جو ظہورِ اسلام سے پہلے گزریں۔

شہنشاہ قسطنطین کے بظاہر عیسائیت قبول کرتے ہی رومی سلطنت میں عیسائیت برسرِاقتدار آگئی۔ غیر اہلِ کتاب مذہب کا وقتِ آخر قریب آ پہنچا تھا۔ اگرچہ قیصرانِ روم میں سب سے جلیل القدر اور سب سے مخلص قیصر کی چارہ گری کی بدولت اُس نے کچھ مدت کے لیے سنبھالا لیا، لیکن اس کا خاتمہ ناگزیر ہو چکا تھا۔ گبن کہتا ہے: "غیر اہلِ کتاب مذہب کے ناپید ہو جانے کے بعد توقع ہو سکتی تھی کہ عیسائی امن و امان اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کر کے اپنی فتح بابی سے متمتع اندوز ہوں گے۔ لیکن تفرقے کا جو بیج اُن کے سینے میں بویا گیا تھا وہ پنپ رہا تھا۔ چنانچہ انھیں اپنے بانیٔ مذہب کے قوانین پر عمل کرنے کی بہ نسبت اُس کی فطرت کی چھان بین کرنے کی زیادہ فکر تھی۔"[1] سارا عیسائی یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور کلیسا فرقوں اور بدعتوں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ عوام الناس کے مذہبی تصورات قبلِ عیسائیت جاہلیت کے مرحلے سے ایک قدم آگے نہ بڑھے تھے۔ مُردوں کی رُوحوں اور زندہ لوگوں کے بُتوں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ تبرکوں اور ولیوں کی پرستش عام تھی۔ مختصر یہ کہ عیسائیت کفر و الحاد کی طرف مراجعت کر گئی تھی۔

جو قومیں عیسائیت کے زیرِ نگیں تھیں اُن کی معاشرتی اور سیاسی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ آزادیٔ فکر و رائے کچل دی گئی تھی اور مسیح کی سلطنت کے جشن ایسے بدعتیوں کی قربانی سے منائے جاتے تھے جو کسی رائج الوقت خیال سے اختلاف کی جسارت کرتے۔

اسکندریہ کے بازار میں مہذب دنیا کی نگاہوں کے سامنے ازمنۂ قدیم کی برگزیدہ ترین عورت انتہائی سفاکی کے ساتھ ایک ایسے عیسائی کے ہاتھوں قتل ہوئی جس کا نام عیسائی اولیا کی فہرست میں درج ہے اور جس کی حمایت زمانۂ جدید کے ایک مصنف نے کی ہے۔ اس ہولناک اور

---

[1] شہنشاہ جسٹینین (Justinian) معروف بہ مُرتد، سے نقل ہے: "کوئی درندہ بھی انسان کا اتنا دشمن نہ ہوگا، جتنا عیسائیوں کا ایک فرقہ دوسرے فرقوں کا دشمن ہے۔"

نفرت انگیز جرم کو، جو عیسائیت کے دامن پر ایک بدنما ترین داغ ہے ڈریپر (Draper) نے بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک حسین، دانش مند اور نیکوکار عورت، جس کے درس میں اسکندریہ کے دولت مند اور شائستہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے کہ تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی تھی، اپنی درسگاہ سے باہر آرہی تھی کہ جوشیلے عیسائیوں کے ایک ہجوم نے اس پر حملہ کر دیا۔ ان حامیانِ دین نے نعرے لگاتے ہوئے اُسے گھسیٹ کر پالکی سے اُتار لیا اور بھرے بازار میں سرتاپا عریاں کر دیا۔ اس کے بعد وہ اُسے گھسیٹ کر قریب کے ایک گرجا میں لے گئے، جہاں ایک نام نہاد "ولی" نے ایک ڈنڈے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ بیچاری کی برہنہ لاش کی بے حرمتی کی گئی اور اس کا عضو عضو کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ لیکن اس شیطانی جرم کی تکمیل اس وقت تک نہ ہوئی جب تک کہ اس کا گوشت سیپیوں سے کھرچ کر ہڈیوں سے جُدا نہ کر دیا گیا اور بچے کھچے ڈھانچے کو جلا نہ دیا گیا۔ اس بھیانک اور گھناؤنے جرم کے ارتکاب میں جس شیطان صفت انسان نے سرغنے کا کردار ادا کیا دنیائے عیسائیت نے اُسے "ولی" کا لقب دے کر سرفرازی بخشی۔ بالآخر ہائی پیشیا (Hypatia) کی شہادت کا انتقام عمرو بن العاص کی تلوار نے لیا۔

جسٹینین Justinian کے عہد میں، جس کی عیسائیت نوازی اور قانون سازی کے قصیدے گائے جاتے ہیں قسطنطنیہ کے جو حالات تھے وہ اس اخلاقی پستی اور خواری کا بہترین آئینہ ہیں جو اُس وقت ساری عیسوی دنیا میں عام تھی۔ خلوت میں ہو کہ جلوت میں، پاکبازی ایک جنسِ مفقود تھی۔ معاشرے میں نہ اس کا کوئی وجود تھا، نہ کوئی تصور۔ قیصروں کے تخت پر ایک فاحشہ عورت براجمان تھی اور وہ قیصر کے اعزاز و اقتدار میں برابر کی شریک تھی۔ تھیوڈورا (Theodora) قسطنطنیہ میں پیشہ کر چکی تھی اور شہر کے اوباشوں میں اُس کا نام ضرب المثل تھا۔ اب اُسی شہر میں "ثقہ حکام، راسخ العقیدہ بشپ، فاتح جرنیل اور قیدی بادشاہ" اُسے خراجِ عبودیت پیش کرتے تھے۔ اس کی ستم طرازیوں نے، جو نہ مذہبی، نہ اخلاقی قوانین کی پابند تھیں، ساری سلطنت میں کہرام مچا دیا۔ آئے دن شورشیں، بلوے اور خونریز ہنگامے ہوتے تھے، جن میں پادری لوگ ہمیشہ نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہر خدائی

اور انسانی قانون پاؤں تلے روند دیا جاتا تھا۔ عبادت گاہیں قربان گاہیں بن جاتی تھیں۔ کسی جگہ کی حرمت ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی، معاشرے کے تمام رابطے کٹ جاتے تھے اور روز روشن میں سیاہ ترین جرائم کا ارتکاب کیا جاتا تھا۔ جسٹینین کی حکومت کے پانچویں سال میں جو بلوے ہوئے اُن میں یہ ناپاک شہر جن ہولناک کارروائیوں کا معرکہ زار رہا۔ اُن کی مثال تاریخ کے صفحات میں مشکل سے ملے گی۔

اس وقت قسطنطنیہ کے مقابلے میں ایران ایک دارالامان تھا۔

عیسوی قسطنطنیہ کی تاریخ ان جرائم سے داغدار ہے۔ اُن کی رُوداد پڑھ کر انسان کے دل میں انتہائی کراہت پیدا ہوتی ہے۔ ابھی پیغمبرِ اسلام اپنے عہدِ شیرخواری ہی میں تھے کہ ایک عیسائی بادشاہ کے ایماء پر ایک بازنطینی شہنشاہ کو جس کا شمار اس سلطنت کے نیک ترین فرمانرواؤں میں ہوتا ہے، بیوی بچوں سمیت انتہائی بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ قاتلوں نے اُسے ایک مقدس مقام سے، جہاں اس نے پناہ لی تھی، گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس کے پانچ بیٹوں کو یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا۔ سب سے اخیر میں شہنشاہ کی باری آئی۔ ملکہ اور اس کی بیٹیوں کو پہلے تو اذیتیں پہنچائی گئیں اس کے بعد اسی جگہ لے جاکر جہاں شہنشاہ موریس (Maurice) کو قتل کیا گیا تھا اُن کے سر قلم کر دیئے گئے۔ شہنشاہ کے دوستوں، رفیقوں اور طرفداروں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ بازنطینی عیسائیوں کی اخلاقی زبوں حالی کے شاہد ہیں۔ اُن لوگوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر دی گئیں، اُن کی زبانیں گُدّی سے کھینچ لی گئیں، اُن کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ بعض تازیانے کی ضربوں سے مر گئے۔ بعض جلا دیئے گئے اور بعضوں کو تیروں سے چھلنی کر دیا گیا۔ گبن کہتا ہے: "عاجل موت ایک ایسی رحمت تھی جو اُن میں سے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔"

بازنطینی سلطنت جس کا خونِ زندگی قطرہ قطرہ رس رہا تھا، جسے سیاسی اور مذہبی نفرتوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا، مذہبی مباحثوں نے پریشان کر رکھا تھا اور "وحدتِ اعتقاد کو بزور عائد کرنے کی خواہش نے دیوانہ بنا دیا تھا"، کُشت و خون، فسق و فجور اور ظلم و ستم کا ایک ڈراؤنا اور گھناؤنا نظارہ پیش کر رہی

تھی[1] ۔ وہ ملک جو فرات کے مغرب کی طرف ایشیائی ترکی میں شامل تھے، پہلے تو کبھی پارتھیوں اور کبھی آریوں کے ہاتھوں تاراج ہوئے اور پھر کبھی ایرانیوں اور کبھی بازنطینیوں کے ہاتھوں چنانچہ وہ انتہائی مایوسی کا مرقع پیش کرتے تھے۔ اُن کی مادی خستہ حالی ان کی اخلاقی ذلت سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰ کے پیروؤں نے ان خرابیوں کو رفع کرنے کی بجائے انھیں اور بھی شدید بنا دیا۔ بین النہرین میں مجوسی ذرتشتیت زوال یافتہ عیسائیت سے الگ برسرِ جنگ تھی، نسطوری راسخ العقیدہ عیسائیوں سے الگ جدال آزما تھے؛ مونٹینس (Montanus) اور داعیٔ نبوت عورتوں میں الگ چپقلشیں جاری تھیں۔ ان سب فتنوں کا نتیجہ یہ تھا کہ مغربی ایشیا ایک دشتِ مایوسی بنا ہوا تھا۔

فتوحات کے جو جھکڑ افریقہ میں چلے تھے اور دینِ عیسوی کے پیروؤں اور مبلغوں نے کُشت و خون اور تاخت و تاراج کے جو طوفان برپا کیے تھے انھوں نے مصر میں اور رو بہ زوال عیسوی سلطنت کے افریقی صوبوں میں اخلاقی زندگی کے تمام شعلے افسردہ کر دیے تھے۔ یورپ میں لوگوں کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ روزِ روشن میں اور نہ صرف عوام بلکہ پیشوایانِ دین کی آنکھوں کے سامنے اپنے ملک کا محسن نارسیز (Narses) قسطنطنیہ کے بازار

---

[1] مل مین (Milman) اُس زمانے کی عیسائیت کی ہیئتِ کذائی کا نقشہ یوں پیش کرتا ہے "وہ قسطنطنیہ کا بشپ یا تو بازنطینی شہنشاہ کا صید بے چارہ یا غلام زرخرید یا حریف تفرقہ پرداز تھا۔ وہ شہنشاہ کی آمریت پر کوئی اعلیٰ اخلاقی اثر نہ ڈال سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقے کے پادری چاہے معاشرے کو کتنے ہی مخفی فائدے پہنچاتے ہوں، اُن کے قبضے میں اتنی طاقت، دولت اور مرتبت تھی کہ ان کے دلوں میں بڑائی کی آرزوئیں پیدا ہونا یا ان کا سازشوں کے جال بچھانا ایک قدرتی امر تھا، لیکن اتنی نہ تھی کہ وہ عوام کے ذہنوں پر کوئی صحت بخش اثر مرتب کر سکتے، ایک زوال پذیر عہد کی اخلاقی خرابیوں کو روک سکتے، مخالف مفادات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے، ایک دوسری کی دشمن قوموں کو شیر و شکر کر سکتے۔ اُن کا حکم اگر کبھی چلتا بھی تھا تو صرف اس لیے کہ لوگ توہمات کی بناء پر اُن سے ڈرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ لوگ اُن کی عزت کرتے تھے یا ان کے گرویدہ تھے۔ وہ عوام کی علمی سطح کو تو کیا بلند کرتے، خود ان کی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱ پر دیکھیں)

میں زندہ جلا دیا گیا۔ روم کے گلی کوچوں میں اکسارک (Exarch) کی نگاہوں کے سامنے، مخالف بشپوں کے طرف داروں نے کھلم کھلا لڑائی کی اور گرجوں کو عیسائیوں کے خون سے رنگ دیا۔ ہسپانیہ تاراج اور خستہ حالی کا ایک جگر خراش منظر پیش کر رہا تھا۔ دولت مند اور خصوصی مراعات کے مالک معدودے چند لوگ، جو شہنشاہوں کے ماتحت صوبوں کی بڑی بڑی مجسٹریٹیوں پر فائز تھے یا صرف مجسٹریٹ کے خطاب سے عزت یافتہ تھے، ہر طرح کے ٹیکسوں سے سبکدوش تھے۔ وہ خوبصورت بنگلوں میں رہ کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، غلام اور لونڈیاں ان کی خدمت پر مامور تھیں اور ان کا زیادہ تر وقت حماموں میں گزرتا تھا، جو بدترین قسم کے قحبہ خانے تھے یا جوا کھیلنے میں یا شراب و کباب کی محفلوں میں۔ ایک طرف تو یہ عیش و عشرت اور دولت و ثروت تھی، اور دوسری طرف عوام میں انتہا درجے کی عسرت و خستہ حالی تھی۔ متوسط طبقے کے لوگ، جو مملکت کے آزاد شہری تھے، رومیوں کی ستم شعاریوں کے تختۂ مشق تھے۔ زرعی غلام نواب ختم ہو چکے تھے، لیکن ان کی جگہ ایسے نوآبادوں نے لے لی تھی جو نہ غلام تھے نہ پوری طرح آزاد۔ غلاموں سے ان کی حالت بعض باتوں کے اعتبار سے بہتر تھی۔ انھیں قانوناً شادی کرنے کی اجازت تھی۔ جن زمینوں کی وہ کاشت کرتے اُن کی پیداوار کا کچھ حصہ انھیں ملتا تھا اور اُن کے آقاؤں کو یہ اختیار نہ تھا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) جہالت کی دلدل میں ڈوب گئے اور بدترین قسم کی وحشت و بربریت یعنی ایک از کار رفتہ تہذیب کے شکار ہو گئے۔ رہبانیت بہت سے ایسے لوگوں کو جو مستعد اور مفید شہری بن سکتے تھے عملی زندگی کے رستے سے ہٹا کر گوشۂ عزلت میں لے گئی، جہاں وہ ایک کاہلانہ مذہبی زندگی بسر کرتے تھے لیکن سوائے ایسے موقعوں کے کہ جب راہب لوگ سیاسی ریشہ دوانیوں یا مذہبی منافقتوں کی خاطر دھڑے باندھتے تھے، معاشرے سے ان کا کوئی سروکار نہ ہوتا تھا، اور وہ اس پر کوئی اثر نہ ڈال سکتے تھے۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ تارکین دنیا جنگلوں میں اور راہب اپنے بسم اللہ کے گنبدوں یعنی راہب خانوں میں۔ انھیں اپنی نجات کا یقین تو ہوتا ہی تھا، اس لیے وہ باقی انسانوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے تھے کہ جہنم واصل ہوتے ہیں تو ہوا کریں۔"

Milman, *Latin Christianity*, vol. i, Introduction

اُن کے مال واسباب پر قبضہ کرلیں۔لیکن باقی ہر لحاظ سے وہ زمین کے غلام تھے۔حکومت کو ان سے ہر طرح کا کام لینے کا اختیار تھا۔گھریلو غلاموں کی طرح انھیں جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں[1]۔ وہ افراد کے غلام تو نہ تھے لیکن زمین کے غلام تھے۔ان معنوں میں کہ جن زمینوں کی وہ کاشت کرتے تھے، ان کے ساتھ نہ صرف عمر بھر کے لیے بلکہ پشت ہا پشت تک موروثی طور پر بندھے رہتے تھے۔ان نام نہاد آزاد لوگوں سے قطعِ نظر، آبادی کا بیشتر حصہ غلاموں پر مشتمل تھا، اور ان غلاموں کی حالت اتنی بُری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔اُن کے ساتھ جانوروں جیسا، بلکہ اس سے بھی بدتر، سلوک کیا جاتا تھا۔ وحشیوں کے حملے نے ہسپانیہ پر ایک نئی قیامت ڈھادی۔وہ اپنے جلو میں ہولناک تباہی کو لے کر آئے۔وہ جدھر گئے انھوں نے کشت وخون اور لوٹ مار سے کہرام مچادیا اور عورتوں اور بچوں اور پادریوں کو غلام بنالیا۔

جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں یہودیوں کی ایک بڑی تعداد صدیوں سے آباد تھی۔سیسی بُت وزیگوتھ the Visigoth Sisebut کے عہدِ حکومت میں ۶۱۶ء کے لگ بھگ ان لوگوں پر پادریوں کے ہاتھوں جو دہشت ناک مظالم شروع ہوئے وہ اس وقت ختم ہوئے جب اسلام نے آکر جہالت وتعصب کے اُن ستم رسیدوں کو چھٹکارا دلایا۔یہ اسلام ہی کی برکت تھی جس نے یہودیوں کو ابن میمون (Maimonides) اور ابن جبرول (Ibn Gebrol) جیسے آدمی پیدا کرنے کی توفیق بخشی۔

آئیے اب ہم اس پُر اسرار اور رُومانی ملک ـــ عرب ـــ کی طرف متوجہ ہوں جو اب تک دنیا کی بڑی بڑی قوموں سے الگ تھلگ اور ان کی جنگی اور سیاسی کارروائیوں سے سروکار رکھے بغیر خاموشی وتنہائی کے پردے میں مستور رہا ہے۔خسروانِ ایران اور قیصرانِ رُوم کی توجہیں ملکِ عرب کی صدیوں کی نیندیں خلل ڈالے بغیر قرنہا بعد قرن اُس کی سرحدوں کے

---

[1] چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر عموماً تین سو کوڑے لگائے جاتے تھے۔

Dozy, *Hist. des Musulmans d, Espagne*, vol. ii, p.87

پاس سے کوچ کرتی ہوئی گزرتی رہی تھیں۔ بازنطین اور ایران کو جو طوفان آئے دن اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے تھے اکثر اوقات اُن کی گھن گرج اس کے کانوں میں پڑی تھی، لیکن وہ اپنی گہری نیند سے بیدار نہ ہوا تھا۔ بہرحال اب اس کے جاگنے کا وقت آ گیا تھا اور جب وہ جاگا تو اس کے برگزیدہ ترین فرزند کی آواز نے اس کی بیداری کا اعلان کیا۔

پہاڑوں کا وہ سلسلہ جو فلسطین سے خاکنائے سویز تک پھیلا ہوا ہے اور جو بحیرۂ احمر کے متوازی چل کر جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی سرے کو جا چھوتا ہے اُسے عربی زبان میں حجاز کہتے ہیں، اور یمن تک جس علاقے سے وہ گزرتا ہے وہ سارا علاقہ اسی کے نام سے موسوم ہے۔ کہیں کہیں تو پہاڑ سمندر کے قریب ہیں اور کہیں کہیں ساحل سے دُور ہٹے ہوئے ہیں۔ اُن کے اور ساحل کے درمیان بنجر اور غیر آباد نشیبی زمینیں ہیں جن میں جا بجا سرسبز وادیاں اور شاداب نخلستان ہیں، جو برساتی نالوں کی گزرگاہوں میں خود بخود پیدا ہو گئے ہیں۔ اس سلسلۂ کوہ سے پرے اور مشرق کی جانب نجد کا صحرا پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع و عریض سطح مرتفع ہے، جس میں بیابان ہیں، گھاٹیاں ہیں اور کہیں کہیں اکا دکا ہرے بھرے سبزہ زار ہیں جو آنکھوں کو طراوت بخشتے ہیں۔ حجاز میں مکے اور مدینے کے مقدس شہر ہیں، جو اسلام کا مولد اور گہوارہ ہیں۔

یہ وسیع خطّہ چار ملکوں میں منقسم ہے جن کی حدود بخوبی متعیّن ہیں۔ شمال کی طرف عرب الحجر (Arabia Petraea) ہے، جس میں قدیم ادومیوں (Edomites) اور مدیانیوں (Midianites) کے ملک شامل ہیں۔ پھر خاص حجاز ہے جس میں یثرب کا مشہور شہر ہے، جو بعد میں مدینۃ النبیؐ (مخفف مدینہ) کے نام سے سرفراز ہوا۔ خاص حجاز کے جنوب میں تہامہ (Tihama) ہے، جس میں مکہ اور جدّے کی بندرگاہ ہے، جہاں حاجی جہاز سے اُترتے ہیں۔ چوتھا اور سب سے جنوبی حصہ عسیر (Asyr) کہلاتا ہے اور اس کی سرحد یمن کی سرحد سے ملتی ہے۔ خاص یمن جزیرہ نمائے عرب کا جنوب مغربی گوشہ ہے، جس کے مغرب میں بحیرۂ احمر ہے اور جنوب میں بحرِ ہند، شمال میں حجاز اور مشرق میں حضرموت۔ یمن کے لفظ کا اطلاق اکثر من حیث العام جنوبی عرب پر ہوتا

ہے جب اس کا اطلاق یوں کیا جائے تو اس میں یمنِ خاص کے علاوہ حضر موت اور اس کے مشرق کا علاقہ مہرہ (Mahra) بھی شامل کیا جاتا ہے۔ مہرہ، (Mahra) کے پرے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مشرقی گوشے میں عمان ہے۔ اس کے شمال میں بحرین یا احساء جو خلیج فارس کے کنارے واقع ہے۔ موخرالذکر علاقے کو ہجر (Hijr) بھی کہتے ہیں، جو اس کے سب سے بڑے صوبے کا نام ہے۔

نجد اس سطح مرتفع کا نام ہے جو حجاز کے کوہستان کے مشرقی حصے سے شروع ہو کر سارے وسطی عرب پر پھیلی ہوئی ہے۔ نجد کا وہ حصہ جو یمن کی سرحد پر واقع ہے نجد الیمن کہلاتا ہے اور شمالی حصہ صرف نجد۔ ان دو حصوں کے درمیان ایک پہاڑی علاقہ ہے جس کا نام یمامہ ہے جو اسلام کی تاریخ میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ نجد کے شمال میں شام کا ریگستان ہے۔ جو فی الحقیقت عرب کا حصہ نہیں، لیکن اب اس میں عرب کے بدوی قبیلے اپنے قدیم ارامی پیشروؤں کی طرح خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں عراق کے صحرا ہیں جن کی سرحد دریائے فرات کے دائیں کنارے پر کالدیہ (Chaldaea) کے علاقے سے ملی ہوئی ہے، جسے وہ عرب کے مزروعہ حصے سے جدا کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب نجد اور احساء کے درمیان حدِ فاصل اُن ریگستانوں میں سے ایک ریگستان ہے جنھیں اہلِ عرب نفود کہتے ہیں۔ جنوب کی طرف دہناء (Dahna) کا صحرا ہے جو نجد کو حضر موت اور مہرہ سے جدا کرتا ہے۔

اس وسیع و عریض خطّے میں، جو اپنے عروج کے زمانے میں فرانس سے دُگنے رقبے پر مشتمل تھا، اس وقت بھی دو طرح کے باشندے تھے اور اب بھی ہیں، یعنی شہروں کے لوگ اور بادیہ نشین لوگ یا بدو۔ بدوؤں میں جو اچھائیاں اور بُرائیاں ہیں، مثلاً ان کی اپنے قبیلے سے محبت، ان کی عجیب و غریب حمیّت، ان کا منچلا پن، اُن کا جذبۂ انتقام اور ان کی انسانی زندگی کے بارے میں لاپروائی، ان سب کو برٹن (Burton) اور پُول (Poole) جیسے مشہور مصنّفین نے بڑی عمدگی اور ہمدردی سے بیان کیا ہے۔ لیکن شہریوں اور بدوؤں میں چاہے کتنا بھی فرق ہو، عرب جبلّۃً بادیہ نژاد ہیں۔ اُن کی پُرجوش محبتِ آزادی اور اُن کی رُجحانی

بلند پروازی ان کے صحرائی مسکن کی کھلی ہوا اور بیکراں پہنائیوں کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ مکے اور عکاظ میں ہر سال میلے ہوا کرتے تھے، عرب کے شعوب و قبائل میں کسی قسم کی وحدت نہ تھی۔ ہر قبیلہ مدنی نشو و نما اور مذہب میں دوسرے قبیلوں سے مختلف تھا۔ یہ تنوّع ان کے مختلف الاصل ہونے کا نتیجہ تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں مختلف قومیں مختلف زمانوں میں آباد رہ چکی تھیں۔ ان میں سے بہت سی صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھیں، لیکن اُن کے اچھے یا بُرے کارناموں کی یاد ان کے بعد آنے والوں کے ذہنوں میں تازہ تھی۔ یہ روایتیں مجموعی طور پر قومِ عرب کی تاریخ تھیں۔ خود عرب ان قوموں کو جو جزیرہ نمائے عرب میں آباد رہ چکی تھیں تین بڑے بڑے گروہوں میں تقسیم کرتے تھے۔

۱۔ عرب البائدہ، یعنی وہ عرب جو معدوم ہو چکے تھے اور جن میں وہ حامی (کوشی) قبیلے جنھوں نے سامیوں سے پہلے عرب میں بود و باش اختیار کی تھی اور ان کے علاوہ شام، فنیشیا اور دوسرے علاقوں کی ارامی قومیں۔

۲۔ عرب العاربہ یا متعاربہ، یعنی اصلی عرب اور خالص سامی قومیں جو روایت کے مطابق قحطان یا یقطان کی اولاد سے تھے اور جنھوں نے اپنی رُو بہ جنوب نقل و حرکت کے دوران ابتدائی باشندوں کو تباہ کر دیا تھا۔ قحطانی عربوں نے، جو طبعاً خانہ بدوش تھے، ان ملکوں کے ابتدائی باشندوں پر، جو حامی النسل ستارہ پرست تھے، اپنا تسلّط قائم کر لیا تھا۔ ان کا اصلی گہوارہ وہ خطّہ تھا جہاں سے نسلِ ابراہیم بھی آئی تھی اور اس کی حدود کا تعیّن قحطان کے دو اسلاف کے ناموں سے ہوتا ہے، یعنی ارفخشد (Arphaxad) جس کے معنی ہیں، "سرحدِ کالدیہ" اور عیبر یا عابر (Eber) جس کے معنی ہیں "دریا پار سے آیا ہوا آدمی" یعنی وہ آدمی جو دریائے فرات کے دائیں کنارے سے بابل یا عراق عرب میں آیا تھا[1]

۳۔ عرب المستعربہ یعنی وہ لوگ جو عرب میں آکر آباد ہوئے۔ یہ لوگ ابراہیمی خاندان کے

---

[1] Lenormant, *Ancient History of the East*, vol. ii, p. 293

سامی تھے جو یا تو پُر امن مہاجروں یا فوجی آبادکاروں کی حیثیت سے جزیرہ نمائے عرب میں آئے اور قحطانی عربوں کے ساتھ شادی بیاہ کر کے انہی کے ساتھ رہنے لگے[1] یہ تینوں الفاظ عاربہ، متعاربہ اور مستعربہ ایک ہی مادے سے ماخوذ ہیں اور ان کی صرفی شکل سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ مختلف گروہ کن کن زمانوں میں آکر سرزمین عرب میں آباد ہوئے[2]

اعراب العاربہ میں جو قومیں تاریخ اسلام کے ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں وہ بنی عاد[3]، عمالقہ، بنی ثمود اور بنی جدیس۔ بنی عاد جو حامی الاصل تھے، جزیرہ نمائے عرب کے سب سے پہلے آبادکار تھے اور وہ زیادہ تر وسطی عرب کے اس حصے میں آباد تھے جسے عرب مؤرخ اور جغرافیہ دان احقاف الرمال کہتے ہیں، اور جس کی سرحد یمن، حضرموت اور عمان کی سرحدوں سے ملتی ہے۔ اپنی تاریخ کے ایک دور میں بنی عاد ایک طاقتور اور فاتح قوم تھے۔ ان کے ایک بادشاہ شدّاد نے، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، اپنی حکومت عرب کی حدود کے باہر بھی قائم کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عراق فتح کیا، بلکہ ہندوستان کی سرحد تک جا پہنچا۔ اس روایت کا اشارہ غالباً بابل اور کالدیا پر عربوں کے حملے کی طرف ہے، جو دو ہزار سال قبلِ مسیح واقع ہوا، اور شاید اسی واقع کو ایرانی روایات میں حملۂ ضحاک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی شدّاد نے یا غالباً اس کے کسی جانشین نے جو اس کا ہم نام تھا مصر پر بھی چڑھائی کی، بلکہ اور بھی مغرب کی طرف جا نکلا۔ بعض

---

[1] ابن الاثیر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۵۵ - ۵۸

[2] کوسین ڈ پرسیول (Caussin de perceval) بائدہ اور عاربہ کو ایک ہی سمجھتا ہے اور متعاربہ کو دوسرا گروہ شمار کرتا ہے۔ بعد کے صفحات میں میں نے اس کی تقسیم پر عمل کیا ہے۔

[3] خیال کیا جاتا ہے کہ قحطانی عربوں نے بنی عاد پر غلبہ پاکر انھیں معدوم کر دیا اور بنی ثمود کو جو ایک عجیب قسم کے غاروں میں رہنے والے لوگ تھے، خدالاحمر (Khqzar al-Ahmar) کے ماتحت اشوریوں نے ختم کر دیا۔

مورخین کی رائے میں مصر پر عربوں کا یہ حملہ وہی واقعہ ہے جسے ہکسوں (The Hyksos) کا حملہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نظریہ کی تائید کسی حد تک اس امر سے ہوتی ہے کہ ان خانہ بدوش حملہ آوروں کو بالآخر تھیبائڈ (The Thebaid) کے بادشاہوں نے اپنے جنوبی ہمسایوں یعنی حبشیوں اور کوشیوں کی مدد لے کر افریقہ سے نکالا۔

کہا جاتا ہے کہ بنی عاد کی بیشتر تعداد خشک سالی کا شکار ہو کر تباہ ہو گئی جو تھوڑے سے لوگ بچ رہے ان سے بنی عاد کی نئی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے یمن میں کچھ مدت خوشحالی کی زندگی بسر کی۔ بالآخر نئے بنی عاد بھی قحطانی لہر کی لپیٹ میں آکر ختم ہو گئے۔

عمالقہ جنھیں لنورماں (Lenormant) نسلاً ارامی خیال کرتا ہے، بلاشک وشبہ وہی تھے جنھیں یہودی اور عیسائی کتب مقدسہ میں عمالقہ کے نام سے اور مصری آثارِ قدیمہ کے کتبوں میں شَسُو کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور جنھیں اشوری بادشاہوں نے بابلیہ سے نکال باہر کیا۔ یہ لوگ عرب میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ یمن حجاز، فلسطین اور شام میں پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصر میں بھی جا پہنچے اور متعدد فراعنہ ان کی نسل سے تھے۔ حجاز کے عمالقہ بنی جُرہُم کے ہاتھوں یا تو تباہ ہو گئے یا ملک سے نکال دیئے گئے۔ بنی جُرہُم بنی قحطان کی ایک شاخ تھے۔ شروع میں یہ لوگ جنوب میں آباد ہوئے، لیکن بعد میں شمال کی طرف بڑھ کر عمالقہ پر غالب آئے۔

بنی ثمود جو بنی عاد کی طرح نسلاً کوشی یا حامی تھے، ادوم کے سرحدی علاقوں میں آباد ہوئے اور پھر حجر میں، جو عرب الحجر کے مشرق میں حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ یہ لوگ چٹانوں میں غار کھود کر ان میں رہتے تھے۔ سر ہنری لے یارڈ (Sir Henry Layard) Layard نے اپنی کتاب (Early Travels) میں ان کے کوہستانی مسکنوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ چنانچہ زمانۂ جدید کے سیاحوں کے بیان کردہ حالات اور جدید انکشافات سے عرب روایات کا مقابلہ کیا جائے تو بنی ثمود کے وطن کی تعیین کی جا سکتی ہے۔ شام، نجد اور حجاز کے درمیان جتنی تجارت ہوتی تھی وہ سب بنی ثمود کی وساطت سے ہوتی تھی۔ اس تجارت کی بدولت انھیں اچھی خاصی خوشحالی نصیب ہوئی۔ بالآخر ان کی بیشتر

نذر کو عظیم عیلامی فاتح خزار الاحمر نے شام اور عرب کی مہموں کے دوران ہلاک کر دیا۔ ان غار نشینوں پر جو اپنے سنگین مسکنوں میں رہ کر اپنے آپ کو خدا کے غضب سے محفوظ خیال کرتے تھے، جو ہولناک افتاد پڑی اس کا ذکر قرآن میں قریش کی تنبیہ کی غرض سے اکثر کیا گیا ہے۔

اس مصیبت کے بعد جو بنی ثمود بچ رہے وہ خلیج عیلام کے شمال میں جبل سعیر (Mount Seir) کے علاقے میں جا کر پناہ گزین ہوئے، جہاں ان کے آباؤ اجداد حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کے زمانے میں رہا کرتے تھے، لیکن بہت جلد وہ ہمسایہ قبیلوں میں جذب ہو کر معدوم ہو گئے اور ان کی جگہ ادومیوں نے لے لی جنھوں نے جبل سعیر پر کچھ مدت تک اپنا تصرّف جمائے رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالآخر عربوں کے ایک گروہ نے، جسے بنی قحطان نے یمن سے وہیں نکالا دیا تھا، ادومیوں کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ ڈیوڈورس سیکولس (Diodorus Siculus) کے زمانے میں یہ لوگ رومی فوجوں کو دستے مہیا کیا کرتے تھے۔

طسم، جدیس اور دوسرے چھوٹے قبیلے کسی ذکرِ خاص کے مستحق نہیں۔ اس لیے ہم ان سے قطع نظر کر کے بنی جرہم کا حال بیان کرتے ہیں، جو عرب العاربہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور جنھوں نے حجاز میں عمالقہ کو مغلوب اور ہلاک کر کے ان کی جگہ لے لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نام کے دو قبیلے تھے۔ ایک تو قدیم ترین قبیلوں میں سے اور بنی عاد کا ہمعصر تھا اور غالباً کوشی نسل سے تھا، دوسرا قحطان کی اولاد سے تھا، جس نے سخت خشک سالی کے زمانے میں یمن سے نکل کر حجاز پر قبضہ کیا اور عمالقہ کو وہاں سے ملک بدر کر کے خود ان کی املاک پر قابض ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنی جرہم نے جو قحطانی النسل تھے، اس وقت خروج کیا جب اسمٰعیلی نسل کے عربوں نے عمالقہ میں، جن کے ملک میں وہ مدتوں سے رہتے چلے آ رہے تھے، نمایاں حیثیت حاصل کرنی شروع کی۔ اسمٰعیلی عربوں نے حملہ آوروں سے سمجھوتہ کر لیا، اور کچھ مدت تک دونوں قومیں امن و امان سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ آلِ اسمٰعیل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بنی جرہم کا وادی پر

لہ کتاب پیدائش ۱۶۔ ۴ اور ۶

قبضہ ڈھیلا پڑتا گیا اور ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ حجاز اور تہامہ کی ولایتیں اولادِ ابراہیم کے ہاتھوں میں آ گئیں۔ مستعربہ عربوں کی ترقی شاہِ بابل کی یورش کے باعث چند سے رُک گئی، لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ابراہیمیوں نے بہت جلد اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کرلی اور حجاز، نجد اور عراق و بین النہرین کے ریگستانوں میں پھیل گئے جہاں انھوں نے قحطانیوں کو، جو ان کے پیش رو تھے، اپنے اندر جذب کرلیا۔

عرب المتعاربہ میں وہ قبیلے شامل تھے جو قحطان بن عابر کی اولاد سے تھے[1] اور جو زیادہ تر یمن میں مقیم تھے۔ قحطانی قبیلے عرب کے شمال مشرقی کونے سے داخل ہوئے تھے اور پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے جہاں وہ کچھ مدت تک تو کوشی النسل بنی عاد کے زیرِ سایہ بود و باش کرتے رہے اور پھر خود صاحبِ اقتدار بن گئے، لیکن قحطانی نسل کے باشندے صرف جنوبی عرب ہی میں نہ رہتے تھے۔ ان کا ابتدائی گہوارہ بین النہرین تھا۔ وہاں سے یمن میں نقلِ سکونت کرنے کے دوران انھوں نے جزیرہ نمائے عرب کے پورے طول کو عبور کیا ہوگا اور قدرتی طور پر اپنی کچھ بستیاں جابجا چھوڑ گئے ہوں گے۔

عرب مؤرخین کا خیال ہے کہ مہاجرین کی جو لہر اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں اُمڈ کر آئی اس کے سردار دو بھائی تھے، قحطان اور یقطان جو عابر اور حابر کے بیٹے تھے۔ اُن کے نزدیک یمن کا پہلا بادشاہ قحطان کا بیٹا یعرب تھا جس کے نام پر اس کے تمام جانشینوں کا بھی اور سارے جزیرہ نما کا بھی نام رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یعرب کے بعد اُس کا بیٹا یشجب تخت پر بیٹھا، جس نے ولایت کے قدیم دار الحکومت مارب کی بنیاد رکھی اور جو مشہور عبد الشمس ملقّب بہ سبا کا باپ تھا۔ اس لقب کے معنی ہیں "ملک گیر" اور یہ اسے اس کی فتوحات کے صلے میں دیا گیا۔ سبا کے اخلاف قحطانی نسل کے مختلف قبیلوں کے اسلاف بنے، جو عربی روایات میں مشہور ہیں۔ سبا کے دو بیٹے تھے حمیر (Himyar) جس کے معنی ہیں سُرخ[2]) اور کہلان (Kuhlân)۔ اوّل الذکر اپنے باپ کے تخت پر

---

[1] ابن الاثیر اُسے عابر یا غابر کہتا ہے۔

[2] وہ فراعنۂ مصر کی طرح سرخ چوغہ پہنا کرتا تھا۔

بیٹھا۔ اسی کے نام پر خاندانِ سبا کا نام حمیری پڑا۔[1] اُس کے اخلاف اور اُس کے بھائی کہلان کے اخلاف ظہورِ اسلام سے ایک صدی پہلے تک یمن پر باری باری حکمران رہے۔ عظیم بادشاہ ذوالقرنین اور مشہور ملکہ بلقیس، جو حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم گئی، دونوں اسی خاندان سے تھے۔[2]

لہ معلوم ہوتا ہے کہ یمن کے حمیری بادشاہ، جن کا لقب تبابعہ (Tobbas) تھا۔ قدیم الایام سے ایران اور بازنطین کے ساتھ راہ و رسم رکھتے تھے۔

۲ے ذوالقرنین کی شخصیت کے بارے میں بہت شبہات ہیں۔ بہت سے مسلم مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جس ذوالقرنین کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ سکندرِ مقدونی تھا، لیکن یہ خیال محلِ نظر ہے۔ "ذوالقرنین" کے اصلی معنی ہیں "دو سینگوں والا"۔ جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ قدیم سبائی بادشاہ ہلال کی شکل کا تاج پہنتے تھے، جو انھوں نے غالباً ذوالقرنین کے زمانہ میں فراعنۂ مصر سے مستعار لیا تو اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قرآن میں جو اشارہ ہے وہ کسی مقامی خاندان کے بادشاہ کی طرف ہے جس کی وسیع فتوحات کو آئندہ پشتوں کے تخیل نے بڑھا کر عالمگیر سلطنت بنا دیا۔

لنورماں (Lenormant) کا خیال ہے کہ شداد، ذوالقرنین اور بلقیس تینوں کوشی نسل کے تھے۔

حمیری بادشاہوں کی رعیت میں یہودیت کا بہت زور تھا۔ اگرچہ ۳۴۳ء میں شہنشاہ قسطنطین کے سفیر کی فرمائش پر شاہانِ یمن نے اپنی مملکت میں متعدد عیسائی گرجا بنانے کی اجازت دی۔ لیکن آبادی کا بیشتر حصہ قدیم سامی مذہب کا پیرو تھا۔

پانچویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب ذونواس نے خونخوار غاصب ذوشناتر (Zu-Shinatir) کو قتل کر کے یمن اور اس کی مقبوضہ ولایتوں پر تسلط جمایا۔ اس نے یہودیوں کے ایما پر، جن کے مذہب میں وہ داخل ہو چکا تھا، عیسائیوں پر جو مظالم کئے اُن کا انتقام اس سے بازنطینی شہنشاہ نے لیا۔ قسطنطنیہ کا اشارہ پا کر حارث کے زیرِ قیادت ایک حبشی لشکر یمن کے ساحل پر اُترا اور اس نے ذونواس کو قتل کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۵۲۵ء کا ہے۔ (باقی صفحہ ۶۱ پر دیکھیں)

بنی اسمٰعیل نے عرب میں جو ابتدائی بستیاں بسائیں اُن کے بارے میں روایات کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ کے کالدیا سے جلا وطن کیے جانے یا ترکِ وطن کرنے کے قصوں سے جا ملتا ہے۔ آلِ اسمٰعیل حجاز میں پھلتی پھولتی اور بڑھتی رہی۔ آخرکار بابل کے ہیبت آفریں بادشاہ بنوخذ نصر ــــ (بخت نصر) نے اُسے بھی اور اس کے ساتھ بنی جُرہم کو بھی مغلوب کر لیا، بلکہ تقریباً تباہ کر دیا۔ جتنے بادشاہوں نے عرب کے دل پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی اُن سب میں یہ اکیلا بادشاہ ہے جو اس پر ضربِ کاری لگانے میں کامیاب ہُوا۔ مکّۂ معظمہ کا سنگِ بنیاد غالباً اُسی زمانے میں رکھا گیا جب ابراہیمی عرب عربستان میں آکر آباد ہوئے، کیونکہ عرب روایات کے مطابق اس کا مؤسس ایک جُرہمی سردار مضاض ابن عمرو تھا، جس کی بیٹی نے عربِ مستعربہ کے جدِّ امجد حضرت اسمٰعیل سے شادی کی۔ اُسی زمانے میں کعبے کی تعمیر ہوئی، جس نے مکّے کو عرب کے باقی تمام شہروں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰ : تھوڑی مدت بعد (۵۲۷ء میں) ابرہہ الاشرم نے حارث کو قتل کیا اور حبشیوں کی طرف سے یمن کا وائسرائے مقرر ہُوا۔ اسی ابرہہ کی قیادت میں عیسائی حبشیوں نے حجاز کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یمن تقریباً نصف صدی تک حبشیوں کے تصرف میں رہا۔ بالآخر معدی کرب (M'adi Karib) نے جو اس مشہور سیف بن ذی یزن (Zu'l yezen) کا بیٹا تھا، جس کے شجاعانہ کارنامں کے گیت بادیہ نشین عرب آج تک گاتے ہیں، کسریٰ انوشیروان سے فوجی امداد لے کر حمیری خاندان کو ۵۷۳ء میں بحال کیا۔ جب ۵۹۷ء میں عیسائیوں نے معدی کرب کو ہلاک کر دیا، تو یمن پر ایران کی براہِ راست حکومت قائم ہوگئی اور دربارِ ایران کے مامور کیے ہوئے وائسرائے اس کے نظم و نسق کے مختار ہو گئے، انھیں مرزبان کے لقب سے پکارا جاتا تھا پہلا مرزبان وہرز (Wahraz) تھا۔ اس کے تحت یمن، حضر موت، مہرہ اور عمان سلطنتِ عجم میں شامل کر دیے گئے۔ آخری مرزبان باذان تھا، جسے خسرو پرویز نے ۶۰۶ء میں مامور کیا۔ یمن میں اسلام کی اشاعت باذان کے عہدِ مرزبانی میں ہوئی اور وہ خود بھی مشرف بہ اسلام ہُوا۔ ایرانیوں نے یمن پر بڑی نرمی سے حکومت کی۔ تمام مذاہب سے رواداری برتی جاتی تھی اور تمام قبیلوں کے شیخ مرزبان کے زیرِ نگرانی اپنے اپنے علاقوں میں اپنے اپنے دستوروں کے مطابق انصرامِ امور کرتے تھے۔

پر فوقیت بخش دی۔ کعبہ، جس کی تعمیر قدیم الایام میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ہوئی، ہمیشہ عرب قوم کا مقدس ترین معبد رہا ہے۔ اس میں تین سو ساٹھ بُت نصب تھے، گویا سال کے ہر دن کے لیے ایک بُت۔ اُن کے مرکز میں ہُبل تھا، جو سُرخ عقیق کا بنا ہُوا تھا۔ اس کے علاوہ غزالین تھے، ایک سونے کا اور ایک چاندی کا۔ اور تو اور، حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے بُت بھی تھے، یہاں سب قبیلوں کے لوگ ہر سال آتے تھے اور آکر سنگِ اسود کو بوسہ دیتے تھے، جو حضرت آدمؑ کے زمانے میں آسمان سے گرا تھا اور سرتاپا برہنہ ہوکر سات بار کعبہ کا طواف کرتے تھے۔"چنانچہ مکہ ابتدائی ایام سے نہ صرف عربوں کی مذہبی عقیدت کا مرجع بلکہ اُن کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ چونکہ وہ پُرانے زمانے کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اس لیے ہمسایہ ملکوں کی ساری دولت اور ثقافت اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔ بابلی فاتح کو بھی اس کی مقدرت نہ ہوئی کہ مکّے کی تجارتی خوشحالی کو کوئی نقصان پہنچا سکتا، کیونکہ عربوں کو جو جغرافیائی حیثیت حاصل تھی اس کی بدولت اقوامِ عالم کے اموالِ تجارت کا نقل و حمل خاص طور پر ان کے حصے میں آیا تھا۔

مکہ اس تجارتی سرگرمی کا مرکز تھا جس نے ہمیشہ عربوں کو دوسری ایشیائی اقوام سے ممتاز کیا ہے۔ مکّے سے وہ قافلے روانہ ہوتے تھے جو یمن اور شہرۂ آفاق ہندوستان کی پیداوار اور مصنوعات لے جاکر بازنطینی ولایتوں اور ایران میں پہنچاتے تھے اور شام سے ایرانی شہروں کے ریشمی کپڑے لاتے تھے۔ لیکن وہ صرف تجارتی مال ہی نہیں لائے، ان کے جلو میں عیش و عشرت کی وہ تمام عادتیں اور وہ تمام خرابیاں بھی آئیں جنھوں نے ہمسایہ سلطنتوں کو زنگ کی طرح کھالیا تھا۔ یونانی اور ایرانی کنیزیں، جو شام اور عراق سے لائی جاتی تھیں، نہ صرف رقص و سرود سے امیروں کے لیے مشغلۂ بیکاری مہیا کرتی تھیں بلکہ اُن کی نفسانی تسکین کا ذریعہ بھی بنتی تھیں۔ وہ شاعر جس کا کلام عربوں کا مایۂ افتخار ہے صرف موجودہ زندگی کی لذتوں کے گیت گاتا تھا اور لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کو شہ دیتا تھا۔ فکرِ فردا کسی کو نہ تھی۔

عرب اور بالخصوص اہلِ مکہ شراب، جوئے اور راگ رنگ کے دلدادہ و شیدا تھے۔ دوسرے ایشیائی ملکوں کی طرح عرب میں بھی ناچ اور گانا ادنیٰ طبقے کی عورتوں کا پیشہ تھا۔ جنھیں

قیان (Kiyan) بصیغۂ واحد قینۃ (Kayna) کہنے بجنے اور جن کی عصمت فروشی ضرب المثل تھی۔ اس کے باوجود ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی اور بڑے بڑے سرداراُن سے مفاخرانہ عشق بازی کرتے تھے[۱] ہندوؤں کی طرح عربوں میں بھی تعدد ازواج بے حد و حساب تھا۔ ماں کے سوا ہر بیوہ متوفی کے وارثوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور لڑکے کے استعمال میں لائی جاتی تھی۔ نوزائیدہ بچیوں کو دفن کر دینے کا نفرت انگیز اور انسانیت سوز دستور بھی عام تھا۔

یہودیوں کو جنہیں اشوریوں، یونانیوں اور رومیوں نے یکے بعد دیگرے گھر سے بے گھر کیا تھا، عربوں کے یہاں امان مل گئی تھی۔ لیکن وہ اپنے ساتھ اپنا مذہب ہی نہ لائے تھے۔ بلکہ عربدہ جوئی کی وہ فطرت بھی جو اُن کی مصیبتوں کا سب سے بڑا سرچشمہ تھی۔ بہرحال انھوں نے عربوں میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا تھا، چنانچہ جب حضرت محمدؐ نے تبلیغ اسلام شروع کی تو اس وقت کہلان کے دو بیٹوں حمیر اور کِندہ کے جانشینوں میں سے ایک مقتدر گروہ یمن میں اور دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر (Nazir) جو بنی اسمٰعیل میں سے تھے، لیکن قدیم الایام سے عرب میں بود و باش کر رہے تھے، خیبر اور یثرب میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ نسطوریوں اور جیکبی عیسائیوں نے بھی بستیاں بسا رکھی تھیں، ان دو حریف مذہبوں میں عرب پر تسلط حاصل کرنے کی خاطر جو کش مکش رہتی تھی، وہ جزیرہ نما کے سب سے زرخیز صوبوں میں خونریز لڑائیوں کا موجب

---

[۱] لوگوں کی اخلاقی ذلت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے گھروں میں ضیافتیں دیا کرتی تھیں جن میں شہر کے رؤسا و اُمراء شامل ہوتے تھے۔

شہری عرب قمار بازی کے اتنے شوقین تھے کہ ٹیسی ٹس جن جرمنوں کا تذکرہ کرتا ہے، اُن کی طرح وہ اپنی آزادی بھی بد دیا کرتے تھے۔ یہ اُن بُرائیوں کی وجہ سے اور اُن کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں وابستہ تھیں اُن کی وجہ سے تھا کہ حضرت محمدؐ نے اپنے پیروؤں پر جوئے، ناچ اور شراب خوری کو حرام کر دیا۔

بنتی رہتی تھی[1] ربیعہ ابن نزار کی نسل کے چند خاندان، مثلاً بنی تغلب جو بین النہرین میں اور بنی عبدالقیس جو بحرین میں آباد تھے، عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ نجران میں بنی حارث ابن کعب، عراق میں بنی عباد، شام میں آلِ غسان اور خزاعہ، دومۃ الجندل میں اور بنی کلب اس کے پیرو بن چکے تھے۔ جو قبیلے فلسطین اور مصر کے درمیان کے ریگستانوں میں بادیہ گردی کرتے رہتے تھے اُن میں سے بعض بھی اس کے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ مجوسیت اور صابیت کے نام لیوا بھی عربوں اور بالخصوص آلِ حمیر میں موجود تھے۔ بنی اسد عطارد کے، بنی جہم مشتری کے، بنی طے سہیل کے اور قیس عیلان کے جانشین شعریٰ کے پجاری تھے۔ قریش کے چند گروہ تین چاند دیویوں، لات، منات اور عزّیٰ کو پوجتے تھے اور انھیں بنات اللہ تصور کرتے تھے۔ مکّہ اس وقت دُور دُور تک پھیلی ہوئی بُت پرستی کا مرکز تھا، جس کی شاخیں جزیرہ نمائے عرب کے ہر قبیلے میں پائی جاتی تھیں۔ کنانہ، جو قریش سے خون کا رشتہ بھی اور سیاسی اتحاد بھی رکھتے تھے، ستارۂ الدبران کے علاوہ عزّیٰ کی پرستش کرتے تھے جو مکّے سے ڈیڑھ دن کی مسافت پر ایک مقام نخلہ کے ایک درخت میں مجسّم تصور کی جاتی تھی۔ ہوازن، جو مکّے کے جنوب مشرق میں بادیہ گردی کرتے پھرتے تھے، لات دیوی کی پوجا کرتے تھے، جس کا بُت طائف میں نصب تھا۔ منات کو ایک چٹان میں مجسّم سمجھا جاتا تھا جو مکّہ اور شام کے درمیان کی سڑک کے کنارے تھی۔ ان بُتوں کی پرستش میں زیادہ تر لِنگ پُوجا کی رسومات پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ قدیم سامیوں، فنیقیوں اور بابلیوں کی پُوجا سے بڑی مشابہت رکھتی تھی۔ لیکن بیشتر عرب بالخصوص آلِ مضر کے لوگ، ایک نہایت ذلیل قسم کی بُت پرستی کے عادی تھے۔ جانور، پودے، غزال، گھوڑا، اُونٹ، کھجور کا درخت، چٹانیں، پتھر، یہ سب چیزیں اُن کی معبود تھیں۔ بہرحال وہ ایک خدائے بزرگ و برتر کے تصور سے بھی ناآشنا نہ تھے، لیکن یہ تصور محدود سے چند لوگوں تک محدود

---

[1] ابن الاثیر۔ جلد اوّل صفحہ ۳۰۸۔

Gibbon, *Decline and Fall of the Roman Empire*, vol. vi, pp 114,115, Caussin de Perceval *Hist des Arabs*, vol. i, pp. 128-131

تھا جنھوں نے بت پرستی کی غلامی سے بیزار کر کے ایک قسم کا فلسفیانہ تشکک اختیار کیا جس میں اُن کے ہمسایوں، صابیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کے قصے کہانیوں کے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ اس محدود طبقے کے بعض لوگ ربّ الاعلیٰ کے صراحتہً قائل تھے اور اپنے زمانے کی فحاشیوں اور مادہ پرستی سے متنفر ہو کر کسی نجات دہندہ کے لیے چشم براہ تھے جس کے جلد آنے کا ان کے دل میں یقین تھا۔

بعض قبیلوں میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کی قبر پر ایک اونٹنی ذبح کی جاتی یا بے آب و دانہ باندھ دی جاتی تاکہ بھوک اور پیاس کے مارے مرجائے۔ یہ اس عقیدے کی بنا پر کیا جاتا کہ اونٹنی مرے ہوئے شخص کی آئندہ زندگی میں اس کی سواری کا کام دے گی۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ روح جسم سے جدا ہو کر ایک پرندے کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ جسے وہ ہامہ یا صدیٰ کہتے تھے۔ اگر مرا ہوا شخص کسی کے ہاتھوں قتل کیا گیا ہوتا تو جب تک قتل کا قصاص نہ لیا جاتا پرندہ مقتول کی قبر کے اوپر اسقونی اسقونی کہتا ہوا منڈلاتا رہتا تھا۔ جنوں اور غولوں پر ایمان اور بتوں کے ذریعے غیب کی اطلاعات حاصل کرنے پر عقیدہ عام تھا۔ بتوں سے تیروں کے ذریعے بشارت لی جاتی تھی، جنھیں ازلام اور قداح کہتے تھے۔ ہر قبیلے کا جدا بت اور جدا بت خانہ تھا۔ ان بت خانوں میں جو پروہت ہوتے تھے انھیں بیش بہا ہدیے دیئے جاتے تھے، اور مختلف بت خانوں کے پرستاروں کے درمیان اکثر خونریز چپقلشیں ہوتی رہتی تھیں[۱]۔

لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل کا معبد، یعنی کعبہ، سب قبیلوں کے نزدیک سب سے زیادہ عظمت رکھتا تھا۔ یہودی اور صابی بھی کعبے پر نذریں چڑھاتے تھے[۲]۔

---

[۱] سب سے مشہور بتکدے یہ تھے:۔ یمن میں بنی خثعم کا ذوالخلاصہ، نجد میں بنی ربیعہ کا رَوضہ، عراق میں ذوالسبات اور ساحلِ بحر کے قریب قدید کے مقام پر منات کا مندر، جس میں اوس اور خزرج کے قبیلے قدیم جو یثرب میں آباد تھے، اپنے دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔

[۲] جمہور، جلد اوّل، مقدمہ۔

اس عبادت گاہ کی تولیت قبائل میں بڑی رقابت کا موجب تھی، کیونکہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے اعزازات اور خصوصی حقوق وابستہ تھے جن کی عربوں کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ولادت کے وقت آپؐ کا خاندان کعبے کا متولی تھا اور آپؐ کے دادا اس کی مملکت کے رئیس تھے۔ انسانی قربانیوں کا دستور عام تھا۔ کعبے میں جو خاص خاص بُت نصب تھے ان کے علاوہ ہر خاندان کا ایک علیحدہ بُت تھا جس کی عبادت کی رسوم سخت پابندی سے ادا کی جاتی تھیں۔

یہ تھی عربوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت۔ نہ یہودیت اور نہ عیسائیت ان میں انسانی خوبیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میور (Muir) کہتا ہے: "اگرچہ عیسائیت کی تبلیغ پانچ صدیوں سے ہو رہی تھی، تاہم عیسائیوں کے صرف اکّا دُکّا گروہ کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے، یعنی بنی حارث نجران میں، بنی حنیفہ یمامہ میں، بنی طے کے چند خاندان تیما میں، اور بس۔ یہودیت نے بھی، جو عیسائیت سے کہیں زیادہ طاقتور تھی، ذو نواس کے تحت وقتاً فوقتاً لوگوں کو اپنے دائرے میں داخل کرنے کی غیر مستقل سی کوششیں کی تھیں، لیکن اب اس کی تبلیغی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مختصر یہ کہ اگر اس کے مذہبی منظر کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیت کی ضعیف کوششوں نے عربی زندگی کے سمندر کی سطح پر صرف خفیف سے ہلکورے پیدا کئے تھے۔ یہودیت کے نسبتاً زیادہ قوی اثرات ایک زیادہ گہرے اور زیادہ ہیجانی دھارے کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن مقامی بت پرستی اور اسمٰعیلی توہم پرستی کا سیلاب جو ہر سمت سے اُٹھ کر لگاتار اُمڈتا ہوا کعبے کی طرف رواں دواں رہتا تھا اس امر کی وافر شہادت بہم پہنچاتا ہے کہ کعبے کے مذہب اور طریقِ عبادت نے نفسِ عربی کو مضبوطی سے اور حتمی طور پر اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔"[1] قبیلوں کے باہمی نفرتوں اور رقابتوں[2] نے اور مذہبی اور نسلی اختلافات کے پیدا کئے ہوئے

---

[1] میور۔ جلد اوّل۔ مقدمہ

[2] یہ قبائلی خلاصے اور خاندانی جھگڑے، جن کا مفصل بیان آگے چل کر آئے گا، عرب شہنشاہی کی بربادی کا باعث بنے۔

مخاصمانہ جذبات نے جو ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے کے خلاف آمادۂ پیکار رکھتے تھے، اشوریوں، بابلیوں یونانیوں اور ایرانیوں کو شمال، جنوب، مشرق اور جنوب مغرب میں مختلف اقطاع پر متصرّف ہونے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ حبشی تو یہاں تک آگے بڑھ آئے تھے کہ انھوں نے کعبے کو مسمار کرنے کے ارادے سے حجاز پر حملہ بھی کر دیا تھا۔ لیکن عبدالمطلب کی حب الوطنی نے کعبے کے سامنے ان کی طاقت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ بیس سالوں تک انھوں نے یمن کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنایا۔ اس کے بعد ایک مقامی حکمران، یعنی نامور سیف ذوالیزن کے بیٹے نے انھیں ایران سے امداد لے کر یمن سے نکالا۔ جب اس حکمران کو عیسائیوں نے قتل کر دیا تو اس کی ریاست، جس پر وہ انوشیروانِ عادل کے زیرِ سایہ حکومت کر رہا تھا، ایرانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی اور یمن شہنشاہ ایران کا باجگزار بن گیا۔[1]

قسطنطنیہ اور ایران کی سلطنتوں نے عرب کے مختلف خطّوں پر جو تسلّط قائم کر رکھا تھا اس کے علاوہ دو سب سے بڑے عرب حکمران، یعنی غسّان اور حیرہ کے بادشاہ، قیصروں اور خسرودں کے باجگزار تھے، اور ان بے سود اور بے مقصد جنگوں میں جو ایرانیوں اور بازنطینیوں نے آپس میں لڑیں اور جن کی خاطر انھوں نے اپنی رعایا کا خونِ زندگی چوس لیا اہلِ غسّان اور اہلِ حیرہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا یا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے۔ اگرچہ بالعموم زرتشتی عیسائیوں کی بہ نسبت زیادہ حق بجانب تھے۔[2]

جزیرہ نمائے عرب کی آبادی نے یوں جن مختلف النوّع عناصر سے ترکیب پائی تھی

---

[1] ابن الاثیر، جلد اوّل، طبری، Caussin de perceval, vol. i. p. 138

[2] یمن، بحرین اور عراق کے شہری ایرانیوں کے تابع فرمان تھے۔ ان ملکوں کے بدو کسی کا حکم نہ مانتے تھے۔ شام کے عرب رومیوں کے مطیع تھے۔ بین النہرین کے عرب کبھی بازنطینیوں کے اور کبھی ایرانیوں کے۔ وسطی عرب اور حجاز کے بدو، جن پر حمیری بادشاہ موثّر طور پر حکومت کرتے رہے تھے، برائے نام ایرانیوں کے زیرِ اقتدار آ گئے تھے، لیکن فی الواقعہ وہ آزاد تھے۔

انھوں نے ملک کی لوک کہانیوں میں بے انتہا تنوّع پیدا کر دیا ہے۔ غیر متمدّن قوموں میں ہمیشہ یہ رُجحان ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو قصے کہانیوں کا جامہ پہنا تے ہیں۔ ان کا تخیل دُور کی چیزوں کو نہ صرف خوشنما رنگوں میں رنگ دیتا ہے بلکہ انھیں اصل سے بڑا بھی بنا دیتا ہے اور اگر کسی قوم کا تمدن بھانت بھانت کے تمدّنوں کا مرکّب ہو تو اس میں ایسی لاتعداد کہانیاں رائج ہو جاتی ہیں جو کم وبیش واقعات پر مبنی ہوتی ہیں۔ یمن اور جنوب مغربی خطّوں میں جو حامی لوگ آکر آباد ہوئے، وہ خالص سامی جوان کے عقب میں آئے جیسے آریہ لوگ مشرق میں آئے تھے، یہودی، عیسائی سب یہ اپنی اپنی روایات، اساطیر اور داستانیں ساتھ لے کر آئے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ماضی کی ان باقیات میں ایک طرح کی مطابقت پیدا ہو گئی۔ لیکن وہ بظاہر چاہے کتنی ہی بے بنیاد معلوم ہوں، اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی سطح کے نیچے ہمیشہ واقعات کی ایک تہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً شدّاد اور اس کے باغِ ارم کی بابت جو قصہ مشہور ہے اس کے دُھندلے آئینے میں ہمیں ایک زبردست سلطنت کا عکس نظر آتا ہے جس نے مصر کو بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ یہ سلطنت ایک دولت مند قوم کی سلطنت تھی جس نے شاندار عمارتیں بنائیں جس کی تہذیب کالدیہ کی تہذیب سے مشابہ اور ترقی یافتہ تھی اور جس کا مذہب بابل کے مذہب سے ملتا جلتا تھا۔ اس قوم کی مادّی ترقی کے پہلو بہ پہلو شدید قسم کی اخلاقی خرابیاں اور فحش رسوم تھیں[1]۔ اسی طرح قومِ عاد اور قومِ ثمود کی تباہی کے بارے میں جو نیم افسانوی اور نیم تاریخی روایات ہیں۔ اُن میں ہمیں اشوریوں اور عربوں، یعنی سامیوں کے سیلاب کے ہاتھوں نسلِ حامی کی تباہی کا نقشہ دکھائی دیتا ہے[2]۔

آلِ یعقوب جب اپنے بے پناہ دشمنوں سے بھاگ کر جزیرہ نمائے عرب میں آئی تو اپنے قصے اور روایات اپنے ساتھ لائی جنھوں نے عربی لوک کہانیوں میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا۔ سامی مہاجرین میں سے جو لوگ سب سے اخیر میں آئے وہ اپنے آپ کو اولادِ ابراہیم کہتے تھے اور ان کے

---

[1] Lenormant, *Ancient History the East*, vol. ii, p. 296

[2] ابن الاثیر۔ جلد اوّل۔

ہمسائے بھی اس امر کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ اعتقاد پشت بہ پشت روایتہً چلا آرہا تھا اور اس نے ایک مسلّمہ امر کی صورت اختیار کر لی تھی۔

جب مانوی مذہب کے پاؤں ایران اور بازنطین سے اُکھڑ گئے تو اس نے بھی سرزمینِ عرب کا رُخ کیا۔[۱] اس آزاد ملک میں دوسیتیوں (The Docetes) مارشونیوں (The Marcionites) ولنیتنیوں (The Valentinians) سب کے نام لیوا موجود تھے۔ ان سب نے اپنے خیالات اور اپنی روایات کی اشاعت کی، جو رفتہ رفتہ مقامی خیالات و روایات کے ساتھ خلط ملط ہو گئیں۔ یہ عیسائی فرقے تقلید پرستوں کے جبر و تشدد کے باوجود اس عقیدے پر مضبوطی سے قائم تھے کہ حضرت عیسیٰؑ خدائے مجسم یا کم از کم خدا کے بیٹے اور خدا کا کلام تھے، جس نے ابدیت کے بطن سے جنم لیا اور جو نورِ عرش کا ایک صدور تھا اور جس کا صلیب پر مر جانا محالات میں سے تھا۔ ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ رنج و کرب کے وہ کلمات جو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں ہرگز ان کے لب پر نہیں آسکتے تھے۔ مختصر یہ کہ جس شخص نے صلیب پر کھینچے جانے کی اذیت سہی وہ خداوند عیسیٰ نہ تھا اور حضرت عیسیٰؑ جلادوں کے ہاتھوں سے بچ کر عرشِ بریں پر واپس چلے گئے۔[۲] یہ نظریہ بظاہر چاہے کتنا ہی مستبعد کیوں نہ لگتا ہو، پھر بھی حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے کے عقیدے سے نسبتہً زیادہ مطابقت رکھتا ہے اور چند مضبوط قیاسات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ پلاطس (Pilate) کی، جس کی بابت ٹرٹلین (Tertullian) کہتا ہے کہ وہ درپردہ عیسائی تھا، یہ زبردست خواہش کہ حضرت عیسیٰؑ کی جان کسی طرح بچالے[۳] ہیرودیس (Herod) کا اس پر آمادہ نہ ہونا کہ

---

۱ Beausobre, *Hist. du Manicheisme*, pt i.i ii. chap. iv

۲ Mosheim and Gibbon, *in loco*

۳ Blunt, History of the Christian Church, p. 138

نبیِ ناصری کے قتل سے اپنے خلاف نفرتِ عام کو اور بڑھائے، جب یہ عظیم محسنِ انسانیت دن بھر کے ہولناک ہنگاموں کی تکمیل کی خاطر صلیب کی طرف لایا گیا تو اس وقت جو جھٹ پٹا چھایا ہوا تھا، وہ خارقِ عادت تاریکی جو اس ڈرامے کے سب سے دہشت ناک منظر کے وقت روئے ارض پر طاری تھی[1] یہ سب حالات و واقعات اس عقیدے کو قرینِ قیاس بنا دیتے ہیں کہ معصوم بچ گیا اور مجرم نے سزا پائی[2]۔

ظہورِ محمدیؐ سے پہلے یہ روایات، جو واقعات پر مبنی تھیں لیکن خیالی رنگوں میں رنگی گئی تھیں؛ لوگوں کے عقائد میں مضبوطی سے گھر کر چکی ہوں گی اور ملک کی لوک کہانیوں کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہوں گی۔ جب حضرت محمدؐ نے تبلیغِ اسلام شروع کی تو آپؐ نے ان روایات کو عرب کے لوگوں میں متداول پایا۔ آپؐ نے انھیں لے کر عربوں اور قرب و جوار کی قوموں کو معاشرتی اور اخلاقی پستی کے اس گڑھے سے نکالنے کی خاطر جس میں وہ گرے ہوئے تھے ایک بیرم کے طور پر استعمال کیا۔ وہ نور جو طورِ سینا میں چمکا تھا، وہ نور جس نے گلیلی کے کسانوں اور ماہی گیروں کی زندگیوں کو روشن کر دیا تھا، اب فاران کی چوٹیوں پر جلوہ نما ہوا[3]۔

---

[1] Milman, Hist. of Christianity vol. pp. 398-362

[2] اگر اس عجیب و غریب عقیدے کو کوئی چیز اس سے بھی زیادہ قرینِ صحت بنا سکتی ہے تو وہ کتاب لوقس کا یہ بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ نے قبر سے اٹھنے کے بعد اپنے شاگردوں کو اس کی اجازت دی کہ وہ ان کے جسم کو چھو کر اپنی تسلی کر لیں کہ وہ فی الواقعہ زندہ ہیں اور جیسا کہ وہ خیال کئے ہوئے تھے، محض ایک روح نہیں ہیں اور پھر انھوں نے کچھ کھانے کو مانگا اور ایک اُبلی ہوئی مچھلی اور شہد کھایا۔

[3] "جاء اللہ من سینا و اشرق من ساعیر و استعلیٰ من فاران"

یاقوت "معجم البلدان" میں لکھتا ہے، "ساعیر فلسطین کی اور فاران مکے کی ایک پہاڑی ہے"۔

پہلا حصہ

پیغمبر اسلام

پہلا باب

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم

بلغ العلیٰ بکمالہٖ　　کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ　　صلّوا علیہ وآلہٖ

یہ چار مصرعے، جن کا حُسنِ بیان ترجمے کا متحمل نہیں ہو سکتا، اُس انسان کی سیرتِ عالیہ کی توصیف میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیتے جس کی زندگی، کارگزاریوں اور تعلیمات کا ذیل کے صفحات میں بیان کرنا ہمیں منظور ہے۔ساتویں صدی کی ابتدا ہے۔ایک خاموش اور غور و فکر میں منہمک شخص، جس کی عمر کا آفتاب نصف النّہار سے قدرے تجاوز کر چکا ہے، عربی لبادہ کندھوں پر ڈالے اور طیلسان کو چہرے پر جھکائے اکثر مکّے کے بازار میں سے گزرتا ہُوا دکھائی دیتا ہے کبھی تو وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے اور کبھی تیز تیز، لیکن دونوں صورتوں میں وہ نہ تو آنے جانے والوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے اور نہ اپنے اردگرد کے لہو ولعب کے مناظر کی طرف متوجہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی خیالات میں مگن رہتا ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی اسے سلام کرے تو وہ اس کا جواب دینے سے کبھی نہیں چوکتا، اور نہ کبھی وہ اُن چھوٹے چھوٹے بچّوں سے محبت و شفقت کی دو باتیں کرنے سے دریغ کرتا ہے جو بڑے شوق سے آ آ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔یہ "الامین" ہے۔اس نے اپنی زندگی ایسی خودداری اور محنت و ریاضت سے گزاری ہے کہ اس کی قوم نے اُسے یہ باعزت خطاب دے رکھا ہے،

لیکن اب اس کی عجیب وغریب تعلیم کے باعث اس کے شہر کے لوگ اسے بدگمانی کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک دور از کار باتیں سوچنے والا خبطی ہے، ایک انقلاب پسند دیوانہ ہے، جو معاشرے کی قدیم امتیازی حدود و فاصل کو ہموار کر دینا چاہتا ہے، ان کی پشتینی مراعات ان سے چھین لینا چاہتا ہے اور ان کے قدیم دین و مذہب اور رسم و رواج کو ان سے چھڑا دینا چاہتا ہے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس زمانے میں مکّہ اپنے تاریخی پس منظر اور اپنی جائے وقوع دونوں کے اعتبار سے عرب کے شہروں میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ مکّہ ایک نشیبی بستی میں واقع تھا، جو شمال سے جنوب کی طرف پھیلتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اس کے مغرب کی جانب پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا اور مشرق کی جانب سنگِ خارا کی اونچی اونچی چٹانیں۔ اپنی مرکزی عمارت یعنی کعبہ، اپنے باترتیب اور پتھر کے فرش والے گلی کوچوں، اپنے قلعہ بند مکانوں اور اپنے دارالندوہ کی بدولت شہر خوشحالی اور مضبوطی کا ایک غیر معمولی منظر پیش کرتا تھا۔ خانۂ کعبہ کی تولیت، جو دراصل اولادِ اسماعیل کا موروثی حق تھی، اہلِ بابل کے حملے کے بعد جرہمیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی۔ دینی اور دنیوی اقتدار کے اجتماع نے بنی جرہم کے سرداروں کو یہ درجہ بخش دیا تھا کہ انھوں نے ملِک کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی کے اوائل میں ایک قحطانی قبیلے نے جس کا نام بنی خزاعہ تھا، یمن سے اٹھ کر مکّہ اور حجاز کے جنوبی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور بنی جرہم کے اقتدار کو ختم کر دیا تھا۔ اسی مدت میں بنی اسماعیل جنھوں نے شاہِ بابل کے ہاتھوں بے انتہا اذیتیں سہی تھیں، آہستہ آہستہ اپنی سابقہ قوت از سرِ نو حاصل کر رہے تھے۔ خاندانِ اسمٰعیل کے ایک فرد عدنان نے جن کا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہے، اپنے جدِّ امجد کی طرح جرہمی سردار کی لڑکی سے شادی کی تھی اور مکّے ہی میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ عدنان کے بیٹے معدّ حجاز و نجد میں آباد ہونے والے بنی اسماعیل کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ معدّ کے ایک جانشین فِہر جن کا لقب قریش اور جن کا زمانہ تیسری صدی عیسوی تھا، اس قبیلے کے بانی تھے جس میں عرب کا پیغمبر اور شارع پیدا ہوا۔

بنو خزاعہ دو صدیوں سے کچھ زیادہ مدت تک خانۂ کعبہ کے متولّی اور اس منصب سے جو

بزرگی اور فضیلت متعلق تھی اس کے مالک رہے۔ بنو خزاعہ کے آخری سردار حُلیل کی وفات پر فہر کے ایک جانشین قصی[1] نے، جو حُلیل کے داماد تھے، بنو خزاعہ کو مکّے سے نکال دیا اور شہر کے سارے دینی اور دنیوی اقتدار پر قابض ہو گئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ حقیقی معنوں میں حجاز[2] کے حکمران بن گئے۔ اب ہم مصدقہ تاریخی واقعات کی اقلیم میں داخل ہوتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ قصی پانچویں صدی عیسوی کے لگ بھگ مکّے پر قابض ہوئے۔ انھوں نے فوراً شہر کے نظم و نسق میں باقاعدگی پیدا کرنے کی طرف توجہ دی۔ قصی کے زمانے تک قریش کے مختلف خاندان شہر کے مختلف حصوں میں متفرق طور پر رہا کرتے تھے۔ ان کی آبادیاں کعبہ سے کافی فاصلے پر تھیں، اور ان کے دلوں میں کعبہ کا جو انتہائی احترام تھا اس کے باعث وہ اس کے قرب و جوار میں رہنے سہنے کے مکانات بنانے سے احتراز کرتے تھے۔ اس غیر محفوظ حالت میں ہونے کی وجہ سے قومی معبد جن خطرات سے دوچار تھا انھیں محسوس کر کے قصی نے قریش کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ کعبے کے آس پاس متیم ہو جائیں، لیکن اس کے چاروں طرف طواف کے لیے کافی جگہ چھوڑ دیں۔ جن خاندانوں کو کعبے کے قرب و جوار میں سکونت کے لیے زمین دی گئی انھوں نے اپنے لیے مستحکم قلعہ بندیاں تعمیر کیں۔

قصی نے اپنے لیے ایک محل تعمیر کیا، جس کا دروازہ صحنِ کعبہ کی طرف کھلتا تھا۔ اس محل کا نام تھا دارالندوہ[3] اور اس میں قصی کے زیرِ صدارت امورِ عامہ پر بحث کی جاتی تھی اور ان کے متعلق

---

[1] قصی فہر کی پانچویں پشت میں تھے، ان کی پیدائش ۳۹۸ء کے لگ بھگ ہوئی۔ لفظ قریش "قرش" سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں تجارت کرنا۔ فہر اور ان کی اولاد کا پیشہ تجارت تھا۔

[2] بنو خزاعہ کا ذکر اس کے بعد ہم اس وقت سنتے ہیں جب قریش نے رسولِ خدا کے خلاف ان سے امداد طلب کی۔

[3] یہ عمارت جس کی تجدید متعدد مرتبہ از سرِ نو ہوئی بالآخر اموی خلیفہ عبدالملک ثانی کے عہد میں ایک مسجد کی شکل میں تبدیل کر دی گئی۔

احکام جاری کئے جاتے تھے۔ اس میں چالیس سال سے کم عمر کا کوئی شخص داخل ہونے کا مجاز نہ تھا، البتہ قصی کے جانشین اس شرط سے مستثنیٰ تھے۔ تمام ملکی معاملات کا انصرام اسی دارالندوہ میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب قریش کسی جنگی مہم پر روانہ ہونے لگتے تھے تو یہیں انھیں قصی کے ہاتھ سے پرچمِ جنگ ملتا تھا۔ قصی اپنے ہاتھوں سے ایک نیزے کے سرے پر سفید کپڑا باندھ دیتے تھے اور پھر نیزہ یا تو خود قریش سرداروں کے حوالے کر دیتے تھے یا اپنے کسی بیٹے کے ہاتھ بھیج دیتے تھے۔ یہ رسم جو عقد اللوا کہلاتی تھی اُس وقت سے لے کر جب قصی نے اس کی ابتدا کی عرب سلطنت کے اختتام تک جاری رہی۔ قصی کا جاری کیا ہوا ایک اور دستور اس سے بھی زیادہ مدت تک قائم رہا۔ انھوں نے قریش پر ان غریب حاجیوں کے لیے جو ہر سال زیارت کعبہ کے لیے آتے تھے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی ضرورت واضح کی اور انھیں ان کے فرائضِ میزبانی جتا کر ایک سالانہ ٹیکس یا چندہ ادا کرنے پر آمادہ کیا، جس کا نام 'رفادہ' رکھا گیا اور جو ایام المنیٰ[1] میں غریب زائرینِ کعبہ کو کھانا کھلانے پر صرف کیا جاتا تھا۔ ایام المنیٰ سے مراد تھی قربانی کا دن اور اس کے بعد کے دو دن جو مقام منیٰ پر گزارے جاتے تھے۔ یہ دستور اسلام کی آمد کے بعد بھی جاری رہا۔ خلفاء اور ان کے بعد سلاطین کے نام پر جو کھانا ہر سال دورانِ حج مقام منیٰ پر تقسیم کیا جاتا تھا اس کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ ندوہ، لِوا اور رفادہ کے الفاظ ان وظائفِ منصبی پر دلالت کرتے ہیں جو قصی ادا کیا کرتے تھے یعنی قومی مجلس کا انعقاد، اور اس کی صدارت، جھنڈا عطا کرنا جو فوج کی سرداری کا نشان ہوتا تھا اور زائرینِ حرم کو خوراک مہیا کرنے کے لیے ٹیکس وصول کرنا۔ ان مناصب کے علاوہ چند اور فرائض بھی قصی کے سپرد تھے، مثلاً مکے اور اس کے گرد و نواح میں جو کنوئیں تھے ان کے پانی کی تقسیم (سقایہ)، خانہ کعبہ کی کلید برداری (حجابہ)، اور رتیانِ کعبہ سے استخارے کی خدمت۔

(سجادہ۔ مترجم)

یوں قصی نے تمام بڑے بڑے دینی، ملکی اور سیاسی مناصب اپنی ذات میں مجتمع کر رکھے

---

[1] منیٰ مکے کے نواح میں ایک مقام کا نام ہے۔

تھے۔ وہی بادشاہ تھے، وہی منصفِ اعلیٰ تھے اور وہی سب سے بڑے مذہبی پیشوا تھے۔ ان کے اقتدار نے، جو تقریباً شاہانہ تھا، قریش کے نام کو، جن کے وہ مسلّمہ طور پر سردار تھے، چار چاند لگا دیئے اور انھیں کے زمانے سے قریش نے بنی اسمٰعیل کے دوسرے قبائل پر ایک نمایاں تفوق حاصل کیا۔

قصی نے طویل عمر پائی اور سنہ ۴۸۰ء کے قریب فوت ہوئے۔

انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے عبد الدّار کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی وفات پر عبد الدّار پُرامن طریقے سے اور کسی مزاحمت کے بغیر اپنے باپ کے منصبِ اعلیٰ پر فائز ہو گئے۔ لیکن عبد الدّار کی وفات پر ان کے پوتوں اور ان کے بھائی عبد مناف کے بیٹوں کے درمیان سخت تنازعات برپا ہو گئے۔ مختلف قبیلے اور اُن کے حلیف اور ہمسائے دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ بہرحال ان تنازعات کا عارضی طور پر صلح صفائی سے فیصلہ ہو گیا۔ مفاہمت اس بنیاد پر ہوئی کہ "سقایہ" اور "رفادہ" کے مناصب عبد مناف کے بیٹے عبد الشمس کو سونپ دیئے جائیں اور "حجابہ" "ندوہ" اور "لوا" عبد الدار کے خاندان ہی میں رہیں۔ عبد الشمس نے، جو نسبتاً غریب آدمی تھے، وہ مناصب جو ان کے حصے میں آئے تھے، اپنے بھائی ہاشم کے حوالے کر دیئے جو عزت و جاہ اور مال و دولت کے لحاظ سے قریش میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔

قصی نے حاجیوں کی مالی اعانت کے لیے قریش پر جو ٹیکس عائد کیا تھا اب اُسے ہاشم وصول کرنے لگے۔ اس ذریعے سے جو آمدنی ہوتی تھی اس میں اپنے مال و جنس کو شامل کر کے وہ ان غریب الدّیار لوگوں کے لیے جو ہر سال حج کے موسم میں مکّے میں جمع ہوتے تھے خورد و نوش کا انتظام کرتے تھے۔

اکثر اہلِ مکّہ کی طرح ہاشم بھی تجارت کرتے تھے۔ قریش میں اس دستور کی بنا انھیں نے رکھی تھی کہ مکّے سے باقاعدہ طور پر دو کاروان روانہ کیے جائیں، ایک سردیوں میں یمن کی طرف اور دوسرا گرمیوں میں شام کی طرف۔ ہاشم نے شہرِ غزہ میں سنہ ۵۱۰ء کے قریب وفات پائی، اور اپنی اولاد میں ایک اکلوتا بیٹا چھوڑا، جس کا نام شیبہ تھا اور جو ایک یثربی خاتون سلمٰی کے بطن

سے تھا۔ ان کے انتقال کے بعد 'رفادہ' اور 'سقایہ' کے انتظامات ان کے چھوٹے بھائی مطلب کے ہاتھ آئے جنھوں نے اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت حاصل کر رکھی تھی اور جو اپنی بزرگی اور فیاضی کے باعث 'الفیض' کے خطاب سے سرفراز تھے۔ مطلب، شیبہ[1] کو یثرب سے مکے لے آئے۔ اہلِ مکہ نے شیبہ کو غلطی سے مطلب کا غلام سمجھ لیا اور انہیں عبدالمطلب (مطلب کا غلام) کہنے لگے۔ چنانچہ تاریخ پیغمبرِ اسلام کے دادا کو عبدالمطلب کے سوا کسی دوسرے نام سے نہیں جانتی۔[2]

مطلب نے ۵۲۰ء کے آخر میں یمن کے شہر غزدان میں وفات پائی اور ان کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب مکے کی جمہوری ریاست کے سربراہ بنے۔ مکے کی حکومت اس وقت اربابِ اقتدار کی ایک جماعت خواص، (Oligarchy) کے ہاتھوں میں تھی جو خاندانِ قصی کے سربرآوردہ افراد پر مشتمل تھی۔ جب عبدالمطلب نے چاہِ زمزم کو از سرِ نو دریافت کیا اور اس کی نگرانی کے بارہ میں جو تنازعات تھے ان کا تصفیہ ہو گیا تو اس وقت جو جماعت برسرِ اقتدار آئی وہ دس افراد پر مشتمل تھی جو "شریف" کے لقب سے ملقب تھے۔ ان عمائدین کا مرتبہ ریاست میں سب سے بلند تھا اور ان کے عہدے موروثی ہوتے تھے، جن کا حق خاندان کے سب سے بڑے رکن یا سربراہ کو پہنچتا تھا۔ یہ عہدے حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ حجابہ (سدانہ) خانۂ کعبہ کی چابیوں کی نگہداشت، ایک متبرک عہدہ جو اونچا درجہ رکھتا تھا۔ یہ عہدہ خاندانِ عبدالدار کے حصہ میں آیا تھا، اور جب اہلِ مکہ نے اسلام قبول کیا تو اس عہدے پر عثمان بن طلحہ فائز تھے۔

۲۔ سقایہ۔ یعنی زمزم کے مقدس کنوؤں کا اور اس تمام پانی کا اجارہ جو حجاج کے استعمال

---

[1] سفید بالوں والا نوجوان۔

[2] عبد مناف کے بیٹوں میں سے سب سے پہلے ہاشم نے غزہ میں وفات پائی، اس کے بعد عبدالشمس نے مکے میں، اس کے بعد مطلب نے غزدان میں اور سب سے اخیر میں نوفل نے مطلب کے کچھ مدت بعد عراق کے شہر سلمان میں وفات پائی۔

کے لیے مخصوص تھا۔ یہ عہدہ بنو ہاشم کے خاندان میں تھا اور فتح مکہ کے وقت رسولِ خداؐ کے چچا حضرت عباسؓ اس پر مامور تھے۔

۳۔ دیات: یعنی دیوانی اور فوجداری عدالت، جو مدت دراز تک تیم ابن مرہ کے خاندان میں رہی تھی اور پیغمبرِ خداؐ کی بعثت کے وقت عبد اللہ ابن قحافہ یعنی حضرت ابوبکرؓ اس منصب پر فائز تھے۔

۴۔ سفارۃ یا حکومت کی نمائندگی: جس شخص کے ہاتھوں میں یہ عہدہ ہوتا تھا وہ ریاست کا وکیلِ مطلق سمجھا جاتا تھا اور اسے اس کا پورا اختیار حاصل ہوتا تھا کہ قریش اور دوسرے عرب قبائل اور غیر ملکی لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو جاتے تھے ان کے بارے میں مذاکرے اور تصفیے کرے۔ اس عہدے پر حضرت عمرؓ متعین تھے۔

۵۔ لواء: یعنی جس جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر قوم دشمن سے جنگ کرنے جاتی تھی اس کی محافظت۔ قومی جھنڈے کا محافظ تمام افواج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ یہ فوجی عہدہ خاندانِ بنو امیہ میں تھا اور اس پر آنحضرتؐ کا بدترین دشمن ابوسفیان بن حرب فائض تھا۔

۶۔ رفادۃ: یعنی اس رقم کا انتظام جو خیرات سے جمع کی جاتی تھی اور جو غریب حجاج کے لیے، عام اس سے کہ وہ مسافر ہوں یا مقامی لوگ، جنھیں حکومت خدا کے مہمان سمجھتی تھی، کھانے پینے کا انتظام کرنے پر خرچ کی جاتی تھی۔ یہ خدمت، جو ابوطالب کو مطلب سے ملی، ان کی وفات کے بعد، نوفل بن عبد مناف کے خاندان میں منتقل ہو گئی اور رسولِ اکرمؐ کے زمانہ میں حارث بن عمروؓ اس پر مامور تھے۔

۷۔ ندوۃ: یعنی قومی مجلس کی صدارت۔ جو شخص اس عہدے پر مامور ہوتا تھا وہ حکومت کا مشیرِ اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا اور تمام امورِ سلطنت اسی کے مشورہ سے انجام پاتے تھے۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں یہ عہدہ عبد العزیٰ بن قصی کے خاندان کے ایک فرد اسود کے قبضے میں تھا۔

۸۔ خامۃ: یا قبہ یعنی قومی جلسہ گاہ کی تولیت۔ یہ منصب، جس کے

مالک کو یہ حق ہوتا تھا کہ مجلس کو اکٹھا کرے ، بلکہ یہ حق بھی ہوتا تھا کہ فوجوں کو جنگ کے لیے جمع کرے ، خالد بن ولید کے سپرد تھا جو مخزوم بن مرّہ کے خاندان میں سے تھے ۔

۹ - **خازنہ** : یعنی بیت المال کا انتظام ، حسن بن کعب کے خاندان میں تھا اور حارث بن قیس اس پر قابض تھے ۔

۱۰ - **ازلام** : یعنی ان تیروں کی نگہبانی جو بتوں سے استخارہ کرنے کے لیے چلائے جاتے تھے ۔ یہ عہدہ ابوسفیان کے بھائی صفوان کے ہاتھوں میں تھا ۔

یہ سب عہدے اپنی اپنی جگہ تھے ، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ ایک مسلمہ دستور تھا کہ اشراف میں جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہوتا تھا اسے سب سے زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہوتا تھا اور اُسے رئیس یا سید کے خطاب سے پکارا جاتا تھا ۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں حضرت عباسؓ کو یہ مرتبہ حاصل تھا ۔

اختیار و اقتدار کی اس تقسیم کے باوجود عبدالمطلب کی ذاتی سیرت اور اثر و نفوذ نے انھیں اپنے ہم چشموں میں ایک امتیازی درجہ دے رکھا تھا ۔ اس محترم سردار کو جس نے اپنی قوم کے دستور کے مطابق اپنے ایک بیٹے کو اصنام کعبہ کے سامنے قربان کرنے کی منّت مانی تھی ، خدا نے کثیر[1] اولاد بخشی تھی ۔ وہ یہ منّت پوری کرنے کے ارادے سے اپنے سب سے پیارے

---

[1] عبدالمطلب کے بارہ بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں ۔ بیٹوں میں سب سے بڑے حارث تھے ، جو ۵۳۶ء کے قریب پیدا ہوئے ، دوسرے بیٹے حسب ذیل تھے :۔ عبدالعزیٰ یا ابولہب ، جس نے رسولِ خدا کو ستایا ، عبدمناف جو ابوطالب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اور ۵۴۰ء میں پیدا ہوئے اور ۶۲۰ء میں انتقال کیا ۔ زبیر اور عبداللہ جو ۵۴۵ء میں ، فاطمہ بنت عمرو مخزومی کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ ضرار اور عباس (۵۶۶ء تا ۶۵۲ء) جو نتیلہ کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ مقوّم ، جحم (معروف بہ الغیداق) اور حمزہ جو ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئے ۔ بیٹیوں میں عاتکہ ، اُمیمہ ، اروی ، برّہ اور اُمّ حکیم (البیضاء) فاطمہ کے بطن سے تھیں ، صفیہ ہالہ کے بطن سے پیدا ہوئیں اور انھوں نے عوام سے شادی کی جو تاریخِ اسلام کے مشہور سپہ سالار عبداللہ ابن زبیر کے دادا تھے ۔ عبدالمطلب کے باقی دو لڑکوں کے نام (باقی حاشیہ صفحہ ۸۰ پر دیکھیں)

بیٹے عبد اللہ کو کعبہ کے سنگدل بتوں کی بھینٹ چڑھانے کے لیے لے گئے، لیکن تقدیر کو کچھ اور منظور تھا۔ کعبہ کی کاہنہ[1] نے انسانی قربانی کو ایک سو اُونٹوں کی قربانی میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت سے قریش میں سو اونٹ ایک آدمی کا خوں بہا مقرر ہوئے۔

عبد اللہ کی شادی قبیلۂ زہرہ کے سردار وہب کی بیٹی آمنہ سے ہوئی۔ عبد اللہ کی شادی سے ایک ایسے سال کا آغاز ہوا جو نہایت اہم واقعات سے مملو تھا۔ سال کے شروع ہی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ساری قوم میں سنسنی پیدا کر دی۔ یمن کے حبشی نژاد نائب السلطنت ابرہۃ الاشرم نے صنعا میں ایک گرجا تعمیر کیا تھا اور اس کی یہ تمنا تھی کہ اس مال و دولت کو جو کعبے کی حرمت و عظمت مکے میں کھینچ لائی تھی اپنے شہر میں لے جائے۔ اہلِ مکہ میں سے ایک شخص نے اس کے گرجا کی بے حرمتی کی تھی۔ اس واقعے نے اُسے ایک عذر مہیا کر دیا۔ چنانچہ وہ ایک زبردست فوج لے کر خانۂ کعبہ کو گرانے کے لیے روانہ ہوا۔ وہ خود ایک آراستہ و پیراستہ ہاتھی پر سوار ہو کر فوج کے آگے آگے تھا۔ اس عظیم الجثہ جانور کو دیکھ کر، جو ایک لشکرِ جرار کے درمیان بڑے باوقار انداز سے چل رہا تھا، عرب کے قبائل اتنے مرعوب ہوئے کہ انھوں نے عام الفیل کے نام سے ایک نئے سن کا آغاز کیا (یہ ۵۷۰ء کا واقعہ ہے) جب افواجِ حبشہ قریب آ پہنچیں تو قریش اپنے بیوی بچوں کو لے کر قریب کے پہاڑوں میں چلے گئے اور وہاں سے واقعات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ ان کے دل میں یہ اُمید تھی کہ خدایانِ کعبہ خود اپنے مسکن کی حفاظت کریں گے۔ صبح ہوئی تو اہلِ حبشہ مکے کی طرف بڑھے۔ روایات کہتی ہیں کہ اس وقت ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا۔ یکایک آسمان کی وسعتوں پر چھوٹے چھوٹے پرندوں کا ایک دل بادل چھا گیا۔ یہ ابابیلیں تھیں جنھوں نے اس بدنصیب فوج پر چھوٹی چھوٹی کنکریوں کی بے پناہ بارش شروع کر دی۔ ان کنکریوں نے، جو آدمیوں کی زرہوں کو چھیدتی ہوئی ان کے اندر گھس گئیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹) نامعلوم ہیں، غالباً اس لیے کہ انھوں نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی (بعض تاریخوں کے مطابق ان کے نام قثم اور حجل تھے۔ مترجم)

[1] کاہنہ کا نام سجاح بتایا جاتا ہے (مترجم)

حملہ آوروں میں ایک دہشتناک تہلکہ مچا دیا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ آسمان کے روزن کھل گئے اور بارش کا ایک سیلاب اُتر آیا جو مردوں اور نیم جان زخمیوں کو بہا کر سمندر میں لے گیا۔

ابرہہ زخموں سے چُور، صنعا کی طرف بھاگ نکلا اور وہاں پہنچنے کے تھوڑی مدت بعد مر گیا۔ ابنِ ہشام اس خارق عادت واقعے کو بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "یہی وہ سال ہے جب چیچک پہلی دفعہ ملکِ عرب میں رُونما ہوئی۔" کوسین دا پرسیول (Caussin de perceval) لکھتا ہے: "اس سے معجزہ کی توجیہ ہو جاتی ہے۔" یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ابرہہ کی فوج کی تباہی کسی ایسی ہی خوفناک وبا کا نتیجہ تھی، جیسی سنحریب[1] (Sennacherib) کی فوجوں کی ہلاکت کا سبب بنی۔ اس پر مستزاد غالباً بارش کے ان بے پناہ طوفانوں میں سے ایک طوفان تھا جو اکثر وادیٔ مکّہ کو خوفناک سیلابوں میں غرق کر دیا کرتے تھے۔

اس واقعے کے کچھ مدت بعد عبداللہ نے ۲۵ برس کی عمر میں یثرب کے ایک سفر کے دوران وفات پائی[2]۔ ان کی وفات کے چند روز بعد ان کی غمزدہ بیوی کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد رکھا گیا۔ حضرت محمدؐ بارھویں ربیع الاوّل کے دن عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ اس وقت افواجِ حبشہ کی تباہی کو پچاس سے کچھ زیادہ دن گزر چکے تھے۔ سنِ عیسوی کے حساب سے اگست ۵۷۰ء کی اُنتیسویں تاریخ تھی[3]۔ روایت ہے کہ آپؐ کی ولادت پر چند ایسی نشانیاں ظاہر ہوئیں جن سے اقوامِ عالم کو معلوم ہو گیا کہ جس نجات دہندہ کا انھیں انتظار تھا اس کا ظہور ہو گیا ہے۔ عقلیت پرست مورخ لوگوں کے ان نشانیوں پر ایمان لانے کا حال

---

[1] اشوریا کا بادشاہ (۷۰۵ سے ۶۸۱ قبل مسیح: (مترجم)

[2] وہ عدی کے بیٹوں کے مکان میں دفن کئے گئے جو ان کے ماموں تھے۔

[3] کسریٰ نوشیروان کی حکومت کے چالیسویں سال کے اواخر میں اور سکندر سلوقسی کے ۸۸۲ھ کے اختتام پر (تاریخِ اسلام مصنفہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی کے مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء۔ مترجم)

سن کر مسکراتا ہے۔ وہ عیسائی مناظر، جو محض قیاسی استدلال کی بنا پر کسی جبل و حجت کے بغیر ان تین سیانوں کی رُوداد کو قبول کر لیتا ہے جو ایک طلوع ستارے کو دیکھ دیکھ کر حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش تک جا پہنچے تھے، ان خارقِ عادت نشانیوں کا تذکرہ پڑھ کر اُن کا تمسخر اُڑاتا ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کے لیے جو تاریخ پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے، جو اگلے لوگوں کے اندازِ فکر کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور جس کا دل تعصب سے پاک ہے، یہ نشانیاں، جو مسلمانوں کی روایت اور عقیدہ کے مطابق ولادتِ نبویؐ پر منودار ہوئیں ا یسے امورِ واقعہ کا درجہ رکھتی ہیں جو تاریخی تجزیہ کے مستحق ہیں۔ ہم لوگوں کو، جو جدید زمانے میں پیدا ہوئے اقوام اور افراد کی زندگیوں کے معمولی واقعات میں ایک اٹل قانون جاری و ساری دکھائی دیتا ہے پھر اس پر تعجب کیسا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے کے لوگوں کو ایک قوم کی یادگاری عمارت کے گرنے میں خدا کا ہاتھ اس کے ظلموں اور بدکاریوں کے ناگزیر انجام کی طرف اشارہ کرتا ہوا دکھائی دیا[1]۔ عربوں کے دستور کے مطابق بچے کو شیرخوارگی کے زمانے میں ایک بدوی خاتون (حلیمہ سعدیہ) کے سپرد کر دیا گیا جو ہوازن کی ایک شاخ یعنی بنی سعد کے قبیلے سے تھیں[2]۔ جب حلیمہ بچے کو واپس لائیں تو اس کی ماں آمنہ نے بڑی محبت سے اسے پالا پوسا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد آمنہ وفات پا گئیں اور یتیم بچے کی نگرانی کا ذمہ اس کے دادا عبدالمطلب نے لے لیا۔ عبدالمطلب نے بڑی شفقت سے اپنے پوتے کی دیکھ بھال کی لیکن دادا کی شفقت والدین کی اس محبت کا بدل نہ ہو سکتی تھی جو بچپن کی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ والد کا انتقال آپؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ والدہ بھی چھ سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئیں اور اس ناقابلِ تلافی نقصان نے حساس بچے کی طبیعت پر بہت گہرا اثر کیا۔ تین چار سال نہ گزرنے پائے تھے کہ دادا کا سایۂ عاطفت بھی سر سے اُٹھ گیا۔ عبدالمطلب کا انتقال ۵۷۹ء میں صنعا سے ایک سفر

---

[1] غالباً کسریٰ انوشیروان کے محل کے کنگروں کے گر جانے کی طرف اشارہ ہے۔

[2] چند سال بعد حلیمہ قریش کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کے لائی گئیں تو آنحضرتؐ نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور ان کی عمر بھر کی کفالت کا انتظام کر دیا۔

سے واپسی پر ہوا، جہاں وہ قریش کی طرف سے ذوالیزن کے بیٹے سیف کو ایرانیوں کی مدد سے حبا لیوں کے تخت پر بیٹھنے کی مبارک باد دینے گئے تھے۔[۱]

عبدالمطلب کی وفات کے بعد اس طفلِ یتیم کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ عبدالمطلب نے بسترِ مرگ پر اپنے پوتے کو اس کے چچا ابوطالب کی کفالت میں دیا جن کے گھر میں آپ[۲] نے اپنی زندگی کے ابتدائی ایام گزارے۔ ہم چشمِ تصور سے اس نوعمر بچے کو جس کی گہرے غور وفکر میں ڈوبی ہوئی آنکھیں گویا مستقبل کی گہرائیوں کے اندر جھانک رہی تھیں، اپنے چچا کے غریبانہ اور سیدھے سادے گھر میں چلتا پھرتا یا صحرا میں جاکر حسنِ فطرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ پاک طینت طفلِ صحرا، طبیعت کا شریف، مزاج کا حلیم، دوسروں کے دکھ درد سے متاثر ہونے والا، اس چھوٹے سے گھرانے میں ہر کسی کو عزیز تھا۔ بالخصوص چچا اور بھتیجے میں دلی محبت کا رشتہ تھا۔ "خدا کے فرشتوں نے اس کا سینہ چاک کر کے نور سے بھر دیا۔"[۲] رسولِ خدا کی ابتدائی زندگی محنت ومشقت کے بوجھ سے آزاد نہ تھی۔ آپ کو اکثر اپنے چچا کے گلوں کی رکھوالی کے لیے صحرا میں جانا پڑتا تھا۔ ہاشم اور عبدالمطلب کی شاہانہ ضیافتوں کے باعث ان کے ورثا کو بہت کم ترکہ ملا۔ چنانچہ ہاشمی اپنی ناداری کی وجہ سے وہ اختیار و اقتدار جو انھیں کبھی حاصل تھا بڑی تیزی سے کھو رہے تھے۔ زائرینِ حرم کو کھانا کھلانے کا منصب ان کے حریف بنوامیہ کے ہاتھوں میں آچکا تھا جنھوں نے آلِ ہاشم کو ہمیشہ رشک وحسد کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

---

[۱] سقایہ اور رفادہ کے جو دو مناصب عبدالمطلب کے پاس تھے ان میں سے سقایہ (زمزم کی نگہبانی کے ساتھ) ان کے بیٹے عباس کے حصہ میں آیا۔ رفادہ کا منصب ابوطالب کو ملا جو کہ بڑے صاحب اختیار و اقتدار تھے۔ لیکن ابوطالب نے رفادہ کا منصب اپنی اولاد کو منتقل نہ کیا۔ ان کی وفات پر یہ نوفل بن عبدمناف کے ہاتھوں میں آیا۔ جب رسولِ اکرمؐ نے مکہ فتح کیا تو اس وقت، جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں، رفادہ کے فرائض عمرو کے بیٹے اور نوفل کے پوتے حارث کے سپرد تھے۔ زینی۔ جلد اول صفحہ ۱۴۔

[۲] سیرت ابن ہشام (مترجم)

حضرت محمدؐ ابھی کم سن ہی تھے کہ حربِ فجار کی ابتدا ہوئی۔ یہ لڑائی، جس میں قریش اور بنی کنانہ ایک طرف تھے اور قیس عیلان دوسری طرف، عکاظ کے مقام پر چھڑی اور کئی سالوں تک جاری رہی۔ اس میں جان و مال کا بہت نقصان ہوا۔ عکاظ مکے سے تین چھوٹی منزلوں پر طائف اور نخلہ کے درمیان واقع ہے۔ اس مقام پر جو تاریخِ عرب میں مشہور ہے، ذوالقعدہ کے مقدس مہینے میں ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس موقع پر جنگ کرنا یا غضب میں آکر انسانی خون بہانا ممنوع سمجھا جاتا تھا، گویا یہ ایک قسم کا مذہبی متارکۂ جنگ تھا۔ دو اور میلے بھی لگتے تھے، ایک تو مجنہ کے مقام پر جو مکے سے تھوڑے سے فاصلے پر مرّ الظہران کے قریب واقع ہے، اور دوسرا عرفات کے دامن میں ذوالمجاز کے مقام پر۔ لیکن عکاظ کا میلہ ایک بہت بڑی قومی تقریب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں اس مقدس مہینے میں، جب تمام قبائلی دشمنیاں اور خانہ جنگیاں عارضی طور پر فراموش کر دی جاتی تھیں، عرب کے تمام حصوں سے بلکہ دور دراز ملکوں سے عالمی تجارت کا ایک دریا بہتا ہوا چلا آتا تھا۔ یہاں حجاز اور نجد کے تاجر آتے تھے، صحرا کے مبارز شاعر آتے تھے اور خطیب آتے تھے، جو اپنے آپ کو خون کا انتقام لینے والوں سے چھپانے کے لیے چہرے پر نقابیں ڈالے ہوتے تھے اور جو ان تمام قوموں سے جو میلوں میں جمع ہوتی تھیں داد وصول کرنے کی خاطر اپنی نظمیں پڑھ کر سناتے تھے۔ عکاظ عرب کا اولمپیا[1] تھا۔ یہاں لوگ محض تجارت کی غرض سے نہ آتے تھے بلکہ اپنی قوت و شہامت اور اپنی شان و شوکت کے نغمے گانے اور اپنے شاعرانہ اور ادیبانہ کمالات کے جوہر دکھانے کے لیے بھی۔ ان کے قصیدے، جو سامعین کے عظیم مجمعوں سے خراجِ تحسین وصول کرتے تھے، سنہری حرفوں میں قلمبند کیے جاتے اور آنے والی نسلوں کے لیے یادگار کے طور پر قومی صنمکدے یعنی کعبے میں لٹکا دیئے جاتے تھے[2]۔ میلے کے ایام میں عکاظ خوشی اور ریل پیل کا ایک عجیب منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن تصویر

---

[1] یونان قدیم کا ایک شہر جہاں کھیلوں کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا جشن منعقد ہوتا تھا۔ (مترجم)

[2] اسی مناسبت سے انھیں "معلقات" کا نام دیا جاتا تھا۔

کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ ناچنے والی عورتیں جو اپنے نشاط آور گیتوں اور قہقہوں اور چہچہوں سے صحرا کے شعلہ مزاج فرزندوں کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہوئی خیمہ بہ خیمہ پھرتی تھیں، اوباشوں کے جمگھٹ، جو فنِ موسیقی کی ابجد سے بھی واقف ہوئے بغیر گانے بجانے کے اوٹ پٹانگ مظاہرے کرتے پھرتے تھے، سرِ بازار مے نوشیاں جو اکثر دنگوں اور خونریزیوں پر ختم ہوتی تھیں، جوا کھیلنے کے اڈے، جہاں اہلِ مکہ رات رات بھر جوا کھیلتے رہتے تھے، شاعروں کی ذاتی چشمکوں کی پیدا کی ہوئی نفرتیں اور دشمنیاں، جو کبھی ہنگامی چپقلشوں اور کبھی مستقل اور تباہ کن لڑائیوں کی صورت اختیار کر لیتیں ـــــ ان سب باتوں نے تصویر کے دوسرے رُخ کو تاریک بنا دیا تھا اور انھوں نے آمنہ کے یتیم بچے کے دل پر ایک گہرا نقش ثبت کیا۔

وہ دو قبائلی لڑائیاں جنھیں اس سبب 'حربِ الفجار' کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس مہینے کی حُرمت شکنی کی جس میں تمام لڑائی جھگڑے ممنوع تھے، ان دو لڑائیوں کے درمیانی وقفے میں حضرت محمدؐ اپنے چچا اور سرپرست کے ہمراہ شام کے ایک تجارتی سفر پر گئے۔[1] شام میں آپؐ کی آنکھوں نے معاشرتی خستہ حالی اور مذہبی پستی کا ایک ایسا منظر دیکھا جس کی یاد آپؐ کے دل و دماغ سے کبھی نہ محو ہوئی۔ اسی طرح خاموشی اور مسکینی کے عالم میں، طرح طرح کے خیالات کی اُدھیڑبن میں مصروف، یہ دُرِّ یتیم بچے سے جوان اور جوان سے مرد ہُوا۔

آپؐ اپنے ملک کی روایتی معلومات پر تو پورا پورا عبور رکھتے تھے، لیکن جن معنوں میں تعلیم کی اصطلاح جدید زمانے میں استعمال ہوتی ہے، ان معنوں میں آپؐ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ آپؐ کو اپنی قوم سے محبت تھی، لیکن عادات و خصائل اور اندازِ فکر میں آپؐ اپنے ہم قوموں سے بالکل مختلف تھے۔ ایک درہم برہم معاشرے کے درمیان تنِ تنہا کھڑے آپؐ ایک از کار افتادہ اور زوال یافتہ دور کا متحرک نظارہ غائر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اہلِ مکہ کی عام بے آئینی

---

[1] ابوطالب اپنے باپ اور دادا کی طرح شام اور یمن کے ساتھ خاصے بڑے پیمانے پر تجارت کرتے تھے۔ وہ دمشق، بصرہ اور شام کے دوسرے شہروں میں حجاز اور ہجر کی کھجوریں اور یمن کے عطر لے جاتے تھے اور ان کے بدلے میں بازنطینی اشیاء لاتے تھے۔

عکاظ کے میلے میں آنے والے قبیلوں کے بے وجہ اور خونریز جھگڑے، قریش کا فسق و فجور اور بے دینی، یہ سب چیزیں قدرتی طور پر اس حساس نوجوان کے دل میں انتہائی نفرت اور کراہت کے جذبات پیدا کرتی تھیں۔

اپنی عمر کے پچیسویں سال میں حضرت محمدؐ نے پھر ایک بار شام کا سفر کیا۔ اس دفعہ آپؐ اپنے خاندان کی ایک معزز قریشی خاتون خدیجہ کے مہتمم اور کارندہ کی حیثیت سے ان کا مالِ تجارت لے کر گئے۔ آپؐ نے جس قابلیت اور دیانت داری سے اپنے فرائض کو انجام دیا اس سے خدیجہ بہت متاثر ہوئیں اور اس تاثر نے رفتہ رفتہ محبت کی صورت اختیار کر لی۔ جلد ہی شادی کا انتظام ہو گیا اور شادی پر سارے قریش نے خوشیاں منائیں۔ حضرت خدیجہؓ حضرت محمدؐ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میاں بیوی میں انتہا درجہ کی محبت تھی۔ اس شادی کی بدولت "آپؐ کو وہ دلجمعی اور فارغ البالی حاصل ہو گئی جس کی آپؐ کو نبوت کے سے کارِ عظیم کی تیاری کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ آپؐ کو ایک محبت کرنے والی عورت کی دلی رفاقت نصیب ہوئی، جو سب سے پہلے آپؐ کی نبوت پر ایمان لائی اور جس نے ہر وقت آپؐ کی ڈھارس بندھائی اور جس وقت کوئی شخص آپؐ پر یقین نہ لاتا تھا بلکہ خود آپؐ کو اپنے پر کامل یقین نہ تھا، اور دنیا آپؐ کو تاریک نظر آتی تھی، اس وقت اُمید کے جھلملاتے ہوئے شعلے کو آپؐ کے سینے کے اندر زندہ رکھا۔"

خدیجہؓ ایک اعلیٰ شخصیت ہیں اور ان کی زندگی مسلمان عورتوں کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی۔ اسلامی شریعت پر جو تہمت باندھی جاتی ہے کہ اس نے عورتوں کے درجہ کو پست کر دیا اس کی تغلیط اس بلند درجہ سے ہوتی ہے جو مسلمانوں کے نزدیک حضرت خدیجہؓ اور رسولِ خدا کی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو حاصل ہے۔ خدیجہؓ کے بطن سے آنحضرتؐ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں، لیکن بیٹے سب کے سب بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ان سے آنحضرتؐ کو بڑی محبت تھی اور ان کی بے وقت وفات سے آپؐ کو بہت صدمہ پہنچا۔ قریش نے بعد میں آنحضرتؐ کے لیے جو ناشائستہ خطاب[1] تراشا اس کی

---

[1] الابتر لغوی معنی دم کٹا۔ ثانوی معنی بے اولاد۔

وجہ تسمیہ آپؐ کے بیٹوں کی وفات ہی تھی۔ بیٹیاں بعثتِ نبویؐ کے بہت بعد تک زندہ رہیں۔ آپؐ کی ازدواجی زندگی کے آئندہ پندرہ سال مجاہدہ و مراقبہ، غور و فکر اور توجہ الی اللہ میں گزرے۔ صرف چند موقعے ایسے تھے جب آپؐ اپنی نجی ضروریات یا شہری زندگی کے تقاضوں کے تحت اپنے گوشۂ خلوت سے باہر آئے۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد مکّے کی حکومت کے اختیارات کم و بیش تقسیم ہو چکے تھے۔ تمام اعیانِ حکومت کا حلقۂ اختیار محدود ہو گیا تھا اور بدل کا ایسا کوئی ادارہ نہ تھا جس کے زیرِ سایہ افـــراد اپنے حقوق اور املاک سے پُرامن طور پر متمتع ہو سکتے۔ خونی رشتوں اور خاندانی یگانگی کی بدولت ہر شہری کسی حد تک ناانصافی اور غارت گری سے محفوظ رہتا تھا، لیکن اجنبی ہر قسم کے جور و تعدّی کا نشانہ بن سکتے تھے۔ نہ صرف ان کا مال و متاع لوٹ لیا جاتا بلکہ ان کی بیویاں اور بیٹیاں بھی اکثر ان سے چھین لی جاتی تھیں۔ قبیلہ بنی قین کا ایک مشہور شاعر حنظلہ اگرچہ ایک ذی رتبہ قریش عبداللہ ابن جدعان کے زیرِ حمایت مکّے میں آیا لیکن اس کے باوجود سرِ بازار لٹ گیا۔ بے آئینی کے ایک اور ایسے ہی واقعے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی کہ اس کا تدارک ضروری ہو گیا۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی تحریک پر بنی ہاشم، بنی مطلّب اور خاندانِ زہرہ و تیم نے متحد ہو کر معاہدہ کیا کہ تمام افراد کو، چاہے وہ مکّی ہوں یا اجنبی، آزاد ہوں یا غلام، مکّے کی حدود کے اندر ہر طرح کے ظلم اور ناانصافی سے محفوظ رکھا جائے گا اور ظالموں کے ہاتھوں ان کے نقصانات کی پوری پوری تلافی کرائی جائے گی۔ فداکاروں کی اس انجمن کا نام بنی جرہم کی ایک پرانی انجمن کے نام پر انجمن حلف الفضول رکھا گیا، جس کے چار ارکان، فضل، فضالہ، مفضّل اور فضیل مجموعی طور پر فضول کہلاتے تھے۔ یہ انجمن آنحضرتؐ کی شادی کے فوراً بعد ۵۹۵ء کے لگ بھگ قائم ہوئی اور آنحضرتؐ اس کے رکنِ اعلیٰ تھے۔ اس کی بدولت کمزوروں اور مظلوموں کو بڑی حد تک امن و امان نصیب ہو گیا۔ اپنے قیام کے پہلے ہی سال میں اسے اتنا رعب و داب نصیب ہو گیا کہ اس کی طرف سے کسی معاملے میں مداخلت کا اشارہ ہی زبردستوں کی بے آئینی کو روکنے اور زیردستوں کے نقصانات کی تلافی کرانے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہ انجمن تاریخ اسلام کی پہلی نصف صدی کے اختتام تک پوری قوّت سے قائم رہی۔ انجمن حلف الفضول

کے قیام کے چند سال بعد یعنی ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں عثمان بن حویرث نے بازنطینی دولت کے بل بوتے پر حجاز کو رومی سلطنت کا ایک صوبہ بنانے کی کوشش کی۔ آنحضرتؐ کی دخل اندازی کی بدولت یہ منصوبہ ناکام رہا اور عثمان نے بھاگ کر شام میں پناہ لی جہاں بعد میں اُسے غسانی شہزادہ عمرو نے زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے مختلف خاندانوں کے درمیان جو کعبے کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف تھے ایک ایسے جھگڑے کا فیصلہ کرا دیا جو ممکن تھا کہ ایک خوں ریز جنگ کی صورت اختیار کر لیتا۔ ان پندرہ سالوں میں آنحضرتؐ کی زندگی کے یہی واقعات ہیں جن کا ہمیں علم ہے۔ آپؐ کی حلیم طبیعت، آپؐ کا سیدھا سادہ طریقِ بود و باش، آپؐ کی پاکیزہ زندگی، آپؐ کی نفاست و شائستگی، آپؐ کا ہر وقت غریبوں اور کمزوروں کی امداد کے لیے تیار رہنا، آپؐ کی خودداری، آپؐ کی دیانت و امانت، آپؐ کی فرض شناسی، ان سب چیزوں نے آپؐ کو اپنے ہم وطنوں سے 'الامین' کا بلند اور قابلِ رشک خطاب دلوایا تھا۔

اسی دورِ زندگی میں آنحضرتؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے احسانات کے بدلے میں اُن کے بیٹے علیؓ کو اپنے زیرِ تربیت لیا۔ ابو طالب اپنے خاندان کی قدیم حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوششوں کی بدولت بڑی حد تک تنگدست ہو چکے تھے۔ آنحضرتؐ، جو حضرت خدیجہؓ سے نکاح کی بدولت خوشحال تھے، اور ابو طالب کے بھائی حضرت عباسؓ یہ دونوں اس وقت مکّے کے سب سے دولت مند لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ عرب میں ایک سخت قحط پڑا جس کے دوران آنحضرتؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کو ابو طالب کے ایک بیٹے کی کفالت قبول کرنے پر آمادہ کیا اور دوسرے کی کفالت خود قبول کی۔ اس طرح حضرت عباسؓ نے جعفر کو اور خود آنحضرتؐ نے علیؓ کو اپنی کفالت میں لیا اور عقیل[1] اپنے باپ ہی کے پاس رہے۔ جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں۔ آنحضرتؐ کے تمام بیٹے ابتدائے طفولیت ہی میں وفات پا گئے تھے۔ حضرت علیؓ کی محبت نے ان کے داغِ مفارقت کو مٹا دیا۔ بعد میں آنحضرتؐ کی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمہؓ[2] کے

---

[1] ابن ہشام، الحلبی "انسان العیون"؛ ابن الاثیر۔

[2] سنِ ولادت ۶۰۶ء۔

ساتھ حضرت علیؓ کے نکاح نے اس رشتۂ محبت و مودت پر مہر ثبت کر دی۔ انہی دنوں میں آنحضرتؐ نے رحم دلی اور انسان نوازی کی ایک ایسی مثال قائم کی جس نے اہلِ مکہ پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ ایک عرب نوجوان زید بن حارث ایک دشمن قبیلے کے ہاتھوں جنگی اسیر بن کر مکے لایا گیا۔ حضرت خدیجہؓ کے ایک بھتیجے نے اُسے خرید کر اپنی پھوپھی کو دے دیا۔ آنحضرتؐ نے زید کو بطورِ نذر حضرت خدیجہؓ سے قبول کیا اور فوراً آزاد کر دیا۔ اس رحم و کرم کا صلہ زید نے پوری پوری محبت و عقیدت سے دیا۔ وہ اپنے باپ کے کہنے پر بھی آنحضرتؐ کو چھوڑ کر اپنے قبیلے میں واپس جانے پر راضی نہ ہوا۔

یوں گزرے آزمائش و امتحان کے یہ پندرہ سال، جو بہت سے آلام سے واغدار تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی رنج و محن پر دلسوزی سے بھی منوّر تھے۔

آپؐ کی آنکھوں کے سامنے آپؐ کا ملک خون میں نہا رہا تھا۔ خاندانی جنگوں اور قبائلی دشمنیوں نے اس کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ آپؐ کے ہم وطن جہالت میں ڈوبے ہوئے، فحش رسوم اور اوہام پرستی کے عادی اور اپنے تمام صحرائی اوصاف کے باوجود بے آئین اور سفاک تھے۔ آپؐ نے دو دفعہ شام کا جو سفر کیا تھا اس کے دوران آپؐ نے اخلاقی اور معاشرتی زبوں حالی کا ایک ناگفتہ بہ نظارہ دیکھا تھا۔ حریف مذہب اور فرقے ایک دوسرے کے ٹکڑے اُڑا رہے تھے جبں فرضی خدا کی پرستش کے وہ دعویدار تھے اس کے وجود جسمانی پر جھگڑے کر رہے تھے۔ اپنے جذباتِ نفرت کو حجاز کی وادیوں اور صحراؤں تک پھیلا رہے تھے اور عرب کے شہروں میں نفاق کا فتنہ برپا کر رہے تھے۔ آپؐ کی آنکھوں کے سامنے جو نقشہ تھا وہ انتہا درجہ کا یاس انگیز تھا۔ جو معدودے چند لوگ اپنے قدیم عقائد کو ترک کر کے کسی مامن کو تلاش کرتے ہوئے تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے وہ ایک عالمگیر بے اطمینانی کی نمائندگی کر رہے تھے[1]۔ ان کے ذہنوں میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو ان کے محدود حلقے کے یا ہر نوعِ انسانی کے لیے

---

[1] زید، ورقہ بن نوفل (جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے) اور دو اور اشخاص (عبید اللہ اور عثمان) یہ چار شخص اپنے ہم وطنوں کی بُت پرستی کو ترک کر کے دینِ برحق کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان میں زید سب سے سربرآوردہ تھے۔ اس سے پیشتر کہ آنحضرتؐ خدا سے رابطہ قائم کرنے کی (باقی حاشیہ صفحہ ۹۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

کوئی معنیٰ یا اہمیت رکھتی۔ لیکن حضرت محمدؐ کی رُوح آسمانوں کی رفعتوں کی سیر کر رہی تھی اور اس کوشش میں مصروف تھی کہ کائنات، حیات و موت اور خیر و شر کے اسرار کا پردہ فاش کرے اور اپنے اردگرد کی پراگندگی کے درمیان کوئی نظام دریافت کرے۔ خدا نے اپنا جو کلام آپؐ پر نازل فرمایا وہ دنیا کے لیے ایک زندگی بخش قوت بن کر جلوہ گر ہوا۔ نکاح کے بعد کئی سال تک آپؐ کا یہ معمول رہا تھا کہ کبھی تو اہل و عیال کے ساتھ اور کبھی تنہا، کوہِ حرا[1] کے ایک غار میں جا کر عبادت و مراقبہ میں منہمک رہتے[2]۔ کوہِ حرا ایک بہت بڑا بنجر ٹیلہ ہے جس میں بہت سی گھاٹیوں نے شگاف ڈال رکھے ہیں اور جو صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں اکیلا کھڑا ہے۔ اس میں نہ کہیں کوئی سایہ دار جگہ ہے، نہ کوئی پھول ہیں، نہ کوئی کنواں ہے نہ کوئی چشمہ۔ عزلت نشینی آپؐ کو بہت مرغوب ہو گئی تھی۔ غارِ حرا میں آپؐ اکثر ساری ساری رات عمیق ترین فکر میں ڈوبے کائنات کے ان دیکھے لیکن محیطِ کل خدا کے حضور میں حاضر رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ زمین و آسمان جلال و جمالِ الٰہی کے اس الہامی مکاشفے سے لبریز ہو گئے جو روزِ ازل سے مقدّر تھا۔ آپؐ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ آپؐ کے اردگرد کی بے جان چیزوں، پتھروں، چٹانوں اور درختوں سے ایک آواز آ رہی ہے جو آپؐ سے اس کام کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۹) غرض سے غارِ حرا میں معتکف ہوئے۔ آپؐ کی ملاقات زید سے ہو چکی تھی اور زید کو بت پرستی سے جو نفرت تھی اس کی آپؐ کے دل میں بڑی قدر تھی۔ بعد میں زید کے رشتہ کے ایک بھائی نے آنحضرتؐ سے زید کے حق میں شفاعت کی درخواست کی تو، اگرچہ آنحضرتؐ خود اپنے دادا عبدالمطلب کے لئے دعائے مغفرت مانگنے پر راضی نہ تھے کیونکہ انھوں نے موت سے پہلے شرک سے توبہ نہیں کی تھی پھر بھی آپ نے زید کے لئے دُعائے مغفرت فرمائی۔ (ابن ہشام)

[1] کوہِ حرا کو آج کل "جبلِ نور" کہتے ہیں۔ ابن ہشام اور ابن الاثیر کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ عموماً رمضان کا مہینہ غارِ حرا میں جا کر عبادت، غریبوں کی امداد اور بھوک کے پیاسے صحرا نوردوں کی دستگیری میں صرف کیا کرتے تھے۔ لیکن طبری ماہِ رجب کا ذکر کرتا ہے۔

[2] صحیح بخاری میں اس کے لیے "تحنّث" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ (مترجم)

انجام وہی کا تقاضا کر رہی ہے جو ایک قدرتِ مطلقہ آپؐ کو تفویض کرنا چاہتی ہے[1]۔ کیا روح کی شعریت اس سے آگے بڑھ سکتی ہے؟ فرشتوں کی جو شکلیں ان لمحات میں آپؐ کو دکھائی دیں وہ ان عقائد کی تجریدی جلوہ گریاں تھیں جن کے ذریعے آپؐ دنیا کو نئی زندگی بخشنے والے تھے۔ مادی زندگی کے تاریک وشب گرفتہ راستوں میں بسا اوقات ہر بڑے آدمی کو ایسے غیر مادی لیکن مرئی اثرات کا روحانی شعور ہوا ہے جن کی بدولت نوعِ انسانی کے چند عظیم ترین کارنامے انجام پائے۔ اس قدیم صاحبِ بصیرت سموئیل سے لے کر، جس کی پُرجلال شکل ماضی کے دھندلے اُفق کی دوریوں میں دکھائی دیتی ہے، مسیحؑ تک جو ویرانہ میں اپنی قوم کی تیرہ بختی اور اپنے کام کی عظمت پر فکر و تامل میں ڈوبا ہوا خدا سے برحق کے شیریں الفاظ کو سنتا تھا، پھر مسیح سے لے کر غارِ حرا کے معتکف محمدؐ تک ان اثرات کی کارفرمائیوں کا سلسلہ لگاتار چلا آتا ہے[2]۔ رات کی پُرسکون گھڑیوں میں، صبح کی خاموشیوں میں، تنہائی کی گہرائیوں میں، جب کوئی ہمدرد آپؐ کے پاس نہ ہوتا تھا، آپؐ کو نسیمِ صبح کی دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی طرح آسمان سے ایک آواز آتی: "تو ہی وہ انسان ہے، تو ہی خدا کا پیغمبر ہے"[3]۔ یا جب آپؐ اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے ہوتے تو آواز گرج کر کہتی: "بول! اپنے ربّ کے نام سے"[4]۔ ان ہیجانی لمحوں میں نفس ایک رویائی تصویر آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے: "ان کارکنانِ سماوی کی تصویر جو ربّ السمٰوات کے پیغام لا کر اس کے بندگانِ خاص کو دیتے ہیں، حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو منتخب کر لیتا ہے اور ان سے رعد کی کڑک سے بھی بلند آواز میں خطاب کرتا ہے"۔ یہ وہی اندرونی آواز ہے جس کے ذریعہ خدا ہم سب سے مخاطب ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آواز رفتہ رفتہ اتنی دھیمی پڑ جائے کہ ہمیں بمشکل سنائی دے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا الہامی

---

[1] ابن ہشام

[2] قرآن مجید سورہ علق۔ ابن ہشام صفحہ ۱۵۳۔ انسان العیون، از الحلبی۔ جلد اوّل صفحہ ۲۴۹

ابن الاثیر، جلد دوم صفحہ ۳۴۔

[3] مقابلے کے لیے دیکھیے عہد نامۂ قدیم، یسعیاہ باب ۶۔

لہجہ زائل ہو جائے اور وہ دنیوی زیرکی کی زبان میں گم ہو کر رہ جائے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آواز اپنی اصلی صورت میں خدا کے چیدہ و برگزیدہ بندوں کے کانوں تک پہنچے اور انھیں آسمانی آواز معلوم ہو۔"[1]

ایک عظیم مصنف کہتا ہے "ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت حضرت محمدؐ کے وسیع تصور کو اس زمانے کی ذہنی فضا سے جو تعلق قدرتی طور پر تھا صرف اس سے اس امر کی کچھ توجیہ ہوتی ہے کہ آپؐ کو جو مہتم بالشان الہامات ہوئے ان کے باوجود آپؐ نے اپنی سلامتیِ طبع اور ضبطِ نفس کو قائم رکھا۔" اس کے بعد وہ کہتا ہے: "یہ محض ایک اتفاقی امر نہ تھا کہ اس وقت کی سب سے زبردست قوت اس وسیع جزیرہ نما کی تنہائیوں سے ظاہر ہوئی جس کے ساحل پر سلطنتوں کا مدوجزر ہوتا رہا۔ ایک افضل و اعلیٰ ادارۂ مطلق کے نام پر جو پیغام بھی دنیا کو دیا گیا وہ صحرا سے بلند ہونے والی ایک آواز تھا۔ نبیِؐ ناصری نے ایک مافوق البشر روحانی قوت سے رابطہ قائم کرنے کی خاطر دنیا سے کنارہ کش ہو کر ملکِ عرب کو جو علامتی معنویت بخش دی تھی اُسے محمدؐ نے ایک علامت سے بڑھ چڑھ کر کچھ اور چیز بنا دیا۔ عرب ایک فردِ واحد کی ذات میں مرکوز ہو کر ساری نوعِ انسانی کا نمائندہ اور پیغمبرِ اسلام اس کا کلامِ ناطق بن گیا۔ صحرا نے اپنے اس فرزند پر، جس کی تربیت اس کی بلند روایات کے دامن میں ہوئی تھی اور جو ایک مخفی اندرونی تقاضے سے مجبور ہو کر تاروں بھری رات کی تنہائیوں میں بے یار و مددگار نکل کھڑا ہوا تھا، اپنے سارے اسرار کھول کر رکھ دیئے۔"[2]

ایک ایسی رات (قدرت و فضیلت کی رات) جب ایک قدسی سکون موجودات پر طاری تھا اور ساری کائنات اپنے مالک کی طرف رجوع کئے ہوئے تھی، آدھی گزر چکی تھی کہ

---

[1] Professor Muller, quoted from Dean Stanley's *Lectures on the History of the Jewish Church*, part i, Lect, p. 394, Johnson, *Oriental Religions*, p. 561

اللہ کی کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشنہ حق روح پر نازل ہوئی۔ آپؐ مراقبہ میں ڈوبے ہوئے بیٹھے تھے کہ ایک زبردست آواز نے، جس میں سمندر کی لہروں کی سی گھن گرج تھی، آپؐ کو حکم دیا: "بول!"[1] دو مرتبہ آواز آئی اور دونوں مرتبہ آپؐ اس کے حکم کی تعمیل سے قاصر رہے۔ لیکن اس کے بعد ایک زبردست قوت نے آپؐ کو بھینچ لیا اور بولنے پر مجبور کیا۔ آواز نے تیسری بار کہا "بول!" آپؐ نے پوچھا "میں کیا بولوں؟" جواب ملا "بول! اپنے رب کے نام سے۔"

جب آواز آپؐ کو یہ بتا چکی کہ کیونکر انسان ایک قطرۂ ناچیز سے شروع ہو کر وجود میں آیا اور کیوں کر اُسے خدائے رحیم و رحمٰن نے عقل و علم دے کر بلندی بخشی اور قلم کی بدولت اُسے وہ چیزیں بتائیں جن کا اسے علم نہ تھا۔[2] تو اس وقت آنحضرتؐ عالمِ بے خودی سے بیدار ہوئے اور آپؐ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ الفاظ جو آپؐ کی روح سے کہے گئے تھے۔ آپؐ کے دل کی تختی پر لکھ دیئے گئے ہیں۔ آپؐ کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ آپؐ جلدی سے گھر گئے اور حضرت خدیجہؓ سے کہا "خدیجہؓ! مجھے کیا ہو گیا ہے؟" آپؐ لیٹ گئے اور حضرت خدیجہؓ آپؐ کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ جب آپؐ کو ہوش آیا تو آپؐ نے فرمایا "اے خدیجہؓ! وہ شخص جس کے بارے میں کسی کو ایسی بات کا یقین نہ آسکتا تھا (یعنی آپؐ) یا تو کاہن[3] بن گیا ہے یا مجنون!" حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا "نعوذ باللہ اے ابوالقاسم! (یہ آپؐ کے ایک بیٹے کی نسبت سے آپؐ کی کنیت تھی) خدا کبھی آپؐ پر ایسی واردات نہ ہونے دیگا کیونکہ آپؐ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، بُرائی کا بدلہ بُرائی سے نہیں دیتے، ایماندار ہیں، نیکوکار ہیں اور اقربا اور دوستوں سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں۔ آپؐ بازاروں میں

---

[1] اقراء کے معنی کے بارے میں اگلے صفحے پر امیر علی کا حاشیہ دیکھیئے۔ (مترجم)

[2] سورہ علق۔ ۱ تا ۵۔ اقراء کا ترجمہ عموماً "پڑھ" کیا جاتا ہے۔ لیکن میں نے کے تجویز کیے ہوئے ترجمے کو ترجیح دی ہے۔

[3] آپؐ کو کاہنوں اور پیش گوئیاں کرنے والوں سے بے حد نفرت تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر بت خانوں سے وابستہ تھے۔

بے ہودہ باتیں بھی نہیں کرتے۔ آپؐ کو کیا واقعہ پیش آیا ہے؟ کیا آپؐ نے کوئی خوفناک چیز دیکھی ہے؟" آنحضرتؐ نے جواب دیا "ہاں" اور پھر آپؐ کو جو کچھ پیش آیا تھا اس کا ماجرا سنایا۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے کہا "آپؐ کو خوش ہونا چاہیے۔ وہ خدا جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میرا گواہ ہے کہ آپؐ اس زمانے کے پیغمبر ہیں" پھر حضرت خدیجہؓ انھیں اور اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو بوڑھے اور نابینا تھے اور یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں کے عالم تھے۔ جب خدیجہؓ نے انھیں سارا واقعہ سنایا تو وہ پکار اٹھے :۔ "قدوسٌ! قدوسٌ!! یقیناً یہ وہی ناموسِ اکبر[1] ہے جو عیسیٰؑ و موسیٰؑ پر اترا تھا۔ محمدؐ اپنے زمانہ کا پیغمبر ہوگا۔ اُسے جاکر بتا دو اور کہو کہ اپنا دل مضبوط رکھے۔"

سلطنتوں اور قوموں کی تباہی اور قبائل کے وحشیانہ شور و فساد کے درمیان ایک آواز فضا میں گونج رہی تھی، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک، کہ خدا کا پیغام ظاہر ہونے والا ہے : وہ گڈریا قریب آپہنچا ہے جو بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو خدا کے باڑے میں واپس لے آئے گا۔ یہ آواز ورقہ کے گوشِ دل نے بھی سنی۔

جب کچھ عرصے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ورقہ ایک دوسرے سے بازار میں ملے تو یہودی اور عیسوی صحائف کے نابینا اور سن رسیدہ عالم نے جس نے اطمینانِ قلب کی جستجو میں یہ صحائف چھان مارے تھے لیکن ان سے اطمینان حاصل نہ کر سکا تھا، لیکن جسے اس وعدے کا علم تھا جو نبی نوعِ انسان سے ایک نجات دہندہ کے آنے کے بارے میں کیا گیا تھا، اپنے ایمان و یقین کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ "میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا

---

[1] عربی میں ناموس کا اصلی مطلب پیغامبر ہے یعنی وہ جو کوئی مخفی پیغام لے کر آتا ہے۔ اس کے ثانوی معنی ہیں قانون۔ Deutsch کہتا ہے، "تلمود کی زبان میں اس سے عبارت ہے الہامی قانون۔ ورقہ کے ذہن میں یہ دونوں معنی یکجا ہو گئے، پیغامبر بھی اور پیغام بھی، جو دونوں کے دونوں قدسی تھے، حضرت محمدؐ پر نازل ہوئے جس طرح وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے۔

ہوں جس کے قبضے میں ورقہ کی جان ہے کہ خدا نے تمہیں اس قوم کا نبی منتخب کیا ہے۔ تم پر ناموسِ اکبر نازل ہوا ہے۔ لوگ تمہیں جھوٹا کہیں گے، تمہیں ایذا پہنچائیں گے، تمہیں جلا وطن کریں گے، اور تمہارے ساتھ جنگ کریں گے۔ کاش میں اس دن تک زندہ رہتا، جب یہ سب کچھ تمہیں پیش آئے گا۔ میں زندہ رہتا تو یقیناً تمہارے لیے جنگ کرتا۔[1] یہ کہہ کر ورقہ نے آنحضرتؐ کی پیشانی کو چوم لیا۔ ان اُمید اور یقین سے بھرے ہوئے کلمات نے آپؐ کے مضطرب دل کو تسکین دی۔[2] اس کے بعد کچھ مدت ایسی گزری جب آپؐ اس کے منتظر رہے کہ ندائے غیب پھر آپؐ کو سنائی دے اور آسمان سے جو الہام آپؐ پر نازل ہوا تھا وہ دوبارہ آپؐ کے بے قرار دل کے لیے وجہِ تسکین بنے۔

جو روحانی اذیتیں، شکوک وشبہات اور اُمیدوں کی جو زبردست ذہنی کشمکشیں آنحضرتؐ کے دل کو محسوس رہی تھیں اُن کا کچھ اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اپنی رسالت کا پوری طرح یقین ہونے سے پہلے آپؐ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس ارادے سے فرشتے نے آپؐ کو وہ فرض یاد دلا کر جو نوعِ انسانی کی طرف سے آپؐ پر عائد ہوتا تھا، باز رکھا[3] اور آپؐ کے مضطرب دل کو، جو شبہات اور اندیشوں کے پیچ وتاب میں مبتلا تھا، اس روشن مستقبل کی ایک جھلک دکھا کر جب ساری اقوامِ عالم ایک سچے دین کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گی، اُمید اور یقین دلانے کی کوشش کی۔[4]

---

[1] ابن ہشام، الحلبی، انسان العیون۔ جلد اوّل۔

[2] اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ ابن ہشام

[3] ابن الاثیر۔ طبری

[4] مصنف نے یہاں آنحضرتؐ کے بارے میں شکوک وشبہات، یا باطنی کشمکش اور خلش کا ذکر کیا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے ایک تو وہ انداز ہے جو بعض محدثین نے اختیار کیا اور وہ یہ ہے کہ اس کشمکش یا خلش کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کو خدانخواستہ اپنے منصب کی حقانیت میں کوئی شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ اس کا تعلق تحمل سے ہے یعنی اس حقیقت ربانی (حاشیہ صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس بشارت کی بدولت خودکشی سے باز آکر آپؐ، ذہنی اور جسمانی طور پر تھکے ماندے، جلدی جلدی صحرا سے گھر گئے اور اپنی جاں نثار بیوی سے کہا، "مجھے کمبل اوڑھا دو"، گویا آپؐ میں جلالِ الٰہی کے عینی مشاہدے کی مزید تاب نہ تھی۔

آپؐ کا خدا کے ساتھ جو رابطہ تھا وہ ان خود پرست لوگوں کا سا نہ تھا جو صحراؤں اور جنگلوں میں جا کر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں اور محض اپنے ذاتی سکون کی خاطر ترکِ دنیا اختیار کرتے ہیں۔ آپؐ کو ایک کٹھن مہم درپیش تھی۔ ایک ایسی مہم جس کی طرف تقدیرِ الٰہی آپ کو کشاں کشاں لے جا رہی تھی، یعنی اپنی قوم کو بُت پرستی کی غلامی سے آزاد کرانے کی مہم۔ تقدیر کو آپؐ سے جو کام لینا تھا وہ آپؐ پر اس وقت واضح ہُوا جب آپؐ غمگین اور اُداس، عمیق تفکّر میں ڈوبے ہوئے تھے اور آپؐ کے کانوں میں وہی آواز آئی جس نے آپؐ سے پہلے نبیوں کو پکارا تھا، اور جو آپؐ سے اُٹھ کر دینِ حق کی تبلیغ میں مصروف ہو جانے کا تقاضا کر رہی تھی "اے چادر میں لپٹے ہوئے اُٹھ اور لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرا اور اپنے ربّ کی کبریائی بیان کر" (سورۃ مدثر) آپؐ اُٹھے اور جس کام کی دعوت آپؐ کو دی جا رہی تھی اس کے لیے کمر باندھ لی۔ اس کے بعد آپؐ کی زندگی تمام کی تمام نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کے لیے وقف ہو گئی۔ بے پناہ ظلم و ستم اور تذلیل و توہین کے باوجود آپؐ ثابت قدمی سے تنبیہ و اصلاح کی راہ پر گامزن رہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵) سے ہے کہ منصب کی حقانیت کے باوجود، تشویش اس خبر کی تھی کہ کیا آپؐ نبوّت کی ان گرانقدر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے یا دوسرے لفظوں میں آیا نبوت کے اس غیر معمولی ظہور کو انسانی فکر و تعقل کا یہ کمزور ڈھانچہ آسانی سے قبول کر سکے گا۔

دوسرا انداز وہ ہے جس کو علامہ شبلی نے اختیار کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے سرے سے یہ روایت ہی مرفوع متصل نہیں جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپؐ شدتِ احساس سے خودکشی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس کو زہری نے بیان کیا ہے اور یہیں یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے۔ ظاہر ہے ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے سند منقطع کافی نہیں۔ (دیکھیے سیرت النبی جلد اوّل صفحہ ۱۹۰) - ادارہ۔

حضرت خدیجہؓ سب سے پہلی ہستی ہیں جو آپ کی نبوت پر ایمان لائیں جنھوں نے آپ کے الہامی پیغام کو قبول کیا بت پرستی کو چھوڑا اور صفائے قلب سے آپ کے ساتھ شامل ہو کر خدائے رحیم و رحمٰن کے حضور میں سجدہ گزار ہوئیں۔ یہی نہیں کہ وہ آپ پر اور آپ کی نبوت پر ایمان لانے والی پہلی ہستی تھیں، بلکہ اس جد و جہد میں جو آپ کو پیش آنے والی تھی آپ کی سچی غمگسار بھی تھیں۔ روایت کہتی ہے، "جب آپ خدیجہؓ کے پاس آئے تو انھوں نے آپ کی ڈھارس بندھائی، آپ کی حوصلہ افزائی کی، آپ کا بوجھ ہلکا کیا، آپ کو اپنے ایمان کا یقین دلایا اور لوگوں کی بے ہودہ باتوں کی پروا نہ کرنے کی تاکید کی۔"

شروع شروع میں آنحضرتؐ نے صرف اپنے عزیزوں پر اپنے دل کا راز کھولا اور ان سے اپنے آباؤ اجداد کی قبیح رسوم و عبادات چھڑانے کی کوشش کی۔ خدیجہؓ کے بعد علیؓ نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی[1] لیا اوقات آنحضرتؐ اپنی بیوی اور چچیرے بھائی کو ہمراہ لے کر مکے کے ارد گرد کے صحرا کی تنہائیوں میں چلے جاتے تاکہ تینوں مل کر رب العالمین کے احسانوں کا شکر ادا کریں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ جب یہ تینوں نماز میں مصروف تھے تو اچانک ابو طالب ادھر آنکلے۔ انھوں نے آنحضرتؐ کو اس حالت میں دیکھ کر پوچھا، "بھتیجے، یہ کون سا مذہب ہے جس کی تم پیروی کر رہے ہو؟" پیغمبر اسلام نے جواب دیا، "یہ خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے نبیوں کا اور ہمارے جدِ امجد ابراہیمؑ کا مذہب ہے۔ خدا نے مجھے اپنے بندوں کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں انھیں سچائی کا راستہ دکھاؤں اور آپ، اے میرے چچا، اُن میں سب سے اچھے بندے ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ آپ کو میں اپنا پیغام دوں اور مناسب ہے کہ آپ سچائی کو قبول کریں اور اس کی اشاعت میں مجھے مدد دیں۔" ابو طالب نے ایک قدیم سامی کے شایانِ شان غیرت و حمیت سے جواب دیا۔ "بھتیجے، میں اپنے باپ دادا کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا لیکن قسم ہے خدائے بزرگ و برتر کی کہ جب تک میں زندہ ہوں کوئی تیرا بال بیکا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" اس کے بعد اس معزز بزرگ نے اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر اس کے مذہب کے بارے میں استفسار کیا۔

---

[1] ابن ہشام۔ الحلبی "انسان العیون"۔

علیؓ نے جواب دیا "میرے باپ! میں خدا اور اس کے نبی پر ایمان رکھتا ہوں اور اس نبی کی پیروی کرتا ہوں۔" ابوطالب نے کہا "اچھی بات ہے، میرے بیٹے۔ وہ تجھے صرف نیکی کی طرف بلائے گا، اس لیے میری طرف سے اجازت ہے کہ تو اس کی پیروی کرے۔"[1]

تھوڑی ہی مدت کے بعد زید بن حارث جنھوں نے آزاد کیے جانے کے باوجود آنحضرتؐ کا دامن نہ چھوڑا تھا، دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے اور ان کے بعد قبیلۂ قریش کے ایک معزز رکن عبداللہ بن ابو قحافہ، جنھوں نے آگے چل کر ابوبکرؓ کے نام سے شہرت پائی۔[2] آپؓ خاندان تیم ابن مرہ کے ایک ممتاز فرد اور ایک دولت مند تاجر تھے۔ سلیم الطبع، صائب الرائے، بیدار مغز، دیانتدار اور ہردلعزیز۔ چنانچہ آپؓ اپنے ہم عصروں میں بڑی وقعت رکھتے تھے۔ آپؓ آنحضرتؐ سے صرف دو سال چھوٹے تھے۔ آپؓ کے بلاحیل وحجت قبولِ اسلام کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ پانچ ممتاز افراد نے ان کی مثال کی تقلید کی، جن میں اُموی خاندان کے عثمانؓ بن عفان بھی تھے، جو بعد میں خلیفۂ سوم ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، جنھوں نے بعد میں ایران فتح کیا اور زبیر بن عوام، جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ ان سب نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ ادنیٰ طبقے کے کئی لوگ بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ رسولِ عربیؐ کی داستانِ حیات کا یہ ایک وصفِ جمیل ہے، جو آپؐ کے صدق وخلوص، آپؐ کی تعلیمات کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ پر آپؐ کے راسخ یقین وایمان پر پُرزور دلالت کرتا ہے، کہ آپؐ کے سب سے قریبی رشتہ دار، یعنی آپؐ کی بیوی اور چچیرے بھائی، اور آپؐ کے گھر کے دوست آپؐ کی رسالت کی سچائی اور آپؐ کے مبعوث من اللہ ہونے پر پورا پورا یقین لائے۔ جو لوگ آپؐ کو اچھی طرح جانتے تھے، یعنی قریبی رشتہ دار اور عزیز ترین دوست، جو آپؐ کے

---

[1] ہم نے اس واقعے کو اسی طرح پیش کیا ہے جس طرح اسے ابن ہشام اور ابن الاثیر نے بیان کیا ہے۔

[2] Desvergers ایک حاشیے میں لکھتا ہے کہ قبولِ اسلام سے پہلے حضرت ابوبکرؓ عبدالکعبہ کے لقب سے ملقب تھے۔

ساتھ رہتے سہتے تھے، یہی لوگ آپؐ کے مخلص اور سب سے وفادار پیرو بنے۔ اگر ان لوگوں کو، جو شریف النسب اور عقل مند تھے اور گلیل کے ماہی گیروں سے کسی صورت کم تعلیم یافتہ نہ تھے، معلّمِ اسلام میں دنیا پرستی، فریب کاری یا ضعفِ ایمان کا شائبہ تک نظر آتا تو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے بارے میں آپؐ کی تمام اُمیدیں ایک لمحے کے اندر خاک میں مل جاتیں۔ ان لوگوں نے آپؐ کی خاطر ظلم و ستم سہا، خطرات کا سامنا کیا، جسمانی اذیتیں برداشت کیں اور معاشرتی تعلقات کے انقطاع کی ذہنی تکلیف اٹھائی، یہاں تک کہ اپنی جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر ان لوگوں کو اپنے آقا میں شمّہ بھر خامی بھی دکھائی دیتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرتے؟ لیکن اگر یہ لوگ آپؐ پر اتنا راسخ ایمان نہ بھی لاتے تو یہ امر آپؐ کے کام کی عظمت اور آپؐ کے خلوصِ نیت پر شک کرنے کا کوئی جواز مہیا نہ کرتا۔ نبیوں میں بہت کم ایسے ہوئے ہیں جن پر اُن کے قریب ترین رشتہ داروں نے یقین کیا۔ مثلاً حضرت عیسٰیؑ ہی کو لیجئے، ان کے بھائی اُن پر ایمان نہ لائے[1]۔ بلکہ یہاں تک ان کے مخالف تھے کہ ایک مرتبہ انھیں دیوانہ سمجھ کر قید و بند میں ڈالنے کی کوشش کی[2] اور تو اور اُن کے قریب ترین حواریوں کا عقیدہ بھی راسخ نہ تھا[3]۔

حضرت عیسٰیؑ کے حواریوں کی یہ سست اعتقادی غالباً اُن لوگوں کی سیرت کی کمزوری کا نتیجہ تھی، یا جیسا کہ ملمین کا خیال ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کا اندازِ تکلّم ہر دفعہ بدلتا

---

[1] یوحنّا باب ۵

[2] مرقس باب ۲۱

[3] جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی۔؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا، دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔" متی باب ۱۲ ۴۶ تا ۴۸ اور مرقس باب ۳۲-۳۳

رہتا تھا۔[1] بہرحال اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حواریوں کا ایمان پوری طرح راسخ نہ تھا۔[2] رسولِ اکرمؐ کے مقربین کا وثوقِ عقیدہ و ایمان آپؐ کے خلوص اور کارِ نبوت میں والہانہ استغراق کی افضل ترین شہادت ہے۔

تین سالوں کی طویل مدت میں آپؐ اپنی قوم سے بُت پرستی چھڑانے کی کوششوں میں خاموشی سے معروف رہے لیکن شرک عربوں کی گھٹّی میں تھا۔ علاوہ بریں پرانے مذہب میں ایسی ایسی دلکشیاں تھیں جو نیا مذہب اپنی پاکیزگی کے باعث پیش نہ کر سکتا تھا۔ قریش کے مفادات بُت پرستی سے وابستہ تھے اور ان کی عزت و وقار کا دار و مدار اس کے قائم رکھنے پر تھا۔ رسول اللہ کو نہ صرف اپنے شہر کی بُت پرستی کا مقابلہ کرنا پڑا، جسے صدیوں کے رواج اور اعتقاد نے استحکام بخش رکھا تھا، بلکہ عمائدین کی مخالفت کا بھی جو شہر کے سفید و سیاہ کے مالک تھے اور جو عرب کے عام لوگوں کی طرح توہم پرستی اور کفر میں مبتلا تھے۔ ان مخالف قوتوں کی موجودگی میں مقامِ تعجب نہیں کہ تین سال کی جاں فشانیاں صرف تیس پیرو پیدا کر سکیں۔ پھر بھی اس معلمِ عظیم نے ہمت نہ ہاری اور اس قادرِ مطلق پر بھروسہ کئے ہوئے جس کے احکام کی وہ تعمیل کر رہا تھا اپنے موقف پر قدم جمائے کھڑا رہا۔ آپؐ اب تک نہایت خاموشی سے بلاتعرض تبلیغ کرتے رہے تھے، آپؐ کے ہم وطنوں نے آپؐ کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا، آپؐ کی صحتِ دماغ پر شبہ کیا تھا، آپؐ کو خبطی اور دیوانہ سمجھا تھا، لیکن آپؐ کی خاموش تبلیغ میں خلل اندازی نہ کی۔ اب آپؐ نے تہیّہ کر لیا کہ آپؐ قریش کو بُت پرستی ترک کرنے کی دعوتِ عام دیں گے۔ اس مقصد کی خاطر آپؐ نے کوہِ صفا پر لوگوں کو جمع کیا اور انھیں بتایا کہ ان کی بدکاریاں خدا کی نگاہ میں کتنی معیوب ہیں، اور اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بتوں کا پوجنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ آپؐ نے انھیں ان قوموں کے حالات سنا کر عبرت دلائی جنھوں نے اپنے وقت کے رسولوں کی بات

---

[1] Milman, *History of Christianity*, vol.i pp. 254, 255.

[2] سر ولیم میور اس امر کو نہایت مثبت الفاظ میں تسلیم کرتا ہے (جلد دوم) وہ کہتا ہے "خطرے کی جھلک پاتے ہی حواری بھاگ کھڑے ہوئے۔"

نہ سنی تھی اور انہیں اس کی دعوت دی کہ اپنے قدیم ناپاک طریقہ ہائے عبادت کو ترک کر دیں اور محبت، صداقت اور پاکیزگی کے اس مذہب کو اختیار کریں جس کی تبلیغ آپؐ کر رہے تھے۔ تمسخر اڑانے والوں نے آپؐ کی باتوں کا تمسخر اُڑایا۔ نوجوان علیؓ کے جوشش وخروش کی تضحیک اور طعن آمیز بول بولتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن ان کے دل اس روحِ انقلاب کے خوف سے کانپ رہے تھے جو انہی کے درمیان سے یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یوں آسمانی تنبیہوں کو قریش تک پہنچانے میں ناکام رہ کر آپؐ نے اپنی توجہ ان اجنبیوں پر مبذول کی جو شہر میں تجارت یا حج کی غرض سے آتے تھے۔ آپؐ نے ان تک خدا کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی، لیکن قریش اس میں بھی مزاحم ہوئے۔ جب حجاج شہر کے نواح میں آنے شروع ہوئے تو قریش نے مختلف راستوں پر آدمی متعین کر دیئے اور آنحضرتؐ کو ایک خطرناک جادوگر کہہ کر آپؐ کے ساتھ کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن اس چال بازی کا نتیجہ ایسا نکلا جس کی اہلِ مکہ کو توقع نہ تھی۔ جب حجاج اور تجار اپنے دُور دراز ملکوں میں واپس گئے تو اپنے ساتھ اس عجیب اور جوشیلے معلم کے ظہور کی خبریں لے گئے جو اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر اقوام عرب کو اپنے آباؤ اجداد کے طریقۂ عبادت کو ترک کر دینے کی علی الاعلان دعوت دے رہا تھا۔

اگر قریش اس زعم میں تھے کہ آنحضرتؐ کے اعزہ و اقربا آپؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے تو ابو طالب کی غضب آلود ملامت نے بہت جلد اُن کے دماغ درست کر دیئے۔ یہ بزرگ سال سردار جس نے اپنی مخصوص وفاداری واستواری سے کام لے کر اپنے قدیم مذہب کو ترک کرنے اور نئے مذہب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس ناانصافی اور اس ناروا داری کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا جو اس کے ہم وطن معلمِ اسلام سے کر رہے تھے۔ چنانچہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جو اب تک تاریخ میں یادگار چلا آ رہا ہے۔ اس میں اس نے صحرانشینوں کی قدیم جواں مردی سے کام لے کر قریش کی ان زیادتیوں پر اظہار افسوس کیا جو وہ ایک ایسے شخص پر کر رہے تھے، جو یتیموں اور بیواؤں کا محسن تھا اور جو الامین تھا یعنی کبھی اپنے قول وفعل میں جھوٹا نہ نکلا تھا۔ اسی قصیدہ میں ابو طالب نے اعلان کیا کہ ہاشم اور مطلب کے خاندان کا بچہ بچہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اس معصوم نوجوان کی حمایت اور حفاظت کرے گا۔ انہی دنوں ایک یثربی سردار نے قریش مکہ کو ایک خط لکھا جس میں اس

نے پُرانے زمانے کی مثالیں دے کر انھیں خانہ جنگیوں اور لڑائیوں میں اُلجھنے سے بچنے کی تاکید کی۔ اس نے انھیں مشورہ دیا کہ نئے معلّم کی باتیں سُنیں ”ایک صاحبِ عزّت شخص نے ایک خاص مذہب اختیار کیا ہے۔ تم لوگ کیوں اُسے ستاتے ہو؟ دلوں کے راز صرف آسمانوں کے مالک کو معلوم ہیں۔“ اس کے مشورہ سے قریش کسی حد تک اثر پذیر ہوئے اور ان کا طرزِ عمل قدرے بدل گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ مدّت کے لیے کھلّم کھلا ظلم و ستم کی جگہ سب و شتم، افترا، بدزبانی اور توہین آمیز حرکات سے کام لیا۔ انھوں نے آنحضرتؐ کو کعبے میں نماز ادا کرنے سے روک دیا۔ جہاں آپؐ جاتے وہ آپؐ کا پیچھا کرتے، آپؐ پر اور آپؐ کے متبعین پر نماز کی حالت میں گندگی اور کیچڑ پھینکتے اور بچّوں اور شہر کے بدمعاشوں کو آپؐ کی تذلیل کے لیے آپؐ کے پیچھے لگا دیتے۔ جن راستوں سے آپؐ عبادت یا مراقبے کے لیے گزرتے اُن پر کانٹے بچھا دیتے۔ اس خار افشانی میں آنحضرتؐ کے چچا ابولہب کی بیوی اُمّ الجمیل ہمیشہ پیش پیش رہتی۔ آپؐ کے ستانے والوں میں وہ سب سے زیادہ بے رحم تھی۔ جہاں جہاں بھی آنحضرتؐ یا آپؐ کے متبعین عبادت کے لیے جاتے وہاں کانٹے بکھیر دیتی۔ اس کی اسی ایذا رسانی کی بدولت اس پر حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (خاردار لکڑیاں لاد کر لانے والی) کا لقب نازل ہوا۔[1]

ان تمام آزمائشوں کے درمیان آنحضرتؐ کے قدم نہ ڈگمگائے۔ آپؐ کو اپنی رسالت پر جو کامل اعتماد تھا اس کی بدولت، آپؐ ثابت قدمی سے اپنے کام میں مصروف رہے۔ کئی مرتبہ قریش کے ہاتھوں آپؐ کی جان کو خطرہ لاحق ہوا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے اُن کے قاتلانہ غضب کو اپنی طبیعت کی نرمی اور صبر و تحمل سے فرو کیا۔ لیکن ظلم و ستم نے دینِ حق کو اور بھی تقویت بخشی۔ یہ مشہور مقولہ کہ ”شہدا کا خون کلیسا کا بیج ہے“ صرف دینِ عیسوی پر ہی صادق نہیں آتا۔ قریش نے آنحضرتؐ پر جو سختیاں کیں اور اُن سے جو شدید تعصب روا رکھا، اسے دیکھ کر عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے حمزہؓ، جو سپہ گری میں اپنا حریف نہ رکھتے تھے، دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ یہ بہادر فراخ دل اور راست باز سپاہی جس کی شمشیر صف شکن

[1] سورۂ لہب ۴

سے تمام قریش کا زہرہ آب ہوتا تھا، انہی دنوں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لایا، اور اسلام کا ایک جاں باز پیرو بن گیا۔ بالآخر اس نے اسلام پہ اپنی جان قربان کر دی۔

اس جبر و تعدّی کے باوجود آنحضرتؐ اپنی قوم کو، جو فسق و فجور میں بُری طرح مبتلا تھی، اپنی بدکاریوں اور مکروہات کو ترک کرنے کی مسلسل تلقین کرتے رہے۔ آپؐ دل و جان سے تبلیغ میں مشغول رہے۔ آپؐ نے شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے الفاظ میں وہ عذابِ الٰہی قریش کو یاد دلایا جو عاد و ثمود کے قبیلوں پر نازل ہوا، جنھوں نے خدا کے رسُولوں کی تنبیہوں پر کان نہ دھرے تھے۔ قومِ نوحؑ کی بداعمالیوں پر جو قہرِ الٰہی نازل ہوا تھا اس کے قصّے بھی آپؐ نے انھیں سُنائے۔ آپؐ نے انھیں فطرت کے حیرت انگیز نظاروں کی، دھوپ کی بھڑکیلی چمک کی اور رات کی، جب وہ اپنی سیاہ چادر پھیلا دیتی ہے اور دن کی، جب وہ شان و شکوہ سے ظاہر ہوتا ہے قسمیں دلائیں اور تاکید کی کہ آپؐ کی تنبیہوں کو سُنیں تاکہ وہ اسی طرح کی تباہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے انھیں یوم الحساب سے ڈرایا، جب وہ تمام اعمال جو انسان نے اس دنیا میں کئے ہیں منصفِ ازلی کے رُو برو تولے جائیں گے، جب اُن بچیّوں سے جنھیں زندہ گاڑ دیا گیا تھا پوچھا جائے گا کہ انھیں کس جرم کی پاداش میں ہلاک کیا گیا، جب زمین و آسمان تہ کر دیئے جائیں گے اور جب خدا کے سوا کوئی نزدیک نہ ہو گا۔ آپؐ نے انھیں عقبیٰ کی جزا و سزا کا حال سنایا اور اُن مادہ پرست لوگوں کی آنکھوں کے سامنے جنّت کی لذّتوں اور جہنم کی عقوبتوں کا مرقّع پیش کیا۔ آپؐ نے انھیں بتایا کہ منکرین کی "مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھیری رات میں آگ جلائے اور جب اس کے اردگرد کی تمام چیزیں چمک اٹھیں تو خدا روشنی کو سلب کر لے اور اُسے اندھیرے میں چھوڑ دے۔ پھر وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے۔"

"وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں اور اسی لیے کبھی راہِ راست پہ نہیں آ سکتے۔"

"وہ اُن لوگوں کی طرح ہیں جو اس وقت جب آسمان کے تاریک بادل انھیں گھیر لیتے ہیں اور بجلی کڑکتی ہے بجلی کی کڑک سے ڈر کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ خدا نے کافروں کو گھیرے میں ڈال رکھا ہے۔"[1]

---

[1] سورہ بقرہ ۱۷ تا ۲۰

"بجلی اس زور سے چمکتی ہے کہ جیسے ابھی ان کی بینائی اُچک لے گی۔ جب وہ چمکتی ہے تو وہ اس کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں لیکن جب انھیں تاریکی گھیر لیتی ہے تو وہ رُک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو یقیناً انھیں کانوں اور آنکھوں سے محروم کر دیتا۔ بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے[1]"

"جہاں تک کافروں کا تعلق ہے ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ریگستان میں سراب جسے پیاسا راہگیر پانی سمجھتا ہے، اور جب وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو اُسے وہاں کچھ نہیں ملتا، لیکن وہ خدا کو ہر سمت موجود پاتا ہے اور خدا اس کا پورا پورا حساب چکائے گا، کیونکہ خدا سریع الحساب ہے۔"

یا (کفار کے اعمال) اس تاریکی کی طرح ہیں جو گہرے سمندر پر پھیلی ہوئی ہے۔ موجوں پہ موجیں سوار چلی جاتی ہیں اور اُوپر تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں یعنی ایک تاریکی کے اُوپر دوسری تاریکی، ایسی تاریکی کہ آدمی اگر اپنا ہاتھ پھیلائے تو اُسے نہ دیکھ سکے۔ جسے اللہ نور عطا نہ کرے اُسے کوئی نور عطا نہیں کر سکتا[2]"

ان بیانات سے لوگوں پر ہیبت طاری ہو گئی اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

اب قریش کے دل میں بہت اندیشہ پیدا ہوا کیونکہ آنحضرتؐ کی تبلیغ ایک خطرناک انقلابی تحریک کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کا اقتدار و وقار خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ وہ لوگ ان بتوں کے محافظ تھے جنھیں آپؐ تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ وہ اس عبادت کے کفیل تھے جسے آنحضرتؐ بُرا کہتے تھے۔ اُن کی ہستی پُرانے اداروں کے قائم رہنے پر منحصر تھی۔ انھیں خوف ہوا کہ اگر مبلغِ اسلام کی پیشگوئیاں پوری ہو گئیں تو قبائلِ عرب میں ان کو جو تفوّق حاصل تھا وہ ختم ہو جائے گا۔ اس نئے مبلغ کا اندازِ کلام انتہا درجہ کا جمہوری تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے خدا کی

---

[1] سورہ بقرہ ۱۷ تا ۲۰

[2] سورہ نور

نگاہوں میں سب انسان برابر ہیں۔ پرانے امتیازات کا ہموار ہو جانا ان کی تمام روایات کے منافی تھا۔ انھیں یہ مساوات قبول نہ تھی کیونکہ یہ ان کی خصوصی مراعات کے حق میں مضر تھی۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس تحریک کے مزید قوت حاصل کرنے سے پہلے فوری اقدامات کئے جائیں۔

چنانچہ انھوں نے ایذا رسانی کا ایک منظّم طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن چونکہ وہ انتقام کے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہتے تھے، اس لیے ہر خاندان نے اپنے اپنے حلقۂ اثر کے اندر نئے مذہب کو کچلنے کا ذمہ لے لیا۔ ہر خاندان اپنے ان افراد و متعلقین اور غلاموں کو اذیت دیتا جن کے بارے میں یہ شک ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ آنحضرتؐ جنھیں ابوطالب اور ان کے قرابت داروں کی حمایت حاصل تھی، حضرت ابوبکرؓ اور چند دوسرے لوگ جو یا تو خود صاحبِ مرتبہ تھے یا قریش میں کوئی بارسوخ دوست یا حامی رکھتے تھے کچھ مدت تک فوری جبر و تشدد سے محفوظ رہے، لیکن دوسرے لوگوں کو قید میں ڈال دیا گیا، بھوکا رکھا گیا، اور جسمانی سزائیں دی گئیں۔ رمضا کی پہاڑی اور بطحا یہ دونوں مقام ان بے رحمانہ ایذا رسانیوں کا محل بن گئے۔[1] جو مرد اور عورتیں بُت پرستی کو ترک کر دیتے انھیں صحرا کی جلا دینے والی دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیا جاتا۔ جب وہ پیاس کی شدت سے جاں بلب ہو جاتے تو انھیں موت سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت بتائی جاتی، یعنی بُت پرستی۔ بعض لوگ اس کا اقرار کر لیتے اور اذیتوں سے چھٹکارا پاتے ہی پھر سے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے، لیکن اکثر و بیشتر لوگ نہایت استقلال سے اپنے ایمان پر قائم رہے۔ انہی لوگوں میں اسلام کے پہلے مؤذن بلالؓ تھے۔ ان کا آقا امیّہ بن خلف ہر روز انھیں ٹھیک دوپہر کے وقت بطحا لے جاتا۔ وہاں اُن کی پیٹھ ننگی کر کے اور اُن کا منہ سورج کی طرف کر کے لٹا دیتا اور اُن کے سینے پر پتھر کی چٹان رکھ کر کہتا "تو اسی حال میں رہے گا جب تک یا تو تیری جان نہ نکل جائے یا تو اسلام سے توبہ نہ کرے"۔ لیکن بلالؓ

---

[1] ابن الاثیر جلد دوم - ابن ہشام

اس بھاری بوجھ کے نیچے پیاس سے جاں بلب لیٹے ہوئے بھی "احدٌ"، "احدٌ" کے سوا کوئی جواب نہ دیتے۔ یہ سزا کئی دنوں تک جاری رہی اور بے چارے بلالؓ موت کے کنارے تک پہنچ چکے تھے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں خرید کر ان کی جان بچائی (حضرت ابوبکرؓ اس سے پہلے بھی ایسے ہی چھ غلام آزاد کرا چکے تھے) یاسرؓ اور اس کی بیوی سمیہؓ کو ایسے ہی دردناک عذابوں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ اور ان کے بیٹے عمارؓ کو خوفناک اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آنحضرتؐ نے کئی مرتبہ اپنی آنکھوں سے اپنے متبعین کی اذیتوں کو دیکھا، جو ایسے صبر و تحمل سے برداشت کی گئیں جو راہِ حق میں شہید ہونے والوں کو زیب دیتا تھا۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ اسی طرح کے لاتعداد شہیدوں کی داستانوں سے رنگین ہے[1]۔

جس طرح فریسیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو تحریصوں سے آزمایا تھا اسی طرح قریش آنحضرتؐ کو جادۂ فرض سے منحرف کرنے کی خاطر دنیوی جاہ و حشم کی ترغیبیں دلاتے۔ مورخ لکھتا ہے کہ ایک دن آپؐ کعبہ میں مخالف سرداروں کے مجمع سے الگ بیٹھے تھے کہ ان میں سے ایک یعنی عتبہ بن ربیعہ، جو دوسروں کی بہ نسبت معتدل مزاج تھا، آپؐ کے پاس آیا اور بولا "اے میرے بھائی کے بیٹے تو اپنے اوصاف اور حسب و نسب کی بدولت ہم سب میں ممتاز ہے لیکن تو نے ہمارے درمیان افتراق کا بیج بو دیا ہے، اور خاندانوں میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ تو ہمارے دیوتاؤں اور دیویوں کو برا کہتا ہے اور ہمارے آباؤ اجداد پر ناپاکی کی تہمت دھرتا ہے۔ ہم تیرے پاس ایک تجویز لے کر آئے ہیں۔ اچھی طرح سوچ کر دیکھ لے کہ

---

[1] مثلاً خبیبؓ بن عدی جنھیں دغابازانہ طور پر قریش کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ قریش نے جیتے جی ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے اور ان کے گوشت کو بوٹی بوٹی کر ڈالا۔ جب انھیں یہ عذاب دیا جا رہا تھا تو کسی نے ان سے پوچھا "خبیبؓ کیا تم نہیں چاہتے کہ محمدؐ تمہاری بجائے اس حالت میں ہوتا؟" انھوں نے جواب دیا "واللہ! میں اپنی، اپنے بیوی بچوں اور مال و دولت کی اتنی قیمت بھی ادا کرنے کو تیار نہیں کہ رسول اللہ کے ایک کانٹا بھی چبھ جائے"۔

نوٹ: بعض مورخین اس گفتگو کو زیدؓ ابن الدثنہ سے منسوب کرتے ہیں (شبلی سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۹۳۔ مترجم)

اس میں تیرے لیے بھلائی ہے یا نہیں "۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "بولو ابو ولید، میں سُن رہا ہوں "۔ عتبہ نے کہا "تو جو کچھ کر رہا ہے اگر اس سے تیرا مقصد دولت پیدا کرنا ہے تو ہم تیرے لیے اتنی دولت جمع کر دیں گے کہ تو ہم میں سب سے امیر ہو جائے گا۔ اگر تجھے عزت وحشمت کی خواہش ہے تو ہم تجھے اپنا سردار بنا لیں گے اور تیرے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے، اگر تجھے مملکت کی خواہش ہے تو ہم تجھے اپنا بادشاہ بنا لیں گے اور اگر تو آسیب میں مبتلا ہے تو ہم طبیبوں کو بلائیں گے اور وہ تیرے علاج کے لیے جتنی دولت چاہیں اتنی دولت انھیں دیں گے "۔ جب عتبہ اپنی بات ختم کر چکا تو رسولِ خدا نے پوچھا "ابو ولید! تمھیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے؟" عتبہ نے جواب دیا "ہاں" آنحضرتؐ نے کہا "تو اب میری بات سنو۔ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ یہ کلام اس رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی زبان میں ہے اور ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے جو دانشمند ہیں۔ اس میں سمجھنے والوں کے لیے بشارتیں ہیں اور نہ سمجھنے والوں کے لیے تنبیہیں۔ لیکن اکثر لوگ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اس پر کان نہیں دھرتے اور کہتے ہیں "جس بات کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے وہ ہمارے دل کو نہیں لگتی" ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور تیرے اور ہمارے درمیان ایک پردہ ہے، اس لیے تو اپنی سی کیے جا اور ہم اپنی سی کیے جائیں۔ کہہ دے اُن سے کہ میں تمھی جیسا آدمی ہوں، مگر مجھ پر وحی آئی ہے کہ تمھارا خدا بس ایک خدا ہے اس لیے سیدھے اس کی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو۔ بدبخت ہیں وہ مشرک جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے آخرت میں ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا "۔ (حٰمٓ السجدہ ۱ تا ۸) جب آنحضرتؐ ان آیات کی تلاوت ختم کر چکے تو آپؐ نے عتبہ سے کہا "تم نے سن لیا؟ اب جو راستہ تم بہتر سمجھو وہ اختیار کر و"۔[1]

---

[1] ابن ہشام

اپنے متبعین کی تکلیفیں دیکھ کر جن کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی آپؐ کو بے حد رنج ہوتا۔ اس لیے آپؐ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ قریب کی عیسائی سلطنت حبشہ میں، جہاں ایک خدا ترس بادشاہ حکومت کرتا تھا، جا کر اس وقت تک پناہ لیں جب تک کہ خدائے تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے قریش کے جذبات کو تبدیل نہ کر دے۔ آپؐ نے اس عیسائی بادشاہ کی نیکوکاری، رواداری اور مہمان نوازی کے تذکرے سن رکھے تھے اور آپؐ کو یقین تھا کہ وہ ان کے ساتھ مدارات سے پیش آئے گا۔

پندرہ لوگوں نے اس ہدایت پر فوراً عمل کیا اور نجاشی کے ملک کو ہجرت کر گئے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلی ہجرت کہلاتی ہے اور یہ بعثتِ نبویؐ کے پانچویں سال (۶۱۵ء) میں واقع ہوئی۔ راہِ حق کے بہت سے دوسرے جاں باز بہت جلد اُن لوگوں سے جا ملے، یہاں تک کہ مردوں کی تعداد ۸۳ تک اور عورتوں کی ۱۸ تک پہنچ گئی[1]۔ لیکن قریش کی اَن تھک مخالفت نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اپنے شکار کے ہاتھ سے نکل جانے پر جھنجھلا اُٹھے چنانچہ انھوں نے نجاشی کے دربار میں جا کر یہ مطالبہ کیا کہ مہاجرین کو ان کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ انھوں نے مہاجرین پر جو الزام لگائے اُن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انھوں نے اپنے آبائی مذہب کو ترک اور نئے مذہب کو اختیار کیا تھا۔ نجاشی نے مہاجرین کو بلایا اور اُن سے پوچھا کہ آیا ان کے دشمنوں کا کہنا درست ہے۔ اس نے دریافت کیا "وہ کون سا مذہب ہے جس کی خاطر تم لوگوں نے اپنا پُرانا مذہب ترک کر دیا اور اس کی بجائے نہ میرا مذہب اور نہ کسی اور قوم کا مذہب اختیار کیا ہے؟" حضرت علیؓ کے بھائی جعفرابن ابو طالب نے جو مہاجرین کی نمائندگی کر رہے تھے، ذیل کے الفاظ میں جواب دیا: "اے بادشاہ ہم لوگ جہالت اور بربریت میں ڈوبے ہوئے تھے، ہم بتوں کو پُوجتے تھے، ناپاکی کی زندگی بسر کرتے تھے، مُردار کھاتے تھے اور فحش باتیں کرتے تھے۔ انسانیت کے تمام احساسات ہم میں مفقود ہو چکے تھے اور ہم مہمان نوازی کے فرائض اور حقوقِ ہمسائیگی کو فراموش کر چکے تھے۔ ہم طاقت

---

[1] ابن ہشام۔ ابن الاثیر۔ ابو الفداء

کے سوا کسی قانون کو نہ مانتے تھے۔ ایسے میں خدائے تعالےٰ نے ہم میں سے ایک ایسا انسان پیدا کیا جس کی شرافتِ نسب، راست بازی، امانت داری اور پاکیزگی سے ہم سب واقف تھے۔ اس نے ہمیں خدا کی وحدانیت کی طرف دعوت دی اور ہمیں یہ سکھایا کہ کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں[1]، اس نے ہمیں بُت پرستی سے منع کیا اور ہمیں یہ ہدایت کی کہ سچ بولیں، اپنے وعدوں کو پورا کریں، صلۂ رحمی کا طریقہ اختیار کریں اور اپنے ہمسایوں کے حقوق کا احترام کریں۔ اس نے ہمیں عورتوں کے بارے میں بُری بُری باتیں کرنے اور یتیموں کا مال کھانے سے باز رکھا۔ اس نے ہمیں بُرائیوں سے دُور رہنے، خرابیوں سے بچنے، نماز ادا کرنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اس کی اس ہدایت و تعلیم کو قبول کیا ہے کہ ہم صرف خدا کی عبادت کریں اور کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ان وجوہ کی بناء پر ہماری قوم کے لوگ ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انھوں نے ہمیں اس پر مجبور کرنے کے لیے کہ ہم خدائے واحد کی عبادت سے روگرداں ہو کر لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے بتوں کی پُوجا اور اس طرح کی دوسری مکروہات کی طرف لوٹ جائیں۔ انھوں نے ہمیں اس حد تک دُکھ پہنچائے ہیں اور اذیتیں دی ہیں کہ ہم اُن سے تنگ آ کر تیرے ملک میں پناہ گزین ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو ہمیں اُن کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھے گا[2]۔"

نجاشی نے قریش کے مطالبات رَد کر دیئے اور اُن کے ایلچی ناکام و نامراد مکّے کو واپس چلے گئے۔

جس زمانے میں حضرت محمّدؐ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متبعین دوسرے ممالک میں دشمنوں کے ظلم و ستم سے پناہ ڈھونڈ رہے تھے آپؐ خود ہر طرح کی توہین و تحقیر کے باوجود نہایت ہمت و

---

[1] بُت پرستوں کو قرآن میں تقریباً ہر جگہ مشرکین کے لقب سے پُکارا گیا ہے کیونکہ وہ دوسری ہستیوں کو خدا کا شریک گردانتے تھے۔

[2] پیغمبرِ اسلامؐ کے کارناموں اور تعلیمات کا کیا اس سے بہتر کوئی خلاصہ ہو سکتا ہے؟ —— ابن الاثیر، ابن ہشام۔

استقلال سے سرگرم تبلیغ تھے۔ قریش پھر ایک بار جاہ و دولت کی پیشکش لے کر آپؐ کو جادۂ فرض سے منحرف کرنے کی خاطر آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے پھر ویسا ہی جوشِ ایمان سے پُر جواب دے کر انھیں لوٹا دیا: "مجھے نہ مال و دولت کی خواہش ہے، نہ شوکت و مملکت کی ہوس۔ مجھے خدا نے بھیجا ہے تاکہ تمھیں بشارت دوں۔ میں تمھیں خدا کا کلام سناتا ہوں اور تمھیں نصیحت کرتا ہوں۔ اگر تم وہ پیغام قبول کرو جو میں لایا ہوں تو خدا تم پر اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی مہربان ہوگا۔ اگر تم میری نصیحتوں کو رَد کر دو تو میں صبر سے کام لوں گا اور اس کو خدا پر چھوڑ دوں گا کہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے۔" قریش نے آنحضرتؐ کی باتوں کو تمسخر میں اُڑا دیا اور ٹیڑھے میڑھے سوالوں سے آپؐ کی تعلیمات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی[1]۔ لیکن آپؐ کا سیدھا سادا اور اٹل ایمان باللہ قریش کے مادہ پرستانہ تشکک پر غالب رہا۔ انھوں نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ آپؐ زمین کو پھاڑ کر چشمے اور دریا جاری کر دیں، آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کے اوپر گرا دیں، اپنے لیے سونے کا ایک گھر بنا کر کھڑا کر دیں یا سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائیں۔ (بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳) یہ وہی حضرت عیسیٰ والے پُرانے قصے کا اعادہ تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ سے خود ان کے پیرو تقاضا کرتے تھے کہ وہ اپنی رسالتؑ کی سچائی ثابت کرنے کے لیے معجزے دکھائیں۔ پروفیسر مومری (Momerie) کا کہنا ہے: "حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے اُن کو اور اُن کے کام کو کبھی نہ سمجھا۔ وہ ان سے یہی مطالبے کرتے رہے کہ وہ آسمان سے آگ برسائیں، یہودیوں کا بادشاہ ہونے کا اعلان کریں اور اُن لوگوں کو اپنے تخت کے دائیں بائیں بٹھائیں۔ وہ اُن کے آسمانی باپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ آپؐ سے ایسے ایسے کام کرانا اور خود ایسے کام کرنا چاہتے تھے جو اُن کے عظیم الشان منصوبے سے کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ سے آخر تک ایسا ہی سلوک کرتے رہے اور جب ان کا انجام آ پہنچا تو انھیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے۔"

---

[1] ابن ہشام۔ ایک عیسائی مؤرخ بت پرستوں کی مڑشگافیوں کا تذکرہ بڑا لطف لے لے کر کرتا ہے۔
ملاحظہ کیجیے: Osborn, *Islam under the Arabs.*

ان غیر مطمئن اور ڈھلمل یقین لوگوں کو جو خارقِ عادت کرشموں کی خواہش میں قریش سے کسی طرح کم نہ تھے اور جنھوں نے حضرتِ عیسیٰؑ کی قابلِ احترام ہستی کو ایک ایسی دھند میں مستور کر دیا جس کا پردہ جدید عینیت پرست عیسائیت بھی اُن کے چہرے سے نہیں ہٹا سکی حضرت عیسیٰؑ کبھی نرمی سے اور کبھی غصہ سے یہ جواب دیا کرتے تھے کہ صرف بدکار اور شہوت پرست لوگ نشانیاں طلب کرتے ہیں، اور وہ انھیں نشانیاں دکھانے سے انکار کر دیا کرتے تھے، کیونکہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے وہ اس صورت میں بھی توبہ نہیں کریں گے کہ کوئی پیغمبر مُردوں میں سے اُٹھ کر ان کے سامنے آجائے[1]

رسُولِ عربی کے متبعین اس بارے میں لائقِ تحسین ہیں کہ انھوں نے کبھی اپنے آقا سے معجزوں کی فرمائش نہیں کی۔ وہ سب کے سب، عالم ہوں کہ تاجر یا سپاہی، صرف آپؐ کی تعلیمات کی اخلاقی شہادتوں پر نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے تمام دنیاوی مفادات اور اپنی تمام دنیاوی اُمیدوں کو قربان کر کے، اپنے بے یار و مددگار معلّم کے گرد جمع ہو گئے اور زندگی اور موت میں آپؐ کی انسانی شخصیت کے ساتھ ایسی وفاداری و جاں نثاری سے وابستہ رہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔

ایک ایسے زمانہ میں جب معجزے آئے دن کے واقعات سمجھے جاتے تھے جنھیں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ بزرگ بھی ایک اشارہ سے رونما کر سکتا تھا اور جب صرف عرب ہی میں نہیں بلکہ ان ہمسایہ ممالک میں بھی جہاں تہذیب بہت زیادہ ترقی کر چکی تھی، ساری فضا مافوق العادات سے معمور تھی، عقلیت کا یہ عظیم علمبردار معجزوں کا مطالبہ کرنے والے کفّار کو بلا تامّل جواب دیتا

---

[1] قدامت پرست عیسائیت کا یہ عقیدہ تھا اور اب بھی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزے اُن کی الوہیت کی دلیل تھے۔ جدید عیسائیت معجزوں کے لیے Aberglaube کا لفظ استعمال کرتی۔ جیسا کہ Literature and Dogma کا مصنّف کہتا ہے، ایک نہ ایک دن معجزوں پر یقین اُٹھ جائے گا اور دینِ عیسوی کے معجزوں کی جو روایات ہیں وہ مشرقی اور مغربی قصے کہانیوں میں شامل ہو کر رہ جائیں گی۔

ہے "خدا نے مجھے کرشمے دکھانے کے لیے نہیں بھیجا، اُس نے مجھے تمھاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ قابلِ تعریف ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟ ..... فرشتے زمین پر آباد نہیں، ورنہ خدا کسی فرشتے کو تمھارے پاس پیغمبر بنا کر بھیجتا (بنی اسرائیل ۹۳-۹۴-۹۵) ..... میں نے کبھی دعوےٰ نہیں کیا کہ خدا کے خزانے میرے قبضے میں ہیں یا مجھے غیب کا علم ہے یا میں کوئی فرشتہ ہوں"۔

"میں خود اپنی ذات کے لیے کسی نفع و ضرر کا اختیار نہیں رکھتا، مگر اسی حد تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے" (الاعراف ۱۸۸) ان باتوں میں نہ کوئی غیر معمولی ادعا ہے، نہ کوئی مبالغہ آمیزی ہے، نہ اپنی سیرت یا شخصیت کو ساحرانہ کشش سے آراستہ کرنے کی کوشش ہے "میں صرف خدا کے کلام کا مبلغ اور بنی نوعِ انسان کو خدا کا پیغام دینے والا ہوں" بار بار آپؐ اسی کا اعادہ کرتے ہیں۔ اوّل سے آخر تک آپؐ کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلتا جس کو "اس پر محمول کیا جاسکے کہ آپؐ انسانوں سے اپنی پرستش کا مطالبہ کرتے ہیں"[1]۔ اوّل سے آخر تک آپؐ کے کلام میں ایک غیر مبدّل متانت ہے جو زمانے اور ماحول کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ اوّل سے آخر تک آپؐ کا کلام اپنے خالق کے حضور میں ایک سیدھے سادے اور عمیق عجز و انکسار سے پُر ہے۔ آپؐ کے جذبات اپنے عروج کے لمحوں میں بھی عاجزانہ شکر گزاری کے جذبات ہیں:۔

"میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔ جو چیزیں بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں، جو بادشاہ ہے، عیبوں سے پاک ہے، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے عرب کے ناخواندہ لوگوں میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کو (عقائدِ باطلہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتا ہے، اور انھیں کتابِ الٰہی اور دانشمندی سکھاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے یہ صریح گمراہی میں مبتلا تھے..... یہ خدا کا فضل ہے، وہ فضل جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل

---

[1] پروفیسر مونٹگمری

والا ہے۔" (الجمعۃ ا تا ۴)

ہر قسم کی طاقتِ کرشمہ سازی سے مبرّا ہونے کا اعلان کر کے پیغمبرِ اسلامؐ صرف اپنی تعلیمات کو اپنی قدسی رسالت کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی قوتِ نفوذ کا لوہا منوانے یا اپنی تنبیہات کو مؤثر بنانے کے لیے کبھی معجزوں کی آڑ نہیں لیتا۔ وہ ہمیشہ فطرت کے جانے پہچانے مظاہر سے وجودِ باری تعالیٰ پر دلیل لاتا ہے[1]۔ وہ مستقلاً انسان کی فطری کمزوری یا زود اعتقادی کی بجائے اس کے شعورِ باطنی اور اس کی عقل سے خطاب کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ اپنے ارد گرد نظر ڈالو، یہ حیرت انگیز دنیا، سورج، چاند اور ستارے، جو آسمان کے نیلے گنبد میں خاموشی اور تیزی سے اپنے مقررہ راستے پر چلے جاتے ہیں، یہ قانون اور نظام جو کائنات پر حکمران ہے، یہ بارش کے قطرے جو مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتے ہیں، یہ جہاز جو انسان کی منفعت کی چیزوں سے لدے ہوئے سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جاتے ہیں، زریں پھلوں سے لدے ہوئے کھجور کے درخت ـــ کیا یہ چیزیں تمھارے لکڑی اور پتھر کے دیوتاؤں کی بنائی ہوئی ہیں (مبنی بر الفرقان (۴۹ تا ۵۹ اور سورۂ قٓ)

"نادانو، تم نشانیاں چاہتے ہو جب کہ ساری کائنات خدا کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنے جسم کی بناوٹ ہی کو دیکھو۔ کیسی حیرت انگیز طور پر پیچیدہ اور کس خوبصورتی سے ترتیب دی ہوئی ہے۔ رات اور دن کا ایک دوسرے کے بعد آنا جانا، زندگی اور موت، تمھارا سونا اور جاگنا، خدا کی فراواں نعمتوں سے متمتع ہونے کی جو خواہش تمھارے دل میں ہے، ہوائیں پانی سے لدے ہوئے بادلوں کو خدا کی رحمت کا پیش خیمہ بنا کر لاتی ہوئی، گونا گونی میں ہم آہنگی اور حسنِ ترتیب، نسلِ انسانی کی رنگا رنگی میں باہمی وابستگی، پھل پھول، چرند پرند

---

[1] اس موضوع پر سر ولیم میور کی عبارت ذیل قابلِ غور ہے: "یہ محلِ نظر ہے کہ آیا مکہ کی بت پرستی کسی مقابلے کے بغیر محمد صلعم کی تعلیمات کے سامنے جنھیں آپ مدلّل شواہد سے تقویت بخشتے تھے، سپر انداز ہو جاتی" قریش کی طرح میور بھی خرقِ عادات کی تائید کے بغیر تعلیمات محمدؐ کو کافی نہیں سمجھتا۔

خود انسان — کیا یہ چیزیں ایک عقلِ کل کے وجود کا کافی ثبوت نہیں ؟[1]

پیغمبرِ اسلام کی نگاہوں میں فطرت بجائے خود ایک الہام اور معجزہ ہے۔ ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید — وَحدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ گوید

وحدانیت کا پیغمبر از بسکہ فطرت کا پیغمبر تھا۔ اس کی تعلیمات کی اخلاقی دلنشینی اور توحیدِ الٰہی کے پُر ذوق وشوق دعوے کی بنیاد ایک محیطِ کل نظام کے عقلی و ذہنی ادراک پر ہے اور ایک واحد عقل اور واحد ارادہ کے عینی شواہد پر جو کائنات کی تنظیم، ہدایت اور حکومت کا ذمہ دار ہے۔ اس کا سب سے عظیم الشان معجزہ وہ کتاب ہے جس میں اُس نے "فطرت، ضمیر اور رسالت کے تمام انکشافات" کو الہامی زبان میں بیان کر دیا۔ "اے منکر لوگو، کیا تم کوئی اس سے بھی بڑا معجزہ چاہتے ہو کہ تمہاری عامیانہ زبان میں وہ بے مثال کتاب نازل کی گئی جس کے آگے تمہاری ساری شاعری اور تمہارے سارے معلقات ہیچ ہیں، تاکہ اس کے ذریعہ ساری کائنات کو رحم وکرم کی بشارت دی جائے، اور تکبر وجبر کرنے والوں کو ڈرایا جائے ؟"

لیکن قریش نے آپؐ کے مواعظ ونصائح پر کان نہ دھرے۔ ان کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ وہ خدا کی نشانیوں کو اور کارخانۂ قدرت میں ذاتِ باری تعالیٰ کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کے کان اتنے بہرے تھے کہ انھوں نے اس صاحبِ بصیرت کی بات نہ سنی جو انھیں نیکی کی طرف لوٹ آنے اور اپنے قدیم جرائم ومکروہات کو ترک کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ انھوں نے رسولؐ اللہ کو جو جواب دیا اس سے ایسی شدید مخاصمت ٹپکتی تھی جس کی مثال صرف اس تشدد میں ملتی ہے جو عیسائیت کی تاریخ میں ایرینوں اور غلیبیوں نے کیا۔ ان کا جواب یہ تھا "جان رکھ، اے محمدؐ! ہم تیری تبلیغ کو رد کرنے سے اس وقت تک باز نہ آئیں گے جب تک یا تو فنا نہ ہو جائے یا ہم فنا نہ ہو جائیں"۔

انہی دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی تعبیر مسلم مؤرخین نے ایک طریقہ سے کی ہے[1]

---

[1] مبنی بر الانعام - ۹۶ تا ۹۹، الذّٰرِیٰت ۲۰، الحجر - ۲۰، طٰہٰ - ۵۰ تا ۵۷، سبا ۲۰ تا ۲۸، ۲۹ وغیرہ وغیرہ۔

آنحضرتؐ کے عیسائی سوانح نگاروں نے ایک اور طریقے سے۔ ایک دن آپؐ پر وحی کی حالت طاری تھی اور آپؐ چند آیات تلاوت فرما رہے تھے جو اب قرآن کے ترپنویں (۵۳ ویں) سورۂ نجم) کا جزو ہیں۔ جب آپؐ ان الفاظ تک پہنچے، "کیا تم لوگوں نے لات اور عزّیٰ اور وہ جو تیسری دیوی مناۃ ہے، اُن کے بارے میں بھی غور کیا ہے؟" ایک بُت پرست نے جو اس موقع پر موجود تھا اور جسے روایات نے اب شیطان میں تبدیل کر دیا ہے، ان دیویوں کی مذمت کی پیش بندی کرنے کے ارادہ سے پکار کر کہا "یہ حسین اور سربلند دیویاں ہیں جن سے عِندَ اللہ شفاعت کی اُمید کی جا سکتی ہے"۔ اس نے یہ کلمات ایسے طور پر کہے کہ گویا یہ وحی کا جزو ہیں۔ قریش یا تو اس چالاکی کی کامیابی پر خوش ہوئے یا اُن الفاظ کو آنحضرتؐ کے الفاظ تصور کر کے یہ سمجھے کہ آنحضرتؐ نے ان کے بتوں کی رعایت کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً مصالحت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ جب آنحضرتؐ کو حقیقتِ حال کا علم ہُوا تو آپؐ نے فوراً اعلان کیا، "وہ کچھ بھی نہیں محض چند خالی خولی نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے گھڑ لیے ہیں"۔ مسلمان مؤرخین اور راویانِ حدیث نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔ لیکن عیسائی سوانح نگاروں نے اُسے ایسے طریقہ سے پیش کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے آنحضرتؐ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی قسم کی مصالحت سے قریش کے ساتھ جھگڑے کو ختم کیا جائے۔ متعصب لوگ اسے لغزش اور تعصب سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن فراخ دل اور غیر متعصب مؤرخین کے نزدیک یہ واقعہ رسُولِ عربیؐ کے جمالِ سیرت کو اور بھی تاباں بنا دیتا ہے۔ ظلم وستم روز بروز بڑھتا چلا جاتا تھا، آپؐ کے متّبعین کی تکالیف شدید تر ہوتی چلی جاتی تھیں اور شہر کی ساری آبادی مسلح ہو کر آپؐ کے مقابلے پر تلی ہوئی تھی۔ آپؐ کو اپنے متبعین کی حالتِ زار دیکھ کر سخت رنج ہوتا تھا۔ عربوں کی بُت پرستی کے خلاف نڈھال کر دینے والی جنگ نے آپؐ کو غمزدہ کر دیا تھا۔ کوئی مقامِ تعجب نہیں اگر اپنے متعصب دشمنوں کے حق میں تھوڑی سی رعایت کر کے کشمکش کو ختم کرنے کا خیال لمحہ بھر کے لیے آپؐ کے دل میں آیا۔[1] اس طرح محمدؐ نے مشرکین کے حق میں اپنی پہلی اور آخری رعایت کی۔ آپؐ

---

[1] غرانیق کا قصہ بالکل لغو اور بیہودہ ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ آنحضرتؐ نے جب (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

نے قرآن کی ایک آیت تلاوت کی جس میں آپؐ نے ان تین چاند دیویوں کا تذکرہ احترام سے کیا اور اس کا اقرار کیا کہ ان سے عند اللہ شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے پس خدا کے آگے جھک جاؤ اور اس کی بندگی کرو۔ سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر محمدؐ کے خدا کے حضور سجدہ میں گر گیا۔ سارے شہر نے اس دو گونہ مذہب کو قبول کر لیا۔ لیکن صحرا کا یہ رویا دیکھنے والا ایسا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۵) سورۂ نجم کی ان آیات کی تلاوت کی ہو تو کسی شریر نے کہہ دیا ہو کہ آنحضرتؐ نے چند لمحوں کے لیے ہی سہی بتوں کی عظمت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور ان کی شفاعت کو پذیرائی کے لائق سمجھ لیا تھا لیکن آنحضرتؐ کا فی الواقع ایسا کرنا قطعی قرینِ عقل نہیں۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل نکات پر غور کر لینا چاہیے۔

۱ قرآن حکیم نے منصب نبوت کے بارہ میں جن خصائص کی تشریح کی ہے۔ ان میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پیغمبر کبھی بھی باطل سے سمجھوتا نہیں کرتا۔ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ مصالحت اور تالیفِ قلب اپنی جگہ اچھی چیز ہے مگر پیغمبر، اس کے لیے اس بنیادی عقیدہ سے انحراف نہیں کر سکتا۔ کہ جس پر اس کی دعوت کا دارومدار ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصب جلیل کے اعتبار سے ایک طرح سے مجبور ہے کہ توحید کے انوار کو عام کرکے رہے۔ منصب نبوت کے بارہ میں چند آیات ملاحظہ ہوں۔

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین۔ الحجر ۹۴ — غرض آپؐ کو جس بات کا حکم کیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنا دیجیے اور مشرکین کی پروا نہ کیجیے۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی۔ یونس ۱۵ — آپؐ یہ کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں، بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ پہنچا ہے۔

لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین۔ الحاقہ ۴۶ — اگر یہ پیغمبر ہمارے ذمہ جھوٹی باتیں لگا دیتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑتے پھر ہم ان کی رگِ دل کاٹ دیتے۔

کیا ان شواہد کے بعد بھی ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ بتوں کی تعریف میں آنحضرتؐ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

شخص نہ تھا کہ ایک جھوٹی بات پر توقف کرتا رکھے کا سارا شہر بھی اس کی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنے اندر کی صداقت کو جھٹلاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے میدان میں آکر اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہوگئی تھی: اسے شیطان نے ورغلا دیا تھا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ کو واپس لیا اور کہا :۔ "جہاں تک ان بتوں کا تعلق ہے وہ محض خالی خولی نام ہیں جنھیں انھوں نے اور ان کے آبا و اجداد نے وضع کر لیا ہے[1]۔"

مغربی سوانح نگاروں نے محمدؐ کی اس "لغزش" پر بڑی شماتت آمیز خوشی کا اظہار کیا ہے لیکن جھگڑا چکانے کا یہ حیلہ ایسا تھا کہ بہت کم لوگ اس سے کام لینے سے انکار کرتے۔ پھر محمدؐ کی زندگی کسی دیوتا کی زندگی نہیں بلکہ ایک انسان کی زندگی ہے، ایسے واردات و تجربات سے پورے طور پر مملو جو انسانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اہل مکہ کی تالیف قلوب اور ان کے شدید جبر و ستم سے امان حاصل کرنے کی خاطر محمدؐ نے ان کی بات کی تغلیط نہ کی تو ہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۶) کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہوں گے؟

(۲) مصنف نے اپنی طرف سے یہ جملہ بڑھا دیا ہے لیکن کبار محدثین مثلاً علامہ عینی، حافظ منذری بیہقی قاضی عیاض اور نووی نے اس قصہ کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔ نووی کا کہنا ہے۔ لایصح فیہ شئی لا من جھۃ النقل ولا من جھۃ العقل۔ کہ یہ قصہ نہ تو روایت کے اعتبار سے صحیح ہے اور نہ عقل و درایت کے اعتبار سے ہی درست ہے۔

(۳). آخری اور اہم نکتہ یہ ہے کہ سورہ نجم کی جن آیات کے بعد اس جملہ کو بڑھایا گیا ہے سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ کیونکہ اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مضمون و معنی کا پورا کارخانہ ہی مختل ہو کر رہ جائے گا۔ یہی نہیں لات اور منات سے متعلق قرآن حکیم نے جو اعتراض کیا ہے۔ یعنی یہ سب تو مؤنث ہیں، اور کیا انصاف ہے کہ تم اپنے لیے تو بیٹے تجویز کرتے ہو اور اللہ کے لیے بیٹیاں۔ الکم الذکر ولہ الانثیٰ۔ تلک اذاً قسمۃ ضیزیٰ (بقیہ)

[1] Stanley Lane poole, *Introduction to the Selections from the Koran*, p.xiix

اس بارے میں کیا کہیں گے کہ اس نے اس مصالحت کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا تھا اس سے وہ مردانہ وار دست بردار ہو گیا اور اپنی غلطی کا علانیہ اقرار کر کے دوبارہ قریش کی توہین و تحقیر کا مورد بننے کے لیے سینہ سپر ہو گیا؟

آپؐ کے یہ اعلان کرتے ہی کہ لات، عزیٰ اور منات صرف نام ہی نام ہیں ظلم و ستم آگے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ از سرِ نو شروع ہو گیا۔ لیکن آپؐ کو تائیدِ ایزدی کا جو یقین واثق تھا اور فرشتۂ رحمت آپؐ کو جو آسمانی پیغام دے رہا تھا اُن کے بل بوتے پر آپؐ نے اپنے دشمنوں کی مخالفت اور ایذا رسانیوں کی پروا نہ کر کے اپنی تبلیغ کو جاری رکھا۔ چنانچہ ہر طرح کی مزاحمت کے باوجود آپؐ کی تعلیمات آہستہ آہستہ لیکن استقلال کے ساتھ پھیلتی گئیں۔ سچائی کے جو بیج اس طرح بوئے گئے اُن کو پنپنے سے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی۔ صحرا کے وحشی عرب اور وہ تاجر جو دور دراز شہروں سے قومی میلے میں آتے تھے وہ اس عجیب و غریب انسان کی باتیں سنتے جسے اس کے دشمن آسیب میں مبتلا سمجھتے تھے، اس کی وہ تعلیمات سنتے جو اُس کی روح کی گہرائیوں سے نکلتی تھیں، خوف و حیرت سے اُس کے وہ ملامت آمیز کلمات سنتے جو وہ اُن کے بتوں، ان کی توہم پرستیوں، اُن کی بد افعالیوں اور اُن کے بُرے طور طریقوں کے بارے میں کہتا تھا۔ وہ یہ سب کچھ سنتے اور اس سے غیر شعوری طور پر ایک نئی روشنی اور ایک نئی زندگی حاصل کر کے اپنے دُور اُفتادہ علاقوں میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ وہ ہجو آمیز باتیں اور گالیاں جو آنحضرتؐ کے دشمن آپؐ کی شان میں بکتے تھے اُلٹا آپؐ کے کلام کی شہرت کو دوبالا کر دیتیں۔

اس اثناء میں اہلِ مکہ بھی نچلے نہ بیٹھے رہے تھے۔ کئی مرتبہ قریش نے ابو طالب کے پاس وفد بھیجے کہ وہ اپنے بھتیجے کو اُن کے مذہب کے خلاف تبلیغ کرنے سے روک دیں۔ شروع شروع میں تو ابو طالب انھیں خلق اور نرمی سے واپس کر دیتے رہے۔ لیکن جب قریش کے الحاد و نا پاکی کے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی آتش بیانیاں جاری رہیں تو انھوں نے آپؐ کو کعبہ سے نکال دیا، جہاں آپؐ تبلیغ کیا کرتے تھے، اور پھر اکٹھے ہو کر آپؐ کے چچا کے پاس آئے[1] اور کہا: "ہم آپ

---

[1] تاریخ طبری

کی بزرگی اور رُتبے کا لحاظ کرتے ہیں، لیکن آخر اس کی کوئی حد بھی ہے۔ آپؐ کا بھتیجا ہمارے بُتوں اور ہمارے آباو اجداد کے بارے میں جو گستاخانہ باتیں کہتا ہے اب وہ ہمارے دائرۂ برداشت سے باہر نکل گئی ہیں۔ یا تو آپؐ اُسے اس سے باز رکھیں یا خود اس کے ساتھ شامل ہو جائیں تاکہ تلوار ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور ہم دونوں میں سے ایک گروہ ہلاک ہو جائے۔[1] یہ کہہ کر وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ ابوطالب کو نہ تو اپنی قوم سے جُدا ہونا گوارا تھا نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے کو بُت پرستوں کے حوالے کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کو بُلا بھیجا اور آپؐ کو قریش کی باتوں سے مطلع کر کے تبلیغ ترک کر دینے کی التجا کی۔ آنحضرتؐ کے دل میں خیال گزرا کہ غالباً آپؐ کے چچا آپؐ کی حمایت سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں لیکن بیکسی کے اس لمحے میں بھی آپؐ کا عزم بلند برقرار رہا۔ آپؐ نے مضبوطی سے جواب دیا: "اے میرے چچا، اگر یہ لوگ میری داہنی ہتھیلی پر سورج اور بائیں ہتھیلی پر چاند رکھ دیں اور مجھے اپنے کام سے باز آنے کو کہیں تو میں پھر بھی باز نہ آؤں گا، جب تک کہ خدا کا منشا پورا نہ ہو جائے یا میں اس کے پورا کرنے کی کوشش میں فنا نہ ہو جاؤں۔" لیکن اپنے مشفق چچا کے ترکِ حمایت کے خیال سے غمزدہ ہو کر آپؐ پلٹ کر جانے ہی کو تھے کہ ابوطالب نے پُکار کر کہا: "ادھر آؤ میرے بھتیجے، جو تمھارا جی چاہتا ہے کہتے چلے جاؤ، میں کبھی تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔"[2] قریش نے پھر ایک مرتبہ کوشش کی کہ ابوطالب اپنے بھتیجے کو اُن کے سپرد کر دیں۔ آنحضرتؐ کے بدلے میں انھوں نے قبیلۂ مخزوم کا ایک شخص دینے کی پیشکش کی لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔[3] ابوطالب نے اپنے بھتیجے کی حمایت کا جو اعلان کیا تھا اس سے قریش بہت خشمناک ہو گئے اور آگے سے بھی زیادہ جبر و تشدّد کی دھمکیاں دینے لگے۔ اس محترم رئیسِ قبیلہ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو، جو آنحضرتؐ کے قرابت دار تھے، ان کی عزّت کا واسطہ دلایا اور اُن سے التجا کی کہ اپنے خاندان کے اس ممتاز فرد کو حریف قبیلوں کی نفرت

---

[1] ابن الاثیر۔ ابن ہشام،

[2] ابن ہشام، ابن الاثیر، ابوالفداء۔

[3] ابن ہشام، ابن الاثیر۔

اور عداوت کا ہدف بننے سے بچائیں۔ اس التجا کا سب نے احترام کیا، نہ کیا تو صرف بھینگے ابولہب نے۔

اس زمانہ میں اسلام کو ایک قوی وجری حامی ہاتھ آیا یعنی حضرت عمرؓ جن کی مستعدی و سرگرمیٔ عمل نے انھیں مملکتِ اسلامیہ میں آگے چل کر بڑی اہمیت بخشی۔ انھوں نے دینِ محمدیؐ کی جو خدمات انجام دیں ان کی بدولت اُن کا نام جریدۂ تاریخ پر ثبت ہے۔ وہ عدی بن کعبؓ کے خاندان کے ایک ممتاز فرد اور خطّاب کے فرزند تھے، جو مسلمانوں کی ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ قبولِ اسلام سے پہلے وہ اسلام کے شدید مخالف اور پیغمبرِ اسلام کے سخت دشمن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا قبولِ اسلام قرآن کی ایک سورت کے معجز اثر کا نتیجہ تھا، جس کی تلاوت انھوں نے بہن کے مکان پر سُنی، جہاں وہ انتہائی غضب کے عالم میں قاتلانہ ارادے سے گئے تھے۔ آپؓ کے کانوں میں جو کلام پڑا اس سے آپ اس قدر متاثر ہوئے کہ سیدھے آنحضرتؐ کے پاس گئے۔ اُن کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی جو وہ آنحضرتؐ اور اُن کے متبعین کے قتل کی خاطر گھر سے لے کر نکلے تھے۔ جو مومنین آنحضرتؐ کے پاس بیٹھے آپ کے ارشادات سُن رہے تھے وہ حضرت عمرؓ کو اس عالم میں آتے دیکھ کر ہراساں ہو گئے، لیکن حضرت عمرؓ نے آگے بڑھ کر رسُولؐ اللہ کا ہاتھ چوم لیا اور دینِ حق کے دائرے میں داخل کئے جانے کی درخواست کی۔ مومنین نے ان پر خدا کے فضل کا یہ نزول دیکھ کر نعرۂ تشکّر بلند کیا۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ اسلام کے لیے زبردست پشت پناہ ثابت ہوئے۔

اب مسلمانوں کو اس کی ضرورت نہ رہی کہ کونوں کھدروں میں چھپے رہیں اور درپردہ نماز ادا کریں۔ طبقۂ غربا کے کثیر التّعداد پیروؤں کے علاوہ اب آنحضرتؐ کے گرد چیدہ و برگزیدہ اصحاب کی ایک جماعت بھی جمع ہو گئی تھی، جو حضرت ابوبکرؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے مستعد، قابل اور صاحبِ عزت لوگوں پر مشتمل تھی۔ حضرت علیؓ اگرچہ نوعمر تھے، لیکن تیزی سے امتیاز حاصل کر رہے تھے۔

ان اہم شخصیتوں کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے مسلمانوں کے حوصلے بڑھے اور اب وہ کھلم کھلا نماز ادا کرنے لگے۔ قریش، جن پر حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے گویا بجلی سی

گر پڑی تھی، صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرنے لگے۔ لیکن ایک فیصلہ کن ضرب لگانے کے موقعے کی تاک میں رہے۔

جب ان کا وفد اپنی ناکامی کی خبر لے کر حبشہ سے واپس آیا تو اُن کے غضب کی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے بالآخر ہاشم اور مطلب کے خاندانوں کو ایک ضربِ کاری سے مٹا دینے کی ٹھان لی۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے بعثتِ نبوی ؐ کے ساتویں سال یعنی ۶۱۶ء کے اواخر میں، بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف ایک انجمن قائم کی۔ انھوں نے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ جو کعبہ میں محفوظ کر دیا گیا اور جس کا مضمون یہ تھا کہ وہ ہاشمیوں کے ساتھ رشتۂ نکاح اور لین دین نہ کریں گے۔ بنی ہاشم اور بنی مطلب، جن میں مسلمان بھی تھے اور بُت پرست بھی، اس معاہدے سے خوف زدہ ہوئے اور اس اندیشے سے کہ مبادا یہ کسی مزید حملے کا پیش خیمہ ہو، انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے گھروں کو چھوڑ کر، جو شہر میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے، ایک جگہ جمع ہو کر رہیں۔ چنانچہ سب شعب ابو طالب میں چلے گئے، جو مکّے کے مشرقی مضافات میں ایک لمبی اور تنگ گھاٹی ہے، جسے چٹانوں اور دیواروں نے شہر سے جُدا کر رکھا ہے اور جہاں سے شہر میں آمد و رفت کا ایک چھوٹے سے دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ اکیلا ابولہب ان میں شامل نہ ہوا، بلکہ دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔

یہ لوگ آنحضرت ؐ کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے تین سال تک اس گھاٹی میں رہے۔ قریش نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور انھیں ہر طرح کی تنگی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ کھانے پینے کا جو سامان وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ فاقہ زدہ بچّوں کے رونے کی آوازیں باہر سے سُنائی دینے لگیں۔ قریش میں جو لوگ نسبتاً کم متعصب تھے اگر وہ لوگ کبھی کبھی چوری چھپے انھیں مدد نہ پہنچا دیا کرتے تو غالباً وہ سب کے سب تباہ ہو جاتے۔ قریش کے بعض بعض سردار اپنی ناانصافیوں پر شرمندگی محسوس کرنے لگے تھے۔ بعثتِ نبوی ؐ کے دسویں سال میں یعنی ۶۱۹ء میں ہشام بن عمرو نے جسے ہاشمیوں سے بہت دلچسپی تھی، ہاشم و

مطلب کے خاندانوں اور قریش کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوشش کی۔ وہ زبیر ابن ابو امیّہ کو اپنا ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گیا، چنانچہ اس کی اور دوسرے لوگوں کی تحریک پر قریش کا معاہدہ منسوخ ہو گیا اور ہاشم و مطلب کے خاندانوں کو اجازت مل گئی کہ مکّے میں واپس آجائیں اور شہری حقوق سے از سرِ نو مستفید ہوں۔

جتنا عرصہ آنحضرتؐ شعب میں اپنے عزیز و اقارب سمیت پناہ گزین رہے، اسلام مکّے میں کوئی ترقی نہ کر سکا۔ ان متبرک مہینوں میں جب لڑائی بھڑائی حرام سمجھی جاتی تھی، آپؐ اپنی جائے پناہ سے باہر آتے اور حاجیوں کو تبلیغ کرنے کی کوشش کرتے، لیکن ابولہب آپؐ کے پیچھے لگا رہتا اور آپؐ کو جھوٹا اور صابی کہہ کر آپؐ کی تبلیغ میں خلل انداز ہوتا۔

اس کے بعد کا سال تاریخِ اسلام میں 'عام الحزن' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سال میں ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ نے یکے بعد دیگرے وفات پائی۔ ابوطالب کی وفات نے آپؐ کو اپنی نگرانی کے سرپرست سے محروم کر دیا جو آپؐ کے اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات آپؐ کے لیے شدید صدمہ تھی۔ جب ابھی آپؐ پر کوئی ایمان نہ لایا تھا، یہاں تک کہ خود آپؐ کے اندر اپنی رسالت کا شعور پوری طرح بیدار نہ ہوا تھا اور جب آپؐ کے چاروں طرف تاریکی اور ناامیدی تھی، ایسے آڑے وقت میں حضرت خدیجہؓ کی محبّت اور ایمان و یقین نے آپؐ کا ساتھ دیا تھا۔ "وہ ہمیشہ آپؐ کے لیے اُمید و تسکین کا فرشتہ رہیں"۔ ان کی محبّت و مودّت کی یاد تا دمِ آخر آنحضرتؐ کے دل میں تازہ رہی۔"

پہلے باب پر نوٹ

سر ولیم میور کا خیال ہے کہ موسیو کوسین دی پرسیوال M. Caussin de perceval نے بطحا کو کسی جگہ کا نام تصور کرنے میں غلطی کی ہے۔ ان کے خیال

ہیں وہ سنگریزوں والی زمین ہے جس پر مسلمانوں کو اذیت دی جاتی تھی (جلد دوم صفحہ ۱۲۸) اپنے بیان اور موسیو کوسین دی پرسیوال کے بیان کی تصدیق میں میرے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ بطحا کا موجود ہونا ایک ایسا امر ہے جس کے بارے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے مسلم مصنفین نے اکثر بطحا کا ذکر ایک ایسے مقام کی حیثیت سے کیا ہے جو مکے کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ مثلاً مشہور شاعر حکیم سنائی کہتا ہے :۔

چو علمت ہست خدمت کن چو بے علماں کہ زشت آید

گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

دوسرا باب

ہجرت

محمد سید الکونین والثقلین والفریقین من عرب ومن عجم

بنی اُمیہ اور دوسرے مخالف قبائل نے کچھ تو اس وابستگی کی بناء پر جو انھیں اپنے قدیم مذہب سے تھی اور کچھ ہاشمیوں سے حسد و نفرت کی بناء پر، اسلام کو مکے میں کچل دینے کا یہ موقع غنیمت جانا۔ ابوطالب کے ذاتی رسوخ اور نیک سیرتی نے ان کے غصّہ کو اب تک حد سے نہ بڑھنے دیا تھا۔ ابوطالب کے وفات پاتے ہی انھوں نے اپنا ظلم و ستم دگنی شدت سے شروع کر دیا۔[1]

اپنے محترم سرپرست اور اپنی محبوب بیوی کی وفات سے آپؐ کو جو صدمہ ہوا، اور قریش کو بُت پرستی ترک کرنے پر آمادہ کرنے سے آپؐ کو جو نا اُمیدی تھی، اس کے باوجود آپؐ کے دل میں اپنی تبلیغ کی صداقت کا پورا پورا یقین تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لیے کوئی نیا میدان تلاش کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ اہلِ مکّہ نے تو خدا کے کلام کو رد کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ اہلِ طائف اس پر کان دھریں۔ اپنے وفادار خادم زیدؓ کو ساتھ لیے ہوئے آپؐ بنی ثقیف کے یہاں پہنچے۔[2] آپؐ نے انھیں اپنی رسالت سے مطلع کیا، ان کی بُرائیوں پر تنبیہ کیا اور انھیں خدا کی عبادت کی طرف بلایا۔ آپؐ کی تقریر سے غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔

---

[1] ابن الاثیر

[2] یعنی ساکنانِ طائف

انھوں نے کہا کہ یہ جبطی شخص کون ہے جو انھیں اُن خوبصورت دیوتاؤں کی پوجا کو ترک کرنے کی دعوت دیتا ہے جن کی پرستش وہ اتنی شگفتہ دلی اور اخلاقی آزادی سے کیا کرتے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو شہر سے نکال دیا۔ آوارہ لوگوں اور غلاموں کا ایک گروہ آوازے کستا ہوا اور پتھر برساتا ہوا آپؐ کے پیچھے دوڑا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور وہ لوگ آپؐ کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ زخموں سے چور، آبلہ پا اور تھکے ماندے، آپؐ کھجوروں کے درختوں کے سائے تلے ٹھہر گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر پکارے: "الٰہی میں اپنی بے بسی اور تدبیر کی ناکامی اور لوگوں کے ہاتھوں اپنی توہین کا شکوہ تیرے ہی حضور کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا ربّ ہے اور میرا بھی۔ اے پروردگار! تو مجھے چھوڑ کر کسے سونپ رہا ہے، جو مجھے اور بھی کمزور بنا دیں گے؟ مجھے میرے دشمنوں کے حوالے نہ کر۔ اگر تو میری اس حالت میں بھی مجھ پر خفا نہیں تو میں مطمئن و مصئون ہوں۔ میں تیرے اس نور کی روشنی میں رہنا چاہتا ہوں جس نے ظلمات کو منوّر بنا رکھا ہے اور جس کے پرتو سے دنیا اور آخرت دونوں کی صلاح حاصل ہوتی ہے۔ الٰہی! اپنے غضب کو مجھ پر نازل نہ فرما اور جس طرح تو چاہے میری مشکلات حل کر دے۔ اللہ کے سوا نہ کوئی قدرت ہے، نہ کوئی طاقت[1]۔"

آنحضرتؐ نہایت آزردہ خاطر مکے واپس آئے۔ یہاں آپؐ کچھ مدت تک لوگوں سے الگ تھلگ رہے۔ آپؐ کبھی کبھی تبلیغ فرماتے تھے لیکن آپؐ کی کوششیں زیادہ تر ان اجنبیوں تک محدود تھیں جو حج کے موقع پر مکے اور اس کے قرب و جوار میں ہر سال جمع ہوتے تھے۔ طبری کے قول کے مطابق آپؐ کو اُمید تھی کہ ان اجنبیوں میں آپؐ کو کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جو آپؐ پر ایمان لائیں گے اور پیغامِ حق لے جا کر اپنے ہم وطنوں تک پہنچائیں گے۔

ایک روز جب آپؐ یوں غمزدہ لیکن پھر بھی دل میں اُمید لیے ہوئے ان نیم تاجروں اور نیم حاجیوں کو تبلیغ فرما رہے تھے تو آپؐ کو یثرب کے دور دراز شہر کے چھ باشندے آپس میں گفتگو کرتے ہوئے نظر آئے۔ آپؐ نے فرمایا "بیٹھ کر میری بات سنو" اور انھوں نے ایسا

---

[1] ابن ہشام۔ ابن الاثیر

ہی کیا۔ آپؐ کے جوش و خلوص اور آپؐ کے کلام کی صداقت سے متاثر ہو کر وہ لوگ ایمان لے آئے۔ (یہ سنہ ۶۲۰ء کا واقعہ ہے[1]) چنانچہ اپنے وطن واپس جا کر ان لوگوں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ یہ خبر پھیلا دی کہ عربوں میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے گا اور اُن کے صدیوں پرانے جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔

دوسرے سال یہ یثربی اپنے ساتھ اپنے چھ ہم شہریوں کو لے کر آئے جو شہر کے دو سب سے بڑے قبیلوں[2] کے نمائندے تھے۔

جس مقام پر پہلے چھ یثربی ایمان لائے تھے وہیں ان نو واردوں نے اسلام قبول کیا۔ اس پہاڑی کے نام پہ جہاں یہ واقعہ ہوا اسے بیعت عقبۂ اولیٰ کہتے ہیں[3]۔ ان لوگوں نے مندرجہ ذیل اقرار کئے: "ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے؛ ہم چوری نہ کریں گے، زنا کاری نہ کریں گے، ہم اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، باہم بہتان طرازی سے اپنا دامن بچائیں گے، ہم ہر امر معروف میں رسولؐ اللہ کی اطاعت کریں گے اور شادی و غم میں ان کے وفادار رہیں گے[4]۔"

بیعت کے بعد جب یہ لوگ اپنے وطن واپس گئے تو اپنے ساتھ آنحضرتؐ کے ایک صحابیؓ کو لے گئے تاکہ وہ انھیں ارکانِ دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ اس طرح اسلام یثرب کے باشندوں میں بڑی تیزی سے پھیل گیا۔

پہلی اور دوسری بیعت کا درمیانی وقفہ رسالت محمدیؐ کا نازک ترین دور ہونے کی وجہ سے

---

[1] ابن ہشام۔ طبری

[2] اوس اور خزرج

[3] تاریخ اسلام میں اس بیعت کو بیعت النساء بھی کہا گیا ہے تاکہ اسے عقبہ کی دوسری بیعت سے ممتاز کیا جاسکے جس میں یثرب کے مندوبین نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو دشمنوں کے حملوں اور توہین آمیز حرکتوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ بھی کریں گے۔

[4] ابن ہشام۔ ابن الاثیر

بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ کا کامل توکّل علی اللہ اور آپؐ کا علوئے ہمت جس طرح اس دور میں نمایاں ہُوا، اس طرح اور کسی دور میں نہ ہُوا۔ آپؐ اپنی قوم کو بُت پرستی کی لعنت میں بُری طرح مبتلا دیکھ کر رنجیدہ خاطر ہوتے[1]۔ لیکن آپؐ کے غم کو یہ اُمید تسکین دیتی کہ انجام کار حق باطل پر غالب آئیگا۔[2] ممکن ہے کو آپؐ کی زندگی اس وقت تک وفا نہ کرے، لیکن باطل کا حق کے سامنے کافور ہو جانا اسی طرح یقینی ہے جس طرح تاریکی کا سورج کی کرنوں کے سامنے غائب ہو جانا۔ اس دور کے بارے میں میور کی زبان سے غیر شعوری طور پر ذیل کے کلمات تحسین بے اختیار نکل گئے ہیں۔

"محمدؐ اس طرح اپنی قوم کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے، فتح کی اُمید میں انتظار کرتے ہوئے، بظاہر بے یار و مددگار، اپنے حامیوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ گویا شیر کے منہ میں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس قادرِ مطلق پر بھروسہ کئے ہوئے جس کا پیغامبر وہ اپنے آپؐ کو سمجھتے تھے اور اس بھروسے کی بدولت ثابت قدم اور مضبوط ــــــــــ یہ انسانی عظمت کا ایک ایسا نظارہ ہے جس کی مثال صحائفِ مقدسہ میں صرف پیغمبر اسرائیل پیش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے آقا سے شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں، صرف میں، تن تنہا رہ گیا ہوں[3]۔"

بیتابانہ انتظار کا یہ زمانہ اس رویائے معراج کی بدولت بھی قابلِ تذکرہ ہے جس نے شاعروں اور راویانِ حدیث کی تخیلی فطانت کے لیے زرّیں خوابوں کی اقلیمیں مہیا کر دیں۔ ان لوگوں نے قرآن کے ان سادہ الفاظ پر خوبصورت اور شاندار قصّوں کے حاشیے چڑھا دیئے ہیں:

"پاک ہے وہ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا، جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے[4]۔ (بنی اسرائیل - ۱) قرآن مزید کہتا ہے: "یاد کرو ہم

---

[1] سورۃ الانعام - ۱۰۷

[2] المؤمن - ۷۸

[3] Life of Mahomet, vol. ii, p. 228

[4] معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے رب نے انسانوں کو گھیرے میں لے رکھا ہے، اور ہم نے تمہیں جو کچھ دکھایا وہ آزمائش تھا" (بنی اسرائیل - ۶۰) - راویوں نے اس واقعہ کو جو خوبصورت لباس پہنایا ہے اس کے باوجود "یہ ایک عظیم الشان رویا ہے، جو پُر شوکت تمثالیس Imagery اور عمیق معنی لیے ہوئے ہے ......"[1]

آئندہ سال (۶۲۲ء میں) وہ یثربی جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا پچھتر (۷۵) کی تعداد میں اپنے بُت پرست بھائی بندوں کو ساتھ لیے ہوئے مکے میں آئے تاکہ رسُول اللہ کو اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۷) وہ اسی قدر ہے کہ پیغمبرِ خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انھوں نے درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں" (سر سید احمد خاں آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ کے متعلق بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات - مقالہ یازدہم) - میور لکھتا ہے: "اوّلین روایات ایک واقعی جسمانی سفر کی طرف نہیں بلکہ محض ایک رویا کی طرف اشارہ کرتی ہیں" ابن ہشام نے جو ابتدائی روایات پیش کی ہیں وہ اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں - میرے خیال میں منصفانہ طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ عیسائی، جو حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ زندہ ہو جانے اور ایلیاہ نبی کے جسمانی طور پر آسمان کا سفر کرنے پر اعتقاد کرتے ہیں، ان مسلمانوں کو جو حضرت محمدؐ کے جسمانی معراج پر ایمان رکھتے ہیں اپنے سے کم عقلیت پسند کیوں سمجھتے ہیں -

[1] Stanley Lane Poole, *Introduction to Selections from the Koran*, p. 56

[2] مصنف نے مسئلہ معراج میں عقلیت پسندانہ اندازِ تعبیر اختیار کیا ہے - جمہور اہلِ سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ پرواز اور اسراء کا یہ تجربہ جسمانی تھا - ہمارے نزدیک اس بحث میں سارا الجھاؤ اس چیز سے پیدا ہوا ہے کہ یار لوگوں نے مدرسیت کے تتبع میں انسان کو جسم و روح کے دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا ہے، حالانکہ انسان محض ایک "انا" ہے جس میں جسم و روح کی دونوں سطحیں برابر شامل ہیں - اس کے ظہور کی ایک خارجی سطح جسم کہلاتی ہے اور داخلی سطح روح - انسان بہرحال ایک ہے اور اس کے کسی بھی فعل کو محض جسمانی یا روحانی قرار نہیں دے سکتے - اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے - معراج کے معنی یہ ہوں گے کہ حضورؐ کی "انا" کو جس میں جسم بھی داخل ہے اللہ تعالیٰ نے سیرِ اسراء کے ذریعہ اُن تمام بہرہ مندیوں سے نوازا کہ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

شہر میں آنے کی دعوت دیں[1] لیکن بُت پرستوں کو اپنے ساتھیوں کا علم نہ تھا۔

رات کی خاموشی میں[2]، جب تمام مخالف عناصر سوئے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اسلام کے یہ پہلے علمبردار اسی پہاڑی کے دامن میں جمع ہوئے جہاں بیعتِ اولیٰ لی گئی تھی۔ آنحضرتؐ اپنے چچا عباس کی معیت میں آئے۔ حضرت عباسؓ نے ابھی اسلام قبول نہ کیا تھا، لیکن اس کی ترقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ آپ نے مذاکروں کا افتتاح کیا اور یثربیوں کو ان خطرات سے واضح طور پر آگاہ کیا جن میں وہ اپنے آپ کو اسلام قبول کر کے اور معلمِ اسلام کو اپنے شہر میں آنے کی دعوت دے کر ڈال رہے تھے۔ ان لوگوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ انھوں نے ان خطرات کی پوری آگاہی کے ساتھ اسلام اختیار کیا تھا اور کہا "یا رسول اللہؐ آپ اپنے اور اپنے خدا کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸) جن کا تعلق اسرارِ دین اور رموزِ کائنات کے عجیب و غریب انکشافات سے تھا۔ یہی وجہ ہے قرآن حکیم نے واشگاف الفاظ میں اسرار کو اپنے "عبد" کی طرف منسوب ٹھہرایا ہے۔ امام بخاری نے بھی صحیح بخاری میں صلوٰۃ، حج، انبیاء، توحید، مناقب اور ادب و تفسیر کے متعدد ابواب میں جو الفاظ ذکر کئے ہیں وہ اس انداز کے ہیں۔ عرج بالنبی، عرج بی، یا حیث عرج بہ۔ ترمذی اور مسند امام احمد بن حنبلؒ میں بھی واقعہ معراج کے لیے اسی طرح کا پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ معراج کا تعلق ایک بلند تر "انا" سے ہے، گرامی قدر ذات اور شخصیت سے ہے۔ صرف رُوح اور اس کے کوائف سے نہیں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں قرآن نے اس کو ایسا رؤیا قرار دیا ہے کہ جس نے لوگوں کو کفر و ایمان کی آزمائش میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ رؤیا کے معنی محض خواب ہی کے ہوتے تو اس میں انکار ہی کیا تھا اور اس کے ادراک کے لئے صرف حضرت صدیقؓ ہی کے ظرفِ عالی کو یہ توفیق کیوں نصیب ہوتی کہ وہ اس کو بلا تامل مان لیں۔ مزید برآں واقعہ معراج کے بعد اختلاف کا جو طوفان اٹھا، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تاریخ کا غیر معمولی واقع تھا۔ محض خواب نہ تھا۔ (ادارہ)

[1] ابن ہشام، الحلبی "انسان العیون"

[2] رسومات حج ادا کرنے کے بعد تین دن کی جو مدت تشریق ہوتی ہے اس کے پہلے اور دوسرے دن کی درمیانی رات۔

لیے ہم سے جو عہد لینا چاہیں لے لیں۔" آنحضرتؐ نے اپنے معمول کے مطابق چند آیاتِ قرآنی کی تلاوت سے آغازِ کلام کیا۔ اس کے بعد آپؐ نے خدا کی عبادت کی دعوت دی اور اسلام کی برکات تفصیلاً بیان کیں[1]۔ یثربیوں نے اپنے عہد کو دہرایا، کہ وہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، اسلام کے احکام کو بجا لائیں گے، ہر امرِ معروف میں آنحضرتؐ کی ہدایات پر عمل کریں گے اور آپؐ اور آپؐ کے متعلقین کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی کرتے ہیں۔

پھر انھوں نے دریافت کیا "اگر ہم راہِ حق میں جانیں دے دیں تو ہمیں کیا صلہ ملے گا؟" جواب ملا "عقبیٰ کی راحت"[2]۔ انھوں نے مزید پوچھا "ایسا تو نہ ہو گا کہ آپؐ کامیابی اور خوشحالی کے وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس چلے جائیں گے؟" پیغمبرِ خدا نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں، ہرگز نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔" وہ بولے "تو اپنا ہاتھ بڑھائیے۔" آنحضرتؐ نے دستِ مبارک بڑھایا اور ہر ایک نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر خدا و رسولؐ کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ معاہدہ ابھی مکمل ہوا ہی تھا کہ ایک مکّی کی آواز آئی جو دُور بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس آواز نے، جو رات کی فضا میں لہراتی ہوئی آئی، ان جاں نثاروں کے دل ہلا دیئے۔ لیکن آنحضرتؐ کے تقویت بخش الفاظ نے اُن کی ڈھارس بندھائی۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے اُن لوگوں سے رائے لے کر ان میں سے بارہ افراد انتخاب کئے جو صاحبِ مرتبہ افراد تھے اور انھیں اپنا نقیب مقرر کیا[3]۔ اس طرح دوسری بیعتِ عقبہ انجام پذیر

---

[1] ابن ہشام ابن الاثیر

[2] ابن الاثیر

[3] ابن ہشام۔ اس معاہدے میں پچھتر افراد (مرد اور عورتیں) شریک تھے۔ یہ معاہدہ ماہِ ذی الحج میں ہوا اور آنحضرتؐ نے اس مہینے کے باقی دن اور محرم و صفر کے مہینے مکے میں گزارے۔ ربیع الاوّل میں آپؐ مدینہ تشریف لے گئے۔ ابن الاثیر جلد دوم۔

ہوئی۔

مکّی مخبر نے اس معاہدے کی خبر سارے شہر میں پھیلا دی تھی۔ قریش آنحضرتؐ کی جرأت پر متعجب ہوئے اور اکٹھے ہو کر یثرب والوں کا روان میں پہنچے تاکہ آنحضرتؐ سے معاہدہ کرنے والوں کی حوالگی کا مطالبہ کریں، لیکن ان لوگوں کا سُراغ نہ مل سکا اس لیے انھوں نے کارواں کو بلا مزاحمت واپس چلے جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن قریش کی یہ ظاہری بُردباری آنحضرتؐ اور ان کے متبعین پر ظلم و تشدد کی تمہید تھی۔ دینِ حق کے علم برداروں کی حالت روز بروز زیادہ خطرناک ہوتی چلی گئی۔ آنحضرتؐ کے دل میں قتلِ عام کا اندیشہ پیدا ہُوا۔ اس لیے آپؐ نے اپنے پیرؤوں کو یثرب میں پناہ لینے کی ہدایت کی۔ چنانچہ تقریباً ایک سو خاندان دو دو تین تین کی ٹولیوں میں چُپ چاپ مکّے سے یثرب چلے گئے، جہاں ان کا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا گیا۔ اس طرح شہر کے بہت سے محلّے خالی ہو گئے۔ عتبہ بن ربیعہ نے ان خالی مکانوں کو دیکھ کر، جن میں کبھی چہل پہل تھی، ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور ایک پرانا شعر پڑھا کہ "ہر مکان، چاہے اس میں کتنی ہی مدت تک برکت و خوشحالی رہی ہو، ایک نہ ایک دن رنج و غم اور خستہ حالی کا موجب بنتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے بھتیجے کا کیا دھرا ہے، جس نے ہماری انجمنوں کو منتشر کر دیا ہے، ہمارے معاملات کو خراب کر دیا ہے اور ہم میں پھوٹ ڈال دی ہے۔"

جو معاملہ حضرت عیسیٰؑ کو پیش آیا تھا وہی حضرت محمدؐ کو پیش آیا۔ فرق اتنا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے خود فرمایا: "یہ خیال نہ کرو کہ میں دنیا میں امن پھیلانے آیا ہوں۔ میں امن لے کر نہیں آیا بلکہ تلوار لے کر آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ بیٹے کو باپ سے، بیٹی کو ماں سے اور بہو کو ساس سے جدا کروں۔"[1] لیکن حضرت محمدؐ کو اُن کے ایک بدترین دشمن نے خاندانوں میں تفرقہ ڈالنے کا الزام دیا۔

اس تمام مدت میں جب کہ طوفان اپنے عروج پر تھا اور ممکن تھا کہ کسی وقت ٹوٹ پڑے، آنحضرتؐ نے ہمت نہ ہاری۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ کے سوا آپؐ کے تمام صحابی یثرب جا چکے تھے۔

---

[1] متی باب ۳۴ اور ۳۵

ان دو رفیقوں کی معیت میں آپؐ نہایت بہادری سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔

دریں اثناء بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ آنحضرتؐ کے بچ کر نکل جانے کے خوف سے قریش نے بعجلت تمام دارالندوہ میں ایک جلسہ منعقد کیا جس میں دوسرے قبائل کے چند افراد بھی مدعو کئے گئے۔ معاملہ اب زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ جلسے میں بڑا گرما گرم مباحثہ ہوا کیونکہ قریش کے دلوں میں خوف گھر کر چکا تھا۔ عمر قید اور شہر بدر کرنے کی سزاؤں پر باری باری سے بحث کی گئی۔ اس کے بعد قتل کی تجویز کی گئی۔ لیکن قتل اگر ایک آدمی کے ہاتھ سے ہوتا تو اسے اور اس کے خاندان کو خون کا خطرہ لاحق ہو جاتا۔ بالآخر ابو جہلؔ نے یہ تجویز پیش کر کے یہ مسئلہ حل کر دیا کہ مختلف خاندانوں کے چند چیدہ منچلے مل کر آنحضرتؐ پر حملہ کریں اور بیک وقت اپنی تلواریں آپؐ کے سینے میں پیوست کر دیں تاکہ سب مجموعی طور پر اس عمل کے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں اور آنحضرتؐ کا خاندان اس طرح انتقام لینے سے معذور رہ جائے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور چند نوجوان امیر زادے اس کام کے لیے منتخب کئے گئے۔ کچھ رات گذرے قاتلوں نے آنحضرتؐ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ یہ لوگ ساری رات تاک میں بیٹھے رہے تاکہ جب آنحضرتؐ صبح سویرے گھر سے نکلیں تو آپؐ کو قتل کر دیں۔ وقتاً فوقتاً وہ کواڑوں کی درزوں میں سے جھانک کر اطمینان کر لیتے تھے کہ آپؐ ابھی بستر پر آرام فرما رہے ہیں۔ لیکن حفظ ذات کی اس جبلّی حس نے

لہ ابن ہشام۔ ابن الاثیر۔ القرآن سورۂ انفال۔ ۳۰۔ ابن ہشام لکھتا ہے کہ ابوجہل کی اس تجویز کی تائید ایک اجنبی نے کی جو نجد کے ایک معزز شیخ کے بھیس میں آیا تھا اور جسے روایت خود شیطان کہتی ہے۔ ابوجہل آنحضرت کے بدترین دشمنوں میں تھا۔ اس کا نام عمرو تھا اور چالاکی و ہوشیاری کی بناء پر اس کا لقب ابوالحکم تھا۔ آنحضرتؐ نے اس کے تعصب اور ہٹ کی بناء پر جس کی وجہ سے اُسے اسلام میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی، اسے ابوجہل کا لقب دیا۔ جہالت نے ہر زمانے میں اپنے آپ کو راسخ العقیدگی کے سرپرست کے لباس میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس طرح ابوجہل کا نام ایک ضرب المثل بن گیا ہے۔ مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی نے ذیل کے شعر میں ابوجہل کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

احمد مرسل نشستہ کی روا دارد خرد ۔ دل اسیر سیرت بوجہل کافر داشتن

جس نے بسا اوقات بنی ناصری کو اپنے دشمنوں سے بچ کر نکل جانے میں مدد دی تھی[1] آنحضرتؐ کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا۔ قاتلوں کی توجہ کو بستر پر مرکوز رکھنے کی خاطر آپؐ نے اپنی سبز چادر حضرت علیؓ کو اوڑھا دی اور انھیں اپنے بستر پر لٹا دیا[2]۔ اور خود حضرت داؤدؑ کی طرح کھڑکی میں سے باہر نکل گئے[3]۔ گھر سے نکل کر آپؐ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر گئے۔ وہاں سے دونوں چپ چاپ مکّے سے روانہ ہو گئے۔ کئی دنوں تک وہ کوہ ثور کے ایک غار میں چھپے رہے جو مکّے کے جنوب میں واقع ہے۔

قریش کے غضب کی اب کوئی حد نہ رہی۔ اس خبر نے کہ قاتل ناکام واپس آ گئے تھے اور آنحضرتؐ بچ کر نکل گئے تھے ان کے تمام جذباتِ دشمنی کو بیدار کر دیا۔ آس پاس کے سارے علاقے میں سوار دوڑائے گئے اور آپؐ کے قتل کے لیے انعام[4] کا اعلان کیا گیا۔ ایک دو مرتبہ تو خطرہ اس قدر قریب آ پہنچا کہ حضرت ابوبکرؓ کا دل خوف سے لرز گیا۔ انھوں نے کہا، "ہم صرف دو ہیں" آنحضرتؐ نے فرمایا، "نہیں ہم تین ہیں، خدا بھی ہمارے ساتھ ہے"۔ اور خدا فی الواقع ان کے ساتھ تھا۔ تین دنوں کے بعد قریش کی تگ و دو سست پڑ گئی۔ اس تمام عرصے میں حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیٹی آپ دونوں کو رات کے وقت کھانا لا کر دیتی رہیں۔ تیسرے دن شام کے وقت آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ غار سے نکلے اور بڑی مشکل سے دو اونٹوں کا انتظام کر کے غیر آباد راستوں سے یثرب کی طرف روانہ ہوئے لیکن یہ راستے بھی خطروں سے خالی نہ تھے۔ آپؐ کے قتل کے لیے جو بھاری انعام مقرر کیا گیا تھا اس کے لالچ میں کئی سوار مکّے سے نکل پڑے تھے اور ابھی تک ان بے یار و مددگار مسافروں کی تلاش میں تندہی سے مصروف تھے۔ ان میں سے ایک نے، جو ایک وحشی اور تند خو سپاہی تھا، آنحضرتؐ اور

---

[1] Milman, *History of Christianity*

[2] ابن ہشام، ابن الاثیر

[3] ایک سو اونٹ۔ ابن ہشام۔ ابن الاثیر

[4] ابن الاثیر

حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ لیا اور ان کا تعاقب کیا۔ پھر ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کا دل ڈوب گیا اور وہ بولے، "اب ہم نہیں بچ سکتے"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، "ڈرو نہیں، خدا ہماری حفاظت کرے گا"۔ جب سوار آنحضرتؐ کے قریب پہنچا تو اس کا گھوڑا چراغ پا ہو گیا اور وہ اس کی پیٹھ پر سے گر پڑا۔ سوار پر ایسا خوف طاری ہوا کہ جس شخص کا وہ تعاقب کر رہا تھا اسی سے اس نے گڑگڑا کر معافی کی التجا کی اور معافی کی نشانی مانگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک ہڈی پر معافی نامہ لکھ کر اسے دے دیا۔[1]

اس کے بعد آنحضرتؐ اور حضرت ابوبکرؓ کو کوئی خطرہ پیش نہ آیا اور دونوں تین دن کے سفر کے بعد یثرب کے علاقے میں پہنچ گئے۔ جون ۶۲۲ء کا ایک گرم دن تھا جب آنحضرتؐ نے اپنی اونٹنی سے اتر کر اس سرزمین پر قدم رکھا جو آئندہ آپؐ کا مسکن و مامن بننے والی تھی۔ سب سے پہلے ایک یہودی نے، جو ایک مینار پر تاک لگائے کھڑا تھا، آپؐ کو دیکھ کر پہچانا۔[2] چنانچہ یوں قرآن کے یہ الفاظ پورے ہوئے: "جن لوگوں پر کتابیں اتری ہیں وہ اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں"۔ (الانعام۔ ۲۰) آپؐ نے اور حضرت ابوبکرؓ نے چند روز تک قبا[3] نام کے ایک گاؤں میں قیام کیا، جو یثرب سے دو میل جانبِ جنوب واقع ہے اور اپنی خوبصورتی و زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہاں حضرت علیؓ آپؐ سے آملے۔ کفار کو آنحضرتؐ کے قتل میں جو ناکامی ہوئی تھی اس کا بدلہ انھوں نے حضرت علیؓ کو سخت اذیتیں پہنچا کر لیا تھا۔[4] حضرت علیؓ قریش کے خوف سے دن کو چھپتے ہوئے اور رات کو سفر کرتے ہوئے مکے سے پیادہ پا آئے تھے۔[5]

بنی عمرو بن عوف نے، جو اس گاؤں کے مالک تھے، آنحضرتؐ کو کچھ اور عرصہ قیام کرنے کی

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر

[2] ابن ہشام

[3] میور، شکل، بدھ اور جمعرات۔ ابن ہشام اور ابن الاثیر

[4] ابن الاثیر [5] ابن الاثیر

[6] کوسیس دی پرسیوال، ابن ہشام

دعوت دی. لیکن آپؐ کا فرض آپؐ کو آگے بلا رہا تھا۔ چنانچہ آپؐ اپنے متبعین کی ایک جماعت کو ساتھ لیے ہوئے یثرب کو روانہ ہو گئے۔ آپؐ جمعہ ۱۶ ربیع الاول (مطابق ۲ جولائی ۶۲۲ء) کی صبح کو شہر میں داخل ہوئے۔

اس طرح آپؐ کی ہجرت واقع ہوئی، جسے یورپی تواریخ میں "محمدؐ کے فرار" کا نام دیا گیا ہے اور جس سے سنینِ اسلامی کی ابتداء ہوئی۔

دوسرے باب پر نوٹ ۱

سنِ ہجری کا اجراء ہجرت کے سترہ سال بعد خلیفۂ دوم کے حکم سے ہوا۔ لیکن اس کی ابتداء آنحضرتؐ کے مکے سے رخصت ہونے کے وقت سے نہیں ہوئی، جو ۴ ربیع الاول کو واقع ہوئی، بلکہ سالِ قمری کے پہلے مہینے یعنی محرم کے پہلے دن سے۔ جس سال سے سنِ ہجری جاری ہوا اس سال میں یکم محرم کو ۱۵ جولائی تھی۔

لیکن اگرچہ حضرت عمرؓ نے سنِ ہجری کا اجراء کیا تاہم واقعات کے متعلق یہ کہنے کا قاعدہ کہ وہ ہجرت سے قبل یا بعد ہوئے چند روایتوں کے مطابق خود آنحضرتؐ کا ایجاد کردہ ہے ــــ یہ ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ رسالتِ محمدی کی تاریخ میں ہجرت کا واقعہ سب سے بڑا بحران تھا ــــ مقابلے کے لیے دیکھیے الحلبیؒ "انسان العیون"۔

دوسرے باب پر نوٹ ۲

بارہ اسلامی مہینے حسبِ ذیل ہیں:۔ محرم (متبرک مہینہ)، صفر (سفر[1] کا مہینہ) ربیع الاول، (موسم بہار کا پہلا مہینہ) ربیع الثانی (موسم بہار کا دوسرا مہینہ)، جمادی الاول (پہلا خشک مہینہ) جمادی الثانی (دوسرا خشک مہینہ) رَجَب (یعنی جس کی تعظیم کی جاتی ہو) اسے رَجَب المرجب بھی کہتے

---

[1] "صفر" کے معنی "روانگی" نہیں، بلکہ یہ لفظ توشہ دان کر خالی کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ـ مترجم

ہیں)، شعبان (کونپلیں پھوٹنے کا مہینہ)، رمضان (گرمی کا مہینہ)، شوّال (اتّصال کا مہینہ)، ذوالقعدہ، (صلح، امن اور آرام کا مہینہ)، ذوالحج (حج کا مہینہ)، قدیم عرب قمری سال پر کاربند تھے جس میں ۳۵۴ دن، آٹھ گھنٹے اور ۴۸ ثانیے اور جو باری باری سے انتیس اور تیس دنوں کے بارہ مہینوں پر تقسیم کیا جاتا تھا۔ اپنے قمری سالوں اور یونانیوں اور رومیوں کے شمسی سالوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی خاطر اور اس غرض سے بھی کہ ہر مہینہ صحیح موسم میں آئے، عرب لوگ ہر تیسرے سال میں ایک مہینے کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ یوں کا یہ مہینہ بڑھانے کا عمل نسیٔ کہلاتا تھا۔ اس سے حساب بالکل ٹھیک تو نہ بیٹھتا تھا، لیکن پھر بھی اتنا فائدہ ہوتا تھا کہ مہینوں کے ناموں اور موسموں میں قدرے مطابقت قائم رہتی تھی۔ چونکہ نسیٔ کے سال (سالِ کبیسہ) میں عرب لوگ رسوماتِ قبیحہ مناتے تھے، اس لیے یہ قاعدہ ترک کر دیا گیا۔ اس وقت سے مہینوں کے ناموں اور موسموں میں کوئی مطابقت باقی نہیں رہی۔

تیسرا باب

رسُول اللہ مدینہ میں

پیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدہ ای — ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدہ ای
اے ختمِ رُسل قرب تو معلوم شد — دیر آمدہ ای زِ راہِ دور آمدہ ای

جو متصوفانہ اشعار اس باب کا زیبِ عنوان ہیں موجودہ زمانہ کے بہت کم مسلمان ان کے پورے معانی کو سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس عظیم صاحبِ بصیرت سے جو گہری عقیدت ان میں مضمر ہے اسے سب مسلمان پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ یہ عقیدت ایسی عقیدت نہیں جو قصے کہانیوں کے کسی فرضی کردار سے وابستہ یا محض امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ جس دن آپؐ نے یثرب میں ورود کیا اُسی دن سے آپؐ کی زندگی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ تاریخ کی روشنی جن عظیم الشان ہستیوں پر پڑی ہے آپؐ ان میں سب سے عظیم الشان ہیں۔ آپؐ کی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی نہایت احتیاط سے قلم بند ہو کر نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہیں۔ "لیکن" ان کی ظاہری صورت ایسی سختی سے متعین ہو گئی ہے جو آپؐ کی حقیقی تعلیمات کی رُوح کے منافی ہے۔[1]

---

[1] احادیث کے بارہ میں مصنف کی رائے میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف تو ان کا کہنا ہے کہ آپؐ کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی نہایت احتیاط سے قلم بند ہو کر نسلاً بعد نسل ہم تک پہنچی ہیں" دوسری طرف یہ شکایت ہے کہ جو جزئیات نہایت احتیاط کے ساتھ قلم بند ہوئی ہیں ان کی ظاہری صورت اسی سختی سے متعین ہو گئی ہے جو آپؐ کی حقیقی تعلیمات کی روح کے منافی ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۱۳۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

کیونکہ ان تعلیمات کا منشا نوعِ انسانی کی دائمی نشو و نما تھا۔ ہم نے اس حیرت انگیز انسان کو ایک یتیم بچّے کی صورت میں دیکھا ہے جسے کبھی شفقتِ پدری نصیب نہ ہوئی، جو شیر خواری کے زمانے ہی میں اُلفتِ مادری سے بھی محروم ہو گیا اور جس کی ابتدائی زندگی مصائب سے پُر تھی۔ وہ ایک پُر فکر بچپن سے گذر کر ایک اس سے بھی زیادہ پُر فکر جوانی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی جوانی اس کے بچپن سی پاکیزہ اور معصوم ہے۔ وہ بڑا ہو کر بھی اتنا ہی متقی و پرہیزگار رہتا ہے جتنا نوجوانی میں تھا۔ اس کے کان کمزوروں اور غریبوں کے رنج و مصیبت کی کہانی سُننے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کا دل ہمیشہ خدا کی تمام مخلوق کے لیے ہمدردی و صلہ رحمی سے لبریز رہتا ہے۔ وہ اس فروتنی اور پاکیزگی سے چلتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو اشاروں سے بتاتے ہیں۔ ”دیکھو، وہ الامین جا رہا ہے، جو راست باز، نیکوکار اور دیانت دار ہے“۔ وہ ایک مخلص دوست ہے، ایک وفا شعار اور فرض شناس خاوند ہے، وہ ایک متفکر ہے جو حیات و موت کے اسرار پر، انسانی اعمال کی ذمہ داریوں پر اور انسانی زندگی کے مقصد و مدّعا پر غور کرتا ہے۔ وہ ایک قوم ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی اصلاح کا کام ایسے وقت میں سنبھالتا ہے جب اس کو تسلی دینے والا اور اس کی ہمّت بندھانے والا ساری دنیا میں صرف ایک محبّت کرنے والا دل ہے۔ اُسے ناکامیاں ہوتی ہیں، لیکن اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، لیکن وہ کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اُسے جو کام تفویض کیا گیا ہے اُس کی انجام دہی کے لیے وہ ایک غیر متزلزل ہمت کے ساتھ جدّ و جہد کئے جاتا ہے۔ اس کی سیرت کی پاکیزگی اور شرافت، خدا کے رحم و کرم پر اس کا واثق اور اٹل ایمان آخر کار جاں نثاروں کی ایک روز افزوں تعداد اس کے گرد جمع کر دیتا ہے۔ جب اس کے امتحان کا سخت ترین لمحہ آتا ہے تو ایک فرض شناس ناخدا کی طرح وہ ثابت قدمی سے اپنے منصبی مقام

(بقیہ حاشیہ صہ۱۴۷) ظاہر ہے کہ جب زندگی کی جزئیات مرتب ہوں گی تو اس سے ایک متعین نقشہ ضرور بنے گا۔ غالباً مصنّف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ احادیث نے زندگی کے جن تعینات کی نشاندہی کی ہے۔ اُن سے اسلام کی آفاقی و عالمگیر روح مجروح ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق تو نقطۂ نگاہ اور تعبیر سے ہے۔ احادیث کی روایت و تحریر سے نہیں۔ (ادارہ)

پرکھڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تمام مسافر خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور اس وقت وہ خود ساحلِ عافیت پر قدم رکھتا ہے۔ یہ ہے اس کا وہ نقشہ جو ہم نے اب تک دیکھا ہے۔ اب ہم اسے ایک بادشاہ، انسانی دلوں کے حکمران، سردار، قانون دان اور منصبِ اعلیٰ کے لباس میں دیکھیں گے، لیکن ان حیثیتوں میں بھی اُسے تکبّر سے پاک اور تواضع و انکسار کا مجسمہ پائیں گے۔ اب اس کی داستانِ حیات اس دولتِ عامہ کی تاریخ میں مدغم ہو جاتی ہے جس کا وہ مرکز تھا۔ اب وہی معلّم جو اپنے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو پیوند لگایا کرتا تھا اور اکثر فاقے ہی سے بسر کرتا تھا دنیا کے قوی ترین فرمانرواؤں سے بھی قوی تر ہو جاتا ہے۔

"محمدؐ نے لوگوں سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ اس کی سیرت کی شرافت اس کی دوست نوازی، اس کا استقلال، اس کی جرأت اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اس کی اولوالعزمی اور اشاعتِ حق میں اس کا جوش و خروش، ان سب باتوں نے ایک ہیرو کا نقشہ لوگوں کی نظروں کے سامنے بے نقاب کیا تھا، یعنی ایک ایسے آقا کا نقشہ جس کی نافرمانی بھی ناممکن تھی اور جس سے محبت نہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ مزید کام کے لیے صرف وقت درکار تھا جب مدینے کے لوگ محمدؐ سے واقف ہو جائیں گے تو وہ بھی دل و جان سے اس کے والہ و شیدا ہو جائیں گے اور اس کا جوشِ ایمان ملتہب ہو کر قبیلوں میں پھیل جائے گا، یہاں تک کہ سارا عرب خدائے واحد کے رسولؐ کے قدموں پر جھک جائے گا۔ جس محبت و عقیدت سے لوگ اپنے ہاتھ کی بُنی ہوئی کملی اوڑھنے والے انسان کو دیکھتے تھے اس محبت و عقیدت سے کبھی کوئی تاج پوش شہنشاہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ اس میں انسانوں کو متاثر کرنے کا ملکہ تھا اور اس میں اتنی شرافت تھی کہ اس نے ہمیشہ لوگوں کو نیکی کی طرف راغب کرنے کی خاطر متاثر کیا۔"[1]

مدینۂ منوّرہ، جس کے کئی نام ہیں، مکّہ کے شمال میں اور وہاں سے گیارہ دن کی مسافت پر واقع ہے۔ آج کل اس شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل ہے، لیکن اُن دنوں یہ بیرونی حملوں سے بالکل

---

[1] امیر علی نے اس اقتباس کا حوالہ نہیں دیا (مترجم)

محفوظ نہ تھا۔ آنحضرتؐ نے اُسے قریش کے حملوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس کے گرد ایک خندق کھُدوائی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر ایک عمالقی سردار نے آباد کیا تھا اور آنحضرتؐ کی تشریف آوری سے قبل اسی کے نام سے موسوم تھا۔ پُرانے زمانے میں یثرب اور اس کے قریب وجوار میں عمالقہ ہی آباد تھے۔ ان لوگوں کو یہودی نوآبادکاروں نے تباہ کر دیا جو یکے بعد دیگرے بابلی، یونانی اور رومی ظلم وستم یا انتقام سے پناہ لینے کی خاطر عرب میں داخل ہوئے اور حجاز کے شمالی حصے میں آباد ہو گئے۔ ان میں اہم ترین نوآبادیاں تین تھیں۔ خیبر میں بنی نضیر، فدک میں بنی قریظہ اور مدینہ کے قریب بنی قینقاع۔ یہ لوگ آطام یعنی قلعہ بندیوں میں رہتے تھے اور جب تک دو قحطانی قبائل یعنی اوس اور خزرج یثرب میں آباد نہ ہوئے اس وقت تک ہمسایہ عربی قبائل پر غالب تھے۔ اوس وخزرج نے شروع شروع میں تو یہودیوں کی محکومی قبول کر لی لیکن بعد میں یہودیوں کو اپنے باجگذار و موالی بنا لیا۔ زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ان کے آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے اور جس زمانے میں آنحضرتؐ نے مکے میں اپنی بعثت کا اعلان کیا، اسی زمانہ کے قریب طول طویل اور تباہ کن لڑائیوں کے بعد ان کی باہمی صلح ہوئی۔

یہ تھی یثرب کی سیاسی حالت جب رسُولؐ اللہ نے وہاں ورود فرمایا۔ آپؐ کے ورود سے شہر میں ایک نیا دور طلوع ہُوا۔

اوس وخزرج کے پرانے اور تباہ کن جھگڑے اخوتِ اسلامی نے بھلا دیئے اور وہ اسلام کے عَلَم کے گرد جمع ہو کر اسلامی دولتِ عامہ کا قلب بن گئے۔ پرانے امتیازات مٹ گئے اور انصار کا معزز لقب ان سب لوگوں کا مشترک لقب بن گیا جنھوں نے اسلام کے نازک وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ جاں نثاروں کا وہ گروہ جس نے اپنے محبوب وطن کو چھوڑا اور سارے رشتے منقطع کر دیئے مہاجرین کے لقب سے سرفراز ہُوا۔

انصار اور مہاجرین کے تعلقات کو زیادہ استوار بنانے کی غرض سے آنحضرتؐ نے انھیں ایک ایسے رشتۂ اخوت میں مربوط کر دیا جس نے انھیں شادی وغم میں ایک دوسرے کا رفیق بنا دیا۔

یثرب کا قدیم نام بدل گیا اور اب وہ مدینۃ النبی یا مختصراً مدینہ کہلانے لگا۔

جلد ہی ایک مسجد بنائی گئی، جس کی تعمیر میں آنحضرتؐ خود شریک ہوئے اور اپنے ہاتھوں سے کام کیا۔ مہاجرین کے لیے بھی مکانات بن گئے۔ جس قطعۂ زمین پر مسجد بنائی گئی اس کے مالک دو بھائی تھے۔ انھوں نے زمین کو بلا معاوضہ نذر کرنا چاہا لیکن چونکہ وہ یتیم تھے اس لیے آنحضرتؐ نے انھیں اس کی قیمت ادا کر دی۔ مسجد کی وضع قطع اور بناوٹ ہر قسم کے تکلفات سے بری اور مذہبِ اسلام کی سادگی کی تصویر تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں، اور ان پر برگِ خرما کا چھپّر تھا۔ مسجد کا ایک حصہ ان لوگوں کے رہنے سہنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا جن کا اپنا کوئی گھر بار نہ تھا۔

اس غریبانہ عبادت گاہ میں ہر کام نہایت سادگی سے کیا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ زمین پر کوئی فرش بچھائے بغیر نماز ادا کرتے اور کھجور کے ایک ستون کے سہارے کھڑے ہو کر وعظ فرماتے اور جو جاں نثار آپؐ کے اردگرد جمع تھے اُن کے دل آپؐ کے روح کی گہرائیوں میں تلاطم پیدا کر دینے والے الفاظ کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگتے۔

آپؐ فرماتے "جو شخص خدا کی مخلوق اور اپنی اولاد پر شفقت نہیں کرتا خدا اس پر شفقت نہیں کرتا۔ جو مسلمان ننگوں کو کپڑے پہنائے گا اسے خدا جنت میں سبز خلعت بخشے گا۔"[1]

ایک وعظ میں آپؐ نے مسئلۂ خیرات پر ذیل کے الفاظ ارشاد فرمائے: "جب اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی تو وہ لرزتی اور کانپتی تھی۔ اسے پختہ کرنے کے لیے خدا نے پہاڑ بنا کر اس پر کھڑے کیے۔ فرشتوں نے پوچھا "یا اللہ تیری مخلوق میں کیا پہاڑوں سے زبردست کوئی چیز ہے۔؟" خدا نے جواب دیا "لوہا پہاڑوں سے بھی زبردست ہے، کیونکہ وہ انھیں توڑ دیتا ہے۔"

"کیا تیری مخلوق میں لوہے سے بڑھ کر کوئی زبردست چیز ہے؟"

"ہاں! آگ لوہے سے زیادہ زبردست ہے۔ کیونکہ وہ اسے پگھلا دیتی ہے۔"

"کیا تیری مخلوقات میں کوئی چیز آگ سے بھی زبردست ہے۔؟"

---

[1] روایت از ابوہریرہؓ۔ مشکوٰۃ۔

"ہاں! پانی، کیونکہ وہ آگ کو بجھا دیتا ہے"۔
"یا مولا! کیا تیری مخلوقات میں کوئی ایسی چیز ہے جو پانی سے بھی زبردست ہے؟"
"ہاں! ہوا، کیونکہ وہ پانی پر غالب آتی اور اسے حرکت میں لاتی ہے"۔
"اے پروردگار! کیا تیری مخلوقات میں ہوا سے بھی بڑھ کر کوئی چیز زبردست ہے؟"
"ہاں، ایک خیرات دینے والا نیک آدمی۔ اگر وہ دائیں ہاتھ سے خیرات دے اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو تو وہ ہر چیز پر غالب آسکتا ہے"۔

آپؐ نے خیرات کی جو تعریف کی وہ ہر قسم کے احسان اور لطف و کرم پر حاوی ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے: "ہر نیک کام خیرات ہے، تمہارا اپنے بھائی کے ساتھ خندہ جبینی سے پیش آنا خیرات ہے۔ اگر تم اپنے ہم جنسوں کو نیک کاموں کی تلقین کرو تو وہ بھی خیرات ہے۔ مسافروں کو راستہ دکھانا بھی خیرات ہے۔ اندھوں کی دستگیری کرنا، راستے پر سے کنکر، پتھر اور کانٹے ہٹانا بھی خیرات ہے۔ پیاسوں کو پانی پلانا بھی خیرات ہے[1]"۔

"آخرت میں انسان کی حقیقی دولت وہ نیکیاں ہیں جو وہ اس دنیا میں اپنے ہم جنسوں سے کرتا ہے۔ جب کوئی مرتا ہے تو لوگ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا جائیداد چھوڑ گیا ہے؟ لیکن وہ فرشتے جو اس سے قبر میں حساب لیں گے اس سے پوچھیں گے "تم نے کونسے نیک اعمال اپنے آگے بھیجے ہیں۔؟"

ایک صحابی نے پوچھا "یا نبیؐ میری ماں اُمِّ سعد فوت ہو گئی ہے۔ وہ بہترین خیرات کونسی ہے جو میں اس کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے دے سکتا ہوں؟" آپؐ نے صحرا کی تپش کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا "پانی۔ اس کی روح کے ثواب کی خاطر ایک کنواں کھدواؤ اور پیاسوں کو پانی پلاؤ"۔ صحابی نے اپنی ماں کے نام پر کنواں کھدوایا اور کہا "میں نے یہ اپنی ماں کے لیے کھدوایا ہے تاکہ اس کا ثواب اس کی روح کو پہنچے"۔

ارونگ Irving لکھتا ہے: "زبان کی خیرات جو اہم ترین خیرات ہے لیکن جس

---

[1] مروی از ابوسعید خدری

کی مشق سب سے کم کی جاتی ہے، اس کی تلقین بھی حضرت محمدؐ نے بڑی تاکید سے کی۔ ابو جاریہؓ جو بصرہ کے باشندے تھے، مدینہ میں آئے اور آنحضرتؐ کے منصب رسالتؐ پر ایمان لاکر آپؐ سے کسی عملی نصیحت کے ملتجی ہوئے۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا، "کبھی کسی کی بُرائی نہ کرو"۔ ابو جاریہؓ کہتے ہیں "اس وقت سے میں نے کبھی کسی شخص کی، چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، بدگوئی نہیں کی"۔

اسلام کی تعلیمات زندگی کی عام تواضعات کو محیط ہیں۔ "کسی گھر میں داخل ہوتے وقت اور اس سے رخصت ہوتے وقت گھر والوں کو سلام کرو"[۱] دوستوں، آشناؤں اور راہگیروں کے سلام کا جواب دو۔ سوار، پیادہ یا چلنے والے کو، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو، چھوٹا گروہ بڑے گروہ کو اور چھوٹا بزرگ کو سلام کرنے میں سبقت کرے[۲]۔

---

[۱] مقابلے کے لیے دیکھئے سورہ النور آیات ۲۷، ۲۸، ۶۱ اور ۶۲

[۲] مروی از ابوہریرہؓ۔ مشکوٰۃ۔ ان حوالوں کے علاوہ کتاب المستطرف بھی ملاحظہ فرمایئے۔ مستطرف میں ترمذی، مسلم اور بخاری کے پورے پورے حوالے دیئے گئے ہیں۔ مجالس الابرار، (مجلس ۱۴۳) بھی ملاحظہ کیجئے۔

چوتھا باب

قریش اور یہود کی دشمنی

(یکم سن ہجری مطابق ۱۰ اپریل ۶۲۲ء سے لے کر ۷ مئی ۶۲۳ء تک)

بلغ اللہ صلاتی وسلامی ابدا — لنبی عربی مدنی حرمی

شمس فضل وضیاءً وسناء اسنیٰ — نور بدر وبهاء وسماء الکرم

اکرم الخلق وجودا وسجودا وجود ا — احسن الناس سخاء وعطاء النعم

اس وقت مدینے میں تین جدا جدا گروہ تھے۔ مہاجرین اور انصار اسلام کا قلب تھے۔ انھیں رسول اللہ سے بے پایاں محبت وعقیدت تھی۔ مہاجرین نے نہ صرف اپنے وطن کو چھوڑا تھا، بلکہ تمام عربی روایات کے خلاف اسلام کی خاطر آل اولاد وعزیز واقارب سے تمام رشتے منقطع کر دیئے تھے۔ انھوں نے راہِ حق میں ہر طرح کی تکالیف کو برداشت کیا تھا اور ہر قسم کی تحریصات کو ٹھکرا دیا تھا۔ ان میں بہت سے دار الامان مدینہ میں بالکل تہی دست آئے تھے۔ مدینہ کے مسلمانوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور ان میں جو زیادہ غریب تھے انھیں اپنے مال و دولت میں برابر کا شریک کر لیا تھا۔ رسولؐ خدا کے تدبر نے جو دینی مواخاۃ قائم کی تھی اس نے ایک طرف تو رقابتوں کے پیدا ہونے کو روکا اور دوسری طرف خدا اور رسولؐ کی خاطر جان و مال کی قربانی دینے کے معاملے میں انصار و مہاجرین کے درمیان ایک عالی ظرفانہ مسابقت کی بنا ڈالی۔ وہ ذوق وشوق اور جوش وخروش جس سے ان لوگوں نے اسلام کی خاطر اپنے آپ کو وقت کر دیا، یہاں تک اپنی جانیں قربان کرنے سے دریغ نہ کیا، اس کی مثال ظہور عیسائیت

کے بعد اس وقت تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ دوسرا گروہ جو کچھ اہم تھا ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جنھوں نے بظاہر اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن پورا پورا ایمان نہ رکھتے تھے بلکہ ابھی تک بت پرستی کی طرف مائل تھے۔ اس گروہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی تھا جو شہر کے صاحبِ حیثیت لوگوں میں تھا اور مدینہ کی بادشاہت کا آرزومند تھا۔ اس آرزو کی تکمیل کی خاطر اس نے اپنے طرفداروں کی ایک زبردست جماعت اپنے گرد جمع کر رکھی تھی، جیسا کہ ابوسفیان نے مکّہ میں کیا تھا۔ وہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے ہی والا تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے ورود نے اس کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسلام کے بارے میں جو عام جوش پھیلا ہوا تھا اس نے عبداللہ ابن ابی اور اس کے پیروؤں کو مجبور کیا کہ وہ دکھاوے کی خاطر اسلام قبول کر لیں، لیکن چونکہ یہ لوگ اسلام کی مخالفت کے لیے ہر وقت موقعے کی تلاش میں رہتے تھے اس لیے وہ اس نئی دولتِ عامہ کے لیے سخت خطرے کا سرچشمہ تھے اور آنحضرتؐ کو ہر وقت ان پر نگاہ رکھنی پڑتی تھی۔ آپؐ ان لوگوں کے ساتھ انتہائی صبر و تحمّل کا سلوک کرتے، کیونکہ آپؐ کے دل میں اُمید تھی کہ بالآخر آپؐ انھیں سچّے دل سے مسلمان بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ نتائج نے ثابت کر دیا کہ آپؐ کی اُمید بے بنیاد نہ تھی۔ عبداللہ ابن ابی کی وفات پر اس کی جماعت، جسے منافقین کا نام دیا گیا ہے، کچھ مدت کے لیے نظروں سے غائب ہو گئی۔[۱]

تیسرا گروہ یہودیوں کا تھا، جو سب سے خطرناک عنصر تھا۔ قریش سے یہودیوں کے بہت قریبی کاروباری تعلقات تھے اور ان کی شاخیں بہت سے ایسے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں جو ابھی اسلام کے مخالف تھے۔ ابتداءً انھوں نے آنحضرتؐ کی تعلیمات کو قدرے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے آپؐ کو اپنا مسیحِ موعود تو قبول نہ کیا، لیکن ان کے دل میں توقع تھی کہ یہ دور دراز کے خواب دیکھنے والا مبلغ، جو ان کے سابق دشمنوں اور اس وقت کے مربّیوں

---

[۱] قرآن سورہ الشوریٰ، ابنِ ہشام۔ منافقین جو سیاستِ اسلامیہ سے کبھی پوری طرح غائب نہیں ہوئے۔ وقتاً فوقتاً انھوں نے ملّتِ اسلامیہ پر بہت مضر اثرات ڈالے ہیں۔ قرونِ اُخریٰ میں انھوں نے راسخ العقیدگی کے حامیوں کا بھیس بدلا۔ مثال کے طور پر افریقہ کے خارجی فرقے کو لیجیے۔

یعنی اوس و خزرج کی مہمان نوازی پر منحصر تھا۔ شاید ان کا انتقام لے اور انھیں عربوں پر غلبہ پاکر یہوواہ کی ایک نئی سلطنت قائم کرنے میں مدد دے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ رسول اللہ کے استقبال میں اُوپرے دل سے اہلِ مدینہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ کچھ مدت تک ان کا رویہ صلح پسندانہ رہا۔ لیکن بمشکل ایک مہینہ گذرا تھا کہ ان کی پُرانی روحِ بغاوت، جس نے ان کے ہاتھوں ان کے نبیوں کو مصلوب کرایا تھا، اپنے آپ کو علانیہ سرکشیوں اور خفیہ سازشوں میں ظاہر کرنے لگی۔ ورودِ مدینہ کے بعد آنحضرتؐ نے سب سے پہلے جو کام کئے تھے اُن میں ایک یہ تھا کہ آپؐ نے مدینہ اور اس کے مضافات کی آبادی کے مختلف النوع اور باہم برسرِ پیکار عناصر کو باہمی عہد و پیمان کے ذریعے ایک منظّم جماعت کی صورت میں متحد کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے آپؐ نے ایک معاہدہ مرتب فرمایا تھا جس میں مسلمانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور مسلمانوں اور یہودیوں کے باہمی حقوق و فرائض واضح طور پر مقرر کر دیئے تھے۔ صلح و آشتی کی اس زبردست تحریک سے مغلوب ہو کر یہودیوں نے معاہدے کو بخوشی منظور کر لیا تھا۔ یہ دستاویز، جو ابن ہشام کے اوراق میں پوری طرح محفوظ ہے، اس انسان کی حقیقی عظمت کو ظاہر کرتی ہے جو نہ صرف اپنے زمانہ کا جیسا کہ میور کہتا ہے، بلکہ سارے زمانوں کا حکیم یگانہ تھا۔ وہ کوئی پریشان خواب دیکھنے والا نہ تھا جو معاشرہ کا موجودہ شیرازہ بکھرنے پر تلا ہُوا تھا، بلکہ ایک عدیم المثال مدبّر تھا جس نے ایک کمل اور یاس انگیز تشتّت کے زمانے میں اس سازوسامان اور اس سیاسی تدبّر سے جو خدا نے اسے عطا کیا تھا ایک سلطنت، ایک دولتِ عامّہ، ایک معاشرے کی از سرِ نو تعمیر کا کام سنبھالا۔ آزادیٔ ضمیر کا یہ پہلا منشور یوں شروع ہوتا ہے: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ معاہدہ ہے جو محمدؐ نبی کی زیرِ نگرانی مومنوں، خواہ وہ قریش ہوں خواہ اہلِ یثرب، اور تمام ان غیر مسلم اشخاص کے درمیان ہُوا ہے، چاہے وہ کسی قوم یا قبیلے سے ہوں مسلمانوں کے مقاصد سے متفق ہیں۔ یہ سب گروہ مل کر ایک قوم شمار ہوں گے۔" اس کے بعد مختلف قبیلوں کے دیت ادا کرنے کے قاعدے اور مسلمانوں کے باہمی انفرادی فرائض سے متعلق چند دانشمندانہ اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ "صلح اور جنگ دونوں حالتوں میں تمام مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو یہ حق نہ ہوگا کہ اپنے ہم مذہبوں کے خلاف صلح یا جنگ کرے۔

جن یہودیوں نے ہماری دولتِ عامہ کے ساتھ الحاق کیا ہے انھیں ہر طرح کی توہین و تعرض سے محفوظ رکھا جائے گا۔ انھیں مسلمانوں کے برابر ہماری نصرت و امداد کا حق ہوگا۔ مختلف قبائل کے یہودی، عوف، نجّار، حارث، جُشم، ثعلبہ، اوس اور تمام دوسرے جو یثرب میں آباد ہیں مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک متحد قوم شمار ہوں گے۔ انھیں اپنے مذہب کے احکام کی بجا آوری میں اتنی ہی آزادی ہوگی جتنی مسلمانوں کو۔ یہودیوں کے موالی اور حلیفوں کو انھی کے برابر حفاظت اور آزادی حاصل ہوگی۔ مجرموں سے مواخذہ کیا جائے گا اور انھیں سزا دی جائے گی۔ یہودی یثرب (مدینہ) کو دشمنوں سے بچانے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ جو لوگ اس عہد نامے کو قبول کریں گے ان سب کے لیے اندرونِ یثرب حرم یعنی دارالامان ہوگا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے متعلقین اور حلیفوں کا اتنا ہی احترام کیا جائے گا جتنا ان کے مربیوں کا۔ تمام سچے مسلمان ہر ایسے شخص سے جو کسی جرم، ناانصافی یا بدامنی کا مرتکب ہوگا نفرت کریں گے۔ کوئی شخص کسی مجرم کی مدد نہیں کرے گا، چاہے وہ اس کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔" پھر امورِ مملکت کے اندرونی انتظامات کے بارے میں چند شرائط بیان کر کے یہ حیرت انگیز دستاویز یوں ختم ہوتی ہے: "جن لوگوں نے یہ معاہدہ قبول کیا ہے ان لوگوں میں آئندہ کوئی جھگڑے ہوں گے تو وہ اللہ کے نام پر رسولؐ کے سامنے پیش ہوں گے۔"

اس طرح عربوں کے اس نراجی دستور کو ایک جان لیوا ضرب لگی جس کے تحت اب تک مظلوموں کو انتقام یا انصاف کی خاطر اپنے رشتہ داروں کے زورِ بازو پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس دستاویز کی رُو سے آنحضرتؐ، نہ صرف اپنے منصبِ رسالت کی بدولت بلکہ لوگوں کے ساتھ ایک معاہدہ کی بناء پر، قوم کے حاکمِ اعلیٰ مقرر ہو گئے۔

ابتداءً مدینے کے قرب و جوار کے تین یہودی خاندان، بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، اس معاہدہ میں شریک نہ تھے لیکن یہ تینوں خاندان بھی تھوڑے عرصے کے بعد بخوشی شامل ہو گئے۔

۲ھ، مئی ۶۲۳ء تا ۲۶ اپریل ۶۲۴ء

لیکن آنحضرتؐ چاہے یہودیوں پر کتنی ہی مہربانیاں اور فیاضیاں کرتے انھیں راضی نہ ہونا

تھا اور نہ ہو سکے۔ ان کے دل میں عداوت کے جو جذبات بھرے ہوئے تھے ان کی تسکین کسی طرح ممکن نہ تھی۔ انھیں بالخصوص غصہ اس بات پر تھا کہ وہ آنحضرتؐ کو تمام عرب کے یہودی بنانے میں آلۂ کار کے طور پر استعمال نہ کر سکے۔ وہ اس پر بھی جھنجلائے کہ اسلام کے عقائد ان کے تلمودی قصوں کے مقابلے میں بالکل سادہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں سے روابط ترک کر دیئے اور دشمنانِ اسلام کی صفوں میں جا ملے۔ جب ان سے یہ پوچھا جاتا کہ وہ بت پرستی یا اسلام کو ترجیح دیتے ہیں تو اکثر عیسائی مناظرین کی طرح یہی جواب دیتے کہ وہ بت پرستی کو اس کی تمام برائیوں کے باوجود دینِ محمدیؐ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ آنحضرتؐ کی شان میں نامناسب کلمات استعمال کرتے اور قرآن کے الفاظ، نماز کے کلمات اور مسلمانوں کے عام راہ و رسم کے الفاظ کا تلفظ جان بوجھ کر کچھ ایسی طرح بگاڑ دیتے کہ وہ مہمل اور مضحکہ خیز یا کلماتِ کفر بن جاتے۔ یہودی شعراء اور شاعرات، جن کی اس وقت بھرمار تھی، تہذیب و شائستگی اور عربوں کے مسلّمہ ضابطۂ شرافت و فتوت کو بالائے طاق رکھ کر مسلمان عورتوں کی ہجو میں فحش اشعار لکھتیں۔ لیکن یہ سب تو ان کے لیے خفیف سی بدتمیزیاں تھیں، مسلمان عورتوں کی توہین اور آنحضرتؐ کی شان میں بدگوئیوں سے ان کی تسلی نہ ہوتی۔ چنانچہ جس ریاست کی حفاظت میں رہنا انھوں نے باقاعدہ طور پر قبول کیا تھا اس کے دشمنوں کے پاس انھوں نے اپنے ایلچی بھیجے۔ قریش، جو آنحضرتؐ کے قتل پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ عبداللہ ابن ابی اور غدار اسرائیلیوں کی مخبری کی بدولت مسلمانوں کی کمزور حالت سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہودیوں نے محض وقتی مصلحت کی بناء پر آنحضرتؐ سے اتحاد کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ان کے قرب و جوار مدینہ میں منہ دکھاتے ہی یہود کے پرستار آنحضرتؐ کا ساتھ چھوڑ کر بت پرستوں سے جا ملیں گے۔

اب مسلمانوں کی سخت ترین آزمائش کا وقت آن پہنچا۔ آنحضرتؐ شہر کے تحفظ کے بندوبست اور مسلمانوں کی تنظیم سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کفار کی یورشیں شروع ہو گئیں۔[ل] خود مدینہ کے اندر بغاوت اور غداری کی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ کا یہ فرض ہو گیا کہ مسلمانوں کو اس

[ل] قرآن سورۂ توبہ آیت ۱۳، زمخشری، کشاف، الحلبی، انسان العیون۔

آفت سے بچانے کے لیے جو کسی اندرونی بغاوت یا بیرونی حملے کی صورت میں ان پر آتی مناسب تدابیر کریں۔ آپؐ صرف اسلام کے مبلغ ہی نہ تھے بلکہ اپنی اُمت کے جان و مال اور آزادی کے محافظ بھی تھے۔ ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپؐ دشمنوں کے طعنوں اور بد زبانیوں کو برداشت کر سکتے تھے، لیکن رئیسِ مملکت کی حیثیت سے اور تقریباً "مسلسل جنگ کے زمانہ میں ایک جرنیل" کی حیثیت سے، جب کہ مدینہ عسکری مدافعت کی حالت میں اور ایک قسم کے فوجی نظم و نسق کے تحت تھا، آپؐ کے لیے غداری سے چشم پوشی کرنا ناممکن تھا۔ رعایا کی طرف سے آپؐ پر جو فرضِ منصبی عائد ہوتا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ آپؐ ایک ایسے گروہ کو دبا دیں جو حملہ آور فوجوں کے ہاتھوں شہر کو تاخت و تاراج کرا سکتا تھا اور کرانے کی کوشش سے بھی نہ چوکا۔ مملکت کے تحفظ کے لیے ضروری تھا کہ ایسے غداروں کا قلع قمع کر دیا جائے جو یا تو مدینہ کے اندر بغاوت کا بیج بو رہے تھے یا مشترک دشمن کو خبریں دے رہے تھے۔ چنانچہ تقریباً چھ آدمی غداری کے مجرم قرار دے کر قتل کر دیئے گئے۔ لیکن ہم اس واقعے کا تذکرہ قبل از وقت کر رہے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ آنحضرتؐ کو دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ملتا قریش کی فوجیں میدانِ جنگ میں آ پہنچیں۔

وہ جس نے ساری عمر کوئی ہتھیار استعمال نہ کیا تھا، جس کا دل انسانی تکالیف کو دیکھ کر انتہائی درد و رحم سے بھر آتا تھا، جو عربوں کے آئینِ مردانگی کے خلاف اپنے بچوں اور پیروؤں کی موت پر بے اختیار رو دیا کرتا تھا اور جس کی طبیعت ہمیشہ اتنی رقیق اور رحیم رہی کہ اس کے دشمنوں کو اسے نسائیت[1] کا طعنہ دینے کا موقع ملا۔ وہ شخص اب حالات کے تقاضوں سے اس پر مجبور ہو گیا کہ اپنے میلانِ طبع کے خلاف اپنے دشمنوں کے حملوں کو بزورِ شمشیر روکے، اپنے متبعین کو اپنی حفاظت کے لیے منظم کرے اور اکثر غدارانہ اور ناگہانی حملوں کی پیش بندی کے لیے فوج بھیجے۔ اب تک عربوں کا طریقِ جنگ یہ رہا تھا کہ یا تو اکثر رات کے وقت یا صبح کے

---

[1] Compare Dozy, *Historie des Musulamans d' Espagne*, vol. i, p. 32

دھندلکے میں دشمن پر ناگہانی اور خوں ریز چھاپے مارے جاتے تھے، یا اگر دشمن کو حملہ آوروں کے ارادے کی خبر ہو جاتی تو ایک ایک، دو دو آدمی آپس میں مقابلہ کرتے یا ایک عام حملہ کر دیا جاتا۔ آنحضرتؐ چونکہ اپنی قوم کی عادات سے بخوبی واقف تھے، اس لیے آپؐ کو اکثر ناگہانی حملوں کی پیش بندی کے لیے طلیعہ بھیجنا پڑتا تھا۔

اہلِ مکہ اور ان کے ساتھیوں نے مدینے کے مضافات میں حملے شروع کر دیئے۔ وہ ان کے پھلدار درخت تباہ کر دیتے اور ان کے گلّے ہانک کر لے جاتے۔ ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس ایک ہزار آدمیوں کی فوج مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے اور قریش کے کاروان کی حفاظت کے لیے ابوجہل کی سرکردگی میں مکّے کی طرف روانہ ہوئی۔ مسلمانوں کو ان کی نقل و حرکت کی بابت خبر مل گئی اور وہ کفّار کو وادیٔ بدر میں آنے سے روکنے کے لیے، جس پر ابوجہل کا لشکر چڑھائی کر رہا تھا، تین سو (۳۰۰) کی تعداد میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب آنحضرتؐ نے لشکرِ کفّار کو متکبرانہ انداز میں وادی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر مومنین کے چھوٹے سے گروہ کے بچاؤ کی دعا مانگی: "یا مولا! اپنے امداد کے وعدے کو نہ بھولیو۔ یا مولا! اگر یہ چھوٹا سا گروہ فنا ہو گیا تو تیری سچی عبادت کرنے والا کوئی باقی نہ رہے گا۔"[1]

قریش کے تین آدمی اس کھلی جگہ میں آئے جو مسلمانوں اور کفّار کے درمیان تھی اور عربوں کے دستور کے مطابق مسلمانوں سے مبارز طلب ہوئے۔ حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہؓ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا اور فتحیاب ہوئے۔ اس کے بعد دونوں لشکر گتھم گتھا ہو گئے۔ ابتداء میں کبھی مسلمانوں کا پلّہ بھاری ہو جاتا تھا اور کبھی کفّار کا۔ لیکن آنحضرتؐ کے پُرجوش الفاظ نے لڑائی کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کر دیا۔[2] یہ موسمِ سرما کا ایک طوفانی دن تھا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکّڑ وادی میں چل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمانی فرشتے مسلمانوں کی طرف سے جنگ کر رہے ہیں۔ آنحضرتؐ اور آپ کے متبعین کے لبریزِ عقیدت دلوں کو،

---

[1] ابنِ ہشام۔ ابن الاثیر

جنھیں فطرت کے تمام عطیوں میں، زندگی کے تمام تعلقات میں اور اپنے انفرادی و اجتماعی حالات کے ہر موڑ پر خدا کا دستِ قدرت کارفرما دکھائی دیتا تھا، اس نازک لمحہ میں ہوا اور ریت کے یہ جھکڑ، دشمنانِ خدا سے جنگ کرتے ہوئے فطرت کے یہ عناصر تائید آسمانی کے ثبوت معلوم ہوئے، گویا فرشتے ہوا کے پروں پر سوار کافروں کو تتر بتر کر رہے ہیں[1]۔ اہلِ مکہ شدید نقصان کے ساتھ پسپا ہوئے، ان کے بہت سے سردار کام آئے، اور ابوجہل نے اپنے غرور و تکبر کی سزا پائی[2]۔

بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے، لیکن ان میں سے صرف دو قتل کئے گئے۔ یہ دینِ اسلام کے شدید دشمن تھے۔ اس لیے عربوں کے قانونِ جنگ کے مطابق انھیں کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا[3]۔

باقی قیدیوں کے ساتھ عربوں کے تمام قواعد و روایات کے خلاف انتہائی انسانیت کا سلوک کیا گیا۔ آنحضرتؐ نے تاکیدی احکام صادر کئے کہ ان لوگوں کو ذلیل نہ کیا جائے، بلکہ ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا جائے۔ جن مسلمانوں کے سپرد یہ قیدی کئے گئے انھوں نے ان ہدایات کی پوری پوری بجا آوری کی۔ ان لوگوں نے قیدیوں کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا، یہاں تک کہ روٹی، جو عربوں کی غذا کا بہترین حصہ سمجھی جاتی تھی، انھوں نے قیدیوں کو دی اور خود کھجوروں پر گزارا کیا[4]۔

---

[1] قرآن سورۂ انفال آیت ۹ اور آل عمران آیات ۱۱ اور ۱۲۱ تا ۱۲۸۔ نیز ملاحظہ کیجیے میور۔

[2] ابن ہشام۔ ابن الاثیر

[3] نضر بن حارث جس کا تذکرہ سورۂ انفال میں ہے، ان میں سے ایک تھا۔

[4] ابن ہشام، کوسین دی پرسیوال۔ میور یوں رقمطراز ہے "حضرت محمدؐ کی ہدایات کے مطابق اہلِ مدینہ نے اور ان مہاجرین نے جن کے پاس خود رہنے کو مکان تھے، قیدیوں کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کے ساتھ بڑی مدارات سے پیش آئے۔ بعد میں ان میں سے ایک قیدی نے کہا "خدا کی رحمت ہو مدینہ کے لوگوں پر، وہ ہمیں سواری دیتے تھے اور خود پیدل چلتے تھے۔ ان کے ہاں گندم کی روٹی کی کمی تھی پھر بھی انھوں نے ہمیں وہ کھانے کو دی اور خود کھجوروں پر بسر کی"۔

مالِ غنیمت کی تقسیم نے مسلمان سپاہیوں میں شدید جھگڑے پیدا کر دیئے۔ آنحضرتؐ نے سب کو مساوی حصہ دے کر عارضی طور پر جھگڑے کا فیصلہ کیا[1]۔ لیکن چونکہ عربوں جیسے شورش پسند لوگوں میں اس قسم کے جھگڑوں سے فتنے برپا ہونے کا امکان تھا، آنحضرتؐ نے مالِ غنیمت کے معاملے میں آئندہ تنازعوں کی پیش بندی کرنے کی غرض سے ایک حکم خاص جاری کیا جو سورۃ انفال میں شامل ہے۔ اس حکم کے تحت مالِ غنیمت کی تقسیم کا قطعی اختیار رئیسِ مملکت کو دیا گیا۔ غریبوں اور محتاجوں کی امداد کی خاطر پانچواں حصہ بیت المال کے لیے وقف کر دیا گیا[2]۔

جو عجیب و غریب حالات فتحِ بدر کا باعث بنے اور اس فتح سے جو نتائج حاصل ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے دلوں پر بہت گہرا اثر کیا۔ مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ خدا کے فرشتوں نے ان کی طرف سے لشکرِ کفار سے جنگ کی تھی۔

فرشتوں کے خدا کی طرف سے جنگ کرنے کے تصور میں جو شاعرانہ عنصر ہے اس کے نقش و نگار کو قرآن میں موقلم کی جن چند سادہ جنبشوں سے اُبھارا گیا ہے وہ خوبصورتی اور عظمت میں زبور کی بلیغ ترین عبارتوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ دونوں میں ایک ہی طرح کی شعریت ہے[3]۔

حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کی طرح حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خدا کے پیغامات

---

[1] سیل Sale کہتا ہے "یہ قابلِ ملاحظہ امر ہے کہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں میں بدر کے مالِ غنیمت کی تقسیم پر جو جھگڑا ہوا وہ ایک ایسے ہی موقعے پر ہوا، جیسا عمالقہ کے مالِ غنیمت کے بارے میں حضرت داؤدؑ کے سپاہیوں میں ہوا تھا۔ جو لوگ جنگ میں شریک ہوئے تھے ان کا اصرار تھا کہ جن لوگوں نے محض مالِ غنیمت کی پاسبانی کی ہے انھیں کوئی حصہ نہ دیا جائے۔ دونوں موقعوں پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ دونوں قسم کے لوگوں کو برابر کا حصہ دیا جائے اور یہ آئندہ کے لئے قانون بن گیا۔"

[2] سورہ انفال آیت ۴۱۔ اگرچہ تقسیم کا اختیار رئیسِ مملکت کو دیا گیا تاہم چند مروجہ قاعدوں پر عمل کیا جاتا تھا جنھوں نے خلفائے کے تحت اسناد و نظائر کی حیثیت اختیار کر لی اور یوں اس قانون کو ایک معین شکل بخشی۔ ملاحظہ کیجیے موسیو کویری کی اعلیٰ کتاب Droit Mussulman, p. 335

[3] سورۂ بدر میں فرشتوں کا نازل ہونا صرف تاریخ و روایات کی (باقی حاشیہ صفحہ ١٥٢ پر ملاحظہ فرمائیں)

انسان تک پہنچانے والی متوسل ہستیوں کے قائل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں آج کل کے لوگوں کا عدمِ اعتقاد اس کا کوئی جواز مہیا نہیں کرتا کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے تصورات کی ہنسی اُڑائیں۔ ہمارے عدمِ اعتقاد اور ان کے اعتقاد دونوں کو وہم وقیاس کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک سلبی ہے دوسرا ایجابی۔ جن چیزوں کو ہم جدید زمانہ میں قوانینِ فطرت کہتے ہیں انہی کو وہ لوگ فرشتے یعنی آسمانی کارپرداز تصور کرتے تھے۔ آیا، جیسا کہ لاک Lock کا خیال ہے، خدا اور انسان کے درمیان کوئی متوسط ہستیاں ہیں، جس طرح انسان اور حیوانی مخلوق کی اسفل ترین صورتوں کے درمیان ہیں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی تہہ تک عقلِ انسانی کی رسائی محال ہے۔

حضرت عیسیٰ کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے قائل تھے کہ ایک اصولِ شر موجود ہے جو ایک وجودِ شخصی میں مجسّم ہے۔ لیکن جب آپ کے اقوال کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں ایک عقلی عنصر دکھائی دیتا ہے، یعنی ایک موضوعی تصور جسے آپ نے اپنے متبعین کے فہم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲) طرفہ طرازی نہیں کہ اس کو شاعرانہ اندازِ بیان پر محمول ٹھہرایا جائے۔ بلکہ اس کا تعلق قرآن کی نص سے ہے۔ چنانچہ سورۂ انفال کی جس آیت کی طرف تحشیہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے: اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملٰئکۃ مردفین۔ (انفال) جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ سے غیر معمولی امداد کا مطالبہ کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس مطالبہ کو شرفِ قبولیت بخشا اور فرمایا کہ میں تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار میدانِ کارزار میں اُتریں گے۔ یہاں عربیت کی رو سے تین قرائن ایسے ہیں۔ جو اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ امرِ واقعہ ہے، اسلوبِ بیان کی ساحری یا شاعرانہ بلاغت نہیں۔ صرف تاکید۔ لفظ امداد و ملائکہ کے ذکر کے بعد صفت مردفین کا اضافہ۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ غزوۂ بدر معمولی لڑائی نہیں تھی۔ بلکہ حق و باطل کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ یعنی یہ جنگ اقدار کی جنگ تھی خیر و شر کی لڑائی تھی، اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص نوازشیں مسلمانوں کے شاملِ حال نہ ہوں۔ (ادارہ)

ملے زبور باب ۱۸

کے مطابق الفاظ کا جامہ پہنا دیا۔ ایک مرتبہ کسی نے آپؐ سے پوچھا کہ شیطان کہاں رہتا ہے تو آپؐ نے جواب دیا "انسان کے دل میں"۔ اس کے مقابلہ میں عیسائی روایات نے اس فریسی کو جس نے حضرت عیسیٰؑ کو آزمائش میں ڈالا سچ مچ کا رئیس جہنم (Prince of Hell)- بنا کر پیش کیا۔[1]

ملائکہ و شیاطین پر اعتقاد نے اسلام میں بھی اور عیسائیت میں بھی قصص و اساطیر کی ایک حیرت انگیز تعداد کو جنم دیا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ آسمان کے اولیاء اور فرشتے ان کی طرف سے جنگ کرتے ہیں۔ مسلمان صرف جہادِ زندگی میں فرشتوں کی معاونت قبول کرتا ہے۔

چوتھے باب پر نوٹ

یہ ایک بالکل بے سروپا افسانہ ہے کہ جب عقبہ بن معیط کو مقتل کی طرف لے جا رہے تھے تو

---

[1] Schleiermacher کے دبستان کے سارے مفکر یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو آزمائش میں ڈالنے والا یہودی پجاریوں کا سرغنہ تھا۔ ملمن Milman اس خیال کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس بارے میں راسخ العقیدہ کلیسا کا جو خیال ہے اس کا بھی، لیکن وہ بڑی ہوشیاری سے کام لے کر اس کا فیصلہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیتا ہے کہ کونسا خیال زیادہ قابلِ قبول ہے۔ Reuss نے اپنی کتاب (History of Christian Theology in the Apostolic Ages) میں فرشتوں پر جو باب لکھا ہے اور اس میں جو سیر حاصل حوالے دیئے گئے ہیں، ان سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اولین عیسائی، یعنی حضرت عیسیٰؑ کے حواریین اور بلاواسطہ متبعین، اس پر کامل اعتقاد رکھتے تھے کہ فرشتے اور شیاطین اشخاص ہیں جن میں تھوڑا سا سماوی عنصر تو ہے لیکن باقی ہر لحاظ سے انسانی صفات پائی جاتی ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ عقیدہ ان حواریین اور متبعین نے خود حضرت عیسیٰؑ سے اکتساب کیا ہوگا، جن کا اندازِ فکر، جیسا کہ Renan کہتا ہے، اپنے ہمعصروں کے اندازِ فکر سے مختلف نہ ہوسکتا تھا۔

اس نے آپ سے فریاد کی اور آپ نے اُسے بیرحمانہ جواب دیا۔ افسانہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب عقبہ نے یہ پوچھا کہ "میرے بچّوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟" تو آپ نے جواب دیا "دوزخ کی آگ"۔ یہ افسانہ بجائے خود اتنا بیہودہ ہے اور آپ کی سیرت کے اس قدر نقیض ہے (جس کے اوصافِ حمیدہ میں ایک یہ وصف تھا کہ آپ کو بچّوں سے بہت محبت تھی اور آپ ہمیشہ یتیموں پر شفقت اور ان کی دستگیری کو ایک قطعی فرض اور خدا کے نزدیک پسندیدہ عمل کہہ کر اس کی تلقین کیا کرتے تھے) کہ اس کے ماخذ کا کھوج لگانا تحصیلِ حاصل ہے لیکن عیسائی مصنفین اسے ایسے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہ اس افسانے کی اصلیت کا سراغ لگانا ضروری ہے۔

قیاسِ اغلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد وہ نام ہے جس سے عقبہ کے بچّے پکارے جاتے تھے، یعنی "صبیۃ النار" (آگ کے بچّے) عقبہ خود قبیلۂ عجلان[1] سے تھا، جس کی ایک شاخ صفرا کے قریب کی چند وادیوں میں آباد تھی۔ اس شاخ کو بنی النّار کہتے تھے۔ عقبہ کے بچّوں کا نام بھی غالباً اسی مناسبت سے صبیۃ النّار پڑ گیا اور اسی کی بنا پر یہ افسانہ گھڑ لیا گیا۔

ایک اور افسانہ ہے کہ آنحضرتؐ نے بُت پرستوں کے مُردے دفن کرتے وقت اُن سے بہت سخت الفاظ میں خطاب کیا۔ جن واقعات کی بنا پر یہ بہتان باندھا گیا، طبرؔی انھیں یوں بیان کرتا ہے "رسُول اللہ اس قبر کے قریب کھڑے ہو گئے جو ان مُردوں کے لیے کھودی گئی تھی۔ جب لاشیں قبر میں اُتاری گئیں تو ہر ایک کا باری باری نام لیا گیا۔ اس وقت آنحضرتؐ نے فرمایا 'میرے رشتہ دارو، جب دوسرے لوگ مجھ پر ایمان لے آئے تو اس وقت بھی تم لوگوں نے مجھے جھوٹا کہا۔ جب دوسروں نے مجھے آسرا دیا تم نے مجھے گھر بار سے نکال دیا۔ تمھارے مقدر میں کیسا انجام تھا! افسوس! خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔' یہ الفاظ صریحاً رحم و تاسّف کے اظہار کے لیے کہے گئے تھے، لیکن انھیں موڑ توڑ کر سخت کلامی سے تعبیر کر دیا گیا۔

---

[1] کوسین دی پرسیوال کے خیال میں اغانی قبیلے سے۔

پانچواں باب

قریش کا مدینے پر حملہ

(۲ ہجری مطابق ۶۲۴ عیسوی)

کالزّھر فی ترف وّالبدر فی شرف
والبحر فی کرم وّالدھر فی ھمم

۲ ہجری

سچائی کی جو بہترین کسوٹیاں ہیں اُن میں ایک کامیابی ہے۔ عیسائیت کے ابتدائی ایام میں بھی نیک فریسی نے کہا تھا: "ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اگر یہ جھوٹے ہیں تو خود بخود نیست و نابود ہو جائیں گے، ورنہ تم خود فنا ہو جاؤ گے۔" اگر قسطنطین کو آسمان پر صلیب نظر نہ آئی ہوتی یا اُسے یہ خیال نہ ہُوا ہوتا کہ اسے صلیب نظر آئی ہے، اگر وہ اس کے زیر سایہ جادۂ کامرانی پر گامزن نہ ہوتا، اگر وہ اس کی ہمت بڑھا کر اُسے فتح و نصرت اور تخت و تاج نہ دلواتی، تو ہم تصوّر نہیں کر سکتے کہ عیسائیت کا کیا حشر ہوتا۔ فتح بدر مسلمانوں کے لیے جو معنی رکھتی تھی وہی معنی عیسائیوں کے لیے ملوین کے پُل کی فتح رکھتی تھی[1]۔ اس فتح کے بعد عیسائیت نے قیصروں کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کی۔

مسلمانوں کے لیے فتح بدر بہت مبارک ثابت ہوئی۔ اس لیے کوئی مقامِ تعجب نہیں کہ

---

[1] عیسائی خود قسطنطین کے ہاتھوں میکسنٹیس کی شکست کو اپنے دین کی سب سے شاندار کامیابی تصور کرتے ہیں۔ اس بارے میں گبن کا باب جو طنز اور تاریخ کا آمیزہ ہے، بظاہر کرتا ہے کہ عیسائیت کی کامیابی کیونکر اس واقع سے شروع ہوئی۔

قدیم اسرائیلیوں اور عیسائیوں کی طرح انھیں بھی اپنی کامیابی میں تائیدِ ایزدی کارفرما نظر آئی۔ اگر مسلمان ناکام رہتے تو ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ ان کا حشر کیا ہوتا — ایک قتلِ عام۔

جن دنوں آنحضرتؐ مہمِ بدر میں مصروف تھے انھیں دنوں میں آپ کی ایک چہیتی بیٹی رقیہؓ جو حضرت عثمانؓ سے بیاہی ہوئی تھیں وفات پاگئیں۔ (حضرت عثمانؓ حال ہی میں ہجرتِ حبشہ سے واپس آئے تھے) لیکن کفار کے دل میں جو آتشِ انتقام بھڑک رہی تھی اس نے آپ کو خانگی غموں پر حصہ لینے کی فرصت نہ دی۔ قریشی قیدیوں کے گھر لوٹتے ہی ابوسفیان دوسو سوار لے کر مکے سے نکلا۔ اس نے قسم کھالی تھی کہ جب تک حضرت محمدؐ اور ان کے متبعین سے بدلہ نہ لے لے گا اس وقت تک واپس نہ آئے گا۔ مدینے کے قرب وجوار کے علاقوں سے گذرتا ہوا وہ جلدی جلدی بے خبر مسلمانوں پر ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہوا۔ وہ جدھر سے گذرا لوگوں کو قتل کرتا گیا اور کھجور کے نخلستانوں کو جن پر عربوں کا زیادہ تر گذارہ تھا تباہ کرتا چلا گیا۔ اہلِ مکہ اس مہم کے لیے سویق (ستو) کے تھیلے لائے تھے۔[1] لیکن مسلمانوں کا اس کشت وخون کا انتقام لینے کے لیے مدینہ سے نکلنا تھا کہ اہلِ مکہ پیٹھ پھیر کر بھاگے اور بھاگتے میں اپنے جانوروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے سویق کے تھیلے پھینک گئے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے اس لڑائی کا نام غزوۃ السویق[2] رکھا۔

۵ ذی الحجہ یکم اپریل ۶۲۴ء

اس موقع پر آنحضرتؐ کو ایک واقعہ پیش آیا جسے واشنگٹن ارونگ Washington Irving نے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ آنحضرتؐ ایک دن اپنے لشکرگاہ سے کچھ

---

[1] عرب لوگ ہرے جو بھون کر اور کوٹ کر ان میں کھجور کا سفوف یا شکر ملا دیا کرتے تھے۔ ان کا عربی نام سویق ہے۔ وہ لوگ دورانِ سفر جب کھانا پکانا مشکل ہوتا تھا اسی کو پھانک کر گذر کر لیتے تھے۔

[2] جس جگہ یہ واقع ہوا، اُسے آجکل سولیقیہ کہتے ہیں۔ وہ مدینے کے جنوب مغرب میں چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے۔

دُور ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ کسی آواز نے آپؐ کو جگا دیا۔ آپؐ نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ایک دشمن سپاہی تلوار سونتے آپؐ کے سر پر کھڑا ہے۔ اس نے کہا: "اے محمدؐ، اب تجھے بچانے والا کون ہے؟" رسُولؐ اللہ نے جواب دیا "اللہ!" یہ سُن کر وحشی بدوی پر کچھ ایسا خوف طاری ہُوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ آنحضرتؐ نے جلدی سے تلوار اُٹھالی اور ہوا میں لہرا کر بدوی سے پوچھا "اے دعثور! اب تجھے بچانے والا کون ہے؟" سپاہی نے جواب دیا "افسوس! کوئی نہیں۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "تو پھر مجھ سے رحم کا سبق سیکھ۔" یہ کہہ کر آپؐ نے تلوار اسے واپس کر دی۔ اس برتاؤ سے اعرابی کا دل اتنا متاثر ہُوا کہ وہ فوراً مسلمان ہو گیا اور مستقبل میں آنحضرتؐ کے جاں نثاروں میں پیش پیش رہا۔[۱]

لیکن مسلمانوں اور کافروں کے درمیان یہ جھڑپ اور بہت سی جھڑپوں کی طرح جو اس کے بعد ہوئیں اس عظیم الشان ڈرامے کی محض ایک تمہید تھی جو بعد میں ہونے والا تھا۔

۳ ہجری (۲۶ اپریل ۶۲۴ء سے لے کر ۱۵ اپریل ۶۲۵ء تک) انتقام کی آگ کفّار کے سینوں میں سُلگ رہی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ایک اور جنگ کے لیے زبردست تیاریاں کیں۔ ان کے سفیر قبائل کنانہ و تہامہ کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کی متحدہ فوجوں کی تعداد بہت جلد تین ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ تین ہزار سپاہی ہر طرح کے سامانِ جنگ سے لیس تھے، اور ان میں سات سو زرہ پوش جنگجو بھی تھے۔ ان سب کے دلوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک رہا تھا۔

---

[۱] اس سال کے آخری مہینہ میں دو اہم واقعات ہوئے۔ عثمانؓ بن مظعونؓ کی وفات اور حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ سے نکاح۔ حضرت عثمانؓ ان لوگوں میں تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے اور مہاجرین میں سب سے پہلے انھوں نے وفات پائی۔ انھیں نواحِ مدینہ کے ایک مقام "بقیع" میں دفن کیا گیا جہاں بہت سے مشاہیر واکابر دفن ہیں جن کے مزاروں کا احترام مسلمان آج تک کرتے ہیں۔

[۲] حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی نسبت مہم بدر سے کچھ پہلے ہو چکی تھی لیکن نکاح ۳ مہینے کے بعد ہُوا۔ اس وقت حضرت علیؓ ۲۱ویں سال میں تھے اور حضرت فاطمہؓ پندرھویں سال میں۔

عرب کے قبائل کے لیے یہ فوج اتنی ہی خوفناک تھی جتنا ایران کے خشایارشا کا لشکرِ جرار یونانی ریاستوں کے لیے تھا۔

یہ فوج سخت گیر ابوسفیان کی قیادت میں کوچ کرتی ہوئی کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر مدینے کے شمال مشرق میں ایک مقام پر پہنچ گئی جہاں اس نے پڑاؤ ڈالا۔ اب اس کے اور مدینے کے درمیان صرف احد کی پہاڑی اور ایک وادی حائل تھی۔ اس مقامِ برتری سے وہ اہلِ مدینہ کے کھیتوں اور نخلستانوں کو تباہ کرنے لگی۔

اپنے مال و املاک کی یہ تباہی دیکھ کر مسلمانوں کو بہت غصہ آیا۔ ان کے جوش نے آنحضرتؐ کو مجبور کیا کہ آپؐ مدینہ سے ایک ہزار مسلمانوں کی فوج لے کر نکلیں۔ یہودیوں کی کھلم کھلا دشمنی کے بل بوتے پر منافقوں کا سرغنہ عبد اللہ بن اُبی اپنے تین سو پیروؤں کو لے کر واپس مدینہ چلا گیا۔ اب مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو رہ گئی اور اس پر ان کے پاس لے دے کر صرف دو گھوڑے تھے۔ اس کے باوجود جاں بازوں کا یہ دستہ ثابت قدمی سے بڑھتا چلا گیا اور درختوں کے جھنڈوں کی آڑ میں کوچ کرتا ہوا بہت جلد احد کی پہاڑی پر قابض ہو گیا۔ ان لوگوں نے گھاٹی میں رات گذاری اور دوسرے دن نمازِ فجر ادا کر کے میدان میں نکل پڑے۔ آنحضرتؐ نے پہاڑی کے عین نیچے صف آرائی کی[1]۔ آپؐ نے فوج کے عقب میں ایک اونچی جگہ پر تیر اندازوں

---

[1] برٹن (Burtom) اس مقام کا نقشہ یوں کھینچتا ہے : ـ یہ مقام جو اسلام کی تاریخ میں مشہور ہے ، کوہِ احد کے جنوبی دامن کے قریب ایک ڈھلوان قطعہ زمین ہے ۔ کفار کی فوج اپنے جرنیل ابوسفیان اور اس کے بتوں کو قلب میں لیے ہوئے اور ایک ہلالی شکل بناتے ہوئے آگے بڑھی۔ یہ مقام مدینہ کے شمال میں تقریباً ۳ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جب کوئی شخص یہاں آئے تو اُسے اپنے سامنے صرف کنکریلی زمین دکھائی دیتی ہے جس پر زنگار رنگ کے سنگ خارا، سرخ رنیلے پتھروں اور سنگِ سماق کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں پڑی ہیں۔ یہ ڈھیریاں شہداء کی قبروں کے نشان ہیں۔ اس نقطہ سے اس مقدس پہاڑی پر نظر ڈالئے تو وہ بھیانک سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے جلے ہوئے اور دندانہ دار پہلو لوہے کے تودوں کی طرح میدان سے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ڈراؤنی دیوار میں صرف ا (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

کا ایک دستہ متعین کیا اور اسے تاکیدی حکم دیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے اپنے مقام سے نہ ہٹے۔ بلکہ دشمنوں کے رسالے کو روک کرے اور مسلمانوں کے میمنہ ومیسرہ کو دشمنوں سے بچائے۔ کفار اپنی تعداد کے گھمنڈ میں اپنے بتوں کو فوج کے قلب میں لیے ہوئے میدان میں اترے۔ ان کے مزاروں کی بیویاں رجزیہ گاتی اور دف بجاتی ہوئی آگے آگے چلیں[1]۔ قریش کا پہلا شدید حملہ حضرت حمزہؓ کے ماتحت دستہ نے نہایت بہادری سے پسپا کر دیا۔ دشمن کی ابتری سے فائدہ اٹھا کر حضرت حمزہؓ ان کی صفوں میں گھس گئے اور دو دستی تلوار سے دشمنوں میں تہلکہ مچاتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی فتح کا نقارہ بجنے ہی والا تھا کہ ان کے تیر انداز رسولِ خدا کی ہدایات کو بھول کر اور دشمنوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ کر مالِ غنیمت کی خاطر ادھر ادھر بکھر گئے[2]۔ چنانچہ بعد میں طورس[3] کے مقام پر جو کچھ ہوا وہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۹) ایک شگاف ہے۔ یہ وہ شگاف ہے جس میں مسلمانوں نے اس وقت پناہ لی تھی جب ان کے تیر اندازوں نے حکم عدولی کر کے اور مالِ غنیمت کی طرف لپک کر خالد بن ولید کو عقب سے حملہ کرنے کا موقع دیا تھا۔ اس کی سطح پر، جو ہر وقت تپتی رہتی ہے، کوئی درخت یا جھاڑی یا گھاس نہیں۔ میں جتنی مدت وہاں رہا مجھے کوئی چرندہ یا پرندہ دکھائی نہیں دیا۔ اس کی گنجی اور اداس پیشانی کو نیلا اور شفاف آسمان گویا اوپر سے گھور رہا تھا، اور اُسے اور بھی گھناؤنا بنا رہا تھا۔

Burton's *Pilgrimage to Mecca*, vol. ii, pp. 236, 237

[1] ابن الاثیر نے ان رجزیہ اشعار کے کچھ ملخصات دیئے ہیں "ویھاً بنی عبد الدار! ویھا حماۃ الادبار! ضرباً بکل بتار! (ہمت! اے عبدالدار کے بیٹو! ہمت! اے عورتوں کے محافظو! اپنی تلواروں سے ضربِ کاری لگاؤ)...... نحن بنات طارق، نمشی علی النمارق۔ ان تقبلوا نعانق۔ او تدبروا نفارق۔ (ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں، ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں۔ اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے اور پیچھے قدم بڑھایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے)

[2] اس نافرمانی کی طرف سورہ آل عمران۔ آیت ۱۵۲ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

[3] فرانس کے ایک مقام کا نام جہاں ۷۳۲ء میں مسلمانوں کو کچھ ایسے ہی اسباب کی بناء پر فرنگیوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ (مترجم)

جنگِ احد میں ہُوا۔ قریش کے ایک میرِ لشکر خالد بن ولید نے فوراً مسلمانوں کی غلطی بھانپ لی اور اپنے سواروں کو جمع کرکے ان کے عقب پر حملہ کر دیا۔[1] ادھر کفّار کی پیادہ فوج بھی پلٹی چنانچہ مسلمانوں کی فوج آگے اور پیچھے دونوں طرف سے گھر گئی اور مسلمانوں کو اس نرغہ میں پھنس کر نئے سرے سے لڑنا پڑا۔ ان کے بہت سے بہادر سردار لڑتے ہوئے مارے گئے۔ حضرت حمزہؓ اور کئی اور سردار شہید ہوئے۔ حضرت علیؓ[2] جنھوں نے کفّار کی رجز کا سب سے پہلے اپنی تلوار سے جواب دیا تھا اور حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ سخت زخمی ہوئے لیکن کفّار کی کوششوں کا مرکز زیادہ تر خود آنحضرتؐ تھے، جو اپنی فوج سے الگ چند جاں نثاروں کے حلقہ میں کھڑے تھے۔ کفّار ہر طرف سے آپؐ کی طرف جھپٹے۔ جو جاں نثار آپؐ کو حلقہ میں لیے کھڑے تھے وہ کٹ کٹ کر گرنے لگے آپؐ بھی زخمی ہوئے لیکن اس حالت میں بھی آپؐ اپنے دشمنوں کو نہ بھولے اور ان ہاتھوں کے لیے دعائے رحمت فرمائی جنھوں نے آپؐ کی پیشانی سے خون بند کرنے کی کوشش کی۔[3] بہرحال کمک نزدیک ہی تھی حضرت علیؓ اور ان کے ساتھی جو دشمن کے قلب میں جان توڑ کر لڑ رہے تھے دشمن کے نرغہ سے نکل کر پہاڑی کے ایک محفوظ مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں

---

[1] ابن الاثیر، الحلبی، انسان العیون۔

[2] طبری لکھتا ہے کہ کفّار کا علمبردار طلحہ جو ایک بہادر جنگجو تھا، حضرت علیؓ کے سامنے آیا اور تلوار گھما کر ان سے یوں مبارز طلب ہوا۔ "تم مسلمان کہتے ہو کہ ہمارے مردے دوزخ میں جاتے ہیں اور تمھارے بہشت میں۔ آؤ میں دیکھوں میں تمھیں بہشت میں بھیج سکتا ہوں یا نہیں۔" حضرت علیؓ نے جواب دیا "بہت اچھا!" چنانچہ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ طلحہ زمین پر گر پڑا اور پکارا "رحم کر اے میرے ابن عم!" حضرت علیؓ نے فرمایا "اچھا رحم سہی، تو دوزخ کی آگ کے قابل ہیں۔"

[3] ابن الاثیر اور ابوالفداء غزوۂ احد کی تاریخ ساتویں، طبری آٹھویں، ابن ہشام پانچویں اور بعض اور مؤرخین گیارھویں شوال بتاتے ہیں، لیکن کوسین دی پرسیوال کے حساب کے مطابق اس غزوہ کی اصل تاریخ گیارھویں شوال تھی، کیونکہ تمام مؤرخین کہتے ہیں کہ ہفتہ کا دن تھا اور گیارھویں شوال ۳ھ (۲۶ جنوری) کو ہفتہ کا دن تھا۔ Hist. des Arabes, vol. III, p. 96

دشمن ان تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ لیکن دشمنوں نے آنحضرتؐ کی شہادت کا جو جھوٹا اعلان کر دیا تھا اس سے یہ سب لوگ سخت سراسیمہ تھے۔ بہرحال مسلمانوں کی ایک اور جماعت کو میدان کے ایک اور حصہ میں لڑتے دیکھ کر وہ دشمنوں کی صفوں میں گھس گئے۔ صفیں چیرتے ہوئے وہ اس جگہ پہنچے جہاں مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ آنحضرتؐ کو حلقہ میں لیے ہوئے تھا اور آپؐ کو زندہ پا کر جاں توڑ کوششوں کے ساتھ آپؐ کو کوہِ احد کی بلندیوں پر لے گئے۔ حضرت علیؓ اپنی ڈھال میں چٹان کے ایک سوراخ سے پانی لائے اور اس سے آنحضرتؐ کے چہرۂ مبارک اور زخموں کو دھویا۔ اس کے بعد سب نے مل کر بیٹھے بیٹھے ظہر کی نماز ادا کی۔

قریش میں اب اتنی سکت نہ رہی تھی کہ مدینے پر حملہ کرتے یا مسلمانوں کو کوہِ احد کی بلندیوں سے ہٹانے۔ اس لیے وہ نہایت سفاکی سے مسلمان شہداء کی لاشوں کا مثلہ کرنے کے بعد، قرب و جوارِ مدینہ کے ان علاقوں سے نکل گئے جن پر انھوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے قریش کی چند عورتوں کو ساتھ لے کر اس وحشیانہ انتقام میں سب سے زیادہ گرمجوشی دکھائی۔ اس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چیر کر ان کا کلیجہ نکال لیا اور دوسرے شہداء کے کانوں اور ناکوں کا ہار بنا کر گلے میں پہن لیا۔

قریش نے شہداء کی لاشوں سے جو سفاکانہ سلوک کیا اس سے مسلمانوں کے جذبات سخت برانگیختہ ہوئے۔ خود آنحضرتؐ کو ابتداً اس قدر غصہ آیا کہ آپؐ نے اعلان کر دیا کہ آئندہ کفار کے مردوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے[1]۔ لیکن آپؐ کی فطرت میں جو رحم و کرم ودیعت کیا گیا تھا وہ اس عارضی غصے پر غالب آ گیا۔ آپؐ نے ہدایت کی "دشمن کی زیادتیوں کو صبر سے برداشت کرو، یقیناً صبر و تحمل کرنے والے سب سے زیادہ فلاح پائیں گے[2]" اس دن سے مُردوں کی بے حرمتی اعضاء کا یہ نفرت انگیز دستور جو تمام قدیم اقوام میں رائج تھا مسلمانوں کے لیے نہایت سختی سے ممنوع ہو گیا[3]۔

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری، الحلبی، انسان العیون۔

[2] سورہ بنی اسرائیل، ابن ہشام، زمخشری۔

[3] یہودی اپنے قیدیوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے اور مقتولوں (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

مدینے میں واپس آکر آنحضرتؐ نے مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا دستہ بھاگتے ہوئے دشمنوں کے تعاقب میں روانہ کیا تاکہ قریش پہ واضح ہو جائے کہ جنگ میں شدید نقصان اٹھانے کے باوجود مسلمانوں کی ہمت پست نہ ہوئی تھی اور وہ اتنے کمزور نہ تھے کہ اگر ان پر کوئی حملہ کرے تو بچ کر چلا جائے۔ اس تعاقب کی خبر سُن کر ابوسفیان جلدی جلدی مکے واپس گیا اور راستے میں دو مسلمان شہید کر گیا۔ اس نے آنحضرتؐ کو پیغام بھیجا کہ وہ آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو فنا کرنے کے لیے بہت جلد دوبارہ آئے گا۔ اسے جو جواب ملا وہ آگے کی طرح ایمان و ایقان سے پُر تھا:

"خدا ہمارے لیے کافی ہے اور وہ اچھا محافظ ہے۔"[۱]

اس المناک جنگ کے مضر اثرات ان تیاریوں سے ظاہر ہوئے جو ہمسایہ خانہ بدوش قبائل مدینہ پر چھاپے مارنے کے لیے کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر آنحضرتؐ کے اس مستعدانہ اقدام سے مرعوب ہو گئے لیکن بعض مخالف قبیلے اسلام قبول کرنے کے وعدے کر کے مسلمانوں کو دھوکے سے اپنے علاقوں میں لے جاتے اور وہاں انھیں قتل کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ستر (۷۰) مسلمان ایک چشمے کے قریب، جس کا نام بیر معونہ تھا، دغا بازی سے قتل کر دیئے گئے، یہ چشمہ قبائلِ بنی عامر و بنی سُلیم کے علاقے میں تھا اور اس کارستانی میں مؤخرالذکر کا خاص طور پر ہاتھ تھا۔ ان مسلمانوں میں سے دو آدمی بچے، جن میں سے ایک مدینے کی طرف بھاگ آیا۔ راستے میں اُسے بنی عامر کے غیر مسلح آدمی ملے، جو آنحضرتؐ سے پروانۂ پناہ لے کر سفر کر رہے تھے۔ اس نے انھیں دشمن سمجھا اور قتل کر دیا جب آنحضرتؐ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپؐ کو بہت رنج ہُوا۔ آپؐ کے ایک پیرو نے، لاعلمی ہی میں سہی، ایک زیادتی کی تھی، اور جو دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے ان کے رشتہ دار خوں بہا کے مستحق تھے۔ چنانچہ مسلمانوں اور دوسرے

(بقیہ حاشیہ مسودہ صفحہ ۱۶۲) کی لاشوں کو نہایت وحشیانہ طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کرتے تھے۔ یونانیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے ہاں بھی ایسی سفاکیاں رائج تھیں۔ عیسائیت نے اس کی کوئی اصلاح نہ کی۔ سولھویں صدی تک بھی تاریخ کے اوراق میں ان انسانیت سوز زیادتیوں کی روداد یں ملتی ہیں۔

[۱] ابن ہشام، سورہ آلِ عمران۔

معاہد قبائل سے دیت جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور دوسرے یہودی قبائل پر مسلمانوں کے برابر دیت ادا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔[1] آنحضرتؐ خود چند صحابیوں کے ہمراہ بنی نضیر کے ہاں گئے اور اُن سے اُن کا حصہ طلب کیا۔ انھوں نے بظاہر یہ مطالبہ قبول کر لیا اور آپؐ سے قدرے توقف کرنے کو کہا۔ لیکن جب آپؐ ایک مکان کی طرف پشت کیے بیٹھے تھے تو مکینوں کی نقل و حرکت سے آپؐ کو علم ہو گیا کہ ان کی نیت آپؐ کو قتل کر دینے کی تھی۔

یہود کی دشمنی کے اسباب واضح کرنے کی خاطر ہمیں گزشتہ واقعات کی طرف مراجعت کرنی پڑے گی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آنحضرتؐ کے ورودِ مدینہ کے لمحے سے وہ کس طرح ہاتھ دھو کر آپؐ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں میں بددلی کا بیج بونے کی کوشش کی، آپؐ پر اور آپؐ کے متبعین پر بہتان باندھے، قرآن کے الفاظ کو خراب معنیٰ پہنانے کی خاطر ان کے تلفّظ کو بگاڑا۔ انھوں نے اسی پر بس نہ کی۔ یہودی اپنی نسبتاً اعلیٰ تعلیم اور بہتر ذہانت کی بدولت، منافقین کے ساتھ گٹھ جوڑ کی بدولت اور اپنے اس اتفاق کی بدولت جو عربوں کی نااتفاقی سے اس قدر مختلف تھا، اس دوناتی مملکت میں جو معلّمِ اسلام کے تحت وجود میں آئی تھی ایک نہایت خطرناک عنصر تھے۔ اخبارات کو عصرِ جدید میں جو حیثیت اور اثر و نفوذ حاصل ہے غیر ترقی یافتہ اقوام میں وہ شعراء کو حاصل ہوتا ہے۔[2] یہودی شعراء اپنی علمی و ثقافتی فضیلت کی بناء

---

[1] ابن الاثیر، طبری، میور اور اسپرینگر نے معاملے کے اس پہلو کو ایک عجیب طرح سے مسخ کیا ہے۔ موسیو کوسین دی پرسیوال کے اس قول کے لیے کہ یہودی دیت ادا کرنے کے ذمہ دار تھے سر ولیم میور کو کوئی سند نہیں ملی۔ اگر وہ طبری کی ورق گردانی کرتے تو انھیں ذیل کا بیان ملتا "بعد میں حکم دیا کہ رقم جمع کی جائے یا مدینہ کے لوگوں سے وصول کی جائے اور یہ حکم بھی دیا کہ اس میں یہودی قبائل، مثلاً بنی نضیر، بنی قریظہ اور وہ جو فدک میں رہتے تھے، جن سب پر معاہدہ کی رو سے ذمہ داری عائد ہوتی تھی، برابر کا حصہ ادا کریں۔ (ترجمہ از فرانسیسی۔ مترجم)

[2] غیر ترقی یافتہ قوموں میں شاعروں اور رجز خوانوں کو جو اثر و رسوخ حاصل ہوتا ہے اس کی مثال جنگِ احد سے متعلق ایک واقعہ میں ملتی ہے۔ جب قریش اس اہم مہم کی تیاریاں کر رہے تھے تو انھوں نے ابو عزّہ نامی ایک شاعر سے فرمائش کی کہ وہ صحرا کے قبائل میں دورہ کر کے انھیں اپنے اشعار (ربانی حاشیہ صفحہ ۱۶۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

بہ قدرتی طور پر اہلِ مدینہ میں بہت صاحبِ رسوخ تھے، اور اس رسوخ سے وہ زیادہ تر مسلمانوں میں نفاق کا بیج بونے اور ان کے اور ان کے مخالفوں کے درمیان جو خلیج حائل تھی اُسے وسیع تر بنانے کا کام لیتے تھے۔ جنگِ بدر میں کفّار کی شکست یہودیوں کو بھی اتنی ہی ناگوار گذری جتنی اہلِ مکّہ کو۔ جنگ کے فوراً بعد یہودی قوم کے ایک معزّز فرد کعب بن اشرف نے، جو قبیلہ نضیر سے تھا، برسرِ عام کفّار کی شکست پر اظہارِ افسوس کیا اور عازمِ مکّہ ہُوا۔ وہاں اس نے یہ دیکھ کر کہ لوگ غم میں ڈوبے ہوئے ہیں اُن کے حوصلے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس نے آنحضرتؐ اور آپؐ کے متبعین کی ہجویں سنا سنا کر اور بدر میں جو اہلِ مکّہ قتل ہوئے تھے ان کے مرثیے گا گا کر قریش میں وہ جوشِ انتقام پیدا کیا جو میدانِ احد میں ظاہر ہُوا۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر وہ اپنے گھر واپس آیا، جو مدینے کے قریب بنی نضیر کے قلعے میں تھا، اور آنحضرتؐ اور مسلمانوں پر طنزیہ اور فحش اشعار میں حملے کرتا رہا، یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں کی عورتوں کا بھی پاس نہ کیا اور ان کی شان میں مغلّظات بکتا رہا۔ اس کے یہ افعال کھُلّم کھُلّا اس دولتِ عامہ کے خلاف تھے جس کا وہ خود ایک فرد تھا۔ اس کا قبیلہ ان قبیلوں میں تھا جنھوں نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا تھا اور مملکتِ اسلامیہ کے اندرونی اور بیرونی تحفظ کا حلف اٹھایا تھا۔ بنو نضیر کا ایک اور یہودی ابورافع سلام بن ابی الحقیق بھی مسلمانوں کا اتنا ہی جانی دشمن تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی ایک شاخ کے ساتھ خیبر کے علاقے میں رہتا تھا جو مدینے کے شمال مغرب کی طرف چار یا پانچ دن کی مسافت پر واقع تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۴) اور رزمیہ گانوں سے مسلمانوں کے برخلاف اُبھارے اور انھیں اس میثاق میں شامل ہونے کی ترغیب دے جو آنحضرتؐ اور ان کے متبعین کی تباہی کے لیے اہلِ مکّہ کی سرپرستی میں مختلف قبائل کے درمیان ہُوا تھا۔ یہ شخص جنگِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہو گیا تھا، لیکن آنحضرتؐ نے اسے فدیہ لیے بغیر اس شرط پر رہا کر دیا تھا کہ وہ آئندہ کبھی مسلمانوں کے خلاف ہتھیار نہ اُٹھائے گا۔ اس رحمدلی کے باوجود اس نے وعدہ خلافی کی اور قبائل میں دورہ کر کے انھیں اپنی شاعری سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کام میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ جنگِ اُحد کے بعد وہ پھر مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہُوا اور قتل کر دیا گیا۔ ابن ہشام

اسے آنحضرتؐ اور مسلمانوں سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے ہمسایہ عرب قبائل مثلاً سُلیم اور غطفان کو ، مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں ہر طرح کے جتن کیے ۔ دولتِ عامّۂ اسلامیہ کے لیے ناممکن تھا کہ ان لوگوں کی دغا بازیوں سے درگزر کرتی ، جن کے ساتھ ہر طرح کی پاسداری کی گئی تھی ، اس مقصد سے کہ اگر وہ مدد نہیں کر سکتے تو کم از کم غیر جانب دار ہی رہیں ۔ اب امتِ اسلامیہ کی ہستی تک خطرے میں تھی اور تحفظ کا ہر اصول اس بات کا متقاضی تھا کہ ان غدارانہ سازشوں کو خاموشی سے ناکام بنا دیا جائے ۔ اہلِ مدینہ نے خود انھیں بغاوت کی سزا کا مستوجب قرار دیا ۔ چنانچہ ایک کو تو بنی اوس کے ایک فرد نے اور دوسرے کو بنی خزرج کے ایک فرد نے قتل کر دیا ۔

عیسائی مناظرین نے اسے دغا بازانہ قتل سے تعبیر کیا ہے ۔ اور چونکہ اس سزا کی انجام وہی کے لیے دو مسلمان خفیہ طور پر بھیجے گئے اس لیے وہ آنحضرتؐ سے تعصب کی بنا پر اس سزا کے مبنی بر عدل ہونے اور اس کے عاجلانہ اور خفیہ طور پر انجام دیئے جانے کی ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اس وقت انفرادی جرموں کی سزا دینے کے لیے کوئی پولیس کورٹ یا فوجداری عدالت بلکہ فوجی عدالت بھی نہ تھی ۔ چونکہ کوئی سرکاری جلاد نہ تھا ، اس لیے حکومت کی طرف سے سزا دینے کا اختیار کسی فرد کو دیا جا سکتا تھا ۔ ان لوگوں نے ایک باضابطہ معاہدے کی خلاف ورزی کی تھی ۔ انھیں نہ برسرِعام گرفتار کیا جا سکتا تھا ، نہ اُن کے قبیلوں کے سامنے سزائے قتل دی جا سکتی تھی ۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا تو احتمال تھا کہ شدید خوں ریزی ہوتی اور ثار ، یا انتقامِ خون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ مملکت کی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ ان لوگوں کے خلاف جنھیں رائے عامہ مستحقِ سزا قرار دے چکی تھی جو کچھ بھی کرنا تھا وہ فی الفور اور خاموشی سے کیا جائے[1] ۔ مملکت کی بقا اور شہر کا امن و امان اس پر منحصر تھا کہ مجرموں کو فی الفور سزا دی جائے

---

[1] ہمارے عیسائی مورخین اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ خود دانشمند سولن (Solon) نے اپنے چھوٹے سے شہر کے تحفظ کے لیے ایتھنز کے باشندوں کے لیے یہ لازمی قرار دیا تھا کہ وہ مفسدوں کا تعاقب کریں اور بلوہ یا فساد یا شورش کی صورت میں دو مخالف گروہوں (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس سے پیشتر کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو اپنے گرد جمع کر لیں۔

شوال ۲ھ (فروری ۶۲۴ء)

ان دو غداروں کے حشر اور ان کے برادران بنی قینقاع کے مدینہ سے اخراج نے بنی نضیر کے سینوں میں پیغمبر اسلام کے خلاف شدید عداوت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے حالات مجمل سے بیان کے محتاج ہیں۔ جہاں دوسرے یہودی قبیلے زیادہ تر زراعت پیشہ تھے وہاں بنی قینقاع کا نہ کوئی کھیت تھا نہ نخلستان۔ یہ لوگ زیادہ تر دستکار تھے جو ہر طرح کی صنعت و حرفت میں مشغول تھے[1]۔ یہ لوگ باغی فطرت اور شورش پسند تھے۔ اسکندریہ کے یہودیوں کی طرح ہر وقت لڑائی جھگڑے کے لیے تیار رہتے تھے اور اپنے پست اخلاق کے لیے بدنام تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ دیہات کی ایک نوجوان لڑکی ان کے بازار میں دودھ بیچنے آئی۔ یہودی نوجوانوں نے اس کی سخت توہین کی۔ ایک مسلمان نے جو ادھر سے گزر رہا تھا، لڑکی کی حمایت کی۔ اس پر بلوہ ہو گیا جس میں بے حرمتی کرنے والا لڑکا مارا گیا۔ لڑکے کا قتل ہونا تھا کہ جتنے یہودی وہاں موجود تھے وہ تمام اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ایک خوفناک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مسلمانوں نے اپنے بھائی کے قتل پر غضبناک ہو کر ہتھیار اُٹھا لیے۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں اور طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس ہنگامہ کی خبر پاتے ہی آنحضرتؐ موقع پر پہنچے۔ آپؐ کی موجودگی نے آپؐ کے متبعین کے غصے کو حد سے تجاوز کرنے سے روکا۔ آپؐ پر فوراً واضح ہو گیا کہ اگر ان بغاوتوں اور شورشوں کی روک تھام نہ کی گئی تو ان کا نتیجہ کیا ہو گا۔ مدینہ کشت و خون کا اکھاڑا بن جائے گا جس میں مخالف گروہ کسی قانونی گرفت کے بغیر ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔ یہودیوں نے کھلم کھلا اور دیدہ و دانستہ معاہدے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۶) میں سے ایک کے ساتھ شامل ہو جائیں اور یوں حکومت کی طرف سے سزا دینے والے بن جائیں۔ وہ اس بات کو بھی بھول جاتے ہیں کہ ادرتو اور عیسائی انگلستان کا قانون بھی ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی راندۂ قانون کا پیچھا کرے اور اسے قتل کر دے۔

[1] طبری

کی شرائط کو توڑا تھا۔ ضروری تھا کہ ان امن شکنیوں کو سختی سے روکا جائے ورنہ امن و سلامتی کی تمام اُمیدوں کو الوداع کہنا پڑے گا۔ چنانچہ آنحضرتؐ فوراً بنو قینقاع کے علاقے میں گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسلام قبول کر کے قطعی طور پر دولتِ عامۂ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ مدینہ خالی کر دیں۔ یہودیوں نے نہایت گستاخانہ الفاظ میں اس مطالبہ کا جواب دیا:[1] "اے محمدؐ! اپنی قوم (یعنی قریش) پر فتح حاصل کر کے آپے سے باہر نہ ہو جا۔ تجھے اب تک ایسے لوگوں سے معاملہ پڑا ہے جو فنِ جنگ سے ناواقف ہیں۔ اگر تجھے ہمارا مقابلہ کرنے کی خواہش ہے تو ہم تجھے دکھا دیں گے کہ ہم مرد ہیں۔" یہ جواب دے کر یہودیوں نے اپنے قلعے کے دروازے بند کر لیے اور آنحضرتؐ کی حاکمیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا مطیع فرمان بنانا قطعی ضروری تھا۔ اس لیے فوراً ان کے قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ پہلے تو انھیں سخت سزا دینے کا ارادہ تھا، لیکن آنحضرتؐ کی رحمدلی عدل کے سخت گیر تقاضے پر غالب آگئی اور صرف جلاوطنی پر اکتفا کیا گیا۔

یہ تمام واقعات بنی نضیر کے سینوں میں کانٹوں کی طرح کھٹک رہے تھے۔ وہ آنحضرتؐ سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی مناسب موقع کی تاک میں تھے۔ آنحضرتؐ کو اپنے علاقے میں دیکھ کر اُن کی مراد بر آئی۔ لیکن، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اُن کے ناپاک منصوبے آنحضرتؐ کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ آپؐ یہودیوں کے دل میں شکوک پیدا کیے بغیر فی الفور واپس چلے گئے، ورنہ آپؐ کی اور آپؐ کے متبعین کی ہلاکت یقینی تھی۔[2]

---

[1] ابن ہشام۔ طبری قینقاع کے جواب کو قدرے مختلف طور پر بیان کرتا ہے لیکن تمام مؤرخین متفق ہیں کہ وہ گستاخانہ اور توہین آمیز تھا۔ گبن (Gibbon) نے یہودیوں کی طرف سے جو عاجزانہ جواب قلمبند کیا ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اسے کہاں سے دستیاب ہُوا۔

[2] اگر آنحضرتؐ یا آپؐ کے صحابی یہودیوں پر یہ ظاہر ہونے دیتے کہ آپؐ کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے تو یہودی فوراً کچھ کر گذرتے اس لیے آنحضرتؐ اکیلے وہاں سے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ اس سے یہودیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ آپؐ ابھی زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے اور جلد ہی لوٹ آئیں گے۔

اب بنی نضیر نے اپنے لیے بالکل وہی صورتِ حال پیدا کر لی تھی جو ان سے پہلے بنی قینقاع اپنے لیے پیدا کر چکے تھے۔ انھوں نے خود اپنے افعال کی بدولت اپنے آپ کو معاہدے کی حدود سے خارج کر دیا تھا۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے مدینے میں آتے ہی بنی نضیر کو اسی مضمون کا پیغام بھیجا، جیسا بنی قینقاع کو بھیجا تھا۔ بنی نضیر نے منافقین اور عبداللہ ابن ابی کی حمایت کے بل بوتے پر گستاخانہ جواب دیا، لیکن عبداللہ نے اور ان کے برادران بنی قریظہ نے امداد کا جو وعدہ کیا تھا جب وہ پورا نہ ہوا تو پندرہ[1] دن کے محاصرہ کے بعد انھوں نے صلح کی التجا کی۔ جو شرائط بنی قینقاع کو پیش کی گئی تھیں وہی ان کو پیش کی گئیں اور انھوں نے اپنے علاقے خالی کر دینے کا اقرار کیا۔ اسلحۂ[2] جنگ کے سوا انھیں تمام اسبابِ منقولہ لے جانے کی اجازت دی گئی، لیکن جانے سے پہلے انھوں نے اپنے تمام مکان مسمار کر دیئے تاکہ مسلمان ان میں نہ رہ سکیں[3]۔

ربیع الاول ۴ھ مطابق جون تا جولائی ۶۲۵ء

ان کی زمینوں کو اور ان کے سامانِ جنگ وغیرہ کو جو وہ اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے تھے، آنحضرتؐ نے انصار کی اجازت سے جو بخوشی تمام دی گئی، مہاجرین میں تقسیم کر دیا، جو اب تک اہلِ مدینہ کی فیاضی کے محتاج تھے۔ مہاجرین اور انصار میں جو برادرانہ محبت تھی اس کے باوجود آنحضرتؐ کو معلوم تھا کہ مہاجرین کے لیے اہلِ مدینہ کی امداد پر مستقلاً انحصار کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے آپؐ نے انصار کے اکابر کو جمع کیا اور ان سے دریافت کیا کہ اگر آپ ان کے غریب بھائیوں میں جو آپ کے جلو میں مکہ سے آئے تھے، یہودیوں کا چھوڑا ہوا مال تقسیم کر دیں تو انھیں کچھ اعتراض تو نہ ہوگا۔ انھوں نے یک آواز ہو کر جواب دیا، "یہودیوں کا مال ہمارے بھائیوں میں تقسیم کر دیجئے، بلکہ ہمارے مال کا بھی کچھ حصہ انھیں دیجئے۔ ہم بخوشی اجازت دیتے ہیں۔" چنانچہ آنحضرتؐ نے یہودیوں کی جائیداد مہاجرین میں اور دو

---

[1] بقول طبری گیارہ دن

[2] ابن ہشام، ابن الاثیر، ابوالفداء

[3] سورۂ حشر آیت ۲

انصاریوں میں جو نہایت غریب تھے تقسیم کر دی۔[1]

بنی نضیر کی جلا وطنی ربیع الاوّل سنہ ۴ھ میں ہوئی۔[2] اس سال کا باقی حصہ اور آئندہ سال کا ابتدائی حصہ خانہ بدوش قبائل کی وقتاً فوقتاً شورشوں اور مدینے پر چند خوں ریز حملوں کی سرکوبی میں صرف ہوا۔[3]

اس اثنا میں دشمنانِ دین بھی بے کار نہ رہے تھے۔ کفّار نے قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنے کے لیے دور دراز علاقوں میں سفیر بھیجے تھے۔ ان کوششوں میں یہود سب سے زیادہ سرگرمی دکھا رہے تھے۔ بنی نضیر کے کچھ لوگوں نے اپنے بھائی بندوں کے ساتھ جو خیبر کے قریب آباد تھے بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہاں انتقام کی آگ سینہ میں بھڑکائے وہ لوگ مسلمانوں کی تباہی کے لیے ایک اور انجمن بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔[4] ان کی کوششیں ان کی اُمیدوں سے بھی بڑھ کر بار آور ہوئیں۔ ایک زبردست اتحاد وجود میں آ گیا، اور شقی القلب

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری۔ اس کے بعد یہ اصول مقرر ہو گیا کہ جنگ کے مالِ غنیمت کے علاوہ اگر کوئی اموال و املاک ہاتھ آئیں تو انھیں مملکت یا رئیسِ مملکت کی ملکیت سمجھا جائے اور ان کے استعمال کا اختیار صرف رئیسِ مملکت کو ہو۔ Droit Musulman by M. Querrty, p. 337 سورۂ حشر میں جن واقعات کی طرف اشارہ ہے وہ تقریباً تمام تر بنی نضیر کی جلا وطنی سے تعلق رکھتے ہیں۔

[2] بقول ابن ہشام و ابو الفدا۔ طبری کہتا ہے کہ یہ صفر کا مہینہ تھا۔

[3] اسی قبیل کی ایک وہ مہم تھی جو دومۃ الجندل (جو بقول ابو الفدا دمشق کے جنوب کی طرف سات دن کی مسافت پر واقع تھا) کے عیسائی عربوں کے خلاف بھیجی گئی جنھوں نے مدینہ والوں کے لیے شام کا رستہ بند کر دیا تھا، بلکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی دھمکیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن یہ قزاق مسلمانوں کے آنے پر بھاگ نکلے، اور آنحضرتؐ ایک ہمسایہ سردار سے معاہدہ کرنے کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔ اس سردار کو آپؐ نے مدینے کی چراگاہوں میں ریوڑ چرانے کی اجازت دی۔ کوسین دی پرسیوال اور طبری۔

[4] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری۔

ابوسفیان کی قیادت میں دس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج ، جو سازوسامان سے آراستہ تھی ، مدینے پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئی - اس کو رستے میں کوئی مزاحمت پیش نہ آئی ، چنانچہ اس نے مدینے سے چند میل کے فاصلے پر رُک کر اُحد کی سمت ، جو مدینے کا سب سے غیر محفوظ پہلو تھا ، پڑاؤ ڈالا -

شوال ۵ھ - ۲ر فروری ۶۲۷ء

اس لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان صرف تین ہزار آدمی جمع کر سکے[1] اپنی تعداد کی قلت اور مدینے کے اندر رہنے والے منافقین کی فتنہ پردازیوں کی وجہ سے ، انھیں دشمنوں پر حملہ آور ہونے کی بجائے دفاعی تدابیر اختیار کرنے پر اکتفا کرنا پڑا[2] چنانچہ انھوں نے مدینے کے غیر محفوظ حصوں کے اردگرد ایک گہری خندق کھودی اور اپنے بیوی بچوں کو حفاظت کی خاطر اپنے قلعہ بند مکانوں میں چھوڑ کر شہر کے باہر خندق کے پیچھے پڑاؤ ڈالا - جہاں تک شہر کے دوسرے پہلو کا تعلق تھا اس کی حفاظت کے لیے انھوں نے اس پر بھروسہ کیا کہ بنی قریظہ اگر ان کی امداد نہ کریں گے تو کم از کم غیر جانبدار تو رہیں گے - مدینہ سے تھوڑی دُور جنوب مشرق میں بنی قریظہ کے متعدد قلعے تھے اور معاہدے کی رُو سے ان کا فرض تھا کہ وہ ہر حملہ آور کے خلاف مسلمانوں کی امداد کریں ، لیکن کفار کے ایماء پر انھوں نے عہد شکنی کی اور قریش کے ساتھ مل گئے - جب آنحضرتؐ کو اُن کی عہد شکنی کی خبر ملی تو آپؐ نے سعدین ، یعنی سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو اُن کے فرائض کی یاددہانی کے لیے اُن کے پاس بھیجا - انھوں نے سرکشی اور بدمزاجی سے جواب دیا "کون ہے یہ محمدؐ رسُول اللہ کہ ہم اس کی اطاعت کریں ؟ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں[3] "

چونکہ یہودی موقع و محل سے بخوبی واقف تھے اور محاصرہ کرنے والوں کو ایسے مقامات

---

[1] ابن ہشام

[2] سورہ احزاب آیات ۱۲ ، ۱۳ ، اور ۱۴

[3] ابنِ ہشام - سر ولیم میور -

دکھا کر جو دفاع کے نقطۂ نظر سے کمزور تھے اُن کی مدد کر سکتے تھے مسلمانوں میں بہت سراسیمگی پھیل گئی۔ اندرونِ شہر میں منافقین کی موجودگی نے خطرہ اور بھی بڑھا دیا۔[1]

جب کفّار اور یہود مسلمانوں کو کھلے میدان میں لانے یا یہودی مخبروں کی رہنمائی میں شہر پر ناگہانی حملہ کی کوششوں میں ناکام رہے تو انھوں نے ایک باقاعدہ حملہ کا تہیہ کر لیا۔ انھیں محاصرہ کئے بیس دن ہو چکے تھے۔ صحرا کے آتش زیرپا اور نچلے نہ بیٹھنے والے قبیلے، جنھوں نے مسلمانوں کو آسانی سے ہاتھ آنے والا شکار سمجھ کر قریش اور یہود سے قول و قرار کیا تھا، اس طویل محاصرہ سے اُکتا گئے تھے۔ اس نازک مرحلے پر محاصرہ کرنے والی فوج کے سرداروں نے خندق عبور کرنے اور مسلمانوں کی چھوٹی سی جماعت پر ٹوٹ پڑنے کی انتہائی کوششیں کیں لیکن مسلمانوں کی چوکسی نے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ موسم اور حالات نے مل کر محاصرہ کرنے والوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا ہے۔ ان کے گھوڑے یکے بعد دیگرے بھوک سے مر رہے تھے اور ان کا سامانِ رسد کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان میں پھوٹ پڑ رہی تھی، اور مسلمانوں کے دُور اندیش سردار نے بے مثال زیرکی سے کام لے کر اس کو اور بھی بڑھا دیا۔ یکایک بیڈی دل، جس نے مسلمانوں کی ناگزیر تباہی کے آثار پیدا کر دیئے تھے، ہوا میں کافور ہو گیا۔ رات کے اندھیرے میں، جب ایک طوفانِ باد و باراں برپا تھا، دشمنوں کے خیمے اُکھڑ اُکھڑ کر گر رہے تھے اور اُن کی روشنیاں گل ہو رہی تھیں، ابوسفیان اپنے ہیبت ناک لشکر کو لے کر

---

[1] اس تمام منظر کا مرقع اس خوبصورتی سے قرآن کے سورۂ الاحزاب میں کھنچا گیا ہے کہ ہم اس کی چند آیات کا اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "جب ان لوگوں نے تم پر اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی چڑھائی کی اور تمھاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور تمھارے کلیجے منہ کو آنے لگے، اور (تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کر رہے تھے، اس وقت مومنوں کا امتحان کیا گیا، اور (ان پر شدید لرزہ طاری تھا، اور (جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک کا مرض ہے) یوں کہہ رہے تھے کہ ہم سے تو اللہ اور اس کے رسولؐ نے محض دھوکے ہی کا وعدہ کر رکھا ہے۔" (الاحزاب ۱۰ - ۱۱ - ۱۲)

بھاگا، اور جو تھوڑے سے بہت لوگ بچ رہے انھوں نے بنی قریظہ کے یہاں پناہ لی[1]۔ آنحضرتؐ نے رات ہی کو دشمنوں کے انتشار کی پیش گوئی کر دی تھی۔ صبح ہوتے ہی مسلمانوں نے اس پیش گوئی کو پورا ہوتے دیکھ لیا۔ اور خوش خوش شہر میں واپس آئے[2]۔

۵ھ ۲۸ فروری ۶۲۶ء تا ۲۴ مارچ ۶۲۷ء

لیکن جب تک بنی قریظہ اس قدر قریب تھے کہ مدینے کو ان سے ہر وقت خطرہ تھا اس وقت تک مسلمان اپنی فتح کو مکمل نہ سمجھ سکتے تھے۔ بنی قریظہ نے اپنے حلف و اقرار کے باوجود غداری کی تھی بلکہ ایک دفعہ بے خبری میں حملہ بھی کرنے والے تھے۔ اگر وہ ایسا کر پاتے تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوتا۔ اس لیے مسلمانوں نے ان کی غداری کا جواب طلب کرنا فرض سمجھا۔ یہود نے اپنی ہٹ پر قائم رہ کر جواب دینے سے انکار کر دیا۔ نتیجۃً یہودیوں کا محاصرہ کر لیا گیا اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے صرف ایک شرط پیش کی۔ وہ یہ کہ ان کے بارے میں فیصلہ بنی اوس کے سردار سعد ابن معاذ پر چھوڑ دیا جائے۔ سعد بن معاذ ایک تند مزاج سپاہی تھے۔ وہ حملہ کے درمیان زخمی ہوئے تھے (اور ان زخموں ہی کی وجہ سے انھوں نے کچھ مدّت بعد وفات پائی) یہودیوں کے غدارانہ طرزِ عمل پر غضبناک ہو کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے جنگ کے قابل آدمی قتل کر دیے جائیں اور ان کی عورتوں اور بچّوں کو مسلمانوں کی غلامی میں لے لیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ پر عمل کیا گیا[3]۔ لین پول (Lane poole) لکھتا ہے "یہ ایک ایسا سخت اور خونیں فیصلہ تھا جو آلبی پر حملہ کرنے والی کلیسائی افواج کے جرنیلوں کو زیب دیتا تھا، یا اس کی مثال آگسٹن دور کے پیوریٹنوں (puritans) کے ہاں ملتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا اور وہ بھی ایک محاصرے کے دوران، اور جن لوگوں نے تاریخ میں

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر

[2] یہ جنگ غزوۂ خندق کہلاتی ہے۔

[3] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری

یہ پڑھا ہے کہ ولینگٹن کی فوج جس راستے سے گزری اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں، انھیں ایک غدّار قبیلے کے ایک سرسری فیصلہ کی رُو سے قتل کیے جانے پر متعجب نہ ہونا چاہیے۔[1]

مختلف یہودی قبائل کو جو سزا دی گئی اس نے میور (Muir) اسپرنگر (Sprenger) وائل (Weil) اور اوزبرن (Osborn) جیسے آنحضرتؐ کے سوانح نگاروں کے لیے آپؐ پر حملے کرنے کا ایک موقع مہیا کر دیا ہے۔ بنی قینقاع اور بنی نضیر کو جو سزا دی گئی وہ اس سزا سے بہت ہلکی تھی جس کے وہ مستحق تھے۔ صرف بنی قریظہ کے ساتھ سختی برتی گئی۔

انسانی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی شخص کے افعال چاہے کتنے ہی مجرمانہ ہوں، اگر اس سے ایسا برتاؤ کیا جائے جو ہمیں درشت یا ظالمانہ معلوم ہوتا ہے تو ہماری طبیعت میں قدرتی طور پر اس برتاؤ کے خلاف ایک جذبۂ بغاوت پیدا ہو جاتا ہے اور رحم انصاف پر غالب آ جاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بنی قریظہ کو جو سزا دی گئی وہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے سخت تھی، لیکن اس امر پر چاہے کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ ان لوگوں کی قسمت کا فیصلہ (اگرچہ خود ان کی درخواست پر) ایک غضبناک سپاہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا، اور چاہے ہمیں اس امر پر بھی کتنا ہی افسوس کیوں نہ ہو کہ اس شخص کے فیصلے پر فوراً عمل کیا گیا، پھر بھی ہمیں جذباتِ رحم سے متاثر ہو کر جرم اور اس کی منصفانہ سزا کے مسئلہ کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ ہمیں ان لوگوں کے جرائم کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ـــ ان کی غدّاری، ان کی کھلم کھلا دشمنی اور ان کا ایک ایسے معاہدہ سے انحراف جس کی پابندی کا انھوں نے حلف اُٹھایا تھا۔ ہمیں ان ترغیبات کو بھی نہ بھولنا چاہیے جو پاک یہوہ کے یہ پرستار کفارِ عرب کو بُت پرستی کی رسم جاری رکھنے کے لیے دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ بعض مسلمان عیسائی ناصحِ اخلاق کے ہمنوا ہو کر یہ کہنے پر مائل ہوں "بُرے لوگوں کا ایک بار نہیں بلکہ سو بار تباہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو جو ابھی تک بے گناہ ہیں اپنی جماعت

---

[1] Selections from the Koran, Intro; p.ixv

میں شامل ہونے کی ترغیب دیں[۱]۔"

یہ مسلمان اس ناصح کے ہمنوا ہو کر، اور صرف ایک لفظ میں تصرف کر کے، یہ بھی کہہ سکتے :

"آئیے ہم ذرا اس پر غور کریں کہ ہمارا اور تمام دوسری اقوام کا جو اس وقت آسمان کے نیچے آباد ہیں کیا حشر ہوتا اگر عربوں[۲] کی تلوار اپنا کام پوری طرح انجام نہ دیتی۔ عربوں کی تلوار نے اپنے خونیں سے خونیں قتال میں بھی دنیا کے تمام ملکوں کے حق میں ایک ایسا کارِ رحمت انجام دیا جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا" اگر عیسائی کا استدلال صحیح ہے اور خلافِ انسانیت نہیں ہے تو یقیناً مسلمان کا استدلال بھی صحیح ہے اور خلافِ انسانیت نہیں ہے۔ بہرحال ممکن ہے کہ بنی قریظہ کو جو خوفناک سزا دی گئی اسے دوسرے مسلمان اسی روشنی میں دیکھیں جس میں کارلائل (Carlyle) ڈروگیڈا (Drogheda) کے باشندوں کے بارے میں کرامویل (Cromwell) کے حکمِ قتلِ عام کو دیکھتا ہے :

"ایک مسلح سپاہی اس ایقانی شعور کے ساتھ کہ وہ خدا کا سپاہی ہے (اور یہ ایک ایسا شعور ہے جو تمام سپاہیوں اور تمام انسانوں کو ہر وقت رکھنا چاہیئے) ایک مسلح سپاہی، فرشتۂ اجل کی طرح ہیبت ناک، تقدیر کی طرح بے رحم، خدا کے دشمنوں کو خدائی فیصلہ کے مطابق سزا دیتا ہوا۔"

لیکن ان یہودیوں کو جو سزا دی گئی ہم اسے ان دونوں میں سے کسی ایک نقطۂ نگاہ سے بھی نہیں دیکھتے۔ ہم اسے خالصتاً ایک ایسا عمل سمجھتے ہیں جو ان قوانینِ جنگ کے مطابق کیا گیا جو اس وقت اقوامِ عالم میں رائج تھے : "اس زمانہ کے مسلّمہ آدابِ جنگ کا پورا پورا اطلاق[۳]" ان لوگوں پر جو کچھ گزری وہ ان کے اپنے کئے کی سزا تھی۔ اگر انھیں

---

۱ Arnold, *Sermons*, 4th sermon

"Wars of the Israelites" pp. 35, 36

۲ اصل عبارت میں "اسرائیلیوں" کا لفظ ہے۔

۳ Grote, *Hist. of Greece*

سعد بن معاذ کے فیصلہ کے بغیر بھی قتل کر دیا جاتا تو یہ اس زمانے کے قوانین کے بالکل مطابق ہوتا۔ لیکن انھوں نے خود سعد بن معاذ کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے انتخاب کیا تھا۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ سعد کا فیصلہ مسلّمہ قوانین کے منافی نہیں ہے۔ اسی لیے انھوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر فتح ان کی ہوئی ہوتی تو وہ اپنے دشمنوں کو کسی تردد یا تامّل کے بغیر ذبح کروا لیتے۔ لوگ حضرت داؤد[1] کی خوں ریزیوں کو اس وقت کی "روشنی میں" دیکھتے ہیں[2]۔ عیسائیوں نے ابتدائی ایّام میں کشت و خون کا جو بازار گرم کیا وہ بھی خاص "روشنیوں" میں دیکھا جاتا ہے۔ پھر ابتدائی مسلمانوں کی دفاعی لڑائیاں اسی نقطۂ نگاہ سے کیوں نہ دیکھی جائیں؟ بہر حال، نقطۂ نظر چاہے کوئی بھی ہو، بے تعصّب طبائع[3] تسلیم کریں گی کہ بنی قریظہ کے قتل کے لیے پیغمبرِ اسلامؐ کو کسی طرح موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مقتولین کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی سو تھی۔

کہا جاتا ہے کہ بقیۃ السیف کی تقسیم میں ریحانہ نام کی ایک نوجوان یہودن آنحضرتؐ کے حصہ میں آئی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ تقسیم سے پہلے ہی آپؐ کے لیے الگ کر لی گئی تھی۔ عیسائی مؤرخین جو ہر وقت آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کے موقع کی تاک میں رہتے ہیں، اس افسانہ سے بھی ناجائز

---

[1] سموئیل ب ۲ "اور اس نے ان لوگوں (یعنی ہارے ہوئے بنی عمون) کو جو اس میں تھے، باہر نکال کر اُن کو آروں اور لوہے کے سینگوں اور لوہے کے کلہاڑوں کے نیچے کر دیا اور ان کو اینٹوں کے پزاوے میں سے چلوایا......"

۲۔ سموئیل ب ۱۲ - ۳۱ - نیز ملاحظہ ہو:

1 Maitland, *Jewish Literature and Modren Education*

2 Stanley's *Lectures on the Jewish Church*, vol. ii, p. 99

[3] جو یورپی مصنفین تعصب کا شکار نہیں ہوئے، اُن میں سے مجھے صرف تین کے نام یاد آتے ہیں: بوسیلو بارتھیلمی سینٹ ہلیر، مسٹر جانسن اور مسٹر سٹانلی لین پول۔

فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکے۔ غلامی کے موضوع سے ہم ایک آئندہ باب میں بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف اتنا بتا دینے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ ریحانہ آنحضرتؐ کے حصہ میں آئی تو پھر بھی ہمیں جدید خیالات کے نقطۂ نگاہ سے اس پر نکتہ چینی کرنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ اس وقت جنگ کے جو مانے ہوئے دستور تھے یہ تقسیم بالکل ان کے مطابق تھی۔ ریحانہ کے آنحضرتؐ کی زوجیت میں آنے کی کہانی سراسر جھوٹ ہے، کیونکہ اس واقعہ کے بعد اس کا کوئی تذکرہ تاریخ کے اوراق میں نہیں ملتا، حالانکہ آپؐ کی سب ازواجِ مطہرات کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

چھٹا باب

آنحضرتؐ کی رحمدلی

دَعَا اِلَی اللہِ فَالْمُسْتَمْسِکُوْنَ بِہٖ
مُسْتَمْسِکُوْنَ بِحَبْلٍ غَیْرِ مُنْفَصِمٖ

سنہ ۶ھ ۲۳ر اپریل ۶۲۷ء تا ۱۲ر اپریل ۶۲۸ء

مدینے کی نئی دولتِ عامہ کی تباہی و بربادی کے لیے یہود و کفار نے جو زبردست اتحاد قائم کیا تھا وہ یکسر ناکام ہو چکا تھا اور ایسے طور پر کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا۔[1] لیکن قرب و جوار کے وحشی اور خونخوار قبائل حدودِ مدینہ کے اندر لوٹ مار اور کشت و خون کرتے رہتے تھے۔ مملکت کی بقا متقاضی تھی کہ ان کی سرکوبی کے لیے سخت اقدامات کئے جائیں۔ ان غارت گروں کے خلاف کئی مہمیں بھیجی گئیں لیکن یہ گریزپا ابنائے صحرا مسلمانوں کی آمد کی خبر سنتے ہی غائب ہو جاتے تھے۔ بنی لحیان، جنھوں نے آنحضرتؐ سے درخواست کرکے ارکانِ اسلام کی تعلیم کے لیے چند مبلّغ اپنے علاقے میں بلوائے تھے اور اُن کے آتے ہی بعضوں کو تو قتل کر دیا تھا اور بعضوں کو اہلِ مکّہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا، انھیں ابھی تک کوئی سزا نہ دی گئی تھی۔ لیکن اب اس جرم کی سزا دینے کا وقت آ گیا تھا۔ اس سال جمادی الاوّل میں فوج کا ایک دستہ آنحضرتؐ کے زیرِ قیادت بنی لحیان کے خلاف روانہ ہُوا، لیکن ان قزاقوں کو آنحضرتؐ کے آنے کی بروقت اطلاع مل گئی اور وہ بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ چنانچہ فوجی دستہ اپنے مقصد کی تکمیل کئے بغیر مدینے واپس آ گیا۔[2]

---

[1] سورۃ الاحزاب ۹

[2] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ خانہ بدوش بنی غطفان کی ایک شاخ بنی فزارہ نے مضافاتِ شہر کے کھلے حصہ پر اچانک حملہ کر دیا، مسلمانوں کے اونٹ ہانک کر لے گئے، جو آدمی اُن کی خبر گیری کر رہا تھا اُسے قتل کر دیا اور اس کی بیوی کو اُٹھا کر لے گئے۔ مسلمانوں نے فوراً ان کا تعاقب کیا اور چند اونٹ واپس لے آئے، لیکن بدوی لوٹے ہوئے مال کا باقی حصہ لے کر صحرا کی طرف بھاگ گئے۔

اسی زمانہ کے لگ بھگ آنحضرتؐ نے کوہِ سینائی کے قریب واقع راہب خانۂ سینٹ کیتھرین کے راہبوں کو، بلکہ سارے عیسائیوں کو ایک سند نامہ حقوق (Charter) عطا فرمایا جس کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ دنیا کی تاریخ روشن خیالی اور رواداری کی جو اشرف ترین یادگاریں پیش کر سکتی ہے یہ ان میں سے ایک ہے۔ یہ دستاویز جسے مؤرخینِ اسلام نے حرف بحرف قلم بند کیا ہے، وسعتِ نظر اور آزادیٔ خیال کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ اس دستاویز کی رُو سے عیسائیوں کو چند ایسی استثنائی مراعات حاصل ہوئیں جو انھیں اپنے ہم مذہب حکمرانوں کے تحت بھی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ آنحضرتؐ نے اعلان کر دیا کہ اس دستاویز میں جو احکام مندرج ہیں اگر کوئی مسلمان ان کی خلاف ورزی کرے گا یا ان سے ناجائز فائدہ اُٹھائے گا تو اسے معاہدۂ الٰہی سے رُوگردانی کرنے والا، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا اور اس کے دین کی تذلیل کرنے والا تصور کیا جائے گا۔ آپؐ نے عیسائیوں کی حفاظت، ان کے گرجاؤں اور ان کے پادریوں کے مکانوں کی پاسبانی اور انھیں ہر طرح کے گزند سے بچانے کی ذمہ داری اپنی ذات پر بھی اور اپنے متبعین پر بھی عائد کی۔ عیسائیوں سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ان پر کوئی ناجائز ٹیکس نہ لگائے جائیں گے، ان کا کوئی پادری اپنے علاقے سے نہ نکالا جائے گا، کسی عیسائی کو اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا، کسی راہب کو اس کے راہب خانے سے خارج نہ کیا جائے گا اور کسی زائر کو سفرِ زیارت سے نہ روکا جائے گا۔ ان کو اس کی بھی ضمانت دی گئی کہ مسجدیں یا مسلمانوں کے رہنے کے مکان بنانے کے لیے کوئی گرجا مسمار نہ کیا جائے گا۔ جن عیسائی عورتوں نے مسلمانوں سے شادی کر رکھی تھی ان کو یقین دلایا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے کی مجاز ہوں گی اور اس بارہ میں ان پر کوئی جبر و اکراہ نہ کیا جائے گا۔ اگر عیسائیوں کو اپنے

گرجاؤں یا خانقاہوں کی مرمت کے لئے یا اپنے مذہب کے کسی اور امر کے بارے میں امداد کی ضرورت ہوگی تو مسلمان انھیں امداد دیں گے۔ اس امداد کو ان کے مذہب میں شریک ہونے سے تعبیر نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اسے حاجت مندوں کی حاجت براری اور خدا اور رسولؐ کے ان احکام کی اطاعت سمجھا جائے گا جو عیسائیوں کے حق میں صادر کئے گئے تھے۔ اگر مسلمان کسی بیرونی عیسائی طاقت سے برسرِ جنگ ہوں گے تو مسلمانوں کے حدود کے اندر رہنے والے کسی عیسائی سے اس کے مذہب کی بناء پر حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان کسی عیسائی سے ایسا برتاؤ کرے گا تو وہ رسولؐ کی نافرمانی کا مرتکب تصور ہوگا۔

جو شخص بدی کا بدلہ بدی سے دینے کی طاقت رکھتا ہو، لیکن اس کے باوجود عفو کے خدائی اصول کی نہ صرف تلقین کرے بلکہ اس پر عمل بھی کرے، اس کی سیرت سے متعلق انسانوں کے دل میں ہمیشہ عظمت و بزرگی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب آنحضرتؐ رئیسِ مملکت اور رعایا کی جان و آزادی کے محافظ کی حیثیت سے عدل کرتے تھے تو آپؐ ہر مجرم کو اس کے جرم کی پوری پوری سزا دیتے تھے۔ لیکن رسولِ خدا اور معلمِ اسلام کی حیثیت سے اپنے بدترین دشمنوں سے بھی نرمی اور رحم کا سلوک کرتے تھے۔ آپؐ کی ذات میں وہ افضل ترین صفات جن کا تصور انسان کرسکتا ہے، یعنی عدل اور رحم، مجتمع تھیں۔

مسلمانوں نے شورش پسند بدویوں کے خلاف جو مہمیں بھیجیں ان میں سے ایک میں قبیلۂ حنیفہ کا ایک سردار ثمامہ بن اُثال گرفتار ہوا۔ وہ مدینہ میں لایا گیا جہاں وہ آنحضرتؐ کے کریمانہ برتاؤ سے اتنا متاثر ہوا کہ دشمنی ترک کرکے آپؐ کا جاں نثار ترین پیرو بن گیا۔ اس نے اپنے قبیلہ میں واپس جاکر مکے سے کھانے پینے کی چیزیں مکے بھجوانا بند کر دیا۔ اس سے مکے میں کھانے پینے کی چیزوں کی بڑی تنگی ہو گئی۔ بنی حنیفہ کو راضی کرنے سے عاجز آکر انھوں نے بالآخر آنحضرتؐ سے رجوع کیا اور ان سے مداخلت کی درخواست کی۔ آپؐ کو ان کی حالت پر رحم آگیا اور آپؐ نے ثمامہ سے سفارش کی کہ بنی حنیفہ کو ضرورت کی چیزیں بہم پہنچنے دیں۔ چنانچہ ثمامہ کے کہنے پر کاروانوں کو مکے جانے کی از سرِ نو اجازت مل گئی۔

آنحضرتؐ کی رحمدلی کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، لیکن ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا

کر بں گے۔ آنحضرتؐ کی ایک صاحبزادی، جو آپؐ کو بہت عزیز تھیں، صلح حدیبیہ کے بعد مکّے سے ہجرت کر رہی تھیں۔ وہ اس وقت حاملہ تھیں۔ جب وہ اونٹ پر سوار ہو رہی تھیں تو ہبار نامی ایک قریش نے اپنے نیزے کا دستہ ان کے اس زور سے مارا کہ وہ گر کر زمین پر آ رہیں اور اس کے نتیجہ میں کچھ مدت کے بعد وفات پا گئیں۔ فتح مکّہ کے بعد ہبار کو اشتہاری قاتل قرار دیا گیا۔ کچھ دنوں تک رُوپوش رہنے کے بعد وہ خود بخود آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے رحم کا ملتجی ہوا۔ اس کا جرم نہایت سنگین تھا، لیکن آنحضرتؐ کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ ذاتی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاتل اپنے کئے پر پشیمان ہے اور سچے دل سے ایمان لایا ہے۔ چنانچہ اسے غیر مشروط طور پر معافی دے دی گئی۔ اسی طرح ایک یہودن جس نے آنحضرتؐ کو خیبر میں زہر دیا اور عکرمہ بن ابوجہل جسے آنحضرتؐ سے شدید ذاتی دشمنی تھی، دونوں معاف کر دیئے گئے۔

عیسائی بدویوں کا ایک قبیلہ (بنی کلب)، جو دومتہ الجندل کے قریب رہتا تھا، لوٹ مار کرتا ہوا حدودِ مدینہ تک آ پہنچا۔ ان لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے اور انھیں قانون شکنیوں سے منع کرنے کے لئے ایک مہم بھیجی گئی۔ اس مہم کے سربراہ کو ہدایات دیتے وقت آنحضرتؐ نے یہ قابلِ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے: "کسی حالت میں بھی فریب یا دغا بازی سے کام نہ لینا اور کسی بچّے کو قتل نہ کرنا۔"[1]

جتنی مہمیں بھی غارت گر اور دشمن قبائل کے خلاف بھیجی جاتی تھیں ان کے سرداروں کو آپؐ ہمیشہ

---

[1] ابنِ ہشام۔ رسُولِ عربیؐ کی ان ہدایات اور حضرت ابوبکرؓ کے وہ الفاظ جو آپؓ نے یزید بن ابوسفیان کو مہم بازنطین پر روانہ کرتے وقت ارشاد فرمائے۔ ان دونوں کا مقابلہ اسرائیلی پیغمبر کے الفاظِ ذیل سے کیجئے:۔

"ربّ الافواج یوں فرماتا ہے .... سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچّے اور شیر خوار، گائے بیل اور بھیڑ بکریاں، اونٹ اور گدھے سب کو قتل کر ڈال" (سموئیل ۱۵: ۳) "تم بوڑھوں اور جوانوں اور لڑکیوں اور ننھے بچّوں اور عورتوں کو بالکل مار ڈالو ...."

(حزقی ایل ۹: ۶)

بتاکیدی حکم دیتے تھے کہ کمزوروں کو ہرگز نہ ستایا جائے۔ آپؐ نے جو فوج بازنطینیوں کے خلاف روانہ کی اس سے مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا "تمہیں جو گزند پہنچائے گئے ہیں ان کا انتقام لیتے وقت ایسے بے ضرر لوگوں کو تنگ نہ کرنا جو اپنے گھروں میں خلوت نشین ہیں طبقۂ اناث کی کمزوری کا لحاظ رکھنا، دودھ پیتے بچوں اور صاحبِ فراش بیماروں کو تکلیف نہ دینا۔ جو لوگ تمہارے مقابلہ پر نہ آئیں ان کے مکانوں کو مسمار نہ کرنا، ان کے ذریعۂ معاش اور ان کے پھلدار درختوں کو تباہ نہ کرنا اور کھجور کے درختوں کو ہاتھ نہ لگانا" حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آقا کے تتبع میں اپنے سردارِ فوج کو یہ ہدایات دیں "اے یزید اپنے لوگوں پر ظلم وستم نہ کرنا اور انھیں پریشان نہ کرنا، بلکہ اپنے تمام معاملات میں ان کا مشورہ لینا اور وہی کرنا جو حق اور مبنی بر انصاف ہو، کیونکہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے کاموں میں کبھی برکت نہیں ہوتی۔ جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنا اور اُسے پیٹھ نہ دکھانا اور اگر تمھیں فتح نصیب ہو تو چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو تباہ نہ کرنا اور غلّے کے کھیتوں کو نہ جلانا، کوئی ثمردار درخت نہ کاٹنا اور مویشیوں کو کوئی گزند نہ پہنچانا، اِلّا یہ کہ تم انھیں خوراک کے لیے ذبح کرو۔ جب تم کوئی معاہدہ یا پیمان کرو تو اس پر قائم رہو اور اپنا قول پورا کرو۔ جب تم آگے بڑھو گے تو تمھیں کچھ ایسے دیندار لوگ ملیں گے جو راہب خانوں میں رہتے ہیں۔ انھوں نے خدا کی بندگی کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان سے تعرض نہ کرنا، نہ انھیں قتل کرنا اور نہ ان کے راہب خانوں کو مسمار کرنا"[1] عیسائیوں نے، خواہ وہ کیتھولک تھے، یا پروٹسٹنٹ یا یونانی کلیسا کے پیرو، سینٹ لکٹانٹیس (St. Lactantius) کے زمانہ سے لے کر کوینانٹروں (Covenanters) کے زمانے تک اپنے دشمنوں پر جو خوفناک پھٹکاریں بھیجیں، ان میں اور ان ہدایات میں کتنا عجیب تباین ہے[2]

---

[1] Mill's *History of Muhammedanism*, pp. 45, 46

[2] بیسویں صدی میں ایک عظیم عیسائی طاقت کی فوجوں نے مانچوریا کے مقام ربانی حاشیہ صفحہ ۱۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

"شہزادۂ امن" (the Prince of Peace) کے پیرو زمانۂ حال تک انتہائی بے دریغی سے آبرو ریزی، خانہ سوزی، تاخت و تاراج اور جوانوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کے بلاتمیز قتل میں مشغول رہے ہیں۔ روئے ارض پر ان کے نائب، کیا پوپ اور کیا بطریق، کیا بشپ اور کیا پادری، ان جرائم کو نگاہِ استحسان سے دیکھتے رہے ہیں اور اکثر انتہا درجہ کے انسانیت سوز مظالم سے مکمل بربیت کے فتوے دیتے رہے ہیں۔

اسی سال ماہِ شعبان (نومبر دسمبر ۶۲۷ء) میں بنی مصطلق کے خلاف ایک مہم روانہ کی گئی۔ ان لوگوں کے اب تک مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رہے تھے لیکن اپنے سردار حارث بن ابی ضرار کی تحریک پر انھوں نے رشتۂ اتحاد توڑ دیا اور مضافاتِ مدینہ پر چھاپے مارنے لگے۔ یہ مہم پورے طور پر کامیاب ہوئی اور بہت سے لوگ قید ہوئے جن میں جویریہ بنتِ حارث بھی تھیں۔[۱]

مہاجرینِ مکّہ کو اپنے دین کی خاطر اور اس ذاتِ باری کی خاطر جس نے ان کے اندر ایک بالکل نیا شعور حلول کر دیا تھا اور اتحاد، محبت و اخوت کی روح بیدار کر دی تھی اپنا وطن چھوڑے ہوئے اب چھ سال ہو گئے تھے۔ عرب کے گوشے گوشے سے لوگ جوق در جوق اس حیرت انگیز انسان کے الفاظ سننے آتے تھے جس نے یہ سب کچھ کر دکھایا تھا اور وہ آکر اس سے اپنی روزانہ زندگی کے معاملات کے بارے میں مشورہ لیتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح زمانۂ قدیم میں بنی اسرائیل سموئیل نبی سے مشورے لیا کرتے تھے۔[۲]

لیکن ان غریب الدیاروں کے دل ابھی تک اپنے مولد کے لئے ترستے تھے، اپنے گھروں کو چھوڑنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۲) بلاگو ویشنک (Blagovestachenk) پر پانچ ہزار چینی مردوں، عورتوں اور بچوں کا جو قتلِ عام کیا وہ محتاجِ بیان نہیں۔

[۱] ابن ہشام، ابن الاثیر

[۲] Stanley's *Lectures on the Jewish Church*, vol,

پر مجبور ہو کر انھوں نے ایک اجنبی شہر میں پناہ لی تھی۔ وہ اس مقدس حرم کعبہ سے نکالے گئے تھے، جو ان کی ہر طرح کی راہ و رسم کا شاندار مرکز اور ان کی قومی تاریخ کا واحد محور تھا۔ چھ سال سے وہ اس مقدس معبد کی زیارت سے محروم تھے، جو ایک ایسا دستور تھا جس کے گرد مرورِ زمانہ نے اپنی عتیق روایات کے ساتھ تقدس کا ہالہ ڈال دیا تھا۔ خود پیغمبرِ اسلام کے دل میں اپنے وطن کو دیکھنے کی اتنی ہی آرزو تھی۔ کعبہ کی عبادت گاہ تمام عرب قوم کی ملکیت تھی۔ قریش اس عبادت گاہ کے صرف محافظ تھے اور ملک کا قانون انھیں اس امر کا کوئی اختیار نہ دیتا تھا کہ اگر کوئی دشمن بھی کسی معاندانہ نیت کے بغیر اور اپنے فرائض مذہبی ادا کرنے کی غرض سے کعبہ میں آئے تو اسے داخل ہونے سے روک دیں[1]۔

زیارتِ کعبہ کا موسم قریب آ گیا تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے عمرہ کی نیت کی منادی کرا دی۔ فوراً ایک ہزار آوازوں نے لبیک کہا۔ جلدی جلدی تیاریاں کی گئیں اور آنحضرتؐ سات سو انصار و مہاجرین کو ہمراہ لیے، جو سب کے سب غیر مسلح تھے، عازمِ کعبہ ہو گئے[2]۔ لیکن قریش کی آتشِ عناد ابھی تک نہ بجھی تھی۔ وہ زائرین کا راستہ روکنے کے لیے ایک فوجِ کثیر لے کر مکے سے چند میل باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد شہر کی طرف پلٹ گئے، تاکہ شہر کے اندر جانے کے تمام راستے بند کر دیں۔ انھوں نے حلف اٹھائے کہ آنحضرتؐ کے متبعین کو حرمِ کعبہ میں داخل نہ ہونے دیں گے اور مسلمانوں نے جو سفیر زیارتِ کعبہ کی اجازت لینے کے لیے ان کے پاس بھیجا تھا اس کے ساتھ بہت بدسلوکی کی۔ مکیوں کا ایک گروہ مسلمانوں کے خیموں کے اردگرد چکر لگانے لگا، اس ارادے سے کہ اگر کوئی مسلمان خیمہ گاہ سے باہر نکلے تو اسے قتل کر دیں۔ اور تو اور انھوں نے آنحضرتؐ پر بھی پتھر اور تیر برسائے[3]۔ جب آنحضرتؐ نے دیکھا کہ کفار ٹس سے مس نہیں ہوتے

---

[1] طبری، کوسین دی پرسیوال

[2] ابن ہشام، طبری، ابن الاثیر۔ ابو الفدا کہتا ہے کہ آپؐ کے ہمراہیوں کی تعداد ۱۴۰۰ تھی۔

[3] ان پتھر اور تیر برسانے والے لوگوں میں سے کچھ لوگ پکڑے گئے اور آنحضرتؐ کے سامنے لائے گئے تو آپؐ نے انھیں معاف کر دیا اور چھوڑ دیا (ابن ہشام) اس موقع پر مسلمانوں نے وہ بیعت کی جو بیعت الرضوان یا بیعت الشجر کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عثمانؓ کو دوسرا قاصد بنا کر قریش (ربانی حاشیہ صفحہ ۱۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

تو آپؐ نے مسلمانوں اور قریش کی جنگ کو ختم کرنے کے لیے اہلِ مکّہ کی تمام شرائط مان لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ بڑی ردّ و کد کے بعد ایک معاہدہ ہُوا جس کی رُو سے یہ طے پایا کہ لڑائی دس سال کے لیے ملتوی کر دی جائے۔ اگر قریش میں سے کوئی شخص اپنے سردار یا مربّی کی اجازت کے بغیر آنحضرتؐ کے پاس چلا آئے تو اُسے واپس کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی مسلمان اہلِ مکّہ کے پاس جائے تو اُسے واپس نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی قبیلہ قریش یا مسلمانوں سے اتحاد کرنا چاہے تو اُسے بلا مزاحمت اس کی اجازت ہو گی۔ اس سال مسلمان وہیں سے واپس چلے جائیں گے اور آئندہ سال انھیں اجازت ہو گی کہ صرف اپنے سفری ہتھیار (یعنی تلواریں نیام میں اور نیام جلبان میں) لیے ہوئے مکّے میں داخل ہوں اور تین دن تک مکّے میں قیام کریں۔

اس معاہدۂ صلح میں آنحضرتؐ نے جس اعتدال اور عالی ظرفی سے کام لیا وہ آپؐ کے بعض جوشیلے متبعین کو، جن کے دلوں میں قریش کی زیادتیوں اور بے رحمیوں کی خلش ابھی باقی تھی، ناگوار گزری۔ معاہدہ کی تیسری شرط کے تحت، جس کی رُو سے مسلمان اس پر مجبور تھے کہ وہ ایسے تمام کفار کو واپس کر دیں جو اپنے مربیوں یا سرداروں کی اجازت کے بغیر ان کے پاس چلے آئے تھے۔ قریش نے آنحضرتؐ کے متعدد صحابہ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور یہ مطالبہ فوراً پورا کیا گیا۔ اس کے باوجود کہ بعض صحابہؓ اس امر سے ناخوش نظر آتے تھے۔[۲]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) کے پاس بھیجا گیا تو قریش نے انھیں نرغے میں لے لیا۔ مسلمانوں کے دل میں خدشہ پیدا ہُوا کہ مبادا حضرت عثمان قتل کر دیے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے گرد جمع ہو کر قتلِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کی قسم کھائی (ابن ہشام، سورہ فتح ۱۸۔ میور نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

[۱] "سلاح الرا ......" ابن ہشام۔ ابن الاثیر، مشکوٰۃ۔ اس صلح کے موقعہ پر قریش کا ایک سفیر جو مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں بھیجا گیا، آنحضرتؐ کے متبعین کی آپؐ کے ساتھ حیرت انگیز عقیدت و محبت دیکھ کر اس قدر متاثر ہُوا کہ قریش کے پاس واپس جا کر بولا "میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں۔ جہاں ہر طرح کی شاہانہ شان و شوکت تھی لیکن محمدؐ کے پیرو جیسی اس کی عزت و اطاعت کرتے ہیں اس کی مثال میں نے کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں دیکھی۔ ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری، ابو الفداء۔

[۲] چونکہ عورتیں اس شرط میں شامل نہ تھیں، اس لیے کفار نے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

مدینہ واپس آکر آنحضرتؐ نے اپنی اس وسیع المشربانہ خواہش کی تکمیل کے لیے کہ آپؐ کا دین ساری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے[۱] ہمسایہ ملکوں کے بادشاہوں کے پاس اپنے سفیر بھیجے تاکہ انھیں اور ان کی رعایا کو آبِ حیات کا وہ پیالہ پیش کریں جس کا نام اسلام تھا۔ اس ضمن میں دو سفارتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو ہرقل شہنشاہِ یونان اور خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے دربار میں بھیجی گئیں۔ شہنشاہِ ایران مکے کے اس مہاجر کی اس جسارت پر حیران ہُوا کہ وہ خسروِ اعظم سے ایک ہمسر کی طرح خطاب کر رہا تھا۔ اس نے غضبناک ہوکر آنحضرتؐ کے خط کو پرزے پرزے کر ڈالا اور سفیر کو سخت سست کہہ کر دربار سے نکلوا دیا۔ جب اس بدسلوکی کی خبر آنحضرتؐ کو دی گئی تو آپؐ نے آہستگی سے فرمایا، "اسی طرح کسریٰ کی سلطنت ایک دن پارہ پارہ ہو جائے گی"[۲] اس پیشگوئی کی تکمیل تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ ہرقل، جو طبیعت کا نسبتاً زیادہ متواضع تھا، سفیر سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا اور شائستگی اور خوش خلقی سے آنحضرتؐ کے پیغام کا جواب دیا۔ لیکن شام سے رخصت ہونے سے پہلے اس شخص نے اس کی سیرت و شخصیت سے متعارف ہونے کی کوشش کی جس نے اسے پیغام بھیجا تھا۔ اس مقصد سے اس نے چند عرب سوداگروں کو، جو غزہ میں ایک کارواں لے کر آئے ہوئے تھے، اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ ان سوداگروں میں ابوسفیان بھی تھا، جو اب تک آنحضرتؐ کا سخت ترین دشمن تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونانی شہنشاہ نے آنحضرتؐ کے متعلق ابوسفیان سے چند سوالات کیے۔ اس کے جواب تقریباً بلفظ اس خلاصے سے ملتے ہیں جو حضرت جعفرؓ نے تعلیماتِ محمدیؐ کے بارے میں نجاشی کے سامنے پیش کیا۔ ہرقل نے پوچھا "محمدؐ کن عقائد کی تعلیم دیتا ہے؟" ابوسفیان نے جواب دیا، "وہ ہمیں اپنے قدیم بتوں کی پرستش ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت اختیار کرنے کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵) مسلمان عورتوں کی واپسی کا جو مطالبہ کیا وہ رد کر دیا گیا۔

[۱] سورۃ الاعراف۔ ۱۵۷، ۱۵۸

[۲] ابن الاثیر

کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خیرات دو، سچائی اور پاکی سے کام لو، زنا و بدکاری سے پرہیز کرو اور مکروہات سے دُور رہو!" ہرقل نے پوچھا "محمدؐ کے پیرو تعداد میں بڑھ رہے ہیں یا کم ہو رہے ہیں۔؟" ابوسفیان نے جواب دیا، "اس کے پیرو روز بروز بڑھ رہے ہیں اور اُن میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس کا ساتھ چھوڑا ہو۔"

ایک اور سفیر اس کے کچھ مدت بعد غسّانی شاہزادے کی طرف بھیجا گیا جو ہرقل کا باجگزار تھا اور دمشق کے قریب بُصریٰ میں رہتا تھا۔ بجائے اس کے کہ سفیر کے ساتھ اس عزّت و احترام کا سلوک کیا جاتا جو سفیروں کے شایانِ شان ہے، اسی خاندان کے ایک اور سردار نے، جو ایک عیسائی قبیلہ کا امیر اور بازنطین کا تابعِ فرمان تھا، اسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا۔ بین الاقوامی واجبات کی یہ بے ہودہ خلاف ورزی بالآخر اس جنگ کا باعث بنی جس نے اسلام اور سارے عالمِ عیسائیت کو ایک دوسرے کے مقابلہ پر صف آرا کر دیا۔ بہرحال اس کی تفصیل ہم آئندہ بیان کریں گے۔

ساتواں باب

اشاعتِ اسلام

فَمَاتطاوُلُ آمَالِ المدیحِ الیٰ ، مافیہِ مِن کَرَمِ الاَخلَاقِ وَالشِّیمِ

۷ ہجری - ۱۲ اپریل ۶۲۸ء سے یکم مئی ۶۲۹ء تک

یہودی قبائل ہزیمتیں اُٹھانے کے باوجود، اب بھی خطرناک تھے اور ابھی تک مسلمانوں کی تباہی کی تدبیروں میں منہمک تھے۔ مدینے سے تین چار روز کی مسافت پر شمال مشرق کی جانب ان کے قبضے میں ایک ایسا علاقہ تھا جس میں جا بجا قلعے تھے۔ ان میں سب سے بڑا قلعہ "القموص" ایک دشوار گذار پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعوں کے اس مجموعے کا نام خیبر تھا (خیبر کے معنی ہیں قلعہ بند مقام) خیبر میں جو لوگ آباد تھے ان میں بنی نضیر اور بنی قریظہ کی بہت سی شاخیں بھی تھیں، جو ان قلعوں میں پناہ گزین تھیں۔ خیبر کے یہودیوں کو آنحضرتؐ اور آپؐ کے متبعین سے سخت دشمنی اور نفرت تھی، جسے ان کے بھائی بندوں کی آمد نے اور بڑھا دیا۔ ان لوگوں کا بنی غطفان اور دوسرے بدویوں کے ساتھ دیرینہ اتحاد تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے خلاف ایک اور متحدہ محاذ قائم کرنے کی کوششوں میں متواتر سرگرم کار تھے[1] صحرائی قبائل مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جو قوت رکھتے تھے مسلمان اس سے بخوبی آگاہ تھے اور انھیں اس کا احساس تھا کہ مدینے کے خلاف ایک نئے اتحاد کا سدِ باب کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس سال ماہِ محرم کے ابتدائی ایام میں چودہ سو (۱۴۰۰) آدمیوں پر مشتمل ایک مہم خیبر بھیجی گئی۔ یہودیوں

---

[1] کوسین دی پرسیوال

نے اپنے حلیفوں سے مدد طلب کی۔ بنی فزارہ فوراً ان کی امداد کو پہنچے، لیکن اس خوف سے کہ کہیں مسلمان پہلو بدل کر ان کی غیر موجودگی میں اچانک ان کے گلّوں اور ریوڑوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں، وہ لوگ جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اس طرح یہودی میدانِ جنگ میں اکیلے رہ گئے۔ مسلمانوں نے انھیں صلح کی شرائط پیش کیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیں۔ اگرچہ یہودیوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن ایک کے بعد ایک قلعے نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ اخیر میں سب سے زبردست قلعے قموص کی باری آئی۔ یہودیوں نے جی توڑ کر اس کے بچاؤ کی کوشش کی لیکن وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس قلعے کی تسخیر سے باقی یہودیوں پر واضح ہو گیا کہ مزید مقابلہ بے سود ہے۔ وہ معافی کے خواستگار ہوئے اور انھیں معافی دے دی گئی۔ انھیں اس امر کی ضمانت بھی دے دی گئی کہ اگر ان کا آئندہ طورطریقہ اچھا رہا تو ان کی زمینیں اور غیر منقولہ جائدادیں ان کے قبضے میں رہنے دی جائیں گی اور انھیں اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی آزادی ہو گی۔ کیونکہ وہ عام محصولات سے مستثنیٰ تھے، اس لیے آنحضرتؐ نے ان پر یہ فرض عائد کیا کہ تحفظ کے بدلے میں وہ حکومت کو اپنی زمینوں کی پیداوار کا آدھا حصہ دیا کریں گے جو قلعے مسلمانوں نے باقاعدہ محاصرہ سے تسخیر کئے ان میں جو جائداد منقولہ تھی وہ اسلامی فوج کے حق میں ضبط کر لی گئی اور فوجیوں میں تقسیم کر دی گئی۔ سواروں کو تین حصے ملے اور پیادوں کو ایک حصہ ملا۔[1]

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر۔ یہ سراسر جھوٹ ہے کہ پوشیدہ خزانے کا پتہ چلانے کے لیے کنانہ کو اذیت دی گئی۔

اس مہم کے دوران آنحضرتؐ کو ہلاک کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں مثلاً جب آپؐ خیبر میں داخل ہوئے تو ایک یہودن نے آپؐ کی اور چند صحابہؓ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ ایک صحابی تو دو چار نوالوں کے بعد ہی جاں بحق ہو گیا۔ آنحضرتؐ کی جان تو بچ گئی، لیکن زہر آپؐ کے جسم میں سرایت کر گیا اور اس کے اثرات تادمِ آخر باقی رہے۔ آنحضرتؐ نے یہودن کو معاف کر دیا اور اسے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۸۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

سنہ ۷ھ کے اواخر میں آنحضرتؐ اور صحابہؓ نے قریش کے ساتھ صلح کا فائدہ اٹھا کر زیارتِ کعبہ کی وہ خواہش پوری کی جو مدتوں سے ان کے دلوں میں تھی۔ اس سفر کو اسلامی تاریخ میں "عمرۃ القضاء" کے محترم نام سے یاد کیا جاتا ہے[۱]۔ مارچ ۶۲۹ء میں آنحضرتؐ دو ہزار صحابہؓ کے ہمراہ عمرہ کے لیے حازمِ مکہ ہوئے۔ قریش کو ان زائرین سے ملنا یا بات تک کرنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ رسومِ عمرہ کی سہ روزہ مدت کے لیے انھوں نے شہر خالی کر دیا اور قریب کی پہاڑیوں پر سے مسلمانوں کے عمرہ ادا کرنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ میور لکھتا ہے: "وہ یقیناً ایک عجیب و غریب نظارہ تھا جو اس وقت وادیٔ مکہ میں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ایسا نظارہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تین دن کے لیے اس قدیم شہر کے تمام باشندے، کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ، شہر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ہر گھر خالی ہو جاتا ہے۔ ادھر اہلِ مکہ شہر سے باہر جا رہے ہیں اور ادھر جلا وطن مسلمان جنھیں اپنے مولد سے شہر بدر ہوئے کئی سال گذر چکے تھے، اپنے حلیفوں کے ہمراہ جوق در جوق شہر کے اندر داخل ہوتے ہیں، ان خالی گھروں میں جاتے ہیں جہاں ان کا بچپن گذرا تھا اور اس مختصر مہلت میں جو انھیں دی گئی ہے زیارتِ کعبہ کی رسوم ادا کرتے ہیں۔ مکے والے اردگرد کی بلندیوں پر چڑھ کر خیموں میں یا پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں جہاں کہیں بھی وہ سر چھپا سکتے ہیں پناہ لیتے ہیں۔ ابوقُبیس کی آگے کو نکلی ہوئی چوٹی پر جمگھٹ بنا کر زائرین کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرتے ہیں، جو اپنے نبی کی سربراہی میں کعبے کا طواف کر رہے ہیں یا صفا و مروہ کے درمیان تیز قدمی سے چل رہے ہیں۔ اوپر والے نیچے والوں میں سے ہر شخص کو متجسسانہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں کہ شاید انھیں کوئی مدتوں سے بچھڑا ہوا دوست یا عزیز نظر آجائے۔ جن شدائد و مصائب سے اسلام کو اپنی ابتدائی زندگی میں دوچار ہونا پڑا، ان کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ نظارہ دیکھنے میں آتا[۲]"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷۹) اپنے لوگوں میں رہنے کی اجازت دے دی۔ طبری، ابن الاثیر

[۱] سورۂ فتح ۲۷

[۲] Muir, Life of Muhammed, voi. iii, 402

مسلمانوں نے شرائطِ صلح کی سختی سے پابندی کی اور تین دن کے قیام کے بعد مکّہ خالی کر دیا۔
جس پُرامن طریقے سے مسلمانوں نے اپنی زیارتِ کعبہ کی آرزو پوری کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کے اور بہت سے اہم افراد دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے ضبط و تحمل اور ایفائے عہد نے دشمنوں پر بہت گہرا اثر کیا۔ قریش کے جو لوگ آنحضرتؐ کے شدید ترین مخالف تھے اور جن میں بہت سے صاحبِ حیثیت اور ذی اثر لوگ بھی تھے جنھوں نے آپؐ سے جنگ کی تھی اور آپؐ کو بُرا بھلا کہا تھا، وہ آنحضرتؐ کی کریم النفسی، شرافت اور عفو و رحم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]
شہنشاہِ یونان کے ایک باجگزار سردار کے ہاتھوں مسلمان سفیر کا قتل ایک ایسا جرم تھا جسے خاموشی سے اور سزا دیئے بغیر نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ غسانی شہزادہ سے تاوان کا مطالبہ کرنے کے لیے تین ہزار آدمیوں کی ایک مہم روانہ کی گئی۔ بازنطینی شہنشاہ کے ماتحت عمّال نے اس جرم سے برأت ظاہر کرنے کی بجائے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی جس کے معنی یہ تھے کہ ساری بازنطینی سلطنت مسلمانوں سے برسرِ جنگ تھی۔ ان عمّال نے اپنی فوجیں جمع کر کے موتہ کے قریب مسلمانوں پر حملہ کر دیا، جو شام کے شہر بلقاء سے کچھ دور، جہاں مسلمان سفیر قتل کیا گیا تھا، ایک گاؤں تھا۔ مسلمانوں نے بازنطینیوں اور ان کے حلیفوں کو پسپا تو کر دیا، لیکن دشمنوں کی فوج تعداد میں مسلمانوں سے بہت زیادہ تھی، اس لیے مسلمان مدینہ واپس آ گئے۔[2]

اسی زمانہ کی بات ہے کہ قریش نے بنی بکر کے ساتھ مل کر صلحِ حدیبیہ کی شرائط کی خلاف ورزی کی اور بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا، جو مسلمانوں کے حلیف اور ان کی حفاظت میں تھے۔ انھوں نے بنی خزاعہ کے بہت سے آدمی ہلاک کر دیئے اور باقیوں کو منتشر

---

[1] مثلاً خالد بن ولید جو جنگِ اُحد میں قریش سواروں کے سردار تھے اور عمرو بن العاص۔
[2] کوسین دی پرسیوال، ابن الاثیر۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کے سالارِ لشکر زیدؓ بن حارث، عم زادۂ رسولؐ جعفرؓ اور بہت سے دوسرے نمایاں افراد شہید ہوئے۔

کر دیا۔ بنی خزاعہ فریاد لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انصاف کا مطالبہ کیا۔ مکے میں بڑی مدت سے ناانصافی اور ظلم و ستم کی گرم بازاری تھی، اہلِ مکہ نے خود شرائطِ صلح کو توڑا تھا اور ان کے کئی سرداروں نے بنی خزاعہ کے قتلِ عام میں حصہ لیا تھا آنحضرتؐ خود دس ہزار مجاہدوں کو لے کر میدان میں نکلے۔ عکرمہ اور صفوان کی سرکردگی میں ان کے قبائل نے تھوڑی سی مزاحمت کی جس میں چند مسلمان شہید ہو گئے۔ ان کے سوا کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور آنحضرتؐ نے مکہ میں ورود کیا۔

اس طرح آنحضرتؐ ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ وہ جو کسی زمانہ میں غریب الوطن اور موردِ ظلم و ستم تھا، اپنی رسالت کو رحم و کرم سے ثابت کرنے کے لیے اپنے شہر میں واپس آیا۔ جس شہر نے اس کے ساتھ اتنی بے رحمی کا سلوک کیا تھا، جس نے اسے اور اس کے جاں نثاروں کو اجنبیوں کی پناہ لینے پر مجبور کیا تھا، جس نے اس کی اور اس کے عقیدت مندوں کی جان لینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ شہر اب اس کے قدموں پر پڑا تھا۔ اس کے ظالم و سفاک دشمن، جنھوں نے پُرامن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم ڈھا کر بلکہ مُردوں کی بھی بے حُرمتی کر کے اپنے ننگِ انسانیت ہونے کا ثبوت دیا تھا، اب اس کے رحم و کرم کے محتاج تھے، لیکن فتح و ظفر کی اس گھڑی میں تمام بُرائیاں بھلا دی گئیں، تمام زیادتیاں معاف کر دی گئیں اور مکے کی تمام آبادی کو عام معافی دے دی گئی۔ اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد آپؐ نے واجب القتل لوگوں کی جو فہرست بنائی وہ صرف چار مجرموں پر مشتمل تھی، جنھیں عدل مستوجبِ سزا قرار دے چکا تھا۔ فوج نے بھی آپؐ کی مثال کی تقلید کی اور پُرامن طریقے سے شہر میں داخل ہوئی۔ نہ کوئی گھر نہ لُوٹا گیا اور نہ کسی عورت کی توہین نہ کی گئی۔ بالکل بجا طور پر کہا گیا ہے کہ فتوحات کی تاریخ میں اس فاتحانہ ورود کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن عربوں کے بُت بے دردی سے توڑ دیئے گئے۔ کفار غم و تاسف کے عالم میں کھڑے اپنے معبود بُتوں کے ہبوط کا نظارہ دیکھ رہے تھے اور پھر ان پر حقیقت آشکار ہو گئی، جب بُتوں کے سرنگوں ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس پرانی جانی پہچانی آواز کو، جسے وہ تمسخر

ہیں اُڑا دیا کرتے تھے ، یہ اعلان کرتے سنا "حق آگیا اور باطل گیا گزرا ہوا اور واقعی باطل آنی جانی چیز ہے[1]" ان کے اصنام کتنے بے دست و پا نکلے!

ان قدیم بتوں کو توڑنے اور جاہلیت کی تمام رسوم کو مٹانے کے بعد رسولِ خدا نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے پہلے تو انسانوں کی فطری مساوات و اخوت کے بارے میں قرآن کے احکام بیان کئے[2] اور پھر فرمایا: "اے قریش! میری طرف سے تمھیں اپنے لیے کس سلوک کی توقع ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "آپؐ ہمارے شفیق برادر اور مہربان برادر کے فرزند ہیں، ہمیں آپؐ سے بھلائی ہی کی توقع ہے[3]۔" طبری کہتا ہے کہ یہ الفاظ سن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپؐ نے فرمایا: "اچھا میں بھی تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا :۔ لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھو ارحم الراحمین۔ (خدا تمھیں معاف کرے، آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔ وہ بڑا رحیم و رحمٰن ہے[4]۔")

اب ایک ایسا منظر رونما ہوا جس کی کوئی مثال تاریخِ عالم میں نظر نہیں آتی۔ جوق در جوق لوگ آتے اور اسلام قبول کرتے چلے جاتے۔ آپؐ نے کوہِ صفا پر بیٹھ کر ان سب سے وہی عہد لیا جو آپؐ نے مدینے والوں سے لیا تھا: "ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، زنا نہ کریں گے اور اولاد کو قتل نہ کریں گے، ہم جھوٹ نہ بولیں گے اور عورتوں کے بارے میں بُری باتیں نہ کہیں گے[5]۔"

اس طرح قرآن کی یہ پیشگوئی پوری ہوئی: "جب خدا کی مدد آپہنچے اور فتح ہو جائے اور تم لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھو تو اپنے ربّ کی حمد و ثنا کرو اور اس

---

[1] بنی اسرائیل
[2] سورۂ الحجرات آیت ۱۰
[3] ابن ہشام، طبری
[4] سورۂ یوسف
[5] ابن الاثیر۔ کوسین دی پرسیوال

سے توبہ کی درخواست کرو۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"[1]

اب آپؐ کی رسالت کا مقصد تکمیل کے قریب تھا۔ آپؐ نے اکابرِ صحابہ کو تمام اطراف میں صحرا کے بدوی قبائل کی طرف بھیجا تاکہ انھیں دعوتِ اسلام دیں اور انھیں تاکیدی احکام دیئے کہ امن و خیر سگالی کی تبلیغ کریں۔ انھیں صرف تشدد سے اپنا تحفظ کرنے کی خاطر ہتھیار اُٹھانے کی اجازت دی گئی۔ ایک موقعے کے سوا ان ہدایات پر پورا پورا عمل کیا گیا۔ خالد بن ولید کے آدمیوں نے اپنے شعلہ مزاج نومسلم سردار کے حکم پر قبیلہ بنی جذیمہ کے چند بدوی یہ سمجھ کر کہ وہ دشمن سپاہ کے آدمی ہیں قتل کر ڈالے۔ لیکن دوسرے مسلمانوں نے دخل اندازی کرکے مزید خوں ریزی روک دی۔ جب بے جا خوں ریزی کی خبر رسولؐ اللہ نے سُنی تو آپؐ فرطِ غم سے بے قرار ہوگئے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر پکارے: "یا اللہ میں خالد کے اس فعل سے بری الذمہ ہوں!" آپؐ نے فوراً حضرت علیؓ کو بنی جذیمہ کے پاس بھیجا تاکہ ہر ممکن طریقہ سے انھیں اس زیادتی کا معاوضہ ادا کیا جائے۔ یہ کارِ خیر حضرت علیؓ کی طبیعت سے موافقت رکھتا تھا اور آپؐ نے ہدایاتِ نبوی کے عین مطابق اس کو انجام دیا۔ انھوں نے مقتولین کی تعداد، ان کی حیثیت اور ان کے ورثاء کو جو نقصان پہنچا تھا ان سب کی بکمالِ احتیاط تحقیقات کی اور ہر کسی کے حق کے مطابق اسے دیت عطا کی۔ نقصانات کی تلافی کے بعد جو رقم بچی وہ انھوں نے مقتولین کے رشتہ داروں اور قبیلے کے لوگوں میں تقسیم کر دی۔ واقعہ نگار لکھتا ہے کہ ان کی اس فیاضی اور رحمدلی سے لوگوں کے دل خوش ہوگئے۔ لوگوں کی دعائیں لیتے ہوئے آپؐ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے جی کھول کر آپؓ کی تعریف کی۔[2]

ہوازن، ثقیف اور بہت سے دوسرے جنگجو بدوی قبیلے جن کی چراگاہیں مکّے کے قرب وجوار میں تھیں اور جن میں سے بعض طائف سے مضبوط قلعہ بند قصبوں میں رہتے تھے مقابلہ کئے بغیر مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس نیت سے ایک اتحاد قائم کیا کہ

---

[1] سورۂ نصر

[2] ابنِ ہشام، ابن الاثیر، طبری۔

مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیں اور انھیں مدافعت کا موقع ہی نہ دیں۔ لیکن آنحضرتؐ کی مستعدی نے ان کی سازش کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ حنین کے قریب جو مکے[1] سے دس میل دور شمال مشرق کی جانب ایک گہری اور تنگ گھاٹی ہے، گھمسان کی لڑائی ہوئی، جس میں کفار کو نقصانِ عظیم کے ساتھ شکست ہوئی[2]۔ دشمن کی فوجیں دو گروہوں میں بٹ گئیں۔ ایک گروہ نے، جس میں زیادہ تر بنی ثقیف کے لوگ تھے، شہرِ طائف میں پناہ لی، جس کے حدود سے آٹھ نو سال پہلے آنحضرت کو اہانت کے ساتھ نکال دیا گیا تھا۔ دوسرا گروہ بھاگ کر وادیٔ اوطاس کے ایک محفوظ مقام میں پناہ گزین ہوا۔ یہ مقام تسخیر کر لیا گیا اور ہوازن کے اہل و عیال اپنے تمام مال و متاع، ریوڑوں اور گلّوں سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ پھر طائف کا محاصرہ کیا گیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد آنحضرتؐ نے محاصرہ اٹھا لیا۔ آپؐ کو خوب معلوم تھا کہ حالات اہلِ طائف کو کسی خون ریزی کے بغیر خود بخود ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیں گے۔ جب آپؐ اس مقام کو لوٹے جہاں ہوازن کے قیدی بغرضِ حفاظت رکھے گئے تھے تو آپؐ نے اس طاقت ور قبیلے کا ایک وفد آپؐ کا منتظر پایا تاکہ آپؐ سے اپنے اہل و عیال کی واپسی کی درخواست کرے۔ آپؐ جانتے تھے کہ عرب اپنے حقوق کے معاملے میں کس قدر حساس ہیں۔ اس لیے آپؐ نے بدوی مندوبین کو یہ جواب دیا کہ آپؐ اپنی قوم کو ثمراتِ فتح سے دست بردار ہونے پر مجبور نہ کر سکتے تھے اور اگر ہوازن اپنے اہل و عیال کو واپس لینا چاہتے تھے تو انھیں کم از کم اپنے مال و اسباب سے دست کش ہو جانا چاہیے۔ ہوازن اس بات پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ دوسرے دن جب مسلمان آپؐ کی امامت میں نمازِ ظہر[3] ادا کر رہے تھے تو ہوازن نے آکر اپنی درخواست کو دہرایا: "ہم رسول اللہؐ سے التجا

---

[1] کوسین۔ دی۔ پرسیوال۔ فادرس یہ محض اتنا ذکر کرتا ہے کہ حنین مکّے سے طائف جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ معجم البلدان میں یہ کہا گیا ہے کہ حنین ذوالمجاز کے جنوب میں اور مکّے سے تین رات کی مسافت پر واقع ہے۔

[2] سورہ توبہ (آیات ۲۵ - ۲۶) میں اس جنگ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ابن ہشام۔ ابن الاثیر

[3] بقول طبری نمازِ فجر

کوتے ہیں کو وہ مسلمانوں سے سفارش کریں اور مسلمانوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ رسُول اللہ سے سفارش کریں کہ ہمارے بیوی بچے ہمیں واپس دے دیئے جائیں۔" آنحضرتؐ نے جواب دیا۔" میں اپنا اور بنو عبدالمطلب کا حصہ فوراً تم لوگوں کو واپس کرتا ہوں۔" آپؐ کی فیاضی سے متاثر ہو کر آپؐ کے متبعین نے فوراً آپؐ کی مثال کی تقلید کی۔ چنانچہ ایک لمحے میں چھ ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے[1]۔ اس دریا دلی نے بنی ثقیف کے دل جیت لیے اور وہ بیعت کر کے سچے دل سے مسلمان ہو گئے۔ ہوازن کے گلّوں اور ریوڑوں کی تقسیم کے بعد جو واقعہ پیش آیا اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ کو اہلِ مدینہ کے دلوں پر کیسا تسلط تھا اور انھیں آپؐ سے کیسی گہری عقیدت تھی، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کی زندگی کے کسی دور میں بھی آپؐ کے پاس اپنے متبعین کو دینے کے لیے کوئی مادی انعامات نہ تھے۔ مالِ غنیمت کی تقسیم میں نومسلم اہلِ مکہ کو اہلِ مدینہ کی بہ نسبت زیادہ حصہ ملا۔ بعض انصار نے اسے جانب داری سے تعبیر کیا۔ جب اس کی اطلاع آپؐ کو ملی تو آپؐ نے انھیں جمع ہونے کا حکم دیا۔ پھر آپؐ نے ان سے مخاطب ہو کر ذیل کے الفاظ فرمائے۔" اے انصار! تم لوگوں کی باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ جب میں تم لوگوں کے پاس آیا تو تم تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ خدا نے میرے ذریعے سے تمھیں سیدھا رستہ دکھایا، تم عزوہ تھے، اس نے تمھیں راحت بخشی، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کی۔ مجھے بتاؤ کیا یہ درست نہیں؟"۔ انھوں نے جواب دیا۔" واقعی ایسا ہی ہے، بے شک خدا اور رسُولؐ کے ہم پر بے حد احسان ہیں۔" آپؐ نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: بخدا! تم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر تم ایسا کہتے تو سچ کہتے اور میں اس کی سچائی کی گواہی دیتا کہ 'ساری دنیا نے تجھ کو جھٹلایا اور ہم نے تیری تصدیق کی، تو ہمارے پاس بے یار و مددگار آیا اور ہم نے تیری مدد کی، تو غریب و بے خانماں تھا، ہم نے تجھے پناہ دی، تو مضطرب و پریشان تھا، ہم نے تیری ڈھارس بندھائی۔' اے انصار! متاعِ دنیا کے لیے کیوں اپنے دلوں کو پریشان کرتے ہو؟ کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ یہاں سے لوٹیں تو اونٹ اور بکریاں ہمراہ لے کر جائیں اور تم اپنے گھروں میں خدا

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر، طبری

کے رسُولؐ کو ہمراہ لے کر جاؤ۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ میں تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔ اگر ساری دنیا اکٹھی ہو کر ایک راستے پر چلے اور انصار دوسرے راستے پر چلیں تو میں انصار کے ہمراہ چلوں گا۔ اے اللہ انصار اور انصار کے لڑکوں اور ان کے لڑکوں کے لڑکوں پر رحم کرنا!" واقعہ نگار کہتا ہے کہ یہ الفاظ سُن کر سب انصار اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے "ہم سب اپنے اپنے حصہ پہ مطمئن ہیں۔" اس کے بعد مسرور و دلشاد سب لوگ رخصت ہو گئے۔

تھوڑی مدت کے بعد آنحضرتؐ نے مدینے مراجعت فرمائی۔

آٹھواں باب

عام الوفود

فَاقَ النّبِینَ فِی خلقٍ وفِی خُلُقٍ — ولم یدانوہُ فی عِلمٍ ولا کرم،
دع ما دعتہ النصاری فی نبیھم — وَاحْکُمْ مَا شِئتَ مدحاً فیہ واحتکم
(قصیدۃ البردہ)

اِنَّ الرَّسُولَ لنور یستضاءُ بِہِ
وَصَارِمٌ من سیُوفِ اللہ مسلول

(بانت سعاد)

ہجرت کا نواں سال ان وفود کی وجہ سے مشہور ہے جو پیغمبرِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جوق در جوق مدینہ میں آئے۔ حمیّتِ جاہلیت، خون کے بدلے خون اور کفر و شرک کی جو کالی گھٹا اس سرزمین پر چھائی ہوئی تھی وہ ہمیشہ کے لیے کھل گئی۔ جاہلیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔

۹ھ۔ ۲۰ راپریل ۶۳۰ئہ تا ۹ راپریل ۶۳۱ئہ

فتح مکہ نے عرب میں صنم پرستی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ جو لوگ اپنی خوبصورت چاند دیویوں، الات، مناۃ اور عُزّیٰ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے تھے بُت پرستی کے اس حصنِ حصین کے سقوط نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اہلِ مکہ کی اطاعت نے صحرا کے وحشی قبائل پر بہت گہرا اثر کیا۔ اب تک جو قبیلے مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے ان کی طرف سے اطاعت و وفاداری کا حلف اٹھانے کے لیے اطراف و اکناف سے وفود آنے لگے[1] کبار صحابہ اور مدینے کے ممتاز شہری ان سفیروں کو اپنے گھروں میں اتارتے اور عربوں

---

[1] ابو ہشام۔ ابن الاثیر

کے قدیم دستورِ مہمان نوازی کے مطابق ان کی خاطر و مدارات کرتے۔ رخصت ہوتے وقت انھیں زادِ راہ کے طور پر معقول رقمیں دی جاتیں اور ہر ایک کے رتبے کے مطابق مزید تحائف بھی پیش کیے جاتے۔ اکثر قبائل کو ان کے حقوق و مراعات کے بارے میں تحریری عہد نامے عطا کیے جاتے اور ہر وفد کے ساتھ ایک معلّم بھیجا جاتا تاکہ وہ ان نومسلموں کو ارکانِ اسلام کی تعلیم دے اور ان کے یہاں بُت پرستی کا کوئی نشان باقی نہ رہنے دے۔

جس اثنا میں یہ مدبّرِ اعظم قبائلِ عرب کو اسلامی علم کے نیچے متحد کر رہا تھا وہ ان خطرات سے بھی آگاہ تھا جو اس نئی وفاقی مملکت کو بیرونی ممالک کی طرف سے درپیش تھے۔

اس زمانہ میں اہلِ بازنطین ازسرِ نو وہی خواب دیکھ رہے تھے جنھوں نے اس سے قبل سلطنتِ روما کے بانی کو عرب میں مہیں بھیجنے پر آمادہ کیا تھا۔[1] ہرقل ایرانیوں کو شکست دے کر غرور و نخوت سے سرشار اپنے ملک واپس گیا تھا۔ عرب میں جو عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے تھے وہ اس کی سیاسی بصیرت سے چھپے نہ رہ سکتے تھے اور اس کے نائبین کے لشکرِ کثیر کو مٹھی بھر عربوں کے مقابلہ میں جو ناکامی ہوئی تھی وہ غالباً اسے کبھی نہ بھولا تھا۔ قیامِ شام کے دوران اس نے اپنے باجگزاروں کو عرب پر حملہ کرنے کے لیے ایک زبردست فوج جمع کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان تیاریوں کی خبر مدینے میں پہنچی اور مسلمانوں کے دل میں قدرے ہراس پیدا ہو گیا۔ اگر یہ خبر صحیح تھی تو دولتِ عامۂ اسلامیہ کے لیے ایک خطرۂ عظیم پیدا ہو گیا تھا۔ حملہ کے سدِ باب کے لیے تمام اطراف سے رضاکار طلب کیے گئے۔ سوءِ اتفاق سے حجاز اور نجد کو خشک سالی نے نڈھال کر رکھا تھا۔ کھجوروں کی فصل تباہ ہو گئی تھی اور باربرداری کے جانور بڑی تعداد میں مر گئے تھے۔ دیہات کے لوگ ایسے میں اپنے گھروں سے دُور کسی مہم پہ جانے کے لیے رضامند نہ تھے۔ بعضوں نے تو یہ عذر پیش کیا کہ موسم لڑائی کے لیے ناموزوں تھا۔ جو لوگ لڑنے سے جی چراتے تھے ان کے خوف کو گرمی کی شدت، سفر کی صعوبتوں اور بازنطینی سلطنت کی قوت و شہامت کے بارے میں لمبی چوڑی کہانیوں نے

---

[1] میری مراد ایلیس گیلس Aelius Gallus کے حملے سے ہے جو قیصر آگسٹس کے عہدِ حکومت میں ہُوا۔

اور بھی بڑھا دیا۔ بہت سوں نے جنگی خدمت سے مستثنیٰ قرار دیئے جانے کی درخواست پیش کو دی۔ آنحضرتؐ نے ایسے لوگوں کی درخواست منظور کرلی جو کمزوری کی وجہ سے ہتھیار نہ اٹھا سکتے تھے یا غریبی کی وجہ سے ہتھیار اور زادِراہ مہیا نہ کر سکتے تھے یا اپنے گھروں میں اکیلے مرد تھے اور گھروں کو چھوڑ کر نہ جا سکتے تھے۔[1]

بے دلوں کی نارضامندی کو منافقین کی سازشوں نے بڑھا دیا، جنھوں نے اس ناراضامندی کو بے اطمینانی کی صورت میں تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔[2] بہرحال صحابۂ کبار اور دوسرے مخلص مسلمانوں کی مثال نے بے دلوں کا حوصلہ بڑھایا اور رجی چلانے والوں کو شرمندہ کرکے ان میں جوش پیدا کر دیا۔ یہ جوش جلد ہی تمام لوگوں میں پھیل گیا۔ مصارفِ جنگ کے لیے ہر طرف سے چندے آنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا پورا اثاث البیت حاضر کر دیا۔ حضرت عثمانؓ ایک بڑے دستے کے مصارف اور اسلحہ کے کفیل ہو گئے۔ دوسرے ذی مرتبہ اور صاحب دولت مسلمانوں نے بھی ایسی ہی دریا دلی سے کام لیا۔ عورتیں اپنے جواہرات اور زیورات لے کر آئیں اور آنحضرتؐ سے ملتجی ہوئیں کہ انھیں مملکت کی ضروریات کے لیے قبول کیا جائے۔ اس طرح کافی تعداد میں فوج فراہم ہو گئی اور مجاہدین نے آنحضرتؐ کی معیت میں سرحد کی طرف کوچ کیا۔[3]

---

[1] ان لوگوں کو "البکاؤن" کا لقب دیا گیا۔ اس بنا پر کہ وہ ایک خطرناک دشمن کے خلاف جہاد میں شریک ہونے سے معذور رہنے پر گریہ و بکا کرتے تھے (ابن ہشام، الحلبی، انسان العیون)۔

[2] منافقین کی سازشوں کی مذمت سورہ توبہ ۸۳ میں کی گئی ہے۔ یہ سازشی سویلم نامی ایک یہودی کے گھر میں جمع ہوتے تھے۔ یہ گھر بعد میں تباہ کر دیا گیا۔ انہی دنوں میں آنحضرتؐ نے یہ پیش گوئی کی کہ ملتِ اسلامیہ میں ہمیشہ منافقین رہیں گے جو مؤمنین کی مخیرانہ کوششوں میں مزاحم ہوا کریں گے۔

[3] اس فوج کے فراہم کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کی مناسبت سے اُسے "جیش العسرۃ" کا نام دیا گیا۔

آنحضرتؐ نے اپنی غیر موجودگی میں مدینے کا انتظام حضرت علیؓ کو سونپا۔ عبد اللہ بن اُبی اور دوسرے منافقین ثنیۃ الوداع تک فوج کے ساتھ گئے لیکن اس کے بعد وہ آنکھ بچا کر پیچھے رہ گئے اور مدینہ واپس آ گئے۔ مدینہ میں آ کر انھوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ آنحضرتؐ مہم کے خطرات کے خوف سے حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ نہ لے گئے تھے۔ اس شرارت آمیز افواہ سے حضرت علیؓ کو بہت غیرت آئی اور وہ ہتھیار سنبھال کر فوج کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ جب آپؓ نے فوج کو جا لیا تو آنحضرتؐ کو معاملہ کہہ سنایا۔ آنحضرتؐ نے اسے ایک کمینہ بہتان سے تعبیر کیا۔ ابن ہشام لکھتا ہے: "فقال کذبوا ولکنی خلفتک لما ترکت ورائی فارجع فاخلفنی فی اھلی واھلک افلا ترضی یا علی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ"[۱]

چنانچہ حضرت علیؓ مدینے واپس آ گئے۔

مسلم مجاہدین نے گرمی اور پیاس کی وجہ سے شدید تکلیفیں سہیں۔ ایک لمبے اور کٹھن سفر کے بعد وہ تبوک[۲] پہنچے، جو مدینہ اور دمشق کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ یہاں ان لوگوں نے آرام کیا۔ وہ یہ سن کر متعجب بھی ہوئے اور انھوں نے اطمینان کا سانس بھی لیا کہ یونانی حملے کی خبر محض ایک ہوائی خبر تھی۔ شہنشاہِ یونان کو اپنے گھر ہی میں مسائل درپیش تھے۔ آنحضرتؐ نے دیکھا کہ مدینہ کی دولتِ عامہ کو کوئی خطرہ نہ تھا، تو آپؐ نے مسلمانوں کو واپسی[۳] کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے تبوک میں بیس دن تک قیام کیا۔ وہاں انھیں اپنے استعمال کے لیے کافی پانی اور باربرداری کے جانوروں کے لیے کافی چارہ میسر آیا۔ وہ رمضان کے مہینے میں مدینے لوٹے۔[۴]

آنحضرتؐ کے مدینے واپس آتے ہی طائف کے شوریدہ سر اور شقی القلب کفار کا ایک وفد

---

[۱] اہلِ تشیع ان ارشادات سے یہ نتیجہ مستنبط کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

[۲] کوسین دی پرسیوال

[۳] ابن ہشام، ابن الاثیر، ابو الفداء

[۴] کوسین دی پرسیوال کہتا ہے وسط دسمبر ۶۳۰ء۔ سورۂ نساء میں یہ واقعات بڑی صراحت سے بیان کیے گئے ہیں۔ تبوک میں بہت سے ہمسایہ سرداروں نے آ کر بیعت کی۔ ابن الاثیر

آپؐ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے آپؐ کو توہین و تشدد کے ساتھ اپنے شہر سے نکال دیا تھا۔ طائفی سردار عروہ جو واقعۂ حدیبیہ کے بعد قریش کا سفیر بن کر گئے آیا تھا، آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا تھا۔ اسے اپنے شہر کے متعصب لوگوں کی طرف سے جو خطرہ تھا آنحضرتؐ نے اسے اس سے متعدد مرتبہ متنبہ کیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ جلدی جلدی طائف واپس گیا تاکہ واپس جا کر اپنے ترکِ بت پرستی کا اعلان کرے اور اپنے ہم شہریوں کو اسلام کی برکات سے بہرہ اندوز ہونے کی دعوت دے۔ وہ شام کے وقت شہر میں پہنچا اور پہنچتے ہی شہریوں کو جمع کر کے اپنی تبدیلیٔ مذہب کا اعلان کر دیا اور انھیں شریکِ اسلام ہونے کی دعوت دی۔ دوسرے دن صبح کے وقت اس نے پھر لوگوں سے خطاب کیا۔ لیکن عُزّیٰ کے پروہت اور پجاری اس قدر مشتعل ہوئے کہ انھوں نے اسے سنگسار کر کے ہلاک کر دیا۔ اس نے مرتے دم کہا کہ میں اپنی قوم کی بھلائی کے لیے اپنا خون اپنے آقا کی نذر کرتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے شہادت کا درجہ عطا فرمایا۔ اس نے یہ وصیت بھی کی کہ اسے شہدائے حنین کے پہلو میں دفن کیا جائے[1]۔ عروہ نے جیتے جی اہلِ طائف کو قبولِ اسلام پر آمادہ کرنے کی جو کوششیں کی تھیں ان سے کہیں زیادہ اثر اس کے آخری الفاظ نے کیا۔ شہید کے خون نے اس کے قاتلوں کے دل میں چراغ ایمان روشن کر دیا۔ اہلِ طائف کو اس سے بہت پشیمانی ہوئی اور بدوی قبائل کے ساتھ جو دشمنی چلی آ رہی تھی غالباً وہ اس سے بھی تنگ آ گئے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے وہ وفد بھیجا جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ یہ وفد معافی اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کی اجازت مانگنے آیا تھا۔ لیکن اہلِ وفد نے اپنے بتوں کے لیئے تھوڑی سی مہلت کی درخواست کی: پہلے دو سال کی مہلت، پھر ایک سال کی پھر چھ مہینے کی، لیکن یہ درخواست منظور نہ کی گئی۔ اخیر میں وہ صرف ایک مہینے کی مہلت پر اُتر آئے، لیکن آنحضرتؐ اپنے موقف سے نہ ٹلے۔ اسلام اور بتوں کا ایک ساتھ موجود ہونا ناممکن تھا۔ پھر انھوں نے نماز سے بریت کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ

---

[1] ابن ہشام، ابن الاثیر۔

نے جواب دیا "جس دین میں عبادت نہ ہو اس میں اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟"[1] بالآخر انھوں نے طوعاً و کرہاً سارے مطالبات منظور کر لیے۔ بہرحال انھیں اپنے ہاتھوں بتوں کے توڑنے سے معذور رکھا گیا، اور یہ کام ابوسفیان بن حرب اور عروہ کے قرابت دار مغیرہ کو تفویض کیا گیا۔ انھوں نے طائف کی عورتوں کے نالہ و شیون کے درمیان یہ کام انجام دیا۔[2]

اب قبیلہ طے نے اپنے پروہتوں کے بھڑکانے پر سرتابی کی۔ انھیں منانے اور بتوں کے توڑنے کے لیے ایک چھوٹی سی فوج حضرت علیؓ کی سرکردگی میں بھیجی گئی۔ اس قبیلے کا سردار عدی تھا۔ جو اس حاتم کا بیٹا تھا جس کی فیاضی اور دریا دلی مشرقی ادب اور شاعری میں ضرب المثل ہے۔ حضرت علیؓ کے آتے ہی عدی شام کی طرف بھاگ نکلا، لیکن بنی طے کے چند مقتدر افراد جن میں عدی کی بہن بھی تھی، مسلمانوں کے ہاتھ قید ہوئے۔ انھیں ہر طرح کی عزت و مراعات کے ساتھ مدینہ لایا گیا۔ آنحضرتؐ نے حاتم کی بیٹی اور اس کے ہم قوموں کو فوراً آزاد کر دیا اور بیش بہا تحائف بھی عطا فرمائے۔ اس نے شام جا کر اپنے بھائی کو آنحضرتؐ کے کریمانہ سلوک کا حال سنایا۔ عدی کا دل ممنونیت سے لبریز ہو گیا اور وہ فوراً خود کو آنحضرتؐ کے قدموں میں ڈالنے کے لیے عازمِ مدینہ ہوا، اور بالآخر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ پھر اس نے واپس جا کر اپنے قبیلے کے لوگوں کو بت پرستی ترک کر دینے کی تلقین کی۔ چنانچہ بنی طے، جو کسی زمانہ میں بت پرستی کی لعنت میں بری طرح مبتلا تھے، دینِ محمدیؐ کے مخلص پیرو بن گئے۔[3]

---

[1] ابن الاثیر

[2] ابن ہشام، طبری۔ ۹ھ کو جو کثیر التعداد وفد آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی مناسبت سے اس سال کا نام "عام الوفود" پڑ گیا۔ بنی ثقیف کے قبولِ اسلام کے بعد جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ان میں یمن، مہرہ، عمان اور بحرین کے حمیری شہزادے اور یمامہ کے نزدیک آباد قبائل تھے۔

[3] ابن ہشام، ابن الاثیر، انسان العیون۔ عدی کا قبولِ اسلام ۹ھ کے ربیع الثانی (جولائی اگست ۶۳۰ء) میں واقع ہوا، لہٰذا اس کا ذکر مہم تبوک سے پہلے ہونا چاہیے لیکن میں نے عرب مؤرخین کی ترتیبِ واقعات کا تتبع کیا ہے۔ جب حاتم کی بیٹی، جس کا نام سفانہ تھا، آنحضرتؐ کی خدمت (باقی حاشیہ صفحہ ۲۰۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

اسی زمانہ میں ایک اور نمایاں شخصیت نے اسلام قبول کیا اور یہ واقعہ ایسے طریقے سے ہُوا جو تفصیلی بیان کا مستحق ہے۔ قبیلۂ مزینہ کا ایک ممتاز شاعر کعب ابنِ زُہیر اپنے قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا اور اس لیے وہ واجب القتل قرار دیا گیا تھا۔ کعب کے بھائی نے، جو مسلمان ہو چکا تھا، اسے بُت پرستی ترک کرنے اور اسلام قبول کرنے کی تاکید کی۔ کعب اس تاکید پر عمل کر کے خفیہ طور پر مدینے میں آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ بہت سے عرب ایک شخص کے گرد بیٹھے انتہائی تعظیم و تکریم سے اس کی باتیں سن رہے ہیں۔ اس نے فوراً پہچان لیا کہ یہی رسولِ خدا ہیں اور صفوں کو چیرتا ہُوا آنحضرتؐ کے قریب گیا اور بولا، "یا رسُولؐ اللہ! اگر میں کعب کو مسلمان بنا کر آپؐ کی خدمت میں حاضر کر دوں تو کیا آپؐ اسے معاف فرما دیں گے؟" آنحضرتؐ نے فرمایا "ہاں"۔ یہ سن کر کعب نے کہا "میں ہی کعب بن زہیر ہوں"۔ مجمع میں سے کئی لوگوں نے اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "ٹھہرو! میں اسے امان دے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۳ سے آگے) میں لائی گئی تو اس نے آپ سے اس طرح خطاب کیا "میرا والد وفات پا چکا ہے، میرا بھائی جو میرا سرپرست ہے، مسلمانوں کے آنے پر پہاڑوں میں جا کر روپوش ہو گیا ہے۔ میں اپنا فدیہ ادا نہیں کر سکتی، اس لیے میں اپنی آزادی کے لیے آپ سے رحم و کرم کی التجا کرتی ہوں۔ میرا باپ ایک مشہور آدمی تھا، اپنے قبیلے کا سردار تھا، قیدیوں کو آزاد کراتا تھا، عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتا تھا، غریبوں کو کھانا کھلاتا تھا، مصیبت زدوں کو تسکین دیتا تھا اور کبھی کسی کی درخواست رد نہ کرتا تھا۔ میں حاتم کی بیٹی سفانہ ہوں"۔ آنحضرتؐ نے فرمایا "تیرے باپ میں مسلمانوں کے اوصاف تھے۔ اگر مجھے اس کی اجازت ہوتی کہ کسی ایسے شخص کے لیے خدا کے رحم کی دعا مانگوں جس کی زندگی بت پرستی میں گزری ہے تو میں حاتم کی روح کے لیے دعائے مغفرت مانگتا"۔ پھر مسلمانوں کے مجمع سے مخاطب ہو کر آپؐ نے ارشاد کیا "حاتم کی بیٹی آزاد ہے۔ اس کا باپ ایک نیک اور رحم دل آدمی تھا، خدا رحمدلوں سے محبت کرتا ہے اور انہیں اجر دیتا ہے"۔ سفانہ کے ساتھ اس کی قوم کے سارے آدمی آزاد کر دیئے گئے۔ سعدیؔ نے اس واقعہ کو بوستان میں عجیب خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

چکا ہوں" اس کے بعد کعب نے اجازت لے کر ایک قصیدہ پڑھا جو ہمیشہ عربی شاعری کا شاہکار سمجھا گیا ہے[1]

اب تک کفّار کو کعبے میں داخل ہونے اور اپنی بُت پرستانہ رسوم ادا کرنے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اب فیصلہ کیا گیا کہ اس اٹل بے جوڑ بات کو ختم کر دیا جائے اور اس کا امکان سرے سے رفع کر دیا جائے کہ جو لوگ ابھی پوری طرح اسلام کے رنگ میں نہ رنگے گئے تھے وہ ازسرِنو بُت پرستی کی طرف مائل ہو جائیں۔ چنانچہ اس سال کے آخری مہینے یعنی ذوالحجہ میں قربانی کے دن (یوم النحر) آنحضرتؐ کے ارشاد پر حضرت علیؓ نے ایک بڑے مجمع کے روبرو ایک اعلان پڑھ کر سنایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ بت پرستی اور اس کی متعلقہ رسوم قبیحہ کو یک قلم ختم کر دیا جائے:۔

"اس سال کے بعد کوئی بُت پرست کعبے کا حج نہ کرے گا۔ کسی شخص کو برہنہ طواف کرنے کی اجازت نہ ہو گی[2]

جن قبائل نے رسول اللہؐ سے معاہدات کئے ہیں وہ ان کے ختم ہونے تک ان پر قائم رہیں گے۔ دوسروں کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں۔

---

[1] یہ قصیدہ اپنے شروع کے الفاظ کی مناسبت سے قصیدہ بانت سعاد کہلاتا ہے۔ تشبیب میں شاعر اپنی محبت کا دردناک قصہ بیان کرتا ہے۔ اس کی محبوبہ سعاد اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ یادل غمزدہ و پریشان اس کی تلاش میں ایک پابجولاں قیدی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا ہے۔ وہ اس کے حسن و جمال، اس کی نرم و ملائم آواز، اس کی شوخ ہنسی، اس کے دلربا تبسم کی تعریف کرتا ہے۔ گریز کے بعد قصیدہ مدحِ رسولؐ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصیدے کے الفاظ میں شروع سے آخر تک ایک ایسی شوکت و بلند آہنگی ہے جو بعد کی عربی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ الحان کے زیر و بم کو بڑی عمدگی سے قائم رکھا گیا ہے۔ جب کعب اس بیت پر پہنچا جو اس باب کا زیبِ عنوان ہے تو آنحضرتؐ نے اپنا خرقہ اُتار کر اسے دے دیا جو بعد میں کعب کے خاندان نے چالیس ہزار درہم میں امیر معاویہؓ کے ہاتھ بیچ دیا اور بنی اُمیہ اور بنی عباسؓ کے قبضے میں رہنے کے بعد اب سلطنتِ عثمانیہ کے پاس محفوظ ہے۔

[2] یہ مذموم دستور کفّارِ عرب میں عام تھا۔

اس کے بعد ان لوگوں کے سوا جن کے ساتھ معاہدے ہو چکے ہیں کسی کے بارے میں آنحضرتؐ پر کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو گی[1]"

یہ اعلان جو اعلانِ برأت کہلاتا ہے آنحضرتؐ کی دانائی و دُور اندیشی کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ معاشرے اور اخلاقِ عامہ کی اس وقت جو حالت تھی ناممکن تھا کہ اسے جاری رہنے دیا جاتا۔ اگر کفار کو اجازت دی جاتی کہ بدستور حج کے موقعے پر آ کر مسلمانوں سے ملتے رہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی فحش اور رذیل رسومات کو بجالاتے رہیں تو آنحضرتؐ نے اتنی محنت و جانفشانی سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سب ضائع ہو جاتا۔ تاریخ عربوں کی نسل کی ایک اور شاخ کو جو انھیں کی طرح غیر متمدن اور انھیں کی طرح صاحبِ جوہر تھی، بت پرستوں میں آباد ہوتے دیکھ چکی تھی۔ اس کے پیشواؤں نے یہوؔہ کی پرستش کو برقرار رکھنے کے لیے بعؔل کے پرستاروں کو گروہ درگروہ ذبح کیا تھا، لیکن پھر بھی اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ بنی اسرائیل نہ صرف اپنے ماحول کے مضر اثرات کا شکار ہو گئے تھے، بلکہ جن لوگوں کو وہ شروع شروع میں مکروہات و مذمومات پر کاربند ہونے کی وجہ سے بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے وہ ان مذمومات و مکروہات پر عمل کرنے میں ان سے بھی سبقت لے گئے آنحضرتؐ کو یہ احساس تھا کہ کفر و شرک کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت و مصالحت آپؐ کے کیے کرائے کام کو یکسر تباہ کر دے گی۔ اس لیے آپؐ نے ایک ایسا طریقہ کار اختیار کیا جو بظاہر تو درشت معلوم ہوتا تھا لیکن بلحاظِ نتائج منفعت بخش تھا۔ وہ کثیر التعداد لوگ جنھوں نے حضرت علیؓ کا خطبہ سنا اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے، لیکن آئندہ سال ابھی حج کے دن نہ آئے تھے کہ ان کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہو گئی۔

---

[1] ابنِ ہشام، ابن الاثیر، ابوالفداء۔

نواں باب

رسالتِ محمدیؐ کی تکمیل

اذا جآء نصرُاللہ والفتح ٥ ورایت النّاس یدخلون فی دین اللہ افواجا ٥ فسبّح بحمد ربّک واستغفرہ انّہ کان توّابا ٥

۱۰ھ اپریل ۶۳۱ء تا ۲۹ مارچ ۶۳۲ء

پچھلے سال کی طرح اس سال بھی عرب کے مختلف حصوں سے قبیلوں اور ان کے سرداروں کی اطاعت کا پیغام لے کر متعدد وفود بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔[۱]

آپؐ جن معلّمین کو مختلف علاقوں میں بھیجتے انھیں ہمیشہ ذیل کی ہدایات دیتے: "لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنا اور کبھی ان پر سختی نہ کرنا، انھیں بشارت دینا اور وحشت زدہ نہ کرنا۔ تمھیں بہت سے ایسے اہلِ کتاب[۲] ملیں گے جو تم سے پوچھیں گے کہ آسمان کی کلید کیا ہے۔ انھیں یہی جواب دینا کہ آسمان کی کلید حق کی شہادت دینا اور نیک کام کرنا ہے[۳]"

اب آنحضرتؐ کی رسالت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔ جاہلیت و بربریت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم میں ایک نبی مبعوث ہوا تھا "جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، انھیں بُری

---

[۱] ۱۰ھ میں یمن اور حجاز کے باقیماندہ قبائل نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد حضرموت اور کندہ کے قبائل مشرف بہ اسلام ہوئے۔

[۲] عیسائی، یہودی اور زرتشتی۔

[۳] ابن ہشام۔

باتوں سے پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا ہے، ان لوگوں کو جو اس سے پہلے کھلی تاریکی میں تھے[۱]" اس نے انھیں ذلت، خونخواری اور وہم پرستی میں غرق پایا اور ان کے سینوں میں ایک سچے اور محبت کرنے والے خدائے واحد پر ایمان پیدا کیا۔ اس نے انھیں متفرق و منتشر اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں مصروف پایا۔ اور انھیں اخوت و مروت کے رشتے میں پرو دیا۔ قدیم الایام سے جزیرہ نمائے عرب پر مکمل اخلاقی ظلمت طاری تھی، روحانیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ نہ یہودیت اور نہ عیسائیت عربوں کے دل و دماغ پر کوئی دیرپا نقوش ثبت کر سکی تھی۔ عرب توہم پرستی، جفا پیشگی اور بدکاری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محرمات سے نکاح اور بیٹیوں کو قتل کرنے کا شیطانی دستور عام تھا۔ سب سے بڑا بیٹا باپ کی دوسری جائیداد کے ساتھ اس کی بیواؤں کو بھی ورثہ میں پاتا تھا۔ انسانیت سے گرے ہوئے باپ اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے، اور یہ جرم، جو قبائل قریش و کندہ میں خاص طور پر رائج تھا، اسی طرح مایۂ فخر سمجھا جاتا تھا جس طرح ہندو راجپوتوں کے ہاں سمجھا جاتا تھا۔ حیات بعد الممات اور نیکی و بدی کی جزا و سزا کا تصور انسانی عمل کے محرکات کی حیثیت سے مفقود تھا۔ یہ تھی عرب کی حالت چند سال پیشتر۔ ان چند سالوں میں کیسی زبردست تبدیلی ہوئی تھی۔ یقیناً فرشتۂ سماوی اس زمین کے اوپر سے گذر گیا تھا اور ان لوگوں کے دلوں میں، جو نیم بربریت کی کراہت انگیز رسموں میں مبتلا تھے، ہم آہنگی اور محبت کی روح پھونک گیا تھا۔ وہی سرزمین جو کسی زمانہ میں اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ایک لق و دق بیابان تھی، جہاں خدا اور انسان کے تمام قوانین کی بے محابا خلاف ورزی کی جاتی تھی، اب تمدن و شائستگی کا گلستان بن گئی تھی۔ بت پرستی اب اپنی بے شمار قباحتوں کے ساتھ نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بڑے مذاہب میں اسلام واحد مذہب ہے جس کی ابتدائی تبلیغ ایک ایسی قوم میں ہوئی اور جس نے زیادہ تر ایک ایسی قوم پر حکومت کی جو ابھی تک بدو و تہذیب کے جھٹپٹے میں بھٹک رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے مؤثر طور پر اپنے پیروؤں کو بت پرستی سے روک دیا۔ بجا طور پر نادر الشہود واقعے کو اسلام کی شاندار ترین

---

[۱] سورۃ الجمعہ۔ ۲

کامیابی اور اس کے بانی کی حکمت و فطانت کا بیّن ترین ثبوت تسلیم کیا گیا ہے۔ ایک مدت مدید سے یہودیت اور عیسائیت عرب قبائل کو ان کے مکروہ توہمات، ان کی انسانیت سوز رسوم اور ان کی بے لگام ہوس رانی سے باز رکھنے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ لیکن جب تک انھوں نے اس مبعوث من اللہ نبی کے "روح میں ہیجان پیدا کرنے والے لفظ" نہ سُنے اس وقت تک ان کے ذہنوں میں خدائے برحق کا شعور پیدا نہ ہوا، جو ساری کائنات کو اپنے حیطۂ قدرت و محبت میں لیے ہوئے ہے۔ اس کے بعد محض حیاتِ دنیا ان کی دوڑ دھوپ کا میدان نہیں رہتی، قبر کے ماورا کوئی اور چیز ہے، اس دنیا کی تمام چیزوں سے بلند تر، پاکیزہ اور مقدس تر، جو انھیں عطا و احسان، نیکوکاری، انصاف اور ہمہ گیر محبت کی طرف دعوت دے رہی ہے۔ خدا صرف امروز و فردا کا خدا نہیں، یعنی ایک ایسا بُت جو لکڑی اور پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہے، بلکہ اس دنیا کا قدرت رکھنے، محبت کرنے والا اور رحیم و رحمن آفریدگار ہے۔ آنحضرتؐ اس نئی بیداری کا مصدر و منبع تھے، یعنی ان لوگوں کی حیاتِ ابدی کی امیدوں کا سرچشمہ اور وہ اس سرچشمے سے سیراب ہونے کے متمنی تھے۔ اب ان کی صرف ایک ہی آرزو تھی، وہ یہ کہ خلوص اور پاکیزگی سے خدا کی بندگی کریں اور زندگی کے تمام معاملات میں اس کے احکام کو بجا لائیں۔ وہ حقائق، وہ نکاتِ حکمت، وہ نصائح و احکام جن کے ذریعے گزشتہ بیس سالوں میں آنحضرتؐ وقتاً فوقتاً اپنے پیروؤں کو ہدایت کرتے رہے تھے، سب ان کے دلوں پر نقش کالحجر ہو چکے تھے اور ان کا لائحۂ عمل بن چکے تھے۔ قانون اور اخلاق متحد ہو چکے تھے۔" اس زمانے سے لے کر جب ابتدائی عیسائیت نے سوتی ہوئی دنیا کو یکدم بیدار کر دیا اور کفر کے خلاف ایک ہلاکت آفریں لڑائی لڑی، روحانی زندگی کی ایسی بیداری دیکھنے میں نہ آئی تھی، یعنی ایسا ایمان جو اُف کیے بغیر قربانیاں برداشت کرتا تھا اور ضمیر کی خاطر دنیوی مال و منال کی بربادی قبول کرتا تھا[1]"

اب آپؐ کا فریضۂ رسالت تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ یہ امر کہ آپؐ کا تمام کام آپؐ کی زندگی ہی میں مکمل ہو گیا آپؐ کو دوسرے زمانوں اور ملکوں کے پیغمبروں، حکیموں اور فلسفیوں پر ایک امتیازی

---

[1] میور، اسلام کے ایک علانیہ دشمن کا یہ بیان بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔

تفوق بخشتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ، زرتشت، ساکیہ مُنی اور افلاطون، ہر ایک کے خدا کی حاکمیت اور اپنی جمہوریتوں کے متعلق اپنے اپنے تصوّرات تھے، جن کے ذریعے وہ پستی میں گری ہوئی انسانیت کو اخلاقی زندگی کی ایک نئی بلندی پر لے جاکر کھڑا کر دینا چاہتے تھے، لیکن وہ سب کے سب اپنی آرزوئیں پوری کئے بغیر اور اپنے درخشاں خوابوں کی تعبیر دیکھے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے یا اپنے ہم جنسوں کی اصلاح کا کام خون آشام متبعین اور تاجدار شاگردوں پر چھوڑ گئے[1]۔ یہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص طور پر مقدر تھا کہ آپ نہ صرف اپنی رسالت بلکہ اپنے پیشرو نبیوں کی رسالت کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔ یہ صرف آپؐ ہی کی قسمت میں تھا کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کا کام ختم کر کے جائیں، کوئی تاجدار پیرو فرامینِ شاہی کے ذریعے آپؐ کی تعلیمات کو نافذ کرانے نہ آیا۔ کیا مسلمان یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ یہ سب کام خود خدا نے انجام دیا۔؟

وہ بے برگ و نوا مبلّغ، جو ابھی اگلے دن اپنے مولد سے جلاوطن کر دیا گیا تھا اور جسے اس جگہ سے جہاں وہ خدا کا پیغام سنانے گیا تھا پتھر مار کر نکال دیا گیا تھا، نو سال کی قلیل مدّت میں اپنی قوم کو اخلاقی اور رُوحانی ذلّت کی تاریک گہرائیوں سے نکال کر پاکیزگی اور انصاف کی بلندیوں پر پہنچا گیا۔

آپؐ کی زندگی ایک گراں قدر کام کے بعنوانِ احسن انجام دینے کی بہترین سرگزشت ہے۔ آپؐ نے ایک مردہ و افسردہ قوم میں زندگی کی رُوح پھونک دی۔ آپؐ نے باہم برسرِ پرخاش قبیلوں کے مجموعۂ متفرقات کو وحدت بخش کر ایک ایسی قوم بنا دیا جس کا محرکِ عمل حیاتِ ابدی کی امید تھی روشنی کی ہر منتشر شعاعیں اس وقت تک علیحدہ علیحدہ دلِ انسانی پر پڑی تھیں انھیں لے کر آپؐ نے ایک نقطۂ ماسکہ پر مرکوز کر دیا۔ یہ تھا آپؐ کا کارنامہ اور آپؐ نے اسے ایک ایسے ذوق و شوق اور جوش و خروش سے انجام دیا جو مخالف قوتوں سے کسی قسم کی مصالحت قبول نہ کرتا تھا اور جس کے لیے کسی ایک مقام پر پہنچ کر ساکن ہو جانا بعید از تصوّر تھا، ایک ایسی ہمّتِ مردانہ سے انجام دیا جو کسی قسم کی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتی تھی اور جو خوفِ نتائج سے بالکل بری تھی، ایک ایسی وحدتِ مقصد

---

[1] بنی اسرائیل میں یشوع، بدھوں میں اشوک، زرتشتیوں میں داریوش اور عیسائیوں میں قسطنطین۔

سے انجام دیا جس میں اپنی ذات کے خیال کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وحدتِ الٰہی کا وہ دین جس کی تعلیم گلیل کے کنارے دی گئی تھی مسخ ہو کر ایک ایسے خدا کی پرستش میں تبدیل ہو چکا تھا جو گوشت و پوست میں مجسم تھا، اور جو لوگ معلمِ ناصری کے دین کا اقرار باللسان کرتے تھے ان کے یہاں ایک دیوی کی قدیم پوجا از سرِ نو رائج ہو چکی تھی۔ معتکفِ حرا، وہ حکیمِ اُمّی جو ایک کٹر بت پرستوں کی قوم میں پیدا ہوا اُن قوموں کے دلوں پر جنھوں نے اُس کی آواز ایک بار بھی سُنی خدا کی وحدانیت اور انسانی مساوات کا اَن مٹ نقش ثبت کر گیا۔ آوازۂ جمہور کی وہ گرج جو اس کے گلے سے نکلی پروہتوں اور بادشاہوں کے استبداد کے خلاف عقلِ انسانی کی بغاوت کا نقارہ تھی۔ متخاصم مذاہب اور مستبدانہ اداروں کے اس زمانے میں، جب روحِ انسانی بعید از فہم اذعانی عقائد کے بوجھ تلے پس رہی تھی اور جسمِ انسانی اجارہ دارانہ مفادات کی ایڑیوں تلے کچلا جا رہا تھا اس نے ذات پات اور امتیازی مراعات کی حدود و فاصل کو توڑ کر رکھ دیا۔ ذاتی مفادات نے خدا اور انسان کے درمیان جو مورچے باندھ رکھے تھے اس نے انھیں ایک پھونک سے تارِ عنکبوت کی طرح اُڑا دیا، اور عبد و معبود کے باہمی تعلقات کے بارے میں تمام اجارہ داریاں ختم کر دیں۔ اس اُمّی نبی نے، جو جمہورِ نوعِ بشر کے نام پیغام لے کر آیا تھا، علم و دانش کی قدر و منزلت کا اعلان کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ قلم کے ذریعے انسان کے کارنامے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ قلم ہی کے ذریعے اس کا محاکمہ کیا جاتا ہے اور قلم ہی خدا کی نگاہوں میں اعمالِ انسانی کا آخری منصف ہے۔ اس نے انسان کی عقل اور اس کی اخلاقی قوتِ ممیّزہ سے کام لینے کی جو تاکید کی، اس کا معجزوں سے انکار، اس کا حکومتِ الٰہی کے بارے میں کاملاً جمہوری تصوّر، اس کے مذہبی مطمحِ نظر کی عالمگیری، اس کی انسانیت نواز شریعت، یہ سب چیزیں اسے اپنے پیشرووں سے ممتاز اور عصرِ جدید سے ملحق کرتی ہیں[1] اس کی زندگی اور اس کے کام کسی پردۂ اسرار میں مکتوم نہیں۔ اس کی شخصیت کے گرد جن دیوی کی کہانیوں کا کوئی جال نہیں بُنا گیا۔

جب عرب کے لوگ جوق در جوق آ کر داخلِ اسلام ہو گئے تو آنحضرتؐ نے محسوس کیا کہ آپ

---

[1] کتاب Oriental Religions

کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے[1] اور اس خیال سے کہ آپؐ کی حیات دنیوی قریب الاختتام ہے آپؐ نے الوداعی زیارت کعبہ کا ارادہ فرمایا۔ ۲۵ ذوالقعدہ (۲۳ فروری ۶۳۲ء) کے دن آنحضرتؐ مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ[2] مدینہ سے روانہ ہوئے۔ مکے پہنچ کر مناسک حج ادا کرنے سے پہلے، آپؐ نے جبل العرفات کی چوٹی پر سے ایک خطبہ ارشاد فرمایا (۹ ذوالحجہ، مارچ) جو ابدالآباد تک مسلمانوں کے دل سے محو نہ ہوگا۔

"اے لوگو! میں جو کچھ کہوں اُسے غور سے سنو، شائد آئندہ سال اور اس کے بعد پھر کبھی یہاں تم لوگوں سے میری ملاقات نہ ہوسکے۔"

"اے لوگو! تم پر ایک دوسرے کی جان و مال تا بہ قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں حرام (قابلِ احترام) ہے یقیناً عنقریب خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کا حساب طلب کرے گا۔........ اے لوگو! تمہارے عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر کچھ حقوق ہیں......ان کے ساتھ محبت و مہربانی سے پیش آؤ کیونکہ تم نے انھیں خدا کی ضمانت پر بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے ان کا جسم اپنے آپ پہ حلال کیا ہے۔"

"اپنی امانتوں میں دیانت دار رہو اور گناہ سے بچو!"

"آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے[3]۔ مقروض پر اصل کے سوا کچھ واجب الادا نہیں، اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن مطلب کا جو سود دوسروں کے ذمہ واجب الادا ہے

---

[1] سورۂ نصر۔

[2] ابن ہشام، ابن الاثیر۔ مذکور رہے کہ نوّے ہزار اور ایک لاکھ چالیس ہزار کے درمیان حاجی آپؐ کی معیت میں گئے۔ اس حج کو تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے: حجۃ البلاغ، حجۃ الاسلام، حجۃ الوداع۔

[3] ربا، یعنی جنس کی صورت میں سود ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن کاروباری یا تجارتی مقاصد کے لیے دیئے ہوئے قرضوں پر واجب نفع منع نہ تھا۔ جو لوگ اس سے واقف ہیں کہ عرب کے اقتصادی حالات کیا تھے۔ وہ اس قاعدے کی حکمت و دانائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جن اسباب کے پیشِ نظر پیغمبرؐ اسلام نے اپنے ملک میں سود خواری کی ممانعت کی انھیں اسباب کی بناء پر عیسائی علمائے دینیات سترھویں صدی کے آخر تک سود خواروں پر لعنتیں بھیجا کرتے تھے۔

اسے باطل کرتا ہوں[1] ......" "جاہلیت کے تمام انتقام خون موقوف کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ربیعہ[2] بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں ......"

"تمھارے غلام! تمھارے غلام! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ، اور اگر ان سے کوئی ایسا قصور ہو جائے جو تم معاف نہ کر سکو تو انھیں جُدا کر دو، کیونکہ وہ بھی اسی خدا کے بندے ہیں اور ان پر ظلم کرنا روا نہیں۔"

"اے لوگو! میری بات گوشِ ہوش سے سنو۔ جان رکھو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور اس رشتے کی وجہ سے کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی کی کسی شے پر اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں۔ ورنہ یہ ایک دوسرے پر ظلم ہوگا۔"

"جو لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں کو سنا دیں، جو یہاں موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ جنھیں یہ باتیں بتائی جائیں، ان لوگوں سے بہتر انھیں یاد رکھیں جنھوں نے اپنے کانوں سُنیں[3]۔"

اس خطبے میں نہ تو اتنی شاعری ہے نہ اتنا تصوّف جتنا حضرت عیسیٰؑ کے پہاڑی خطبے میں تھا، لیکن اس میں نہ صرف ایسی عملی دانشمندی ہے جو اعلیٰ طبائع کو پسند آتی ہے بلکہ ادنیٰ الطبائع کی صلاحیتوں اور زمانوں سے مطابقت بھی ہے جنھیں اخلاقی رہنمائی کے لیے مثبت اور مکمل ہدایات کی ضرورت ہوتی ہے۔

لوگوں نے جس ذوق و شوق سے آپؐ کے ارشادات کو سنا اس سے آپؐ اس قدر متاثر ہوئے

---

[1] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عباسؓ صاحبِ ثروت تھے۔ ربا اور خون کے بدلے خون کے خلاف قانون کا نفاذ کرتے وقت آنحضرتؐ نے اپنی مغلوب الغضب قوم کو اپنے افراد خاندان کے ایثار کی عملی مثال پیش کی۔

[2] ابن ربیعہ، آنحضرتؐ کے عم زاد بھائی بچپن ہی میں عورد پرداخت کے لیے بنی لیث کے خاندان کو سونپ دیئے گئے تھے۔ انھیں بنی ہذیل کے کچھ لوگوں نے بڑی بیدردی سے قتل کر دیا تھا، لیکن اس قتل کا بدلہ ابھی تک نہ لیا گیا تھا۔

[3] ہر جملے کے بعد آنحضرتؐ توقف فرماتے اور ربیعہ بن اُمیہ بن خلف بآوازِ بلند آپؐ کے الفاظ کا اعادہ کرتے، تاکہ مجمع کے سب لوگ ساری باتیں پوری طرح سن لیں۔

کہ خطبے کے اختتام پر آپؐ نے فرمایا "یا خدا! میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا اور اپنا کام پورا کر دیا !" مجمع بیک آواز پکار اُٹھا "ہاں! آپؐ نے اپنا کام پورا کر دیا" اس پر آپؐ نے فرمایا، "اے خدا! تو گواہ رہنا!" ان الفاظ کے ساتھ آنحضرتؐ نے اپنا خطبہ ختم فرمایا، جو روایات کے مطابق طوالت، فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش میں آپ اپنی مثال تھا۔ مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد آپؐ اپنے متبعین کے ہمراہ مدینے واپس آ گئے۔[1]

۱۱ھ - ۲۹ مارچ ۶۳۲ء تا ۱۸ مارچ ۶۳۳ء

آنحضرتؐ کی زندگی کا آخری سال مدینے میں گزرا۔ جو علاقے اور قبیلے اسلام قبول کر کے اسلامی مملکت کے حصے بن چکے تھے آپؐ نے انھیں منظم کیا۔ اگرچہ شام و عراق کے زیادہ تر عرب ابھی تک عیسائی تھے، لیکن تمام عرب داخلِ اسلام ہو چکا تھا۔ مختلف صوبوں اور قبیلوں میں فرائض اسلام کی تعلیم دینے، عدالت کرنے اور جزیہ وصول کرنے کے لیے حکام بھیجے گئے۔ معاذ ابن جبل یمن بھیجے گئے اور انھیں رخصت کرتے وقت آنحضرتؐ نے یہ ہدایت کی کہ نظم و نسق کے معاملات میں اگر انھیں قرآن سے سند نہ ملے[2] تو اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کریں۔ حضرت علیؓ کو یمن بھیجتے ہوئے آپؐ نے فرمایا "جب لوگ کوئی معاملہ لے کر تمھارے پاس آئیں تو فریقین کی بات سُنے بغیر فیصلہ نہ کرنا"

اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں اس مقصد سے بازنطینیوں کے خلاف ایک مہم بھیجنے کی تیاریاں کی گئیں کہ شام میں مسلم سفیر کے قتل کا خون بہا جو ایک مدت سے واجب الوصول چلا آ رہا تھا،

---

[1] عبداللہ بن ابی سرغنۂ منافقین نے ذوالقعدہ (فروری ۶۳۱ء) میں انتقال کیا۔ مرتے وقت اس نے آنحضرتؐ سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ آنحضرتؐ کسی قریب مرگ شخص کی درخواست رد نہ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ نے آپ کو عبداللہ کی مخالفت اور افترا پردازی یاد دلائی۔ پھر بھی آپ نے اس کے حق میں دعا مانگی اور اپنے ہاتھوں سے اُسے قبر میں اُتارا۔

[2] حدیث معاذ میں قرآن کے ساتھ سنت کا لفظ بھی ہے۔ دیکھیے: ترمذی ابوداؤد اور دارمی۔ باب الاقضیہ - (ادارہ)

وصول کیا جائے۔ فتح شہر کے بار شیہ شاہ سے کوچ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ لیکن خیبر میں ایک یہودن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو زہر دیا تھا اور جو آہستہ آہستہ جسم میں سرایت کر گیا تھا، اس کے اثرات اب ظاہر ہونے لگے اور یہ دکھائی دینے لگا کہ اب آپؐ کی زندگی کے زیادہ دن باقی نہیں۔ اس لیے مہم کو روک دیا گیا۔ آپؐ کی علالت کی خبر سے دور افتادہ صوبوں میں بدنظمی بھی پیدا ہو گئی۔ نبوت کے تین جھوٹے دعویدار اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ نبوت کا سوانگ رچا کر اور شہ پا کر اور بغاوت کر کے اپنا دور دورہ قائم کریں۔ انھوں نے اپنے قبیلوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی جعلسازیوں سے کام لیا۔ ان میں سب سے زیادہ خطرناک الاسود بن کعب تھا، وہ یمن کا سردار تھا، امیر کبیر، چالاک و ہوشیار اور شعبدہ بازی میں طاق۔ سادہ لوح قبائلیوں نے اس کے شعبدوں کو معجزے سمجھا اور اس کی اطاعت قبول کر لی چنانچہ وہ ان کی مدد سے گردونواح کے کئی شہر فتح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے شہر کو قتل کر دیا جسے آنحضرتؐ نے اس کے باپ بازان کی جگہ، جس کی موت انہی دنوں میں واقع ہوئی تھی، صنعا کا حاکم مقرر کیا تھا۔ بازان خسروانِ ایران کے ماتحت یمن کا وائسرائے تھا اور قبولِ اسلام کے بعد آنحضرتؐ نے اسے اس عہدے پر قائم رہنے دیا تھا۔ اپنی زندگی میں اسے نہ صرف ان ایرانیوں پر جو یمن میں آباد تھے اور ابنا کہلاتے تھے بلکہ وہاں کے عربوں پر بھی بہت اثر و رسوخ حاصل رہا تھا، چنانچہ اس کی مثال کی تقلید میں یمن کے تمام ایرانی داخل اسلام ہو گئے تھے۔ جعلساز اسود نے شہر کو قتل کر کے اس کی بیوہ مرزبانہ سے جبراً شادی کر لی تھی۔ ایک رات جب وہ رنگ رلیاں منانے کے بعد شراب کے نشے میں دھت پڑا تھا ابنا نے اسے مرزبانہ کی مدد سے قتل کر دیا۔ باقی دو مدعیانِ نبوت، طلیحہ بن خویلد اور ابوثمامہ حران بن حبیب معروف بہ مسیلمہ کی سرکوبی حضرت ابوبکرؓ کے مسند نشینِ خلافت ہونے کے بعد ہوئی۔ مسیلمہ نے آنحضرتؐ کو ذیل کا خط لکھنے کی جسارت کی:۔

"خدا کے رسول مسیلمہ کی طرف سے خدا کے رسول محمدؐ پر سلام! میں تمہارا شریک کار رسول، اقتدار ہم دونوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ آدھی مملکت میری ہو اور آدھی تمہاری۔ لیکن قریش غاصب لوگ ہیں اور انصاف کے عادی نہیں۔" آنحضرتؐ نے جو جواب دیا وہ آپؐ کے علوِ طبع کا مظہر

ہے:۔" خدائے رحمٰن و رحیم کے نام پر، محمد رسولؐ اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کی طرف۔ سلام ہو اُن پر جو سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ زمین خدا کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اُسے عطا کرتا ہے۔ فلاحِ آخرت صرف اہلِ تقویٰ کے لیے ہے۔"

آنحضرتؐ نے اپنے آخری ایام ایک نمایاں سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب سے گزارے جس کی بدولت آپؐ ضعف و نقاہت کے باوجود وفات سے تین دن قبل تک نماز کی امامت کرتے رہے۔ ایک روز آدھی رات کے وقت آپؐ جنت البقیع میں، جو آپؐ کے بہت سے پُرانے رفقاء کی آخری آرامگاہ تھی، تشریف لے گئے اور رو رو کر ان کے لیے دعائے مغفرت مانگتے رہے۔ علالت کے دوران قیام کے لئے آپؐ نے حضرت عائشہؓ کا مکان انتخاب کیا، جو مسجد سے متصل تھا۔ اور جب تک آپؐ میں تاب و تواں باقی رہی آپؐ جماعت کے ساتھ شریکِ نماز ہوتے رہے۔ جب آپؐ آخری مرتبہ مسجد میں تشریف لے گئے تو آپؐ کے عم زاد بھائی حضرت علیؓ اور حضرت فضل بن عباسؓ آپؐ کو سہارا دیئے ہوئے تھے۔ جو لوگ آپؐ کے آس پاس تھے ان سب نے دیکھا کہ آپؐ کے چہرے پر ایک پُرسکون تبسم ہے۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد آپؐ نے مجمع سے یوں خطاب کیا:۔ "مسلمانو! اگر میں نے تم میں سے کسی پر کوئی زیادتی کی ہے تو میں اس کے قصاص کے لیے حاضر ہوں۔ اگر مجھے کسی کا کچھ دینا ہے تو میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔" مجمع میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر تین درہموں کا مطالبہ کیا جو اس نے آنحضرتؐ کے ارشاد پر کسی غریب شخص کو دیئے تھے آپؐ نے تین درہم فوراً ادا کر دیئے اور فرمایا "اس دنیا میں شرمسار ہونا آخرت میں شرمسار ہونے سے بہتر ہے۔" پھر آپؐ نے حاضرین کے حق میں اور ان مسلمانوں کے حق میں جو دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے دُعائے خیر مانگی۔ سب کو فرائضِ دینی کی بجا آوری اور قیامِ صلح و امن کی ہدایت کی اور قرآن کے ان الفاظ پر خاتمۂ کلام کیا: "دارِ آخرت ہم اُن لوگوں کے لیے خاص کرتے ہیں جو تکبر اور فساد نہیں کرتے۔ آخرت کی بھلائی متقیوں کے لئے ہے[۱]" (القصص ۸۳)

اس کے بعد آپؐ کبھی مسجد میں تشریف نہ لے جا سکے۔ آپؐ کی نقاہت سرعت سے بڑھتی چلی گئی۔

---

[۱] ابن الاثیر، طبری

دوشنبے کو دوپہر کے وقت (۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ - ۸ جون ۶۳۲ء کے دن) خشوع و خضوع سے زیرِ لب دُعا مانگنے کے عالم میں اس پیغمبرِ اعظم ؐ کی روح عالمِ قدس میں "الرفیق الاعلیٰ من الجنّۃ" کے پاس پہنچ گئی۔

یوں ختم ہوئی ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک خدا اور اس کی مخلوق کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ کیا اور کوئی زندگی ایسی نظر آتی ہے جو اتنی آزمائشوں اور تحریصوں سے گذر کر اتنی بلندی تک پہنچی ہو؟ کیا اور کوئی زندگی ایسی ہے جو اتنے مخالفانہ حملوں کا ہدف بنی ہو اور جسے پھر بھی کوئی گزند نہ پہنچا ہو؟ وہ جو ایک بے جاہ و حشم مبلّغ تھا عرب کا فرماں روا، کسراؤں اور قیصروں کا ہمسر اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بن گیا۔ لیکن اس کی فطرت و سیرت کے امتیازی اوصاف وہی رہے ـــــ وہی انکسار و فروتنی، وہی کریم النفسی، وہی پاکیزہ دلی، وہی زہد و قناعت، وہی نفاست و لطافتِ احساس، ادائے فرض میں وہی جاں فشانی یعنی تمام وہ خوبیاں اور محبوبیاں جنھوں نے اُسے "الامین" کا لقب دلوایا تھا۔ اپنی ابتدائی زندگی میں ایک مرتبہ، جب آپ مکے کے ایک بارسوخ شہری سے مذہبی گفتگو میں مصروف تھے تو آپ ایک نابینا طالبِ حق کی طرف متوجہ نہ ہوئے تھے جو آپ سے ہم کلامی کا آرزومند تھا۔ آپ ہمیشہ تاسّف و پشیمانی کے ساتھ اس واقعے کا ذکر کرتے اور یہ اعلان کرتے رہے کہ خدا نے آپ کے عمل کو ناپسند فرمایا[1]۔ ایک ایسی

---

[1] اسی واقعہ کی طرف سورۂ عبس میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

"پیغمبر چیں بجبیں ہو گیا اور متوجہ نہ ہُوا، کیونکہ اس کے پاس اندھا آیا۔ اے پیغمبر! تجھے کیا خبر کہ شاید وہ پاک ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی۔ جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے، اس کی طرف تو تو خوب متوجہ ہوتا ہے حالانکہ تجھ پر کوئی الزام نہیں اگر وہ پاک و صاف نہ بن جائے اور جو شخص خدا سے ڈر کر تیرے پاس دوڑتا ہُوا آتا ہے تو اس سے بے اعتنائی برتتا ہے۔ آئندہ ایسا ہرگز نہ کیجیو......"

اس سورہ کے نزول کے بعد جب کبھی آنحضرتؐ اس نابینا (عبد اللہ ابن ام مکتوم۔ مترجم) کو دیکھتے تو اس کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتے اور فرماتے "اس شخص کا آنا میرے سر آنکھوں پر جس کی خاطر میرے خدا نے مجھے تنبیہ کی۔" آپ نے اسے دو مرتبہ مدینے کا عامل مقرر کیا۔

پاکیزہ ، ایسی رفیق و شفیق اور ساتھ ہی ساتھ ایسی عالی ہمت طبیعت کو دیکھ کر دل میں نہ صرف عزت ، بلکہ محبت پیدا ہوتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ عرب مصنفین بڑے فخر سے ابو عبد اللہ کے محاسنِ اخلاق اور فراست و کیاست کا تذکرہ کرتے ہیں۔ بڑوں کے ساتھ آپؐ کی تواضع، چھوٹوں کے ساتھ آپؐ کی نرمی و شفقت اور متکبروں کے ساتھ آپؐ کا پُر وقار طرزِ عمل آپؐ کو ہر کسی سے تحسین کا خراج دلواتا۔ آپؐ کا چہرہ آپؐ کی نیک دلی کا آئینہ تھا۔ صحیفۂ فطرت کا یہ عالمِ متبحر، اُمّی ہونے کے باوجود، ایک وسیع قلب کا مالک تھا، جسے روحِ کائنات کے ساتھ گہرے رابطے نے بلندی بخش دی تھی اور جسے عالم و اُمّی دونوں پر یکساں اثر انداز ہونے کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ آپؐ کے چہرے پر ایک شاہانہ تمکنت اور ذکاوت و ذہانت برستی تھی جو ہر اس شخص کو جو آپؐ سے ملتا عزت و محبت سے مملو کر دیتی۔[1]

آپؐ کی حیرت انگیز عالی طبعی، آپؐ کی لطافتِ احساس، آپؐ کی نفاستِ جذبات، آپؐ کی پاکیزگی و راست بازی احادیث کے مستقل موضوع ہیں۔ آپؐ اپنے سے ادنیٰ کے ساتھ بڑی نرمی و دلجوئی کے ساتھ پیش آتے تھے اور کبھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی آپؐ کے ذاتی خدمت گار کو جھڑکے خواہ وہ کچھ بھی کرے۔ آپؐ کے خدمت گار انس رضؓ کہتے ہیں "میں دس سال تک رسول اللہؐ کی خدمت میں رہا اور اس تمام عرصے میں آپؐ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہی۔[2]" آپؐ کو اپنے کنبے والوں سے بڑی محبت تھی۔ آپؐ کے ایک بیٹے نے اپنی کھلائی کے دھوئیں سے بھرے ہوئے گھر کے اندر آپؐ کی گود میں دم توڑا۔ آپؐ کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ آپؐ اکثر راستہ چلتے ہوئے انھیں روک لیتے اور ان کے گالوں کو پیار سے تھپکتے۔ آپؐ نے زندگی بھر کبھی کسی پر ہاتھ نہ اُٹھایا۔ سخت ترین کلمات جو آپؐ نے کبھی اثنائے گفتگو میں کسی کی بابت کہے یہ تھے "اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی پر کیچڑ![3]" جب آپؐ سے کسی پر لعنت بھیجنے کو کہا جاتا تو آپؐ فرماتے "میں دنیا کے لیے

---

[1] مشکوٰۃ

[2] مشکوٰۃ

[3] لین پول نے آنحضرتؐ کے شمائل و خصائل کا ایسا عمدہ اور صحیح نقشہ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔"
آپؐ بیماروں کی عیادت کو جاتے، ہر جنازے میں شریک ہوتے، غلاموں کی دعوت بھی

(بقیہ حاشیہ ص۲۱۸) پیش کیا ہے کہ میں اُس کا اقتباس دیئے بغیر نہیں رہ سکتا :۔ "اس شخص میں ہمت و شجاعت کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی ملائمت و لطافت تھی کہ اس کے بارے میں رائے قائم کرتے وقت ہمیشہ یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ اس قبیل کی طبیعت انسان کے دل میں عزت بلکہ محبت کے جو جذبات پیدا کرتی ہے اس سے انسان کی قوتِ فیصلہ کہیں غیر شعوری طور پر متاثر نہ ہو جائے یہ شخص جس نے سالہا سال تک تن تنہا اپنی قوم کی مخالفت کا مقابلہ کیا وہی شخص ہے جس نے کبھی اپنا ہاتھ کسی کے دوستانہ مصافحہ سے نہ ہٹایا، وہ شخص ہے جو بچوں کا محبوب تھا اور جس نے کبھی ایسا نہ کیا کہ اگر راہ چلتے اسے بچوں کا کوئی چھوٹا سا گروہ ملا تو اس نے اُن کی طرف مسکرا کر نہ دیکھا ہو اور ان سے شفقت و محبت کی دو باتیں نہ کی ہوں، جن میں اس کی شیریں آواز لطف و مہربانی کی اور بھی زیادہ چاشنی ملا دیتی تھی۔ اس کی بے لاگ دوستی، اس کی کریمانہ فیاضی، اس کی بے خوف جرأت، اُس کی عالی ہمت رجائیت، یہ سب اوصاف تنقید کو تحسین میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک والہانہ جوش و خروش تھا، ان مستحسن معنوں میں جن میں جوش و خروش انسان کی ایک صفتِ حمیدہ ہوتی ہے، یعنی وہ واحد صفت جو انسانوں کو اپنی زندگیاں نباتات و جمادات کی طرح بے مصرف گزار دینے سے بچاتی ہے۔ جوش و خروش کا استعمال اکثر مفسدانہ طور پر کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت جب وہ ذمیم مقاصد سے وابستہ ہو یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ بنجر زمین میں ہل چلانے کے مترادف ہوتا ہے اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محمدؐ کا جوش و خروش اس قسم کا نہ تھا۔ اس نے جوش و خروش سے ایسے میں کام لیا جب جوش و خروش دنیا میں انقلاب کی آگ لگا دینے کا واحد وسیلہ تھا اور اس کا جوش و خروش ایک اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کا ایک افضل طریقہ تھا۔ وہ ان معدودے چند خوش اقبال لوگوں میں تھا جنھیں ایک عظیم صداقت کو اپنا سرچشمۂ حیات بنانے کی سعادتِ غیر مترقبہ نصیب ہوئی۔ وہ خدائے واحد کا پیغمبر تھا، اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس نے اس امر کو فراموش نہ کیا اور نہ اس نے اس پیغام کو فراموش کیا جو اس کا مدارِ زندگی تھا۔ اس نے اپنی قوم کو جو بشارت دی وہ ایک ایسے عظیم الشان وقار کے ساتھ دی جس کا سرچشمہ وہ احساس تھا جو اُسے اپنے اُونچے منصب کے بارے میں تھا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسے انکسار سے دی جس کی بنیاد اس کا ایک انسانِ ضعیف البنیان ہونے کا شعور تھا۔"

قبول کرتے، اپنا لباس اپنے ہاتھوں سے رفو کرتے، اپنی بکریاں خود دوہتے اور اپنے سارے کام خود کرتے۔ مصافحہ کرتے وقت آپؐ کبھی دوسرے کا ہاتھ نہ چھوڑتے جب تک وہ خود نہ چھڑاتا اور اس وقت تک رخصت نہ ہوتے جب تک دوسرا رخصت نہ ہوتا۔ آپؐ کا ہاتھ سب سے زیادہ سخی، آپؐ کا سینہ سب سے زیادہ پُرہمت اور آپؐ کی زبان سب سے زیادہ راست گو تھی۔

آپؐ جس کسی کی حمایت کا وعدہ کرتے اس کی حمایت میں سب سے زیادہ استوار رہتے۔ آپؐ کی گفتگو سب سے زیادہ شیریں اور دلنواز تھی۔ جو کوئی آپؐ سے ملتا اس کا دل جذبۂ احترام سے لبریز ہو جاتا۔ جو لوگ آپؐ کے قریب آتے وہ آپؐ کے والہ و شیدا ہو جاتے۔ جو لوگ آپؐ کا تذکرہ کرتے وہ یہی کہتے "میں نے اگلوں اور پچھلوں میں نہ ایسا کوئی اور شخص دیکھا نہ اس کا حال سُنا۔" آپؐ نہایت کم گو تھے اور جب آپؐ گفتگو کرتے تو اس طرح سوچ سوچ کر اور بات پر زور دے دے کر کہ سننے والا کبھی آپؐ کی بات نہ بھولتا۔ "تواضع و دلنوازی، صبر و تحمل، ایثار اور سخاوت، یہ تھیں وہ صفات جو آپؐ کے کردار سے ٹپکتی تھیں اور جو ہر ایک کے دل کو مسخّر کر لیتی تھیں۔ محروموں اور غمزدوں سے آپؐ بڑی دلجوئی اور ہمدردی سے پیش آتے ...... عسرت کے دنوں میں بھی آپؐ دوسروں کو اپنے کھانے میں شریک کرتے اور اپنے اردگرد کے لوگوں کے آرام کا حد درجہ خیال رکھتے۔" اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شخص بھی آپؐ کو راستے میں روک کر اپنا دُکھڑا سنانا چاہتا تو آپؐ کھڑے ہو کر اس کی بات اوّل سے آخر تک سنتے۔ آپؐ کم مایہ سے کم مایہ لوگوں کے بھی گھر جا کر غم و مصیبت کے وقت انہیں تسلی دیتے۔ ادنیٰ ترین غلام بھی آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آپؐ کو لے جاتے تاکہ آپؐ اُن کے آقاؤں سے بدخوئی کی تلافی کرائیں یا غلامی سے رہائی دلوائیں۔[1] آپؐ خدا سے دُعا کئے بغیر کبھی کھانا کھانے نہ بیٹھے اور خدا کا شکر ادا کئے بغیر کبھی دسترخوان سے نہ اُٹھے۔ آپؐ نے اپنے اوقات کو بڑی باقاعدگی سے تقسیم کر رکھا تھا۔ دن کے وقت، نماز کے اوقات کے علاوہ، آپؐ لوگوں سے ملاقات کرتے اور حکومت کا کاروبار انجام دیتے۔ رات کو آپؐ بہت تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتے اور باقی رات عبادت میں گزارتے۔ آپؐ کو غریبوں سے محبت تھی اور آپؐ اُن کی عزت کرتے تھے۔ بہت سے

1۔ حیات القلوب (شیعہ) روضۃ الاحباب (سنّی)

بے خانماں لوگ رات کو مسجد میں سوتے، جو آپؐ کے گھر سے ملحق تھی۔ ہر شام آپؐ کا معمول تھا کہ آپؐ اُن میں سے چند ایک کو بُلا کر اپنے غریبانہ کھانے میں شریک کرتے۔ باقی لوگ آپؐ کے سر برآوردہ صحابہؓ کے مہمان بنتے۔[1] آپؐ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی عفوو درگزر اور رحم و کرم کا سلوک کرتے۔ اگرچہ آپؐ مملکت کے دشمنوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کرتے لیکن جہاں تک آپؐ کی ذات کا تعلق تھا آپؐ فتح و کامیابی کی گھڑیوں میں، جو دلِ انسانی کے لیے آزمائش کی گھڑیاں ہوتی ہیں، کیا استہزاء، کیا توہین، کیا زیادتیاں، کیا ظلم و ستم سب کچھ فراموش کر دیتے اور بدترین مجرموں کو بھی معافی بخش دیتے۔

آپؐ کی عادات میں انتہا درجے کی سادگی و بے تکلفی تھی۔ آپؐ کا طریقِ بود و باش، آپؐ کا لباس، آپؐ کے گھر کا سامان سب میں اخیر تک ایک بدویانہ سادگی رہی۔ ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ کئی کئی وقت آپؐ فاقے سے رہتے۔ اکثر آپؐ کا گزارہ صرف کھجوروں اور پانی پر ہوتا تھا۔ ایسا بارہا ہوا کہ مہینوں تک ناداری کی وجہ سے آپؐ کے گھر میں آگ نہ جلی۔ مسلمان مؤرخین کہتے ہیں کہ خدا نے دنیا کے خزانوں کی کنجیاں آپؐ کے سامنے رکھ دی تھیں، لیکن آپؐ نے انھیں قبول نہ کیا۔

اس حیرت انگیز معلم کا دماغ اپنی عقلیت نوازی اور ترقی پسندی کے اعتبار سے عہدِ جدید کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس کی تعلیم کے مطابق دائمی جدوجہد انسانی زندگی کا ایک لازمہ ہے۔ لیس للانسان الا ما سعیٰ اور السعی منّی والاتمام من اللہ۔[2] یہ تھے اس کے بنیادی سبق۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ دنیا ایک قرینے سے ترتیب دی ہوئی تخلیق ہے جس کا انتظام و اہتمام ایک عقلِ کل کر رہی ہے جو ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس نے اعلان کیا: کل امرٍ مرھونٌ باوقاتھا۔ لیکن اس کے باوجود انسانی ارادہ اپنی نجات کی کوشش کرنے کے لیے آزاد ہے۔ اس کی ہمدردی آفاق گیر تھی۔ اُسے اسی لیے رحمۃ للعالمین کا لقب ملا کہ

---

[1] ابوالفدا۔ الحلبی "انسان العیون"۔

[2] یہ حدیث نہیں قول ہے۔

اس نے ساری مخلوقات کے حق میں خدا سے رحمت کی دُعا کی۔ وہی تھا جس نے یہ کہا تھا کہ ایک زندگی کا بچانا ساری نوعِ انسانی کے بچانے کے برابر ہے۔

اس کا معاشرتی تصور تعمیری تھا، تخریبی نہ تھا۔ انتہا درجے کی روحانی از خود رفتگی کی کیفیت میں بھی اس نے کبھی عائلی زندگی کے تقدس کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس کے نزدیک خدمتِ خلق افضل العبادات تھی۔ اس نے اپنے پیروؤں کو کبھی یہ تلقین نہ کی کہ جن لوگوں کی طرف سے اُن پر فرائض عاید ہوتے تھے ان کا ساتھ چھوڑ دیں، بلکہ اس نے ہمیشہ انھیں یہی تعلیم دی کہ وہ ان فرائض کو ادا کر کے ثواب و اجر کمائیں۔ بچے اس کی نگاہ میں خدا کی امانت تھے اور ان کا محبت و شفقت سے پالنا پوسنا ایک خدائی فرض تھا۔ اسی طرح بچوں کا فرض تھا کہ والدین سے عزت و محبت سے پیش آئیں۔ اس کے مقرر کیے ہوئے دائرۂ فرائض میں رشتہ دار، ہمسائے اور غربا و مساکین سبھی داخل تھے۔

اُسے اپنا پیغام دیتے ہوئے چودہ صدیاں گذر گئی ہیں، لیکن جو محبت و عقیدت اس نے لاتعداد انسانوں کے دلوں میں پیدا کی مرورِ زمانہ سے اُس میں کوئی فرق نہیں پڑا، اور اس کے متبعین کے دلوں میں اور ان کی زبانوں پر جس طرح اُس وقت یہ الفاظ تھے اسی طرح اب بھی ہیں:

رُوحِي فِدَاكَ يَا رَسُولَ اللّٰه۔

دسواں باب

مسئلۂ خلافت

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرّقوا!

وہ رُوحانی زندگی جو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی قوم میں پھونک دی تھی آپؐ کی وفات کے ساتھ ختم نہ ہوگئی۔ شروع ہی سے یہ ایک رکنِ ایمان تھا کہ جہاں کہیں نمازِ باجماعت ادا کی جارہی ہو وہاں آپؐ روحانی طور پر موجود ہوتے ہیں اور آپؐ کے جانشین آپؐ کے رُوحانی نمائندے تھے۔ ہادیٔ اسلام کی رُوح کا مسلمانوں کی نمازوں میں ہر جگہ موجود ہونا وہ رشتہ ہے جو انسان کی رُوح اور ذاتِ باری کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔ خاندانی رقابتوں اور فرقہ وارانہ تنازعوں کے باوجود آپؐ کی رُوحانی موجودگی کے اس صوفیانہ تصور نے دینِ اسلام کو ایک ایسی قوت وسالمیت بخشی ہے جس کے بارے میں جتنا کچھ بھی کہا جائے کم ہے۔[1]

دو بڑے فرقے جن میں اسلام ایک ابتدائی مرحلے ہی میں تقسیم ہوگیا اس پر متفق ہیں کہ شریعت نے جو مراسم و فرائض مقرر کئے ہیں اُن کے کما حقہٗ ادا کئے جانے کا دار و مدار پیغمبرِ اسلامؐ کے ایک نمائندہ و نائب کی موجودگی پر ہے، جو دین و ملت کا امام ہوتا ہے۔

ائمۂ اہلِ بیت کے متبعین نے اپنا ہی ایک فلسفہ وضع کیا ہے جو اہلِ سنت کے عقیدے سے بالکل مختلف ہے۔ اُن کی رائے میں آنحضرتؐ کا ورثہ روحانی حضرت علیؓ کو ملا اور پھر حضرت فاطمہؓ کے بطن سے ان کی جو اولاد تھی اس کو ملا۔ اُن کے نزدیک امامت بامرِ الٰہی سلسلہ بہ سلسلہ خاندانِ

---

[1] آنحضرتؐ کی رُوح کا نمازوں میں موجود رہنا قطعی اسلام کا رکن نہیں۔ تعجب ہے فاضل مصنف نے اُسے آرٹیکل آف فیتھ کیونکر قرار دیا ہے۔ (ادارہ)

نبویؐ میں چلی آرہی ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کو برحق تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ، جنھیں خود رسُولِ خدا نے اپنا جانشین کہا، بربنائے حق پہلے خلیفۃ المسلمین اور امام المومنین تھے اور اُن کی شہادت کے بعد رُوحانی پیشوائی اُن کی اور حضرت فاطمہؓ کی اولادِ نرینہ کو یکے بعد دیگرے ملی، تاآں کہ یہ سلسلہ گیارھویں امام یعنی امام حسن عسکری تک پہنچا، جن کی وفات عباسی خلیفہ معتمد کے زمانے میں ۲۶۰ھ یا ۲۶۴ھ میں ہوئی۔ امام حسن عسکری کی وفات پر امامت اُن کے بیٹے محمد المہدی کے حصے میں آئی، جو امامِ آخر الزمان تھے۔ خانوادۂ نبویؐ کے ان اماموں کی داستان بڑی دردناک ہے۔ امام حسنؑ کے والد کو جابر متوکل نے مدینے سے سامرہ جلاوطن کردیا اور مرتے دم تک وہیں قید رکھا۔ اسی طرح متوکل کے جانشینوں کے حسد و رشک کی وجہ سے امام حسنؑ مدتوں تک قید رہے۔ ان کا بیٹا، جو ابھی صرف پانچ برس کا تھا، انھیں تلاش کرتے کرتے ایک غار میں داخل ہوا جو اُن کے گھر کے قریب ہی تھا۔ اُس غار سے وہ پھر کبھی واپس نہ آیا۔ اس حادثۂ دلگداز کی رقّت انگیزی اُس اُمید کا سرچشمہ بنی جو شیعوں کے سینوں میں مدتوں تک زندہ رہی کہ یہ معصوم بچہ ایک دن واپس آکر دنیا کو فسق و فجور اور ظلم و ستم سے پاک کرے گا۔ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں، جب ابن خلدون اپنی عظیم کتاب کی تصنیف میں مصروف تھا، شیعہ لوگ شام کے وقت اس غار کے منہ کے سامنے جمع ہوکر اس بچے سے واپسی کی التجائیں کیا کرتے تھے۔ ایک طویل اور حسرت آگیں انتظار کے بعد وہ مایوس ہوکر اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے تھے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ یہ اُن کا آئے دن کا معمول تھا۔ جب ان سے کہا جاتا کہ بچے کا اتنی مدت تک زندہ رہنا محال تھا تو وہ جواب دیتے کہ اگر حضرت خضر زندہ رہ سکتے تھے تو اُن کا امام کیوں زندہ نہ رہ سکتا تھا[۱]۔ اس امام کو اہلِ تشیع امام منتظر، حجّۃ اور قائم کے القاب سے پکارتے ہیں۔

مذاہب کا کوئی فلسفی مزاج طالبِ علم ضرور محسوس کرے گا کہ کیا شیعہ اور کیا سُنّی دونوں کے عقائد پُرانے عقائد سے ایک عجیب و غریب مشابہت رکھتے ہیں۔ زردشتیوں کے یہاں سلجوقی حکمرانوں کے جبر و تشدد نے اس عقیدے کو جنم دیا کہ ایک مبعوث من اللہ نجات دہندہ، جس کا نام سوسیوشس تھا، خراسان سے خروج کرے گا اور انھیں غیر ملکی حکمرانوں کے پنجۂ ستم سے رہائی دلائے گا۔ کچھ اسی قسم کے اسباب نے یہودیوں کے سینوں میں مسیحا کی آمد کی پُرتب و تاب اُمیدیں پیدا کیں۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ

مسیحا کا ظہور ابھی نہیں ہُوا۔ اسی طرح سُنّیوں کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا نجات دہندہ ابھی پیدا نہیں ہُوا۔ عیسائیوں کا ایمان ہے کہ نجات دہندہ ایک بار آ کر جا چکا ہے، لیکن دوبارہ آئے گا۔ عیسائیوں کی طرح اثنا عشری امام مہدی کے ظہورِ ثانی کے منتظر ہیں، جو دنیا کو شر اور ظلم سے پاک کریں گے۔ ان تصورات کی اصل و ابتداء اور ان کے تنوّع کی وجوہات ایک ہی قسم کے اسباب میں ملتی ہیں۔ جس دَور میں امام مہدی کا تصوّر جدا جدا صورتوں میں شکل پذیر ہُوا، اس کے مظاہر ان مظاہر سے مشابہہ تھے جو قدیم تر مذاہب کی تاریخ میں رُونما ہوئے۔ عیسوی اور یہودی دنیا کی طرح دنیائے اسلام میں بھی ایک ہادیٔ موعود کے آنے اور آ کر دنیا کو معصیت اور مصیبت سے نجات دلانے کی دُعائیں ہر شام گنبدِ نیلی میں گونجتی ہیں۔

شیعوں کا ایمان ہے کہ ان کا امام اگرچہ غائب ہے پھر بھی ان کی عبادتوں میں رُوحانی طور پر موجود ہوتا ہے۔ مفسرانِ شریعت اور پیشوایانِ دین رُوئے زمین پر اس کے نائب ہیں، بلکہ سربراہانِ حکومت بھی دنیوی معاملات میں اُس کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ایک اور چیز جو سُنّیوں اور شیعوں میں مابہ الاختلاف ہے یہ مسئلہ ہے کہ امام میں کون کون سے اوصاف کا موجود ہونا لازمی ہے۔ شیعوں کے نزدیک امام کو معصوم یعنی بری از گناہ ہونا چاہیے اور ان کی رائے میں یہ وصف صرف ان کے ائمہ میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وہ یہ کہتے ہیں کہ امام صرف وہی ہو سکتا ہے جو افضل البشر ہو۔

سُنّی عقائد، جو مسلمانوں کی اکثریت کی زندگیوں، افکار اور کردار پر حکمران ہیں، شیعہ تصوّرات کی عین ضد ہیں۔ سُنّی شریعت اس پر مُصر ہے کہ مسلمانوں کی نماز کو بارگاہِ ایزدی میں مقبول بنانے کی خاطر امام کا فی الواقع جسمانی طور پر موجود ہونا ضروری ہے اور جہاں کہیں امام بذاتِ خود موجود نہ ہو سکے وہاں اس کے ایسے نمائندوں کو موجود ہونا چاہیے جو تمام لازمی صفات سے متصف ہوں۔

یہ مسائل اکثر کُتبِ فقہ و دینیات میں بالتفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ خلافت کی تصریح یوں کی جاتی ہے کہ وہ رسولِ خدا کی نیابت ہے، جو اسلام کے دوام اور اُس کے قوانین اور قواعد و ضوابط کی بجا آوری کو برقرار رکھنے کی خاطر حکمِ ربّی سے مقدّر ہے۔ چنانچہ اسلام کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ اس میں ہر وقت ایک خلیفہ، یعنی آقائے اسلام کا فرمانروا فقہی اور ربط و اسطہ

نائب، موجود ہو۔ امامت رُوحانی پیشوائی کا نام ہے۔ لیکن یہ مناصب ایک دوسرے سے جُدا نہیں کئے جا سکتے۔ خلیفۂ نبی واحد شخص ہے جو، جب کبھی وہ ذاتی طور پر موجود ہو، نماز کی امامت کا حق رکھتا ہے۔ کوئی اور شخص یہ وظیفہ ادا نہیں کر سکتا، الاّ اُس صورت میں کہ خلیفہ اُسے بلاواسطہ یا بالواسطہ مندوب کرے۔ امام اور ماموم (یعنی جماعت) کے درمیان ایک روحانی رشتہ ہوتا ہے جو انھیں اقرارِ دین میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کرتا ہے۔ یہ ایمانی اصول اس امر سے کہ اسلام میں پروہتوں کا کوئی طبقہ نہیں کوئی عدم مطابقت نہیں رکھتا۔ ہر مسلمان بارگاہِ ایزدی میں اپنی وکالت آپ کرتا ہے اور ہر رُوح کسی اور انسان کی وساطت کے بغیر خدا سے تعلق رکھتی ہے۔ امام انفرادی عبادت گذار اور صحیفۂ اسلام کے درمیان ایک کڑی ہے۔ دینِ اسلام کا یہ صوفیانہ عنصر اس کی حیرت انگیز وحدت وسالمیت کی بنیاد ہے۔

ہم نے اُوپر جو کچھ کہا ہے اُس سے "دُرّ المختار" کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امامت دو طرح کی ہوتی ہے: امامتِ کُبریٰ اور امامتِ صغریٰ، یعنی سب سے اُونچے درجے کی پیشوائی، اور نماز کی قیادت کا نسبتاً ادنٰے منصب۔ امامِ کبیر سُنّی دنیا کا خلیفہ ہوتا ہے۔ اُس کی ذات میں پیغمبرِ اسلامؐ کے نائب کی حیثیت سے دینی و دنیوی اختیارات جمع ہوتے ہیں۔ امورِ دنیوی کا انصرام وہ یا تو شوریٰ کے مشورے سے کرتا ہے، جیسا کہ خلافتِ راشدہ میں ہوا، یا، جیسا کہ بعد کے زمانوں میں ہوا، اپنے مندوبین کے ذریعے، جو اجتماعی طور پر یا انفرادی طور پر اس کے تفویض کئے ہوئے اختیارات سے کام لیتے ہیں۔ ایسا ہی دینی ورُوحانی معاملات میں ہوتا ہے، لیکن جہاں تک جماعتِ نماز کا تعلق ہے، اُس پر واجب ہے کہ ذاتی طور پر اس کی امامت کرے، الاّ اس صورت کے کہ وہ جسمانی طور پر معذور ہو۔

شیعوں میں، عام نمازوں کا تو ذکر ہی کیا، جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی انفرادی طور پر اور خلوت میں ادا کی جا سکتی ہیں۔ سُنّیوں کے یہاں، اگر مسجد یا کوئی اور عبادت گاہ قریب ہو تو نماز با جماعت فرض ہے۔ کسی معقول وجہ کے بغیر جماعتِ نماز میں شریک نہ ہونا گناہ ہے اور جو شخص اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں وہ بعض ملکوں میں حکومت کی طرف سے بھی مستوجب سزا قرار پاتے ہیں۔ نجد میں وہابیوں کے تحت نماز سے جی چرانے والوں کو کوڑے مار کر مسجد میں لے جایا جاتا تھا اور

آج بھی ابنِ سعود کی حکومت میں اس کے متبعین، جو اپنے آپ کو اخوان کے لقب سے ملقب کرتے ہیں، مراسم دینی کی بجا آوری اسی قسم کے طریقوں سے کراتے ہیں۔ چونکہ نماز باجماعت فرض عین تھی اس لیے امام کی موجودگی لازمی تھی[1]۔

سُنّیوں کا دعویٰ ہے کہ اپنی آخری علالت کے دوران رسُول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی جگہ نمازوں کی امامت کے لیے مقرر فرمایا۔ آپؐ کی وفات پر لیکن تجہیز وتدفین سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی نامزدگی مجمعِ عام میں قبول کر لی گئی اور وہ باجماعِ اُمّت مسند نشینِ خلافت ہو گئے۔ اس وقت سے یہی طریقۂ انتخاب سُنّیوں میں مسلّم چلا آرہا ہے۔

منصبِ خلافت کے لیے جو صفات ضروری ہیں اُن میں سب سے اہم یہ ہیں کہ خلیفہ اہل سنت والجماعت سے ہو، اختیارِ اعلیٰ کی اہلیت رکھتا ہو، کسی کا تابع فرمان نہ ہو۔ سُنّی یہ تقاضا نہیں کرتے کہ امام المسلمین کو معصوم یا افضل البشر ہونا چاہیئے اور وہ یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ وہ خاندانِ نبوی سے ہو۔ ان کے نزدیک یہ کافی ہے کہ وہ ایک خود مختار حاکم ہو، ذاتی معائب سے بری ہو، نیک سیرت ہو اور امورِ سلطنت کے انصرام اور نماز کی امامت کی قابلیت رکھتا ہو۔ متقدمین فقہا نے آنحضرتؐ کے ایک ارشاد کی سند پر ایک اور شرط شامل کر لی ہے جو اس عبارت کے اخیر میں آتی ہے جو لوازمِ امامت کے موضوع پر کتب احادیث میں پائی جاتی ہے: وہ یہ کہ امام قبیلۂ قریش سے ہونا چاہیئے (الائمۃ من قریش)۔ اس شرط کے شامل کرنے کا مقصد، جیسا کہ دُرّ المختار اور ردّ المحتار دونوں میں مذکور ہے، شیعوں کے اس دعوے کا باطل کرنا تھا کہ امامت خانوادۂ نبویؐ یعنی حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد تک محدود تھی اور پہلے تین خلفاء اور اموی اور عباسی خلفاء کو مستحقِ خلافت ثابت کرنا تھا۔ عظیم فقیہ و مؤرخ ابنِ خلدون[2] نے، جو امیر تیمور کا ہمعصر تھا اور جس نے ۱۴۰۶ء میں

---

[1] اس معاملے میں تمام سنّی مذاہب کا مکمل اجماع ہے۔ فقہِ مالکی کی جیّد کتاب کا مصنف خلیل ابن اسحٰق اس ضمن میں جو قوانینِ شرعی بیان کرتا ہے وہ بالکل وہی ہیں جو حنفیوں اور شافعیوں کے یہاں مسلّم ہیں۔

[2] وہ طویل مدت تک قاہرہ کا مالکی قاضی القضاۃ رہا۔

خاندانِ عثمانی کے مسند نشینِ خلافت ہونے سے بہت پہلے وفات پائی، اپنے مقدمہ میں اس شرط سے بہت سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ اس روایت کی صحت سے جس پر یہ شرط مبنی ہے انکار نہیں کرتا، لیکن کہتا ہے کہ یہ محض ایک سفارش تھی جو حالاتِ وقت کی بنا پر کی گئی۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ جب اسلام دنیا میں آیا تو اس وقت قبیلۂ قریش عرب کے تمام قبائل میں سب سے ترقی یافتہ اور صاحبِ اقتدار تھا اور جب آنحضرتؐ نے یہ سفارش کی یا یہ خواہش ظاہر کی کہ مسلمانوں کی دینی و دنیوی پیشوائی آپؐ کے قبیلہ کے افراد تک محدود رہے تو آپؐ کے پیشِ نظر وہ حالات تھے جو آپؐ کے وصال کے فوراً بعد رونما ہونے والے تھے اور آپؐ کا مقصد یہ نہ تھا کہ جانشینی کے بارے میں کوئی لگا بندھا قاعدہ نافذ کریں۔ اس وقت صرف قریش میں کوئی ایسا شخص مل سکتا تھا جو مسلمانوں کا حاکم بننے کی اہلیت و قابلیت رکھتا تھا۔ صرف یہی وجہ تھی کہ آنحضرتؐ نے قریش میں سے خلیفہ و امام منتخب کرنے کی سفارش کی۔ اس رائے کو، جو سنّی ماہرینِ فقہ میں سے ایک فاضل ترین ماہر نے بیان کی ہے، تمام متاخرین قبول کرتے ہیں، اور اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تمام دوسری شرائط کے پورا ہو جانے کی صورت میں قانون امام کے انتخاب پر کوئی قبائلی یا نسلی حدود عائد نہیں کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات سے پہلے حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین نامزد کیا اور اس تقرر کو جمیع المسلمین نے جن میں اہلِ بیتِ نبی بھی شامل تھے قبول کیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی یا مجوسی مذہبی جوشیلے کے ہاتھوں، جسے اس عظیم خلیفہ کے بعض احکام کے خلاف شکایت تھی، زخمی ہو کر شہادت پائی۔ انھوں نے جانبداری یا رورعایت کے الزامات کا سدِباب کرنے کی خاطر وفات سے پہلے اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے چھ ممتاز مسلمانوں پر مشتمل ایک مجلس قائم کی تھی۔ ان لوگوں کی نگاہِ انتخاب حضرت عثمانؓ پر پڑی، جو خاندانِ امیہ میں سے تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ امت کے اتفاق رائے سے مسند نشینِ خلافت ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی المناک شہادت پر دامادِ نبی حضرت علیؓ، جو شیعوں کی رائے میں بر بنائے وراثت بلا واسطہ جانشین نبی بننے کے حقدار تھے، خلیفہ و امام بنے۔ حضرت علیؓ کی ذات میں موروثی و انتخابی دونوں استحقاق جمع تھے۔ لیکن انھوں نے عہدِ عثمانی کے نظم و نسق میں اصلاحی تبدیلیاں کرنے کی جو کوششیں کیں ان کی وجہ سے ان کے لاتعداد دشمن پیدا ہو گئے۔ امیر معاویہؓ نے، جو اموی النسب تھے اور عہدِ عثمانی

میں شام کے عامل تھے، علمِ بغاوت بلند کیا۔ حضرت علیؓ بغاوت کو فرو کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں آئے، لیکن ایک غیر فیصلہ کن لڑائی کے بعد کوفے کی جامع مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے ایک قاتل کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد وہ دور ختم ہو گیا جسے ابتدائی سنی فقہا و علمائے دین اس بنا پر "خلافتِ کاملہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہ ملت کے اجماعِ رائے نے چاروں خلفاء کے استحقاقِ خلافت پر مہرِ تکمیل ثبت کی۔

حضرت علیؓ کی شہادت پر اُن کے بڑے صاحبزادے حضرت امام حسنؓ کوفہ اور اس کے ماتحت علاقوں کے لوگوں کے اتفاقِ رائے سے منصبِ خلافت پر مامور ہوئے، لیکن انھوں نے یہ منصب امیر معاویہؓ کو تفویض کر دیا۔ شام کے لوگوں نے امیر معاویہؓ کے تقرر کو قبول کر لیا۔ یہ ۶۶۱ء کا واقعہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بنی اُمیّہ اور بنی ہاشم ایک ہی قبیلے یعنی قریش کی دو شاخیں تھے۔ ان دو خاندانوں کے درمیان بڑی زبردست رقابت تھی، جس کا دُور کرنا آنحضرتؐ کے سب سے بڑے مقاصد میں سے ایک مقصد تھا۔ خاندانِ ہاشم کے بانی ہاشم آنحضرتؐ کے جدّ امجد تھے۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب کے متعدد بیٹے تھے۔ خلفائے عباسی ان میں سے ایک یعنی حضرت عباسؓ کی اولاد تھے۔ ہاشم کے ایک اور فرزند ابوطالب حضرت علیؓ کے والد تھے اور سب سے چھوٹے، یعنی عبداللہ آنحضرتؐ کے والد۔

امیر معاویہؓ بنو اُمیّہ کے پہلے خلیفہ تھے۔ معاویہؓ کے پوتے کی وفات پر خاندانِ اموی کی حکمی شاخ کے ایک فرد مروان نے عہدۂ خلافت سنبھالا۔ مروان کے بیٹے عبدالملک اور پوتے ولید کے عہدِ حکومت میں سُنّی خلافت نے اپنی انتہائی وسعت حاصل کی۔ وہ بحرِ اوقیانوس سے لے کر بحرِ ہند تک اور دریائے ٹیگس سے لے کر صحرائے اعظم اور حدودِ حبشہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ ۷۴۹ء میں ابوالعباس سفاح نے، جو عمِ نبی حضرت عباسؓ کی اولاد سے تھا، اموی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور آخری اموی خلیفہ مروان ثانی کی جگہ کوفہ کی جامع مسجد میں لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی۔ بیعت کے بعد اس نے منبر پر چڑھ کر ایک خطبہ دیا، جو اس کے جانشینوں نے موروثی بنا کر رکھا۔ یہ خطبہ عرب مؤرخ ابن الاثیر کی کتاب میں پوری طرح قلمبند

ہے۔ اس میں طویل طویل دلائل سے بنو عباس کے استحقاقِ خلافت کو ثابت کیا گیا ہے۔ اب ابوالعباس سُنّی دنیا کا جائز فرمانروا اور سُنّی مذہب کا مسلّم پیشوا بن گیا۔ اس کے پہلے چھ جانشین نمایاں قابلیت کے لوگ تھے۔ جو ان کے بعد آئے اُن کی قابلیت کے مختلف مدارج تھے۔ لیکن ان میں سے بعض غیر معمولی علم و فضل اور استعداد کے مالک تھے۔ سفّاح کے بھائی منصور نے، جو اس کے بعد خلیفہ ہُوا، بغداد کی بنیاد رکھی جو عباسیوں کا مستقرِ حکومت بن گیا اور عموماً دار الخلافۃ اور دار السّلام کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں خاندانِ عباسی کو صدیوں تک کسی مخالفت کے بغیر دینی و دنیوی اختیار حاصل رہا۔ اس کے عظیم حریف، جن کا دار الخلافہ قاہرہ تھا، صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ قرطبہ کا شاندار اموی خاندان گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ناپید ہو گیا۔ الموحدؔ المرابط اور دہ متعدد بربر اور عرب خاندان جو المرابط کے زوال پر یکے بعد دیگرے برسرِ اقتدار آئے سنّی مذہب کی پیشوائی کا کوئی واجب التسلیم حق نہ رکھتے تھے۔ سنّی دنیا کی امامت پر عباسیوں کا حق بحرِ اوقیانوس سے لے کر دریائے گنگا تک اور بحرِ اسود و دریائے سیحوں سے لے کر بحرِ ہند تک مسلّم تھا۔ ۴۹۳ھ (۱۰۹۹ء) میں الموحد فاتح یوسف بن تاشفین نے زلاقہ کی عصر آفرین لڑائی کے بعد، جس میں عیسائی لشکروں کو فیصلہ کن شکست ہوئی، عباسی خلیفہ مقتدی سے خلعت و علم اور امیر المسلمین کا خطاب حاصل کیا۔ بعد میں خلیفہ المستظہر نے اس کی توثیق کر دی۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ نہ تو قرطبہ کے "خلفائ" نے اور نہ زمانۂ مابعد کے مسلم حکمرانوں نے خلیفۃ الرسولؐ ہونے کا دعوےٰ کیا اور نہ امیر المومنین کا خطاب اختیار کیا۔

پوری پانچ صدیوں تک بغداد دنیائے اسلام کی تمام ذہنی سرگرمیوں کا مرکز رہا اور یہاں خلافت اور دوسرے امورِ دینی و دنیوی کے بارے میں قواعد و ضوابط کو ایک منظّم شکل دی گئی چنانچہ یہ تصور کہ خلیفہ واِمام مامور من اللہ نائبِ رسولؐ تھا جمہور مسلمین کی مذہبی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک بن گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سنّی عقائد کے مطابق خلیفہ محض ایک حاکمِ دنیوی نہیں، وہ ایک ملّت اور دولتِ عامہ کا مذہبی سربراہ ہے۔ یعنی حکومتِ الٰہیہ کا فی الواقعی نمائندہ و نائب[1]۔

---

[1] سیوطی

خلافتِ عباسیہ پانچ صدیوں تک قائم رہی ۔اس کا خاتمہ ۱۲۵۸ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر ہوا۔اس وقت مستعصم باللہ خلیفہ تھا۔ وہ ، اس کے بیٹے اور اس کے خاندان کے برگزیدہ افراد قتلِ عام میں ہلاک ہو گئے ؛ خاندانِ عباسی کے صرف وہ افراد بچ پائے جو اس وقت دار الخلافہ میں نہ تھے یا جن پر منگولوں کی نگاہ نہ پڑی ۔

مستعصم باللہ کے قتل کے دو سال بعد تک سنی دنیا ایک امام و خلیفہ کی ضرورت شدت سے محسوس کرتی رہی ۔خلفاء کے عرب مورخ[1] نے بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے کہ ملت اسلامیہ کے روحانی پیشوا کی غیر موجودگی سے کتنا رنج و قلق پیدا ہوا اور لوگوں نے کس شدت سے ایک نائبِ رسولؐ کی ضرورت محسوس کی جو ان کے لیے تسکینِ قلب اور فلاحِ دارین کا سرچشمہ بنتا۔جو لوگ زندہ تھے ان کی عبادات اس قبولیت و فضیلت سے محروم تھیں جو ایک مسلّم امام کی موجودگی سے حاصل ہوتی ہے ۔اسی طرح مردوں کی ارواح کو ثواب پہنچانا ناممکن نہ تھا۔سلطان بیبرس نے ساری سُنّی دنیا کی طرح ایک خلیفہ و امام کی اشد ضرورت محسوس کی ۔ خلافت کا حق پانچ صدیوں کی مسلسل حکومت اور اجماعِ اُمّت کی بدولت خاندانِ عباسی کی ملکیت بن چکا تھا۔چنانچہ اس خاندان کے ایک فرد ابوالقاسم احمد کو ، جو منگولوں کے قتلِ عام سے بچ نکلا تھا، قاہرہ میں آکر مسندِ خلافت سنبھالنے کی دعوت دی گئی ۔ابو القاسم قاہرہ کے قریب پہنچا تو سلطان قاضیوں اور ارکانِ سلطنت کو ہمراہ لے کر اس کے استقبال کو گیا ۔مسند نشینی کی رسومات بڑی شان و شوکت سے بجالائی گئیں۔پہلے تو قاضی القضاۃ کے سامنے ابو القاسم کے سلسلۂ نسب کا ثبوت بہم پہنچایا گیا۔اس کے بعد اُسے مستنصر باللہ کے لقب سے مسندِ خلافت پر بیٹھایا گیا۔سب سے پہلے خود سلطان بیبرس نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی ، اس کے بعد قاضی القضاۃ تاج الدین اور مشائخ و وزراء نے سب سے آخر میں درجہ بدرجہ عمائدِ سلطنت نے ۔یہ ۱۲ مئی ۱۲۶۱ء کا واقعہ ہے ۔نئے خلیفہ کا نام سکوں پر مسکوک کرایا گیا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا گیا۔جمعہ کے دن خلیفہ عباسیوں کی سیاہ[2] ردا اوڑھے ہوئے جلوس کے ساتھ جامع مسجد میں آیا اور وہاں اس نے خطبۂ خلافت

---

۱ سیوطی

۲ عباسیوں کا امتیازی رنگ سیاہ تھا۔امویوں کا سفید اور جانشینان نبی فاطمیوں کا سبز۔

دیا۔ چونکہ اب خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے اس کی مسند نشینی مکمل ہو چکی تھی، اس لئے اس نے سلطان بیبرس کو مسند وخلعت عطا کر کے نائب السلطنت مقرر کیا۔

جس خلافتِ عباسیہ کی بنیاد اس طرح قاہرہ میں رکھی گئی وہ اڑھائی صدیوں تک قائم رہی۔ اس مدت میں جو بادشاہ مصر پہ حکمران رہے وہ مملوک سلاطین کہلاتے ہیں۔ ہر سلطان تخت نشین ہوتے ہی خلیفہ وامام الوقت سے سند حاصل کرتا تھا اور اپنے آپ کو اس کا نائب السلطنت کہتا تھا۔ مذہبی منصب داروں اور قاضیوں کا تقرر خلیفہ کی باضابطہ منظوری سے ہوتا تھا۔ اگرچہ خلیفہ کی ملکی اور سیاسی طاقت سلب ہو چکی تھی، تاہم اسے اس قدر مذہبی وقار حاصل تھا اور اس وقار کی ضرورت کا احساس سُنیوں کے دلوں میں اس قدر گہرا تھا کہ زوالِ بغداد کے بعد دو مرتبہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے خلفائے عباسی سے سندِ نیابت حاصل کی۔ تغلق آباد کے نامکمل شہر کے بانی سلطان محمد جوناخاں تغلق نے ۱۳۴۳ء میں خلیفہ کے سفیر کا جو شاندار استقبال کیا اس سے ہمیں اس امر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی، جو ان دنوں مصر سے پورے چھ مہینوں کی مسافت پر تھا، منصبِ خلافت کا کتنا احترام کیا جاتا تھا۔ جب سفیر شہر کے قریب پہنچا تو سلطان سادات وارکین کو ہمراہ لیے اُسے خوش آمدید کہنے کو اپنے دار السلطنت سے نکلا، اور جب خلیفہ کا شُقّہ سلطان کو پیش کیا گیا تو اس نے اُسے انتہائی ادب کے ساتھ لیا۔ خلیفہ کی سندِ نیابت نے سلطان کے اختیارات پر مہرِ جواز ثبت کر دی۔ یہ سارا واقعہ مشہور شاعر بدرالدین چاچ نے ایک قصیدہ میں بیان کیا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں خاندانِ عثمانی کے سلطان سلیم اوّل (الملقب بہ سفّاح) کا ستارہ افق پہ طلوع ہوا۔ اس سلطان نے دشمنانِ اسلام پر بے شمار فتوحات حاصل کیں۔ اور کوئی دوسرا مسلم بادشاہ، یہاں تک کہ ایران میں صفوی خاندان اور پہلی شیعہ مملکت کا بانی شاہ اسماعیل بھی، عظمت واقتدار میں اس عثمانی سلطان کا ہم پایہ نہ تھا۔

پندرھویں صدی کے اواخر میں مصر کے حالات بڑی حد تک دگرگوں ہو چکے تھے اور بعد کے مملوک سلاطین کے زمانے میں جو بدنظمی شروع ہوئی تھی وہ چند سال بعد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔ مصریوں کے ایک طبقے نے سلیم کو دعوت دی کہ وہ آ کر ان کے پراگندہ حال ملک میں امن وامان ازسرِنو قائم کرے۔ سلیم نے نہایت آسانی سے نااہل مملوکوں کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور مصر کو اپنی قلمرو

میں جو آگے ہی بہت وسیع تھی، داخل کر لیا۔ اس وقت جو خلیفہ نیابت رسُولؐ پر مامور تھا المتوکل علی اللہ کے لقب سے ملقب تھا۔ سنّی تواریخ کے مطابق اس خلیفہ نے یہ محسوس کیا کہ سلیم واحد مسلمان بادشاہ ہے جو امام کے مناصب دوگانہ کو اپنی ذات میں جمع کر سکتا ہے، خلافتِ اسلامیہ کو نظری اور دونوں حیثیتوں سے ازسرِ نو قائم کر سکتا ہے اور مؤثر طور پر اس منصب کے وظائف کو ادا کر سکتا ہے، چنانچہ اس نے ۱۵۱۷ء میں ایک باضابطہ وثیقۂ تفویض کے ذریعہ فاتح عثمانی کو خلافت منتقل کر دی اور اپنے تمام عمائد اراکین کے ساتھ اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اسی سال شریف مکّہ محمد ابوالبرکات نے جو خاندانِ علوی سے تھا، خانۂ کعبہ کی کنجیاں ایک سیمیں کشتی میں رکھ کر اپنے بیٹے کے ہاتھ سلطان سلیم کو بھجوا دیں اور اس کے بیٹے نے اس کی طرف سے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ سلیم کی ذات میں تفویض اور بیعت کے ذریعے عباسیوں کے حقوق جمع ہونے سے اور خاندانِ نبویؐ کے نمائندے اور متولیٔ حرمین کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے عثمانی سلطان کے استحقاقِ خلافت پر مہر تکمیل ثبت ہو گئی ''بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علیؓ کی بیعت نے پہلے تین خلفاء کے حق کی تصدیق کی تھی''، مکّہ و مدینہ میں سلطان کے لیے جو دعائیں مانگی گئیں اور اس کے نام کے جو خطبے پڑھے گئے انھوں نے سلیم کے حقِ خلافت کو بالکل مسلّم الثبوت بنا دیا۔ اس وقت سے اس کا ''مستقرِ حکومت'' دارالخلافہ'' بن گیا اور اسے اسلام بول کا نام دیا گیا۔ کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ سلیم اور اس کے بیٹے سلیمان ذی شان کے دربار میں سنّی مملکتوں کے حکمرانوں کی طرف سے حلفِ وفاداری اٹھانے کے لیے سفیر آئے۔ چنانچہ اس طرح سنّیوں کے قول کے مطابق خلافت خاندانِ عثمانی کا ورثہ بن گئی جس پر وہ کسی مخالفت کے بغیر چار صدیوں سے قابض چلا آرہا ہے۔

دُوسرا حصّہ

رُوحِ اِسلام

پہلا باب

اِسلام کا مثالی نصبُ العینْ

هَلُم الیّ لا تقصد سِوائیّ
اَناالمنّانَ فاطلُبنی تجدنی
اتذکرلیلۃً ناديت سراً
فلم اسمعک فاطلبنی تجدنی
اذاالمضطر قال الاتراني
نظرت الیہ فاطلبنی تجدنی
اذا عبدی عصانی لم تجدنی
سریع الاخذ فاطلبنی تجدنی

مرے در پہ آ، کوئی دوسرا تو نہ کر تلاش مرے سوا — میں ہوں صاحبِ کرم و عطا، تو جو مجھ کو ڈھونڈھے تو پائے گا
تجھے یاد ہے کوئی ایسی شب، ترے دل نے جب مری کی طلب — تو سُنی نہ میں نے تری صدا، مجھے ڈھونڈھ، تو مجھے پائے گا
جو کبھی پکارے کوئی حزیں "تجھے کیا تلاش مری نہیں؟" — تو میں اس کو دیتا ہوں یہ ندا "مجھے ڈھونڈھ تو مجھے پائے گا"
کوئی بندہ جب مرے حکم سے کرے سرکشی تو بلا مجھے — ہے سریع میرا مواخذہ، مجھے ڈھونڈھ تو مجھے پائے گا

حضرت عیسےٰ نے جس مذہب کی بنیاد رکھی وہ ان کے نام کی مناسبت سے عیسائیت اور ان کے لقب کی مناسبت سے مسیحیت کہلاتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ اور مہاتما بدھ جو مذاہب لائے وہ انہی کے

ناموں سے موسوم ہیں، لیکن حضرت محمدؐ جس مذہب کے معلّم تھے اس کا نام ان کے نام سے متعلق نہیں، اور وہ نام ہے "اسلام"۔

دینِ محمدی کے مناسب طور پر سمجھنے کے لیئے ضروری ہے کہ ہم لفظِ "اسلام" کے صحیح معنوں سے کماحقہٗ واقف ہوں۔ مسلّم کے ابتدائی معنی ہیں سکون، قرار، فرض سے عہدہ برآئی، فرض سے سبکدوشی، کامل امن و آشتی۔ اس کے ثانوی معنی ہیں اس ہستی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا جس سے انسان نے رابطۂ آشتی قائم کر رکھا ہے۔ اس مادّے سے جو اسم ماخوذ ہے اس کے معنی ہیں امن، سلام، سلامتی، نجات۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس لفظ میں مشیتِ ایزدی کے سامنے مکمل سپراندازی کا مفہوم مضمر ہے، لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس کے برعکس اس لفظ کا مطلب ہے حصولِ تقویٰ کی خاطر جدوجہد۔

اسلام میں جو اخلاقی اصول مضمر و مجسّم ہیں ان کا لُبّ لباب قرآن کے دوسرے سُورے نے ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے:-

> "اس کتاب کے بارے میں کوئی شک نہیں۔ یہ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اس پر اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی ہیں ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کی ہدایت سے فیض یاب ہیں" (البقرۃ - ۱ تا ۵)

اسلامی نظام کے بنیادی ارکان حسب ذیل ہیں:-

(۱) خالقِ کل کی وحدت، غیر مجسّمیت، قدرت اور ہمہ گیر محبّت پر ایمان (۲) نوعِ انسانی میں باہمی اخوت و ہمدردی (۳) جذباتِ سفلی کی تسخیر۔ (۴) تمام نعمتوں کے بخشنے والے کا شکریۂ احسان۔ (۵) حیات بعد الممات میں تمام انسانی اعمال کی باز پُرس۔ ذاتِ باری کی قدرت و محبت کے جو اعلیٰ اور عظیم الشان تصورات قرآن نے پیش کیئے ہیں اُن کے مقابلے کی کوئی چیز دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ خدا کی وحدت، اس کی غیر مادیت، اس کی عظمت و جبروت اور اس کا رحم و کرم قرآن کی سب

سے فصیح و بلیغ اور رُوح میں ہیجان پیدا کر دینے والی عبارتوں کے مستقل اور لامتناہی موضوع ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی، نُور اور روحانیت کا ایک دریا ہے جو رُکے تھمے بغیر موجزن ہے، لیکن اذعانیت و ادعائیت کا شائبہ بھی موجود نہیں۔ شروع سے آخر تک کہیں کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں پایا جاتا۔ ہر بات میں صرف انسان کے شعورِ باطنی اور اس کی عقلِ وجدانی سے خطاب کیا گیا ہے۔

آیئے اب ہم ان مذہبی تصورات پر ایک نگاہِ بازپسیں ڈالیں جو اس وقت اقوامِ عالم میں رائج تھے جب پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی پیغام رسانی کا آغاز کیا۔ کفارِ عرب کے یہاں خدائی کا تصور افراد و قبائل کے تمدنی اختلافات کے پہلو بہ پہلو مختلف تھا۔ بعضوں کے یہاں وہ فطرت کو لباسِ خدائی پہنانے کی حد تک مقابلتاً بلند تھا اور بعضوں کے یہاں خالی خولی بُت پرستی کی حد تک گرا ہوا مثلاً گندھی ہوئی مٹی یا ایک لکڑی یا ایک پتھر کی پُوجا۔ بعض ایک آئندہ زندگی پر اعتقاد رکھتے تھے اور بعضوں کو اس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ زمانۂ قبلِ اسلام کے عربوں کے یہاں سُوری فینیقیوں ——— (Syro-phoenicians) کی طرح مقدّس کُنج تھے، ایسے درخت تھے جن سے استخارہ کیا جاتا تھا، اور غیبی بشارتیں دینے والی بچاریں تھیں۔ آلاتِ تناسل کی پُوجا سے بھی وہ نا آشنا نہ تھے۔ چنانچہ پتھر اور لکڑی کے مندر بنا بنا کر عساکر سماوی کی طرح تولیدی قوتوں کی پرستش کی جاتی تھی۔ یہ قرینِ قیاس نہیں کہ جب یہ غیر متمدّن بادیہ نشین ہوا کے وہ جھکڑ دیکھتے تھے جو پورے کے پورے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے تھے یا جب ان کی نظر واہمہ کے بنائے ہوئے اُن حسین مناظر پر پڑتی تھی جو مسافر کو دھوکہ دے کر تباہی کی طرف لے جاتے تھے، تو ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہوتا ہو کہ یہ کسی دستِ غیب کی شعبدہ طرازیاں ہیں۔ چنانچہ ایک برترین خدا یعنی ایک خدائے خدایان کا ناقابلِ فہم اور مبہم سا تصوّر عربوں کی شعوری دنیا کی فضا میں منڈلانے لگا۔

غالباً یہودیوں نے جنھیں عموماً تاریخ میں نظریۂ وحدانیت کے بہت بڑے محافظ خیال کیا جاتا ہے، اس تصوّر کی تشکیل میں مدد دی ہوگی۔ لیکن خود انھوں نے اس حقیقت کا عملی مظاہرہ کیا کہ جب کسی قوم کے ضابطۂ دینی میں کوئی تاریخی اور عقلی عنصر موجود نہ ہو جو اسے ثبات

بخش سکے تو اس کے خیالات میں کیسا عجیب و غریب قلب ماہیت واقع ہوجاتا ہے۔

یہودی مختلف ادوار میں اور مختلف واقعات کے زیر اثر عرب میں داخل ہوئے تھے چنانچہ قدرتی امر تھا کہ ان میں تارکینِ وطن، پناہ گزینوں اور نو آبادکاروں کے جو مختلف گروہ تھے اُن کے افکار و خیالات میں بہت سی گوناگونی ہو۔ جن لوگوں کو اہلِ آشور اور اہلِ بابل نے وہیں نکال دیا تھا لازمی تھا کہ ان کے تصورِ خدائی میں اُن لوگوں کے تصورِ خدائی کی بہ نسبت جنھیں قیصرانِ روم ویسپیزین (Vespasian) ٹریجن (Trajan) اور ہیڈرین (Hadrian) نے جلا وطن کیا تھا انسان سے جسمانی مشابہت[1] اور جذباتی مماثلت[2] کا عنصر زیادہ ہو۔ بنی اسرائیل کے جن خواصِ طبعی نے انھیں اپنے اصلی وطن میں جہاں اُن کی بے راہ روی کی مذمت کرنے والے اربابِ بصیرت موجود تھے، بار بار بت پرستی کی لعنت میں مبتلا کیا تھا وہ انھیں عربوں کے الحاد و شرک سے کیوں کر محفوظ رکھ سکتے تھے؟ قدرتی بات تھی کہ وہ خدائے ابراہیم کے تصور میں خدا کے مادی تصور کی آمیزش کر لیں۔ چنانچہ انھوں نے حرم کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم کا ایک بُت نصب کیا، جس کے پہلو میں ایک مینڈھا قربانی کے لئے تیار کھڑا تھا۔

جو یہودی بعد کے ادوار میں آئے تھے ان میں شمائیوں (Shammaites) اور غلاۃ (Zealots) کی بہت بڑی اکثریت تھی۔ ان گروہوں میں قوانینِ دینی کی اطاعت بت پرستی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون نویسوں (Scribes) اور ربیّوں کا احترام پرستش سے لگا کھانے لگا۔ یہ حضرات اپنے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اُمت کے مربّی، محافظ، قانون و روایت کے برقرار رکھنے والے اور قوانینِ الٰہی کے عین مطابق زندگی بسر کرنے

---

[1] غیر انسانی اشیاء و اشخاص (بالخصوص خدا) کو انسان کی جسمانی صفات سے متصف کرنا۔ Anthropomorphism

[2] غیر انسانی اشیاء و اشخاص (بالخصوص خدا) سے انسانی جذبات و احساسات کا منسوب کرنا۔ Anthropopathism

کے جیتے جاگتے نمونے اور آئینے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زُبدۂ اُمّت سمجھتے تھے اور عام عقیدہ یہ تھا کہ خدا سے راہ و رسم رکھنے کی بدولت وہ مستقبل کے بارے میں بشارتیں دینے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو اور لوگ بھی ان کو خدا کے خاص الخاص منظورِ نظر تصور کرتے تھے یوزیفس (Josephus) کے قول کے مطابق یہودیوں کے دلوں میں حضرت موسیٰ کا احترام اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ خدا کے نام کے بعد ان کے نام کی عزت کرتے تھے اور یہ عزت انھوں نے حضرت عزیرؑ (عزرا) Ezra کو منتقل کر دی تھی، جنھوں نے خاندانِ کیانی کے عہد میں یہودی قانون اور زندگی کو نشاۃِ ثانیہ بخشی۔

مزید براں قیاس غالب ہے کہ یہود کے عامۃ الناس نے "ترافم" (Teraphim) کی پُوجا مکمل طور پر ترک نہ کی تھی، جو ایک طرح کے خاندانی دیوتا تھے جن کے بُت انسانی شکل پر بنائے جاتے تھے اور جن سے ہر موقع پر شگون لیا جاتا تھا، بلکہ جنھیں اغلباً رومیوں کے penates کی طرح محافظ دیوتا خیال کیا جاتا تھا۔ یہ بُت پرستی یقیناً کفارِ عرب سے مس کی بدولت اور بھی استوار ہو گئی ہو گی۔

جب یہودیہ میں حضرت عیسیٰؑ کا ظہور ہوا تو صرف ایک قوم تھی، یعنی یہوہ کے پرستاروں کی قوم، جو اللہ کی وحدت کا نظریہ اور یہ تصور کہ ایک افضل و اعلیٰ ارادۂ ذاتی ساری کائنات کو اپنے حیطۂ قدرت و رحمت میں لیے ہوئے ہے، قبول کرتی تھی۔ اس قوم کے یہاں ہر طرح کی انسدادی کوششوں کے باوجود الوہیت کا تصور یا تو کافر قوموں سے مس کے باعث مسخ ہو چکا تھا، یا غیر اہلِ کتاب قوموں کے فلسفے کے زیرِ اثر متغیر ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو کلدانی مجوسی (Chaldaeo Magian) فلسفے نے یہودی روایات پر اپنی متصرفانہ انگلیوں کے اَن مٹ نشان چھوڑے تھے اور دوسری طرف یہودیوں کے بہترین دماغوں نے جہاں یونانی اور رُومی فلسفیوں کو ایک عظیم سببِ اوّل کے تصور سے آشنا کیا تھا وہاں خود اسکندریہ کے مکتبوں میں ایسے ایسے افکار و خیالات بھی سیکھے تھے جو اُن کے وحدانی مذہب کے ساتھ کوئی مطابقت نہ رکھتے تھے۔

کہیں ہندو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے جمِّ غفیر کو لیے ہوئے تھے، کہیں مجوسی زردشتی

اپنے دو مخالف خداؤں کو لیے ہوئے جو ایک دوسرے پر غلبہ پانے کے لیے برسرِ پیکار تھے، کہیں یونانی، رومی اور مصری اپنے اپنے دیومنڈل Pantheon لیے ہوئے، جن کے افراد اخلاق میں اپنے پجاریوں سے پست تر تھے ——— یہ تھی مہذب دنیا کی حالت اُس وقت جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی تعلیم و تلقین کا آغاز کیا — اپنے تمام حسین خوابوں اور اپنی تمام دُور و دراز اُمنگوں کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کا ذہن ان سب اِدّعاؤں سے مبرا تھا جو ان کے مجنونانہ جوش رکھنے والے پیروؤں نے اُن سے منسوب کئے ہیں۔ انھوں نے کبھی خدا کا تتمّہ یا ذاتِ خداوندی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

اگرچہ عہدِ حاضر کی عیسائیت میں ایک فکری رفعت پیدا ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود وہ گزشتہ قرنوں کی تشبیہیت Anthropomorphism کے ورثے کا جُوا اُتار کر نہیں پھینک سکی۔ قرناً بعد قرن اس معلّم عظیم کی تاریخ سے انسان صفتی کا ہر عنصر خارج کیا جاتا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شخصیت افسانوں کے ایک طومار میں گم ہو کر رہ گئی ہے اور تو اور نئی انجیل بھی ایک صدی تک مراقبے میں رہنے کے باوجود اس بزرگ ہستی کے چہرے پر سے توہمات کی دھند کا پردہ ہٹا نہیں سکی۔ روز بروز یہ خیال کہ اس کی زندگی "ابدیت کبریٰ کے سینے میں ایک ابدیت صغریٰ" تھی، زور پکڑتا جا رہا ہے، تا آنکہ نیس کی کونسل The Council of Nice اس خیال کو ایک شکل اور ٹھوس پن بخشتی ہے اور اسے ایک ادعائی عقیدے میں مجسّم کر دیتی ہے۔

بہت سے ذہن عالمگیر باپ کی دُور افتادگی سے گھبرا کر ایک انسانی شخصیت میں، جسے وہ الٰہیت کا درجہ بخشتے ہیں، ایک درمیانی منزل تلاش کرتے ہیں۔ ایک قریبی معبود کی یہ ضرورت ہی وہ چیز ہے جس نے جدید عیسائیت کو مجبور کیا ہے کہ وہ ایک مثالی چیز کو نام دے، اُسے گوشت و پوست کا پیراہن پہنائے اور ایک بشر نما خدا (man-God کے طور پر اس کی پرستش کرے۔

"جدید عیسائیت کے نقائص "(The Defects of Modern Christanity) کے فاضل مصنف کا خیال ہے کہ جس تواتر و اصرار

سے بنیُ ناصری نے خدا کا بیٹا ہونے کا دعوےٰ اور خدا کی طرح معبود بنا کے جانے کا تقاضا کیا ہے وہ بجائے خود اس کی الہیت کا ثبوت ہے۔ ہم اس امر سے مطلق انکار کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے کبھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا، ان معنوں میں جن معنوں میں عیسائی علمائے الٰہیات اور متکلمین نے ان الفاظ کو سمجھا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے حتمی طور پر ثابت کیا ہے کہ نئی انجیل کی عبارات کئی امور کے اعتبار سے کاملاً ناقابلِ اعتماد ہیں۔ جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کی خدائی کا تعلق ہے ہمیں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ یہ افسانہ کیونکر تدریجاً گھڑا گیا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جو الفاظ حضرت عیسیٰؑ سے منسوب کئے جاتے ہیں وہ انھوں نے فی الواقع استعمال کئے ہیں، پھر بھی کیا اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا کا اکلوتا بیٹا ہونے کا دعوےٰ کیا؟ کیا عیسائی متکلمین نے اس مشرقی درویش کا نام نہیں سُنا جو اب حلاج کے نام سے مشہور ہے اور جس نے خود خدا ہونے کا دعوےٰ کیا تھا؟ اس نے کہا تھا "انا الحق" یعنی "میں خدا ہوں، میں سچائی ہوں"۔ چنانچہ مسلم علماء نے یہودی سنہدریوں (sanhedrim) کی طرح اُسے کفر کا مجرم گردانا اور سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس طرح ایک سادہ لوح انسان، جس کا سینہ جوشِ معرفت سے لبریز تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بابیوں کا اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کا آقا "الباب" (یعنی حیاتِ ابدی کا دروازہ) قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک معجزانہ طریقہ سے آسمان پر پہنچا دیا گیا تھا۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ابو مغیث الحلاج[1] نے اپنے آپ کو "حق" اور باب نے اپنے آپ کو "جنت کا دروازہ" کہا تو ان کا منشا یہ دعوےٰ کرنا تھا کہ وہ خدا کے شریک ہیں؟ اور اگر اُن کا یہ منشا تھا بھی تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا دعویٰ بجائے خود دلیل ہے۔؟ لیکن جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، ہم ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰؑ نے، جن کے تصوّرات میں، جب ہم انھیں اُن کے پیروؤں کے چڑھائے ہوئے ملمع سے پاک کر کے دیکھیں، ان کی اپنی صفات یا شخصیت کے

---

[1] ابو مغیث ابن منصور الحلاج عین جوانی میں مارا گیا۔ وہ پاکیزہ سیرت، سادہ دل اور ریاضیوں کا دوست تھا۔ لیکن تخیل پرست اور جوشیلا تھا۔

بارے میں مبالغہ کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، کسی موقع پر بھی ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے ان ادّعاؤں کا جواز دستیاب ہو سکے جو ان کے پیروؤں نے ان کے سر منڈھ دیئے ہیں۔ ان کا خدا کی ابوت کے بارے میں جو تصور تھا وہ ساری نوعِ انسانی پہ حاوی تھا۔ ان کے نزدیک تمام انسان خدا کے بچّے تھے[1] اور وہ خود ابدی باپ کے بھیجے ہوئے ایک معلّم تھے۔ اس طرح عیسائیوں کے سامنے بشری فضیلت کی ایک زندہ مثال موجود تھی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ نبیِ ناصری کی تعلیم سے عیسائی خدا کا ایک منزّہ تر تصور اخذ کرتے۔ لیکن ہُوا یہ کہ چند صدیوں کے مرور نے حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کے ارد گرد ایسے قصوں کا ایک ہالہ سا ڈال دیا جنھوں نے ان کے اپنے ارشادات کے علی الرّغم انھیں الوہیت کا مجسّمہ یعنی خدا کا اوتار بنا دیا۔ دنیا نے آقا کی جگہ بندے کی پرستش شروع کر دی۔ عوام النّاس میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ جدید فیثا غورثیت (Neo pythagoreanism) افلاطونیت، یہودی و یونانی فلسفے اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے اس عجیب و غریب امتزاج کو سمجھ سکتے۔ چنانچہ انھوں نے یا تو حضرت عیسےٰؑ کو ایک مجسّم خدا کے طور پہ پوجنا شروع کر دیا، یا قدیم زمانہ کی تبرّکات پرستی کی طرف عود کیا یا حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ مطہرہ کو چھوٹی ٹیپ ٹاپ والی ایک دیوی بنا کر پوجنے لگے[2] ــــ کالیریڈیوں، (Collyridians) کے اہم فرقے نے تو یہاں تک غلو کیا کہ عیسائیوں کے دیو منڈل میں سے خدا کو خارج کر کے اس کی جگہ حضرت مریم کو دے دی اور ایک بل دار کیک کا چڑھاوا چڑھا کر ان کی پوجا کرنے لگا۔ اس بل دار کیک کو Collyris کہتے تھے، جس پہ

---

[1] خدا کی نسبت باپ کے لفظ کا استعمال اسی وجہ سے نہیں کیا گیا کہ اس زمانہ کے عیسائیوں نے ابوت الٰہی کے تصور کو بگاڑ دیا تھا۔

[2] Isaurian بادشاہوں نے اسلام سے بالواسطہ متاثر ہو کر ایک صدی سے زیادہ مدّت تک عیسائیت کے تنزّل کے خلاف جدوجہد کی اور اس امر کی کوشش میں پورا زور لگا دیا کہ وہ کسی طرح اپنے معلّم عظیم کی تعلیمات کی طرف عود کر جائے۔ لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

[3] موشیم کی تاریخِ کلیسا (Mosheim's *Ecclesiastical Hist.*) جلد اوّل صفحہ ۴۳۲۔

اس فرقے کا نام رکھا گیا۔ نیس کی کونسل (The Council of Nice) میں جہاں حضرت عیسیٰؑ کی ماہیت و جبلت کے بارے میں آخری فیصلہ کیا گیا، بعض ایسے لوگ بھی تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ (God the father) "آسمانی باپ" کے علاوہ دو اور خدا ہیں یعنی حضرت مسیح اور حضرت مریم۔ کہا جاتا ہے کہ رومی کلیسا والے اب بھی حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کو تثلیث کا تکملہ تصوّر کرتے ہیں۔

توہّم کی طویل رات میں عیسائی نبیٔ ناصری کی تعلیم سے بہت دُور بھٹک گئے تھے۔ بتوں، ولیوں اور متبرک باقیات کی پرستش دینِ عیسوی کا ایک جزوِ لاینفک بن چکی تھی۔ وہ سب طور طریقے جن کی حضرت عیسیٰؑ نے مذمت کی تھی، وہ سب خبائث و رذائل جن کو انھوں نے ممنوع قرار دیا تھا ایک ایک کر کے اُن کے مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ مقدّس سرزمین جس پر اس محترم معلّم نے زندگی کے دن گذارے تھے، معجزوں اور خارقِ عادت شعبدوں کے بادلوں میں گھر گئی تھی اور عیسائیوں کے دماغی اعصاب تقلید اور اندھا دھند اعتقاد کی بدولت مفلوج ہو گئے تھے[1]

۴۲۳

[1] موشیم کی "تاریخ کلیسا" (Mosheim's *Ecclesiastical Hist.*) جلد اول صفحہ مزید ملاحظہ کیجئے ہیلم کی "انگلستان کی دستوری تاریخ" (Constitutional Hist of England) باب ۲ صفحہ ۸۵۔ ان کتابوں کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جو دعویٰ کیا جاتا ہے، کہ اسلام میں جو جو اچھی باتیں ہیں وہ سب اُس نے یہودیت یا عیسائیت سے اخذ کیں، اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے۔ ڈوئش Deutsch کہتا ہے: "یہ ایک عام قاعدہ بن گیا ہے کہ اسلام میں جو جو خوبیاں ہیں اُنھیں عیسائیت سے منسوب کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نظریہ دیانت دارانہ تحقیق کے نتائج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ محمدؐ کے زمانہ میں جزیرۂ عرب کی عیسائیت ناگفتہ بہ حالت میں تھی .... اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اُس کے مقابلے میں نو جدید مصری Modern Amharic عیسائیت بھی، جس کے بارے میں ہم نے تحیّر انگیز قصے سُنے ہیں خالص اور اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۵۴ صفحہ نمبر ۳۱۵۔

جو بیہودگیاں ہم نے اُوپر بیان کی ہیں، ان سب کا قلع قمع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقصدِ زندگی تھا۔ جب بھی اس ملک الکلام نے (جس لقب سے اسے بجا طور پر ملقب کیا گیا ہے) اپنا آوازۂ حق بلند کیا (جس میں کلام خدا کی الہامی گونج ہوتی تھی، تو چاہے اس کے مخاطب عرب کے بُت پرست قبیلے ہوں یا مسخ شدہ عیسائیت اور یہودیت کے پیرو، اس نے کبھی عقل کی سرحدوں سے تجاوز نہ کیا اور ہمیشہ ان لوگوں کو اپنے عقائد کی انسانیت سوز مہملیت پر شرمندہ کیا۔ وحدتُ اللہ کا داعیٔ اعظمؐ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح تاریخ کے میدان میں انسان کے اس رجعت پسندانہ رجحان سے کہ وہ مخلوق ہستیوں کو خالقِ کائنات کا شریک گردانے سرگرم جہاد دکھائی دیتا ہے۔ قرآن میں بارہا ذیل کی عبارتوں کی سی جوش و خروش اور آتش نوائی سے بھری ہوئی عبارتیں نظر آتی ہیں:۔

"تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ اس رحمٰن و رحیم کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں، رات اور دن کے لگاتار ایک دوسرے کے بعد آنے میں اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے ابر آسمان سے برساتا ہے اور جس کے ذریعے وہ مُردہ زمین کو ازسرِ نَو زندگی بخشتا ہے اور پھر زمین پہ ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مطیعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں ـــ ان سب چیزوں میں سمجھدار لوگوں کے لیے اللہ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن ان کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا خدا بناتے ہیں اور اُن کے ساتھ ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جیسی انھیں خدا سے رکھنی چاہیے"[1]

(البقرۃ ۱۶۳ - ۱۶۴ - ۱۶۵)

---

[1] نوٹ:۔ اگرچہ قرآن مجید کی انہی عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے جن کا انگریزی ترجمہ مصنف نے اقتباساً دیا ہے، تاہم اس نے جو حوالے دیئے ہیں وہ بڑی حد تک غلط ہیں اس لیے ان کی تصحیح ضروری سمجھی گئی ہے۔ اردو ترجمہ کی عبارت مترجم نے خود کی ہے۔ (مترجم)

ان الفاظ میں گمراہ لوگوں کے ساتھ کتنی گہری ہمدردی مضمر ہے !

مکرّر :۔

" وہی ہے جو تمھیں بجلیاں دکھا کر ڈراتا بھی ہے اور اُمیدیں بھی دلاتا ہے اور جو پانی سے لدے ہوئے بادل اُٹھاتا ہے ۔ بادلوں کی گرج اس کی خوبیوں کی اور فرشتے اس کی ہیبت کی تسبیح کرتے ہیں ..... وہ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے اور جب لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ان بجلیوں کو جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے ....

اسی کو پکارنا حق ہے ۔ وہ دوسری ہستیاں ، جنھیں یہ لوگ اسے چھوڑ کر پکارتے ہیں ، اُن کی دُعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں ۔ انھیں پکارنا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر یہ سمجھے کہ پانی خود اس کے منہ تک پہنچ جائے گا ، حالانکہ وہ کبھی اس تک نہیں پہنچ سکتا "

(الرّعد ۱۲ تا ۱۴)

" اس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور وہ بہت بالا و برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے ۔ اس نے انسان کو ایک ننھی سی بوند سے پیدا کیا .... اور اب ان کو دیکھو کہ وہ کھلے بندوں جھگڑالو اور بڑبولا بن گیا ۔ اس نے چوپائے بنائے ، جن سے تمھیں گرم پوشاک بھی حاصل ہوتی ہے ، خوراک بھی ، اور دوسرے فائدے بھی ۔ جب تم انھیں چرنے کو بھیجتے ہو اور شام کو گھر واپس لاتے ہو تو وہ تمہارے لیے سرمایۂ جمال بنتے ہیں .... "

(النحل ۳ - ۴ - ۵ - ۶)

" اور اس نے رات اور دن ، سُورج اور چاند کو تمھارے کاموں پر مامور کر رکھا ہے ، اور تمام ستارے بھی اس کے تابع فرمان ہیں .... وہی ہے جس نے سمندر کو تمھارے لیے مسخّر کر رکھا ہے .... اور تم دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے چلتے ہیں .... تاکہ تم اس کے شکر گذار بنو .... پھر کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے ایک برابر ہوں ؟ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو

گننا چاہو تو گن نہیں سکتے۔ اللہ فی الحقیقت بڑا بخشنے والا اور رحیم ہے۔ وہ تمہارے کھلے اور چھپے دونوں کاموں سے واقف ہے۔ رہیں وہ ہستیاں جنھیں لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، وہ کچھ پیدا نہیں کرتیں، بلکہ خود مخلوق ہیں، وہ مردہ ہیں نہ کہ زندہ۔"

(النحل ۱۱ - ۱۲ - ۱۴ - ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ - ۲۰)

"اللہ، جس کے سوا کوئی خدا نہیں، زندۂ جاوید ہے اور کائنات کا قائم رکھنے والا ہے۔ اُسے نہ نیند آتی ہے، نہ اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں کوئی سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں سے اوجھل ہے اُسے بھی اور جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے۔ جو کچھ اس کے علم میں ہے وہ اُن کے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا، سوائے اس صورت کے کہ وہ خود کسی چیز کا علم انھیں بخشے۔ اس کی کرسیٔ حکومت آسمانوں اور زمین دونوں کو محیط ہے، اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں...."

(البقرہ ۲۵۵)

"وہ دن کو رات کے پردے سے ڈھانپ دیتا ہے اور پھر رات دوڑتی ہوئی اس کا تعاقب کرتی ہے۔ سورج، چاند اور تارے اس کے مطیع ہیں۔ خبردار رہو کہ اُسی کا کام ہے خلق کرنا اور حکم فرمانا۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔"

(الاعراف ۵۴)

"کہو کہ اللہ ایک ہے اور کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اُس نے کسی کو اور نہ اُس کو کسی نے جنا، اُس کا کوئی ہمسر نہیں۔"

(الاخلاص)

"سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو سارے جہانوں کا رب ہے، رحمٰن اور رحیم ہے اور روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا یعنی اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے فضل کیا، جو تیرے

معتوب نہیں ہوئے اور جو بھٹک نہیں گئے۔"

(الفاتحہ - ا تا ۷)

"میں پناہ لیتا ہوں خدائے صبح کی ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے بنائی۔"

(الفلق ۱ - ۲)

"تم چاہے پکار کر بات کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات کو بلکہ اس سے بھی مخفی تر بات کو جانتا ہے۔"

(طٰہٰ - ۷)

"اُن سے پوچھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہو سب کچھ اللہ کا ہے، جس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اُوپر لازم کر لیا ہے۔"

(الانعام - ۱۲)

"اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، جن سے اس کے سوا کوئی واقف نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ بحر و بر میں کیا کچھ ہے۔ کوئی پتّا ایسا نہیں جھڑتا جس کا اُسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی چھپا ہُوا دانہ ایسا نہیں اور کوئی ہری یا سُوکھی چیز ایسی نہیں جو اُس کی کھلی ہوئی کتاب میں درج نہ ہو۔ وہی ہے جو رات کو تمھاری رُوحیں قبض کر لیتا ہے اور دن کے وقت تم جو کام دھندا کرتے ہو اُس سے واقف ہے۔ پھر دوسرے روز وہ تمھیں اُٹھاتا ہے تاکہ تمھاری زندگی کی مقررہ میعاد پوری ہو۔ آخر کار تم اُس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، اور اس وقت وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کیا کرتے رہے ہو۔"

(الانعام ۵۹ - ۶۰)

"وہ اللہ ہی ہے جو دانے اور گٹھلی کو پھوڑتا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مُردہ کو زندہ سے۔ یہ ہے اللہ! تم کدھر بہکے چلے جاتے ہو؟"

(الانعام ۹۵)

"وہی پردۂ شب کو چاک کر کے صبح نکالتا ہے، اسی نے آرام کے لیے رات بنائی اور اُسی نے سورج اور چاند کو دن اور رات کے حساب کے لیے پیدا کیا۔ یہ ہے وہ اہتمام جو اس

توانا و دانا رب نے کیا ہے۔"

(الانعام ۹۷)

"یہ ہے اللہ تمھارا پروردگار۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا اسی کی بندگی کرو، کیونکہ وہ ہر چیز کا کفیل ہے۔"

(الانعام ۱۰۲)

"نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، کیونکہ وہ نہایت باریک بین اور باخبر ہے۔"

(الانعام ۱۰۳)

"کہو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔"

(الانعام ۱۶۲)

"کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں سب وہ جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں، اور وہ پرندے بھی جو پَر پھیلائے اُڑ رہے ہیں؟ سب کو اپنی اپنی دُعا اور اپنی اپنی تسبیح معلوم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے، اور اُسی کی طرف ہر ایک کو پلٹنا ہے۔"

(النّور - ۲۴ - ۴۱ - ۴۲)

"وہی زمین اور آسمانوں کی پادشاہی کا مالک ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔"

(الاعراف - ۱۵۸)

"وہی ازل سے ابد تک زندہ رہنے والا ہے۔ اُس کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں۔ تم سب ایمانِ خالص سے اُسے پکارا کرو۔"

(المؤمن - ۶۵)

"میری نماز اور میری عبادت، میری زندگی اور میری موت، سب اللہ ربّ العٰلمین کے

لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ۔"

(الانعام ۱۶۲ - ۱۶۳)

" وہی ہے جس نے تمھیں بنا کھڑا کیا، جس نے تمھیں کان اور آنکھیں دیں اور دل بھی دیا لیکن کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اس کے شکر گذار ہیں! وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا اور اسی کی طرف تم اکٹھے لوٹو گے ۔"

(الملک ۲۳ - ۲۴)

"اے خدا مجھے ان گناہ گار قوموں میں داخل نہ کر ۔"

(المومنون ۹۴)

" وہی ہے جس نے رات تمھاری اوڑھنی کے طور پہ بنائی اور نیند تمھارے آرام کی خاطر، اور جس نے دن تمھارے دوبارہ جی اُٹھنے کی خاطر بنایا ۔"

(الفرقان ۴۷)

"کون ہے اُس کے سوا جو مصیبت زدوں کی پکار سنتا ہے جب وہ اُسے پکارتے ہیں، اور اُن کی گتھیاں سُلجھا دیتا ہے اور جو تمھیں رُوئے زمین پر اپنا نائب بناتا ہے ۔"

(النحل ۶۲)

"...... اللہ زبردست، ہر چیز کا جاننے والا گناہ کا بخشنے والا اور توبہ کا قبول کرنے والا ......"

(المؤمن ۱-۲)

"کہو کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رَبّ بنانے کے لیے تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اُس کا ذمہ دار وہ خود ہوتا ہے۔ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔ بالآخر تم سب کو اپنے رَبّ کی طرف لوٹنا ہے۔ اُس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تمھیں جتلا دے گا ۔"

(الانعام ۱۶۵)

" وہ ہر چھپی اور کھلی چیز کا جاننے والا، بہت بڑا اور سب سے اُونچا ہے ...... چاہے کوئی

چپکے سے بات کہے یا پکار کر، چاہے کوئی رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہو یا دن کی روشنی میں سرِ بازار پھر رہا ہو، اُس کے لیے سب یکساں ہیں۔"

(الرّعد ۸ - ۹)

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک طاق ہو جس میں ایک چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک شیشے میں ہو اور شیشہ ایک طاق میں رکھا ہو، شیشے کی یہ شان ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ وہ ایک مبارک (کثیر المنافع) درخت یعنی زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو، جو نہ کسی آڑ کے مشرق کی طرف ہو نہ مغرب کی طرف اور جس کا تیل ایسا بھڑک اُٹھنے والا ہو کہ اگر اس کو آگ نہ بھی لگے تو پھر بھی وہ خود بخود جل پڑے اور جب اس کو آگ لگ جائے تو نورٌ علیٰ نور ہو جائے۔ اللہ اپنے اس نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی کرتا ہے اور اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"

(النور - ۳۵)

"وہ ایسے گھروں میں عبادت کرتے ہیں جنھیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کا ذکر کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان گھروں میں وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کرتے ہیں۔"

(النّور - ۳۶)

"جن لوگوں کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامتِ نماز و ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔ انجام اُن لوگوں کا یہ ہوگا کہ اللہ انھیں اُن کے اعمال کا بہت ہی اچھا بدلہ دے گا اور مزید اپنے فضل سے نوازے گا۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔"

(النّور ۳۷ - ۳۸)

"جن لوگوں نے کُفر کیا اُن کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹیل میدان میں سراب جسے پیاسا دُور سے پانی سمجھے ہوئے تھا، مگر جب وہاں پہنچا تو کچھ بھی نہ پایا، بلکہ قضائے الٰہی کو پایا، چنانچہ اللہ نے اس کا پورا پورا حساب چکا دیا۔ اللہ کو حساب لینے دیر نہیں لگتی۔"
(النّور ۳۹)

"یا پھر اُن کی مثال ایسی ہے جیسے بڑے گہرے سمندر میں اندرونی اندھیرے جن پر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اُس پر ایک اور موج، اور اُس کے اُوپر بادل۔ غرض اُوپر تلے بہت سے اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، ایسے اندھیرے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ جسے اللہ نور نہ بخشے اُسے کہیں سے بھی نور میسّر نہیں ہو سکتا۔"

(النّور۔ ۴۰)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ پرندے جو پَر پھیلائے اُڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی دُعا اور اپنی اپنی تسبیح جانتا ہے، اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے واقف ہے۔"

(النّور۔ ۴۱)

"کیا تم کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ ایک بادل کو دوسرے بادل کی طرف آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اُن کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے اور اُنھیں سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے؟ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس بادل کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے ہیں اور وہ آسمان سے اولوں کے پہاڑ برساتا ہے۔ پھر وہ جن پر چاہتا ہے انھیں گراتا ہے اور جنھیں چاہتا ہے اُن سے بچا لیتا ہے۔ اُس کے کوندے کی لپک کا یہ حال ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اب آنکھیں نکال لے جائے گی۔"

(النّور۔ ۴۳)

"رات اور دن کا اُلٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں آنکھوں والوں کے لیے ایک سبق ہے۔"

(النّور۔ ۴۴)

پیغمبرِ اسلامؐ نے قرآن کی شکل میں مظاہرِ فطرت سے خدا کی قدرت وحکمت کی جو شہادتیں پیش کیں اُن کی بہترین مثالوں میں سے ایک مثال سورۂ الرحمٰن ہے، جسے مغربی مصنّفین نے بجا طور پر "اسلام کی بنیڈسٹی" (Benedicite)[1] کہا ہے۔

---

[1] عہد نامۂ عتیق کے باب "سلیمان کی غزل الغزلات" کی ایک مناجات

"سورج اور چاند حساب کے ساتھ چلتے ہیں اور بوٹیاں اور پیڑ اسے سجدہ کرتے ہیں اور اُسی نے آسمان کو اُونچا کیا اور ایک ترازو متعین کی تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف سے سیدھی ترازو تولو اور تول کو نہ گھٹاؤ۔ اُسی نے خلقت کے واسطے زمین بنائی جس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل پر غلاف ہوتا ہے اور غلّہ ہے جس میں بھُس بھی ہوتا ہے اور خوشبودار پودے بھی ہیں۔"

(الرحمٰن - ۵ تا ۱۲)

"اس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بنایا اور جنّات کو خالص آگ سے۔"

(الرحمٰن - ۱۵)

"پھر اُس نے آسمان بنانے کی طرف توجہ کی، جو اُس وقت محض ایک دھوآں سا تھا۔........"

(حمٓ - ۱۱)

....

"وہ دونوں مشرقوں اور مغربوں کا مالک ہے......"

(الرحمٰن - ۱۷)

"اس نے دو دریاؤں کو یوں پہلو بہ پہلو چلایا کہ وہ بظاہر باہم ملے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت ان کے درمیان ایک ایسا پردہ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتے۔"

(الرحمٰن ۱۹-۲۰)

"ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے۔"

(الرحمٰن - ۲۲)

"اُسی کے ہیں وہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اُونچے کھڑے نظر آتے ہیں۔"

(الرحمٰن - ۲۴)

"اُن میں سے ہر ایک فانی ہے اور صرف تمہارے عظمت و احسان والے خدا کا چہرہ

باقی رہے گا۔"

(الرحمٰن ۔۲۶ ۔ ۲۷)

"سب آسمانوں اور زمین والے اُسی سے اپنی اپنی حاجتیں مانگتے ہیں ۔وہ روز ایک نیا کام کرتا ہے ۔"

(الرحمٰن ۔ ۲۹)

"ہر انسان کی تقدیر کی تختی ہم نے اس کے گلے میں لٹکا رکھی ہے اور قیامت کے دن ہم اسے اس کا نوشتۂ اعمال دکھائیں گے ، جسے وہ ایک کھلی کتاب کی طرح پائے گا ۔"

(بنی اسرائیل ۔۱۳)

"قسم ہے انسان کی رُوح کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے درست بنایا اور اُسے بدکرداری و پرہیزگاری دونوں کی تمیز بخشی ، یقیناً وہ شخص مُراد کو پہنچا جس نے اپنی رُوح کو پاک کر لیا اور نامُراد ہُوا وہ شخص جس نے اُسے خاک میں ملا دیا ۔"

(الشّمس ۔ ۷ تا ۱۰)

"کیا تجھے خدائے رحمٰن کے بنائے ہوئے میں کچھ خلل دکھائی دیتا ہے ؟ دوبارہ نگاہ ڈال ۔ کہیں بھی تجھے کوئی نقص نظر آتا ہے ؟ ایک بار پھر نگاہ ڈال ۔تیری نگاہ عیب نکالنے میں ناکام ہو کر اور تھک کر لوٹ آئے گی ۔"......

(الملک ۔۳ ۔ ۴)

"وہ مری ہوئی زمین کو دوبارہ زندگی بخشتا ہے ۔اسی طرح تم دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے ۔"

(الروم ۔ ۱۹)

"یہ آسمان اور یہ زمین دونوں اس کے حکم سے قائم ہیں ۔ بالآخر جب وہ تمھیں پکارے گا تو تم زمین کے اندر سے نکل کر کھڑے ہو جاؤ گے ۔"

(الروم ۔ ۲۵)

"جب سورج تہ کر دیا جائے گا ، جب تارے گر پڑیں گے ، جب پہاڑ چلنے لگیں گے جب

اونٹنیاں بے مہار پھریں گی، جب جنگلی جانوروں میں ہلچل مچ جائے گی، جب سمندر اُبلنے لگیں گے، جب رُوحوں کے جوڑے بندھیں گے، جب ان بیٹیوں سے جو جیتی گاڑ دی گئی تھیں یہ پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی پاداشں میں ماری گئیں، جب اعمالناموں کے ورق کھولے جائیں گے، جب آسمان چھلکے کی طرح اُتار دیئے جائیں گے، جب دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی اور جب جنّت قریب آجائے گی، اُس وقت ہر رُوح کو پتہ چل جائے گا کہ وہ کیا ساتھ لے کر آئی ہے۔"

(التکویر۔ ا تا ۱۴)

"(اے محمدؐ) تمھیں اُس گھڑی کا کیا علم ہے؟ اُس کا علم صرف تمھارے خدا ہی کو ہے، تمھارا کام تو صرف اتنا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو جو ڈرنے والے ہیں اُس سے ڈراؤ۔"

(النّٰزعٰت ۴۳۔۴۴۔۴۵)

"تمھیں کیا خبر ہے کہ وہ ہو کر رہنے والی چیز کیسی ہے؟ ثمود اور عاد نے اس کھڑکے والی چیز کو جھٹلایا۔ چنانچہ ثمود تو ایک زور کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے اور عاد ایک تیز و تُند ہوا سے برباد ہو گئے۔"

(الحاقّۃ۔ ۳ تا ۶)

پھر بھی، اس قدرت و جبروت کے باوجود اس کی ربوبیت و رحمت ہمہ گیر ہے۔

"قسم ہے چڑھتی دُھوپ کی اور چھائی ہوئی رات کی کہ تمھارے رَبّ نے نہ تمھارا ساتھ چھوڑا اور نہ تم سے بیزار ہُوا۔ یقیناً تمھارا مستقبل ماضی سے بدرجہا بہتر ہو گا۔ بالآخر وہ تمھیں اتنا کچھ دے گا کہ تمھارا دل خوش ہو جائے گا۔ کیا اُس نے تمھیں ایک یتیم نہیں پایا اور پھر تمھیں ٹھکانا نہیں دیا؟ تمھیں بھٹکتا نہیں پایا اور پھر ہدایت نہیں دی؟ تمھیں نادار نہیں پایا اور پھر تمھیں مالدار نہیں بنایا؟ (اس کے شکریئے میں) یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور خدا کے احسانوں کا تذکرہ کرتے ہو۔"

(الضّحٰی)

"کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمھیں یونہی (کسی حکمت کے بغیر) پیدا کر دیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہیں لائے جاؤ گے؟"

(المؤمنون۔ ۱۱۵)

"..... اے ہمارے رَبّ، ہم سے مواخذہ نہ کر، اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے .... ہم سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے ......"

(البقرہ - ۲۸۶)

"اے مولا، ہم پر عفو و رحم کر، کیونکہ تو سب رحیموں سے اچھا رحیم ہے۔"

(مومنون - ۱۱۸)

"......... کوئی شخص کسی اور کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور ہم کبھی سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔"

(بنی اسرائیل - ۱۵)

"قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں اُتارا ہم ہیں آگاہ کرنے والے۔"

(الدخان - ۲ - ۳)

"ہم نے قرآن تم پر اس لیے نہیں اُتارا کہ تمھارے لیے باعثِ تکلیف ہو۔"

(طٰہٰ - ۲)

یوں رواں دواں چلی جاتی ہے یہ معجز کتاب، جس کا خطاب انسان کے اشرف جذبات سے ہے، یعنی اُس کے شعورِ باطنی سے اور اس کی حِسِّ اخلاقی سے، اور یوں یہ بُت پرستانہ عقائد کی انسانیت سوزی کو بے نقاب اور ثابت کرتی ہے۔ کوئی سورت ایسی نہیں جس میں خدا کی قدرت، رحمت اور وحدت کے موضوع پر کوئی پُرجوش و خروش عبارت نہ ہو۔ قادرِ مطلق کے بارے میں اسلام کا جو تصور ہے اس کے متعلق عیسائی مصنّفین غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ خدائے اسلام کو یوں پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ "ایک بے رحم اور جابر حاکم ہے، جو انسانوں سے شطرنج کے مہروں کی طرح کھیلتا ہے اور اپنی بازی کا نقشہ جماتے وقت اس امر کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا کہ مہروں کا کیا حشر ہو گا۔" آئیے ہم یہ دیکھیں کہ آیا یہ خاکہ درست ہے۔ اسلام کا خدا قادرِ مطلق ہے، عالِمِ کل ہے، عادلِ کامل ہے، رَبُّ العٰلمین ہے، آسمانوں اور زمین کا صانع ہے، زندگی اور موت کا خالق ہے جس کے قبضۂ اختیار میں حکومت

ہے اور اٹل قوت ، اور جو عرشِ معلّٰی کا مالک اور ساری موجودات پر حاوی ہے۔ قوی ہے، متعال ہے ، خلاق ہے ، صنّاع ہے ، صورت گر ہے ، حکیم ہے ، عادل ہے ، حق ہے سریع الحساب ہے ۔ وہ ہر شخص کی نیکی و بدی کی چیونٹی کے برابر مقدار سے بھی واقف ہے اور اس کے فرمانروا بندے جس انعام کے مستحق ہیں اس کے ایک ذرہ سے بھی وہ انھیں محروم نہیں رکھتا ۔ لیکن قادرِ مطلق اور علیم و حکیم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ بادشاہ ہے ، ایک مقدس ہستی ہے ، امن قائم رکھنے والا ہے ، وعدے کا پکّا ہے ، اپنے بندوں کا محافظ ہے، یتیموں کا ملجا ہے ، محروموں کو دلاسا دینے والا ہے ، مصیبت زدوں کا آسرا ہے ۔ وہ نعمتوں کا مالک ہے ، ایک آقائے کریم ہے ، رحمٰن ہے ، سمیع ہے ، شہ رگ سے بھی قریب تر ہے ، رحم کھانے والا ہے ، انتہائی درجے کا درگزر کرنے والا ہے ، جسے انسان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ محبت ہے جتنی ایک مادہ پرندے کو اپنے بچّوں سے ہوتی ہے ۔

قادرِ مطلق کا رحم و کرم قرآن کے سب سے شاندار موضوعوں میں سے ایک موضوع ہے ۔ وہ لقب یعنی الرّحمٰن ، جس سے ہر سورت شروع ہوتی ہے اور جس سے خدا بار بار پکارا جاتا ہے ، بجائے خود اس امر کا مظہر ہے کہ اس رحمتِ ربّی پر جس نے ساری موجودات کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے کیسا صمیمی ایمان قرآن کی روح میں جاری و ساری ہے [1]

پہلے دو مذاہب کے پیروؤں کی اخلاقی پستی کو دیکھ کر معلّمِ اسلام کے دل کو انتہائی رنج ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے نبیوں کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جو توہم پرستانہ رسمیں اپنے یہاں رائج کی تھیں وہ سخت الفاظ میں ان کی مذمت کرتا ہے ۔ مذہبی جوش کی وہ آگ جو اشعیاہ (Isaiah) اور یرمیاہ (Jeremiah) کے سینوں میں دہکتی تھی از سرِ نو ایک اور شخص کے سینے میں بھڑک اٹھی جو اُن سے بھی بڑا انسان تھا ۔ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کی زجر و توبیخ کی ، لیکن انسانیت کے انحطاط کو دیکھ کر جو دردناک آواز ، جو صدائے شیون ، اس کے منہ سے نکلی اس کے ساتھ ہی اسی

---

[1] الفرقان ۔ ۵۰ ۔ القصص ۷۳ ۔ الشوریٰ ۳ وغیرہ وغیرہ ۔

سے بھی بلند نہ اُمید کی ایک صلائے عام تھی۔

قرآن یہودیوں کو چھوٹے خداؤں اور بتوں کی پوجا اور عزیز (عزرا) (ezra) کی مبالغہ انگیز تعظیم پر اور عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی پرستش پر نہایت سختی کے ساتھ ملامت کرتا ہے۔

"کیا تم نے اُن لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنھیں کتاب کے علم میں سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے۔ وہ بتوں اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔"

(النساء - ۵۱)

"یہودی کہتے ہیں کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے - یہ بے بنیاد باتیں ہیں جو یہ لوگ اگلے منکروں کی تقلید میں منہ سے نکالتے ہیں.......... انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رَبّ بنا لیا ہے........ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں........"

(التوبہ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲)

"یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔"

(المائدہ - ۱۸)

"ان اہلِ کتاب میں سے بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں تمھارے ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا دیں........... نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور تم جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے اپنے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے پاس پہنچ کر پاؤ گے۔"

(البقرہ - ۱۰۹ - ۱۱۰)

"وہ (یہود و نصاریٰ) کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہو گا.. ....اُن سے کہو کہ اگر وہ سچے ہیں تو اس پر اپنی دلیل لائیں۔ حق یہ ہے کہ جو شخص بھی خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو اور نیکوکار بھی ہو اس کے رَبّ کے پاس اُس کا اجر ہے۔"

(البقرہ - ۱۱۱ - ۱۱۲)

"اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ اللہ کا رسولؐ تھا اور اس کا کلام (یعنی حکم) ...... لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین (خدا) ہیں۔ باز آجاؤ اس بات سے ...... مسیح نے کبھی اس بات کو ناگوار نہ سمجھا کہ اُسے اللہ کا ایک بندہ کہا جائے۔"

(النساء ۱۷۱، ۱۷۲)

"کسی انسان کی مقدرت نہیں کہ اللہ تو اُس کو کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ تم کامل ربانی بن جاؤ جیسا کہ اس کتاب کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔"

(آل عمران - ۷۹)

ذیل کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قسم کے تصورات کے بارے میں قرآن کا کیا خیال تھا:-

"وہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ یہ انتہائی بے ہودہ بات ہے جو تم لوگوں نے کہی ہے۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے، زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگ رحمٰن سے اولاد منسوب کرتے ہیں، حالانکہ رحمٰن کے شایانِ شان نہیں کہ اس کے کوئی بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں میں کوئی ایسا نہیں جو بندے کی حیثیت سے اس کے حضور پیش ہونے والا نہیں۔ وہ سب پر محیط ہے۔"

(مریم - ۸۸ - ۸۹ - ۹۰ - ۹۱ - ۹۲ - ۹۳ - ۹۴)

لیکن یہ صاحبِ الہام مبلغ جو حق کی اشاعت کے لیے مبعوث ہوا اچھے اور بُرے لوگوں میں تمیز کرتا ہے۔

"لیکن سب اہلِ کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پہ گامزن ہیں۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں، اس کے آگے سربسجود ہوتے ہیں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں سرگرم

رہتے ہیں۔ ان لوگوں کا شمار صالحین میں ہوتا ہے۔"

(آلِ عمران - ۱۱۳-۱۱۴)

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی منافرتیں، نسطوریوں (Nestorians) اور مونوفیزیوں (monophysites) کی وحشیانہ لڑائیاں، مختلف فرقوں کے باہمی مناقشے، بازنطینی پادریوں کے رُوح فرسا لفظی تنازعے یہ سب عبارتِ ذیل کی قسم کی ملامتوں کے مورد بنتے ہیں:

"عیسٰی ابن مریم اور دوسرے رسُولوں کو ہم نے روشن نشانیاں عطا کیں.........اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان کے بعد ان کی اُمت کے جو لوگ ہوئے وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ لیکن اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہ وہی کرتا ہے۔"

(البقرۃ - ۲۵۳)

"ایک زمانے میں سب انسان ایک ہی طریقے پر تھے۔ پھر اللہ نے اپنے پیغمبر بھیجے، جو خوشخبریاں بھی دیتے تھے اور ڈراتے بھی تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک کتاب برحق نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان جو اختلافات ہوں اُن کا فیصلہ کر دے۔ لیکن اختلاف کئے تو صرف اُن لوگوں نے کئے جن کو وہ کتاب عطا کی گئی تھی، اور محض اس لیے کہ ان میں باہمی ضد اضدی تھی......"

(البقرہ - ۲۱۳)

"اے اہلِ کتاب، تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو؟.........ایسی بات پر کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کچھ علم نہیں؟"

(آلِ عمران - ۶۴-۶۵)

"نئے مذہب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نوعِ انسانی کے دل میں اس حقیقت وصداقت کا ایک جیتا جاگتا اور اک پیدا کرے یا از سرِ نو بروئے کار لائے جو زندگی کے عام علائق در روابط میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ایک مشہور مصنّف کے الفاظ میں "اس نئے صحیفۂ آسمانی کا اخلاقی مقصدِ غائی عام انسانی فرائض اور باہمی شفقت ومحبت کے جانے پہچانے طریقوں کی حدود کے اندر مقرر کیا گیا۔"

"وہ کچھ لوگ تھے جو گذر گئے۔ انھوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کا حصہ ہے۔ جو تم کماؤ گے وہ تمھارا

حصہ ہوگا۔ان کے کیے کی پرسش تم سے نہ کی جائے گی "

(البقرہ - ۱۳۴)

"اللہ کسی متنفس پر اس کی طاقت برداشت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا۔جس نے جو نیکی کی اس کا پھل اسی کو ملتا ہے اور جس نے جو بدی کی اُس کی سزا اُسی کو دی جاتی ہے "

(البقرہ - ۲۸۶)

"مبارک ہے وہ شخص جو اپنا مال اپنے آپ کو پاک کرنے کی خاطر (حق داروں کو) دے دیتا ہے اور جو کسی پر احسان کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کا بدلہ ملے بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر "

(الضحیٰ - ۱۷ - ۱۸ - ۱۹ - ۲۰)

"نیک بخت ہیں وہ لوگ جو ازراہِ شفقت مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، یہ کہہ کر کہ ہم جو تم کو کھانا کھلا رہے ہیں تو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر۔ہم تم سے نہ اس کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری "

(الدہر - ۸ - ۹)

"خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے مہربانی کا سلوک کرو، لوگوں سے راست بازانہ بات کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو "

(البقرہ - ۸۳)

"اپنے والدین کے ساتھ عاجزی اور احترام کا سلوک کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے حق میں یہ دُعا مانگا کرو کہ 'پروردگار! ان پر رحم فرما، جس طرح انھوں نے مجھے بچپن میں پالا تھا، جب میں بالکل بے بس تھا "

(بنی اسرائیل - ۲۴)

"اگر تم صدقات علانیہ طور پر دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر دو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے "

(البقرہ - ۲۷۱)

"تمھیں جو کچھ دیا گیا ہے اُس میں سے دوسروں کو دو اس سے پیشتر کہ وہ دن آئے جب نہ کوئی تجارت ہوگی، اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی، نہ کوئی سفارش۔"

(البقرہ - ۲۵۴)

"کیا تم جانتے ہو کہ گھاٹی کا کیا مطلب ہے؟ وہ کسی کی گردن کا غلامی سے چھڑا دینا ہے، یا کسی یتیم رشتہ دار کو یا کسی خاک نشین کو فاقے کی حالت میں پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے (جس نے ایسا کیا وہ) اُن لوگوں میں شمار ہوا جو ایمان والوں کو صبر اور رحم کی تلقین کرتے ہیں۔"

(البلد - ۱۱ تا ۱۷)

"حیف ہے اُن لوگوں پر........جو التقامر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے انکار کرتے ہیں۔"

(ل)

"اے ایمان والو، اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دل دُکھا کر خاک میں نہ ملا دو......"

(البقرہ - ۲۶۴)

"میٹھا بول اور چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے۔"

(البقرہ - ۲۶۳)

"سود خواری ترک کر دو........"

(البقرہ - ۲۷۸)

"جو شخص اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسی ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اُس پر جب زور سے مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنا مال محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ٹیلے پر ایک باغ ہو، اُس پر زور کی بارش ہو جائے تو وہ دُونا چوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو۔"

(البقرہ - ۲۶۴ - ۲۶۵)

"اے داؤد، ہم نے تجھے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے، لوگوں پر عدل و انصاف سے حکومت کر اور اپنی ہوا و ہوس پر نہ چل تاکہ تو اللہ کی راہ سے بھٹک نہ جائے۔"

(صٓ - ۲۶)

"جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی طمع نہ کرو......"

(النساء ۳۲)

"اچھائی اسی میں نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف، بلکہ اس میں ہے کہ آدمی اللہ کو دل سے مانے...... اور نیک کام کرے......"

(البقرہ - ۱۷۷)

"حسنِ عفو کا طریقہ اختیار کرو اور نیک کاموں کی تلقین کئے جاؤ، جاہلوں سے کنارہ کر لو اور اگر کبھی شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو......" (الاعراف - ۱۹۹، ۲۰۰)

"یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ...... اپنا عہد پورا کرو...... اور زمین پر اترا کر نہ چلو......"

(بنی اسرائیل-۳۴-۳۷)

"جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے ......"

(النحل - ۵۸)

"مفلسی کے ڈر سے اپنی اولاد کو ہلاک نہ کرو۔ تمہاری اولاد کو بھی اور تم کو بھی ہم روزی دینے والے ہیں۔ ان کا ہلاک کرنا ایک گناہِ کبیرہ ہے۔"

(بنی اسرائیل -۳۱)

"......اُس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تمہیں ان کی بدولت آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی کا رشتہ ہو......" (الروم - ۲۱)

"قرابت داری کے رشتوں کو بگاڑنے سے پرہیز کرو......"

(النساء - ۱)

"زناکاری کے پاس بھی نہ پھٹکو، کیونکہ وہ بے حیائی اور بدکاری ہے۔"

(بنی اسرائیل - ۳۲)

"مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں .... اور مومن عورتوں سے کہو کہ محرموں کے سوا کسی کے سامنے اپنے بناؤ سنگار کی نمائش نہ کریں ......"

(النور - ۳۰ - ۳۱)

"خوب جان لو کہ آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی محض لہو ولعب ہے ...... مال اور اولاد کی بہتات کی کوشش کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے مینہ برسنے کے بعد کھیتی ہری بھری ہو کر کاشت کار کے دل کو خوش کرتی ہے اور پھر وہ خشک اور زرد ہو کر روندن سا بن جاتی ہے۔ آخرت کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے ......"

(الحدید - ۲۰)

"تم کھلے گناہوں سے بھی بچو اور چھپے گناہوں سے بھی۔ جو لوگ گناہ کماتے ہیں وہ اس کمائی کا بدلہ پا کر رہیں گے۔"

(الانعام - ۱۲۰)

"جو لوگ لغو باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اپنی شہوتوں کو قابو میں رکھتے ہیں، اپنی امانتوں کو پورا کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو (راحت ابدی کی) میراث پائیں گے۔"

(الحج ۴ تا ۹)

"اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر تمہارے پاس رہیں تو کبھی انھیں اُف تک نہ کہو اور اُن سے جھڑک کر بات نہ کرو، بلکہ اُن سے باادب پیش آؤ اور نرمی اور شفقت کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو۔"

(بنی اسرائیل ۲۳ - ۲۴)

"اپنے قریبی رشتہ داروں کو اُن کا حق دو اور مسکینوں اور مسافروں کو اُن کا حق، لیکن

فضول خرچی نہ کرو۔"

(بنی اسرائیل - ۲۶)

"نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھو اور نہ اُسے پوری طرح کھلا چھوڑ دو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ حقیر اور نادار بن کر رہ جاؤ۔"

(بنی اسرائیل - ۲۹)

"میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے ہمیشہ دل کو بھانے والی بات نکالا کریں۔"

(بنی اسرائیل - ۵۳)

"بُری بات کا رد ایسی بات سے کرو جو اس سے بہتر ہو۔"

(المومنون - ۹۶)

"قیامت کے دن ہم ٹھیک تولنے والی ترازوئیں رکھ دیں گے۔ پس کسی ذی روح پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اگر کسی کا رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا تو ہم وہ اس کے سامنے لاکر تولیں گے۔ اور ہم حساب لگانے کے لیے کافی ہیں۔"

(الانبیاء - ۴۷)

"اپنے رب سے معافی مانگو اور اسی کی طرف پلٹ کر آؤ۔ بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔"

(ہود - ۹۰)

"تمہارا رب کہتا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا۔"

(المومن - ۶۰)

"کہہ دے' اے میرے بندو، جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی، اللہ کی مہربانی کی آس نہ توڑو، وہ سب گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ وہ ہے عفو کرنے والا اور مہربان۔"

(الزمر - ۵۳)

"پاکیزہ کلام اس کی طرف صعود کرتا ہے اور وہ نیک کام کو بلندی بخشتا ہے۔"

(فاطر - ۱۰)

"کہو کہ جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں وہ یہ ہیں:۔ بے حیائی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، گناہ اور ناحق کی زیادتی۔"

(الاعراف ۔ ۳۳)

"اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے پکارو۔ یقیناً اسے حد سے تجاوز کرنے والے پسند نہیں۔ اب جب کہ اس زمین کی اصلاح ہو چکی ہے، اس پر فساد برپا نہ کرو، اور خوف اور التجا کے ساتھ خدا کو پکارو۔ یقیناً اللہ کی رحمت نیک لوگوں کے قریب ہے۔"

(الاعراف ۔ ۵۵ ۔ ۵۶)

"اور ہم نے انسان کو تاکید کی ہے کہ اپنے ماں باپ سے اچھا سلوک کرے۔ اس کی ماں نے تکلیفیں اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دکھ سہہ کر اسے جنم دیا...... وہ (بڑا ہو کر) کہتا ہے: اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں اُن احسانوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے اور میری قسمت میں کر کہ میں ایسے نیک کام کروں جن سے تو خوش ہو، نیز مجھے نیک اولاد عطا فرما، کیونکہ میں توبہ کرکے تیری طرف رجوع ہوا ہوں اور تیرا حکم بردار بندہ ہوں۔"

(الاحقاف ۔ ۱۵)

"اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس ایک سلامتی کا گھر ہے، اور اس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا وہ ان کا سرپرست ہے۔"

(الانعام ۔ ۱۲۸)

"یقیناً بدبخت ہیں وہ لوگ جنھوں نے نادانی اور کم فہمی سے اپنی اولاد کو ہلاک کر دیا اور اللہ نے انھیں جو رزق دیا تھا اُسے اللہ پر جھوٹ باندھ کر حرام ٹھہرایا۔ یہ لوگ بہک گئے اور سیدھے راستے پر نہ چلے۔"

(الانعام ۔ ۱۴۱)

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں، جن میں سے ہر ایک میں سو دانے ہوں۔۔ .... جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کرکے پھر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی کو ستاتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہے۔ اُن کے لیے خوف یا رنج کا کوئی موقع

نہیں۔ میٹھا بول بولنا اور دوسروں کی خطاؤں سے درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد دکھ پہنچایا جائے۔"

(البقرہ ۔ ۲۶۱ ۔ ۲۶۲ ۔ ۲۶۳)

"اللہ کسی متنفّس پر اس کی طاقتِ برداشت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اُسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اُسی پر ہے۔"

(البقرہ ۔ ۲۸۶)

"اے ربّ اگر ہم سے کوئی بھول چوک یا قصور ہو جائے تو اس پر گرفت نہ کر۔ اے مالک! ہم پر ایسا بارِ گراں نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ ہم سے ایسا بوجھ نہ اٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ ہم سے درگزر کر، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔"

(البقرہ ۔ ۲۸۶)

"وہ لوگ جو صابر ہیں، راست باز ہیں، فرماں بردار ہیں، کشادہ دل ہیں اور جو رات کے پچھلے پہر میں اللہ سے مغفرت کی دُعائیں مانگتے ہیں۔"

(آل عمران ۔ ۱۷)

"جو لوگ، خواہ وہ خوش حال ہوں یا بدحال، اپنا مال خرچ کرتے ہیں، غصّے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کی خطائیں معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔"

(آل عمران ۔ ۱۳۴)

"اے خدا، ہمارے گناہ بخش، ہماری بُرائیاں دُور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔"

(آل عمران ۔ ۱۹۳)

"پھر ان کا خدا جواب میں فرماتا ہے 'میں تم میں سے کسی کا عمل رائیگاں نہیں جانے دیتا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔" (آل عمران ۔ ۱۹۵)

"لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو اور قرابت داری کا خیال رکھو۔"

(النساء ۱)

"اور ایسی عورتوں سے نکاح نہ کرو جو تمھارے باپ کے نکاح میں رہ چکی ہوں۔ یہ بے حیائی ہے، ایک ناپسندیدہ حرکت ہے اور بُرا چلن ہے۔"

(النساء۔ ۲۲)

"جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا ہے اس کی ہوس نہ کرو۔"

(النساء۔۳۲)

"ماں باپ سے، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں سے، قریبی ہمسایوں سے، اجنبی ہمسایوں سے، برابر کے رفیقوں سے، مسافروں سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمھارے قبضے میں ہوں، نیک برتاؤ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ کو اترانے اور بڑے بول بولنے والے لوگ نہیں بھاتے۔"

(النساء ۳۶)

"جو شخص (انسانوں کے باہمی معاملوں میں) بھلائی کی سفارش کرے گا وہ بھلائی کا حصہ اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ بُرائی کا حصہ پائے گا۔ اللہ ہر چیز کا عادلانہ بانٹنے والا ہے۔"

(النساء۔ ۸۵)

"اے ایمان والو، انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے سچی گواہی دو، خواہ اس سے خود تمھیں یا تمھارے ماں باپ کو اور رشتہ داروں کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچے۔ فریق معاملہ چاہے امیر ہو چاہے غریب، دونوں صورتوں میں اللہ تم سے زیادہ اس کا خیر خواہ ہے۔ اس لیے اپنے نفس کی بات مان کر انصاف کی راہ سے نہ بھٹک جاؤ۔"

(النساء۔ ۱۳۵)

حضرت اشعیاہ اور حضرت عیسیٰؑ کے مقابلے میں اس بادیہ زادنبی کا روئے سخن ایک زیادہ

وسیع دنیا اور ایک زیادہ ترقی یافتہ نوعِ انسانی سے تھا۔ انصاف سے دیکھنے کی بات ہے کہ آیا اس کی پیش کردہ تعلیمات، جو انسانی محبت کے ایک رفیع جذبے اور راستی، نیکی اور پاکی کے حصول کی ایک بیتاب تمنا سے لبریز ہیں، حضرت اشعیاہ کی خوف دلانے والی تنبیہوں اور حضرت عیسیٰؑ کی دل پگھلا دینے والی التجاؤں سے کسی طرح کم تر درجہ رکھتی ہیں۔

غریب، یتیم اور مسکین، زمین کے اسفل نشین، وہ کم نصیب لوگ جو ابتدائے زندگی ہی میں ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے، یہ ہیں وہ لوگ جن کی حالت دیکھ کر اس کی رقتِ قلب خصوصاً جوش میں آتی ہے۔ وہ بار بار اعلان کرتا ہے کہ خدا کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کی مدد کی جائے، غریبوں کی رفعِ حاجت کی جائے اور قیدیوں کا فدیہ دے کر انھیں رہائی دلائی جائے۔ اس کی دلسوزی اور محبت صرف اپنے ابنائے جنس تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے جاندار بھی اس میں شریک تھے۔

"ایک مرتبہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گٹھڑی اٹھائے حاضر ہوا اور بولا: یا رسول اللہ، میں ایک جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے پرندوں کے بچوں کی آوازیں سنیں۔ چنانچہ میں نے انھیں پکڑ کر اس جامے میں لپیٹ لیا۔ ان کی ماں پر پھڑپھڑاتی ہوئی میرا تعاقب کرنے لگی۔ آنحضرتؐ نے کہا، بچوں کو گٹھڑی سے نکال کر زمین پر رکھ دو۔ جب آدمی نے ایسا کیا، تو اُن کی ماں اُن کے پاس آ گئی۔ آنحضرتؐ نے پوچھا' اس کی ماں کو اپنے بچوں سے جو محبت ہے کیا تمھیں اسے دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے؟ میں اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ جتنی محبت ایک مادہ پرندے کو اپنے بچوں سے ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ محبت خدا کو اپنے بندوں سے ہے۔ ان بچوں کو تم جہاں سے لائے ہو وہیں واپس پہنچا دو اور اُن کی ماں کو اُن کی دیکھ بھال کرنے دو۔"

"جانوروں کے معاملے میں خدا کا خوف کرو، ان پر صرف اس وقت سواری کرو جب وہ سواری کے قابل ہوں۔ جب وہ تھک جائیں تو اُن کی پیٹھ پر سے اُتر جاؤ۔ یقین جانو کہ

بے زبان جانوروں سے اچھا برتاؤ کرنے اور انھیں پانی پلانے کا ثواب ملتا ہے۔"

قرآن کے ارشاد کے مطابق خدا کی نگاہوں میں حیوانی زندگی کی بھی وہی قدر ہے جو انسانی زندگی کی ہے۔ قرآن کہتا ہے "زمین پر چلنے والے کوئی چوپائے اور ہوا میں اُڑنے والے کوئی پرندے ایسے نہیں جو تمھاری طرح ایک اُمّت نہ ہوں، وہ سب اپنے خدا کی طرف لوٹیں گے۔"

(الانعام - ۳۸)

عالمِ عیسائیت نے کہیں صدیوں میں جا کر حیوانی مخلوقات کے بارے میں احساسِ فرض لینے اندر پیدا کیا اس سے بہت پہلے کہ عیسائی قوموں کے یہاں جانوروں سے نرمی اور انسانیت کے ساتھ پیش آنے کا خیال بھی پیدا ہوا ہوتا، حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے پُر اثر الفاظ میں اس فرض کا اعلان کیا جو انسان پر اپنے بے زبان اور بے بس خدمت گذاروں کے بارے میں عائد ہے۔ نرمی و ملائمت کی یہ ہدایات جو اسلام کے زُبدۂ اخلاق میں مندرج ہیں، ان پر اسلامی دنیا کی آئے دن کی زندگی میں ایک فرضِ مذہبی کی طرح عمل کیا جاتا ہے۔

دوسرا باب

اسلام کی مذہبی رُوح

قل لمن ما فی السموٰت والارض قُل لِلّٰہ کتب علی نفسہ الرحمۃ

"کہو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہو اللہ کا ہے۔ اس نے رحمت اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے۔"

(الانعام - ۱۲)

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئا و بالوالدین احسانا ہ ولا تقتلوا اولادکم من املاق ہ نحن نرزقکم وایاھم ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ذالکم وصکم بہ لعلکم تعقلون۔ لا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن۔ حتی یبلغ اشدہ واوفوا الکیل والمیزان بالقسط۔ لا نکلف نفساً الا وسعھا۔ واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی وبعھد اللہ اوفوا، ذالکم وصکم بہ لعلکم تذکرون ہ

[1] محض مذہب کی سچی روح برقرار رکھنے کی خاطر قرآن حکیم کی تصریحات کی روشنی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بنیادی فرائض کی نشان دہی کی، جن میں سب سے اہم یہ ہیں: (۱) نماز

---

[1] اُردو ترجمہ صفحہ ۲۹۱ پر ملاحظہ ہو۔

(۲) روزہ (۳) زکوٰۃ اور (۴) حج۔

انسان کے اندر ایک ارفع و اعلیٰ اور ہمہ گیر قوت کا جو شعور ہے، فطرت کے ساتھ دائمی جنگ لڑنے میں اسے اپنی بے بسی کا جو احساس ہے، خدا کے احسانوں کا اس کے دل میں جو اعتراف ہے، ان سب کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے سینے میں اُمنڈتے ہوئے جذبات کو ایک ہمیشہ بیدار اور مہربان ہستی کے حضور شکر گزاری، محبت، پشیمانی اور التجا کے الفاظ کی صورت میں انڈیل دے۔ عبادت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ ان جذبات کا اظہار ہے جن سے انسان کا دل لبریز ہے لیکن یہ تمام جذبات انسانی ارتقا کے ایک اعلیٰ مرحلے کی پیداوار ہیں۔ وحشیوں کا تو یہ عالم ہے کہ اگر منت و سماجت سے ان کی مقصد برآری نہ ہو تو وہ اپنے معبود بتوں کی نکوہش و سرزنش پر اتر آتے ہیں۔ بہرحال ہر اس مذہبی نظام نے جس میں ذرا سا بھی نامیاتی عنصر پایا جاتا ہے عبادت کی تاثیر اور رسائی کو کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کیا ہے لیکن زیادہ تر مذاہب میں اعجازی اوصاف اخلاقی اوصاف پر غالب ہیں، بلکہ بعض میں تو اخلاق کا خیال ہی سرے سے مفقود ہے۔

ہندوؤں کی ابتدائی پوجا دو قسم کی کارروائیوں پر مشتمل تھی۔ یعنی ایک تو نذر و نیاز اور قربانی اور دوسرے دعا و استمداد۔ فکرِ مذہبی کی طفولیت میں دیوتاؤں کے بارے میں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ان میں وہی شہوات و جذبات ہوتے ہیں جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف انسان مادی منفعتوں کا محتاج ہوتا ہے تو دوسری طرف دیوتاؤں کو رضا جویانہ صدقوں اور چڑھاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کا اظہار بار بار رگ وید کے حمدیہ ترانوں اور بھجنوں میں کیا گیا ہے۔ جب مذہبی تصورات کی نشو و نما ہوئی تو قیاس غالب ہے کہ کم از کم نسبتہً ترقی یافتہ اور صاحبِ فکر لوگوں کے نزدیک نذر و نیاز اور قربانیوں کے مفہوم میں بڑی حد تک ترمیم ہو گئی ہو گی۔ لیکن جیسے جیسے برہمنوں کا فرقہ جو اس کا مدعی تھا کہ اس میں چند مخفی اوصاف ہیں جو صرف وراثتہً منتقل ہو سکتے ہیں، عوام الناس کے دلوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا چلا گیا، ویسے ویسے برہمنیت ایک ایسے مسلک کی معین شکل اختیار کرتی گئی جس کا بنیادی رکن قربانی تھا۔ قربانی کے مجاز صرف پنڈت تھے اور اس کے لیے نہایت سخت گیر اور

ناقابل تبدیل قاعدے مقرر کیے گئے تھے۔ ادھر پنڈت منتر پڑھتا جاتا تھا اور کسی قسم کے مذہبی احساس یا جذبے کے بغیر گیے بندھے طریقے سے مقررہ رسوم ادا کرتا چلا جاتا تھا اور اُدھر تپسیا کرنے والا ایک بے حس و حرکت بُت کی طرح پاس کھڑا یا بیٹھا اس پوجا کا تماشا دیکھتا رہتا تھا جو اس کی طرف سے ایک اور شخص ادا کر رہا تھا۔ اگر کہیں پوجا پاٹ کے منتروں یا رتیوں میں ذرا سی بھی بھول چوک ہو گئی تو ساری پوجا بیکار ہو جاتی تھی۔ بہرحال قیاس چاہتا ہے کہ مذہبی عقیدت سرے سے ناپید نہ تھی، ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ بھگوت گیتا وجود میں آتی حقیقتِ حال جو کچھ بھی ہو، عوام الناس کے لیے عبادت محض چڑھاووں اور بلدانوں کا ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گئی تھی، جس کا انحصار اتنا عبادت کرنے والے کے انفرادی اخلاقی کردار پر نہ تھا جتنا پنڈت کے گیان دان پر تھا۔ عبادت کرنے والے کے لیے صرف اتنا ضروری تھا کہ رتیوں اور رنیموں پر اعتماد رکھے اور دھرم کے نقطہ نگاہ سے پوتر ہو۔

مجوسی زرتشتی اور صابی عبادت گزاری کی فضا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ زرتشتی چھینک آنے پر، ناخن یا بال کٹواتے وقت، کھانا پکاتے وقت، چراغ جلاتے وقت، غرض دن رات کے ہر موقع پر، کوئی نہ کوئی وظیفہ پڑھا کرتے تھے۔ پہلے تو ہُرمزد سے مناجات کی جاتی تھی، اس کے بعد آسمان، زمین، عناصرِ اربعہ، ستارے بلکہ درخت (اور بالخصوص سوم[1] کا درخت) اور چرندے پرندے بھی دعاؤں کے مخاطب بنائے جاتے تھے۔ بعض بعض وظیفے تو ایسے تھے کہ ان کا ورد بارہ بارہ سو مرتبہ کرنا پڑتا تھا[2]۔ اخلاق کا خیال، چاہے گنتی کے چند لوگوں کے یہاں کتنا ہی منترہ کیوں نہ ہو، عوام الناس کے ذہنوں سے بالکل خارج ہو گیا ہوگا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غیر معمولی نفوس کو بھی جو روحانی زندگی نصیب تھی وہ بھی مذہبی پیشواؤں کی بلا شرکتِ غیرے

---

[1] سنسکرت بولنے والی قومیں اسے سوم کہتی تھیں اور ژند بولنے والی قومیں ہوم یا ہومہ۔

[2] dollinger, The Gentile and the Jew, vol. i, p.308۔ ژند اوستا خود ایسی دعاؤں، حمدیہ ترانوں، مناجاتوں وغیرہ کا ایک گنجینہ ہے جن کا روئے سخن متعدد خداؤں سے ہے جن میں ہُرمزد اول درجے پر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ دعاؤں کا ایک مجموعہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے: Clarke, Ten Great Religions, pp.187,207

ملکیت تھی۔ خصوصی تقدس کی جو دیوار مذہبی منصب داروں کو عوام سے جدا کرتی تھی اس کی بدولت مؤخر الذکر اعلیٰ درجے کی تمام روحانی تمتعات سے محروم رہ جاتے تھے۔ انھیں The Ophici کی طرح مجوسیوں کے یہاں عبادت کے دو طریقے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ معبود ہستیوں کے فہم کے دو طریقے تھے، ایک مخفی، جو مذہبی منصب داروں کے لیے مخصوص تھا یا دوسرا عوامی جس میں عوام الناس بھی شریک ہو سکتے تھے[۱]

قانونِ موسوی میں دُعا کے معاملے میں کوئی احکام نہ تھے۔ اگر مناجات اور حمد و ثنا کے کوئی قاعدے مقرر تھے تو صرف مذہبی منصب داروں کو کمائی کا ایک عشر دینے کے بارے اور پہلوٹھی کے بچے کی پیش گزاری کے متعلق جو باضابطہ اور مقطع خانگی رسوم مقرر تھیں ان کے بارے میں۔ مؤخر الذکر موقع پر باپ اپنے بچے کو قانون کے احکام کے مطابق پیش کرنے کے اجر کے طور پر یہوہ سے بنی اسرائیل کے حق میں اس رحمت و برکت کا طالب ہوتا تھا جس کا عہد یہوہ نے ان کے آبا و اجداد سے کیا تھا[۲] لیکن جب رفتہ رفتہ عوام اور معلمین دونوں کے ذہنوں میں خدا کا نسبتہً زیادہ روحانی تصور پیدا ہو گیا اور جسمانی تشبیہیت (Anthropomorphism) کی شدت میں کمی آگئی تو لوگوں کی سمجھ میں آنے لگا کہ عبادت فی الحقیقت خدا اور انسان کے درمیان راہ و رسم کا ایک طریقہ ہے۔ قانونِ موسوی میں عبادت سے متعلق قواعد و ضوابط کی جو کمی تھی وہ روایت اور رواج نے پوری کر دی۔ چنانچہ ڈولنگر[۳] کے قول کے مطابق یہودی ایک عبادت گزار قوم بن گئے۔ روزانہ تین گھنٹے (یعنی نواں، بارھواں اور تیسرا گھنٹہ) مذہبی اوراد و اعمال کے لیے وقف تھے، لیکن ایک طرف تو پروہتوں کی ضرورت اور دوسری طرف شارع کی کسی مثبت عملی مثال کی غیر موجودگی، ان دونوں

۱؎ Reland, *Dissertationes Miscellanae*, Part I, p. 191, Shahristani

۲؎ Deuteronomy xxvi -12-15

۳؎ ڈولنگر جلد دوم۔ صفحہ ۳۶۲

نے یکجا ہو کر عبادت کو لوگوں کی اکثریت میں محض ایک میکانکی عمل بنا دیا۔ حضرت عیسیٰ کے عہد میں یہودیوں کے یہاں چمڑے کے جزدان رکھنے کا طریقہ رائج تھا، جن میں توراۃ و زبور کی عبارتیں کاغذ کے پرزوں پر نقل کر کے رکھی جاتی تھیں اور جنھیں یہودی عبادت کے وقت ماتھے اور بائیں بازو پر باندھ لیا کرتے تھے۔ ان جزدانوں کی خرید و فروخت کی جاتی تھی۔ چنانچہ قرآن یہودیوں کو خدا کی آیات بیچنے پر سخت الفاظ میں لعن طعن کرتا ہے۔[1]

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات، جو انسان کی مذہبی نشو و نما کے ایک بعد کے مرحلے کی نمائندگی کرتی ہیں، عبادت کا صحیح مفہوم پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے ذاتی مثال[2] قائم کر کے عبادت اور شکرگزاری پر بہت زور دیا۔[3] لیکن عوام کی ہدایت کے لیے کسی متعین قاعدے کے نہ ہونے کے معنی یہ تھے کہ مذہبی اعمال و وظائف کے معاملے میں وہ بالکل آزاد چھوڑ دیئے گئے۔ چنانچہ وہ پادریوں کے تابع فرمان ہو گئے، جنھوں نے عبادات کی تعداد، طول اور اصطلاحات کے تقرّر کو اپنا اجارۂ مخصوص بنا رکھا تھا۔ مقررہ دعاؤں کے مجموعے، رسوم عبادت کے ضابطے اور عقائد و ایمانیات کی تعیین کی خاطر متعدد کلیسائی کونسلیں اور مجالسِ مذاکرہ، یہ سب اسی صورتِ حال کا نتیجہ تھے، اسی کے مظہر ہیں وہ وظیفے جنھیں راہب ایک بھنبھناتی ہوئی آواز میں اور ایک میکانکی طور پر پڑھا کرتے ہیں اور ہفتے بھر میں ایک دن گرجاؤں میں وہ عبادتیں جو گویا ہفتے کے باقی دنوں کے رُوحانی فاقوں کی کسر نکالنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ نیز اسی کی پیداوار ہے وہ پریسبیٹر Presbyter جو شروع شروع میں تو محض ایک خادم[4] ہوتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اپنے آپ کو حضرت عیسیٰؑ کے ترکۂ روحانی کا مالک و وارث سمجھنے لگا۔

ساتویں صدی عیسوی میں، جب رسولِ عربی نے ایک اصلاح یافتہ مذہب کی تبلیغ شروع کی،

---

[1] سورہ البقرۃ - ۴۱

[2] لوقا ۹ - ۱۱تا۴

[3] مثلاً Mosheim, vol. i, 99 et seq.

[4] ملاحظہ کیجیے: Eph. vi, 18, Col.1.12 et seq.

یہ خرابیاں اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ چکی تھیں۔ نماز کا قاعدہ رائج کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امر کا اعتراف کیا کہ انسان کے دل میں خدا کے حضور اپنی محبت اور ممنونیت کا اظہار کرنے کی بیتاب تمنا ہوتی ہے۔ نماز کے اوقات کے تعین کا اعلان کر کے آپ نے عبادت کے عمل پر وہ نظم و ضبط عائد کر دیا[1] جو انسان کے خیالات کو مادی دنیا میں ہرزہ گردی کرتے رہنے سے باز رکھتا ہے۔ آپؐ نے اپنی سنت و مثال کے ذریعے جو قاعدے قائم کر دیئے انھوں نے ایک طرف تو اسلامی دنیا کو عبادت کے اعمال و وظائف کے بارے میں مباحثہ و مناظرہ کی خرابیوں سے بچایا اور دوسری طرف افراد کے لیے اس امر کی پوری پوری گنجائش چھوڑ دی کہ قادرِ مطلق کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کے ساتھ سربسجود ہوں۔

تہذیبِ اخلاق اور تنزیہ قلب کے ایک وسیلے کی حیثیت سے نماز جو قدر و قیمت رکھتی ہے وہ قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے:۔

"تلاوت کرو اس کتاب کی جو تم پر وحی کے ذریعے اتاری گئی ہے اور نماز قائم رکھو۔ یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔"

(العنکبوت ۔ ۴۵)

جن مناجاتی اوراد و اذکار پر رسول اکرمؐ کی سنت نے مہرِ تقدس ثبت کر دی ہے ان کی خوبصورتی قرآنی تعلیمات کے اخلاقی عنصر کی خوبصورتی کی آئینہ دار ہے۔

رَبِّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ ۔

اے میرے رب اپنے ذکر اپنے شکر اور اپنی بہترین عبادت میں میری مدد فرما،

اَللّٰھُمَّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِی ظُلْمًا کَثِیْرًا وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِی
مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِی اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۔

"اے اللہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، بڑا ظلم اور گناہوں کو سوائے تیرے کوئی نہیں بخشتا، تو مجھ کو بخش دے، خاص طور پر بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

---

[1] Oelsner, *Des Effets de la Religion de Mohammed*, p.6

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَالْعَزِیْمَةَ عَلَی الرُّشْدِ وَاَسْئَلُکَ شُکْرَ نِعْمَتِکَ وَحُسْنَ عِبَادَتِکَ وَاَسْئَلُکَ قَلْباً سَلِیْمًا وَلِسَانًا صَادِقًا وَاَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا تَعْلَمُ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا تَعْلَمُ۔

اے اللہ میں تجھ سے دین میں ثابت قدمی چاہتا ہوں اور تجھ سے ہدایت پانے کا قصد رکھتا ہوں اور تجھ سے تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق اور حسنِ عبادت طلب کرتا ہوں اور مانگتا ہوں تجھ سے قلبِ سلیم اور سچی زبان، اور چاہتا ہوں تجھ سے وہ بھلائی جس کو تو جانتا ہے اور پناہ مانگتا ہوں اس برائی سے جو تجھ کو معلوم ہے اور معافی چاہتا ہوں اُن گناہوں سے جن کو تو جانتا ہے۔

(مشکوٰۃ۔ کتاب ۹، باب ۱۸، فصل اوّل، دوم و سوم)

ایک اور روایتی دعا، جو دعائے داؤدی کے نام سے مشہور ہے، حسبِ ذیل ہے:۔

"اے مولا، مجھے اس کی توفیق عطا کر کہ میں تجھ سے محبت کروں اور اُن سے محبت کروں جو تجھ سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے اس کی توفیق عطا کر کہ میں ایسے کام کروں جو تجھے محبوب ہیں اور تیری محبت کو اپنی ذات، اہل وعیال اور مال و دولت کی محبت سے زیادہ بیش بہا سمجھوں"[1]

ذیل کی دو مناجاتیں، جو حضرت علیؓ سے منسوب ہیں[2]، اعلیٰ ترین جذبۂ عبودیت کی مظہر ہیں:۔

"شکر ہے اللہ کا، جو قابلِ عبادت ہے اور جس کے سوا کوئی عبادت کا سزاوار نہیں۔

---

[1] تفسیرِ جلالی

[2] یہ دو مناجاتیں سید امیر علی نے حضرت علیؓ سے منسوب کی ہیں لیکن "صحیفۂ کاملہ" کا حوالہ دیا ہے، جو حضرت علیؓ کی نہیں بلکہ حضرت علی بن حسین زین العابدین کی دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ ان کی عبارات سید امیر علی نے صحیفۂ کاملہ کے کسی مخصوص حصے سے نہیں لیں بلکہ مختلف مقامات سے اقتباسات لے کر انھیں دو عبارتوں کے رشتے میں پرو دیا ہے۔ میں نے اسی کی عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ (مترجم)

میرا مولیٰ ازلی، ابدی، پروردگار، حقیقی حاکم، جس کی رحمت و قدرت ساری موجودات کو محیط ہے، دنیا کا کارساز اور کائنات کی روشنی ہے۔ ہم اس کی عبادت کرتے ہیں۔ سب عبادت اسی کے لیے ہے۔ وہ سب چیزوں سے پہلے موجود تھا اور اس وقت بھی زندہ رہے گا جب سب چیزیں فنا ہوچکی ہوں گی۔ تو ہی معبود ہے میرے مولا، تو ہی آقا ہے، محبت کرنے والا اور بخشنے والا، تو جسے چاہتا ہے طاقت و قوت عطا فرماتا ہے، جسے تو بلندی بخشے اُسے کوئی گرا نہیں سکتا، جسے تو گرائے اسے کوئی اُٹھا نہیں سکتا۔ تو میرے آقا، ازلی ہے، خالقِ کل ہے۔ دانائے کل، حاکم بزرگ ہے۔ تیرا علم ہر چیز کا عالم ہے، تیرا عطا و احسان ہر چیز کو حاوی ہے، تیرا عفو و رحم ہر کسی کے شامل ہے۔ اے میرے مولا تو مصیبت زدوں کا مددگار ہے، رنج و غم کا دُور کرنے والا ہے، شکستہ دلوں کو تسکین دینے والا ہے، تو اپنے بندوں کی مدد کے لیے ہر جگہ موجود ہے۔ تو سب بھیدوں کا جاننے والا اور سب خیالوں کا بوجھنے والا ہے اور ہر انجمن میں حاضر ہے۔ تو ہماری سب حاجتوں کا پورا کرنے والا اور سب نعمتوں کا بخشنے والا ہے۔ تو سب غریبوں اور محروموں کا رفیق ہے۔ میرے مولا تو میرا حصارِ عافیت ہے۔ تو ان سب کا حصنِ حصین ہے جو تیری مدد مانگتے ہیں۔ تو کمزوروں کا آسرا ہے، سب صدق و صفا والوں کا مددگار ہے۔ اے میرے مولا تو میرا پشت پناہ ہے، میرا مددگار ہے اور ان سب کا مددگار ہے جو تجھ سے مدد مانگتے ہیں ...... اے میرے مولیٰ، تو خالق ہے، میں تو محض مخلوق ہوں، تو میرا آقا ہے اور میں تو محض تیرا ایک بندہ ہوں، تو مدد دینے والا ہے، میں مدد مانگنے والا۔ تو اے میرے مولا، میرا ملجا و ماویٰ ہے، تو بخشنے والا ہے، میں گنہگار ہوں۔ تو میرے مولیٰ، رحیم ہے، علیم ہے، محب ہے۔ میں اندھیرے میں بھٹک رہا ہوں، میں تیرے علم اور تیری محبت کا طلبگار رہوں۔ اے میرے مولیٰ، اپنا سارا علم، اپنی ساری محبت اور اپنی ساری رحمت مجھ پر ارزانی فرما، میرے گناہوں کو بخش دے اے میرے مولیٰ!"

"اے میرے مولیٰ تو سبحان ہے، قدیم ہے، حاضر و ناظر ہے، حیّ و قیوّم ہے، ہمیشہ قریب ہے، عالمِ کُل ہے، تو ہر دل میں، ہر روح میں، جیتا جاگتا موجود ہے۔ تیرا علم ہر نفس میں سرایت کیے ہوئے ہے"...... "اس سے کوئی مشابہ نہیں، اس کا کوئی ہمسر نہیں، وہ واحد

ہے قدیم ہے، شکر اس مولیٰ کا جس کا رحم ہر گناہ گار کے شاملِ حال ہے، جو ان کو بھی روزی بہم پہنچاتا ہے جو اس کے منکر ہیں۔ اول بھی اسی کا ہے آخر بھی اسی کا، تمام علم اسی کو ہے اور وہ دلوں کے پوشیدہ ترین رازوں کو جانتا ہے۔ اسے کبھی نیند نہیں آتی، وہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے اور ہمیشہ انصاف کرتا ہے۔ وہ اپنے رحم کی بدولت بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، اسے اپنی ساری مخلوق سے محبت ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں اپنے آقا کی نیکی کی اس کے نبی کے پیغام کی صداقت پر صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ۔"

ایک انگریز مصنف کہتا ہے: "اسلام کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کی مقرر کی ہوئی عبادت صرف ہاتھوں سے بنائی ہوئی عمارتوں ہی میں نہیں، بلکہ خدا کی زمین پر اور اس کے آسمان کے نیچے کسی جگہ ادا کی جا سکتی ہے[1]۔" ہر وہ جگہ جہاں قادرِ مطلق کی باایمان پرستش کی جائے ایک سا تقدس رکھتی ہے۔ مسلمان چاہے کہیں بھی ہو، سفر میں یا حضر میں، جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ چند مختصر لیکن ذوق و شوق سے بھرے ہوئے مناجاتی کلمات میں اپنی روح کو بے نقاب کر کے خدا کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اس کی نماز اتنی لمبی نہیں ہوتی کہ اس کی طبیعت اکتا جائے، اور اس کی دعاؤں کا موضوع ہمیشہ انکسارِ نفس، خدائے منعم و محسن کی حمد و ثنا اور اس کے رحم و کرم پر اظہارِ اعتماد ہوتا ہے[2]۔ دینِ محمدیؐ میں روحِ عبودیت کی جو تب و تاب پائی جاتی ہے اس کی شدت کا پورا پورا احساس عیسائی دنیا نے نہیں کیا۔ روایت، جو ماضی کی صداقت شعار وقائع نگار ہے اور جس کی تصدیق سینکڑوں تائیدی شہادتوں کے ذریعے ہوتی ہے، بیان کرتی ہے کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے دوران فرطِ جذبہ سے زار و قطار رویا کرتے تھے اور کس طرح آپ کے شریف النفس چچیرے بھائی اور داماد عبادت میں اتنے منہمک ہو جایا کرتے تھے کہ ان کا بدن سن ہو جایا کرتا تھا۔

---

[1] Hunter, *Our Indian Musulmans*, p. 179

[2] البقرہ۔ ۲۲۰۔ ۲۲۹ وغیرہ۔ الاعراف۔ ۲۰۴، ۲۰۵۔ بنی اسرائیل۔ ۶۹۔ حج۔ ۱۳۰۔ روم۔ ۱۶، ۱۷ وغیرہ وغیرہ۔ نیز ملاحظہ ہو "کتاب المستطرف"۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام پیشہ ور مذہبی لوگوں کے کسی طبقے کو تسلیم نہیں کرتا اور عبد و معبود کے درمیان روحانی علم یا خصوصی تقدس کی کسی قسم کی اجارہ داری کو حائل نہیں ہونے دیتا۔ ہر روح کسی کشیش، ربّی، موبد، ملّا، پادری، پنڈت، پروہت یا کسی اور مذہبی وکیل کی وساطت کے بغیر اپنے پیدا کرنے والے کی طرف صعود کرتی ہے۔ ایک مضطرب دل کو اس تسکین دینے والی ہستی کے حضور میں جانے کے لیے ذاتی مفادات کے مدعیوں کی ایجاد کردہ قربانیوں اور رسموں کی کوئی ضرورت نہیں[1] ہر انسان آپ اپنا وکیل و شفیع ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام میں کوئی ایک شخص ایک انسان کی حیثیت سے کسی دوسرے شخص سے اونچا درجہ نہیں رکھتا۔

یورپ کے عقلی مفکرین نے اسلامی عبادات پر پیچیدہ اور مشکل ہونے کا الزام لگایا ہے[2] لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا مقرر کیا ہوا ضابطہ مرسوم سادگی اور اعتدال کے اعتبار سے عبرت انگیز ہے۔ اس میں لازمی اعمالِ ایمانی شامل ہیں، یعنی کلماتِ ایمانی کا پڑھنا، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج، لیکن ان اعمال کے بارے میں اس نے کوئی لگے بندھے قاعدے مقرر نہیں کیے۔ "نماز قائم کرو، ظہر کی نماز بھی، اور خدا کے حضور توجّہ قلب سے حاضر ہو" (البقرہ ۲۳۸) صبر اور تقوےٰ سے مدد طلب کرو، یقیناً اللہ صابروں کا ساتھ دیتا ہے۔"

"جب تم روئے زمین پر سفر کر رہے ہو، اگر تمھیں اس بات کا خدشہ ہو کہ کفار تم پر حملہ آور ہو جائیں گے تو تمھارے لیے نماز قضا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خدا ہر چیز کو معاف کر دیتا ہے سوائے اس کے کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔"

بہرحال نبی اکرمؐ کی سنّت نے ادائے نماز کے ساتھ چند آداب و قواعد کو وابستہ کر دیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صریح اور ناقابلِ اشتباہ الفاظ میں یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ روحوں کی ٹوہ رکھنے والا اصل میں جس چیز کو دیکھتا ہے وہ دل کی کیفیتِ عبودیت ہے۔ "نہ قربانی کے جانوروں کا گوشت، نہ ان کا خون اللہ کو پہنچتا ہے، بلکہ صرف تمھارا التقویٰ۔" (الحج - ۳۷)

---

[1] حج کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے وہ محض ایک یادگاری رسم ہے۔

[2] الذرر والغرر فی المحاضرات۔

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے منہ مشرق کی طرف موڑ لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر ایمان لائے اور اللہ کی محبّت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو دے اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ وہ لوگ جو کوئی عہد کرتے ہیں تو اُسے پورا کر دکھاتے ہیں اور جو سختی ومصیبت کے وقت اور جنگ وجدل کے زمانے میں صبر کرتے ہیں، یہ ہیں وہ لوگ جو سچّے ہیں۔"

(البقرہ - ۱۷۷)

قرآن نے علی الاعلان کہہ دیا کہ حضورِ قلب کے بغیر نماز بے سُود ہے اور اس امر کی تاکید کی کہ اللہ کا کلام، جس کا روئے سخن صرف ایک قوم کی طرف نہیں بلکہ ساری نوعِ انسانی کی طرف تھا، ایسی کیفیت میں پڑھا جانا چاہیئے کہ جس میں دل اور زبان کے درمیان مکمل ہم آہنگی ہو۔ حضرت علی رضؓ کا ارشاد ہے کہ ایسی نماز جو پڑھی جانے والی آیتوں کا مطلب سمجھے بغیر ادا کی جائے بے فائدہ ہوتی ہے اور ثواب کی مستحق نہیں ہوتی[1] امام غزالی رحؒ کا فتویٰ ہے کہ کلامِ مقدس کی تلاوت میں دل اور دماغ کو باہمی تعاون کرنا چاہیئے۔ ہونٹ صرف الفاظ کو ادا کرتے ہیں، دماغ اُن کے معانی سمجھنے میں مُمد ہوتا ہے اور دل احکامِ شریعت کی بجا آوری میں مدد دیتا ہے[2]

رسُولِ اکرمؐ کی حدیث ہے کہ خدا کو کسی آدمی کی عبادت کا نہ چھٹا نہ دسواں حصہ قبول ہے، بلکہ اُتنا ہی حصّہ جو وہ سمجھ بوجھ کے ساتھ اور صحیح بندگی وسپردگی کے ساتھ خدا کے حضور پیش کرے[3]"

---

[1] الدّار والغُرر فی المحاضرات

[2] The KITAB-UL-MUSTATRAF, CHAP. 1

[3] ابن حبل، روایت از ابوداؤد ونسائی۔

دینِ عیسوی میں بپتسمے کی جو رسم ہے اور مصریوں، یہودیوں اور مشرق و مغرب کے بے کتاب مذاہب کے مخفی رسوم کی صدارت کرنے والے پروہتوں کے یہاں مذہبی اور عباداتی اعمال و وظائف شروع کرنے سے پہلے ریاضت یا قربانی کے ذریعے تطہیر کا جو تقاضا کیا جاتا تھا اُن سے ظاہر ہے کہ ظاہری طہارت کے ساتھ کیسا خاص تقدّس وابستہ کیا جاتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی مثال کے ذریعے اس قدیم اور مفید قاعدے کو وجوب بخشا۔ آپؐ نے صفائی و پاکیزگی کو عبادتِ الٰہی کی ایک لازمی تمہید قرار دیا[1]۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آپؐ نے یہ بھی خاص طور پر واضح کر دیا کہ صحیح تقویٰ محض ظاہری یا جسمانی پاکیزگی میں مضمر نہیں بلکہ ضروری ہے کہ انسان خدا کی بارگاہ میں نفس کی پاکیزگی اور عاجزی کے ساتھ حاضر ہو۔ امام غزالیؒ ان لوگوں کی تردید میں جو ظاہری صفائی و پاکی کا تو خیال رکھتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں نخوت دریا بھری ہوتی ہے بالتخصیص کہتے ہیں کہ رسولِ خدا نے سب سے اہم پاکیزگی اس کو قرار دیا کہ دل کو تمام قابلِ تشنیع خواہشوں اور رغبتوں سے اور دماغ کو تمام فاسد افکار سے اور ایسے خیالات سے جو اللہ کی طرف سے توجہ کو ہٹاتے ہیں پاک کیا جائے[2]۔

اسلامی دنیا میں اسلام کے مولد کی یاد زندہ رکھنے کی خاطر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی روشنی میں یہ ہدایت کی کہ نماز ادا کرتے وقت مسلمانوں کو اپنا منہ مکّے کی طرف کر لینا چاہیے، کیونکہ مکّہ وہ مطلعِ انوار ہے جہاں سے حق کی نشاۃِ نو کی پہلی کرنیں پھوٹیں۔ انسانوں کی طبع شناسی کا جو ملکہ انھیں ایک پیغمبر کی حیثیت سے عطا

---

[1] المائدہ ۵ - ۶۔ قرآن ایک ہمہ گیر دستور کی حیثیت سے وضو کا تذکرہ کرتا ہے لیکن جہاں پانی دستیاب نہ ہو وہاں وہ صفائی کے کسی ایک وسیلے کی اجازت دیتا ہے۔ بہرحال وہ آدابِ وضو کی مکمل تفصیلات کہیں بھی بیان نہیں کرتا چنانچہ سنتِ نبوی کی بنا پر وضو یا طہارت کا جو طریقہ ہے اس کے بارے میں علمائے دینیات کے درمیان اختلافِ رائے ہے اور اس موضوع پر بہت بحث و مباحثہ ہوا ہے۔

[2] کتاب المستظرف۔

ہوا تھا اس کی بدولت آپؐ نے اندازہ لگا لیا کہ اگر ایک ایسا مرکزی مقام مقرر کر دیا جائے جو قرنہا بعد قرن آپؐ کے پیروؤں کے مذہبی جذبات کا مرجع رہے تو یہ اُمت کا استحکام و جمعیت پیدا کرنے کے معاملے میں کتنا موثر عامل ثابت ہو گا۔ چنانچہ آپؐ نے حکم دیا کہ دنیائے اسلام میں ہر جگہ مسلمان قبلہ رُو ہو کر نماز پڑھا کریں[۱]

مکہ مسلمانوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو یہودیوں کے لیے یروشلم رکھتا ہے۔ مکے سے ان کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں انھوں نے اسے اُن پر ایک خاص اثر و نفوذ بخش دیا ہے۔ یہ مقام ان کے مذہب کا گہوارہ تھا، جہاں ان کے نبی نے اپنا بچپن گزارا۔ اس کا خیال آتے ہی مسلمان کے دل میں پرانے مذہبوں اور اس کے نئے مذہب کی باہمی جنگ، بتوں کی تختہ براندازی اور خدائے واحد کی پرستاری کے قیام کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ان سب چیزوں سے بھی بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک واحد قبلے کا ہونا مسلمانوں کو یہ امر یاد دلاتا ہے کہ ساری دنیا میں اس کے برادرانِ ملت ایک ہی مرکز کی طرف منہ کئے ہوئے مصروفِ عبادت ہیں اور وہ مومنوں کی ایک عظیم جماعت کا ایک فرد ہے جو ایک ہی مذہب کے رشتۂ وحدت میں منسلک ہے جس کے سینے میں ایک ہی قسم کی اُمیدیں اور آرزوئیں ہیں، جو ایک ہی طرح کی چیزوں کا احترام کرتی ہے اور ایک ہی خدا کی عبادت گزار ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کعبہ کے تقدس کو برقرار رکھ کر اس امر کا ثبوت دیا کہ آپ انسان کے مذہبی جذبات کے کتنے بڑے نبض شناس تھے[۲]۔ لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی قرآن کی ان عبارات سے جن کے اقتباس ہم اُوپر پیش کر آئے ہیں ظاہر ہے کہ محض قبلے کی طرف منہ کو نا ہی عبادتِ الٰہی کے لوازمات میں سے نہیں ہے[۳]

۱؎ البقرہ ۱۳۹-۱۴۰، ۱۴۴ وغیرہم۔

۲؎ Stanley Lane-Poole, Introduction to the Selections from the Koran, LXXXV

۳؎ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے: لیس البر ان تولوا (باقی حاشیہ صد ۱۹۴ پہ ملاحظہ فرمائیں)

روزہ داری کا رواج تقریباً تمام قوموں میں رہا ہے لیکن عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے قدیم میں اس سے بلا استثناء پرہیزگاری و تقویٰ کی بہ نسبت توبہ و استغفار کا خیال زیادہ متعلق تھا۔ یہاں تک کہ یہودیت میں بھی تعذیبِ نفس اور انکارِ نفس کی ایک ریاضت کے طور پر روزہ داری کا خیال قرونِ اُخریٰ کی پیداوار ہے۔ اسینیوں، (Essenians) کو فیثا غورثیوں سے اور اُن کے ذریعے نسبتہً زیادہ مشرقی سمت میں واقع ممالک کی مرتاضیت و رہبانیت سے جو واسطہ پڑا، اس کی بدولت وہ یہودیوں میں پہلے لوگ تھے جنھوں نے اصولِ روزہ داری کے اس اخلاقی پہلو کا ادراک کیا، اور قیاس غالب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بہت سے دوسرے تصورات کی طرح یہ تصور بھی انہی سے اخذ کیا ہوگا۔

حضرت عیسیٰ کی ذاتی مثال نے کلیسا کی نظروں میں روزہ داری کی مشق کو تقدس بخش دیا۔ تاہم روزے کی عمومی حیثیت کے بارے میں جو خیال کلیسا میں زیادہ تر مسلّم ہے وہ توبہ و کفّارہ کا خیال ہے[۱] اور صرف ایک جزئی حد تک اتباعِ سنتِ مسیح کا یا بالارادہ جسمانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۳) تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتٰب والنبیین ..... البقرہ

[۱] Mosheim, voi. i, p.131 موشیم بالوضاحت کہتا ہے کہ روزے کے بارے میں ابتداء ہی یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ارواحِ خبیثہ کی قوت کی روک تھام اوران کی تدبیروں کی شکست کا اور خدا کے غیظ و غضب کو رفع کرنے کا مؤثر ترین وسیلہ ہے۔ Vol. i, p.398

[۲] نینڈر Neander کہتا ہے کہ عیسائیوں کی ہفتہ وار اور سالانہ تقریبوں کا منبع بھی یہی بنیادی خیال ہے ....: یعنی صلیب پر چڑھائے ہوئے اور اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر قبر سے اُٹھے ہوئے مسیح کی تقلید کا خیال۔" وہ مزید کہتا ہے "عیسائیوں کے یہاں، جو اپنے اجتماعی فریضے کو ایک جنگ، ایک جہادِ مسیحی (Militia Christ) کے نام سے پکارا کرتے تھے، ایسے روزوں کا اور ان سے متعلق عبادتوں کا نام Statione (مقامات) تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

خود آزاری دوسرے مذاہب کی طرح عیسوی کلیسا میں بھی بہ کثرت رائج ہے، لیکن اس خود آزاری کا نتیجہ ہمیشہ قوائے ذہنی وجسمانی کی تباہی اور ایک غیر صحت مند ترکِ دنیا ہوا ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں روزے کا جو مقصد ہے وہ یہ واجب مقصد ہے کہ بہ ذاتہ ایک معین و محدود مدت کے دوران حواس کی تسکین سے اجتناب کرکے جذبات و شہوات پر قابو پایا جائے اور فاضل حیوانی جوش کی طغیانی کو صحت مند طریقوں سے بہ نکلنے کا موقع دیا جائے۔ بے سُود اور غیر ضروری جسمانی اذیت نہ صرف ممنوع بلکہ مذموم قرار دی گئی ہے۔ تندرست اور تنومند لوگوں پر روزہ اس مقصد سے فرض کیا گیا ہے کہ وہ جسم پر پابندیاں عائد کرکے رُوح کی تربیت کریں۔ کمزوروں کو، بیماروں کو، مسافروں کو، طالب علموں کو (جو تحصیلِ علم میں مشغول ہوں، جسے جہادِ اکبر کہا گیا ہے) اُن سپاہیوں کو جو دشمنانِ دین سے برسرِ جہاد ہوں، اور اُن عورتوں کو جن پر نسوانی معذوریاں عائد ہوں ـــــ ان سب کو روزے کی ممانعت ہے۔ جن لوگوں کو یونانیوں، رومیوں، ایرانیوں اور زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی بسیار خوری اور لذائذ و مفاسد میں لپٹی ضیافتیں یاد ہیں، وہ اس تعدیل و ضابطہ بندی کی قدر و قیمت کا اعتراف کریں گے اور اس کی داد دیں گے کہ یہ انسان اور بالخصوص نیم مہذب انسان کے بہیمی میلانات کی روک تھام کے لیے کس حیرت انگیز طور پر مفید ہے۔

قرآن نے اس بارے میں جو حکم دیا ہے ذرا اس کی دانشمندی پر غور کیجیے: "اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے .... تاکہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو۔ یہ چند شمرد دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں اتنے ہی روزے رکھ کر کسر پوری کرلے، اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (لیکن روزہ نہ رکھیں) وہ کسی مسکین کو کھانا کھلا کر اس کا فدیہ دیں .... لیکن اگر تم ٹھیک سے سمجھو تو تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ روزہ رکھو .... اللہ تمھارے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ۲۸۴) گویا وہ مسیح کے سپاہیوں Milites Chtisti کی بیرے کی چوکیاں تھیں۔ Neander, *Church History*, vol. i, p. 409

نرمی کرنا چاہتا ہے۔

(البقرۃ ع ۲۳ - ۱۸۳ - ۱۸۴)

پرہیز کی مدت دن کے اوقات تک محدود ہے۔ رات کے وقت یعنی عبادت و ریاضت کے وقتوں میں مسلمان کو اجازت ہے، بلکہ حکم ہے، کہ اعتدال کے ساتھ کھا پی کر اپنے جسم کو قوت و تازگی بخشے اور دوسرے جائز طریقوں سے تفریح طبع کرے۔ شارع کے ارشادات کی حقیقی روح کو سمجھ کر ارباب فقہ نے بالاتفاق یہ حکم لگایا ہے کہ روزے کے دوران دل کے سفلی خیالات سے پرہیز اتنا ہی لازمی ہے جتنا جسم کا خورد و نوش سے پرہیز۔[1]

اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب نے خیرات کو، یعنی بیواؤں، یتیموں اور معذور ناداروں کی امداد کو، نظامِ دین کے مثبت ارکان میں شامل کر کے اسے ایک مقدس فرض کی حیثیت نہ بخشی تھی۔

اگاپی agapae یعنی دورِ اوّل کے عیسائیوں کے یہاں جو خیراتی ضیافتیں ہوا کرتی تھیں وہ افراد کی ذاتی مرضی پر منحصر ہوتی تھیں، چنانچہ ان کا اثر بے قاعدہ اور غیر مسلسل تھا۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ یہی بے قاعدگی تھی جس کے باعث یہ خیراتی ضیافتیں یا "محبت کی دعوتیں" وجود میں آنے کے تھوڑی ہی مدت بعد ممنوع قرار دے دی گئیں۔[2]

---

[2] Neander, vol. i, p. 450, et seq ,psje, Mosheim vol; 2, p 56

میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ ضیافتیں عیسائیوں کے یہاں خیرات کا واحد طریقہ تھیں۔ بیواؤں، غریبوں اور یتیموں کی اعانت کی تاکید عیسائیت نے بھی اتنی ہی کی جتنی اسلام نے کی۔ لیکن یہ خیرات فی سبیل اللہ بھی جس کی تلقین حضرت عیسیٰ نے کی اُن کے حواریوں کے ہاتھوں میں اکثر خصوصیت کے رنگ میں رنگی گئی۔ کسی بیوہ کے لیے خیرات سے مستفید ہونے کی خاطر ضروری تھا کہ "ساٹھ سال کی ہو، صرف ایک آدمی کی بیوی رہ چکی ہو، بچوں کی تربیت کر چکی ہو"، وغیرہ وغیرہ۔ ملاحظہ کیجئے، Blunt's *History of the Christian Church*, p. 27, seq.

[1] کتاب المستطرف۔ باب اول۔ فصل ۳

اسلام کے قوانین کے تحت ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصّہ اپنے غریب ہمسایوں کی امداد و اعانت کے لیے علیحدہ کر دے۔ یہ عموماً تمام اموالِ منقولہ اسباب، زرعی آمدنی، تجارتی اور کاروباری منافع وغیرہم کا چالیسواں حصّہ، یعنی ۲½ فیصد ہے لیکن زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہے کہ کسی شخص کے کل املاک کی قیمت ایک مقررہ حد تک پہنچ جائے[1] اور وہ پورے ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہ چکے ہوں۔ جن مویشیوں سے کھیتی باڑی میں کام لیا جا رہا ہو یا جن پر مال برداری کی جا رہی ہو ان پر کوئی زکوٰۃ واجب الادا نہیں۔ مذکورۂ بالا زکوٰۃ کے علاوہ ماہِ رمضان کے اختتام پر، یعنی عید الفطر کے دن، جو مسلمانوں کے اس خصوصی ریاضت کے لیے وقف مہینے (Lent) کا آخری دن ہوتا ہے، ہر صاحبِ خانہ کو اپنے لیے، اپنے خاندان کے ہر فرد کے لیے اور ہر اس مہمان کے لیے جس نے دورانِ رمضان اس کے گھر میں روزہ کھولا ہو یا جو وہاں سویا ہو، گیہوں، جَو، کھجوروں، کشمش، چاولوں اور دوسرے غلّوں کی ایک مقدار یا اس مقدار کی نقد قیمت فطرے یعنی خیرات کے طور پر دینی پڑتی ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی سنّت یا ان کے صحابہ کی مثال کی روشنی میں زکوٰۃ کے مستحق حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ غریب و نادار لوگ۔

۲۔ وہ لوگ جو زکوٰۃ مطلوبہ کے جمع اور تقسیم کرنے کے سلسلے میں خدمات ادا کریں۔

۳۔ ایسے غلام جو فدیہ ادا کر کے آزادی خریدنا چاہتے ہیں، لیکن اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔

۴۔ ایسے مقروض جو قرض ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

۵۔ مسافر اجنبی[2] (اور مؤلفۃ القلوب)

---

[1] مثلاً اگر کسی شخص کے پاس کم از کم بیس اُونٹ نہ ہوں تو اُس پر زکوٰۃ لازم نہیں۔

[2] Radd-ul Muhtar, Chapter on Hajj.
Query, *Droit Musulman*, vol. 1, The Mabsut

عام خیرات[1]، یعنی انفاقِ اموال، کی تاکید قرآن نے انتہائی پُر زور الفاظ میں کی ہے[2]۔
لیکن اسلام کی اصلی عظمت و شان اس میں ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ[3] کے حسین و جمیل
جذبات کو معیّن قوانین کی شکل میں مجسّم کر دیا۔

اسلام کے ارکان میں مکّے اور حرمِ کعبہ کی سالانہ زیارت یعنی حج کو شامل کرنے میں
جو حکمت تھی اس نے دینِ اسلام میں فرقوں کے اختلافات کے باوجود اخوّت و مروّت
کی رُوح پھونک دی ہے۔ ساری اسلامی دنیا کی نگاہیں اس مرکزی مقام پر مرکوز ہو کر
ہر مسلمان کے سینے میں اس آسمانی نور کی شعاعیں زندہ رکھتی ہیں جس نے اس تاریک
صدی میں دنیا کو روشن کر دیا تھا۔ اس موضوع پر بھی اس صاحبِ الہام شارع کی
دانشمندی احکام کے ایجابی حصے میں، یعنی ان شرائط میں جن کا پورا ہونا حج کی فرضیت
کے لیے لازم ہے، جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں :۔

۱۔ ذہن و عقل کی پختگی
۲۔ مکمل آزادی
۳۔ خرچِ سفر اور زادِ سفر کا مہیّا ہونا۔
۴۔ عازمِ حج کی غیر حاضری میں اُس کے اہل و عیال کی کفالت کے وسائل
۵۔ سفر کا ممکن ہونا

کفّارِ عرب کے یہاں کھانے کی مختلف چیزوں کے حلال یا حرام ہونے کے بارے
میں بڑے تفصیلی قاعدے تھے، جو اتنے ہی سخت گیر تھے جتنے برہمنوں کے بنائے ہوئے
قوانین۔ مسلمانوں کو ان قاعدوں کے پھندوں سے نکالنے کی خاطر مبلّغِ اسلام نے قرآن

---

[1] جامع الترمذی۔ باب زکوٰۃ۔ جامع عبّاسی
نیز ملاحظہ کیجئے "مبسوط"
[2] البقرۃ ۲۔ ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۱ وغیرہم۔ سورہ ۹۔ ۶۰۔
[3] متی۔ باب ۲۵۔ آیات ۳۵۔ ۳۶۔

کی روشنی میں اکثر اپنے پیروؤں کو یہ ہدایت کی کہ چند چیزوں کو چھوڑ کر کھانے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ "جو کچھ حلال و طیّب اللہ نے تمھیں دیا ہے اُسے کھاؤ اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔"

(المائدہ ۵ - ۸۸)

"جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں کی گئی الّا یہ کہ وہ مُردار ہو یا بہایا ہوا خون ہو یا سُؤر کا گوشت ہو، جو ناپاک ہے یا فسق ہو ان معنوں میں کہ وہ ایسا جانور ہو جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پہ ذبح کیا گیا ہو۔"

(الانعام - ۱۴۶)

اس کی تشریح پانچویں سورہ میں کی گئی ہے، جس کا مقصد بھی زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی مختلف وحشیانہ اور بُت پرستانہ رسموں کی مذمت تھا۔

"تم پہ یہ چیزیں حرام کی گئیں، مُردار، خون، سُؤر کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور کے نام پہ ذبح کیا گیا ہو[1] وہ جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو[2] سوائے اس کے کہ تم نے اُسے زندہ پا کر خود ذبح کیا ــــ اور وہ جانور جو کسی آستانے یا استھان پر ذبح کیا گیا ہو[3]۔ نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ (تیروں کے ذریعے) پانسہ ڈال کر مذبوحہ کا گوشت بانٹا کرو۔"

(المائدہ - ۳)

---

[1] کفّارِ عرب جب کوئی جانور کھانے کے لیے ذبح کرتے تھے تو وہ اس پر اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کے نام لیا کرتے تھے۔

[2] بت پرست عربوں کے یہاں جانوروں کو ہلاک کرنے کے مختلف وحشیانہ طریقے تھے اس ممانعت میں ان بے رحمانہ طریقوں کی طرف اشارہ ہے۔

[3] قرآن میں لفظ 'نصب' استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد نذر و نیاز چڑھانے کے مقامات ہیں۔ حرمِ کعبہ کے اردگرد اور کفّارِ عرب کے گھروں کی دہلیزوں پر پتھر نصب کیے جاتے تھے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ (مترجم)

"جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔"[1]
(البقرہ - ۱۷۲)

نشے اور جوئے کی، جو عیسائی جماعتوں کی عام لعنتیں ہیں اور رکیک و رذیل فطرتوں کی بڑی کمزوریاں، اور اسی طرح ہر قسم کی بے اعتدالیوں کی سخت ممانعت کی گئی۔

رسولِ عربی کی تعلیمات سے بڑھ کر کوئی تعلیم سیدھی سادی اور ذہنِ انسانی کی ترقی سے ہم آہنگ نہیں۔ مذہبی رسوم کے بارے میں آپ نے اسلام کی رُو سے جو چند آداب و قواعد متعین کیے ان کا مقصد زیادہ تر نظم و ضبط اور یک رنگی و یکسانی پیدا کرنا تھا، جو معاشرے کی

---

[1] جو چیزیں انسان کے لیے طبعاً مکروہ ہیں مثلاً گوشت خوار جانوروں کا گوشت، شکاری پرندے، سانپ وغیرہ، ان کے لیے کسی صریحی ممانعت کی ضرورت نہ تھی۔ ہندوستان میں جو یہ عام خیال ہے اور جو ہندوؤں سے مستعار لیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کے ساتھ کھانا پینا جائز نہیں، وہ بالکل غلط اور قرآن کی عبارت ذیل میں دی ہوئی ہدایت کے بالکل منافی ہے: "آج تمھارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے۔" (المائدہ - ۵)

شارعِ اسلام نے کھانے پینے اور رہنے سہنے سے متعلق اسراف کے بارے میں جو قاعدے اور اوامر و نواہی پہنچائے ان کے ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ان کے وقت اور ان کی قوم کے عارضی حالات کے تقاضوں کا نتیجہ تھے۔ جب وہ حالات معدوم ہو گئے تو ان قوانین کی ضرورت بھی ختم ہو گئی لہٰذا یہ فرض کر لینا کہ ہر اسلامی ہدایت ایسی ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا تاریخ اور عقلِ انسانی کے ارتقا کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس ضمن میں ابنِ خلدون کے الفاظ سنجیدگی سے غور کیے جانے کے مستحق ہیں:

"ہم صرف دقتِ نظر اور محنت و کاوش سے ماخذوں کا مطالعہ اور چھان بین کر کے صداقت کو دریافت کر سکتے ہیں اور غلطیوں سے بچ سکتے ہیں۔ اگر ہم محض اخبار و روایات کے نقل کر دینے پر اکتفا کریں اور تجربے کے مہیا کیے ہوئے قواعد، سیاست مدن کے اصولی قوانین، کسی زمانے کی مخصوص تہذیب اور انسانی معاشرے کے حالات پر نظر نہ ڈالیں، اگر ہم ازمنۂ بعیدہ کے تقاضوں کا اندازہ (باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

نشو و نما کے بعض مراحل میں بہت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ آداب و قواعد لوچ اور لچک سے خالی نہ تھے۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں اور بعض اسباب کے تحت انھوں نے اُن سے انحراف کی اجازت دی۔

"خدا تمھارے لیے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان ضعیف پیدا کیا گیا۔"

(النساء ۔ ۲۸)

رسُول اکرمؐ نے جو قانونی اصول وضع کئے وہ یا تو ایسے سوالات کے جوابوں کی صورت میں وضع ہوئے جو مدینہ کے منصفِ اعلیٰ کی حیثیت سے آپ سے کئے جاتے تھے یا چند صریح خرابیوں کو دُور کرنے کی خاطر۔ آپؐ کے اسلام میں کوئی ایسی رسم نہ تھی جو انسان کو خدائے واحد کے خیال سے دُور لے جاتی، کوئی ایسا قانون نہ تھا جو ترقی پذیر نوعِ انسانی کے ضمیر کو پابجولاں رکھتا۔

اسلام کے ضابطۂ اخلاق کا خلاصہ چھٹے سوُرے میں بالفاظِ ذیل دیا گیا ہے :۔

"آؤ میں تمھیں بتاؤں کہ تمھارے رَبّ نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہ یہ ہیں :۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، کیونکہ ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھارے بچّوں کو بھی دیں گے، بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکو، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھُپی، کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو، اِلّا حق کے ساتھ.......؛ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، اِلّا ایسے طور پر کہ تم اُسے بہتر بنا سکو.........اور جب بات کہو تو حق کی کہو، چاہے اہلِ معاملہ تمھارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ کا عہد پورا کرو۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے، شاید تم ان کا دھیان رکھو گے......یہی ہے میرا سیدھا راستہ۔ لہٰذا تم اس پر چلو۔"

(الانعام ۔ ۱۵۲ ۔ ۱۵۳)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۰) اُن تقاضوں سے نہ لگائیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں یعنی اگر ہم ماضی کا مقابلہ حال سے نہ کریں تو ممکن نہیں کہ ہم غلطیوں کا شکار نہ ہو جائیں اور صداقت کے راستے سے بھٹک نہ جائیں۔" (مقدمۂ ابن خلدون)

"بالتحقیق اُن مسلمانوں نے (آخرت میں) فلاح پائی جو اپنی نماز خشوع سے ادا کرتے ہیں، جو لغو باتوں سے، خواہ وہ قولی ہوں یا فعلی، دُور رہتے ہیں، جو زکوٰۃ کے طریقے پر ثابت قدمی سے کاربند رہتے ہیں، جو اپنی عصمت کا تحفظ کرتے ہیں......جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں......"

(المؤمنون - ۱ تا ۸)

"یقیناً اللہ تمھیں عدل و احسان اور رشتہ داروں کا حق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور بدی، بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے......"

(النحل - ۹۰)

ایک عیسائی مورخ کا قول ہے "کسی اُمت کے ابتدائی مراحل نشو و نما میں، جب اس کے عقائد کا رسوخ و وثوق درجۂ کمال کو نہیں پہنچا ہوتا، ظاہری رسوم اور باقاعدہ ادارے عوام الناس کے سینوں میں حسِ مذہبی کو زندہ رکھنے کی خاطر ضروری ہوتے ہیں اور یہ ایمان و احسان کے ساتھ کوئی تناقض نہیں رکھتے"[1] چنانچہ انسانوں کی اکثریت کو ایک واضح اور سہل الفہم تصورِ دین کا ابلاغ کرنے کی خاطر حضرت محمدؐ نے اپنی تعلیمات سے چند آداب و رسوم کو وابستہ کر دیا۔ اور تو اور، خود حضرت عیسیٰؑ نے دو رسمیں جاری کی تھیں یعنی بپتسمہ اور عشائے ربانی[2] (Holy supper) اور وہ کچھ اور مدت تک دنیا میں رہتے تو ممکن ہے کہ وہ چند اور رسوم کا اضافہ کرتے۔ بہرحال ایک چیز یقینی ہے۔ وہ یہ کہ اگر ان کو ایک طویل تر حیاتِ دنیوی نصیب ہوتی تو وہ اپنی تعلیمات کو زیادہ منظم بنیادوں پر استوار کر جاتے۔ عیسائیت میں جو یہ بنیادی نقص رہ گیا دراصل اسی کی بدولت کلیسائی مذاکرے اور جلسے (Convocations Councils) ضروری ہوئے تاکہ ارکانِ دین اور مسلّماتِ ایمان معین کئے جائیں۔ لیکن جب وہ معین ہوئے تو ایسے نکلے کہ عقل اور فکرِ آزاد کی ایک خفیف سی ضرب سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ حضرت

---

[1] Moshiem, vol. I, p.124

[2] ایضاً

عیسیٰؑ کا کام ادھورا رہ گیا۔ اخلاقی قوانین کی ضابطہ بندی کو ایک اور معلّم کے حصّے میں آنا تھا۔

اپنے خالق کے ساتھ ہمارے جو تعلّقات ہیں وہ تو ہمارے ضمیر کے معاملے ہیں لیکن اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمارے تعلّقات کو مثبت قواعد کے تابع ہونا چاہیئے اور انسانوں کے باہمی فرائض کی بجا آوری کے لیے مذہب کی تصدیق و توثیق، یعنی تکلیفِ شرعی، سے بڑھ کر کونسی ضمانت ہوسکتی ہے؟ مذہب کو صرف چیدہ چیدہ معلّموں کی خطیبانہ چرب زبانی کا موضوع یا خواب وخیال کی دنیاؤں میں رہنے والی چند مخصوص طبائع کی تفریح کے لیے ایک عجیب و غریب نظریہ نہ ہونا چاہیئے۔ مذہب کو آئینِ زندگی ہونا چاہیئے، اس کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ نوعِ انسانی کو اس اوجِ کمال تک پہنچائے جو ہماری ہستی کی منزلِ مقصود ہے۔ لہٰذا وہ مذہب سب سے زیادہ توجہ اور احترام کا مستحق ہے جو اجتماعی مطالبات اور انسانی فرائض کی ضابطہ بندی کرکے اخلاق کے بنیادی اصولوں کی تنظیم کرے، جو عقلِ انسانی کی انتہائی نشوونما کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی بدولت ہیں مرحلہ بہ مرحلہ ہستیِ کامل سے قریب تر لینا چلا جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اسلام کی تبلیغ کی اس کا امتیازی وصف یہ ہے کہ تمام مذاہب میں، خواہ وہ خاص خاص قوموں کے لیے آئے ہوں یا ساری نوعِ انسانی کے لیے، جو عظیم ترین اور نمایاں ترین اوصاف ہیں، یعنی ایسے اوصاف جو انسان کی عقل اور وجدانِ اخلاقی سے موافقت رکھتے ہیں، وہ ان سب کا جامع ہے۔ وہ محض ایک ایسا نظام نہیں جو انسانی ترقی کے ایک صحیح تصوّر پر مبنی چند مثبت اخلاقی قواعد پر مشتمل ہے، بلکہ وہ "چند بنیادی اصولوں کا قیام ہے، چند میلانات کا بروئے کار لانا ہے، ایک خاص افتادِ طبع ہے اور ان سب کا اطلاق انسانی ضمیر کو زمان ومکان کے ہمیشہ بدلتے ہوئے حالات پر کرنا پڑتا ہے"۔ معلّمِ اسلامؐ نے عالمگیر محبّت واخوّت کو محبّتِ الٰہی کے نشان کے طور پر پیش کرکے ہزاروں مختلف طریقوں سے اس کی تلقین کی "کیا تمھیں معلوم ہے کہ جب تم خدا کے حضور میں حاضر ہوگے تو وہ تمھیں کس نشانی سے پہچانے گا؟ وہ نشانی وہ محبّت ہے جو تمھیں اپنے بچّوں سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے ہمسایوں سے اور اپنے ہم جنسوں سے تھی[1]"

---

[1] مشکوٰۃ۔ XXI 11 XV & XVI

"کیا تم اپنے خالق سے محبت رکھتے ہو؟ تو پہلے اپنے ہم جنسوں سے محبت کرو۔"[1]

"کیا تم خدا کا قرب حاصل کرنا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو اس کی مخلوق سے محبت کرو، دوسروں کے لیے وہی چیزیں پسند اور وہی چیزیں رد کرو جو تم اپنے لیے کرتے ہو، ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو جیسا تم اپنے ساتھ چاہتے ہو۔"

ناپاکی میں جو بُرائی ہوتی ہے، ریاکاری میں جو کمینہ پن ہوتا ہے اور خود فریبی میں جو خدا فریبی ہوتی ہے، مبلّغِ اسلام نے ان سب کی مذمت نہایت سخت الفاظ میں کی اور ناقابلِ اشتباہ الفاظ میں اس نے حق و صداقت، نیکی و احسان اور برادرانہ محبّت کی گرانقدری کا اعلان کیا۔

اسلام کی ہدایات میں تمام زمانوں اور تمام قوموں کے حالات کے مطابق موڑے جانے کی جو صلاحیت ہے، عقل کی روشنی کے ساتھ ان میں جو کامل مطابقت ہے، اُن کی جو یہ خصوصیت ہے کہ اُن میں کوئی ایسے مخفی و پُراسرار مسئلے نہیں جو انسان کے سینے کے اندر ودیعت کی ہوئی ازلی صداقتوں کو جذباتی وہم پرستی و جہالت کا گرہن لگا دیں ـــ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں جو مذہبی استعداد ہے اسلام اس کی جدید ترین ترقیوں کا آئینہ دار ہے۔ جن لوگوں نے اسلام کی بعض ہدایات کے تاریخی مطلب و مدّعا سے دانستہ تجاہل کیا ہے ان کا خیال ہے کہ ان ہدایات کی ظاہری درشتی یا موجودہ اسالیبِ فکر سے اُن کی نامطابقت اسلام کے اس دعوے کو کہ وہ ایک عالمی مذہب ہے ناقابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ لیکن اگر قوانین و ہدایات کی تاریخی ونعت کی تھوڑی سی تحقیق کی جائے اور واقعات کا جائزہ لیتے وقت قدرے زیادہ انصاف سے کام لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ایسے اسلامی قوانین جو جدید زمانے کے مطالبات و تعصّبات سے ہم آہنگ معلوم نہیں ہوتے محض ایک عارضی اور وقتی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام کی ہمہ گیری کو، اس کی وسیع المشربی کو اور تمام اخلاقی نظاموں سے اس کی فراخدلانہ رواداری کو اس کے حریف مذاہب کے تعصّب نے یا تو صحیح طور پر سمجھا نہیں یا جانتے بوجھتے

---

[1] شرح بخاری ـ حصہ اول ـ صفحہ ۷۰

انھیں مسخ کر دیا ہے یا عمداً پوشیدہ رکھا ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

"یقین جانو کہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا عیسائی، جو لوگ بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے، اُن کے لیے نہ کسی خوف کا مقام ہے نہ رنج کا[1]"

(المائدہ ۵ - ۶۹)

اس مضمون کا اعادہ پانچویں سورہ میں جا بجا کیا گیا ہے۔ ان عبارتوں کے علاوہ سینکڑوں عبارات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نجاتِ اُخروی کو صرف پیروانِ محمدؐ تک محدود نہیں رکھتا۔

"تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی ہے۔ اگر تمھارا خدا چاہتا تو تم سب کو (یعنی ساری نوعِ انسانی کو) ایک ہی اُمت بنا سکتا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس نے تمھیں مختلف احکام دے کر تمھاری آزمائش کی ہے۔ لہٰذا نیک کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمھیں ان باتوں کی اصل حقیقت جتا دے گا جن کے بارے میں تم اختلاف کرتے رہے ہو"

(المائدہ ۵ - ۴۸[2])

دنیا کے جن مذہبوں نے ضمیرِ انسانی پر حکومت کی ہے ان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں وہ دونوں تصورات مجتمع ہیں جو مختلف زمانوں میں انسانی کردار کے سب سے بڑے محرک رہے ہیں یعنی وقارِ انسانی کا احساس، جسے قدیم فلسفوں نے بڑی اہمیت دی ہے اور معصیتِ انسانی کا احساس، جو عیسائی متکلمین کو اس قدر عزیز ہیں۔ یہ عقیدہ کہ آخرت کے دن انسان کی قسمت کا فیصلہ محض اس کے اعمال کی بناء پر ہوگا

---

[1] ان تعلیمات کا مقابلہ Athanasian Creed کی تعلیمات سے کیجیے۔

[2] مزید ملاحظہ کیجیے، ۲ - ۶۲، ۲ - ۱۱۲، ۲۲ - ۴۱، ۳۹ - ۴۱، ۴۰ - ۱۳ وغیرہ

مسلمان کو تقویٰ اور اپنے ہم جنسوں سے لطف و احسان کی طرف رغبت دلاتا ہے مشیتِ ربّی پر اعتماد، خدا کے رحم و کرم، شفقت و محبّت اور قدرتِ مطلقہ پر ایمان اسے خدا کے سامنے انکسار و عاجزی سکھاتا ہے اور ان غازیانہ محاسن پر آمادہ کرتا ہے جن کے طفیل اسلام پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اسلام نے جن اوصافِ حسنہ کی تلقین کی ہے ان میں رواقیت پائی جاتی ہے[۱] یعنی صبر و تحمّل، تسلیم و رضا اور زندگی کے امتحانوں میں ثابت قدمی۔ یہ ایمان اُسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے ضمیر سے تردّد و اضطراب کے ساتھ باز پرس کرتا رہے، اپنے اعمال کے محرکات کا حزم و احتیاط کے ساتھ مطالعہ کرتا رہے[۲]۔ اپنی ذاتی قدرت پر مکمل بھروسہ نہ رکھے، بلکہ خیر و شر کی باہمی جنگ میں خدائے جلیل و کریم کی تائید پر اعتماد کرے۔

بعض مذاہب میں فرائض معیّن کرنے والے احکام ایسے ناقابلِ عمل، فطرتِ انسانی کے علم سے اس قدر خالی اور اندھا دھند جوش رکھنے والوں کی سی پراگندہ دماغ خیال پرستی سے اس قدر مملو رہے ہیں کہ زندگی کے حقیقی مخاربوں میں بالکل بے کار ثابت ہوئے ہیں[۳]۔ کسی مذہب کی عالمگیری کے بارے میں فیصلہ کرنے کے معیار یہ ہیں کہ وہ کہاں تک قابلِ عمل ہے، انسانوں کے عام تعلقات میں اور روزانہ زندگی کے معاملات میں وہ کتنا مستقل اثر و نفوذ رکھتا ہے اور عوام النّاس کے دلوں پر اس کا سکّہ کہاں تک جمتا ہے۔ کسی مذہب کے حقیقی اوصاف کا اندازہ اس سے نہیں لگایا جا سکتا کہ غیر معمولی طبائع پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ عام لوگوں کی ذہنیتیں اس سے جس طور پر متاثر ہوتی ہیں اس کا مطالعہ کیا جائے۔ کیا وہ ان پر اثر اندازی کی بڑی قوّت رکھتا ہے؟ کیا وہ انھیں رفعت بخشتا ہے؟ کیا وہ اُن کے تصوّرِ حقوق

---

[۱] Clarke, *Ten Great Religions*, p. 484

[۲] حسین واعظ کی کتاب "اخلاق" کے Apologue بر موضوعِ "اخلاص" سے موازنہ کیجئے۔

[۳] موازنہ کیجئے۔ موسیو ارنسٹ ہارؔوے Ernest Harvet کے وہ اقوال جو انہوں نے اپنی فاضلانہ کتاب Le Christianisme et ses Origines, Pref. p. xxxix

و فرائض کو منضبط کرتا ہے ؟ اگر جزائر بحرِ جنوبی یا گفرار یا کے باشندوں میں اس کی تبلیغ کی جائے تو کیا وہ انھیں بہتر بنائے گا یا اور بھی بدتر کر کے رکھ دے گا ؟ .... یہ ہیں وہ سوال جو قدرتی طور پر ہمارے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام میں ایک بلند نظر مقصدیت ایک انتہائی معقول عملیت کے ساتھ جمع کی گئی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے کبھی اپنے آپ کو ان پیچ در پیچ راستوں میں نہیں الجھایا جو واقفیت و حقیقت کی اقلیم سے باہر ہیں۔ دوسرے دینی نظاموں کی طرح اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ نوعِ انسانی کو کمالِ مطلق کی مثالی معراج کی طرف اٹھا لے جائے۔ لیکن وہ اس مقصد کی تحصیل یا اس کی تحصیل کی کوشش اس حقیقت کے ادراک کے ذریعے کرتا ہے کہ اس مادی زندگی میں انسان کی فطرت ناقص ہے۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ "اگر تیرا بھائی تیرے ایک گال پر طمانچہ رسید کرے تو تو دوسرا گال اُسے پیش کر دے"۔ لیکن اگر اس نے خبیث النفس غلط کاروں کو اُن کی بُرائی کی حد تک سزا دینے کی اجازت دی[1] تو ساتھ ہی ساتھ اس نے سوز و گداز سے بھرے ہوئے الفاظ میں اور مختلف لہجوں میں عفو و حلم اور بدی کا معاوضہ نیکی سے دینے کی تعلیم بھی دی۔ قرآن کا ارشاد ہے :۔

"اس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو دوسروں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے اور خود بھی نیک کام کرتا ہے۔؟ .... نیکی اور بدی برابر نہیں، بدی کا دفعیہ اس سے کرو جو اس سے بہتر ہے۔"

(حم السجدة ۔ ۳۳ ۔ ۳۴)

"ایک اور جگہ جنّت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے "اور وہ اُن کے لیے ہے

---

[1] قرآن ۔ سورہ ۲۲ ۔ ۳۹ ۔ ۴۰ ۔ تونیسن Thonissen کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت محمد نے عمداً برائیاں کرنے والوں کو سزا دینے کی اجازت اس مقصد سے دی کہ ان سے زیادہ سنگین برائیوں کا انسداد ہو سکے۔

جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، غصّے کو قابو میں رکھتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں۔"

(الشوریٰ ۴۲ - ۳۷)

یہ خُلقِ عظیم سکھانے والی ہدایات ایسی نہیں کہ جبلی جذباتیت کے طاقِ نسیاں ہی پر دھری رہ جائیں، بلکہ یہ سچے مسلمان کی زندگی کے عملی اصول ہیں۔ دوسرے مذاہب کے پیروؤں نے امتحان و ابتلا میں صبر و تحمل کی جو مثالیں پیش کیں تاریخ نے انھیں محفوظ رکھا ہے تاکہ آئندہ نسلیں انھیں خراجِ تحسین ادا کریں۔ لیکن اقبال و خوش حالی کی بہ نسبت عُسرت و مصیبت میں، جب کہ انسان میں برائیوں کا بدلہ لینے کی طاقت نہیں ہوتی، عفو و بُردباری زیادہ آسان ہے۔ شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو ایک غلام نے ایک اُبلتی ہوئی طشتری اُن کے جسمِ مبارک پر اُلٹ دی اور اُسی وقت دو زانو ہو کر قرآن کی یہ آیت پڑھی :-

"جنّت اُن کے لیے ہے جو اپنے غصّے کو ضبط کرتے ہیں۔"

امام حسینؓ نے کہا: "مجھے تو غصّہ نہیں آیا۔" غلام نے یہ مزید عبارت پڑھی: "اور اُن کے لیے بھی جو انسانوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں۔" امام حسین نے کہا: "میں نے تجھے معاف کیا"۔ غلام نے آیت کی تکمیل کرتے ہوئے اضافہ کیا: "کیونکہ خدا محسنوں سے محبّت کرتا ہے۔" امام حسین نے اسی وقت اعلان کیا "جا میں نے تجھے آزاد کیا اور تجھے چاندی کے چار سو سکّے بھی دیتا ہوں۔"[1]

صاحبِ کشّاف اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یوں پیش کرتا ہے: "جو تمھیں دھتکار دے اُس کے پاس دوبارہ جاؤ، جو تم سے کچھ لے لے اس کو اور بھی دو، جو تمھارے ساتھ بُرائی کرے

---

[1] یہ واقعہ سیل (Sale) نے بھی اپنے ترجمۂ قرآن کے تیسرے باب پر ایک نوٹ میں اور گبن نے بھی اپنی تاریخ زوالِ روما میں بیان کیا ہے۔ لیکن دونوں نے سہواً اسے حضرت امام حسنؓ سے منسوب کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر حسینی۔

اُسے معاف کر دو[1] کیونکہ خدا کو یہ پسند ہے کہ تم اس کے کمالات کی جڑ اپنی روح کی گہرائیوں میں گاڑ دو[2]۔"

کیا کوئی عبارت جذبے کی رفعت و پاکیزگی میں ذیل کی قرآنی عبارت سے زیادہ حسین و جمیل ہو سکتی ہے ؟ :-

"رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جب جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہتے ہیں 'تم کو سلام'، وہ جو اپنے ربّ کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں،......... ؛ وہ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ ایسے کہ فضول خرچی ہو اور نہ ایسے کہ بخل ہو، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال سے، وہ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے، اور زنا کے مرتکب نہیں ہوتے،...... وہ جو جھوٹ کے حق میں گواہی نہیں دیتے، اور اگر کسی لغو فعل سے اُن کا سامنا ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح اُس کے پاس سے گزر جاتے ہیں،...... وہ جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے ـــ یہ ہیں وہ لوگ جنھیں اجرِ عظیم ملے گا، کیونکہ انھوں نے صبر سے کام لیا اور جنّت میں اُن کا استقبال خوش آمدید اور دُعا و سلام سے کیا جائے گا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ خوب ہے وہ ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ!"

(الفرقان ۲۵ : ۶۳ تا ۷۶)

یہ ہے محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ اسلام۔ یہ صرف ایک ضابطۂ عقائد ہی نہیں بلکہ موجودہ زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ ہے، راست بازی، راست اندیشی، راست گوئی کا ایک

---

[1] اس کا مقابلہ کیجیے حضرت رسولؐ کے اس ارشاد سے جو البورہ آرنے مشکوٰۃ (کتاب ۴۔ باب ۱، فصل ۲) میں روایت کیا ہے اور مستطرف میں عفو کے باب سے (باب ۳۶).

[2] زمخشری (کشّاف) مصری ایڈیشن ۔حصہ ا ۔صفحہ ۲۸۰ -

مسلک ہے، جس کی بنیاد حُبِ الٰہی پر، عالم گیر عطا و احسان پر اور خدا کی نگاہوں میں تمام انسانوں کی مساوات پر ہے۔ اسلام کے موجودہ نام لیواؤں نے اس کی اصلی شان و شوکت کو چاہے کتنا ہی غبار آلود کیوں نہ کر دیا ہو (اور سچ پوچھئے تو اس زمانے میں جو اسلام رائج ہے اس کے نقائص و معائب پر ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے) پھر بھی وہ مذہب جس نے صلاح و تقویٰ اور اعمال کی بناء پر جزا و سزا کو ایک ضابطہ بند صورت میں مجسّم کر دیا ہے نوعِ انسانی کے محبّوں کے اعتراف کا مستحق ہے[1]۔

می توانی از رہِ آساں شدن بر آسمان
راست باش و راست رو کانجا نباشد کاستی

اسلام کے نزدیک موجودہ زندگی آئندہ زندگی کا مزرع ہے۔ کاملِ انکسارِ نفس کے ساتھ انسانوں کی بھلائی کی خاطر کام کرنا، جامع الکمالات سے کسبِ کمال کی خاطر پوری ہمت کے ساتھ کوشش، یہ ہے اسلام کا اصل الاُصول۔ سچا مسلمان سچا عیسائی بھی ہوتا ہے، ان معنوں میں کہ وہ حضرت عیسٰیؑ کی نبوت کا قائل ہے اور ان کی اخلاقی تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرتا ہے۔ پھر اس کا کیا جواز ہے کہ کوئی سچا عیسائی اس معلّم کا احترام نہ کرے جس نے اپنے پیش رو معلّموں کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا؟ کیا اس معلّم نے دنیا کی آوارہ و ہرزہ گرد قوتوں کو یکجا کر کے ترقی کی راہ پر گامزن نہیں کیا۔؟

اس کے سوا کہ اسلام حضرت عیسٰیؑ کے ابن اللہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتا، اسلام اور عیسائیت میں کوئی اساسی اختلاف نہیں۔ دونوں کا جوہر، دونوں کی رُوحِ رواں ایک ہی ہے، دونوں نوعِ انسانی کے بطون میں کام کرنے والی ایک ہی قسم کی روحانی قوتوں کی پیداوار ہیں۔ عیسائیت یہودیوں اور رومیوں کی شقی القلب مادہ پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی، اسلام عربوں

---

[1] Cotter Morrison, in his *Services of Man* اس کے مخالف نظریئے کو اخلاقِ انسانی کے حق میں حد درجہ مضر خیال کرتا ہے۔

کی انسانیت سوز بُت پرستی اور ان کے وحشیانہ وظالمانہ رسوم وعادات کے برخلاف ایک اعلانِ جنگ تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ ایک متمدن و مہذب قوم کو کی گئی جو ایک منظم حکومت کی تابع فرمان تھی۔ اس لیے اسے نسبتاً کم شورہ پُشت خرابیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اسلام کی اشاعت ایسے قبیلوں اور فرقوں میں ہوئی جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اس لیے اُسے ذاتی مفادات کے جبلّی تقاضوں اور آبائی وجدی توہّم پرستی کی قلعہ بندیوں کے خلاف لڑائی لڑنی پڑی عیسائیت مشرق کی طرف جو قدم بڑھا رہی تھی انھیں ایک نفیس الدماغ ،لیکن عجیب الفطرت شخص نے ، جو نسلاً یہودی لیکن تعلیماً اسکندریہ کا ایک یونانی تھا ، روک دیا۔ چنانچہ وہ یونان اور روما کی طرف چل دی۔ ان ملکوں میں پہنچ کر اس نے ان کی صدیوں پُرانی مُشرکانہ تہذیب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اُسے نئے افکار اور نئے نظریوں کی صورت میں منتقل کر دیا۔ عیسائیت نے جس لمحہ اپنے مولد سے نقلِ مکان کیا وہ عیسائیت نہ رہی بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے دین کی بجائے پال حواری کا مذہب بن گئی۔ قدیم شرک کے صنمکدے گرنے کے قریب تھے۔ یونان اور اسکندریہ کے فلسفے نے رومی دنیا کو ذہنی طور پر ایک مجسّم خدا پر ، یعنی ایک نیم خدا پر ، ابدیتِ کبریٰ کے سینے میں ایک ابدیتِ صغریٰ پر ایمان لانے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ یہ تصور پال کی سکھائی ہوئی عیسائیت میں حلول کر گیا۔ جدید زمانے کی مثالیت پرست عیسائیت ، جو ایک مثبت مذہب کے بجائے ایک نظامِ فلسفہ ہے ، ماقبل عیسائیت اور مابعد عیسائیت تہذیب کی متعدد صدیوں کی پیداوار ہے۔ اسلام کا پیغام جن لوگوں کو اور جن اجتماعی و اخلاقی حالات میں دیا گیا وہ بالکل مختلف قسم کے تھے۔ ایک "انحطاط یافتہ" عیسائیت نے اس کی اشاعت میں جو سدِّراہ حائل کر دی اگر وہ اس کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا اور کرۂ ارض کی اشرف قوموں میں رواج پا جاتا تو اس کی ہیئت و سیرت اور اس کی ترقی اس نقشے سے بالکل مختلف ہوتی جو اس وقت نسبتہً کم شائستہ مسلم جماعتیں کسی مشاہدہ کرنے والے کی نگاہوں کو پیش کرتی ہیں۔

دو ایسے دریاؤں کی طرح جو دو مختلف علاقوں میں سے گزرتے ہیں ان دو مذاہب نے اپنے اپنے علاقوں کی زمین کی طبعی خصوصیتوں کے مطابق مختلف نتائج رونما کیے ہیں میکسکو کے وہ باشندے جو اپنے آپ کو ایک مذہبی ریاضت کے طور پر خاردار جھاڑیوں کی ٹہنیوں سے اذیت

پہنچاتے ہیں، جنوبی امریکہ کے بت پرست، بلکہ تمام عیسائی قوموں کے نچلے طبقے کسی معنی میں بھی عیسائی کے لقب کے مستحق نہیں۔ ان کے اور جدید عیسائی فکر کے رہنماؤں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ اسلام نے جہاں کہیں بھی ثقافت پذیر اور ترقی پسند قوموں میں رواج پایا ہے، وہاں اس نے اپنے آپ کو ترقی پسند رجحانات سے کاملاً ہم آہنگ ثابت کیا ہے، تہذیب کے ارتقاء میں مدد دی ہے اور مذہب کو ایک مثالی ہیئت بخشی ہے۔[۱]

ایک مذہب اسی صورت میں جاہل اور غیر تربیت یافتہ لوگوں پر ایک مستقل صحت بخش اثر ڈال سکتا ہے کہ اس کے اوامر و نواہی نمایاں طور پر حتمی و قطعی ہوں۔ جہاں تک اعلیٰ اور روحانیت سے مملو طبائع کا تعلق ہے، وہ کبھی کبھی خارجی ہدایات کے بغیر بھی اپنے ہم جنسوں کے ساتھ راہ و رسم سے متعلق اپنے قلوب کے اہرتوں پر قاعدے وضع کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کسی نہ کسی انداز سے اللہ کے ساتھ رشتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خیر و شر اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی استعداد انھیں فطرتاً ودیعت ہوئی ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی رہتی ہے۔ افلاطون اور ارسطو کو الہامی دینوں کا نور نصیب نہ ہوا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اخلاق کے بعض بلند ترین اصول دنیا کو اسی طرح وضاحت سے بتائے جیسے انبیاء نے تلقین فرمائے تھے۔ ان کو بھی اپنے طور پر ہدایت الٰہی نصیب ہوئی تھی اور ان کی فکر نے انھیں بلندی بخش کر حق کے قریب پہنچا دیا تھا۔

لیکن نوعِ انسانی کی اکثریت کے لیے، جو جہالت یا بد تربیت میں مبتلا ہے، اور ایسے لوگوں کے لیے جو شائستگی سے معرّا اور بری عادتوں کے شکار ہوں، اخلاقی ہدایات کوئی معنی نہیں رکھتیں، جب تک انھیں صریح الفاظ میں قانونوں کی سی قطعیت کے ساتھ اور سزا و جزا سے

---

[۱] وہ مذہب جس نے حضرت علیؓ کی غازیانہ وفاداری، امام جعفر صادق کے حلم و نرم مزاجی، امام موسیٰ کے صبر و تقویٰ، حضرت فاطمہؓ کی قدسی پاکدامنی، حضرت رابعہ بصری کی پارسائی کو جنم دیا، وہ مذہب جس نے ابن سینا، البیرونی، ابن خلدون، سنائی، جلال الدین رومی، فرید الدین عطار، ابراہیم ادہم اور ایسے ہی کئی کبار ابطال پیدا کیے، وہ مذہب یقیناً اپنے اندر ایسے اوصاف رکھتا ہے جن سے اُمیدِ فلاح کی جا سکتی ہے۔

منسلک کرکے پیش نہ کیا جائے۔ نہ مذہب کا اخلاقی پہلو ایسے لوگوں کے احساسات و جذبات کو حرکت میں لاتا ہے، نہ فلسفیانہ تصورات اُن کے ذہنوں، اُن کے آئے دن کے کردار یا اُن کے اسلوبِ زندگی پر کسی قسم کا اثر مترتب کرتے ہیں۔

مجرّد اصولوں پر خطبوں کی بہ نسبت سند و نظیر کا سکّہ ان کے دلوں پر بہ آسانی بیٹھتا ہے۔ انھیں اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ نہ صرف اپنے ہم جنسوں بلکہ اپنے خدا کے ساتھ بھی تعلقات کے بارے میں اُن کے لیے پکّے قاعدے بنا دیئے جائیں، ورنہ انسان تو انسان، وہ خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔

اسلام کو ساتویں صدی عیسوی میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور جس حیرت انگیز سُرعت سے وہ روئے زمین پر پھیلا اُس کا راز اسی میں مضمر تھا کہ اس نے انسانی فطرت کی اس بنیادی ضرورت کو ملحوظ رکھا۔ ایک ایسی دنیا سے جو مختلف مذہبوں اور فرقوں کے مناظروں اور مناقشوں کی معرکہ گاہ بنی ہوئی تھی اور جس کے لیے اعمال کی بہ نسبت الفاظ کہیں زیادہ اہمیت رکھتے تھے اس نے اختیار و اقتدار کے منبعِ مطلق سے آئے ہوئے حتمی احکام کی صورت میں خطاب کیا۔ اگرچہ اس نے اخلاقی و اجتماعی بربادی کے ماحول میں جنم لیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ازلی ارادۂ ذاتی کی پرستش کو منظّم و منضبط کرے اور اس طرح نوعِ انسانی کی توجہ فرائض کی بجا آوری کی طرف مبذول کرائے جو روحانی نشو و نما کا واحد طریقہ ہے۔ نسبتہً اسفل قوموں کو اجتماعی اخلاق کی ایک بلند تر سطح پر اٹھا کر اس نے ایک مستقل نظام کی ضرورت دنیا پر ثابت کر دی۔ میانہ روی، پرہیزگاری، باہمی ہمدردی، انصاف پسندی اور مساوات کو خدا کے احکام کی حیثیت سے پیش کرکے اس نے انھیں ان اوصاف کی تعلیم دی۔ اس نے انسانی مساوات کا جو اصول قائم کیا اور اس میں جو اشتراکیت سے ملتا جلتا رجحان تھا وہ فکرِ انسانی کے اُسی پہلو کی نمائندگی کرتا ہے جس کا اظہار گلیلی کے ساحل پر ہوا تھا۔ لیکن اپنی رفیع ترین جذباتی کیفیت میں بھی مبلّغِ اسلام نے کبھی انفرادی صلاحیت کی اُن حدود کو فراموش نہیں کیا جو معاشی عدم مساوات کا باعث ہوتی ہیں۔

اسلام کے موجودہ نام لیواؤں کی حالت پر افسوس ہے! جس طرح کلیسائی "آبائیت"

(patristicism) نے دینِ عیسوی کی اصلی صورت کو مسخ کر دیا تھا، اسی طرح علمائے ظاہر کی اندھا دھند تقلید پرستی نے اسلام کی حقیقی رُوح کو جلوہ گر ہونے سے روک دیا ہے۔

ایک عیسائی خطیب نے دین اور دینیات کے باہمی اختلاف کو اور اُن خرابیوں کو جو ان دونوں کے التباس کی بدولت عیسوی کلیسا میں پیدا ہوگئی ہیں بڑے پُرزور الفاظ میں بیان کیا ہے لے جو کچھ عیسائیت میں ہو چکا ہے وہی اسلام میں ہو رہا ہے۔ عمل کی جگہ زبانی اقرار کے ڈھونگ نے لے لی ہے۔ نیک اور پُرخلوص کاموں کو، یعنی ایسے کاموں کو جو خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے، نیکی کرنے کی خاطر اور حُبِّ الٰہی کی وجہ سے کئے جائیں، خالی خولی رسم پرستی نے معطل کر دیا ہے۔ مذہبی جوش مُردہ ہو چکا ہے اور خدا اور رسولؐ کی محبت ایک مہمل ترکیب لفظی بن گئی ہے۔ وہ ذوق و شوق جس کے بغیر انسانی زندگی بہائم کی زندگی سے بہتر نہیں، یعنی راست روی و راست اندیشی کا ذوق و شوق رُخصت ہو چکا ہے۔ آج کل کے مسلمان الفاظ کی محبت میں مبتلا ہو کر معانی سے غافل ہو گئے ہیں۔ معلمِ اسلام نے جس مثالی نصب العین کی تلقین کی تھی اس کے حصول کی جدّ و جہد کرنے کی بجائے، نیکوکاری و اتقا میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہنے کے بجائے، خدا سے محبت کرنے اور اس کی خاطر انسانوں سے محبت کرنے کے بجائے، وہ موقع پرستی اور ظاہرداری کے غلام ہو گئے ہیں۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعینِ اوّلین کے دلوں میں اپنے ہادی کا جو احترام تھا اس کا ایک قدرتی تقاضا تھا کہ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس کے رنگ میں رنگ لیتے، اس کے آئے دن کے طور طریقوں کا کامل تتبع کرتے، اس کی حوادث سے مملو زندگی کے گزراں واقعات کو ایک مستقل حیثیت بخش دیتے اور ایسے احکام، قواعد اور ضوابط کو جو ایک نوزائیدہ معاشرے کے ہنگامی مسائل سے متعلق بنائے گئے تھے اپنے دلوں پر کالنقش فی الحجر کر لیتے۔ لیکن یہ خیال کرنا پیغمبرِ اسلامؐ کے ساتھ ناانصافی ہے کہ دنیا کے اس عظیم ترین مصلح نے

---

professor Momerie in his *Defects of Modern Christianity*

عقل کی حاکمیت کے اس سب سے بڑے حامی تھے، اس شخص نے جس نے یہ اعلان کیا کہ اس کائنات پر ایک ضابطۂ قوانین مسلط ہے اور دائمی ارتقا آئینِ فطرت کا بنیادی تقاضا ہے، کبھی یہ سوچا ہوگا کہ اور تو اور ایسی ہدایات بھی جو ایک نیم مہذب قوم کی عارضی ضرورتیں پوری کرنے کی خاطر دی گئی تھیں رہتی دنیا تک ناقابلِ تغیر سمجھی جائیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ سے بڑھ کر کسی شخص کو اس امر کا احساس نہ تھا کہ اس ترقی پذیر دنیا میں جس کے اجتماعی و اخلاقی مظاہر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، نت نئی ضرورتیں پیدا ہوتی رہیں گی اور یہ ممکن ہے کہ اس پر جو آسمانی آیات نازل ہوئیں وہ تمام ممکن حالات پر منطبق نہ ہو سکیں۔ حضرت معاذؓ کو حاکمِ یمن مقرر کیا گیا تو پیغمبر صلعم نے ان سے پوچھا کہ صوبے کے نظم و نسق میں وہ کس قانون کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنائیں گے۔ حضرت معاذؓ نے جواب دیا "قرآن کے قانون کو"۔ پیغمبر نے پوچھا "لیکن اگر تمھیں قرآن میں کسی معاملے کے بارے میں کوئی ہدایات نہ ملیں تو اس صورت میں کیا کروگے"؟ حضرت معاذؓ نے کہا "اس صورت میں میں سنتِ نبویؐ پر عمل کروں گا"۔ پیغمبر نے پھر پوچھا "اور اگر وہ بھی ناکافی ثابت ہو؟" حضرت معاذؓ نے جواب دیا "تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا"۔ پیغمبر صلعم نے اس جواب کو بہت پسند فرمایا اور اپنے دوسرے مندوبین کو بھی اسی کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کی۔

یہ جلیل القدر معلم اپنے وقت کے مسائل سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جن لوگوں سے اسے سابقہ پڑتا تھا وہ کس طرح اجتماعی و اخلاقی مایوسی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنے خداداد تعمقِ نظر اور وسعتِ فکر کی بدولت اس نے اس امر کا ادراک کر لیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے اس کی پیش گوئی کی کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب اتفاقی و عارضی ہدایات کو دائمی اور کلی ہدایات سے متمائز کرنا ضروری ہوگا۔ اس نے اپنے پیروؤں سے خطاب کرکے اعلان کیا: "تم لوگ ایک ایسے دور سے گزر رہے ہو کہ اگر تم احکام کے دسویں حصے سے بھی تغافل برتو تو برباد ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آئے گا کہ اس وقت جو احکام دیئے گئے ہیں اگر کوئی ان کے دسویں حصے پر بھی عمل کرے گا تو اسے نجات نصیب ہو جائے گی[1]" (حاشیہ صفحہ ۲۰۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

وعن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انکم فی زمان من ترک عشر ما امر به هلك ثم یاتی زمان من عمل منهم عشر ما امر به نجا۔[1]

جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، وہ لعنت جس میں مسلمان قومیں اس وقت گرفتار ہیں معلّمِ اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مذہب میں اسلام سے بڑھ کر نشوونما کا مادّہ نہ تھا، کوئی بھی مذہب اس سے زیادہ خالص یا نوعِ انسانی کے روز افزوں تقاضوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔

مسلم جماعتوں کے موجودہ جمود کا سب سے بڑا باعث یہ غلط خیال ہے جس نے مسلمانوں کی اکثریت پر قبضہ جمالیا ہے کہ اجتہادِ ذاتی کا حق فقہائے قدیم پر ختم ہوگیا اور اس زمانے میں اس کی مشق گناہ ہے۔ اسی کی ایک شق یہ خیال ہے کہ ایک مسلمان صرف اُس صورت میں صحیح العقیدہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک کا مقلّد ہو اور اپنی ذاتی رائے کو معطّل کر کے ایسے علماء کے احکام و اقوال پر اعتماد کرے جو نویں صدی عیسوی میں زندہ تھے اور بیسویں صدی کے مقتضیات کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ اہلِ سنت کا یہ عام عقیدہ ہے کہ چار اماموں[2] کے بعد کوئی عالمِ دین ایسا پیدا نہیں ہوا جو شریعتِ محمدی کی تعبیر و تفسیر کی قابلیت رکھتا تھا مسلمان جن بدلے ہوئے حالات میں آج کل زندگی بسر کر رہے ہیں ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جن نتائج پر یہ علمائے دین آج سے صدیوں پہلے پہنچے تھے وہ آج بھی جوں کے توں قائم ہیں اور اُن کا اطلاق آج کے حالات پر بھی اُسی طرح ہوتا ہے۔ شیعوں میں اخباریوں کا فرقہ ذاتی رائے کو مفسرینِ شریعت سے ایک قدم آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے فکر کو

(حاشیہ [1] صفحہ ۳۰۵) یہ مستند روایت جامعِ ترمذی میں بیان کی گئی ہے اور مشکوٰۃ میں بھی پائی جاتی ہے۔

[2] ابوحنیفہ، شافعی، مالک اور احمد بن حنبل۔

ذہنِ انسانی کا سب سے اہم اور سب سے اشرف وظیفہ کہا تھا۔ ہمارے مکتبی اربابِ فقہ اور اُن کے غلامانہ ذہنیتوں والے مقلد اسے بروئے کار لانے کو گناہ اور جرم قرار دیتے ہیں۔

جو کچھ عیسائیوں کے یہاں ہوا تھا وہ ہی مسلمانوں کے یہاں ہوا ہے۔ اس زمانے میں کثیر التعداد مسلمانوں کا طریقِ زندگی اور کردار اتنا معلّمِ اسلام کے ارشادات و تعلیمات کے سانچے میں نہیں ڈھالا جاتا جتنا وہ مجتہدین اور ائمہ کے نظریات و آراء سے متاثر ہوتا ہے جنھوں نے اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے نظامِ فکر کے مطابق معلّمِ اسلام پر نازل شدہ آیاتِ ربّی کی ترجمانی کی ہے۔ ان ترجمانوں کی تو یہ مثال تھی کہ گویا یہ ایک مجمع میں کھڑے ہو کر ایک مبلّغ کا خطبہ سن رہے تھے، جو ایک جمِ غفیر سے خطاب کر رہا تھا اور جو اپنے اونچے مقام پر سے ایک وسیع رقبے کو اپنے دائرہ نظر میں لیے ہوئے تھا، لیکن ان کی نظر صرف مجمع کے ان افراد تک محدود تھی جو بالکل ان کے قریب کھڑے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ مبلّغ کے الفاظ کے وسیع تر معانی کو اور اس امر کو کہ اُس کے مخاطب کس قسم کے لوگ تھے سمجھ نہ سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اُس کے الفاظ کا مطلب اپنے تنگ دائرۂ نظر کے اندر، یعنی ان کے ذہنوں میں انسانی ضروریات اور انسانی ترقی کا جو محدود تصور تھا اس کے مطابق استنباط کر لیا۔ نہ تو انھیں معلّمِ اسلام کی تعلیمات کی ہمہ گیری کا کوئی ادراک تھا، نہ ان میں اُس کا سا جوشِ روحانی تھا، نہ ان کو اس کا سا الہام میسّر تھا۔ نتیجۃً انھوں نے یہ فراموش کر دیا کہ اس نے اپنی خداداد فطانت کی بلند چوٹی پر سے ساری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا تھا۔ انھوں نے عارضی کو مستقل سے، اصولی کو فروعی سے اور جزئی کو کُلّی سے مخلوط کر دیا۔ عیسائی کلیسائیوں کی طرح اُن علمائے فقہ میں بہت سے ایسے تھے جو جابر اور مستبد بادشاہوں کے ملازم تھے، جن کے مطالبات معلّمِ اسلام کے ارشادات سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ نئے نئے قانون ایجاد کئے گئے، نئے نئے نظریئے تراشے گئے، نئی نئی روایات ڈھونڈ نکالی گئیں، اور شارع کے الفاظ کو ایسے ایسے معانی پہنائے گئے جو ان کے اصلی مفاہیم کی ضد تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو قواعد و ضوابط آج کل مسلمانوں کے ضمیروں پر حکمران ہیں اُن میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو نصوصِ قرآنی پر مبنی نہیں، بلکہ فقہ و دینیات کی اُن کتابوں سے ماخوذ ہیں جن کی طغیانی قرونِ اُخریٰ کے دوران دنیائے اسلام

میں آئی تھی۔

"جس طرح عبرانیوں نے عہدِ عتیق کی کتابوں کو برطرف کرکے تلمود کو اختیار کیا" ایک انگریز مصنّف کہتا ہے، "اُسی طرح مسلمانوں نے قرآن کو بالائے طاق رکھ کر روایتوں اور علمائے دین کے فتووں کو اپنا رہبر بنا رکھا ہے" "ہمارا یہ مطلب نہیں" وہ اس پر اضافہ کرتا ہے "کہ اگر کسی مسلمان سے پوچھا جائے کہ اس کے مذہب کا نصاب کیا ہے تو وہ قرآن کے سوا کسی اور کتاب کا نام لے گا۔ پھر بھی ہمارا یہ مطلب ضرور ہے کہ فی الواقع قرآن اس کے اعمال یا عقائد کی رہنمائی نہیں کرتا۔ قرونِ وسطی میں نیا عہد نامہ نہیں، بلکہ ٹامس اکوئیناس کی سما تھیولوجیکا Summa Theologica 'جامعِ دینیات' عیسوی عقائد کے صواب و خطا کا معیار تھی، اور کیا موجودہ زمانے میں عیسائی گرجا کا کوئی رکن انجیلوں کی ذاتی چھان بین کرکے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے اپنے عقائد اخذ کرتا ہے؟ غالباً اگر وہ کسی تحریر سے رجوع کرتا بھی ہے تو صرف گرجا کے سوال و جواب نامہ ہی سے۔ یہی اس کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کی طبیعت میں چیزوں کی ٹوہ لگانے کا مادّہ ہو تو گرجا کے اُنتالیس ارکان سے اس کے تمام شبہات زائل ہوجاتے ہیں، لیکن اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ اس کا ضابطۂ عقائد انجیلوں سے ماخوذ ہے اور وہ یہ کبھی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس نے انجیلوں کے مضمون کا اکتساب کن وسیلوں سے کیا۔ موجودہ زمانے کا اسلام بالکل اسی قسم کے طریقوں سے وضع کیا گیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ قرآن پر مبنی نہیں"

اس کے باوجود ہر مذہبِ خیال میں اصلاح کی استعداد ہے اور اگر اس کی نشو و نما مسدود ہوگئی ہے تو اس میں اربابِ فقہ کا کوئی قصور نہیں۔ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ لوگ معلّمِ اصلی کے ارشادات کی رُوح رواں سے بیگانہ ہوگئے ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو علمائے سلف کے اقوال کو بھی سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں۔

مغربی دنیا میں دینی اصلاح کی تحریک The Reformation کا پیش خیمہ ثقافت کی نشاۃ ثانیہ The Renaissance تھی۔ یورپ کی ترقی اس

وقت شروع ہوئی جب اس نے کلیسائیت کی بیڑیاں اُتار پھینکیں۔ دنیائے اسلام میں بھی اصلاح روشن خیالی کے بعد ہی آئے گی۔ اس سے پیشتر کہ مذہبی زندگی کی تجدید ہو، ضروری ہے کہ لوگوں کے ذہن اس غلامی سے آزاد ہو جائیں جو اُن پر صدیوں کی لفظی تفسیروں نے اور تقلید کے نظریئے نے عائد کر رکھی ہے۔ وہ ظاہریت جو عبادت کرنے والے کے دل سے خطاب نہیں کرتی ترک کرنی پڑے گی۔ خارجی آداب کو باطنی جذبات کے تابع کرنا ہوگا، اور اخلاق کے سبق دلوں پر نقش کرنے ہوں گے۔ یہ سب کچھ ہوگا تو صرف اس صورت میں اس کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ پیغمبرِ اسلام کے سکھائے ہوئے فرائض کے بارے میں نئے سرے سے ذوق وشوق پیدا ہوگا۔ دنیائے اسلام میں اصلاح اس وقت شروع ہوگی جب اس امر کا اعتراف کیا جائے گا کہ کلامِ الٰہی چاہے کسی زبان میں ہو کلامِ الٰہی ہی رہتا ہے اور خدا کا ذکر چاہے کسی زبان میں کیا جائے خدا کو قبول ہوتا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے خود اپنے ایک متبع غیر ملکی کو اپنی مادری زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت دی تھی[1] یہی نہیں، اُس نے انھیں یہ اجازت بھی مرحمت فرمائی تھی کہ اپنی زبان میں قرآن کی تلاوت کیا کریں، بلکہ اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ قرآن سات قرأتیں میں نازل ہُوا تھا۔

اسلام کے قرونِ اولیٰ میں اس بات پر اتفاقِ رائے تھا کہ فہم کے بغیر عبادت بے کار ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نماز اور خطبہ کا کسی زبان میں پڑھنا جائز تھا[2]۔

امام ابوحنیفہ کے دو شاگردوں، یعنی ابو یوسف اور محمدؒ نے اپنے استاد کی رائے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ قبول کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص عربی سے نابلد ہو تو وہ کسی زبان میں نماز پڑھ سکتا ہے[3]۔ لیکن ایک نہایت معقول وجہ ہے جس کی بنا پر نماز کو عربی میں ادا کرنے کا

---

[1] حضرت سلمان فارسی، جن کی جان حضرت علیؓ نے ایک خیبر سے بچائی تھی، پہلے شخص تھے جنھیں یہ اجازت دی گئی۔
[2] جواہر الاخلاط، دُرّ المختار، باب الصلوٰۃ۔ یہی رائے تجنیس میں بھی ظاہر کی گئی ہے۔ تحمادی کہتا ہے کہ امام کی رائے مستند اور واجب التقلید ہے۔ شارحِ دُرّ المختار بھی فارسی میں نماز ادا کرنے کو جائز خیال کرتا ہے۔
[3] علمائے حاضر اس کی تاویل یوں کرتے ہیں کہ کسی اور زبان میں نماز پڑھنے کی اجازت صرف ایسے شخص کو ہے جو عربی الفاظ کا تلفظ ادا نہ کر سکتا ہو۔ اس تاویل کی کمزوری واضح ہے۔

قاعدہ، جہاں تک ممکن ہو، جاری رکھا جانا چاہیئے۔ وہ وجہ یہ نہیں کہ عربی پیغمبرِ اسلام کی زبان تھی، بلکہ یہ کہ وہ اسلام کی زبان بن گئی ہے اور ایک ایسا رشتہ ہے جو ساری اسلامی دنیا کو مربوط کئے ہوئے ہے۔ آخر وحدت سے بڑھ کر قوت کس چیز میں ہو سکتی ہے۔؟

نوٹ نمبر ا

شارعِ اسلام نے اسراف کے بارے میں جو امتناعی احکام صادر کئے انھیں دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی کیفیتی اور کمیتی۔ کھانے پینے میں بے اعتدالی کی ممانعت اور اسی طرح کی اور ممانعتیں مؤخر الذکر قسم کی ہیں۔ یہ کسی حد تک تو اس لیے ضروری سمجھی گئیں کہ زوال رسیدہ شامیوں اور رومیوں سے میل جول کے باعث عربوں میں ایک نیم مہذب قسم کی لذت پرستی epicureanism پھیل گئی تھی اور کسی حد تک چند ایسے حالات کی بناء پر جن کی جھلکیاں مجمل طور پر ہیں قرآن میں ملتی ہیں۔ جہاں تک سؤر کے گوشت کا تعلق ہے اس کی ممانعت، جو کیفیتی قسم کی تھی، صحت کے ملاحظات کی بناء پر کی گئی۔ ناچ کی ممانعت بالخصوص رندانہ و اوباشانہ رقصوں کے برخلاف تھی جن کے ذریعے مشرکینِ عرب اپنے شامی و فینیقی دیوتاؤں اور دیویوں (یعنی عشتورث Ashtoreth، مولوخ Moloch اور بعل Baal) کی پوجا کیا کرتے تھے۔

* * * * *

تیسرا باب

اسلام میں حیات بعد الممات کا تصوّر[1]

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝

"اے نفسِ مطمئنہ، اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل، تو اس سے اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے بندوں میں شامل اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

(الفجر ۲۷، ۲۸، ۲۹)

ایک آئندہ زندگی کا تصوّر، یعنی ایک ایسی زندگی کا تصوّر جو ہماری ترکیبِ فطری کے زندہ رہنے والے اور فنا ہو جانے والے اجزاء کی علیحدگی کے بعد شروع ہوگی، دنیا کی بہت سی قوموں میں، جو اور باتوں کے لحاظ سے ایک دوسری سے بالکل مختلف ہیں، بڑی حد تک مشترک ہے۔ اس بناء پر یہ عقیدہ عام ہے کہ یہ تصوّر طبعِ انسانی کے اوّل اور بنیادی عناصر میں ہوگا۔ لیکن جب ہم مختلف نسلوں اور قبیلوں کے زمانۂ طفولیت کا زیادہ غور سے جائزہ

---

[1] اس باب کو پڑھنے سے پہلے چند اشارات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔
۱۔ مصنّف نے موت کے بعد کے کوائف کی جس انداز میں تشریح کی ہے وہ انداز ان کا اپنا ہے۔
۲۔ قرآن حکیم کا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس نے اخروی زندگی کے بارے میں جن حقائق کی نقاب کشائی کی ہے، وہ بالکل نئے اور اچھوتے ہیں یا اُن پر دنیا کے مختلف گوشوں میں غور و فکر نہیں ہوا ہے، اور انسانی فکر نے اس ضمن میں کوئی ارتقائی قدم نہیں اُٹھایا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایک زندگی مستقبل کا تصور اگر جبلتِ انسانی میں مضمر ہے تو دوسری طرف وہ نفسِ انسانی کے تدریجی ارتقاء کی پیداوار بھی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۱) قرآن کا منشا محض یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں اس کی مادی و حسی لذات کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں، انھیں یقین دلائے کہ اگر تم یہاں رہ کر ایمان و عمل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہو تو تمھیں آخرت میں اس سے بہتر بلکہ مکمل زندگی عطا کی جائے گی۔

۳۔ جنت اور اس کی حسی کیفیات کے بارہ میں تاویل و تعبیر کے دو مسلمہ اصول رائج ہیں۔ ایک گروہ نے ان لذات و احوال کو اس بنیاد پر حقیقی قرار دیا ہے اور ظاہر پر محمول کیا ہے کہ انسانی "انا" میں زندگی کے یہ دونوں رخ موجود ہیں اور حسی و معنوی دونوں پہلو اس "انا" کے ایسے اجزاء ترکیبی ہیں کہ تجرید کے کسی بھی مرحلہ میں ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محدثین اور سلف کا تصور ہے۔ عقلیت پسند گروہ نے ان کو ایسے معانی سے تعبیر کیا ہے جن کو محض سمجھانے کے لیے حسیات کی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ اصل مقصود رضائے الہیٰ کا حصول ہے اور یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جس سے اہلِ ایمان جنت میں بہرہ مند ہوں گے۔

۴۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ جنت میں جن حسی لذات کا ذکر آیا ہے وہ صرف مکی سورتیں ہیں اور یہ سورتیں اس وقت نازل ہوئیں جب کہ شعورِ نبوت پختہ نہیں ہوا تھا۔ یہ درست ہے کہ قرآن حکیم میں اُمت کے شعوری ارتقاء کا برابر خیال رکھا گیا ہے۔ جسے ہم تدریج و تسہیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کا تعلق احکام و شوریٰ کے نفاذ سے ہے۔ اصول و عقائد سے نہیں۔ عقائد و اصول اس کے بغیر واضح کر دیئے گئے ہیں اور ان میں اوّل سے آخر تک کہیں جھول یا اجمال پایا نہیں جاتا۔ چنانچہ جس طرح مکی سورتوں میں جنت کی نعمتوں کا تذکرہ ہے، ٹھیک اسی طرح مدنی سورتوں میں بھی ان کا بیان ہے۔

۵۔ نبوت کے بارہ میں اس حقیقت کو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ بعض حساس اور پاکباز ہستیاں اپنے وجدان و تاثرات کو دیانتداری کے ساتھ وحی کے روپ میں دیکھتی ہیں اور اپنے دور میں پھیلی ہوئی اجتماعی سچائیوں کو اپنے دامنِ فکر میں سمیٹ اور جوڑ کر متعین دعوت کی شکل میں ڈھال دیتی ہیں۔ جیسا کہ ایک مدرسہ فکر کہتا ہے اسلامی نقطہ نظر سے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۱۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

غیر متمدّن وحشی کو اس کا سان گمان بھی نہیں کہ جو زندگی وہ اس زمین پر بسر کر رہا ہے اُس کے علاوہ اور اس سے مختلف کوئی اور زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ موت کو ہستی کا خاتمہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آتا ہے جب انسان اپنے ابتدائی دورِ وحشت سے گزر چکتا ہے۔ اب اُس کی اُمیدیں اور آرزوئیں اس کی ارضی موت کے نقطے پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتیں، بلکہ اسے اپنی موجودہ زندگی کے مکمل ہو جانے کے بعد ایک اور زندگی کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن اس دور میں بھی جس قسم کی بقائے دوام کا تخیّل انسان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ اس کی روزانہ زندگی کے لگے بندھے نقشے سے مختلف نہیں ہوتی بلکہ اسی زندگی کی ایک توسیع ہوتی ہے۔ قبر سے ماوراء سلسلۂ زندگی کے برقرار رہنے کا یہ خیال غالباً رُوحِ انسانی کی اُس خواہش سے، جو ابھی تک غیر شعوری تھی، پیدا ہُوا ہو گا کہ کاش ایک ایسا وسیع تر عرصۂ وجود ہو جس میں اعزّہ و اقربا سے جدائی، جو وحشی انسان اور متمدّن انسان دونوں کے لیے المناک ہوتی ہے، اُن سے دوبارہ ملاقات میں تبدیل ہو جائے۔

اس کے بعد کا مرحلہ جلد ہی آجاتا ہے، انسان کے دل میں یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی موجودہ خوشیوں اور غموں ہی پر ختم نہیں ہو سکتی، بلکہ موت کے بعد ایک اور زندگی بھی ہو گی بلکہ یقیناً ہے جس میں اس کو وہ خوشیاں اور وہ غم نصیب ہوں گے جن کا وہ مستحق ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۲) انبیاء علیہم السلام کی بعثت اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو مخلوق کی اصلاح کے لیے چنتا ہے۔ وہی ان کے قلب و ذہن کی پرورش کا اہتمام کرتا ہے اور وہی رشد و ہدایت کی ارزانی بھی فرماتا ہے۔ ان کا دل وحیِ الٰہی کا مہبط قرار پاتا ہے اور زبان حق کی ترجمان۔ انھیں اختیار قطعی نہیں ہوتا کہ اپنی طرف سے کوئی بات کہیں۔ یہ اپنے دور کی اجتماعی و فکری سچائیوں کے بارہ میں بلاشبہ ایک متعین موقف رکھتے ہیں لیکن اس میں ان کے ذاتی انتخاب کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ خود ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے عہد کی جملہ صداقتوں کی تصدیق کریں اور ان کو ایک بہترین امتزاج کی شکل میں پیش کریں۔ (م۔ ح۔ ن)

یہاں پہنچ کر انسان نے ایک اصول یا قانون کا انکشاف کیا۔

لیکن ذہنِ انسانی ایک حیاتِ مستقبل کے تصور کی مزید نشوونما سے قاصر رہتا ہے۔ فلسفۂ عدمیت و انکاریت (Nihilistic) کوئی نیا انکشاف نہیں کرتا، کوئی نیا موقف اختیار نہیں کرتا۔ وہ محض ہمارے وحشی آبائے اوّلین کی لکیر کی فقیری کرتا ہے جن کا دائرۂ نظر صرف موجودہ زندگی تک محدود تھا۔

بہرکیف یہ ایک مستند امر ہے کہ حیات بعد الممات سے متعلق مختلف خیالات، جو ایک معروضی نقطۂ نگاہ سے انسانی ذہنیت کے ارتقا کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے ہیں، نہ صرف مختلف قوموں کے یہاں بلکہ ایک ہی قوم کے یہاں ہر قوم کی انفرادی نشوونما کے مطابق بہ یک وقت مختلف مجموعہ ہائے افکار کی صورت میں موجود نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مصری پہلے لوگ تھے جنھوں نے حیاتِ بعد الممات کا نظریہ تسلیم کیا، یا کم از کم کردارِ انسانی کے اصولوں کی بنیاد اس نظریے پر رکھی۔ انھوں نے تناسخِ ارواح اور آئندہ زندگی میں جزا و سزا کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان قبر میں داخل ہوتے ہی پھر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک نئی زندگی شروع کر دیتا ہے جس میں اس کا رفیق و رہنما آفتاب ہوتا ہے جو تکوین کا اصل الاصول اور تمام موجودات کا قائم بالذات سبب ہے۔ ان کے نزدیک آفتاب کی طرح انسان کی رُوح بھی غیر فانی تھی اور اسی کی سی منازلِ سفر طے کرتی تھی۔ تمام اجسام عالمِ سفلی میں داخل ہو جاتے تھے، لیکن حشر یعنی دوبارہ اُٹھ کھڑا ہونا معدودے چند ہی کو نصیب ہوتا تھا۔ مری ہوئی روحوں کی نیکی و بدی کا فیصلہ اوسائرس دیوتا Osiris اور اس کے بیالیس مشیروں کے ہاتھ میں تھا۔ فنا کی سزا صرف اُن رُوحوں کو ملتی تھی جو گناہگار پائی جاتی تھیں۔ جہاں تک نیک روحوں کا تعلق تھا وہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہو کر کامل راحت کے عالم میں داخل ہو جاتی تھیں اور اوسائرس انھیں اپنے ہمرکابوں

سلہ

Rawliinson, *History of Ancient Egypt*, vol. ii, p. 423

کی حیثیت سے لذیذ نعمتیں مہیا کرتا تھا[1]

ہمیں قدرتی طور پر توقع ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر میں ایک مدتِ مدید تک قیام کرنے کی بدولت مصریوں سے حیاتِ بعد الممات کا تصور اور اس کا تلازمہ یعنی جزا و سزا کا عقیدہ اکتساب کر لیا ہوگا۔ لیکن خالص موسویت (یا یوں کہیئے کہ وہ تعلیم جو اس لقب سے ملقب کی جاتی ہے) موجودہ زندگی سے مختلف کوئی زندگی تسلیم نہیں کرتی۔ وہ محور جس پر شریعتِ موسوی کا سارا نظام گردش کرتا ہے محض ارضی جزا و سزا پر مشتمل ہے[2] اس شریعت میں عنصرِ حیات بہت ہی کم ہے۔

حشرِ اجساد کا نظریہ اور اس سے پیدا ہونے والے افکار جن کا ظہور بعد کی یہودیت میں (اور بالخصوص حضرت دانیال اور حزقی ایل Ezekiel کی تصنیفات میں) ہوا بداہتہً ایک ثمرِ دیر رس ہے جو مذہبِ زرتشتی سے حاصل کیا گیا۔ اور تو اور شئول Sheol یعنی وہ عالمِ برزخ جہاں دنیا سے کوچ کرنے والی روحیں، عام اس سے کہ وہ نیک ہوں یا بد، کچھ مدت تک رکھی جائیں گی اگرچہ نسبتہً ابتدائی تحریروں میں مذکور ہے، لیکن اس کے جو نقشے ان تحریروں میں دیئے گئے ہیں وہ عبرانی الاصل معلوم نہیں ہوتے۔ شئول میں انسان نہ خدا کی تسبیح کر سکتا ہے نہ اس کی محبت و شفقت اُسے یاد آ سکتی ہے[3]

شئول پرچھائیوں کی ایک دنیا ہے، یعنی غیر اہلِ کتاب کے عالمِ اسفل Hades کا یہودی مثنٰی، جس میں روحیں ایک ایسی کاہلانہ لیکن بے آرام زندگی بسر کرتی ہیں جس پر مُردنی سی چھائی

---

[1] Leonormant, *Ancient History of the East* vol. i, pp. 319,322, and Aiger *History of the Doctrine of a Future Life*, p. 102, et seq Aiger *Hist of the Doctrine of a Future Life*, p. 157

Miliman's *Christianity*, pp. 21,25,75, etc

[3] زبور۔ ۶: ۵

ہوتی ہے ۵؎ انھیں اُن لوگوں کا جو دنیا میں انھیں عزیز تھے کوئی علم نہیں ہوتا اور وہ دن رات اپنی ہی حالت پر نالہ و شیون کرتی رہتی ہیں۔[1]

لیکن زمانۂ مابعد کی یہودیت زندگی مستقبل کے بارے میں ایک نہایت قوی ایمان سے معمور ہے۔ روایت تُلطف سے لے کر رُوحانی مسرت کے مقامات کی کیفیتیں اور ملعون روحوں کے عذابوں کی رُوئیدادیں بیان کرتی ہے[2] چنانچہ زرتشتی مذہب نے عبرانی قوموں پر دو طریقوں سے عمل کیا۔ اس نے نہ صرف انھیں حیاتِ بعد الممات کے ایک زیادہ خالص اور زیادہ رُوحانی تصور سے روشناس کیا بلکہ مجوسی زرتشتیت (Mogo-Zorastrianism) نے جو خود کلدانیت (Chaidaeism) کا ایک ماحصل تھی، یہودی ربانیوں کے عقائد پر عقبیٰ میں جزاؤں اور سزاؤں کے ایک مادی تصور کا گہرا رنگ چڑھا دیا[3]۔ بہرحال یہ امتیاز مشرق کی آریائی قوموں کو حاصل ہے کہ انھوں نے موت کے بعد کی زندگی کا ایک واضح اور بیّن تصور پیش کیا۔ آریائی خاندان کی ایک شاخ کے یہاں اس نے یا تو ایک لاتناہی تناسخ یعنی موت اور پیدائش کے ایک کبھی نہ تھمنے والے چکّر کی صورت، یا ایک طویل امتحان کے بعد ایک مطلق لاتناہیت میں یا ایک بے پایاں و بیکراں وسعتِ مکانی میں یا عدمِ محض میں جذب ہو جانے کی صورت اختیار کی[4]۔

۱؎ ایّوب ۱۴:۲۱، ۲۲، نیز ملاحظہ کیجیے :-

Dollinger, vol. ii, p. 389. and , Alger.

History of the Doctrine of a Future Life, p. 151,152, et seq

۲؎ Milman, *History of Christianity*,

۳؎ ملاحظہ کیجیے Alger کا وہ باب جس میں اس نے قرونِ اُخریٰ کی یہودیت پر ایرانی نظام کے اثرات سے بحث کی ہے۔

۴؎ برہمن پروہتوں نے دوزخ کے عذابوں اور جنّت کی لذّتوں کا نقشہ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

دوسری شاخ نے اس تصور کو جزاؤں اور سزاؤں کے ایک سلسلۂ مدارج کی شکل بخشی، انہی معنوں میں جن میں جدید عیسائیت اور اسلام کے نزدیک جزا و سزا اس امر کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ سوال ہے کہ مجوسی زرتشتی شروع ہی سے حشرِ اجساد پر ایمان رکھتے تھے یا نہیں۔ ڈولنگر (Dollinger) برنوف (Burnouf) اور متعدد محققین کا خیال ہے کہ یہ تصور اصل میں زرتشتی نہیں بلکہ یا تو عبرانیوں سے ماخوذ ہے یا زمانۂ مابعد کی پیداوار ہے۔[1]

حقیقتِ حال جو کچھ بھی ہو، رسولِ عربیؐ کی بعثت کے وقت ایرانیوں کے یہاں آئندہ زندگی کا ایک قوی اور ارتقا یافتہ تصور موجود تھا۔ ژند اوستا کے جو لقیۃ الدہر حصے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں مستقبل کی جزاؤں اور سزاؤں کے بارے میں عقیدہ صاف طور پر پایا جاتا ہے۔ وندیداد (Vendidad) اور بُندہیش (Bundehesh) کے مذہبِ زرتشتی میں، جو اوستا کے عقائد پر ایک اضافہ ہے، یہ خیال ملتا ہے کہ انسان کی موت کے بعد دیو (Demons) اُس کے جسم پر قابض ہو جاتے ہیں لیکن تیسرے دن شعور عود کر آتا ہے۔ وہ روحیں جو اپنی ارضی زندگی میں بدی کے دامِ تحریص میں گرفتار رہ چکی ہیں چنیواد (Chinevad) کا وہ پل پار نہیں کر سکتیں جہاں انھیں موت کے تیسرے دن کے بعد لے جایا جاتا ہے۔ نیک رُوحیں، جن کی رہبری "یزت" (Yazatas) یا جدید فارسی میں ایزد، کرتا ہے اسے پار کر لیتی ہیں اور اقلیمِ سعادت میں داخل ہو جاتی ہیں، جو ہرمُزد (Ormuzd) اور امشاسپندوں (The Amshaspands) کا مسکن ہے وہاں وہ سونے کے تختوں پر بیٹھ کر حورانِ بہشتی کی صحبت سے اور طرح طرح کی اور نعمتوں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۶) ایک بیان تخیل کی محاکاتی وضاحت کے ساتھ کھینچا۔ شہرستانی نے بدھ کے عقائد کی (ذاتی حیاتِ معاد کے بارے میں نہیں جتنی بالعموم) جو داد دی ہے، عربی داں حضرات کو اُس کی دعوتِ مطالعہ دی جاتی ہے۔ دیکھیے شہرستانی۔ صفحہ ۴۴۶۔

[1] آلجر Alger نے اس قیاس کے حق میں مضبوط دلائل پیش کئے ہیں (بالائی حاشیہ صفحہ ۳۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

لذت اندوز ہوتی ہیں۔ بُرے لوگ پُل پر سے گر کر دوزخ کے دریا میں جا پڑتے ہیں، جہاں دیو اُن کو قسم قسم کی اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ اس عذاب کی مدت ہرمُزد کے حکم سے مقرر ہوتی ہے، لیکن بعض رُوحوں کو اپنے عزیزوں کی دعاؤں اور شفاعتوں کے طفیل نجات حاصل ہوجاتی ہے۔ جب دنیا کا خاتمہ قریب ہوگا تو ایک پیغمبر آکر دنیا کو ظلم و شر سے پاک کرے گا اور انسانوں کو راحت و مسرت کی ایک نئی زندگی بخشے گا۔ یہ ہے زرتشتیوں کی بہشت اور ہرمُزد کی آسمانی بادشاہت[1]۔ اس کے بعد ایک عالمگیر حشر برپا ہوگا، جس کی بدولت بچھڑے ہوئے رشتہ دار اور عزیز پھر ایک دوسرے سے ملیں گے۔ لیکن اس ملاقات کی خوشی نہایت مختصر ہوگی، کیونکہ فوراً ہی نیکوں اور بدوں کی چھانٹ شروع ہوجائے گی اور وہ ایک دوسرے سے جدا کر دیئے جائیں گے۔ گناہگاروں کو جو عذاب دیا جائے گا وہ نہایت ہیبت ناک ہوگا۔ اہرمن اضطراب و پریشانی کے عالم میں چینواد کے پُل پہ دوڑتا پھرے گا۔ ایک پھڑکتا ہوا دُمدار ستارہ زمین پر گر کر اُسے آگ لگا دے گا۔ پہاڑ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہنے لگیں گے۔ سارے انسان بلاتمیز نیک و بد اس آتشیں سیلاب میں سے گزر کر پاک ہوجائیں گے۔ یہاں تک کہ خود اہرمن دُھل دُھلا کر کچھ کا کچھ ہوجائے گا اور دوزخ کی بھی ایک نئی صورت نکل آئے گی۔ اُس وقت سے بُرائی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجائے گا اور ساری نوعِ انسانی ایک ناقابلِ بیان راحت و نشاط

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۷) کہ ابتدائی زرتشتی حشرِ اجساد پر اعتقاد رکھتے تھے۔ زرتشتی مجوسی لاشوں سے جو کراہت کرتے تھے اس سے اس نتیجے کی تغلیط نہیں ہوتی۔ یہ کراہت اغلباً تورانی اثرات کا نتیجہ تھی۔ ملاحظہ ہو آلجر صفحہ ۱۳۸۔ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں اہلِ عجم کو لاشوں سے جو کراہت تھی اس سے متعلق ملاحظہ کیجئے بحرالبحر جلد دوم صفحہ ۴۰۹۔

[1] شہرستانی اس پیغمبر کو اُشیزر بیکا کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ دیکھئے کیورٹن کا ایڈیشن صفحہ ۱۸۸، لیکن مغربی مصنفین کے قول کے مطابق اس کا نام سوشیوش تھا اور اس سے پہلے دو اور پیغمبروں کو آنا تھا جن کے نام اوشیدر بامی اور اوشیدر ماہ تھے۔ ڈولنگر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۰۱۔ وَساسی اُسے پیشوتن کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کی زندگی بسر کرے گی۔ یہ ہے خلاصہ ان آراء کا جنھوں نے سامی افکار و خیالات پر اثر ڈالا۔

یسوع ناصری کے ظہور کے وقت فینیقی اور آشوری رخصت ہو چکے تھے اور دنیا پر یونان کے مقلد رومیوں کی حکومت تھی۔ البتہ مشرق میں مجوسی زردشتیت کے احیاء و عروج نے اُسے پھیلنے سے روک رکھا تھا۔ یہودی ہمیشہ کے لیے اپنی آزادی و خود مختاری کھو بیٹھے تھے۔ داؤد کے تخت پر ایک ذلیل خوشامدی متمکن تھا۔ سلیوقی یونانیوں، (The Seleucidae) سے ایک زیادہ بڑی قوت نے اس کی انتشار انگیزی کو مسخر کر رکھا تھا۔ جیسے جیسے یہودیوں پر تیرہ بختی کے بادل چھا گئے، ویسے ویسے ہر اس قوم کی طرح جسے اپنے ملک، اپنے مذہب اور اپنی شخصیت سے زبردست محبت ہوتی ہے وہ اس اُمید کو اپنے سینوں میں راسخ تر کرتے چلے گئے کہ گیدین (Gideon) یا میکابیس (Maccabeus) کی قسم کا کوئی مبعوث من اللہ مرد کامل ان کی عظمت رفتہ کو واپس لے آئے گا اور انھیں اس کی توفیق بخشے گا کہ وہ اپنے مختلف و متعدد ایذا رسانوں پر غالب آئیں[1] ایک مسیحا کے ظہور کا جو نقشہ اُن کے تمام وطن پرست اہلِ نظر اور شعراء نے شوخ رنگوں میں کھینچا تھا اس کا پس منظر ایک مبہم بالشان آرزو تھی، یعنی حکومتِ اسرائیل کا از سرِ نو قیام۔ مشرق میں مجوسی زردشتیوں اور کلدانیوں کے زیرِ اثر اور مغرب میں یونانی فلسفے کے دبستانوں کے زیرِ اثر، بعض بعض طبقوں میں (اور بالخصوص ان طبقوں میں جنھیں ہیرودس (Herod) کی یونانیت نوازی نے اسرائیل کے دامن سے علیحدہ کر دیا تھا)، ایک شخصی مسیحا پر اعتقاد مبہم اور غیر واضح سا تھا، یا عوام الناس کے خیالات کی محض ایک صدائے بازگشت تھا۔ لیکن جیسا کہ مل من (Milman)، نے نہایت عمدہ پیرائے میں کہا ہے، فلسطین کے یہودیوں نے اس زمانے کے لگ بھگ مختلف عناصر سے ظہورِ مسیحا کا، تمام اشیاء کی نشاۃ ثانیہ کا، مُردوں کے زندہ ہو جانے کا اور مسیحا کی بادشاہی کے ساری دنیا پر تسلط کا ایک شاندار اگرچہ قدرے دھندلا تصور وضع کر لیا تھا۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ یہ سارے واقعات بیک وقت یا فی الفور

---

[1] آخر کا یہ مفروضہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہودی اُن (باقی حاشیہ صفحہ ۳۲۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

یکے بعد دیگرے رونما ہوں گے[1]۔ مسیحا نسلِ داؤد سے ہوگا۔ وہ سارے قبیلوں کے منتشر افراد کو جمع کرے گا اور ان کے سارے قابلِ نفرت غیر ملکی دشمنوں کو تباہ کر دے گا۔ مسیحا کے زیرِ سایہ ایک حشرِ نو برپا ہوگا، لیکن اس میں صرف بنی اسرائیل کے نیک افراد دوبارہ اُٹھائے جائیں گے[2]۔ بے چین اُمنگوں اور مبہم آرزوؤں کے اس ہنگامے میں حیاتِ جاودانی اور سعادتِ آئندہ کی اُمیدیں ایک عجیب و غریب طریقے سے غلط ملط ہو گئیں۔ مایوسی کی انتہا اور خارجی امداد کی پُرجوش اُمیدیں عموماً لوگوں کے ذہنوں میں اسی قسم کی کیفیت پیدا کیا کرتی ہیں۔ ایک طبقہ ایک آسمانی بادشاہی کے خواب دیکھنے لگتا ہے جس میں خدائی اہتمام کے تحت امن و امان اور آئین و

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۹) قومی مقاصد کی تکمیل کی خاطر ایلیاہ یا کسی اور نبی کے ظہور کے لیے چشم براہ تھے، اس سے ہمیں یہ نتیجہ اخذ کر لینا چاہیے کہ وہ تناسخ کے قائل تھے۔

[1] Milman, *Hist. of Christianity*, vol. i. p. 76

[2] زردشتیوں کے یہاں ایک آزادی دلانے والے اور روئے زمین پر مذہب اور امن و امان کو نئے سرے سے مسلط کرنے والے کے بارے میں جو تصور ہے اور یہودیوں کے یہاں جو تصورِ مسیحائی ہے ان دونوں کی باہمی مشابہت حیرت انگیز ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہودیوں نے یہ تصور زردشتیوں سے مستعار لیا اور اپنے مصائب و آلام کے دوران اس پر گہرے رنگوں سے حاشیہ آرائی کی، لیکن میرا قوی قیاس ہے کہ ایرانیوں کے یہاں سوسیوش (Sociosch) کا جو خیال تھا، اس میں پیغمبری کا کوئی مفہوم مضمر ہو یا نہ ہو، وہ ان کے اندر اس زمانے میں پیدا ہوا جب ان کے کندھوں پر غلامی کا جوا تھا۔ اگرچہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ غلامی سامی النسل اسوریوں کی تھی یا یونانی مقدونیوں کی۔ وہ ملک جس میں سوشیوش کا ظہور ہونا تھا، دساسی (De-Sacy) کے خیال میں خراسان کا علاقہ کنگوبدیز Konguedez اور ڈولنگر (Dollinger) کے خیال میں کنسویہ (Consoya) تھا۔ یہ دونوں علاقے ایران کے مشرق میں واقع ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنے ادبار و نکبت کے زمانے میں ایرانیوں کی نظریں مشرق اور بالخصوص (The Lond of the Sun) پر جمی ہوئی تھیں، جہاں سے انھیں رستگیری و رستگاری کی اُمید تھی۔

قانون کا دوردورہ ہوگا اور اس کے طفیل اُسے بیباکانہ قوتوں کے پنجے سے رہائی نصیب ہوگی۔ دوسرے طبقے کے دل میں یہ اُمید ہوتی ہے کہ وہ غیر ملکیوں اور کافروں کے خون کی بھینٹ چڑھاکر ایک آسمانی بادشاہت حاصل کرے گا۔[1]

حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات کے بارے میں جو روایات ہیں ان پر تخریج و انتخاب کا عمل اس شدت سے ہوا ہے کہ یہ کہنا ناممکن ہے کہ ان میں سے کون کون سی ان کے اصلی الفاظ کو پیش کرتی ہیں اور کون کون سی نہیں کرتیں[2] لیکن وہ بصورت موجودہ جیسی کچھ بھی ہیں، اگر ہم انھیں قبول کرلیں اور اُن پر اُسی طرح کی ناقدانہ نگاہ ڈالیں جیسی

---

[1] اس کی مثال عیسائیوں کا وہ جدید لیکن غیر معروف فرقہ ہے، جو کرسٹاڈیلفین ، Chrisadelpians کہلاتا ہے۔

[2] مل مین Milman اقرار کرتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے افعال و اقوال کے بارے میں جو روایات عیسائی جماعتوں میں رائج تھیں وہ کہیں دوسری صدی کے نصف اوّل کے اختتام پر جاکر اپنی موجودہ صورت کے سانچے میں ڈھالی گئیں۔ (تاریخِ عیسائیت۔ جلد اوّل صفحہ ۱۲۶)

اس سے ظاہر ہے کہ عیسوی انجیلوں کے قدیم جامعین و مؤلفین نے ، یا مل مین کے الفاظ میں مبتدی اور سیدھے سادے مؤرخین نے ، روایات کے رد و قبول میں اپنی ذاتی رائے سے کام لیا ہوگا۔ اُن کے فیصلے یقیناً اٹکل پچّو اور من مانے ہوں گے۔

اگر انھوں نے کسی واقعے یا تحریر کو لب و لہجہ اور مضمون کے اعتبار سے اپنے خود ساختہ خیالات کے موافق پایا تو ناقص ناچیز شہادت کو بھی کافی و وافی سمجھا ، اور اگر نہ پایا تو مستند سے مستند شہادت کو بھی غلط فہمی پر مبنی کہہ کر رد کردیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے اقوال و افعال میں غیر شعوری طور پر ہی سہی ، بہت سے اضافے ہوگئے اور اس موضوع پر سلیس Seisus کی یہ شہادت کہ عیسائی اپنی روائتوں میں ایجاد و ایزاد اور تصریف و تحریف کے عادی تھے ، مبالغے کی پوری پوری گنجائش چھوڑ کر فیصلہ کن سمجھی جانی چاہیے اور یہ ان اصولوں پر مبنی ہے ، جو سر ولیم میور ، Sir Willim Muir نے اپنی کتاب سیرتِ محمدؐ (Life of Muhammad) Canon iii,p.L xxxi میں قائم کیے ہیں۔

دوسری مذہبی تحریروں پر ڈالی جاتی ہے (یعنی ان کے اصلی منشا کو نظرانداز نہ کریں، لیکن یہ بھی نہ کریں کہ اندھا دھند اعتقاد رکھنے والوں کی طرح اُن میں مخفی معانی ڈھونڈیں) تو ہم دیکھتے ہیں کہ روایتوں کے اس سارے دفتر میں ایک نئے نظامِ اشیاء (یعنی ایک آسمانی بادشاہت کے فوری صدور کا تخیل حضرت عیسیٰؑ کے ذہن پر اس حد تک مستولی ہے کہ وہ باقی تمام خیالات کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ ابنِ آدم کا ظہور ہو چکا ہے۔ خدا کی بادشاہت قریب آپہنچی ہے: یہ ہے ان تمام تحریروں میں ٹیپ کا بند[1]۔ یہ بادشاہت اس معاشرے اور راس حکومت کا نعم البدل تھی جو بنیٔ ناصری کو اپنے سامنے موجود دکھائی دیتی تھی اور جسے وہ بیحد ناقص اور خراب پاتا تھا۔ کبھی کبھی اس نئے معلّم کے الفاظ سے اس کے حواری یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ وہ صرف غریبوں اور بھوکے ننگوں کو شان و شوکت اور راحت و مسرت بخشنے کے لیے آیا ہے، یعنی جس خدائی سلطنت کی وہ اُمید دلاتا ہے اس کے زیرِ سایہ صرف یہی لوگ سعادت و برکت اور غلبہ و اقتدار کے مالک ہوں گے، کیونکہ وہ خوف انگیز الفاظ میں امیروں اور شکم سیروں کی بابت غم و اندوہ کی پیشگوئیاں کرتا تھا[2]۔ دوسرے مواقع پر خدا کی ولایت مسیحائے موعود کے ظہور کے بارے میں مکاشفوں کی لغوی تعبیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ خدا کی بادشاہت رُوحوں کی ایک اقلیم ہے اور آنے والی نجات محض اس مادّی زندگی کے بندھنوں سے رُوحانی آزادی) کا نام ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا تھا جب سارے تصوّرات حضرت عیسیٰؑ کے ذہن میں ایک ساتھ جمع تھے[3]۔ بہر حال حکمران طبقے کی تند خوئی اور تعصّب پرستی اور عقابِ رُومی کی صولت و قوّت کے پیشِ نظر کوئی معاشرتی تغیّر خیالِ محال تھا۔ جیسے جیسے حالات کے فوراً بہتر ہو جانے کی اُمیدیں نوٹ ہوتی گئیں، ویسے ویسے ایک روشن تر مستقبل کی اُمیدیں اور آرزوئیں دلوں پر قبضہ جماتی گئیں۔ حضرت عیسیٰؑ

---

[1] متی ۳-۲، ۱۷-۴، ۷ وغیرہ

[2] لوقا ۶: ۲۰ و تتمہ۔

[3] Renan, *vie de Jesus*, p .282

کا عقیدہ یہ تھا کہ موجودہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی اور انسان کی تخلیق نو کا وقت آپہنچا ہے[1]۔ جب وہ بنفسِ نفیس، لباسِ نورانی زیبِ تن کئے ہوئے، ایک تختِ شاہانہ پر بیٹھے، فرشتوں اور چیدہ چیدہ حواریوں کے حلقوں میں گھرے ہوئے آسمانوں کے بادلوں میں نمودار ہوں گے[2]۔

مُردے اُٹھ کر قبروں سے نکل آئیں گے[3] اور مسیحا کرسیٔ عدالت پر رونق افروز ہوگا۔ فرشتے ان کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہوں گے۔ وہ برگزیدہ لوگوں کو ایک نہایت عمدہ

---

[1] متی۔ بابِ ۱۶۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت عیسیٰ حشرِ اجساد اور حیاتِ اُخروی میں جزا اور سزا کے معتقد تھے۔ وہ "سعادت مند" لوگوں کا تذکرہ اکثر یوں کیا کرتے تھے کہ وہ اُن کے خوانِ نعمت پر بیٹھے خورد و نوش میں مصروف ہیں۔ اگرچہ ابتدائی روایات میں، جو ان کے چار بڑے حواریوں سے منسوب ہیں، حیاتِ بعد الممات کے نقشے کاٹ چھانٹ کی بدولت بہت مختصر ہیں، لیکن بعد کے راویوں نے جنت و جہنم کے ان ابتدائی خاکوں میں خوب خوب رنگ بھرے اور ریلے سے لے کر عجیب و غریب خیال آرائیاں کیں، جنھیں مکاشفوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو Rev. XXI 8-21, XXII 1, 1-2) جہاں تک ڈینگ ہانکنے کا تعلق ہے، عیسائی اہلِ روایت دوسرے مذاہب کے اہلِ روایت سے پیچھے نہیں رہے۔ ارینیوس (Irenaeus) نے ایک روایت میں حضرت یوحنا کی سند پر ذیل کے الفاظ حضرت عیسیٰ کی طرف منسوب کئے ہیں: "ایسے دن آئیں گے جب انگور کی بیلیں ہوں گی، جن میں سے ہر ایک کی دس ہزار شاخیں ہوں گی، اور ان شاخوں میں سے ہر شاخ کی دس ہزار مزید شاخیں ہوں گی اور ان شاخوں میں سے ہر ایک کے دس ہزار ٹہنیاں ہوں گے اور ان شاخچوں میں سے ہر ایک میں انگوروں کے دس ہزار خوشے ہوں گے اور ہر خوشے میں دس ہزار انگور ہوں گے اور ہر انگور میں سے دوسو چھتر گیلن شراب نکلے گی اور جب کوئی شخص ان مقدس خوشوں میں سے ایک خوشہ چننے گا تو ایک دوسرا خوشہ پکار اُٹھے گا "میں بہتر خوشہ ہوں مجھے چنو اور میرے اوپر خدا کی حمد و ثنا کرو"۔ وغیرہم۔

[2] متی۔ بابِ ۲۶۔ ۲۷۔ بابِ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ بابِ ۲۵۔ ۳۱ و تتبعہ۔

[3] یوحنا عارف کا مکاشفہ۔ بابِ ۲۰۔ ۱۲، ۱۳۔ ان عقائد کا مقابلہ زرتشتی عقائد سے کیجئے۔

مسکن ہیں، جو ابتدائے آفرینش سے تیار کر کے رکھا گیا ہے، بھیجے گا اور بدکاروں کو دائمی آگ میں جھونک دے گا، جو شیطان اور اس کے ساتھیوں کے لیے جلا رکھی گئی ہے[1]" اور جس میں جھونکے جانے والے گریہ وزاری کیا کریں گے اور اپنے اُوپر غصّے کے مارے دانت پلپیا کریں گے۔ برگزیدہ لوگ، جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی[2] ایک ایسے محل میں رکھے جائیں گے جو روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہُوا ہوگا۔ وہاں انھیں ضیافتیں دی جائیں گی، جن میں بنی اسرائیل کا جدِ امجد اور بزرگان و انبیا[3] اور خود حضرت عیسیٰؑ شریک ہوں گے[4]۔

اس نئی سلطنت کا قیام، جسے حضرتِ عیسیٰؑ کے ظہورِ ثانی اور نوعِ انسانی کی رستخیز کے ساتھ ہی ساتھ رونما ہونا تھا، زیادہ دُور نہ تھا۔ یہ امر حضرت عیسیٰؑ کے اس اعلان سے ظاہر ہے جو انھوں نے ایک مجمع کے سامنے کیا کہ خدا کی بادشاہت عنقریب قائم ہونے والی ہے، اور اس لیے موجودہ زندگی کی مصروفیتوں اور ضرورتوں کے لیے ساز و سامان مہیا کرنا بالکل بے کار ہے[5]۔

اُس وقت کے حالات نے جو عام کیفیتِ دماغی پیدا کر رکھی تھی اس کی سان پر چڑھ کر حضرت عیسیٰؑ کے یہ الفاظ تیز نشتروں کی طرح اُن کے حواریوں اور شاگردوں کے دلوں میں کھُب گئے تھے[6]۔ چنانچہ انھوں نے سلطنتِ مسیح کی بابت بشارتوں کی لفظ بہ لفظ تعبیر کا ایک ایسا واضح نقشۂ آمال تیار کر رکھا تھا جس کی اس سے بہتر نظیر عقائدِ انسانی کی تاریخ میں نایاب ہے۔

---

[1] متی ۲۵ - ۴۱

[2] لوقا - ۱۳ - ۲۳

[3] متی ۸ - ۱۱ - لوقا ۱۳ - ۲۸، ۲۲ - ۳۰

[4] متی ۲۶ - ۲۹

[5] متی - ۱۰ - ۲۳، مرقس ۱۳ - ۳۰ - لوقا ۱۲ - ۳۵، متی ۶ - ۲۵ - ۳۴ - ۶ - ۲۲

[6] اپنے ہم عصروں کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ نے جو تلخ الفاظ استعمال کئے وہ قابلِ ملاحظہ ہیں۔

"اگر اوّلین عیسائیوں کے دلوں میں کوئی عمیق اور مستقل عقیدہ تھا تو وہ یہ تھا کہ دنیا اپنے اختتام کے قریب پہنچ رہی تھی اور مسیح کا مکاشفہ بہت جلد واقع ہونے والا تھا۔"[1] جب عیسوی کلیسا کی باقاعدہ تنظیم ہو گئی تو اس وقت کہیں جا کر حضرت عیسیٰ کے پیروؤں نے اپنے افکار و خیالات کو یہودی دنیا کے محدود اُفق کے باہر پھیلایا اور ایک سلطنتِ مسیح کے خوابوں سے متّلی بالطبع ہو کر یونانی و رومی معاشرے میں جذب ہو گئے اور اپنے مذہب کی قلمرو کو لاتعداد وحشیوں اور بربروں پر مسلّط کیا، جو جنگلوں سے نئے نئے باہر آئے تھے اور جن کے لیے حضرت عیسیٰ اور اُن کی ماں دونوں ان کے اپنے دیوتا اوڈن (Odin) اور اس کی ماں فریا Freya کے مماثل دیوتا تھے، جن کی پرستش وہ اپنے قدیم مرز بوم میں کیا کرتے تھے۔

لیکن دفعتاً فوقتاً، جب کبھی عیسائی دنیا میں کوئی ہیجان پیدا ہوا ہے یا اسے کوئی بڑی آفت پیش آئی ہے، ناصرہ کے عظیم پیغمبر کے معجزانہ ظہورِ ثانی کی اُمیدوں نے اس میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ لیکن خدا کی ولایت کا تصوّر مرورِ زمانہ اور فکرِ انسانی کی ترقی کے زیرِ اثر یا تو ایک رُوحانی سانچے میں ڈھل گیا ہے یا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ اگر کہیں وہ کسی حد تک باقی بھی ہے تو اس نے اپنے عقیدت مندوں کے ماحول کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ یہودی، مجوسی، زردشتی، عیسائی سب کے سب جسمانی رستخیز کے معتقد تھے۔ ابتدائی موسویت (Mosaism) کے جو سیدھے سادے اور ناتراشیدہ خیالات تھے ان کی جگہ کلدانی زردشتیت (Chaldaeo-Zoroastrianism) سے اخذ کئے ہوئے زیادہ معیّن خیالات نے لے لی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ ایرانیوں کے یہاں قدیم کوہستانی طرزِ پرستش اور ابتدائی معلوم کی سیدھی سادی تعلیم کیونکر جادوگرانِ بابل کے کرشموں کی بدولت جزا و سزا کے ایک پیچیدہ نظام میں تبدیل ہو گئی، اور کلدانی فلسفہ کیونکر مجوسی زردشتیت کے بطون میں سرایت کر گیا۔ ابتدائی عیسائیت نے جو مسیح کی مادّی بادشاہی کے فوری قیام پر مبنی تھی، کلدانی مجوسی زردشتی اور

---

[1] Renan, *vie de Jesus*, p. 287

Compare also Milman's *History of Christianity*, vol. i. p. 378

اسکندریائی منبعوں سے، جنھوں نے پرانے خیالات کو یکسر بدل ڈالا تھا، خیالات اخذ کئے۔ یہودی، عیسائی، زردشتی سب کے دلوں میں یہی توقع تھی کہ آئندہ زندگی میں اُنھیں مادّی جزائیں اور سزائیں دی جائیں گی۔

عیسائیوں کے یہاں کلیسائیت کا پھیلایا ہوا یہ خیال کسی زمانے میں عام تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے نزدیک عورتیں رُوح سے معرّا ہوتی ہیں، لیکن اب یہ خیال غالباً رفع دفع ہو چکا ہے۔ یہ ایک بہتان تھا جو اسلام سے نفرت پیدا کرنے کی خاطر باندھا گیا تھا۔ پھر بھی یہ خیال ابھی تک قائم ہے کہ رسُولِ عربی نے اپنے پیروؤں سے حسّی لذّات کی ایک جنّت اور عیش و عشرت کے مختلف مدارج کا وعدہ کیا۔ یہ خیال بھی پہلے خیال کی طرح جہالت اور تعصّب کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ درمیانی دور کی سُورتوں میں، جب کہ معلّمِ اسلام نے ابھی شعورِ دینی کا درجۂ کمال حاصل نہ کیا تھا اور جب کہ اس بات کی ضرورت تھی کہ عقبیٰ اور جزا و سزا کے تصوّرات کو ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے جو سیدھے سادے بادیہ نشینوں کی سمجھ میں آسکیں، جنّت و جہنّم کے واقعیت نما نقشے، جو زردشتیوں، صابیوں اور تلمودی یہودیوں کی بادر ہوائیاں آرائیوں پر مبنی تھے، پڑھنے والے کی توجہ کو ضمنی حاشیہ آرائیوں کے طور پر اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن ان کے فوراً بعد قرآن کا جوہرِ خالص آتا ہے۔ یعنی کمالِ عجز و محبّت سے خدا کی عبادت۔ حُوریں زردشتی نژاد ہیں۔ اس طرح جنّت[1] بھی زردشتی الاصل ہے۔ البتّہ جہنّم عذابِ الیم کے مقام کی حیثیت سے ایک تلمودی تخلیق ہے۔ ان کے جو منظر کھینچے گئے ہیں وہ مبنی بر واقعیت ہیں، بلکہ بعض بعض جگہ مبنی بر حسّیت بھی ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ ان میں حس پرستی ہے یا یہ کہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے متبعین میں سے ظاہر پسند سے ظاہر پسند نے بھی کبھی انھیں حس پرستی کے مظاہر سمجھ کر قبول کیا ایک افترا ہے۔ وہ "شراب" جو بدمست نہیں کرتی" اور وہ حُوریں جو "قریب نہیں آتیں" لذّاتِ حسّی کی علامتیں کیونکر ہو سکتی ہیں[2]؟

اسلام میں آئندہ زندگی کا جو نمایاں ترین تصوّر ہے وہ اس عقیدے پر مبنی ہے کہ عقبیٰ میں

---

[1] فارسی میں "فردوس" Paradise

ہر انسان کو ان اعمال کا حساب دینا ہو گا جو اس نے اپنی ارضی زندگی میں کیے اور اسے جو خوشی یا رنج نصیب ہو گا وہ اس پر منحصر ہو گا کہ اس نے اپنے خالق کے احکام کی بجا آوری کہاں تک کی۔ بہر کیف خدا کی رحمت و شفقت بے پایاں ہے اور اس کے ہر بندے کے شاملِ حال ہو گی، یہ ہے وہ محور جس پر اسلام کا نظریۂ معاد گردش کرتا ہے اور یہی ایک عقیدہ ہے جس کا تقاضا اس سلسلے میں ہر مسلمان سے کیا جاتا ہے۔ باقی جتنی باتیں ہیں وہ ضمنی ہیں اور مختلف قوموں اور قبیلوں کی عام روایتوں سے مستعار لے کر اس عقیدے کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں۔ آئندہ کی جزا و سزا اور حیاتِ بعد الممات سے متعلق تمام خیالات میں جو داخلی عنصر ہوتا ہے اسے نظر انداز کر کے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ خیالات وہ قوی ترین آلہ ہیں جسے دنیا کے تمام معلّمینِ اخلاق نے افراد و اقوام کی سیرت و کردار کو متاثر کرنے کی خاطر استعمال کیا، لیکن، اگرچہ ہر مذہب میں مواخذۂ عقبیٰ کا اصول کسی نہ کسی حد تک ضرور پایا جاتا ہے۔ پھر بھی اسلام کے سوا تمام مذاہب اس امر کا ادراک کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ اس اصول کو عوام النّاس کے تزکیۂ اخلاق کے ایک مستقل وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایسی نیکی جو مقصود بالذّات ہو، یعنی محض نیکی کرنے کی خاطر کی جائے، ایک ایسی چیز ہے جو صرف اعلیٰ طبائع کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ عام طبائع کے لیے اور خصوصاً ایسے لوگوں کے لیے جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں، جزاؤں اور سزاؤں کا ایک مکمل ضابطہ یعنی تکلیفِ شرعی، لازمی ہے۔

آئیے اب ہم ان جزاؤں اور سزاؤں کی ماہیت پر غور کریں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ انسانوں کی عام اکثریت کے ذہنوں تک رُوحانی مسرّت یا رُوحانی اذیت کا خیال اس وقت تک منتقل نہیں کیا جا سکتا جب تک مسرّت و اذیت کو جیتی جاگتی شخصیتوں کی طرف منسوب اور اشیائے محسوس کی صورت میں متشکل نہ کیا جائے۔ فلسفہ صدیوں سے ایسے مجرّد الفاظ و تراکیب پر مباحثوں میں اُلجھا ہُوا ہے جنھیں محسوسات کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ اس قسم کے مجرّد الفاظ وقتاً فوقتاً رائج ہوئے ہیں اور مختلف مدّتوں تک رائج رہ کر متروک ہو گئے ہیں۔ فلسفیانہ خیال آرائیوں کی مبہم دنیا میں رہنے والے چند لوگوں کے حلقے سے باہر اُن کا کوئی اثر محسوس نہیں کیا گیا اور ان کے غائب ہو جانے کے بعد ان کا کوئی نشان

باقی نہیں رہا۔

حضرتِ محمدؐ کا رُوئے سخن صرف چند عالی دماغ مفکّرین کی طرف نہ تھا جو اس زمانے میں اتفاقاً موجود تھے، بلکہ اردگرد کی وسیع دنیا کی طرف، جو ہر طرح کے مادّی مسائل و مشاغل میں منہمک تھی۔ انھیں اس کی ضرورت پیش آئی کہ ایسا اسلوبِ بیان اختیار کریں جو عام فہم ہو، بھُوکے ننگے کُندۂ ناتراش عرب بدوی کے لیے پاک و صاف پانی یا دودھ یا شہد کی نہروں سے بڑھ کر کون سی چیز دل لُبھانے والی یا اُس کے تصورِ جنّت سے مطابقت رکھنے والی ہو سکتی تھی؟ پھلوں سے لدے ہوئے درختوں، ہرے بھرے سبزہ زاروں اور زرخیز زمینوں سے بڑھ کر اُسے کون سی چیز پسند آ سکتی تھی؟ ان حسّی لذّتوں کے بغیر راحت و مسرّت کا کوئی تصوّر مطلقاً اس کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا۔ مسلم اہل الرّائے کا ایک طبقہ، جس کے سرخیل سنائی اور غزالی ہیں۔ ان حسّی علامتوں کا یہ جواز پیش کرتا ہے کہ مادّی عیش و مسرّت کو ایک قابلِ ادراک صورت میں مجسّم کرنے کے لیے درختوں، نہروں اور پریزادوں سے بھرے ہوئے شاندار محلّوں کے جو نقشے کھینچے گئے ہیں اُن کے پردے میں عمیق تر معانی ہیں اور سب سے بڑی راحت جو جنّتیوں کو نصیب ہوگی وہ دیدارِ الٰہی کی سعادت ہوگی جب وہ پردہ انسان اور اس کے خالق کے درمیان حائل ہے چاک ہو جائے گا اور رُوح حواسِ خمسہ کی حدود سے باہر نکل کر جلوۂ باری کو اپنے رُوبرو پائے گی۔ اس استدلال کی تائید نصوصِ قرآنی سے بھی ہوتی ہے، اور ارشاداتِ نبویؐ سے بھی۔ نبی صلعم نے فرمایا کہ خدا کا سب سے مقبول بندہ وہ ہوگا جو صبح و شام خدا کا چہرہ (یعنی اس کا جلوہ) دیکھے گا۔ یہ ایک ایسی راحت ہوگی جو تمام لذّاتِ جسمانی سے اُسی طرح بڑی ہوگی جس طرح سمندر پسینے کی ایک بوند سے بڑا ہے۔"

ایک دن حضرت ابوہریرہؓ صحابی سے گفتگو کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "... خدا نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں تیار کر رکھی ہیں جیسی نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سُنیں، نہ دلوں نے محسوس کیں۔" یہ فرما کر آپؐ نے ذیل کی آیتِ قرآنی پڑھی:

"اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے لیے آنکھوں کی کیسی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔"[1] (السّجدہ ۔ ۱۷)

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب ۲۳، باب ۸، فصل ۱۔

ایک اور روایت[1] کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے ارشاد کیا کہ نیک لوگوں کو دیدارِ حق نصیب ہوگا اور اس کی تائید میں ذیل کی آیتِ قرآنی کا حوالہ دیا:

"اللہ تمہیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے ......جن لوگوں نے نیکی کا طریقہ اختیار کیا اُن کے لیے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی"

(یونس۔ ۲۵ - ۲۶)

جہاں تک الفاظِ قرآنی کے تمثیلی ہونے کا تعلق ہے، اس مسلکِ خیال کے دعوے کی بنیاد قرآن کی یہ عبارت ہے:۔ "وہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے، جس میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں، اور دوسری متشابہات"

(آلِ عمران - ۷)

ایک اور گروہ عقبیٰ کی خوشیوں اور رنجوں کو کاملاً داخلی سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جیسے انتہائی ذہنی تکلیف جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ عذاب دہ ہوتی ہے اسی طرح اعلیٰ ترین قسم کی ذہنی مسرت ہر قسم کی حسی لذت سے زیادہ راحت بخش ہوتی ہے، چونکہ جسمانی موت کے بعد انفرادی روح قرآن کے الفاظ میں روحِ کل کی طرف عود کر جاتی ہے، اس لیے معلم اسلام نے عوام الناس کو حقیقتِ حال سمجھانے کی خاطر جن خوشیوں اور غموں کے نقشے شوخ رنگوں میں پیش کیے ہیں وہ سب خوشیاں اور رنج ذہنی و داخلی ہوں گے۔ اس گروہ میں اسلامی دنیا کے چند سب سے بڑے حکماء و صوفیاء داخل ہیں۔

لیکن ایک اور جماعت، جو غالباً اس گروہ سے بڑی ہے، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ قرآن نے جنت و جہنم کے جو کوائف بیان کیے ہیں وہ مجازاً ہو بہو پیش آئیں گے۔

ہم ان مختلف مذاہبِ خیال کا محاکمہ کیے بغیر اسی پر اکتفا کریں گے کہ عقبیٰ کی جزا و سزا

---

[1] روایت از شعیب

[2] ملاحظہ کیجیے زمخشری (کشاف) مصری ایڈیشن حصہ اول، صفحہ ۴۴۴، زمخشری مختلف اکابر دینیات اور مکاتبِ دینیات کے سیر حاصل حوالے دیتا ہے اور مشبہ اور جبریہ کے عقائد کا خاص طور پر تذکرہ کرتا ہے۔

کے بارے میں ہمارا جو ذاتی عقیدہ ہے اُسے بیان کر دیں۔

قرآن کے غائر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ شعورِ مذہبی کے جن مختلف ارتقائی مدارج سے گذرے حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی وہی مدارج پیش آئے حضرت محمدؐ اور حضرت عیسیٰؑ دنیا۔کے دو ایسے معلّمین ہیں جو ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتے ہیں لہٰذا ہم ان کا مطالعہ ایک ساتھ کریں گے۔حضرت عیسیٰؑ کے مذہبی ارتقاء کے دوران اُن کے اندازِ فکر میں جو عظیم تغیر ہُوا وہ نہ صرف آسمانی بادشاہت کے اس مثالی تصور سے ظاہر ہے جو انھوں نے اپنی ارضی زندگی کے آخر میں پیش کیا بلکہ غیر اسرائیلیوں کی بابت ان کے لہجے میں جو تبدیلی ہوئی اس سے بھی اس تغیّر کا پتہ چلتا ہے۔ابتداءً اُن کی تبلیغ صرف اسرائیلیوں تک محدود تھی[1] لیکن جب اُن کے مذہبی شعور نے نشو و نما پائی تو اُن کی ہمدردیوں میں وسعت پیدا ہو گئی[2]۔

یہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مذہبی ارتقاء کا حال ہے۔قرآن کے جن سورتوں میں جنت کے مرصّع نقشے کھینچے گئے ہیں عام ہے کہ وہ نقشے مجازی تھے یا معنوی وہ سب سُورتیں کُلّی یا جزئی طور پر مکّے میں نازل ہوئے۔اس موضوع پر جو روایتیں اس زمانے میں عام تھیں۔ممکن ہے کہ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے شعورِ مذہبی کے اوائل میں اُن میں سے چند ایک کو مانتے تھے لیکن جب اُن کی روح میں کامل بیداری آ گئی اور خالقِ کائنات کے ساتھ اُن کا رابطہ زیادہ گہرا ہو گیا تو اُن کے وہ خیالات جو پہلے مادّیت کا پہلو لیے ہوئے تھے سراسر رُوحانی ہو گئے۔اُن کی ذہنی نشو و نما نہ صرف مرورِ زمانہ اور ان کے شعورِ مذہبی کے ارتقاء کے دوش بدوش بلکہ اُن کے متبعین نے رُوحانی تصورات کے سمجھنے میں جو ترقی کی اس کے قدم بقدم بھی ہوئی۔چنانچہ بعد کے سُورتوں میں رُوحانی پہلو مادّی پر

---

[1] متی باب ۱۰ - ۵ ؛ متی باب ۱۵ - ۲۲ - ۲۶

[2] متی باب ۸ - ۱۹ وغیرہ۔مطالعہ کیجیے ؛
Strauss, *New Life of Jesus* (1865), vol. I, P.296, et seq

اور رُوح جسم پر غالب نظر آتی ہے۔ سرسبز و شاداب باغ جنھیں نہریں سیراب کرتی ہیں، دائمی چھاؤں[۱]، آسودہ حالی اور امن و امان، یہ سب چیزیں جو ایک بے آب و گیاہ اور بے سایہ ریگستان کے سدا جُھو کے پیاسے رہنے والوں کے لیے جن کی زندگی اپنے ساتھ اور اپنے ماحول کے ساتھ ایک مسلسل جنگ تھی، غیر مترقبہ نعمتیں تھیں، اب بھی مرقّع کے بنیادی نقش و نگار ہیں لیکن اہلِ جنّت کو جو خوشی نصیب ہوگی وہ خدا کی بارگاہ میں سکون و اطمینان اور باہمی اُلفت و مودّت کی صورت میں دکھائی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

"لیکن وہ لوگ جو متقی ہیں باغوں میں رہیں گے جہاں چشمے بہتے ہونگے۔
اُن سے کہا جائے گا ' ان میں سلامتی کے ساتھ اور بے خوف وخطر داخل ہوجاؤ '۔ اُن کے سینوں میں جو کدُورتیں ہوں گی وہ سب نکال دی جائیں گی اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر ایک دوسرے کے رُوبرو تختوں پر بیٹھیں گے۔
نہ اُنھیں وہاں کسی قسم کی کلفت ہوگی ، نہ کوئی اُنھیں وہاں سے نکالے گا"
(الحجر ۴۵ تا ۴۸)

ذیل کی عبارت ، جو حیاتِ دنیا اور حیاتِ عقبیٰ کے بارے میں رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آخری پیغام سے مقتبس ہے اور جو اُن کے عقیدے کا بہترین خلاصہ ہے، اس موضوع پر تخیّل اور محاکات میں اس سے بہتر کون سی عبارت ہو سکتی ہے۔؟

"وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق کے آسرے سے خوش خوش سفر کرتے ہو یکایک بادِ مخالف کے جھونکے اُٹھتے ہیں اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگنے لگتے ہیں۔ مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ وہ طوفان میں گھر گئے۔ اُس وقت سب اپنی بندگی کو صرف اللہ کے لیے مخصوص کر کے اُس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ 'اگر تو ہمیں اس آفت سے بچا لے تو ہم تیرے شکر گذار رہوں گے۔ لیکن جب اللہ اُن کو بچا

---

[۱] قرآن - النفال - ۴۴ - سورہ محمّد - ۱۶ - ۱۷ - سورہ توبہ ، سورہ یونس اور سورہ ابراہیمؑ سے بھی مقابلہ کیجئے۔

یقینا ہے تو اسی وقت وہ لوگ رُوئے زمین پر شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمھاری شرارتیں تمھی پر پڑتی ہیں۔ یہ دنیا کے چند روزہ مزے ہیں، لُوٹ لو۔ آخر کار تمھیں ہماری طرف لَوٹ کر آنا ہے۔ اس وقت ہم تمھیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی تو وہی مثال ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی۔ پھر عین اس وقت جب زمین بناؤ سنگار کر کے اپنی پوری بہار پر تھی اور اس کے مالک اپنے زعم میں یہ خیال کر رہے تھے کہ وہ اس پر قادر ہیں یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے سب کچھ یوں کاٹ کر ڈھیر کر دیا جیسے کل وہاں کوئی بستی یا کھیتی نہ تھی۔ یوں ہم کھلی نشانیاں دکھاتے ہیں اُن لوگوں کو جو سوچ سمجھ رکھتے ہیں۔ اللہ تمھیں دارالسلام کی طرف دعوت دے رہا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔[1] جو لوگ نیکی کرتے ہیں اُن کے لیے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔ اُن کے چہروں پر سیاہی اور رُسوائی نہ چھائے گی۔ یہ لوگ جنتی ہیں اور ہمیشہ جنّت میں رہیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے بُرائیاں کمائیں وہ اپنی بُرائیوں کے برابر بدلہ پائیں گے۔[2] انھیں رُسوائی نصیب ہو گی، کیونکہ انھیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔ اُن کے چہروں پر ایسی سیاہی چھائی ہو گی کہ جیسے ہم نے تاریکی کا ایک ٹکڑا اسے کر اُن کے منہ پر ڈال دیا ہو۔"

(یونس - ۲۱ تا ۲۷)

ذیل کی عبارت سے زیادہ ولولۂ ذوق وشوق کس عبارت میں پایا جا سکتا ہے؟

"وہ لوگ جو اللہ کا اقرار پورا کرتے ہیں، اُس سے کئے ہوئے پیمان کو نہیں توڑتے، اُس کے مقرر کیے ہوئے رابطوں کو قائم رکھتے ہیں، وہ لوگ جو

---

[1] بیضاوی یہدی من یشاء کا مطلب لیتا ہے۔ "وہ لوگ جو تائب ہوتے ہیں" نیز ملاحظہ کیجیے زمخشری کی کشاف"

[2] ملاحظہ طلب بات یہ ہے کہ نیکی کا اجر عمل کی مقدار تک محدود نہ ہو گا بلکہ اس سے زیادہ ہو گا۔ اس کے برخلاف بدی کا بدلہ صرف اُتنا ہی ملے گا جتنی بدی کی مقدار ہو گی۔

اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے، وہ لوگ جو اپنے ربّ کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کھلے طور پر اور چھپے طور پر بھی خرچ کرتے ہیں، بُرائی کا مقابلہ بھلائی سے کرتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے لیے عاقبت کا گھر ہے، یعنی ایسے باغ جو اُن کی ابدی قیام گاہ ہوں گے۔ وہ خود بھی اُن میں داخل ہوں گے اور اُن کے آباؤاجداد اور اُن کے بیوی بچوں میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی اُن کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ فرشتے ہر دروازے سے اُن کے استقبال کو آئیں گے یہ کہتے ہوئے کہ "سلامتی ہو تم پر، تم نے دنیا میں جو صبر کیا یہ عقبیٰ کا گھر اُسی کا صلہ ہے[1]۔" (الرّعد۔ ۲۰ - ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴)

ہم نے جو کچھ اُوپر بیان کیا وہ اس نظریئے کے ابطال کے لیے کافی ہے کہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے حیاتِ معاد کے جو نقشے پیش کئے وہ سراپا حسّی ہیں۔ ہم اس باب کو قرآن کی اسی عبارت پر ختم کرتے ہیں جس سے اس کا آغاز کیا گیا۔ اس عبارت سے اسلام کی عمیق رُوحانیت اور اُن اُمیدوں اور اُمنگوں کی پاکیزگی جن پر اُس نے اپنے اُسوۂ حیات کی بنا درکھی، ظاہر ہے:

"اے نفسِ مطمئنّہ، اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل: تو اس سے اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے بندوں میں شامل اور میری جنّت میں داخل ہو جا۔"

---

[1] اس ساری عبارت کا مقابلہ زمخشری کی "کشّاف" سے کیجئے۔

چوتھا باب

اِسلام کا تبلیغی جہاد

لااکراہَ فی الدینؒ ـــ ان الذین آمنو والذین ھادوا والصّابوٗن والنصاریٰ من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔

"یقین جانو کہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابی ہو یا عیسائی، جو لوگ بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف کا مقام ہے نہ غم کا۔[۲]
(المائدہ - ۶۹)

جس غیر معمولی سُرعت سے رسُولِ عربیؐ کا دین رُوئے زمین پر پھیلا وہ مذاہب کی تاریخ کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔ عیسائیت صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں اپنا سر چھپاتی رہی۔ جب تک اُس نے غیر اہلِ کتاب کے مذہب کو اپنے اندر جذب نہ کر لیا، جب تک ایک غیر اہلِ کتاب حکمران نے فرمانوں اور منشوروں کے ذریعے اُس کی مدد نہ کی، اُس وقت تک وہ مذاہبِ عالم کی محفل میں سر اُٹھانے کے قابل نہ ہوئی۔ اسلام اپنے معلمؐ کی وفات کے

---

[۱] البقرۃ ع۲۔ ۲۵۶۔

[۲] اس کے مقابلے میں عیسائیت کا اتھینشن ضابطۂ عقائد The Athanasian Creed منکروں کو بجلی کے کڑکوں کے ساتھ عذابِ آخرت کا خوف دلاتا ہے۔

تیس سال کے اندر اندر لاکھوں انسانوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ ایک صدی بھی نہ گذری تھی کہ مغنکفِ حرا کی آواز تین برّاعظم پار کر کے فضائے عالم میں گونج گئی۔ قیصر و کسریٰ کی فوجیں جنھوں نے عرب سے آشکار ہونے والی اس نئی جمہوریت کے ریلے کو روکنے کی کوشش کی، بادیہ نشینوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئیں۔ اسلام کی شاندار کامیابی اور لوگوں کے دلوں پر اس کی حیرت انگیز حکومت نے اُسے اس الزام کا مورد بنایا ہے کہ وہ تلوار کا مذہب ہے جو تلوار کے ذریعے پھیلایا گیا اور تلوار ہی کے بل بوتے پر قائم رکھا گیا۔ لہٰذا ہم اس امر کی تحقیق کرنے کی خاطر کہ آیا یہ الزام حق بجانب ہے اسلام کے ظہور سے متعلق حالات و واقعات کا بامعانِ نظر جائزہ لیتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ کے ورودِ مدینہ کے وقت اوس و خزرج کے قبیلوں کی برسوں پرانی تباہ کُن جنگ ابھی ابھی ایک کھوکھلی صُلح کی شکل میں تھمی تھی۔ قوی امکان تھا کہ وہ کسی لمحے آگے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نئے سرے سے شروع ہو جائے گی۔ یہودیوں نے حملۂ جبلہ (Jabala) کے بعد اعرابِ مدینہ کی باجگزاری (Clientage) کو قبول کر لی تھی، لیکن بسرعتِ تمام نئے سرے سے زور پکڑ رہے تھے اور کھلم کھلا اپنے مشرک ہم وطنوں کو مسیحائے موعود کے غضب کی دھمکیاں دے رہے تھے جس کے ظہور کی انھیں ہر لمحہ توقع تھی۔ آس پاس کے قبیلے جن پر قریش کا اثر و نفوذ غالب تھا، اپنی پوری بدویانہ جنگجوئی کے ساتھ مدینے پر پل پڑنے کے لیے تُلے کھڑے تھے۔ حضرت محمدؐ کے مدینے میں داخل ہوتے ہی وہ خطرات جو نئے دین کو درپیش تھے ظاہر ہو گئے۔ مکّے کے صحابہ جنھوں نے اپنے آقا کی خاطر اور اس نُور کی خاطر جس سے اس نے اُن کے سینوں کو روشن کر دیا تھا پہلے موت کا مقابلہ کیا تھا اور اب غریب الوطنی میں ناداری و تنگدستی کا سامنا کر رہے تھے گنتی کے چند لوگ تھے جن میں مقاومت کی زیادہ تاب نہ تھی۔ مدینے میں بھی آنحضرتؐ کے پیرو زیادہ تعداد میں نہ تھے اور جتنے تھے وہ بھی قبائلی خصومتوں کے باعث مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کا ایک اہم گروہ جس کا سرخیل ایک بارسوخ سردار تھا جس کی نگاہیں مدینے کے تخت پر جمی ہوئی تھیں، کفّار کی حمایت میں خفیہ طور پر کارروائیاں کر رہا تھا۔ یہودی، جو متحد اور منضبط

تھے، زہر اور دغا کے اچھے ہتھیار لیے آنحضرتؐ کی ہلاکت کے درپے تھے اور ہر ممکن طریقے سے آپؐ کی مخالفت کر رہے تھے۔ لیکن وہ دل جو قریش کی قاتلانہ دھمکیوں سے نہ ڈرا ایسی حالت میں کیونکر ڈر سکتا تھا جب بہت سے دوسرے لوگوں کی زندگی اس کی زندگی سے وابستہ تھی؟ آپؐ نے فوراً ان متفرق لوگوں کو جو آپؐ کے رایتِ تبلیغ کے سائے میں جمع ہوئے تھے ایک منظم جماعت میں متشکل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ قبائل کے قدیم طریقۂ قصاص کی جگہ آپؐ نے ان کے باہمی مناقشوں کو طے کرنے کی خاطر ثالث معین کیے۔ اوس و خزرج کا باہمی اختلاف مٹا دیا، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی چھوٹی سی دولتِ متحدہ میں شامل کیا اور سب مسلمانوں میں دوستی و برادری کے تعلقات قائم کیے۔ آپؐ نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی چاہے وہ یہودی ہو یا صابی یا عیسائی، خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے کسی قسم کے خوف کا مقام نہیں۔ ایک ایسی قوم کو جو بدترین قسم کے کفر و شرک میں مبتلا تھی اور جس کے لیے خونریزی فطرتِ ثانیہ تھی آپؐ نے پاکبازی، راستی، ضبطِ نفس، عطا و احسان اور ہمدردیٔ ابنائے جنس کا سبق سکھایا۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ "اگر کوئی شخص اپنے حقِ قصاص سے دست بردار ہو جائے گا تو یہ خدا کے نزدیک کفارہ شمار ہوگا۔" "جو شخص بھلائی کی سفارش کرے گا اُسے بھلا اجر ملے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اُس بُرائی میں سے حصہ پائے گا۔" (النساء ۴، ۸۵)

اِدھر آپؐ اپنی قوم میں انسانیت پیدا کرنے، اُسے قعرِ مذلت سے نکالنے، اور خبائث سے پاک کرنے کے مقدس کام میں مصروف تھے، اُدھر آپؐ کے بے رحم دشمن انتقام کے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ انھوں نے آپؐ کو ہلاک اور آپؐ کے دین کو تباہ کرنے کا حلف اُٹھا رکھا تھا۔ قریش آپؐ کو اور آپؐ کے متبعین کو اپنے آبائی مذہب سے مُرتد شمار کرتے تھے اور انھیں یہ امر بے حد کھٹکتا تھا کہ اُن مرتدوں نے مکّے کے حریف شہر میں پناہ لے رکھی تھی تاکہ وہاں رہ کر اپنے انقلابی مذہب کی داغ بیل ڈالیں۔ ان کے نزدیک متحدہ عرب کا یہ فرض تھا کہ ان سرپھرے جوشیلوں کو نیست و نابود کر دیں جنھوں نے گھر بار اور مال و دولت کو اس مقصد سے خیرباد کہی تھی کہ ایک ایسے اَن دیکھے خدا کا پیغام دنیا کو

پہنچائیں جو اپنی عبادت کے معاملے میں اتنا سخت گیر تھا اور جو محبت، صلۂ رحم، احسان، پاک اندیشی اور نیکوکاری کے عام فرائض پر اتنا اصرار کرتا تھا۔ جس لمحہ حضرت محمدؐ نے مدینے میں قدم رکھا، اُسی لمحہ آپؐ کی قوم کی تقدیر خصوصاً اُن لوگوں کی تقدیر جنھوں نے آپؐ کو مدینہ آنے کی دعوت دی تھی اور آپؐ کا استقبال کیا تھا آپؐ کی کامیابی و ناکامی، آپؐ کی زندگی و موت کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ آپؐ کی ہلاکت کے معنی تھے ان تمام لوگوں کی ہلاکت جو آپؐ کے پرچم کے نیچے جمع ہوئے تھے۔ اُن لوگوں کے اردگرد دشمن اور غدار گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ سارا عرب قریش کے کوسِ جنگ کے لیے گوش برآواز تھا، کیونکہ وہ قوم کے خداؤں کے قدیم خادم تھے اور ان خداؤں کے منکروں کو مٹانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ ایسے میں اگر وہ اپنے تحفظ کے لیے تلوار ہاتھ میں نہ لیتے تو اُن کی تباہی ناگزیر تھی۔ پھر بھی جب تک ان کے دشمن پیش قدمی کرکے ان پر حملہ آور نہ ہوئے اس وقت تک یہ اعلان نہ ہُوا کہ "کفّار مومنوں کے معاملے میں نہ خون کے رشتے کا، نہ عہد و پیمان کا خیال رکھتے ہیں۔ جب وہ صلح کے عہدوں کو توڑیں اور تم پر حملہ آور ہوں تو اپنی حفاظت کرو۔"

"تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں لیکن زیادتی نہ کرو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(البقرہ - ۲ - ۱۹۰)

مسلمانوں کے لیے مدافعانہ کارروائی اپنے تحفّظ کا معاملہ بن گئی تھی۔ ان کے لیے دو ہی صورتیں تھیں، یا تو یہ کہ دشمنوں کے آگے اپنا سر رکھ دیں یا یہ کہ جب دشمن اُن پر حملہ آور ہوں تو ان کا مقابلہ کریں۔ انھوں نے مؤخر الذکر طریقہ اختیار کیا اور ایک طویل کش مکش کے بعد دشمنوں پر غلبہ پانے میں کامیاب ہوگئے۔

یہودیوں کی جانی دشمنی، ان کی مکرّر بدعہدیاں اور حلف شکنیاں، اُن کی مسلسل غداریاں اور ان کی متواتر کوششیں کہ مسلمانوں کو دغا بازی سے کفّار کے حوالے کر دیں، ان سب حرکتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ انھیں سخت سزائیں دینی پڑیں۔ یہ سزائیں برسبیلِ انتقام نہ تھیں، بلکہ مسلمانوں کی قلیل اور کمزور جماعت کے تحفظ کے لیے انسدادی تنبیہیں تھیں۔

ہمیں یہ فرض کر لینے کا کوئی حق نہیں کہ چونکہ دنیا میں جو رہبر عہد بہ عہد آئے ان میں سے چند ایک نے مخالف حالات سے مادّی طور پر شکست کھا کر جامِ شہادت نوش کیا، چونکہ چند ایک نے ناممکن الحصول مثالی دنیاؤں کے نقشے تیار کئے، چونکہ دُور و دراز خواب دیکھنے والے دنیا میں رہ چکے ہیں، چونکہ چند جوش و ولولہ رکھنے والوں نے تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اس لیے حضرت محمّد کا یہ فرض تھا کہ ان لوگوں کی مثال کی تقلید کرتے اور اپنا تبلیغی کام انجام دینے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے۔ آپؐ پر یہ کسی طرح لازم نہ تھا کہ اپنے آپؐ کو اور اس ساری جماعت کو جس کی سرداری اُنھوں نے قبول کی تھی ایک ایسی چیز کی بھینٹ چڑھا دیتے جسے ہم آج کل کے زمانے میں ایک "آیڈیا" (IDEA) ایک اندازِ فکر کہیں گے۔

آئیے ہم مسلمانوں کے ان مدافعانہ غزووں کا جو اُنھوں نے اپنے تحفّظ کے لیے لڑے اُن خونیں جنگوں سے مقابلہ کریں جو یہودیوں اور عیسائیوں نے، بلکہ اور تو اور نرم مزاج پارسیوں نے بھی، اپنے اپنے مذاہب کی اشاعت کی خاطر کیں۔ یہودیوں کے معاملے میں تو زیادتی، پیش دستی اور ہلاکت مذہبی فریضے تھے۔ اگر وہ اپنے مخالف کی جان بخشی کرتے تو ملعون قرار دیے جاتے۔

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے، عاجزی و فروتنی کا وہ نظریہ جس کی تعلیم نبیٔ ناصری نے دی تھی حکومت و اقتدار کے ملتے ہی فراموش کر دیا گیا۔ جس وقت عیسائیت کو ایک مانی ہوئی قوّت کی حیثیت حاصل ہوئی، یعنی وہ ایک جماعت کی اکثریت کا مذہب بنی، اُسی وقت اس میں جارحیت اور جبر و تشدّد پیدا ہو گیا۔ مختلف مصنّفین نے حضرت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمّدؐ کا موازنہ کیا ہے۔ اُن میں سے جن مصنّفین کے دلوں میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا راسخ عقیدہ تھا، اُنھوں نے اُن "ارضی" وسائل کو جو رسُولِ عربی نے اپنی اُمّت کے احیا و اصلاح کے لیے اختیار کئے شیطان کی سُجھائی ہوئی تدبیریں کہا ہے اور اس امر کو کہ نبیٔ ناصری نے ایسے وسائل استعمال نہیں کئے (غالباً اس لیے کہ انھیں اس کا موقع ہی نہیں ملا) اُن کی خدائی کا ثبوت خیال کیا ہے۔ ہم مدلّل طور پر واضح کریں گے کہ اس قسم کے موازنے غیر منصفانہ ہیں، کیونکہ وہ ایسے مقدمات پر مبنی ہیں جو نہ صرف تاریخی

اعتبار سے بلکہ انسانی فطرت کے نقطۂ نگاہ سے بھی باطل ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کے حالاتِ زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے حضرت عیسیٰ کا اثر و نفوذ اُن کی مختصر بعثت کے دوران پیروؤں کے ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود رہا اور یہ لوگ زیادہ تر اسفل طبقوں کے اَن پڑھ لوگ تھے۔ اس سے پیشتر کہ یہ پیرو تعداد یا رسوخ میں اتنی ترقی کرتے کہ اُن کی ہدایت کے لیے عملی قاعدوں کی ضرورت محسوس ہوتی، اس سے پیشتر کہ وہ روحانی تعلیم کی خاطر یا حکمرانوں کے مذہبی تشدّد سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو ایک منظّم جماعت میں تبدیل کرتے حضرت عیسیٰؑ ان خشمناک جذبات کا شکار ہوگئے جو انھوں نے پیشہ ور مذہبی لوگوں کی بےجان رسم پرستی کے خلاف صدائے لعنت و ملامت بلند کر کے اُکسائے تھے۔[1] چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے پیرو ایک ایسی جماعت کے افراد تھے جو باضابطہ قوانین کے تحت تھی جن کی بجا آوری کی ضامن اقتدار اعلیٰ رکھنے والی حکومت روما تھی، اس لیے انھیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی کہ اپنے آپ کو ایک منظّم جماعت بنائیں۔ علیٰ ہذالقیاس ان کے معلّم نے بھی یہ ضروری نہ سمجھا کہ ان کی ہدایت کے لیے مثبت اخلاقی قوانین وضع کریں۔ یہ ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب عیسائیوں کی جماعت بڑی ہوگئی اور ایک ایسے عالم نے جو جدید افلاطونی علوم کا ماہر تھا اُس انفرادیت اور سادگی کو تباہ کر دیا جو معلّمِ اصلی کی تعلیمات کی خصوصیت تھی۔

حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو بھی اپنی تبلیغی و اصلاحی زندگی

---

[1] مغربی محققین اس بارے میں جو نظریہ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں، میں یہ اسی کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر وفات نہیں پائی بلکہ معجزانہ طور پر غائب ہوگئے، اور اُن کے عہد میں جو روایات رائج تھیں، یہ عقیدہ ان سے مطابقت رکھتا تھا۔ اگرچہ اس نظریے کو ایک مشکوک الاصل غناسطی روایت کہا جاتا ہے اور یہ عام عیسائی روایات سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن تاریخی اعتبار سے دونوں نظریوں کی صداقت کا مساوی امکان ہے۔

کے آغاز ہی سے اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ۔ اُن کے پیرو بھی ابتدا میں قلیل التعداد اور کمزور تھے ، اُن کے پیش رو بھی ایسے لوگ تھے جنھوں نے بُت پرستی کے بندھن توڑے تھے اور اپنے بطون میں چشمۂ حیات کی موسیقی سُنی تھی ۔ اُنھوں نے بھی نرمی ، صلۂ رحمی اور محبت کی تعلیم دی ۔

لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا ظہور ایک ایسی قوم میں ہُوا جو بربریت وجہالت میں ڈوبی ہوئی تھی ، جس کے لیے جنگ و جدل مقصدِ زندگی تھا ۔ وہ ایک ایسی قوم تھی جو یونانیوں اور رُومیوں کے مادیت آفریں اور انحطاط انگیز اثرات سے بھی اور اُن کے انسانیت آموز اثرات سے بھی دُور تھی ۔ شروع شروع میں آپؐ کی دعوت تحقیر وتضحیک کے ساتھ اور بعد میں انتقامی غیظ وغضب کے ساتھ سُنی گئی ۔ اس کے باوجود آپؐ کے پیروؤں کی تعداد اور قوت بڑھتی چلی گئی ۔ تا آنکہ اہلِ مدینہ کی دعوت نے آپؐ کے عظیم الشان کارنامے کو تاجِ کامرانی پہنایا ۔ جس لمحے آپؐ نے اس مامن میں قدم رکھا جو آپؐ کے شریف النفس میزبانوں نے آپؐ کو پیش کیا تھا ، جس وقت آپؐ نے مدینہ کا منصبِ اعلیٰ اور رُوحانی معلّم بننا قبول کیا ، اُسی لمحے سے آپؐ کی کامیابی یا ناکامی اہلِ مدینہ کی کامیابی یا ناکامی سے وابستہ ہو گئی ۔ اُسی لمحے سے بُت پرستوں اور اُن کے معاونوں کی مخالفت اتنی بڑھ گئی کہ مسلمانوں کے لیے ہر وقت بیدار رہ ہوشیار رہنا ضروری ہو گیا ۔ ایک اکیلے شہر کو عرب کے کثیر التعداد قبائل کی مجموعی یورشوں کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ ان حالات میں اس چھوٹی سی خدا داد مملکت کا وجود قائم رکھنے کی خاطر اکثر مستعدانہ اقدامات کی ضرورت پیش آتی تھی ۔ جب امن و آشتی کی حجّتیں تمام ہو جاتیں تھیں تو بازوے کام لینا پڑتا تھا ۔

تحفّظِ ذات کا وہ جبلّی داعیہ جو نبیٔ ناصری کے سینے کے اندر سے اُس وقت پکارا تھا جب انھوں نے اپنے حواریوں کو یہ تلقین کی تھی کہ اپنے آپ کو تحفّظ کے آلات سے لیس کریں[1] ، اُسی داعیے نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو مجبور کیا کہ جب اُن کے بے رحم دشمن اُن پر حملہ آور ہوں تو ہتھیاروں سے اُن کا مقابلہ کریں ۔

---

[1] لوقا ۔ ۲۲ ۔ ۳۶

رفتہ رفتہ محبت و شفقت اور مستعدانہ محنت و ہمت کی بدولت بکھرے ہوئے عرب قبیلے پرستاران حق کی جماعت میں شامل ہو گئے اور ملک میں امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے تو ایک ایسی قوم کے فرزند جس کا شمار دنیا کی سب سے زیادہ مشتعل مزاج قوموں میں ہوتا ہے، جو جبلۃً اس وقت بھی اتنی ہی طوفانی و ہیجانی تھی جتنی اب ہے اور جس کے جذبات اس کے صحرا کو تپانے والے سورج کی طرح بھڑکیلے تھے، لیکن آپؐ نے عربوں کو ضبطِ نفس اور انکارِ نفس کی ایسی عادتیں سکھائیں جن کی کوئی نظیر تاریخ نے اس سے پہلے پیش نہ کی تھی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ظہور کے وقت بین الاقوامی مروت کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ جب قومیں یا قبیلے ایک دوسرے سے جنگ کرتے تھے تو اس کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا تھا کہ جو لوگ لڑنے کے قابل ہوتے تھے وہ سب کے سب تہ تیغ کر دیئے جاتے تھے۔ معصوم عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جاتا تھا اور دشمنوں کے گھروں میں جو بُت ہوتے تھے وہ اپنے ساز و سامان سمیت لُوٹ لیے جاتے تھے۔

اگرچہ اہلِ رُوما نے تیرہ صدیوں کی مدت میں ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جو اتنا ہی جامع تھا جتنا وہ بلند تھا[1] لیکن وہ بھی بین الاقوامی اخلاق یا انسانیت کے فرائض کا ادراک نہ کر سکے۔ وہ جنگ صرف اس مقصد سے کرتے تھے کہ آس پاس کی قوموں کو اپنا مطیع و منقاد بنائیں۔ جہاں جہاں انھیں کامیابی ہوئی انھوں نے مسخر قوموں پر اپنی مرضی علی الاطلاق عائد کر دی۔ معاہدوں کے تقدس کا کوئی احساس نہ تھا۔ معاہدے کیے جاتے تھے اور عند الضرورت توڑ دیئے جاتے تھے۔ اہلِ رُوما کی نظروں میں دوسری قوموں کی آزادی کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔[2]

---

[1] سامی نسلوں سے ناانصافی ہوگی، اگر میں یہاں یہ بیان نہ کر دوں کہ رُوم کے تقریباً تمام قانون ساز سامی النسل تھے، یعنی فنیقی، اسوری یا قرطاجنی۔

[2] اس موضوع پر دیکھیے، Dollinger, The Gentile and the Jew.

مذہبِ عیسوی کے آنے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ بین الاقوامی مراعات کے بارے میں اہلِ دُنیا کا جو عندیہ پہلے تھا، اب بھی وہی رہا۔ لڑائیاں اُنھی انسانیت سوز اور ہلاکت آفریں طریقوں سے لڑی جاتی رہیں جو پہلے رائج تھے۔ فتحمند فوجیں اُسی طرح بے دریغانہ ہزیمت خوردہ لوگوں کو غلامی کی بیڑیاں پہناتی رہیں۔ میثاق اور معاہدے اُسی طرح ہوتے رہے اور اسی طرح کسی مقامی سردار کی سہولت کے پیشِ نظر توڑے جاتے رہے۔ عیسائیت کا یہ دعوےٰ ہی نہ تھا کہ اُسے بین الاقوامی اخلاق سے کوئی سروکار ہے۔ چنانچہ اُس نے اس بارے میں اپنے پیروؤں کی ہدایت کے لیے کوئی مشعل روشن نہ کی۔

جدید مفکرین نے یہ نہیں کیا کہ اس امر کو عیسوی نظام کا ایک حقیقی نقص تسلیم کریں جو اس قدرتی سبب سے رہ گیا کہ اس نظام کا بانی اپنا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ اس کے بجائے انھوں نے اس کی حمایت کی ہے اور اس کے جواز کی دلیلیں پیش کی ہیں۔ عقلِ انسانی بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو کیسی کیسی کج بحثیوں میں الجھا لیتی ہے! ایک ہی کام فرد سے سرزد ہو تو صحیح سمجھا جاتا ہے اور جماعت سے سرزد ہو تو غلط۔ اسی طرح ایک ہی کام جماعت سے سرزد ہو تو صحیح سمجھا جاتا ہے اور فرد سے سرزد ہو تو غلط۔ مذہب اور اخلاق جو متبادل الفاظ ہیں، دونوں قانون کی اقلیم سے علیحدہ رکھے جاتے ہیں۔ مذہب جو افراد کے علائق کی ضابطہ بندی کا مدعی ہے، نوعِ انسانی کے مختلف گروہوں کے باہمی تعلقات سے اپنے آپ کو بری الذّمہ کہتا ہے۔ چنانچہ یوں مذہب محض جذباتیت ہو کر رہ جاتا ہے، یعنی پُرجوش جذبات کے اُنڈیلنے کی ایک ناند، یا مجالسِ مذاکرہ میں باہمی قصیدہ خوانی کا ایک موضوع، اگرچہ یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی وہ فلسفۂ اخلاق کی رفعت بھی حاصل کر لیتا ہے۔

بین الاقوامی فرائض کی حقیقی بنیاد یہ ہے کہ اقوام کو افراد کی سی حیثیت دی جائے اور یہ بات ملحوظِ خاطر رکھی جائے کہ اقوام اور افراد کے لیے علیحدہ علیحدہ معیار قائم نہیں کیے جا سکتے کیونکہ جس طرح افراد کے مجموعوں کا نام اقوام ہے اسی طرح اقوام کے مجموعے کا نام ہے نوعِ انسانی، اور اقوام کے درمیان جو رابطۂ حقوق و فرائض ہے وہ اس رابطۂ حقوق و فرائض سے جو افراد کے درمیان ہوتا ہے کسی طرح مختلف نہیں[1]

---

[1] مقابلے کے لیے ملاحظہ کیجیے: David Urquharts (باقی حاشیہ صفحہ ۳۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہ درست ہے کہ جب مغرب میں لاطینی کلیسا قائم ہو گیا اور روم کے اسقفوں کو مزید اختیارات حاصل ہو گئے تو عیسائی دنیا کے لاطینی حصّے میں کسی حد تک بین الاقوامی ذمہ شناسی پیدا ہو گئی۔ لیکن یہ ذمّہ شناسی تمام و کمال کلیسائے رُوم کے تابعین تک محدود تھی۔ البتہ کبھی کبھی یونانی عیسائیت کو بھی اس سے مستفید کر دیا جاتا تھا۔ جہاں تک باقی دنیا کا تعلق تھا، وہ غیر مشروط طور پر اس کے استفادے سے محروم رکھی گئی۔ "مذہب کے نام کو کمزور قوموں کے خلاف جارحانہ کارروائیوں کا عذر اور جواز سمجھا جاتا تھا اور اس کی خاطر اُن قوموں کو لوٹ مار اور غلام سازی کا مورد بنایا جاتا تھا" ہر جابرانہ اور متشددانہ عمل پر کلیسا کی مُہرِ تقدیس ثبت ہو جاتی تھی۔ انتہائی ظلم کی صورت میں کلیسا کا پروانۂ بریت ظالم کی راہِ نجات کو ہموار کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ قتلِ عام کے اُن معرکوں سے شروع کر کے جو شارلمین Charbemagne نے کلیسا کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ برپا کیے، امریکہ کے فرنجان و مرنج اصلی باشندوں کے کُشت و خون اور بردہ فروشی تک بین الاقوامی فرائض کی خلاف ورزی اور انسانی حقوق کی پامالی کا ایک غیر منقطع سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ جنسی ہمدردی کے اوّل اصول سے اس اعراض ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرتِ عیسیٰؑ کے جن تابعین نے کلیسا سے اختلافِ رائے کی جسارت کی اُن پر ستم توڑے گئے۔[1]

پروٹسٹنٹ مسلک کے رونما ہونے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ عیسائیت کے مختلف فرقوں کے درمیان جو مجادلے ہوئے اور انھوں نے ایک دوسرے پر جو مظالم روا رکھے، وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۲)

Essay on the Effects of the Contempt of International Law

reprinted from *The East and West*, feb, 1867.

[1] مقابلہ کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Milman, Latin Christianity, vol. i, and

Lecky, *History of Rationalism in Europe*, (Persecution)

بجائے خود ایک کمل تاریخ کا مواد بن سکتے ہیں۔ ہیلم (Hallam) کا قول ہے کہ:
"متعصبانہ تشدد اصلاح یافتہ کلیسا کا سب سے بڑا فطری گناہ ہے۔ یہ اس کی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث ہر دیانت دار آدمی کے دل میں اس کی حمایت کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اسی حد تک جس حد تک اس کے مطالعے میں وسعت آتی جاتی ہے۔"[۱]

مختلف نوزائیدہ کلیسا ایمانیات و دینیات کے معاملے میں ایک دوسرے سے یا کلیسائے روم سے چاہے کتنے ہی مختلف الرائے ہوں، جہاں تک اُن قوموں کے ساتھ جو کلیسا کے دائرے سے باہر تھیں اشتراکِ حقوق و مفادات کا تعلق تھا وہ سب بالاتفاق رائے اس کے مخالف تھے۔[۲]

اس کے برعکس اسلام کی رُوح علیحدگی اور دوسری جماعتوں کے ساتھ بےتعلقی کو پسند نہیں کرتی۔ اگرچہ تہذیب و شائستگی نے ابھی بہت کم ترقی کی تھی اور دنیا معاشرتی و اخلاقی تاریکی میں بھٹک رہی تھی، لیکن رسولِ پاک نے مساوات کے اُن اصولوں کی تعلیم دی جن کا محض ایک ادھورا سا ادراک دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے اور ایسے قوانین نافذ کئے جو وسیع المشربی اور شریف النفسی کے اعتبار سے ہر دوسرے مذہب کے قوانین سے حریفِ مقابلہ ہو سکتے ہیں۔ ایک قابل مصنف کہتا ہے کہ "اسلام اپنے عقائد کی تبلیغ کرتا تھا، لیکن

---

[۱] Hallam's *Consitutional History of England*, vol. i. chap, ii, p. 62

لکی کہتا ہے کہ جب کیلون نے سرویٹس کو تثلیث کے بارے میں ملحدانہ خیالات کی بنا پر نذرِ آتش کیا تو پروٹسٹنٹوں کے تمام فرقوں نے اس کام کو سراہا .... انگلستان میں کیتھولکوں غیر مقلدوں اور اربابِ بدعت کے برخلاف جو تعزیراتی قوانین رائج تھے اگر کوئی راست بین شخص ان کا مطالعہ کرے تو اُس کے دل و دماغ کو دھکا سا لگتا ہے۔

[۲] گروٹیس (Grotius) نے جو غالباً یورپ میں بین الاقوامی قانون کا بانی مبانی تھا، مسلمانوں کو باضابطہ طور پر مغربی اقوام کے ساتھ اشتراکِ حقوق سے خارج قرار دیا۔

انھیں کبھی جبراً تسلیم نہیں کراتا تھا ، اور جو لوگ ان عقائد کو قبول کر لیتے تھے انھیں فاتحین کی جماعت کے برابر حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔

اسلام نے مفتوحہ ملکوں کو اُن تمام پابندیوں اور شرطوں سے آزاد رکھا جو ابتدا سے عالم سے لے کر ظہورِ اسلام تک ہر فاتح عائد کرتا چلا آیا تھا۔

اسلام کے قوانین تمام دوسرے مذاہب کے پیروؤں کو جو اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ تھے نہ صرف آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ عبادت عطا کرتے تھے بلکہ اُن آزادیوں کے ضامن بھی ہوتے تھے۔ قرآن کا یہ ارشاد کہ لااکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں کوئی جبر نہ ہونا چاہیے)[1] رواداری و احسان کے ان اصولوں پر شاہد ہے جن کی تعلیم اسلام نے دی " اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام دنیا کے لوگ بہ یک وقت ایمان لے آتے ، پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں ؟ کوئی متنفس اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا " (یونس - ۹۹ ، ۱۰۰)

یہ ہیں اس معلّم کی ہدایات جس پر مذہبی تشدد اور تعصب کا بہتان باندھا گیا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے اقوال نہیں جو محض ایک اپنا ہی خونِ جگر کھانے والا مذہبی دیوانہ یا ایک تخیل پرست فلسفی تھا جسے مخالف قوتوں کے غلبے نے مفلوج کر دیا تھا ، بلکہ یہ اس شخص کے اقوال ہیں جو اپنی قوت کے عروج پر تھا ، جو ایک ایسی مقتدر اور بہمہ وجوہ منظم مملکت کا تاجدار تھا جس میں اتنی طاقت تھی کہ بزورِ شمشیر اس کے احکام کا لوہا منوا سکتی تھی۔

کیا مذہب اور کیا سیاست ، دونوں میں افراد اور گروہوں نے رواداری کی تلقین اور عملی تاکید صرف اس وقت تک کی ہے جب تک وہ کمزور اور بے بس تھے۔ جہاں اُن میں اتنی طاقت آئی کہ مخالف قوتوں سے جنگ آزما ہو سکیں ، وہیں جبر و تشدد نے رواداری کی جگہ لے لی۔ جب قسطنطین (Constantine) قیصرانِ رُوم کے تخت پر متمکن ہوا تو عیسائیت آزار رسانی سے مصئون ہو گئی لیکن اسی وقت سے مذہبی ظلم و تعدی کا ایک منظم سلسلہ شروع ہو گیا جس کی نظیر صرف یہود کے یہاں ملتی ہے۔ لیکی (Lecky) کہتا ہے کہ " جس لمحہ کلیسا کو قسطنطین

---

[1] البقرہ - ۲۵۷ ، ۲ سورت

کے زیرِ سایہ سیاسی اقتدار حاصل ہُوا، اُسی لیے استبداد کا عام اصول مسلّم ہوگیا اور اس پر یہودیوں، مُلحدوں اور مشرکوں کے خلاف عمل درآمد شروع ہوگیا[1]۔ ان لوگوں کو بے رحمی کے نہایت لطیف طریقوں سے ایذائیں پہنچائی گئیں: انھیں دھیمے دھیمے جلنے والی آگ میں جلایا گیا تاکہ انھیں کلیسائے مسیحی کی رحمدلی اور انسان نوازی پر غور کرنے کا موقع ملے۔ آبائے کلیسا نے یکے بعد دیگرے مذہبی تشدد کے تقدّس کے فتوے دیئے۔ کلیسا کے اولیاء میں سے ایک برگزیدہ ترین ولی نے، ایک ایسے ولی نے جو زہد و تقویٰ میں بے نظیر تھا "جبر و اکراہ کے شقی ترین طریقوں کی حمایت میں دلائل پیش کیے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یورپ جن عظیم جنگوں کا معرکہ زار بنا، اُن کو چھوڑ کر کوئی ایسا موقع نہیں آیا جب کلیسائے مسیحی نے، جو عیسوی رسولوں سے استناد اور کسبِ اختیار کا مدعی ہے، جنگ بازی کی حوصلہ افزائی میں تامّل کا اظہار کیا ہو[2] یا مذہب کے نام پر اور مسیح کی عظمت برقرار رکھنے کی خاطر بدعت یا انکار کے مرتکب لوگوں کو تہس نہس کرنے کی مہیں منظور کرنے میں پس و پیش کیا ہو۔ عیسوی انسان نوازی یا آئینِ اقوام پر ان لوگوں کو کوئی حق نہ پہنچتا تھا اور نہ آج کل بے چاری سیاہ فام قوموں کو پہنچتا ہے۔ پندرھویں صدی میں پاپائے روم نے ایک خصوصی منشورِ حقوق جاری کیا جس کی رُو سے غیر عیسائی دنیا پرتگیزوں اور ہسپانیوں میں برابر تقسیم ہوگئی اور انھیں مکمل اختیار دے دیا گیا کہ جن طریقوں سے بھی چاہیں اپنے حصّے کے باشندوں کو عیسائی بنائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ پرتگیزوں اور ہسپانیوں نے کس فراخدلی سے اس منشور کی تفسیر کی۔ ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ جبر و تشدد اور غیر عیسائیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں جتنے فتنہ انگیز مسائل ہیں وہ سب حضرت عیسیٰؑ کے سر منڈھ

---

[1] مقابلہ کے لیے ملاحظہ کیجئے: Hallam, *Constitutional* History of England, vol. i, chap. ii, p.98

[2] بیسویں صدی کی عظیم اور تباہ کُن جنگ میں، جس میں عیسوی دنیا کی تمام بڑی بڑی قوموں نے شرکت کی (یعنی پہلی عالمی جنگ میں ۔ مترجم) اطراف کے مذہبی اربابِ اختیار نے جنگ کی آگ بھڑکانے میں پُرجوش و خروش کردار ادا کیا۔

دیئے جاتے ہیں مثلاً ان کہ ان الفاظ کا مطلب ماڈرنٹ کر دیا جاتا ہے کہ انہیں داخل ہونے پر مجبور کرو۔[1]

اپنی شاندار کامیابی کے عروج پر، جب رسولِ عربی نے حرم کعبہ میں داخل ہو کر وہاں کے بُت توڑ ڈالے، اس وقت آپؐ نے مذہبی غیظ و غضب میں نہیں، بلکہ از راہِ رحم و کرم ارشاد فرمایا کہ "حق آ پہنچا ہے، تاریکی رخصت ہوتی ہے۔" آپؐ نے عام معافی کا اعلان کیا، کمزوروں اور غریبوں پر ظلم کرنے کی ممانعت کی اور انصار میں جو لوگ غلام تھے انھیں آزادی بخشی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رواداری کی محض تلقین ہی نہیں کی، بلکہ اُسے قانون کی صورت میں متشکل کر دیا۔ تمام مفتوحہ قوموں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ اپنے طریقۂ عبادت پر عمل کرنے کی اجازت کا معاوضہ انھیں صرف ایک برائے نام جزیے کی صورت میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس وقت کوئی غیر مسلم گروہ جزیہ دینے کا اقرار کرتا تھا، اسی وقت سے اس کے مذہب یا اس کی آزادیٔ ضمیر میں کسی قسم کی مزاحمت یا مداخلت شرعِ اسلامی کی خلاف ورزی سمجھی جاتی تھی۔ کیا یہ بات کسی دوسرے مذہب پر صادق آتی ہے؟ تلوار کے ذریعے اسلام کی اشاعت پیغمبرِ اسلامؐ کو طبعاً ناگوار تھی اور آپؐ کی طبیعت مذہبی مناقشوں سے نفور تھی۔ بار بار ارشاد ہوتا ہے: "جس بات کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے اس پر کیوں بحث کرتے ہو؟ نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ جب تم اللہ کے حضور پلٹ کر جاؤ گے تو اس وقت وہ تمھیں اُن تمام باتوں کی حقیقت بتا دے گا جن کے بارے میں تمھارے باہمی اختلافات تھے۔"

آیئے اب ہم پیغمبرِ اسلامؐ کے غزوات کا جائزہ لیں۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ آنحضرتؐ کے تابعین اور اطرافِ مدینہ کے قبیلوں میں جو چپقلشیں ہوئیں اُن سب کا باعث بُت پرستوں کی جارحانہ اور سفاکانہ عداوت تھی جس نے مسلمانوں کو مدافعانہ اقدامات پر مجبور کر دیا۔ جنگِ موتہ اور مہم تبوک، جو دونوں کسی غیر ملکی سلطنت کے خلاف سب سے پہلی کارروائیاں تھیں، اس لیے ضروری ہوئیں کہ یونانیوں نے مسلمانوں کے ایک سفیر کو قتل کر دیا۔ اگر مسلمان

---

[1] ملاحظہ کیجیے کتاب ہذا کا باب بعنوان "اسلام کی سیاسی روح"

مشرقی عیسائیوں کو اس جرم کی سزا نہ دیتے تو غالباً اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کا الزام سُننے میں نہ آتا۔ غزوہ مُوتہ فیصلہ کُن ثابت نہ ہوا، اور مہم تبوک جو محض ہرقل (Hera clius) کی فوجوں کے اجتماع کو روکنے کے لیے شروع کی گئی، خالصتہً مدافعانہ تھی۔ چنانچہ آنحضرتؐ کی زندگی میں یونانیوں کو اپنے جرم کی سزا نہ دی جا سکی، لیکن اُن کے جانشینوں نے اس جرم کو فراموش نہ کیا اور اس کا کماحقہٗ معاوضہ وصول کیا۔

یونانی سلطنت کے ڈانڈے مسلمانوں کی مملکت سے یوں ملے ہوئے تھے کہ مخاصمت کی بدولت مسلمان عیسائی دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کے ساتھ برسرِ جنگ ہو گئے۔ مزید بریں بازنطینی شہنشاہوں کے رُوبہ زوال اقتدار کے تحت صوبوں کے حاکم کچھ ایسے خود مختار ہو گئے تھے کہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ معاہدہ کر کے مسلمان اس صورتِ حال کا علاج نہ کر سکتے تھے۔ ابھی ایک کو شکست دے کر اُس سے معاہدہ نہ ہو چکا ہوتا تھا کہ کوئی دوسرا کسی مخاصمانہ کارروائی کا مرتکب ہو جاتا تھا اور مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا تھا کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی کریں۔ چنانچہ جب یونانیوں سے معاندت شروع ہوئی، تو مسلمان نتیجتہً ساری عیسائی دنیا سے ایک محاربۂ عام میں مُبتلا ہو گئے۔[1]

---

[1] ملاحظہ کیجئے: Urquhart, *Islam as a Political System*,

میرا منشا یہ دعوےٰ کرنا نہیں کہ مسلمانوں نے کبھی جارحیت یا ہوسِ ملک گیری کے زیرِ اثر عمل نہیں کیا۔ اس قسم کا دعوےٰ انسانی فطرت سے پرلے درجے کی جہالت کا اظہار ہو گا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے دشمنوں اور حملہ آوروں کے مقابلے میں جو بے نظیر اور شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں اور اس طرح انھیں اپنے قرب وجوار کی قوموں کی کمزوری کا جو علم حاصل ہوا تھا اس کے باوجود وہ جادۂ اعتدال پہ ثابت قدم اور قانونی حدود کے اندر محصور رہتے۔ میں اس امر سے بھی تجاہل نہیں کرتا کہ محمدؐ کے پیروؤں نے آپس میں لڑائیاں لڑیں اور وہ لڑائیاں اتنی ہی بے رحمی سے لڑی گئیں جتنی عیسائیوں کی باہمی جنگیں۔ لیکن مسلمانوں کی یہ لڑائیاں خاندانی جنگیں تھیں۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں نے ایک دوسرے پہ جو تشدد کئے وہ بھی زیادہ تر اہنی اسباب کا نتیجہ تھے۔ مثلاً اہلِ بیتِ نبویؐ، یعنی اولادِ علیؓ و فاطمہؓ، پر جو ستم (باقی حاشیہ صفحہ ۳۴۹ پہ ملاحظہ فرمائیں)

جس طرح عیسائیوں کے یہاں اُسی طرح مسلمانوں کے یہاں بد نیت مقامی سرداروں نے اکثر مذہب کو اپنی حُبِّ جاہ کی تسکین کا وسیلہ اور بہانہ بنایا ہے۔ جس طرح عیسائی فقہا اور علمائے دین نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی کُفر کی دنیا اور عیسائیت کی دنیا، اسی طرح مسلم سوفسطائیوں نے بھی دارالحرب اور دارالاسلام میں فرق قائم کیا ہے لیکن اگر اُن اصولوں کا جن پر مسلم حکومتوں اور غیر مسلم مملکتوں کے باہمی تعلقات مبنی کئے گئے اور بین الاقوامی آئین کے موضوع پر عیسائی مصنفین کی تحریروں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ اول الذکر میں مؤخر الذکر کی بہ نسبت کہیں زیادہ فراخ دلی اور عالی ظرفی ہے۔ عیسائی حکومتوں نے تو ابھی حال ہی میں اور حالات کے دباؤ کے تحت غیر مسلم مملکتوں کو قوموں کی برادری میں داخل کیا ہے۔ اس کے برخلاف مسلم فقہاء نے حالتِ جنگ اور حالتِ امن کے درمیان تفریق کی چنانچہ دارالحرب میں صرف وہ ملک شامل ہیں جن سے مسلمان برسرِ جنگ ہوں جن ملکوں سے اُن کی صلح ہو وہ دارالامان کے حصّے شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک حربی یعنی دارالحرب کا باشندہ خالصتہً و کُلّیتہً ایک غیر ملکی تصوّر کیا جاتا ہے۔ اُسے اس کا حق نہیں ہوتا کہ صریح اجازت کے بغیر اسلامی مملکتوں میں قدم رکھے۔ لیکن اگر غریب سے غریب مسلمان بھی اُسے امان دے یعنی اس کی حفاظت کا ذمہ دار بنے، تو پورے ایک سال تک وہ ہر قسم کی مداخلت سے مصئون ہوتا ہے۔ ایک سال گزرنے کے بعد ضروری ہے کہ وہ اسلامی مملکت سے چلا جائے۔ دارالامان کا رہنے والا مستامن ہوتا ہے۔ اُسے جو امان دی جاتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے ہو سکتی ہے یا ایک محدود مدت کے لیے، لیکن جب تک امان قائم رہے مستامن کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہ اُس معاہدے کی شرائط کے عین مطابق ہوگا جو اسلامی مملکت اور اس ملک کے درمیان ہو۔ مستامن لوگوں پر اُن کے اپنے قوانین عائد کئے جاتے تھے، انھیں جزیے سے معاف رکھا جاتا تھا اور انھیں اور رعایتیں بھی دی جاتی تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۸) بنی اُمیّہ نے روا رکھے اُن کا سرچشمہ جیسا کہ میں آگے چل کر واضح کروں گا۔ قریش کی وہ پُرانی دشمنی تھی جو انھیں حضرت محمدؐ اور بنی ہاشم سے تھی۔

جس ضابطۂ قوانین نے آئینِ بین الاقوامی کو احکامِ شرعی کا ایک جزو بنا لیا اُس میں جارحیت کا شائبہ بھی کیونکر ہو سکتا تھا؟ محمدؐ کے پیرو اپنے اقتدار کے عروج پر بھی ہمیشہ اپنے مخالفوں سے یوں خطاب کرنے کو تیار رہتے "ہماری مخالفت ترک کر دو اور ہمارے حلیف بن جاؤ تو ہم تم سے اپنا حلف پورا کریں گے، یا ہمیں جزیہ ادا کرو اور ہم تمھارے تمام حقوق کا تحفظ کریں گے، یا ہمارا دین قبول کرو اور ہمارے سارے حقوق میں ہمارے برابر کے شریک ہو۔"

آنحضرتؐ کی وہ بڑی بڑی ہدایات جن پر اسلامی قوانینِ رزم مبنی ہیں، اسلامی نظام کی دانشمندی اور انسان نوازی پر شاہد ہیں :-

"اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، لیکن زیادتی نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اگر وہ تم پر حملہ کریں تو انھیں ہلاک کر دو لیکن اگر وہ باز آئیں تو جان لو کہ ظالموں کے سوا کسی پر دست درازی روا نہیں۔" (البقرۃ - ۱۹۰ تا ۱۹۲)

مسلمانوں نے ایران پر جو لشکرکشی کی تو یہ حالات کا تقاضا تھا۔ نیم عرب بادشاہوں کا ایک خاندان یعنی خاندانِ بنو منذر، جو شہنشاہِ ایران کے زیرِ سایہ حکمران تھا، یوں تو سلطنتِ بازنطین کا سیاسی مخالف تھا لیکن اس کے ساتھ مذہب اور مفادات کے رشتے میں منسلک تھا۔ یونانیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جو پہلی آویزش ہوئی اس کا ردِ عمل اہلِ حیرہ پر ہوا۔ جو بنو منذر کے باجگزار تھے۔ حیرہ کی قلمرو ایک وسیع قلمرو تھی، جو دریائے فرات کے کنارے سے مغرب کی طرف پھیلی ہوئی تھی اور دشتِ عراق کو پار کرتی ہوئی بازنطینی سلطنت کے باجگزار غسانی عربوں کی چراگاہوں تک جا پہنچی تھی۔

حیرہ کی حیثیت ایرانیوں کے تحت تقریباً وہی تھی جو قیصرانِ روم آگسٹس (Augustus) اور ٹائبریس (Tiberias) کے تحت یہودیہ کی تھی۔

مسلمانوں کی فتح کے وقت شہنشاہِ ایران کا مامور کیا ہوا ایک سردار حیرہ پر حکمران تھا لیکن کسریٰ نے ایک ایرانی مرزبان اس کی نگرانی پر مقرر کر رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسریٰ دل ہی دل میں بنو منذر کے جانشینوں پر رشک کرتا تھا، جن کی رعایا اُتنی ہی شوریدہ سر تھی جتنے اس کے اخلاف آج کل ہیں اور آئے دن ہمسایہ قبیلوں پر چڑھائیاں کرتی رہتی تھی۔ انہی

چڑھائیوں کے نتیجے میں اہلِ حیرہ نے مسلمانوں سے دشمنی مول لے رکھی تھی۔ اسلامی حکومت اُس وقت ایک واحد فرماں روا یعنی خلیفہ کے تحت مضبوط ہو چکی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی وفات کے بعد بدوی قبائل کی سرکوبی کر کے ایک قوی حکومت بن چکی تھی۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ ایک لڑکھڑاتی ہوئی سلطنت کے ایک ادنیٰ سردار کی گستاخیاں برداشت کرتی چلی جاتی۔ چنانچہ ایک مسلم فوج حیرہ روانہ کی گئی۔ مرزبان بھاگ کر مدائن چلا گیا جو سلطنتِ ایران کا دارالحکومت تھا اور عرب سردار نے کسی قسم کی مزاحمت کئے بغیر مسلم سپہ سالار حضرت خالدؓ بن ولیدؓ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔

فتح حیرہ کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمان ولایتِ کیانی کی دہلیز تک جا پہنچے۔ ایران کو خانہ جنگی کی ایک طویل مدت کے بعد جس کے دوران لاتعداد وحشیانہ خونریزیاں اور سفاکیاں ہوئیں، بالآخر ایک قابل اور مستعد حکمران یعنی یزدگرد نصیب ہُوا تھا۔ اس حکمران کے زیرِ ہدایت ایرانی سپہ سالار ایک لشکرِ جرّار لے کر مسلمانوں کے مقابلے کو نکلا۔ فاروقِ اعظمؓ نے، جو اس وقت مسندِ خلافت پر جلوہ افروز تھے، ایرانیوں کی دعوتِ مبارزت قبول کرنے سے پہلے اپنے ایلچیوں کے ذریعے حسبِ معمول صلح و امن کی شرائط پیش کیں تاکہ جنگ کی نوبت نہ آئے۔ یہ شرائط حسبِ ذیل تھیں:۔

قبولِ اسلام جس کے معنی تھے اُن سیاسی خرابیوں کی اصلاح جنھوں نے حکومتِ ساسانی کی حالت اتنی پست کر رکھی تھی۔ اُن تعدّی آمیز محصولوں اور بالائی آمدنیوں[1] میں تخفیف جو قوم کا خون چوس رہی تھیں اور آئینِ محمدیؐ کے مطابق عدل و انصاف جس کی نگاہوں میں رعایا کے تمام افراد بلا امتیازِ رُتبہ و منصب مساوی تھے۔ ان شرائط کی متبادل شرط یہ تھی کہ حفاظت کے معاوضے کے طور پر خراج ادا کیا جائے۔ ایرانی بادشاہ نے حقارت کے ساتھ یہ شرائط ردّ کر دیں جس کا منطقی نتیجہ تھا معرکۂ قادسیہ۔ فتحِ مدائن کے بعد خلیفۃ المؤمنین نے قطعی حکم دیا کہ مشرق

---

[1] عشرِ اراضی اور ۲½ فیصد زکوٰۃ کے سوا، جس کی تقسیم خود بادشاہ اور اس کے افسروں کی مرضی پر چھوڑ دی گئی تھی۔

کی سمت مسلمان کسی قسم کے حالات میں بھی دریائے دجلہ پار نہ کریں اور دریائے فرات کو ہمیشہ کے لیے عجمی اور مسلم ملکوں کے درمیان حدِ فاصل سمجھا جائے۔ اُن کی شرائط پر ایک عہد نامہ صلح پر دستخط کیے گئے، لیکن ایران کو سرزمینِ بین النہرین (Meso op tamia) سے نکل جانے کا بہت رنج تھا۔ ایرانیوں نے معاہدے کی جو خلاف ورزیاں یکے بعد دیگرے کیں اُن کا نتیجہ معرکۂ نہاوند کی صورت میں رُونما ہُوا۔ کسریٰ کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اُس کے سردار اور موبد، جن کا مفاد اس میں تھا کہ بدنظمی اور ظلم وستم کا دور دورہ قائم رہے، اس سے منقطع ہو گئے اور وہ خود اپنے پیش رو دارایوش (Darius) کی طرح ایک غریب الوطن پناہ گیر بن گیا۔ ایرانیوں نے من حیث القوم مسلمانوں کا استقبال[1] نجات دلانے والوں کے طور پر کیا۔ مسلمانوں نے دجلہ سے لے کر البرز تک اور البرز سے لے کر ماوراالنہر (Transoxiana) تک جو پیش قدمی کی وہ باعتبارِ نوعیت وحالات اُس پیش قدمی سے مختلف نہ تھی جو اہلِ برطانیہ نے ہندوستان میں کی۔

ایرانیوں کا مجموعی طور پر مسلمان ہو جانا اکثر اوقات اسلام کے عدمِ رواداری کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے لیکن تعصب میں اتنی کورچشمی ہوتی ہے کہ اس کے زیرِ اثر اہلِ علم بھی اُن حالات کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے تحت مسلمان ایران میں داخل ہوئے۔ مذہبی زندگی کا ایک شمہ بھی ایرانیوں میں باقی نہ تھا۔ عوام النّاس ایک ایسی خرابی کی چکّی میں پسے جا رہے تھے جس سے بڑی خرابی کسی ملک کو لاحق نہیں ہو سکتی، یعنی مذہبی اجارہ داروں کی ایک رذائل میں مبتلا جماعت اور ایک فسق وفجور میں ڈوبی ہوئی اقلیتی حکومت۔ مزدک و مانی کے پھیلائے ہوئے کفر نے معاشرے کے سارے جوڑ بند ڈھیلے کر دیئے تھے۔ کسریٰ نوشیروان نے قومی شیرازے کے بکھر جانے کو صرف تھوڑی مدّت کے لیے ملتوی کیا تھا۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ جب مسلمان قاعدہ قانون اور امن وامان کے نقیب بن کر ایران میں داخل

---

[1] دارایوش کی طرح یزدگرد اپنی ہی قوم کے ہاتھوں قتل ہُوا۔ دیکھیے:
Short History of the Caracens, p. 32

ہوئے تو اُن کے داخل ہوتے ہی سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کرلیا، اور ایران ہمیشہ کے لیے دائرۂ اسلام میں آگیا۔[1]

جو شخص واقعات کا منصفانہ تجزیہ کرے وہ خود اس امر کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ میور کے قولِ ذیل میں کتنی صداقت ہے: "اسلام کی بقائے دائمی کے لیے ضروری تھا کہ جو جارحانہ طریقہ اُس نے اختیار کیا تھا وہ مسلسل طور پر جاری رکھا جائے اور عالمگیر قبول یا کم از کم عالم گیر فضیلت کے بارے میں اُس کا جو ادّعا تھا وہ بزورِ شمشیر تسلیم کرایا جائے۔"[2] ہر مذہب اپنے دورانِ حیات میں کسی نہ کسی مرحلے پر اپنے پیروؤں کے میلانات و رجحانات کے مطابق جارحیت پر کاربند رہا ہے۔ اس سے اسلام مستثنیٰ نہیں۔ لیکن ہم یہ ماننے سے قطعاً انکار کرتے ہیں کہ اسلام نے کبھی بھی بالجبر تبلیغ کو پیشِ نظر رکھا یا دوسرے مذاہب سے زیادہ جارحیت کا ثبوت بہم پہنچایا۔[3]

اسلام نے صرف اپنے تحفّظ کی خاطر تلوار نیام سے نکالی اور اپنے تحفّظ ہی کی خاطر اسے اپنے ہاتھ میں رکھا، اور وہ ہمیشہ ایسا کرے گا۔ لیکن اسلام نے کبھی کسی مبنی بر اخلاق مذہب کے اعتقادات و یقینیات میں دخل اندازی نہیں کی، اس نے کبھی تشدّد سے کام نہیں لیا، اس نے کبھی کوئی مجلسِ مواخذہ (Inquisition) قائم نہیں کی۔ اس نے

---

[1] مسلمانوں کے مقاصد کی بلندی کی شہادت میں ہم ذیل کی عبارت گبّن (Gibbon) سے پیش کرتے ہیں: "ایران کے نظم و نسق کی بنیاد انسانوں، مویشیوں اور زمینوں کی پیداوار کے جائزے پر رکھی گئی۔ اس طرح جو شاندار انتظامی عمارت کھڑی کی گئی اور جو خلفاء کی بیدار مغزی کی گواہی دیتی ہے وہ ہر زمانے کے فلسفیوں کے لیے ایک سبق بن سکتی تھی۔"

Decline and Fall of the Roman Empire, vol. v, p. 97

نیز ملاحظہ کیجیے سیوطی، "تاریخ الخلفاء"

[2] Muir, *Life or Mahomet*, vol. ii, p. 251

[3] مقابلہ کے لیے دیکھیے:

Niebuhr, Descriptisn de l'Arabia,

اختلافِ رائے کو دبانے، انسانی ضمیر کا گلا گھونٹنے یا بدعت کا قلع قمع کرنے کے لیے کوئی تعذیبی شکنجہ ایجاد نہیں کیا، نہ اس نے لوگوں کو کھونٹوں سے باندھ کر آگ میں زندہ جلایا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو تاریخ سے واقفیت رکھتا ہے اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ عیسوی کلیسا نے دعوے تو کیا مطلق معصومیت کا لیکن "تاریخ انسانی کے کسی اور ادارے سے بڑھ کر خونِ معصوماں بہایا"۔ جس مرد یا عورت نے کلیسا سے انحراف کیا یا کسی اور مذہب کو عیسائیت پر ترجیح دی اُسے ایسی سزا ملی جو اگر موت نہ تھی تو موت سے بہتر بھی نہ تھی[1]۔ ۱۵۲۱ء میں چارلس پنجم نے تمام اہلِ بدعت کے لیے موت اور قرقیِ املاک کا فرمان جاری کیا۔ شرکتِ عشائے ربانی سے انکار کی عمومی سزا تھی آگ میں زندہ جلانا، پھانسی پر لٹکانا، زبان کا گدی سے نکال دینا۔ جب انگلستان نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا تو یکے بعد دیگرے متعدد حکمرانوں کے عہد میں پریسبٹیرینوں (Presbyterians) کو قید کیا گیا، گرم لوہے سے داغا گیا، لولا لنگڑا بنا دیا گیا، اُن کے کوڑے لگائے گئے اور انھیں شکنجوں میں کس کر تشہیر کیا گیا۔ سکاٹ لینڈ میں وہ فراری مجرموں کی طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑے گئے، اُن کے کان جڑ سے کھینچ نکالے گئے، اُنھیں گرم لوہوں سے داغا گیا۔ انگلیاں مروڑنے کے آلے سے بھینچ کر اُن کی اُنگلیاں توڑ دی گئیں، کالبوتوں کے اندر جکڑ کر اُن کی ٹانگوں کی ہڈیاں چُور چُور کر دی گئیں۔ عورتوں کو سرِ بازار کوڑے لگائے جاتے تھے۔ کیتھولکوں کو اذیتیں پہنچائی گئیں اور پھانسی پر لٹکایا گیا۔ ان بپتیوں (Anabaptists) اور ایریوں (Arians) کو زندہ نذرِ آتش کیا گیا۔ یہ تو عیسائی فرقوں کے باہمی سلوک کا حال تھا۔ رہے غیر عیسائی، تو اُن کے معاملے میں کیا کیتھولک اور کیا پروٹسٹنٹ، کیا مقلد اور کیا غیر مقلد، سب میں مکمل اتفاقِ رائے تھا۔ مسلمان اور یہودی عیسائیت کے دائرے سے، یعنی انسانیت کے دائرے سے، خارج تھے۔ انگلستان میں یہودیوں کو عذاب کا تختۂ مشق بنایا گیا اور پھانسیاں دی گئیں۔

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ سترھویں صدی میں ایک نوجوان کو صرف اس لیے پھانسی دی گئی کہ اس نے حضرت محمدؐ کو بُرا آدمی کہنے سے انکار کر دیا۔

ہسپانیہ میں مسلمان جلائے گئے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان، عیسائیوں اور "کافروں" کے درمیان، شادیاں قانوناً کالعدم شمار ہوتی تھیں، بلکہ ممنوع تھیں اور ان کے لیے حد درجے کی گھناؤنی اور بھیانک سزائیں مقرر تھیں۔ آج بھی عیسائی امریکہ اُس عیسائی نیگرو کو جو کسی سفید فام عورت سے شادی کر لے زندہ جلا دیتا ہے! یہ ہیں عیسائیت کے اثرات و نتائج۔

آج تک، جہاں کہیں سائنسی تفکر نے ایک نئی روح نہیں پھونکی، جہاں کہیں صحیح تمدن نہیں پنپا، مسلمانوں کو خارجی سمجھنے اور ان سے تعصب برتنے کی پرانی عادت، اسلام سے کلیسائی قدیمی نفرت کتابوں میں، اخباروں میں، تقریروں میں، عام گفتگو میں، غرض جلوت و خلوت میں اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے۔ جبر و تشدد کا رجحان عیسائیت میں آج بھی باقی ہے۔ اُس کی آگ راکھ میں دبی ہوئی موجود ہے اور کسی متعصب کے چھوتے ہی بھڑک اُٹھنے کو تیار۔

آئیے اب ہم اس منظر سے منہ موڑ کر دنیائے اسلام کی طرف متوجہ ہوں۔ جہاں راسخ العقیدہ عیسائی یہودیوں اور نسطوریوں پر ظلم و ستم کر رہے تھے، کیونکہ یہ ان لوگوں کے اخلاف تھے جنھوں نے اُن کے خیال میں اُن کے مجسّم خدا کو صلیب پر لٹکایا تھا اور اس کی ماں کی پرستش کرنے سے انکار کیا تھا، وہاں اسلام نے ان دونوں قوموں کو اپنی امان میں لے لیا۔ جہاں عیسوی یورپ جادوگرنیوں اور بدعت کے مجرموں کو زندہ جلا رہا تھا اور یہودیوں اور کافروں کے قتلِ عام میں مصروف تھا، وہاں مسلمان حکمران اپنی غیر مسلم رعایا سے رواداری و مراعات کا سلوک کر رہے تھے۔ غیر مسلم مملکت کے معتبر شہری تھے، مجالسِ شوریٰ کے ارکان تھے، مسلمانوں کے دوش بدوش ہر غیر مذہبی منصب کے مستحق شمار ہوتے تھے۔ خود معلّم اسلام نے مسلمان مردوں کو عیسائی، یہودی اور زردشتی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی تھی۔ مسلمان عورتوں کو بدیہی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر غیر مسلم مردوں سے شادی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مسلم ترکی اور ایران نے اپنے غیر ملکی مفادات اپنی عیسائی رعایا کو تفویض کیے۔ عیسائیت میں اختلافِ مذہب ایک جرم ہے، اسلام میں وہ محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ ارکہرٹ (Urquhart) کہتا ہے: "عیسائیوں کے لیے اختلافِ مذہب فی الواقعہ جنگ کا جائز سبب تھا اور یہ صرف قرونِ مظلمہ ہی میں اور مذہبی دیوانوں کے یہاں ہی نہیں۔ شارلیمین (Charlemagne) نے سیکسنوں The Saxons

فریزیوں (The Frisians) اور دوسرے جرمن قبیلوں کا جس طرح قتلِ عام کیا ہزاروں بے گناہ مرد اور عورتیں جس بیدردی سے زندہ نذرِ آتش کی گئیں، ایرین (The Arians) پالیشین The Paulicians. آلبی جنیز The Albigenses اور ہیوجناٹ (Huguenots) جس سفاکی سے ہلاک کئے گئے، ماگڈ برگ (Magdeburg) اور رُوم کو جس ہیبت ناک طریقے سے تاخت و تاراج کیا گیا، سی سالہ جنگ میں جو بھیانک خونریزیاں ہوئیں، ان سب سے شروع کرکے کیلون کے پیرو (Calvinistic) سکاٹ لینڈ اور لُوتھر کے پیرو (Lutheran) انگلستان کی تشدّد آزمائیوں تک عدمِ رواداری، تعصّب، اور کٹّرپن کے مظاہروں کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا ہے۔ امریکہ کے مرنجان و مرنج اصلی باشندوں کو جس طرح مسیح کے نام پر جس بے دریغی سے تباہ کیا گیا کیا اس سے زیادہ رُوح فرسا کوئی داستان ہو سکتی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ عربدہ جوئی کا ذوق عیسائیت نے اسلام کی جارحیت سے حاصل کیا۔! العجب! ثم العجب!

عیسائیت کے نام پر جسٹینین (Justinian) نے جو قتلِ عام کئے اور کلوڈس Clovis نے جو ہیبت ناک محاربے کئے وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ظہور سے بہت پہلے واقع ہوئے۔

آئیے ذرا ہم صلیبی رزم آراؤں اور مسلم مجاہدوں کے کردار کا بھی موازنہ کریں۔ جب خلیفہ عمر نے ۶۳۷ء میں یروشلم فتح کیا تو وہ بطریق سوفرونیس (Sophronius) کی ہمرکابی میں اور اس کے ساتھ شہر کے آثارِ قدیمہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے، داخلِ شہر ہوئے۔ نماز کا وقت آیا تو انھوں نے Church of The Resurrection میں، جہاں وہ اس وقت اتفاقاً تھے، نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بجائے کلیسائے قسطنطین کی سیڑھیوں پر نماز ادا کی۔ اس کی توجیہ انھوں نے بطریق کو ان الفاظ میں بیان کی: "اگر میں گرجا کے اندر نماز پڑھتا تو احتمال تھا کہ میری مثال کا عذر پیش کرکے مسلمان آئندہ کسی وقت معاہدہ شکنی کے مرتکب ہوتے"۔ لیکن جب صلیبی جنگجوؤں نے یروشلم فتح

کیا تو انھوں نے بچّوں کو سر کے بل دے پٹخا، شیر خوار بچّوں کو قلعے کی فصیلوں پر سے باہر پھینک دیا، آدمیوں کو جلتی ہوئی آگ پر بھونا، بعض لوگوں کے پیٹ یہ دریافت کرنے کے لیے چاک کر دیئے کہ انھوں نے سونا تو نہیں نگل رکھا۔ یہودی اپنے معبدوں میں بند کر کے جلا دیئے گئے۔ تقریباً ستّر ہزار آدمی تہِ تیغ کر دیئے گئے، اور پاپائے رُوم کے ایلچی نے اس جشنِ قتلِ عام میں حصہ لیا۔[1] جب سلطان صلاح الدین نے یروشلم دوسری بار فتح کیا تو اُس نے تمام عیسائیوں کو رہائی بخشی، اُنھیں خوراک اور نقدی دی اور اُن کے بحفاظت تمام رخصت ہونے کا بندوبست کر دیا۔[2]

اسلام نے اپنے تحفظ کی خاطر تلوار سنبھالی، عیسائیت نے اس لیے سنبھالی کہ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عقیدہ کو کچل ڈالے۔ جب قسطنطین نے دینِ عیسوی قبول کیا تو عیسائیت مغربی دنیا کا غالب مذہب بن گئی۔ اس کے بعد اُسے دشمنوں سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ لیکن اقتدار حاصل کرتے ہی اُس کی طبعی سیرت، یعنی علیٰحدگی اور دوسروں سے نفرت، سطح پر آگئی۔ جہاں کہیں عیسائیت کا غلبہ ہُوا کسی اور مذہب کے پیرو ظلم و تعدّی سے محفوظ نہ رہے۔ اس کے برعکس مسلمان دوسروں سے امن و آشتی کی ایک سیدھی سادی ضمانت طلب کرتے تھے، یعنی یا تو حفاظت کے عوض خراج یا قبولِ اسلام کی صورت میں مسلمانوں کے ساتھ تمام حقوق و رعایات میں مکمل مساوات۔

---

[1] *History of the Development of Europe*, vol. ii, p. 22

[2] تفصیلی تذکرے کے لیے دیکھیے:

Short History of the Sarcens, p. 356

پانچواں باب

اِسلام میں عورتوں کی حیثیت

الجنّت تحت اقدام الاُمّھات [1]

معاشرتی نشو و نما کے ایک مرحلے میں تعددِ ازدواج (Polygyny)، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں تعدّدِ ازواج (Polygamy) یعنی ایک مرد کا بیک وقت ایک سے زیادہ عورتوں کا شوہر ہونا، ایک ناگزیر امر ہوتا ہے۔ قدیم زمانوں میں آئے دن کی قبائلی جنگوں کے باعث مردوں کی آبادی میں جو کمی واقع ہو جایا کرتی تھی جس سے عورتوں کے عددی تناسب کا پلہ بھاری ہو جایا کرتا تھا، کچھ اس کی بدولت اور کچھ اس وجہ سے کہ قبائلی سرداروں کو جو مرد ہوتے تھے مطلق اختیار حاصل تھا یہ دستور وجود میں آیا، جسے ہمارے ترقی یافتہ زمانے میں بجا طور پہ ایک ناقابلِ برداشت خرابی سمجھا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں کی تمام مشرقی اقوام کے یہاں تعددِ ازدواج ایک مانا ہُوا ادارہ تھا۔ چونکہ بادشاہ، جو صفتِ الٰہیت سے متصف سمجھے جاتے تھے، اس پر عمل کرتے تھے، لہٰذا یہ رواج عام لوگوں کی نظروں میں مقدس ہو گیا۔ ہندوؤں کے یہاں تعددِ ازدواج چندزنی اور چند شوئی دونوں صورتوں میں قدیم ترین زمانوں سے رائج تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مادیوں بابلیوں، اسوریوں اور ایرانیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی ایک مرد بہ یک وقت لاتعداد عورتوں کا شوہر ہو سکتا تھا۔ اونچی ذات کے برہمن کو آج کل کے زمانے میں بھی جتنی بیویاں وہ چاہے

---

[1] جنّت ماؤں کے قدموں میں ہے۔

اُتنی بیویوں کی اجازت ہے حضرت موسیٰؑ کے وقت سے پہلے بنی اسرائیل کے یہاں بھی تعدّد ازدواج کا دستور تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے قائم رہنے دیا یہاں تک کہ انھوں نے اس کی کوئی حد بھی مقرر نہ کی کہ ایک یہودی مرد بیک وقت کتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا تھا۔ بعد کے زمانے میں تلمود یروشلم نے یہ پابندی عائد کی کہ ایک مرد صرف اتنی عورتوں کو اپنے نکاح میں رکھ سکتا ہے جتنی عورتوں کو نان و نفقہ مہیا کرنے کی اس میں استطاعت ہو۔ اگرچہ ربیّوں کی یہ ہدایت تھی کہ کسی مرد کے چار سے زیادہ بیویاں نہ ہونی چاہئیں لیکن قرائین Karaites کو اُن سے اختلافِ رائے تھا اور وہ تعیینِ حد کے قائل نہ تھے۔

ایرانیوں کے مذہب نے بیویوں کی کثرت کو قابلِ انعام قرار دیا[1]۔

سُوری فنیقی قوموں میں جنھیں بنی اسرائیل نے جلا وطن، مسخر یا تباہ کیا، تعددِ ازدواج بہیمیت کی حد تک گر گیا تھا[2]۔

تھریس Thrace، لیڈیا Lydians اور پیلاسگیا Pelasgian کی قوموں کے یہاں، جو یورپ اور مغربی ایشیا کے مختلف حصّوں میں آباد تھیں، تعددِ ازدواج حدِّ اعتدال سے اس قدر متجاوز ہو گیا تھا کہ کوئی دوسری قوم اس امر میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی[3]۔

اہلِ ایتھنز کے یہاں، جو ازمنۂ قدیم کی تمام قوموں سے زیادہ مہذّب اور شائستہ تھے، بیوی محض ایک اثاثہ تھی جو خرید و فروخت کیا جا سکتا تھا، بلکہ وصیتہً منتقل بھی کیا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک بُری چیز سمجھی جاتی تھی، جو محض گھربار چلانے اور بچّے جننے کے لیے ضروری تھی۔ ایتھنز کے شہریوں کو بے حد و حساب بیویوں کی اجازت تھی، چنانچہ ڈیموستھینز (Demosthenes) فخریہ بیان کرتا ہے کہ اس کی قوم میں عورتوں کے تین طبقے تھے،

---

[1] Dollinger, *The Gentile the Jew*, pp. 405, 406

[2] انسائیکلوپیڈیا Encyclopedia Universal, Art.

[3] Mariage. Dollinger, *The Gentile and the Jew*, vol. ii, 233

جن میں سے دو طبقے نکاحی بیاہی اور نیم نکاحی بیاہی عورتیں مہیا کرتے تھے[1]

اہلِ سپارٹا (The Spartans) کے یہاں مردوں کو خاص حالات کے سوا ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہ تھی، لیکن عورتوں کو بہ یک وقت متعدد شوہروں کی اجازت تھی اور اس اجازت سے تقریباً ہمیشہ فائدہ اُٹھایا جاتا تھا[2]

جن مخصوص حالات میں رُومی مملکت قائم ہوئی انھوں نے غالباً اس امر کی اجازت نہ دی کہ شروع شروع میں تعددِ ازدواج کو قانوناً جائز قرار دیا جائے۔ سبائی (Sabine) عورتوں کے استحصال بالجبر کے قصے کی تاریخی صداقت چاہے کچھ بھی ہو، اس قصے کا موجود ہونا ہی اُن اسباب کا شاہد ہے جن کی بنا پر رُومیوں نے شادی سے متعلق اپنے غیر مہذب قوانین وضع کئے۔ آس پاس کی مملکتوں اور بالخصوص ایٹرسکنوں (The Etruscans) کے یہاں تعددِ ازدواج ایک ایسا رواج تھا جس کے ساتھ چند رعایات وابستہ تھیں۔ رُومیوں کو اٹلی کی دوسری قوموں سے جو سابقہ پڑا اور جن جنگوں اور فتوحات میں وہ صدیوں تک مشغول رہے انھوں نے عیش و عشرت کی اُن عادتوں سے مل کر جو کامیابی اور خوشحالی نے پیدا کی تھیں بالآخر رُومیوں کے یہاں شادی کے تقدس کو محض ایک کہاوت بنا دیا۔ تعددِ ازدواج قانوناً تو جائز نہ تھا، لیکن "پیونک" (Punic) جنگوں میں ظفر مندی کے بعد رُومہ کی خواتین کے دلوں میں ایک آزاد اور خوشحال مملکت کی منفعتوں سے متمتع اندوز ہونے کی اُمنگیں پیدا ہوئیں، اور اُن کی اُمنگیں اُن کے خاوندوں اور رعاشقوں کی نفس پرستیوں نے پوری کر دیں[3]۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد شادی بے محابا داشتہ بازی کی ایک صورت بن گئی۔ قوانینِ مملکت کی تائید حاصل کر کے داشتہ بازی کا ایک ایسا ادارہ بن گئی جو مراعاتِ خاص کا مستحق تھا۔ عورتوں

---

[1] Dollinger, *The Gentile and the Jew*, vol. ii, p. 233-238

[2] Grote, *History of Greek*, vol. vi, p. 136

[3] Gibbon; *Decline and Fall of the Raman EmpIre*, vol. ii. p. 206

کی کھلم کھلا آزادی، مردوں کے ساتھ اُن کا ڈھیلا ڈھالا رشتہ، بیویوں کے کثیر الوقوع تبادلے، یہ سب چیزیں تعدّدِ ازدواج پر دلالت کرتی ہیں، البتہ انھیں یہ نام نہیں دیا گیا۔

دریں اثنا جس ابتدائی عیسائیت کی تبلیغ گلیلی کے ساحل پر ہوئی تھی اس نے ساری رُومی دنیا کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ اسینیوں (Essenes) کے اثرات نے، جن کا واضح ثبوت حضرتِ عیسیٰؑ کی تعلیمات میں ملتا ہے، اُن کی اس توی اُمید سے مل کر کہ آسمانی بادشاہی قائم ہونے والی تھی، انھیں اس پر آمادہ کیا کہ ازدواجی زندگی کو مذموم قرار دیں، اگرچہ انھوں نے کبھی اسے صراحتہً منع نہیں کیا۔

جب تک جسٹینین (Justinian) کے قوانین نے تعدّدِ ازدواج کو ممنوع قرار نہ دیا اس وقت تک وہ ایک نمایاں صورت میں رائج رہا۔ بلکہ قانونی ممانعت نے بھی لوگوں کے اخلاقی خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔ چنانچہ تعدّدِ ازدواج پر اُس وقت تک عمل ہوتا رہا جب تک کہ جدید معاشرے کی رائے نے اسے معیوب قرار نہ دیا۔ پہلی بیوی کے سوا کسی بیوی کو کوئی قانونی حقوق حاصل نہ تھے۔ اُن حقوق اور مراعات سے محروم رہ کر جو پہلی بیوی کو حاصل تھے، دوسری بیویاں اپنے خاوندوں کی من کی موج کی غلام ہوتی تھیں، اُن کے بچّوں پر حرامزدگی کا کلنک کا ٹیکہ لگا ہوتا تھا، وہ باپ کی جائداد میں سے ایک حصّے کے بھی حقدار نہ ہوتے تھے اور سماج میں ذات پات سے خارج شمار کئے جاتے تھے۔

اُونچے طبقے کے مردوں کی نیچے طبقے کی عورتوں سے شادیاں جن میں ایک شرطِ نکاح یہ ہوتی تھی کہ اولاد کو کوئی حقِ وراثت نہ پہنچے گا اور ایسی شادیاں جن میں اس اَمر کی علامت کے طور پر کہ بیوی کو اور اس کی اولاد کو کوئی حقوقِ وراثت نہیں، دُولہا اپنا بایاں ہاتھ دُلہن کو تھما دیتا تھا، دونوں طرح کی شادیاں صرف اعلیٰ طبقے ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ عام تھیں، اور تو اور پادری لوگ بھی اپنے عہدِ تجرّد کو بھول کر ایک سے زیادہ شرعی یا غیر شرعی شادیاں کیا کرتے تھے۔ تاریخ حتمی طور پر ثابت کرتی ہے کہ پچھلے چند سالوں سے پیشتر تعدّدِ ازدواج کو اتنا معیوب نہ سمجھا جاتا تھا جتنا اب سمجھا جاتا ہے۔ اوروں کا تو تذکرہ ہی کیا، خود

سینٹ اگسٹین[1] (St. Augustine) کو اس میں کوئی بنیادی خرابئ اخلاق یا معصیت نظر نہ آئی تھی، چنانچہ انھوں نے اعلان کیا کہ اگر وہ کسی ملک میں قانوناً جائز تھی تو اُسے شرعی تباہی میں شمار نہ کرنا چاہیئے۔ ہیلم (Hallam) کے قول کے مطابق جرمن مصلحین نے ابھی سولھویں صدی میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ ہونے کی صورت میں یا اسی طرح کے اور اسباب کی بناء پر دوسری شادی بلکہ تیسری بھی جائز ہے۔

بعض محققین، اگرچہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ تعدد ازدواج میں کوئی بنیادی خرابئ اخلاق نہیں اور حضرت عیسیٰؑ نے قطعاً یا صراحتہً اس کی ممانعت نہیں کی، تاہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ یک زوجگی کا جو دستور یورپ میں آجکل عام ہے وہ عیسائیت پر جرمن اور یونانی و رومی خیالات کا پیوند لگ جانے کا نتیجہ ہے[2] یہ رائے تاریخی واقعات کے منافی ہے اور قابل تسلیم نہیں۔ جہاں تک جرمنوں کا تعلق ہے، اس دعوے کی تائید کہ اُن کے یہاں ہمیشہ سے یک زوجگی کا دستور تھا صرف دو ایک رُومیوں کی غیر مصدقہ شہادت سے ہوتی ہے، جس کا اعتبار اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ واقعات کے معاملے میں رُومی بالکل غیر معتمد گواہ تھے اور اگر اخفائے حقیقت سے انھیں کوئی ذاتی فائدہ متوقع ہوتا تو کبھی اس سے گریز نہ کرتے تھے۔ علاوہ بریں ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر ٹیسی ٹس (Tacitus) نے اپنی کتاب "جرمنوں کے طور طریقے" (The manners of the Germans) لکھی وہ کیا تھا۔ یہ کتاب خود رومیوں کی شہوت پرستی پر ایک حملہ تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ بربروں کے فرضی محاسن سے رومیوں کے پست اخلاق کا موازنہ کر کے رُوم کے معاشرے کو بہتر خیالات سے روشناس کرایا جائے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ

---

[1] St. Augustine, lib.ii cont, Faust ch. xvii

[2] M. Barthelemy. St Hilaire کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ یک زوجگی کا دستور عیسائیت نے یونانیوں اور رومیوں سے اخذ کیا۔

ٹیسی ٹس کی رائے درست تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جرمنوں کے اعلیٰ طبقوں میں اُنیسویں صدی تک تعدّدِ ازدواج کا جو عام رواج تھا اس کی توجیہہ کیونکر کی جا سکتی ہے؟[1]

ابتدائی زمانے میں رومیوں کے یہاں جو رواج بھی رہا ہو یہ واضح ہے کہ جمہوریتِ روما کے آخری ایام میں اور سلطنتِ روما کے آغاز میں تعدّدِ ازدواج یقیناً ایک تسلیم شدہ رواج تھا یا کم از کم خلافِ قانون نہ سمجھا جاتا تھا۔ جس فرمان نے اس رواج کی عمومیت کو محدود کیا اس میں اس کا وجود اور اس کی مشق دونوں مفروض ہیں۔ یہ فرمان اس خرابی کو رفع کرنے میں یا رائے عامہ کی رَو کا رُخ بدلنے میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ ایک طرف تو اس سے ظاہر ہے کہ شہنشاہان اونوریس (Honorius) اور آرکیڈیس، (Arcadius) نے چوتھی صدی عیسوی کے اخیر میں اسے از سرِ نو جاری کیا اور دوسری طرف اس سے کہ قسطنطین اور اس کے بیٹے دونوں کے متعدد بیویاں تھیں۔ شہنشاہ ویلنٹینین ثانی (Valentinian) نے ایک نئے فرمان کے ذریعے سلطنت کے تمام مردوں کو متعدد بیویاں رکھنے کی عام اجازت دی۔ اس زمانے کی تاریخ کلیسا سے اس امر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ بشپوں اور عیسائی گرجاؤں کے سربراہوں نے اس قانون پر کوئی اعتراض کیا تھا۔ کلیسا کا اعتراض کرنا تو بجائے خود رہا، ویلنٹین کے بعد جتنے شہنشاہ آئے سب نے تعدّدِ ازدواج پر عمل کیا اور لوگوں نے ان کی مثال کی تقلید میں کوتاہی نہ کی۔

قانون کی یہ صورتِ حال شہنشاہ جسٹینین (Justinian) کے وقت تک برقرار رہی، جب اس دانشمندی اور تجربہ کاری نے جو ترقی اور نشوونما کی تیرہ صدیوں کا جمع شدہ

---

[1] مقابلہ کے لیے دیکھیے: Encyclopedie Universelle, art, Mariage

Enc univ, Art. Mariage and [2]

Devenport *Apology for Mahomet*,

ماحصل تھی اپنے آپ کو اُن قوانین کی صورت میں ظاہر کیا جنھوں نے اس شہنشاہ کے بدنام دورِ حکومت پر ایک جھوٹا ملمع چڑھا دیا۔ لیکن یہ قوانین کم از کم براہِ راست عیسائیت کے مرہونِ منت نہ تھے۔ جسٹینین کا سب سے نمایاں مشیر ایک ملحد تھا۔ جسٹینین نے تعددِ ازدواج کو قانوناً ممنوع کر دیا، لیکن اس کی طرف لوگوں کا جو عام رجحان تھا اس کی روک تھام نہ کر سکا۔ قانون فکری ترقی کا آئینہ دار تھا۔ اس کا اثر چند اربابِ فکر تک محدود رہا۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا اُن کے لیے وہ محض ایک تقویم پارینہ تھا۔

یورپ کے مغربی حصے میں بربریوں کے زبردست ہنگامے اور اُن کے اخلاقی خیالات کے مقامی لوگوں میں نفوذ کر جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلقات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ بعض بربریوں کے قانونی ضابطوں میں تعددِ ازدواج[1] سے متعلق پابندیاں تھیں۔ لیکن قول کی بہ نسبت عمل زیادہ مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ اُن کے بادشاہوں نے بہت سی بیویاں کرنے کی جو مثال پیش کی عوام الناس نے فوراً اس کی تقلید کی[2] اور تو اور پادری لوگ بھی، اس کے باوجود کہ کلیسا انھیں تجرد کی تلقین کرتا تھا، متعدد نیم منکوحہ بیویوں کے رواج سے مستفید ہونے لگے۔ اس کے لیے مقامی بشپ یا مقامی (Diocese) کے سربراہ کی اجازت کافی ہوتی تھی[3]۔

عیسائی مصنفین کو اسلام کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں اُن میں سب سے زیادہ تشنیع طلب یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے تعددِ ازدواج کی داغ بیل

---

[1] تھیوڈورک کے قوانین کی طرح لیکن یہ ضابطے بازنطینی تصورات پر مبنی تھے۔

[2] میرووِنگین اور کارلوونگین سلاطین میں جو تعددِ ازدواج رائج تھا اس کا تذکرہ A Short Hist of the Saracens, (p.626) میں دیکھئے۔

[3] Hallam. *Cone. Hist of England*, vol. i, p. 87, and note, *Middle Ages*, p. 353 (vol. ed.)

ڈالی یا اُسے قانونی حیثیت دی۔ یہ خیال کہ وہ اس کے مؤجد تھے محض جہالت کا نتیجہ اور ثبوت تھا اور تحقیق نے اس کی دھجیاں اُڑا دی ہیں، لیکن یہ خیال اب بھی نہ صرف عیسائی دنیا کے عوام میں بلکہ بہت سے ارباب علم میں رائج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دستور کو اختیار کیا اور اُسے قانونی جواز بخشا۔ اس سے بڑھ کر باطل کوئی عقیدہ نہیں ہو سکتا۔

تعدّدِ ازدواج نہ صرف عربوں کے یہاں بلکہ ہمسایہ ملکوں کے لوگوں کے یہاں رائج تھا اور مؤخر الذکر کے یہاں تو اس نے نہایت کریہہ شکلیں اختیار کر رکھی تھیں۔ یہ بجا ہے کہ عیسائی مملکت کے قوانین نے اس خرابی کے رفع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔ تعدّدِ ازدواج کی رسم روک ٹوک کے بغیر جاری رہی۔ پہلی بیوی کے سوا، جسے محض تقدّمِ زمانی کے طفیل ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوتی تھی، باقی سب بیویوں کو عدمِ حقوق کی سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ظہور کے وقت ایران میں خرابیٔ اخلاق نہایت افسوسناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ازدواج کے بارے میں کوئی مسلّم قانون نہ تھا اور اگر تھا بھی تو اُس پر مطلق عمل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ژند اوستا میں بیویوں کی کوئی حد مقرر نہ کی گئی تھی لہٰذا ایرانیوں کے نہ صرف بیک وقت متعدد بیویاں ہوتی تھیں بلکہ اُن کے علاوہ لا تعداد داشتہ عورتیں بھی۔[1]

قدیم عربوں اور یہودیوں کے یہاں متعدد بیویوں کے علاوہ مشروط اور عارضی عقد بھی ہوتے تھے۔ عائلی اخلاق کے بارے میں اس ڈھیل نے معاشرے کے نظام پر نہایت مضر اثر ڈالا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جو اصلاحات کیں اُن سے عورتوں کی حیثیت بدرجہا بہتر ہو گئی۔ کیا یہودی اور کیا بدوی عرب دونوں کے یہاں عورتوں کی حالت نہایت

---

[1] Dollinger, The Gentile the Jew, vol. i, p 406

خستہ و خراب تھی۔ ایک یہودی بددی لڑکی اپنے والد کے گھر میں بھی ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی۔ سِنِ بلوغ سے پہلے اس کے والد کو اختیار ہوتا تھا کہ جی چاہے تو اُسے بیچ ڈالے۔ باپ کی وفات کی صورت میں بھائیوں کو یہ اختیار حاصل ہو جاتا تھا۔ بیٹی کو ورثے میں ایک حبہ نہ جُڑتا تھا، الاّ اس صورت کے کہ کوئی مرد وارث ہی نہ ہو[1]۔ شہری عرب کفّار کے یہاں، جن پر اردگرد کی مملکتوں کے فاسد اور انحطاط یافتہ تمدن کا اثر ہو چکا تھا، عورت محض ایک چیز بِلست سمجھی جاتی تھی، اور اپنے خاوند یا باپ کی جائداد کا ایک حصہ شمار کی جاتی تھی۔ چنانچہ ایک متوفی مرد کی بیوائیں دوسرے املاک کی طرح اُس کے بیٹوں کو ورثے میں ملتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھیں وہ سوتیلے بیٹوں اور سوتیلی ماؤں کی آپس میں شادیاں جنھیں اسلام نے نکاح المقت (شرمناک یا مکروہ نکاح) کے نام سے مطعون کر کے منع کر دیا۔ یمن کے نیم یہودی اور نیم صابی قبیلوں کے یہاں تو ایک عورت کے بیک وقت بہت سے مردوں کی بیوی ہونے کا دستور بھی تھا[2]۔

اعراب جاہلیت کو عورتوں سے اس درجہ نفرت تھی کہ وہ اکثر اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ یہ خوفناک دستور قریش اور کندہ کے قبیلوں میں سب سے بڑھ کر رائج تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ وآلہٖ وسلّم نے غضب آمیز الفاظ میں اس کی مذمت کی اور سخت سزائیں مقرر کر کے اس کا اسی طرح انسداد کیا جس طرح انھوں نے بچّوں کو بتوں کی بھینٹ چڑھانے کی رسم کا قلع قمع کیا، جس پر قریش و کندہ کے قبیلے قدیم زمانے کی اکثر قوموں کی طرح عمل کرتے تھے۔

ایرانی اور بازنطینی مملکتوں میں عورتوں کا معاشرتی درجہ بے حد پست تھا۔ بہت سے مذہبی دیوانے جنھیں بعد کے زمانوں میں کلیسا نے ولایت کا رتبہ بخشا، اُن کے خلاف

---

[1] گنتی۔ باب ۲۷۔

[2] Lenormont, *Ancient Hist. of the East*, vol. ii, p. 318

وعظ کرتے تھے اور ان کی خباثتیں بیان کرتے تھے۔ وہ یہ بھول جایا کرتے تھے کہ انھیں عورتوں میں جو بُرائیاں دکھائی دیتی تھیں وہ اُن کے متعصّب دماغوں کی پیداوار تھیں۔ ایسے وقت میں، جب معاشرے کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا، جب وہ تمام رشتے جنھوں نے معاشرے کو اُستواری بخشی رکھی تھی ٹوٹ رہے تھے، جب ہر طرف سے یہ شور اُٹھ رہا تھا کہ تمام پرانے نظاموں کو تجربے کی ترازو میں تول کر دیکھا گیا اور سب کے سب ناقص پائے گئے ــــ ایسے وقت میں پیغمبرِ اسلامؐ کی اصلاحات عورتوں کے حق میں ایک آیۂ رحمت بن کر آئیں۔

پیغمبرِ اسلامؐ کی مذہبی تعلیمات کا ایک بنیادی عنصر عورتوں کا احترام تھا۔ آپؐ کے متبعین کے دلوں میں آپؐ کی دُخترِ نیک اختر کی جو عزت تھی اس کی بناء پر انھوں نے اُسے "خاتونِ جنت" کا لقب دیا، جو صنفِ اِناث کی خدمت میں ایک خراجِ عقیدت تھا۔ "فاطمۃ الزہرا" اُن تمام قدسی صفات کا مجسمہ تھیں جو خدا نے عورت کی ذات میں ودیعت کی ہیں، یعنی خلوص، صداقت اور پاکیزگی اور تمام وہ صفاتِ محمودہ جو انسان کے مثالی کمال کی آئینہ دار ہیں ــــ اُن سے ایسی خواتین کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جن کے محاسن و فضائل نے صنفِ اِناث کو چار چاند لگا دیئے ــــ کون ہو گا جس نے ربیعہ، رابعہ اور اُن کی قبیل کی ہزاروں نیک بی بیوں کا نام نہ سُنا ہو؟

جو قوانین رسُولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے نافذ کیے اُن میں آپؐ نے مشروط نکاحوں کا قاعدہ قطعاً ممنوع قرار دیا۔ جہاں تک عارضی نکاحوں کا تعلق تھا، اگرچہ شروع شروع میں علانیہ مخالفت نہ کی گئی، لیکن تیسرے سنہ ہجری میں یہ بھی حرام کر دی گئیں[1]

---

[1] شیعوں کا ایک گروہ عارضی نکاحوں کو اب بھی مباح قرار دیتا ہے، لیکن جن مجتہدین نے اس رائے کا اظہار کیا ہے، اگرچہ میں اُن کا احترام کرتا ہوں، تاہم میں یہ خیال کرنے پر مجبور ہوں کہ یہ رائے وقتی مذاق کی تسکین یا سلاطینِ وقت کو خوش کرنے کی خاطر ظاہر کی گئی تھی۔ ان مجتہدین کی آراء میں جا بجا ذاتی میلانات کے آثار پائے جاتے ہیں۔

حضرت محمدؐ نے اپنے آئینی نظام میں عورتوں کو ایسے حقوق عطا کیے جو اس سے پہلے انھیں کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ آپؐ نے انھیں ایسی ایسی خصوصی مراعات بخشیں جن کی قدر شناسی زمانہ کچھ اور ترقی کرنے کے بعد کرے گا۔ آپؐ نے تمام قانونی اختیارات و وظائف میں عورتوں کو مردوں کے برابر مرتبہ بخشا۔ انھوں نے بیویوں کی تعداد کی شرعی حد مقرر کرکے اور سب بیویوں سے مساوی سلوک کی شرط شوہروں پر عائد کرکے تعدّدِ ازدواج پر پابندیاں لگا دیں۔ یہ قابلِ ملاحظہ ہے کہ قرآن کی جو آیت بیک وقت چار بیویوں کی اجازت دیتی ہے اس کے فوراً بعد ایک ایسا جملہ ہے جو اس آیت کے دائرہ اطلاق کو مناسب طور پر محدود کر دیتا ہے۔ آیت یہ ہے: "اور عورتوں میں سے جو تمھیں بھائیں دو، تین یا چار بیویاں کر سکتے ہو"، اس کے بعد کا جملہ یہ ہے: "لیکن اگر تم سب کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہیں کر سکتے تو تمھیں صرف ایک ہی عورت پر اکتفا کرنا چاہیے۔" دنیائے اسلام کے اکابر مفکرین نے بالخصوص اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ لفظ "عدل" کے معنی محاورۂ قرآن میں کیا ہیں اس جملہ شرطیہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ "عدل" سے عبارت صرف مکان، لباس اور دوسری خانگی ضروریات کے معاملے ہی میں مساوات سلوک نہیں، بلکہ محبت، شفقت اور عزت کے معاملے میں بھی مکمل مساوات۔ چونکہ جذبات کے معاملے میں کامل عدل و انصاف ناممکن ہے لہٰذا قرآن کا یہ حکم فی نفسہٖ ایک ممانعت ہے۔ یہ تفسیر زمانۂ حال کی نہیں، بلکہ تیسری صدی ہجری میں کی گئی۔[1] خلیفہ المامون کے عہد میں اولین حکمائے معتزلہ نے یہ رائے ظاہر کی کہ تکمیل یافتہ شریعت قرآنی وحدتِ ازدواج کا تقاضہ کرتی ہے۔ اگرچہ خلیفہ متوکل کے مجنونانہ تعصب نے اس سے جو مظالم کروائے انھوں نے اس تعلیم کی اشاعت کو روک دیا۔ تاہم تمام

---

[1] ردالمحتار میں صراحتہً لکھا ہے "بعض حکماء (معتزلہ) یہ رائے رکھتے ہیں کہ عدل میں محبت و شفقت کی مساوات شامل ہے، لیکن ہمارے ائمہ اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں اور عدل کو نفقہ کے معاملے میں مساوی سلوک تک محدود خیال کرتے ہیں جس سے قانون کی زبان میں کھانا، کپڑا اور مکان مراد ہے۔"

ترقی یافتہ مسلم جماعتوں میں یہ یقین رفتہ رفتہ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ تعدّدِ ازدواج تعلیماتِ محمدیؐ کے اسی قدر منافی ہے جس قدر وہ تہذیب و تمدّن کی عمومی ترقی کے منافی ہے۔[1]

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعدّدِ ازدواج کا وجود حالات پر منحصر ہے بعض بعض اوقات اور بعض بعض حالات میں یہ عورتوں کو بھوک ننگ اور ناداری سے بچانے کی خاطر بالکل ناگزیر ہوتا ہے۔ اگر اخبار و اطلاعات اور اعداد و شمار واقعات کی سچّی آئینہ داری کرتے ہیں تو مغرب کے تہذیبی مرکزوں میں جو فسق و فجور پایا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ انتہائی افلاس و ناداری کا نتیجہ ہے۔ ایبے ہُک (Abbe Huc) اور لیڈی ڈف گورڈن Lady Duff Gordon دونوں کا کہنا ہے کہ مشرق میں محض حالات کا دباؤ لوگوں کو تعدّدِ ازدواج کی مشق پر مجبور کر دیتا ہے۔

فکری ترقی کے ساتھ ساتھ، حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ، تعدّدِ ازدواج کی ضرورت ناپید ہوتی جاتی ہے اور اس کی مشق یا خود بخود متروک ہو جاتی ہے یا علی الاعلان ممنوع قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن مسلم ممالک میں جہاں وہ حالات جنھوں نے اس کے وجود کو لازمی بنایا تھا معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ تعدّدِ ازدواج کو مذموم اور تعلیماتِ قرآنی کے نقیض سمجھا جانے لگا ہے۔ لیکن جن ممالک میں معاشرے کے حالات مختلف ہیں اور جہاں عورتوں کو وہ وسائل مہیا نہیں، جو ترقی یافتہ جماعتوں میں انھیں اپنی مدد آپ کرنے کی قابلیت بخشتے ہیں، وہاں ناگزیر ہے کہ تعدّدِ ازدواج کا وجود برقرار رہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ چونکہ یہ آزادی تاویل سوفسطائی ذہنیت سجیوں کی گنجائش چھوڑتی ہے، اس لیے تعدّدِ ازدواج کی مطلق ممانعت ایک مشکل کام ثابت ہوگی۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ ایک زوردار اعتراض ہے، جو اُن تمام مسلمانوں کی توجہ کا مستحق ہے جو اسلامی تعلیمات کو اس الزام سے بَری کرنا چاہتے ہیں جو اُن پر کیا گیا ہے اور ترقی تہذیب کے دوش بدوش قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ قوانین میں لوچ اور لچک کا ہونا اُن کی

---

[1] اس موضوع پر مولوی چراغ علی کا فاضلانہ مقالہ قابلِ ملاحظہ ہے۔

منفعت و افادیت کا سب سے بڑا معیار ہے۔ یہی تعدّدِ ازدواج کے موضوع پر قرآن کے حکم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ حکم متمدّن سے متمدّن معاشرے کے لیے بھی اور کم سے کم متمدّن معاشرے کے لیے بھی موزوں ہے۔ یہ نہ ترقی پذیر جماعتوں کی ضروریات کو نظرانداز کرتا ہے، نہ اس امر کو فراموش کر دیتا ہے کہ دنیا میں ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں جن کے لیے یک زوجگی ایک بہت بڑی خرابی ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال تعدّدِ ازدواج کا استیصال اتنا مشکل نہیں جتنا تصوّر کیا جاتا ہے۔ مسلمان جس لعنت میں گرفتار ہو گئے ہیں وہ محض اس قدامت پرستی کا نتیجہ ہے جس نے اجتہاد کو مسدود کر دیا ہے۔ وہ دن دُور نہیں جب معلّمِ اسلام کے اپنے ارشادات سے رجوع اس مسئلے کا فیصلہ کر دے گا کہ آیا مسلمان ارشاداتِ نبویؐ پر عمل کریں گے یا متقدمین فقہا کی تفسیروں پر، جنھوں نے اپنے من مانے خیالات منوانے کی خاطر یا اُن خلفا و سلاطین کے، وہ بندگانِ فرمان تھے اُن کی خود سرانہ آرا کی تائید کے لیے شارع کے الفاظ کا مطلب عمداً ماؤف کیا ہے۔ یورپ اس عمل میں سے گزر چکا ہے۔ اُسے چاہیے کہ دینِ محمدیؐ کو تبرّاؤں کا تختۂ مشق بنانے کی بجائے تجدید یافتہ اسلام کی ان کوششوں کا تحمّل و ہمدردی سے مشاہدہ کرے جو وہ قدامت پرستی کے بندھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے کر رہا ہے۔ جب پرانے خیالات کی غلامی سے آزادی حاصل ہو گئی تو ہر مسلم مملکت کے اربابِ فقہ کے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ ایک مستند فتوے کے ذریعہ اپنی اپنی مملکت میں تعدّدِ ازدواج کو ممنوع قرار دے دیں۔ لیکن یہ اس وقت ممکن ہو گا جب حالات و واقعات اور پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات کے سمجھنے میں عام ترقی ہو گی۔ جس نئی روشنی میں آپؐ کے ارشادات کا مطالعہ کیا جا رہا ہے وہ تعدّدِ ازدواج کو تاریکی کی طرح دُور کر رہی ہے۔

جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، یہ امر کہ تعلیماتِ محمدیؐ ترقی کے ہر مرحلے سے مطابقت رکھتی ہیں اُن کے معلّم کی حکمتِ بالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ غیر ترقی یافتہ جماعتوں میں تعدّدِ ازدواج بشرطیکہ اُن پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے جو پیغمبرِ اسلامؐ نے عائد کی ہیں، کسی طرح بھی ایک تاسف انگیز خرابی نہیں۔ بہرکیف وہ چند شوہری Polygamy کے رواج پر، جو ہر طرح کے اخلاقی ضبطِ نفس کو ترک کر دینے کی نشانی ہے، قابلِ ترجیح ہے۔ جیسے جیسے تمدّن میں ترقی ہوتی جاتی ہے تعدّدِ ازدواج میں جو خباحتیں ہیں اُن کی حقیقت اور اس کی ممانعت کی حکمت زیادہ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہم یہ کہنے کو کسی طرح تیار نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے برہمنی قوموں کے ساتھ، جن کے یہاں تعدد ازدواج کی بے انتہا آزادی تھی، اختلاط کر کے کوئی اچھا سبق سیکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس اختلاط کی بدولت اُن کے اخلاقی خیالات میں رکاکت آگئی ہے۔ ان کے یہاں انسانی وقار اور روحانی پاکیزگی کا جو تصور تھا وہ پست ہو گیا ہے اور طوائفوں کا طبقہ اُن کے یہاں اتنا ہی مقبول ہو گیا ہے جتنا وہ ان کے غیر مسلم ہمسایوں کے یہاں تھا۔ اس کے باوجود ایسے آثار نمایاں ہیں جن سے اُمید ہوتی ہے کہ جس نورِ حق نے ساتویں صدی عیسوی میں عرب کو منوّر کیا تھا وہ ایک دن اُن کے دلوں پر بھی جلوہ افگن ہوگا اور جس تاریکی میں وہ گھرے ہوئے ہیں اُس سے اُنھیں نجات بخشے گا۔ معتزلہ عقیدۂ یک زوجگی کے حامی تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق ایک عورت کے ساتھ عقد برقرار ہونے کی صورت میں کسی دوسری عورت کے ساتھ عقد شرعاً ناجائز تھا، دوسرے الفاظ میں جو عقد معتزلہ کے قوانین کے مطابق کیا جائے وہ بہمہ وجوہ ایک مرد کا ایک عورت کے ساتھ عقد ہے، تاحینِ حیات اور باخراجِ ہمہ دیگراں۔

اور تو اور، قدامت پرست فرقوں کے یہاں بھی ایک کثیر التعداد اور صاحبِ اثر طبقہ ایسا ہے جو تعددِ ازدواج کو منافیٔ شرع خیال کرتا ہے، کیونکہ جن حالات نے اُسے اگلے زمانے میں جواز بخشا تھا وہ اب بدل گئے ہیں یا یکسر ناپید ہو گئے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ تعددِ ازدواج کی مخالفت ایک زبردست اخلاقی جذبہ نہیں بنی تو کم از کم ایک قوی اجتماعی جذبہ ضرور بن گئی ہے اور یہ جذبہ بہت سے خارجی حالات سے مل کر ہندوستان کے مسلمانوں میں سے اس رواج کا ازالہ کر رہا ہے۔ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں یہ دستور ہو چلا ہے کہ نکاح نامے میں ایک شرط شامل کی جاتی ہے جس کے مطابق خاوند اپنے اس مفروضہ حق سے کہ وہ اپنی پہلی شادی کے قیام کے دوران دوسری شادی کر سکتا ہے دست بردار ہو جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت بیجا نوے فی صد مرد، خواہ ازروئے عقیدہ یا بتقاضائے مجبوری، ایک ہی بیوی کے شوہر ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں، جو اپنے اسلاف کی تاریخ سے واقف ہیں، اور دوسری ملتوں کی تاریخ سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، تعددِ ازدواج کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایران میں آبادی کا محض ایک چھوٹا سا حصہ متعدد بیویوں کی مشتبہ عشرت

متمتع ہوتا ہے[1] اُمیدِ واثق ہے کہ بہت جلد علمائے اسلام کی ایک مجلسِ افتتا اس امر کا اعلان کر دے گی کہ غلامی کی طرح تعددِ ازدواج بھی شریعتِ اسلامیہ میں مکروہ ہے۔

آیئے اب ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شادیوں پر ایک نظر ڈالیں جنھیں بہت سے ایسے لوگوں نے جو یا تو حقیقتِ حال سے ناواقف تھے یا واقعات کا دیانت دارانہ جائزہ لینے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف وجہِ الزام ٹھہرایا ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے عیسائی مخالفین کہتے ہیں کہ آپؐ نے ذاتی طور پر ایسی خصوصی روایات سے فائدہ اٹھایا جو شرعاً مباح نہ تھیں، اور یوں ایک ایسی کمزوری کا ثبوت دیا جو منصبِ نبوت کے شایانِ شان نہ تھی لیکن اگر تاریخ کا صحیح مطالعہ کیا جائے اور واقعات کا بے تعصبانہ جائزہ لیا جائے تو حتمی طور پر ثابت ہو جائے گا کہ عیش پرست ہونا تو کجا، آپؐ نے غریبی اور بے مائگی کی حالت میں ایک قدیم آبائی رواج کے مطابق بے آسرا عورتوں سے شادی کر کے اور اپنے آپ کو اُن کے نان و نفقہ کا کفیل بنا کر ایک ایثارِ عظیم کا ثبوت دیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانی نقطۂ نگاہ سے اغراض و محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو اس "عظیم الشان عرب" پر جو الزام لگائے گئے ہیں ان کی بے بنیادی اور بدنیتی ظاہر ہو جائے گی۔ جب محمد صلعم پچیس سال کے جوان تھے تو آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کی جو آپؐ سے عمر میں بہت بڑی تھیں۔ پچیس سال تک حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپؐ کی ازدواجی زندگی مہر و وفا اور راحت و مسرت کا ایک سلسلۂ شبانہ روز تھی۔ کفار نے آپؐ کی شان میں گستاخیاں کیں اور آپؐ پر جو مظالم توڑے اُن کے دوران حضرت خدیجہؓ آپؐ کی واحد غمگسار و مددگار تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے وقت نبی کریمؐ کی عمر پچاس برس کی تھی۔ آپؐ کے دشمن اس سے انکار نہیں کر سکتے بلکہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ اس طویل مدت میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس سے آپؐ کے اخلاق پر معاذ اللہ کوئی دھبہ لگتا ہو۔ حضرت خدیجہؓ کی زندگی میں حضرت محمدؐ نے کوئی دوسری شادی نہیں کی، اس امر کے باوجود کہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو رائے جمہور اسے جائز قرار دیتی۔

---

[1] Col. Macgregor کے قول کے مطابق صرف دو فی صد۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے چند ماہ بعد جب آپؐ بیکسی و مظلومی کے عالم میں طائف سے واپس آئے تو آپؐ نے حضرت سودہ کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔ حضرت سودہ سکران کی بیوہ تھیں، جو قبولِ اسلام کے بعد کفّار کے ظلم و ستم سے بچنے کی خاطر ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تھے اور وہاں اپنی بیوی کو بے وسیلہ و نادار چھوڑ کر غریب الوطنی کی حالت میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ ملک کے رواج کے مطابق شادی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے آنحضرتؐ اپنے وفا شعار صحابی کی بیوہ کو اپنی پناہ میں لے سکتے تھے۔ عطا و احسان اور انسانیت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ انھیں اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دیں۔ حضرت سودہؓ کے پہلے خاوند نے دینِ حق کی خاطر ترکِ وطن کیا تھا اور اس پر اپنی جان نثار کردی تھی۔ اُن کی بیوی مصائبِ غریب الوطنی میں اُن کی شریک رہی تھیں اور اب بے کس و بے نوا اپنے وطن واپس آئی تھیں محض انھیں آسرا دینے کی خاطر آپؐ نے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا، اگرچہ اس وقت آپؐ خود نانِ شبینہ کو محتاج تھے۔

عبد اللہ بن ابو قحافہ، جو بعدہٗ تاریخ میں ابوبکرؓ کے اسم مبارک سے مشہور ہوئے، عاشقانِ رسولؐ میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ آپؓ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے سب سے پہلے داعئ اسلام کو لبیک کہا۔ انھیں رسولِ اکرمؐ سے جو مخلصانہ عقیدت اور جاں نثارانہ محبت تھی اس میں وہ حضرت علیؓ کے حریفِ مساوی شمار کیے جا سکتے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی ایک کم عمر بیٹی تھی، جس کا نام عائشہ تھا اور اُن کی دلی تمنا تھی کہ انھیں پیغمبرِ اسلامؐ سے، جنھوں نے انھیں کفر کی تاریکی سے نکالا تھا، جو محبت و عقیدت تھی اپنی بیٹی کو پیغمبرؐ کی زوجیت میں دے کر اس کا رشتہ اور بھی استوار کریں۔ حضرت عائشہؓ کی عمر اس وقت صرف سات سال کی تھی لیکن ملک کا رواج اس کم عمری میں شادی کی اجازت دیتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے اصرار پر آنحضرتؐ نے اس کمسن لڑکی کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

مہاجرین کے وردِ مکّہ کے کچھ عرصہ بعد ایک واقعہ رُونما ہوا جس سے عربوں کے اس وقت کے حالاتِ زندگی پر بہت سی روشنی پڑتی ہے۔ جو لوگ عربوں کے خصائل و عادات

سے واقف ہیں "غرور، عربدہ جوئی، حمیّتِ جاہلیت اور انتقام لینے میں انتہا درجے کی غضب ناکی بھی اور صبر بھی") وہ لوگ اس واقعے کے معنی پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ برٹن Burton عربوں کے بارے کہتا ہے کہ: "اب بھی ذرا سی بات پر بدوی قبیلوں کے درمیان پشتینی عداوتیں شروع ہو جاتی ہیں" حضرت عمر ابن الخطاب، جو بعد میں خلیفۂ ثانی ہوئے، کی ایک بیٹی تھی، حفصہ نام۔ اس نیک بی بی کا خاوند غزوۂ بدر میں شہید ہو گیا تھا اور چونکہ وہ اپنے باپ کی طرح شعلہ مزاج تھی، اس لیے کسی کو اس سے شادی کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی، یہ امر حضرت عمرؓ کے لیے بہت رنج کا باعث تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور پھر حضرت عثمانؓ کو پیغام دیا۔ دونوں میں سے کسی نے رضامندی ظاہر نہ کی۔ حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار گزرا۔ چنانچہ وہ غم و غصہ کے عالم میں آستانۂ نبوی پہ نالش لے کر پہنچے، کیونکہ اس میں اُن کی عزت کا سوال تھا۔ لیکن نہ حضرت ابوبکرؓ نے اور نہ حضرت عثمانؓ نے ہامی بھری۔ یہ قضیہ ہمیں چاہے کتنا ہی مضحکہ خیز دکھائی دیتا ہو، لیکن مومنین کی چھوٹی سی جماعت میں ہل چل پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان حالات میں سردارِ مومنین نے حضرت حفصہؓ کو اپنے نکاح میں لا کر حضرت عمرؓ کا غصہ فرو کیا اور رائے عام نے نہ صرف اس کو سراہا بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تین اور بیویاں یعنی حضرت ہندؓ اُمِ سلمہؓ، حضرت اُمِ حبیبہؓ اور حضرت زینب اُمّ المساکینؓ بھی کُفّار کے ہاتھوں بیوہ ہوئی تھیں اور اُن کے اقربا و اُن کا بارِ کفالت قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے آزاد کردہ غلام زید کی شادی ایک عالی نسب خاتون، زینب نامی سے کی تھی، جو قریش کے دو ممتاز ترین خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ فخرِ نسب کی وجہ سے اور غالباً غرورِ حُسن کی وجہ سے بھی حضرت زینب ایک آزاد کردہ غلام کی زوجیت میں خوش نہ تھیں۔ میاں بیوی کے تعلقات گرٹتے بگڑتے باہمی نفرت کی حد تک پہنچ گئے۔ ممکن ہے کہ جہاں تک حضرت زیدؓ کا تعلق تھا، انھیں حضرت زینب سے جو رنجیدگی تھی اس میں اس امر نے اضافہ کر دیا کہ حضرت زینبؓ ازراہِ فخر چند ایسے الفاظ کو جو ایک بار نبی کریم کے مُنہ سے انھیں دیکھ کر نکلے تھے، آئے دن دہرایا کرتی تھیں۔ ہُوا یہ تھا کہ آنحضرتؐ ایک دن زیدؓ کے گھر گئے تھے اور وہاں حضرت زینبؓ کو بے نقاب دیکھ کر آپؐ نے فرمایا تھا:

"سبحان اللہ مقلب القلوب" یہ الفاظ ایسے ہی تھے جیسے کوئی خوبصورت تصویر یا مجسمہ دیکھ کر آج کل کے کسی مسلمان کے منہ سے نکلیں گے۔

حضرت زینبؓ ان الفاظ کو، جو بطریق استحسان قدرتی طور پر آنحضرتؐ کے منہ سے نکلے تھے، بار بار یہ جتانے کی خاطر کہ خود پیغمبرِ خدا نے ان کے حسن و جمال کی تعریف کی تھی دہرایا کرتی تھیں، جس سے حضرت زیدؓ کو مزید رنج ہوتا تھا۔ بالآخر حضرت زیدؓ نے ان سے علیحدگی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آنحضرتؐ کی خدمت میں طلاق کی اجازت لینے کے لئے حاضر ہوئے۔ آنحضرتؐ نے پوچھا "کیوں کیا تمھیں اس میں کوئی نقص دکھائی دیا ہے؟" حضرت زیدؓ نے جواب دیا "نہیں، مجھے اس میں کوئی نقص دکھائی نہیں دیا، پھر بھی میں اس کے ساتھ رہنے پر راضی نہیں ہوں۔" آنحضرتؐ نے فوراً ارشاد کیا۔ "جاؤ اور اپنی بیوی کی حفاظت کرو، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور خدا سے ڈرو، کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: "اپنی بیویوں کی دیکھ بھال کرو اور خدا سے ڈرو"۔ لیکن زیدؓ اپنے ارادے سے باز نہ آئے اور پیغمبرِ اسلامؐ کی مخالفت کے باوجود انھوں نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ آنحضرتؐ کو اس کا بہت ملال ہوا خصوصاً اس لیے کہ آپ نے بنفسِ نفیس ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستۂ داماں کیا تھا۔

حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ سے طلاق ملنے کے بعد متعدد مرتبہ آنحضرتؐ سے شادی کی التجا کی تا آنکہ ان کی آرزو پوری ہو گئی۔[1]

---

[1] طبری (زوٹن برگ کا ترجمہ، جلد سوم صفحہ ۵۸) اس شادی پر بُت پرستوں نے بہت لے دے کی۔ وہ لوگ اپنی سوتیلی ماؤں اور ساسوں سے تو شادی کر لیتے تھے، لیکن متبنّیٰ کی مطلقہ بیوی سے شادی کو ناجائز سمجھتے تھے (زیدؓ ایک وقت رسولِ اکرمؐ کا متبنّیٰ تھا)۔ لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو دور کرنے کی خاطر کہ تبنیت سے خون کے رشتے کی طرح کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ سورۂ الاحزاب کی چند آیات نازل ہوئیں، جن کی رُو سے کسی کو منہ بولی بہن یا ماں یا منہ بولا بھائی یا باپ بنا کر اس سے تعلقاتِ زناشوئی کو ہمیشہ کے لئے حرام کر دینے کا جو جاہلانہ دستور تھا وہ ختم کر دیا گیا۔ رسولِ اکرمؐ نے اس امر میں جس پاکیزگی سیرت کا ثبوت دیا اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت زینبؓ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

آنحضرتؐ کی ایک اور بیوی کا نام جویریہؓ تھا۔ وہ بنی مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی تھیں، اور ایک لڑائی میں جو بنی مصطلق کی بغاوت فرو کرنے کی خاطر لڑی گئی تھی گرفتار ہوئی تھیں لیکن انھوں نے اپنے گرفتار کرنے والے سے یہ عہد لے لیا تھا کہ وہ ایک مقررہ فدیہ لے کر انھیں رہا کر دے گا۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ سے درخواست کی کہ آپؐ ان کا فدیہ ادا کریں۔ آنحضرتؐ نے فوراً فدیہ ادا کر دیا۔ حضرت جویریہؓ نے اس احسان کا معاوضہ آنحضرتؐ کی زوجیت کی صورت میں ادا کیا۔ مسلمانوں نے جب اس شادی کی خبر سُنی تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بنو مصطلق اب رسولِ خدا کے قرابت دار ہیں اور اب ہمیں اُن سے اس کے مطابق سلوک کرنا چاہیے۔ چنانچہ ہر فتح مند مسلمان نے اُن لوگوں کو رہا کر دیا جنھیں انھوں نے لڑائی میں گرفتار کیا تھا اس طرح ایک سو خاندانوں نے آزادی پا کر اُس نئے عقد کے حق میں دعائے خیر کی[۱]

حضرت صفیہؓ بھی، جو یہودی النسل تھیں، جنگِ خیبر میں ایک مسلمان کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھیں۔ انھیں بھی رسولِ خداؐ نے فدیہ دے کر آزادی دلائی اور اُن کی درخواست پر انھیں اپنی ازواجِ مطہرات کے زُمرے میں شامل کر لیا۔

حضرت میمونہؓ، جن سے آنحضرتؐ نے مکّہ میں شادی کی، آپؐ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھیں اور جب اُن کی شادی آپؐ سے ہوئی تو اُن کی عمر پچاس برس سے اُوپر تھی۔ اس شادی سے صرف یہی نہیں ہوا کہ رسولِ خداؐ نے اپنی ایک غریب رشتہ دار کی گذرِ معاش مہیا کرنے کا ذمہ اپنے سر لے لیا، بلکہ دو مشہور و معروف ہستیاں دائرہٴ اسلام میں آگئیں یعنی حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت خالدؓ بن ولیدؓ۔ مؤخر الذکر جنگِ اُحد میں قریش کی سوار فوج کے امیرِ لشکر تھے اور بعد میں یونان کے فاتح بنے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵) کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے جو محبت و عقیدت تھی اس میں سرِمو فرق نہ آیا۔

[۱] ابن ہشام

بہتھی آنحضرتؐ کے نکاحوں کی نوعیت۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض کی محرک اولادِ نرینہ کی آرزو ہو اور کیوں نہ ہوتی؟ آخر آپؐ ایک بشر ہی تو تھے اور ایک بیٹے کو اپنا نام لیوا چھوڑنے کی خواہش ایک تقاضائے بشری ہی تو تھی۔ اس پر یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ اس توہین آمیز لقب سے مبرا ہونے کے خواہشمند تھے جو آپؐ کے بدترین دشمنوں نے آپؐ کو دیا تھا[1] بہرکیف، واقعات کو سطحی نظر سے بھی دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان شادیوں نے ایسے قبیلوں کو جو ایک دوسرے برسرِ پیکار تھے باہم شیر و شکر اور ملت کے شیرازے کہ مربوط کر دیا۔

ثار یعنی انتقام کا رواج کفارِ عرب میں عام تھا۔ خاندانی دشمنیوں کے ہاتھوں اکثر قبیلے کے قبیلے تباہ ہو جایا کرتے تھے۔ کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس کا کسی اور خاندان سے پشتینی عناد نہ تھا۔ خانہ جنگیوں میں اکثر مرد قتل اور عورتیں اور بچے غلامی کے پھندے میں گرفتار ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل اس لعنت میں مبتلا تھے (جیسا کہ تمام قومیں اپنے ارتقاء کے بعض مراحل میں ہُوا کرتی ہیں) لیکن وہ اس کا قلع قمع نہ کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے پناہ گاہوں (حرم المقدس) کا قاعدہ رائج کر کے اسے ایک قانونی شکل دے دی۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے پاس اس مرض کا ایک بہتر نسخہ تھا۔ آپؐ نے مخالف

---

[1] آنحضرتؐ کے فرزند کی وفات پر آپؐ کے دشمن آپؐ کی شان میں "الابتر" کا گستاخانہ لفظ استعمال کرتے تھے۔ "الابتر" کے لفظی معنی ہیں "دُم کٹا" یعنی "وہ جس کا پیچھا یا نام لیوا کوئی نہ ہو"۔ ہندوؤں کی طرح قدیم عربوں میں بھی بیٹے کے متعلق یہ تصور تھا کہ اُس کی بدولت دیوتاؤں کی برکتیں جاری رہیں گی۔ اور جو شخص کوئی بیٹا نہ چھوڑ جاتا تھا، اُسے انتہا درجے کا بدنصیب سمجھا جاتا تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں جو ناموزوں کلمہ کفّار استعمال کرتے تھے اُس کا یہی مفہوم تھا۔ ملاحظہ کیجیے قرآن۔ سورۂ کوثر (نیز کشّاف)۔ یہی وجہ تھی کہ بُت پرست عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے جس کی مذمت آنحضرتؐ نے سخت الفاظ میں کی۔ دیکھیے قرآن۔ سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۴ وغیرہ۔

خاندانوں اور قبیلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنی ذات کے ساتھ نکاح کے رشتے میں منسلک کر دیا۔ اپنی دعوتِ حق کے اخیر میں، کوہِ عرفات پر کھڑے ہو کر آپؐ نے اعلان کیا کہ اس وقت کے بعد تمام دشمنیاں ختم ہو جانی چاہئیں۔

غیر منصف اور بد طینت دشمنوں نے اُن محرکات کو مسخ کر دیا ہے جنھوں نے ایک قدیم الاصل آبائی رواج کی پیروی میں آنحضرتؐ کو اس پر آمادہ کیا کہ بے کس اور بے آسرا بیواؤں کو وسائل معاش مہیا کرنے کی خاطر اپنی زوجیت میں داخل کریں۔ ان بیواؤں کو اپنے خاندان کے رُکن بنا کر آپؐ نے اُن کے نان و نفقہ کا انتظام اس واحد طریقے سے کیا جس کی اجازت آپؐ کی قوم اور زمانے کا دستور دیتا تھا۔

اہلِ مغرب طبعاً تعددِ ازواج کو بنیادی طور پر معیوب اور نہ صرف خلافِ قانون بلکہ شہوت پرستی اور اخلاقی رکاکت کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اس قسم کے تمام دستور حالات و ضروریاتِ وقت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ نسلِ عبرانی کے آباؤ اجداد، جنھیں تمام سامی مذاہب کے پیرو اخلاقی عظمت کے قابلِ تقلید نمونے خیال کرتے ہیں، تعددِ ازدواج پر اس حد تک کاربند تھے جو ہمارے جدید اندازِ فکر کو قانوناً جائز بدکاری کی انتہا معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اس تقدس کے باوجود جس کا پردہ قدامت اور قصص و روایات نے اُن پر ڈال رکھا ہے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم ان بزرگوں کی سیرت و کردار پر انگلی رکھیں، لیکن رسُولِ عربیؐ کے معاملے میں ضروری ہے کہ ہم آپؐ کے عمل کی تاریخی قدر و قیمت اور معنویت کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔

غالباً کہا جائے گا کہ چاہے کیسی بھی ضرورت یا مجبوری تھی آنحضرتؐ کو واجب نہ تھا کہ تعددِ ازدواج سے معیوب رواج پر خود عمل کرتے یا دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دیتے، بالخصوص چونکہ حضرت عیسیٰؑ نے اس اصلاح کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن امرِ واقع یہ ہے کہ یہ رواج اور بہت سے رواجوں کی طرح شرِ محض نہیں۔ شر ایک اضافی نام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل یا دستور ابتداءً اقوام و افراد کے اخلاقی تصورات سے مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن افکار کی ترقی اور جماعت کے حالات میں تبدیلیاں اس کو رُجحاناً باعثِ فساد بنا دیں اور ایک

وقت ایسا آئے کہ حکومت اُسے خلافِ قانون قرار دے دے۔ یہ ایک پیشِ پا اُفتادہ بات ہے کہ افکار و خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن سطحی سوچ بچار کرنے والے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ رواجوں اور دستوروں کا دارو مدار ترقیِ افکار پر ہوتا ہے اور وہ حالاتِ زمانہ کے مطابق یا اس معیار کے مطابق کہ انھیں لوگوں کا ضمیر قبول کرتا ہے یا نہیں (جسے "روحِ عصر" کہتے ہیں) بُرے یا بھلے ہوتے ہیں۔

عیسائیت کی ابتدائی تاریخ میں ایک سب سے نمایاں بات یہ نظر آتی ہے کہ اُس نے تاہُّل کو مذموم قرار دیا۔ شادی کو ایک اسفل طریقِ زندگی اور بچوں کی پیدائش کو ایک خرابی سمجھا جاتا تھا۔ رُہبانیت نے بہترین نفوس کو دنیا سے الگ تھلگ کر دیا تھا۔ کلیسا کے منصب داروں کو تو ذکر ہی کیا، اُن مذہبی مبلغین کو بھی جو کلیسا کے منصب دار نہ تھے یا تو شادی کی ممانعت تھی یا اگر اجازت تھی بھی تو صرف ایک بار شادی کرنے کی۔ یہ غیر صحت مند قدغن کسی حد تک تو معلّمِ دین کی ذاتی مثال پر مبنی تھی اور کسی حد تک چند ایسے حالات کا نتیجہ تھی جنھوں نے ابتدائی ملّتِ عیسوی پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔

نبیٔ ناصری کو اسینی Essene راہبوں سے جو گہرا تعلق تھا اُن کی یہ قوی توقع کہ خدا کی بادشاہی جس میں تمام معاشرتی علائق ختم ہو جائیں گے بہت جلد قائم ہونے والی تھی اور اُن کا اپنے تبلیغی کام کی تکمیل سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جانا — یہ ہیں وہ اسباب جن سے اس امر کی توجیہہ ہوتی ہے کہ وہ تاہّل کے مخالف تھے اور غالباً انھی اسباب کی بنا پر انھوں نے تاہّل کی زندگی اختیار نہیں کی۔ اصطباغی کے ساتھ، جو خود اسینی تھے، ان کا تعلق ان کی مختصر لیکن المناک داستانِ حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ پال کو جنسِ اناث سے جو زبردست اور ناقابلِ توجیہہ نفرت تھی اُس نے حضرت عیسیٰؑ کے ارشادات سے مل کر کلیسا میں اس اسینی عقیدے کو راسخ کر دیا کہ مرد اور عورت کا یہ مقدس ترین رشتہ ایک گناہ ہے اور ایک ایسی خرابی ہے جس سے حتی الامکان حذر کرنا چاہیے۔ شادی کا واحد مقصد بچے پیدا کرنا اور مرد کی شہواتِ نسوانی کا پورا کرنا سمجھا گیا۔ چنانچہ اکثر عیسائی کلیساؤں میں نکاح کی رسم آج تک جن عبارات کی تلاوت سے ادا کی جاتی ہے اُن پر اس جاہلانہ تصور کا ٹھپّا لگا ہوا ہے۔ انہی اثرات کی بدولت عیسائیت

پر اس خیال کا پیوند لگ گیا ہے کہ جس شخص نے کبھی شادی نہیں کی وہ اُس شخص پر فائق ہے جس نے شادی کر کے اپنے آپ پر کلنک کا ٹیکہ لگا لیا ہے اور جہاں جہاں انسان نواز علوم نے اس خیال کا ازالہ نہیں کیا وہاں وہاں یہ خیال اب تک مضبوطی سے قائم ہے۔ ہندوستان کے بھبوت ملنے والے جوگی، مشرقی ملکوں کے جٹا دھاری بیراگی اور بدھ مت کے سنیاسی سب غیر متاہل ہوتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ "گھر بار اور اہل و عیال کے رشتے توڑے بغیر معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، اور تجرّد کی زندگی بسر کیے بغیر ابدیت کا نصیب ہونا ممکن نہیں۔" تجرّد مشرقی عرفانیت اور مرتاضیت سے شروع ہوا، اور مختلف وسائل سے آ کر عیسائیت میں داخل ہو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی "معصومیت" کو بہت سے لوگوں نے اُن کی الوہیت کا ثبوت اور بہت سے لوگوں نے دنیا کے دوسرے معلمین پر اُن کے تفوّق کی دلیل سمجھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمّد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا ایک دوسرے سے جو موازنہ و مقابلہ کیا جاتا ہے وہ کلیتہً باطل اور اخلاقی معیاروں کے غلط تصوّر پر مبنی ہے۔ اگر شادی نہ کرنا کسی شخص کو ایک مثالی انسان بنا دیتا ہے تو سارے جوگی، بیراگی، سنیاسی اور درویش کامل انسان ہوتے ہیں۔ اُس صورت میں ایک کامل زندگی وہ ہوگی جو تمام خانگی رشتوں سے مبرّا ہو۔ ایسا خیال یقیناً منافیِ فطرت اور نوعِ انسانی کے لیے حد درجہ مضرّت رساں ہوگا، لیکن اگر حقیقت الامر یہ نہیں، تو تعجب ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کو، جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ادھورے چھوڑے ہوئے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، کیوں مطعون کیا جاتا ہے؟ کیا ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کی؟ ہم اوپر واضح کر آئے ہیں کہ ان شادیوں کی نوعیت کیا تھی۔ ہم نے اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور ثابت کر دیا ہے کہ یہ شادیاں جن کے لیے انھیں موردِ الزام بنایا جاتا ہے حقیقت میں خدا ترسی اور ایثارِ نفس کے کام تھیں۔

بہرکیف، آیئے ہم پیغمبرِ اسلامؐ کی متعدد شادیوں کا جائزہ ایک مجرّد نقطہ نگاہ سے لیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے متعدد شادیاں کیوں کیں؟ کیا وہ نیک سیرت تھے یا شہوت پرست؟ حضرت داؤدؑ نے، جنھیں انجیلِ قدیم "محبوبِ خدا" کہتی ہے، تعددِ ازدواج کی حد کیوں کر دی؟ جواب بالکل بدیہی ہے۔ ہر زمانے کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ جو چیز ایک

زمانے کے لیے موزوں ہوتی ہے وہ کسی دوسرے زمانے کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمیں ماضی کے اعمال کو حال کے معیاروں سے نہ جانچنا چاہیئے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ان محترم اور بزرگ ہستیوں نے صداقت و دیانت سے اپنے وقت کے معیاروں پر عمل کیا تو اس سے اُن کے عظمت و تقدّس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیا یہ بجا ہوگا کہ ہم حضرت عیسیٰؑ کو ایک برخود غلط، خود پرست اور عقلِ عملی سے بے بہرہ تخیل پرست یا حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کو ایک شقی القلب شہوت پرست کہیں محض اس بنا پر کہ حضرتِ عیسیٰؑ اپنی متوقع خدائی بادشاہی کے خواب دیکھنے میں گُم تھے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کی نجی زندگی بیسویں صدی کے معیاروں کے مطابق اتنی قابلِ اعتراض تھی؟ اگر ہم ایسا کریں تو دونوں صورتوں میں ہم ناانصافی کے مرتکب ہوں گے حضرت عیسیٰؑ کی اُمیدیں اور آرزوئیں اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کے کارنامے دونوں تاریخی حادثے تھے، جو اپنے وقت کی پیداوار تھے۔ نبی کی صداقت کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ منزع سے مترقع کیفیتوں میں بھی وہ جو کچھ ابھی پیدا نہیں ہوا اس کا تصوّر کرتے وقت اُسے نہیں بھول جاتا جو موجود ہے۔ وہ اپنی ذات میں نوعِ انسانی کی نشوونما اور ترقی کا نمائندہ ہے۔ نہ حضرت عیسیٰؑ اور نہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس معاشرے کو جو اُن کے زمانے میں موجود تھا فی الفور یک قلم محو اور اپنے زمانے کے قومی وسیاسی اداروں کو برطرف کرسکتے تھے حضرت عیسیٰؑ کی طرح حضرت محمدؐ نے بھی اس پر اکتفا کیا کہ "اپنے تابعین کے دلوں پر وہ اصول نقش کردیں جو وقتِ مناسب کے آنے پر ان اداروں کو خودبخود برطرف کردیں گے۔" البتہ جہاں جہاں وقتی ضروریات پوری کرنے کے لیے قواعد ضروری تھے وہاں انھوں نے قواعد وضع کردیئے۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ذاتی معاملے میں ایسی مراعات روا رکھیں جن سے اُن کے تابعین محروم تھے، اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ ایک ایسی غلط فہمی پر مبنی ہے جو واقعات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ تعدّدِ ازدواج کی تحدید کا حکم ہجرت کے چند سال بعد مدینے میں صادر ہوا۔ اور اس حکم نے آپ پر جو عمل لازم کردیا وہ ایک نفس پرست کی مراعات طلبی نہ تھا، بلکہ ایک بارِ ذمہ داری

تھا، جو ایک خودشناس وخودنگر انسان نے بطیبِ خاطر قبول کیا۔ آپؐ کی تمام شادیاں تعددِ ازدواج کی تحدید کرنے والی آیت کے نازل ہونے سے پہلے واقع ہوئیں اور اسی آیت کے ساتھ ایک اور آیت نازل ہوئی جس نے آپؐ کی ذاتی مراعات کا خاتمہ کر دیا۔ آپؐ کے تابعین کو تو اجازت تھی کہ (شرعی قیود کے اندر) بیک وقت چار بیویاں رکھیں اور طلاق کا اختیار استعمال کریں، جسے وہ نبی کی تنبیہ کے باوجود استعمال کرتے تھے، نئی شادیاں کریں، لیکن آپؐ خود نہ تو کسی بیوی کو جس کے نان و نفقہ کا ذمہ آپ نے لے رکھا تھا علیحدہ کر سکتے تھے، نہ کوئی نئی شادی کر سکتے تھے۔ کیا اسے مراعات طلبی کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ حکم اُن عورتوں کے حق میں جو آپؐ کے عقد میں تھیں ایک مخیّرانہ حکم اور آپؐ کے لیے ذاتی طور پر پیغمبرانہ انکارِ نفس کا حکم نہ تھا؟

طلاق کا موضوع بہت سی غلط فہمیوں اور بحث آرائیوں کا منبع رہا ہے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مطلقہ عورتوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں جو قرآنی احکام ہیں "ان میں کسی اور کتابِ آسمانی کے احکام سے زیادہ انسانیت اور انصاف ہے۔"

تمام قدیم اقوام میں طلاق کا اختیار شادی کے قانون کا ایک لازمی ضمیمہ سمجھا گیا ہے، لیکن چند استثنائی صورتوں کے سوا یہ اختیار صرف مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ بیوی کو کسی حالت میں بھی طلاق لینے کا حق نہ تھا۔

تہذیب کی ترقی اور افکار کی نشوونما عورتوں کی حالت میں ایک جزئی بہتری کا باعث بنی۔ عورتوں کو بھی طلاق لینے کا مشروط حق عطا کیا گیا اور انھوں نے جی کھول کر اس سے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ قیصرانِ روم کے عہدِ حکومت میں شادیاں جس آسانی سے کی اور توڑی جاتی تھیں وہ ضرب المثل بن گئی تھی۔

قدیم عبرانی شریعت کے تحت خاوند کو یہ اختیار تھا کہ اگر اس کی بیوی کسی وجہ سے اس کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہو جائے تو وہ اُسے طلاق دے دے، اور اس اختیار کے من مانے اور بے جا استعمال پر کوئی پابندیاں عائد نہ تھیں۔ بیویوں کو کسی حالت میں بھی طلاق لینے کا حق نہ تھا[1]۔

---

[1] خروج باب ۲۱- ۲- ۱۰، استثنا باب ۲۱- ۱۴۔ باب ۲۴- ۱ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

بعد کے زمانوں میں شمائیوں (Shammaites) نے طلاق کے دستور میں قدرے ترمیم کی اور اس پر کچھ پابندیاں لگائیں، لیکن ہلیل (Hillel) کے مذہب نے ابتدائی قانون کو سختی سے برقرار رکھا۔

پیغمبرِ اسلامؐ کے ظہور کے وقت عرب کے قبیلوں میں ہلیلی (Hillelite) عقیدے زیادہ تر رائج تھے اور ان کے یہاں بیویوں سے قطعِ تعلق اتنا ہی عام تھا جتنا کفارِ عرب میں تھا۔

اہلِ ایتھنز کے یہاں مرد کو بیوی سے قطعِ تعلق کا جو اختیار تھا وہ اتنا ہی غیر محدود تھا، جتنا قدیم اسرائیلیوں کے یہاں تھا۔

رومیوں کے یہاں طلاق کو ابتدائی زمانوں سے مطابقِ قانون سمجھا جاتا تھا۔ "بارہ تختیوں کے قوانین" (The laws of the Twellve Tables) نے طلاق کو جائز قرار دیا۔ اگر رومیوں نے، جیسا کہ اُن کے مدّاح کہتے ہیں، اس قانون سے اپنے شہر کی بنیاد پڑنے کے پانچ سو سال بعد تک فائدہ نہ اُٹھایا تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُن کے شمائل و خصائل دوسری قوموں کے شمائل و خصائل سے بہتر تھے، بلکہ یہ تھی کہ اگر کسی عورت پر زہر دینے یا شراب پینے یا کسی کا بچہ مانگ کر گود میں ڈال لینے کا الزام لگتا تو اس کے خاوند کو اختیار تھا کہ چھان بین کئے بغیر اُسے قتل کر ڈالے لیکن بیوی کو طلاق لینے کا کوئی حق نہ تھا۔[1] اگر وہ طلاق مانگنے کی جسارت کر گزرتی تو وہ سزاوارِ موت خیال کی جاتی تھی۔ زمانۂ مابعد کی جمہوری حکومت کے زمانے میں طلاقوں کی جو کثرت تھی وہ بہ یک وقت اخلاق کے سریع فساد کی نشانی بھی، سبب بھی اور نتیجہ بھی تھی۔

ہم نے قرونِ قدیمہ کی وہ نمایاں ترین قوموں کا تذکرہ کیا ہے جن کے اسالیبِ فکر نے جدید زمانے کے فکر، زندگی اور رسم و رواج پر ایک قوی اثر ڈالا ہے۔ رومیوں نے طلاق کے بارے میں جو قوانین وضع کئے وہ ترقی پسندی کی صفت سے متصف تھے اور اُن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۲) نیز ملاحظہ کیجئے: Dollinger, *The Gentile, and the Jew*, vol. ii, pp. 339, 340, and Selden's *Uxor Hebraica in Loco*

[1] Dollinger, *The Gentile and the Jew*, vol. ii, p. 255.

کا رُجحان عورتوں کی حیثیت کے بہتر بنانے اور اُنھیں مردوں کے مساوی درجہ عطا کرنے کی طرف تھا۔ یہ اُتنا ہی افکارِ انسانی کی ترقی کا نتیجہ تھا جتنا کسی خارجی سبب کا۔

"جن مبہم الفاظ میں حضرتِ عیسیٰؑ کی ہدایت مندرج ہے وہ ہر اُس تفسیر کو قبول کرتے ہیں جس کا تقاضا قانون سازوں کی دانشمندی کرے[1]" ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے یہ ارشاد کیا کہ "جو عقد خدا نے باندھا ہے اُسے کوئی انسان نہ توڑے[2]" تو اُن کے ذہن میں صرف یہ خیال تھا کہ فسادِ اخلاق کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو روکیں اور انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ اُن کے الفاظ کو بالآخر کیا معنی پہنائے جائیں گے۔ بعد میں جو یہ قانون وضع کیا گیا کہ زناکاری طلاق کی واحد وجہ جواز ہے اس سے اس بات کا وافر ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو ایسی صورتِ حال کے امکان کا احساس تھا[3] لیکن بعد کے قانون سازوں کی دانشمندی نے اپنے آپ کو اسی حد کے اندر مقید نہیں رکھا کہ ایک ایسے قانون کا اندھادھند اتباع کریں جو ایک تشکیل پاتی ہوئی جماعت کے حسبِ حال بنایا گیا تھا اور جس کا اعلان محض زبانی کیا گیا تھا۔ یہ قانون بے شک ایک اشرف جذبے کی تلقین

---

[1] Gibbon, *Decline and Fall of the Roman Empire*, vol. iv, p. 209

[2] متی ۱۹؍۶۔

[3] اناجیل میں سے دو اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کرتیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے کس سبب کی بنا پر اپنے پیروؤں کو اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی بیویوں کو علیحدہ کر دیں۔ (مرقس ۱۰؍۱۱ اور لوقا ۱۶؍۱۸) اگر ان روایات کو جو ان انجیلوں میں قلمبند ہیں اُن روائتوں سے زیادہ مستند سمجھا جائے جو متّی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں تو اس صورت میں ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰؑ نے اشرف جذبات کی تعلیم دی اور ارفع اصولوں کی تلقین کی تاہم اُن کا منشا یہ نہ تھا کہ اُن کے اقوال کو ایک ناقابلِ تغیر اور مثبت قانون خیال کیا جائے۔ سیلڈن کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جو مبہم جواب دیا اُس کا مقصد یہ تھا کہ وہ شامیوں یا ہلیلوں کو برگشتہ نہ کرنا چاہتے تھے۔

Uxor Hebraica, I, III, C. 18-22, 28-31

کرتا ہے لیکن عیسائی ملکوں نے بعد میں طلاق کے جو کثیر التعداد اور متنوع قانون بنائے ان کے پیشِ نظر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ طلاق کے بارے میں دینِ عیسوی کا امتیازی اور بنیادی قانون ہے۔

عربوں کے یہاں طلاق دینے کا جو اختیار مردوں کو دیا گیا تھا وہ غیر محدود تھا۔ عرب اپنی بیویوں سے سلوک کے معاملے میں انسانیت یا انصاف کے کسی قاعدے قانون کو نہ مانتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم طلاق کے رواج کو بےحد ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُسے قوم کی شیرازہ بندی کے حق میں نہایت مُضرخیال کرتے تھے۔ آپؐ نے بار بار اعلان کیا کہ غلاموں کو آزادی دینے سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کے نزدیک مقبول اور طلاق سے بڑھ کر غیر مقبول نہیں۔ لیکن معاشرے کے حالات جو اُس وقت تھے اُن کے ہوتے ہوئے اس رواج کا مکمل استیصال ناممکن تھا۔ آپؐ کو جو کام درپیش تھا وہ یہ تھا کہ ایک نیم مہذّب جماعت کو شائستگی کے ایک بہتر سانچے میں ڈھالیں تاکہ جو رُوحانی سبق آپؐ نے سکھائے تھے وہ رفتہ رفتہ پھل لائیں۔ طلاق کا رواج شرِ محض نہ تھا، اس لیئے آپؐ نے چند شرائط کے تحت مردوں کو اجازت دی کہ طلاق کے اختیار کو استعمال کریں۔ آپؐ نے طلاق دینے والے مرد اور مطلقہ بیوی کو تین جدا جدا مُہلتیں دیں تاکہ اگر ممکن ہو تو وہ صلح و صفائی کرکے نئے سرے سے تعلقاتِ مباشرت شروع کرلیں۔ لیکن اگر مصالحت کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوں تو تیسری مہلت میں اُن کا جو باہمی فیصلہ ہوتا تھا وہ راسخ ہوجاتا تھا۔ میاں بیوی کے جھگڑوں کے بارے میں آپؐ نے ہدایت کی کہ اُن کا فیصلہ ثالثوں کی وساطت سے کرایا جائے۔

موسیو سیدیلو (Sedillot) نے، جن سے بہتر کسی مصنّف نے آئینِ محمدیؐ کا تجزیہ نہیں کیا، اس موضوع پر ذیل کی عبارت لکھی ہے:۔

"طلاق کی اجازت تو تھی، لیکن ایسی باضابطہ شرطوں کے تحت جو اس امر کی اجازت دیتی تھیں (بلکہ کہنا چاہیئے اس امر کی سفارش کرتی تھیں) کہ اگر کوئی فیصلہ عجلت میں اور پورے تفکّر و تامّل کے بغیر کیا گیا ہو تو وہ منسوخ کیا جاسکے۔ ایک ایک مہینے کے وقفے کے بعد تین طلاقوں کا مکرّر اعلان طلاق کو ناقابلِ تنسیخ

بنانے کے لیے لازمی تھا۔[1]

پیغمبرِ اسلام کی اصلاحات نے مشرقی قانون سازی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ آپ نے مردوں کے اختیارِ طلاق پر پابندیاں عائد کیں، لیکن آپ نے عورتوں کو معقول اسباب کی بناء پر خلع کا حق عطا کیا اور اپنی زندگی کے آخری دور میں تو آپ نے ثالثوں اور قاضی کی وساطت کے بغیر مردوں کے لیے حقِ طلاق کا استعمال عملاً ممنوع کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک تمام مباح اعمال میں سب سے زیادہ غیر مقبول عمل طلاق ہے"۔ کیونکہ وہ ازدواجی خوشی میں مخل اور بچوں کی صحیح تربیت کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے طلاق کی جو اجازت دی ہے، اگرچہ اُس نے قدیم رواج کی کسی حد تک تائید کی، تاہم ضروری ہے کہ اس کی تعبیر شارع کے اعلانات و ارشادات کی روشنی میں کی جائے۔ اگر ہم یہ ملحوظِ خاطر رکھیں کہ نظامِ اسلامی میں دین اور شریعت کا کتنا گہرا تعلق ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ نبی کے ارشادات و اعلانات طلاق کے دستور کے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔

قدرتی طور پر مختلف مذاہبِ فقہ میں اس موضوع پر بہت سا اختلاف ہے کہ مرد کو قاضی کی وساطت کے بغیر طلاق دینے کا کہاں تک حق پہنچتا ہے۔ اربابِ فقہ کی ایک کثیر اور معتبر جماعت کے نزدیک جب تک مجبوری کی حالت نہ ہو، مثلاً یہ کہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی ہو، اُس وقت تک طلاق دینا مرد کے لیے فی الحقیقت ممنوع ہے۔ ایک اور جماعت، جس میں معتزلہ کی اکثریت ہے، حاکم الشرع کی منظوری کے بغیر طلاق کو غیر مجاز اور غیر متشرع خیال کرتی ہے۔ اس جماعت کی رائے ہے کہ جب تک ایک غیر جانب دار ثالث یا قاضی اس کی تصدیق نہ کرے ایک منکوحہ جوڑے کے درمیان علیحدگی جائز اور طلاق نواہی کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتی۔ اس رائے کی تائید میں وہ شارعِ اسلام کے اُن الفاظ کا حوالہ دیتے ہیں جنھیں ہم اُوپر پیش کر آئے ہیں اور آپ کی اس ہدایت سے استناد کرتے ہیں کہ زوجین کے درمیان اختلاف و نزاع کی صورت میں مفاہمت کی خاطر ثالث مقرر کیے جانے چاہئیں۔

---

[1] Sedillot, *Historie Des Arabes*, Vol I, p.85

حنفی، شافعی، مالکی اور زیادہ تر اہلِ تشیع طلاق کو مباح خیال کرتے ہیں، اگرچہ وہ اس اختیار کے بلا وجہ استعمال کو خلافِ شرع قرار دیتے ہیں۔

ردّ المختار، (Radd-ul Muhtar) میں طلاق کے منافیٔ شرع ہونے کے خلاف دلائل بیان کرنے کے بعد ذیل کی عبارت آئی ہے: "اس میں شک نہیں کہ طلاق ممنوع ہے، لیکن وہ بعض خارجی اسباب کی بنا پر مباح ہو جاتی ہے۔ اور جو اربابِ فقہ اسے ممنوع کہتے ہیں اُن کا یہی مطلب ہے۔"

اگرچہ ائمۂ دین نے عارضی اجازت کو ایک مثبت قاعدہ تصوّر کر لیا ہے اور معلّمِ اسلامؐ نے عدل کے جو اصول وضع کیے تھے اُن میں سے اکثر کو نظر انداز کر دیا ہے، پھر بھی اربابِ فقہ نے جو قاعدے مرتب کیے ہیں وہ اُن رومن قوانین کے مقابلے میں، جن کی تشکیل عیسوی کلیسا کی سرپرستی میں ہوئی، بدرجہا زیادہ کریمانہ ہیں[1]۔ فقہاء کے نزدیک بیوی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بدسلوکی، نان و نفقہ مہیا نہ کرنے یا اسی قسم کے کسی اور سبب کی بنا پر تنسیخِ عقد کا مطالبہ کرے، لیکن اگر وہ اس مطالبے کے حق میں ٹھوس اور تسلی بخش اسباب پیش نہیں کر سکتی تو وہ جہیز کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ جب کبھی مرد اپنی مرضی سے طلاق دے تو وہ شادی کے وقت بیوی کو جو کچھ ہبہ کر چکا ہو اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتا[2]۔

---

[1] Milman, *Latin Christianity*, vol. i, pp. 368.369

[2] سُنّی فقہ میں جو یہ شرط ہے کہ قطعی انقطاع کی صورت میں میاں بیوی کی از سرِ نو مباشرت سے پہلے لازمی ہے کہ بیوی کسی اور مرد سے نکاح کرے اور اس سے طلاق لے، موسیو سدیو اس شرط کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ایک نہایت دانشمندانہ قاعدہ کہتا ہے جس کی بدولت طلاق پر ایک کڑی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف میور شارعِ اسلام کو ایک ایسی کڑی شرط لگانے کے لیے موردِ الزام ٹھہراتا ہے۔ وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ عربوں جیسے مغرور، رشک کرنے والے اور حساس لوگوں کے لیے اس قسم کی شرط بیجا طلاقوں کے سدّباب کی بہترین ضمانت تھی۔ میور نے جو ضرب المثل بیان کی ہے خود اس سے اس پر واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ (باقی حاشیہ صفحہ ۳۸۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

قرآن میں زوجین کی علیحدگی کے خلاف جو تنبیہیں کی گئی ہیں اور مصالحت سے تمام تنازعوں کا فیصلہ کرنے کے بارے میں جو متواتر تاکیدیں کی گئی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شارعِ عربی کی نگاہوں میں رشتۂ نکاح کی کتنی حرمت تھی۔

"جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رُخی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ آپس میں مصالحت کر لیں، کیونکہ مصالحت بہتر ہے۔ انسانوں کے نفس حرص کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمھارے اس عمل سے بے خبر نہیں ہوگا۔ بیویوں سے برابر کا سلوک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۷) جو شخص اپنی بیوی کو ایک ایسے کراہت انگیز امتحان میں ڈال سکتا تھا وہ کتنی ذلت برداشت کرتا تھا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سر ولیم میور کو پیغمبرِ اسلامؐ سے جو خدا واسطے کی دشمنی تھی اس کے باعث وہ یہ بھول گیا کہ اس شرط کا منشا ایک اور انسانیت سوز رواج کا روکنا تھا جو یہودیوں اور کافر عربوں اور تقلیداً عیسائیوں میں بھی عام تھا، یعنی یہ رواج کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر یا شہوانی جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی بیویوں سے قطع تعلق کر لیا کرتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو شرط عائد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی قوموں میں سے ایک حساس ترین قوم کی طبیعت پر یوں قابو پا یا جائے کہ اس کی فطرت کے ایک قوی ترین جذبے کو بروئے کار لایا جائے۔ یعنی اس کی حمیت کو (مقابلۃً دیکھئے۔ *(Sale, Preliminary Discourse) میور نے یہ بھی فراموش کر دیا ہے کہ بہت سے شیعہ اہلِ فقہ اس امر کو واجب یا جائز نہیں سمجھتے کہ مطلقہ عورت میاں کے گھر آنے سے پہلے کسی دوسرے مرد سے نکاح کر کے اس سے طلاق لے (ملاحظہ کیجئے میلکم تاریخ ایران اور مبسوط) جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اس امر کا قائل ہوں کہ یہ آیت کہ "جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے تو یا بھلے طریقے سے انھیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو محض ستانے کی خاطر نہ روک رکھو، کیونکہ زیادتی ہوگی (البقرہ، ۲۲) آیاتِ ماسبق کو منسوخ کر دیتی ہے۔ جس کی رُو سے دوسرے مرد سے نکاح لازم آتا ہے۔

کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ تم چاہو بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اور کچھ نہیں تو ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ایک طرف لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرزِ عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

(النساء۔ ۱۲۸)

اس سے پہلے کی ایک آیت میں ذیل کا اعلان کیا گیا ہے:۔

"اگر تمھیں میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک منصف مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں مصالحت چاہیں گے تو اللہ مصالحت کی صورت نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

(النساء۔ ۳۵)

نظامِ اسلامی میں رشتۂ نکاح کو جو تقدس حاصل ہے اُسے غیر مسلم یا تو سمجھ نہیں سکے یا اس کی پوری طرح داد نہیں دے سکے۔ اشباہ والنظائر (Ashbah w'an Nazair) میں ہے: "شادی ایک ایسا ادارہ ہے جو نوعِ انسانی کے تحفظ کے لیے اور اس مقصد سے کہ انسان اپنے آپ کو بدکرداری اور آلودہ دامنی سے بچائیں لازم کیا گیا ہے۔" نکاح ایک متبرک رسم ہے، ان معنوں میں کہ وہ اس دنیا میں ایک عملِ عبادت ہے کیونکہ وہ انسان کو ناپاکی و نجاست سے بچاتا ہے۔" "وہ نوعِ بشر کے افراد کے درمیان حکمِ ربّی سے مقرر کیا گیا ہے۔" "نکاح کو اگر ایک معاہدہ سمجھا جائے تو وہ ایک ایسے مرد اور ایک ایسی عورت کے درمیان، ان کی باہمی رضامندی پر مبنی، ایک دائمی علاقہ ہے جن کے درمیان عقد کی شرعاً ممانعت نہ ہو۔"

اکثر کہا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اپنے متبعین کو اس کی اجازت دی کہ چار شرعی بیویوں کے علاوہ لونڈیوں سے بھی علاقہ رکھیں۔ اس موضوع پر جو حکم ہے وہ بجائے خود یہ واضح کر دینے کے لیے کافی ہے کہ یہ خیال کس حد تک آئینِ اسلامی کے حقیقی منشاء کے خلاف ہے:۔

"جو شخص تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے شادی کر سکے اُسے

اجازت ہے کہ تمھاری اُن لونڈیوں میں سے جو تمھارے قبضے میں ہوں اور مومنہ ہوں کسی کے ساتھ نکاح کرلے .... یہ اجازت اُن لوگوں کو دی گئی ہے جنھیں شادی نہ کرنے کی صورت میں پاکبازی سے منحرف ہوجانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہوگا۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

(النساء - ۴ - ۲۵)

اس کمزور بنیاد پر اور غالباً مملکتِ اسلامی کے ابتدائی دور کے بعض عارضی اور اتفاقی حالات پر ہمارے اربابِ فقہ نے لونڈیوں سے تعلقات رکھنے کے رواج کو قائم کیا ہے۔ اگرچہ یہ رواج معلّمِ اسلام کی حقیقی ہدایات کے نقیض ہے، لیکن اس کے باوجود یہ غیر مسلموں کی شدید ترین نکتہ چینیوں کا موضوع بن گیا ہے۔

جاریہ بازی، یعنی آقا اور لونڈی کی نکاح کے بغیر ایک دوسرے سے مباشرت، عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور اُن کی تمام ہمسایہ قوموں میں رائج تھی۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے ابتداءً اس کی مذمت نہیں کی، لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسے صریحاً منع کر دیا۔ قرآن میں ہے:-

"اور محفوظ عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں، خواہ وہ اہلِ ایمان میں سے ہوں یا اُن قوموں میں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، اس شرط پر کہ تم ان کے مہر ادا کرکے انھیں قیدِ نکاح میں لاؤ، نہ یہ کہ تم اُن سے آزادانہ شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔"

(المائدہ ۵)

اس آیت کے پہلے حصے کا جو منشاء ہے ذرا اُس کا مقابلہ عیسوی کلیسائیت سے کیجئے جس نے کبھی عیسائی کے غیر عیسائی سے عقد کو قانوناً جائز تسلیم نہیں کیا۔ اگر کبھی کسی "کافر" نے کسی عیسائی سے شادی کی جسارت کی تو اسے نذرِ آتش کر دیا جاتا تھا۔ شارعِ اسلام کا وضع کیا ہوا قاعدہ صریحاً انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے عیسوی قانون کا نعم البدل ہے۔

مسلمان عورتوں کے غیر مسلموں سے شادی کرنے کی ممانعت، جس نے اسلام کے مخالفین کو نکتہ چینی کا بہت سا مواد مہیا کیا ہے، سیاسی مصلحتوں اور اسلامی مملکت کی ابتدائی ضرورتوں پر مبنی تھی۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے رواج جو مسلمانوں نے اعرابِ جاہلیت سے ورثے میں پائے اور جو اب تک ایک کہنہ نظام کے باقیات کے طور پر جاری ہیں مسلمان قوموں کی ترقی میں سدِّ راہ ثابت ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک رواج عورتوں کے مردوں سے علیحدہ رہنے کا رواج ہے۔ یہ رواج ابتدائے ایّام سے اکثر قدیم اقوام میں متداول تھا۔ "جائینے کونائٹس" (Gynaikonitis) یعنی حرم سرا اہلِ ایتھنز کے یہاں ایک معروف ادارہ تھی اور ایک ایتھنی حرم کی رہنے والیوں کو اُسی طرح نگاہِ عام سے چھپایا جاتا تھا جس طرح اس زمانے میں ایرانی گھرانے کی عورتوں کو چھپایا جاتا تھا، یا آجکل ہندوستانی گھرانوں کی عورتوں کو چھپایا جاتا ہے۔ اپنے ہم پیشہ مشرقی خواجہ سراؤں کی طرح "جائینے کونومئے" (Gynaikonomoi) عورتوں کی پردہ دارانہ زندگی کے معتبر محافظ تھے اور وہ ایتھنز کی خواتین کی بڑی مستعدی سے نگہبانی کرتے تھے۔ عورتوں کے الگ تھلگ رہنے کی بدولت قدرتی طور پر "ہیتیرائی" (Hetairai) یعنی پڑھی لکھی رنڈیوں کا طبقہ وجود میں آگیا، جن کے بہت سے افراد نے ایتھنز کی تاریخ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ بازنطینی سلطنت میں جو غیر معمولی اور ناقابلِ توجیہ منظر دکھائی دیتا تھا اور جو اب جدید یورپ و امریکہ میں دکھائی دیتا ہے، اگر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ کسی ایسے معاشرے میں جس نے فنونِ تہذیب میں ذراسی بھی ترقی کی ہے ان بدنصیب عورتوں کا وجود جو انسانیت کے چہرے پر ایک شرمناک داغ اور تہذیب کے لیے سرمایۂ ننگ و عار ہیں اس امر کا نتیجہ ہے کہ عورتیں مردوں کی زندگی سے الگ تھلگ رہنے کے باعث مردوں کے نفوس پر وہ شرافت آفریں، پاکیزگی اور انسانیت آموز اثر مرتب نہیں کر پاتیں جو کچھ اُنہی کا خاصہ ہے۔ جب پاکیزہ چیزیں نفسِ انسانی کے سامنے نہیں ہوتیں تو وہ ناپاک چیزیں تلاش کرتا ہے۔ اہلِ بابل، اہلِ ایٹروریا (Etruscans) اہلِ ایتھنز اور اعرابِ جاہلیت قدیم زمانوں میں اس حقیقت کی نمایاں ترین مثالیں پیش کرتے ہیں لیکن وہ معاشرتی ناسور جو جدید زمانے میں قوموں کو اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا ہے اور اُن کے خونِ زندگی میں زہر پھیلا رہا ہے ایک منکرِ خدا مادہ پرستی کا نتیجہ ہے جس کے اوپر مذہب کا، چاہے وہ عیسائیت

ہو، چاہے اسلام اور چاہے کوئی اور مذہب، ایک ملمع چڑھا ہوا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوائل زندگی میں اہلِ مکہ کی اخلاقی خرابیوں کو دیکھ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ان خرابیوں کو دُور کرنے کا وہ طریقہ اختیار کیا جو اس زمانے اور ان لوگوں کے حالات کے پیشِ نظر مؤثر ترین تھا۔ مسٹر بوزورتھ سمتھ (Mr. Bosworth Smith) کے پُرمعنی الفاظ میں "اوّل اوّل اپنے سخت قوانین کی بدولت اور بعد میں اُن قوانین نے جو قوی اخلاقی جذبہ پیدا کیا اس کی بدولت آپ آج تک مسلم ممالک کو" (یعنی اُن ممالک کو جن میں غیرملکی اثرات کی وبا نہیں پھیلی) "اُن مطعونِ خلائق اور بدنصیب عورتوں سے پاک رکھنے میں کامیاب رہے ہیں جن کا مدارِ زندگی ایک ذلیل پیشہ ہوتا ہے اور جن کا ایک علیحدہ اور جانے پہچانے طبقے کی حیثیت سے موجود ہونا اس معاشرے کے ہر فرد کے لیے جس کی وہ رُکن ہوتی ہیں باعثِ ننگ وعار ہوتا ہے۔ اس کامیابی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔"

عورتوں کو علیحدہ رکھنے کا دستور بیشک غیر متمدّن جماعتوں کی فلاح و بہبود کے حق میں بہت سے فائدوں کا حامل ہے۔ ایسے ملکوں میں بھی جہاں ثقافت اور اخلاقی خیالات کا بہت تنوع پایا جاتا ہے عورتوں کی علیحدگی کی کوئی ترمیم یافتہ صورت فائدے سے خالی نہیں ہوتی۔ فی زمانتا یہ دستورکم وبیش سختی کے ساتھ بعض ایسی قوموں میں رائج ہے جو مسلم اثرات سے بہت دور ہیں، جن کی طرف اسے ہندوستان اور دوسرے مشرقی ملکوں میں منسوب کیا جاتا ہے۔ کوریا میں عورتوں کی علیحدگی حماقت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ چین میں اور جنوبی امریکہ کی ہسپانوی نو آبادیوں میں، جو براہِ راست یورپی تہذیب کے حلقۂ اثر میں نہیں ہیں، پردے کا رواج ابھی تک قائم ہے۔ پیغمبرِ اسلام نے اسے ایرانیوں اور دوسری مشرقی قوموں میں متداول پایا۔ آپ نے اس کے فائدوں کو محسوس کیا اور ممکن ہے کہ عربوں کے تمام طبقوں میں جو اخلاقی ابتری پھیلی ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر آپ نے عورتوں کو اس کی تلقین کی لیکن یہ خیال کرنا آپ کی اصلاحات کے منشاء کے نقیض ہے کہ جس سختی کے ساتھ یہ آجکل رائج ہے آپ کا مقصد اُسی سختی کے ساتھ اس کی ہدایت کرنا تھا یا یہ کہ آپ نے عورتوں کی مکمل علیحدگی کی تلقین کی۔ خود قرآن سے اس دعوے کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ عورتوں کی علیحدگی دینِ اسلام

کا ایک جزو ہے۔

"اے محمد، اپنی عورتوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی چادریں اپنے اوپر قدرے نیچی نہ لٹکائیں۔ اس سے وہ بہ آسانی پہچانی جائیں گی اور کوئی اُن کی توہین نہ کرے گا۔ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔"

(الاحزاب - ۵۹)

"اور اے نبی، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، سوا اُس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔"

(النور - ۳۱)

اس معاشرتی اور اخلاقی ابتری کے پیشِ نظر جس کے اندر سے آپ اللہ کے زیرِ ہدایت ایک نظام پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے، یہ ہدایات آسانی میں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ یہ دانشمندانہ اور کارآمد ہدایات تھیں جن کا مقصد عورتوں میں شرم و حیا کو فروغ دینا، اُن کے لباس اور اُن کے طور طریقوں کی اصلاح اور اُنھیں توہین سے محفوظ رکھنا تھا۔

ل "ہدایہ" کا مترجم ہملٹن اپنے مقدمے میں، جس میں وہ Book of Abominations سے بحث کرتا ہے، یوں رقمطراز ہے: "یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں بہت سے رکیک مباحث شامل ہیں اور جس پر زیادہ تر ایک ایسے مقالے کی روشنی میں غور کرنا ضروری ہے جس کا تعلق حسنِ اخلاق اور شائستگی سے ہو۔ اس میں جو چیز خاص طور پر نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ نسوانی حیاء پر بڑی احتیاط سے توجہ مبذول کی گئی ہے اور اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کوئی ایسا عمل نہ ہونے پائے جس سے خیال میں بھی اس کی بے حرمتی ہو، لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سے عبادت عورتوں کی وہ مکمل علیحدگی نہیں جو بعض مصنفین نے تصور کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورتوں کی علیحدگی رشک اور دعزور کا نتیجہ ہے نہ کسی شرعی حکم اقتضا کا جیسا کہ ہدایہ کے اس حصّے اور بہت سے دوسرے (باقی حاشیہ صفحہ ۳۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

لہٰذا یہ تصور کرنا ایک غلطی ہے کہ شریعت میں کوئی ایسا حکم ہے جو پردے کے رواج کو دوام بخشنے کا رجحان رکھتا ہے۔ شارع نے عورتوں کے حجاب کے بارے میں جو ہدایات صادر کیں ان کے حقیقی مفہوم کی بڑی حد تک اس امر سے وضاحت ہوتی ہے کہ خود آپ کے خاندان کی عورتوں پر نقل و حرکت کی کوئی سخت پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ نے جن سے آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد شادی کی بنفسِ نفیس حضرت علیؓ کے خلاف تحریکِ بغاوت کی قیادت کی۔ جنگ جمل کی مشہور لڑائی میں وہ خود اپنی فوجوں کی سپہ سالار تھیں۔ آنحضرتؐ کی بیٹی حضرت فاطمہؓ نے خلافت کی جانشینی سے متعلق مذاکروں میں شرکت کی۔ آنحضرتؐ کی نواسی اور حضرت امام حسینؓ کی بہن حضرت زینبؓ نے معرکۂ کربلا کے بعد اپنے نوجوان بھتیجے کی حمایت میں علمِ جہاد بلند کیا۔ اُن کی ہمت و جرأت سے خون آشام عبیداللہ بن زیاد اور شقی القلب زید دونوں خائف ہو گئے۔

وہ فسادِ اخلاق جس نے اعرابِ جاہلیت اور یہودیوں اور عیسائیوں کے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں فوری اصلاح کا متقاضی تھا پیغمبرِ اسلام نے عورتوں کے حجاب کے بارے میں جو ہدایات دیں انھوں نے بلاشک وشبہ بداخلاقی کے سیلاب کی روک تھام کی اور کفارِ عرب میں جو یہ دستور تھا کہ ایک عورت کے متعدد خاوند ہوتے تھے اسے اپنے متبعین میں مخفی طور پر رائج نہ ہونے دیا۔

فان ہیمر (Von Hammer) کے نزدیک "حرم ایک مامن ہے؛ اس میں غیر مردوں کو آنے کی جو ممانعت ہوتی ہے وہ اس لیے نہیں ہوتی کہ عورتوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جاتا، بلکہ رسم و رواج نے انھیں جو حرمت بخش رکھی ہے اس کی وجہ سے۔ کیا ایشیا اور کیا یورپ دونوں کے مسلمانوں میں عورت کا جو احترام ہے اُس کی بیّن شہادت ہر جگہ بہ آسانی مل سکتی ہے۔"

عورتوں کے بارے میں ایک بلند تصور رکھنا افضل ترین طبائع کا ایک قدرتی خاصہ ہے، لیکن جہاں تک عورتوں کو معاشرے میں ایک بلند درجہ دینے کا تعلق ہے، اس موضوع پر قومی غرور اور مذہبی تعصب نے جدید عیسائیت کے تمام شائستہ و متمدن طبقوں میں دو متبائن نظریے

(تتمہ حاشیہ صفحہ ۳۹۳) حصوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں یہ قاعدہ تمام مسلم ممالک میں رائج بھی نہیں۔

ایجاد کیے ہیں۔ ایک نظریے کی رُو سے عورتوں کی تعظیم مریم پرستی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے نظریے کی رُو سے وہ قرونِ وسطیٰ کے اس دستور کا نتیجہ ہے کہ عورتوں کی حمایت و حفاظت کرنا جزوِ شجاعت سمجھا جاتا تھا، جو ٹیوٹونک (Teutonic) اداروں ہی کا ایک ادارہ تھا۔ عورتوں کے بارے میں عیسائیت کا جو نقطۂ نظر ہے اُس کی بابت جتنا کم کہا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ ابتدائی زمانوں میں، جب اشرف و اسفل، عالم و جاہل، سب کا مذہب حضرت عیسیٰؑ کی ماں کی پرستش پر مشتمل تھا، عیسوی کلیسا نے عورت ذات کو راندۂ درگاہ قرار دے رکھا تھا۔ آبائے کلیسا نے یکے بعد دیگرے عورتوں کی خباثتوں، فتنہ پردازیوں اور شرانگیزیوں پر داد فصاحت دی۔ ٹرٹلین (Tertullian) نے جب عورت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا کہ "وہ شیطان کا دروازہ، آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کھلانے والی، قانونِ الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والی اور خدا کی شبیہ یعنی انسان کی بگاڑنے والی ہے" تو وہ رائے عامہ کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ایک اور صاحب رائے نے ایک نفرت انگیز انسان دشمنی کے ساتھ اعلان کیا کہ "میں نے عورتوں میں عصمت تلاش کی لیکن نہ پائی۔" لیکی (Lecky) کہتا ہے کہ کرائسوسٹم (Chrysostom) نے، جسے ایک بلند مرتبت ولی تصور کیا جاتا ہے، جب عورت کے بارے میں یہ کہا کہ وہ ایک ناگزیر شر، ایک قدرتی دامِ تحریص، ایک فتنۂ دلفریب، ایک برقِ نشیمن، ایک سحرِ مہلک، ایک بنی ٹھنی آفت ہوتی ہے" تو وہ آبائے کلیسا کے اجماع کی ترجمانی کر رہا تھا۔ راسخ العقیدہ کلیسا نے عورتوں کو ادنیٰ ترین رسوم کے سوا تمام مذہبی رسوم سے خارج کر دیا۔ معاشرے سے بھی وہ مطلقاً خارج تھیں، نہ وہ کھلے بندوں باہر جا سکتی تھیں، نہ دعوتوں اور ضیافتوں میں شریک ہو سکتی تھیں۔ انھیں تاکید تھی کہ گھر کے گوشۂ عزلت میں بسر کریں، خاموش رہیں، اپنے میاں کی اطاعت کریں اور اپنا وقت سوت کاتنے، کپڑا بُننے اور کھانے پکانے میں صرف کریں۔ اگر وہ کبھی باہر جاتیں تو ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک لپیٹ لیں۔ یہ تھی عورتوں کی حالت دنیائے عیسوی میں، ایک ایسے وقت جب ہر طبقے میں حضرت مریمؑ کی پرستش رائج تھی۔ بعد کے زمانوں میں اور بالخصوص اس وقفے میں جو مغربی سلطنت کی بربادی اور یورپ میں جدید معاشرت کے ظہور کے درمیان گزرا، یعنی اُن صدیوں میں جنھیں "قتل و غارت

دروغ گوئی، جبر و تعدی، حرص و ہوس اور تشدّد کی صدیاں " کہا گیا ہے۔ عیسائیت نے راہب خانے قائم کر کے عورتوں کی حالت کو چند امور کے لحاظ سے بہتر بنا دیا، لیکن یہ مشتبہ اصلاحِ حال صرف ایک ایسے دور کے لیے موزوں تھی جب عورتوں کا اغوا آئے دن کا واقعہ تھا اور اخلاق کی ابتری ناقابلِ بیان تھی۔ علاوہ بریں تمام راہب خانے نیکوکاری اور پرہیزگاری کے مقامات نہ تھے اور تجـــرد کی تاکید عصمت و عفت کی یقینی ضمانت ثابت نہ ہوتی تھی۔ رجسٹرم وزی ٹیشیونم" (The Registrum Visitationem) یعنی آرچ بشـــپ ریگو، (Archbishop Rigaud) کا اسقفی روزنامہ زمانۂ عقیدت کے سب سے شاندار حصّے میں اخلاق کی جو حالت اور عورتوں کی جو حیثیت تھی اس پر ایک عجیب روشنی ڈالتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے ظہور نے بھی عورتوں کی حالت میں اور قانون دانوں کے نزدیک اُن کی جو حیثیت تھی اس میں کوئی فرق نہ ڈالا۔ جہاں حضرت عیسیٰؑ نے عورتوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا تھا وہاں اُن کے تابعین نے انھیں انصاف کے دائرے سے بھی خارج کر دیا۔

دوسرا نظریہ جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے یورپ کے رُومان نویسوں میں مقبول ہے۔ اُنھوں نے قرونِ وسطیٰ کے ہر تاریکی شخص کو یوں پیش کیا ہے جیسے وہ کوئی بایار Bayard [1] یا کرائٹن [2] (Crichton) تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ "شولری" (Chivalry) یعنی نیکوکارانہ جوانمردی کا زمانہ آٹھویں صدی کے آغاز سے لے کر چودھویں صدی کے اختتام تک تھا۔ قابلِ ملاحظہ ہے کہ مسلمانوں کے ہسپانیہ میں اقتدار کا بھی قریب قریب یہی زمانہ تھا، لیکن اس زمانے میں بھی، اس سـنہرے ہالے کے باوجود جو شاعـری اور رُومان نگاری نے اس کی معاشرتی حالت کے گرد ڈال رکھا ہے، عورتیں اکثر جبر و تشدد کا تختۂ مشق بنتی تھیں۔ زور زبردستی اور فریب و دغا عیسائی "شولری" کے عہدِ زرّیں کی

---

[1] فرانس کا ایک پاکیزہ سیرت شجاع اور جنگجو (۱۵۲۴ - ۱۴۷۳ء)

[2] ایک مشہور کردار جو عورتوں کا حامی و محافظ تھا۔

امتیازی خصوصیات تھیں۔ جب تک مغرب کو مشرق کی تہذیب و شائستگی سے واسطہ نہیں پڑا اُس وقت تک رولینڈ[1] (Roland) اور آرتھر[2] (Arthur) محض فرضی شخصیتیں تھے۔ "شولری" Chivalry[3] سکینڈی نیویا کے برف زاروں یا جرمنی کے اندھیرے اور گھنے جنگلوں کی پیداوار نہ تھی: نبوت کی طرح "شولری" کا مرزبوم بھی ریگستان تھا۔ ریگستان ہی سے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جلوہ نما ہوئے اور ریگستان ہی سے حضرت عنترہؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کا ظہور ہُوا۔

جو عرب شہروں اور گاؤں میں رہتے تھے اور جنھوں نے شامیوں، ایرانیوں اور رومیوں کے رکیک اخلاقی خیالات اپنا لیے تھے اُن کے یہاں، جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، عورتوں کی حالت نہایت خستہ و خراب تھی۔ البتہ بعض بدوی قبیلوں میں عورتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی اور وہ اپنے قبیلوں میں بڑا اثر و نفوذ رکھتی تھیں۔ پیرن (Perron) کے قول کے مطابق "وہ یونانیوں کی عورتوں کی طرح بدنصیب ہستیاں نہ تھیں۔ وہ اپنے مردوں کے ہمراہ لڑائی کے میدانوں میں جاتی تھیں اور اُن کی ہمّت بڑھاتی تھیں۔ جوانمرد اپنی بہنوں، ماؤں اور معشوقاؤں کے گیت گاتے ہوئے دادِ تہوّر دیتے تھے۔ اُن کی سرفروشی کا سب سے بڑا انعام ان عورتوں کی محبت ہوتی تھی۔ مردوں کے لیے سب سے بڑی خوبیاں بہادری اور فیاضی ہوتی تھیں اور عورتوں کا سب سے قیمتی زیور عصمت ہوتا تھا۔ اگر کسی قبیلے کی ایک عورت کی توہین کی جاتی تو اس سے جزیرہ نمائے عرب کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک غصّے کی آگ بھڑک اُٹھتی تھی۔ حرب الفجار، جو چالیس برس تک

---

[1] فرانس کے حماسہ، شانسان دُرولاں "(رولاں کا گیت) کا ہیرو جو قوت شجاعت اور نیکی میں مشہور تھا۔

[2] انگلستان کا ایک تاریخی یا افسانوی بادشاہ جو اپنی گول میز (یعنی حلقۂ بہادراں) کے ساتھ بہادری اور نیکی کے کارناموں کے لیے مشہور ہے۔

[3] فتوت۔ جوانمردی

جاری رہی اور جسے پیغمبرِ اسلامؐ نے بند کرایا، یوں شروع ہوئی کہ عکاظ کے میلے میں کسی ایک جوان لڑکی کی اہانت کی گئی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شعلوں الطبع بدوؤں کے ایک جذباتی دستور کو لے کر اُسے ایک مستقل شعار کی صورت بخشی اور عورتوں کے احترام کو اسوۂ اسلامیہ میں شامل کیا۔ بہت سی ایسی ہدایات کے ساتھ ساتھ جو اس زمانے کی سیدھی سادی اور ناتراشیدہ معاشرت کی آئینہ داری کرتی ہیں، آپؐ کے ارشادات میں کسی اور معلّم کی تعلیمات سے کہیں زیادہ عورتوں کے بارے میں فیاضی اور بہادری کی رُوح رچی ہوئی ہے۔ عیسائیت کی طرح اسلام بھی افراد کی طبیعتوں اور زمانے کے مزاج کے مطابق عملی جامہ بدل لیتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی عورتوں سے جوانمردانہ سلوک کسی اور مذہب یا معاشرتی نظام کی بہ نسبت حقیقی اسلام سے زیادہ گہرا تعلق رکھتا ہے۔

اسلام کا سُورما، حلف الفضول کے بانی کا سچا شاگرد، کمزوروں اور مظلوموں کی دادرسی کرنے کے لیے بھی ہر وقت اُتنا ہی تیار رہتا تھا جتنا دُشمنانِ خدا کے خلاف تیغ و سنان سے جہاد کرنے کے لیے۔ عراق کے میدانوں میں ہو یا عرب کی سرزمین پر، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بیکسوں اور دُکھیاروں کی فریاد سُن کر زرہ پوش غازی اُن کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھا ہو۔ اُس کے کارناموں نے داستانوں کی صورت میں مجسّم ہو کر لشکرگاہ سے قصرِ شاہی تک پہنچ کر بعد میں آنے والی نسلوں کو بہادری کا سبق سکھایا ہے۔ خلیفہ ایوانِ ضیافت میں دسترخوان پر بیٹھا ہوا ہے کہ اس کے کانوں میں ایک عرب لڑکی کی آواز پڑتی ہے، جسے رومی سپاہیوں نے اسیر کر رکھا ہے "عبدالمالک میری مدد کو کیوں نہیں آتا؟" اور وہ وہیں کھانے کی رکابی اپنے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ جب تک لڑکی کو آزاد نہ کرا لے گا اُس وقت تک پانی کا ایک قطرہ بھی اپنے لبوں کو نہ چھوانے گا۔ اُسی وقت وہ اپنا لشکر لے کر رومی او باشوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور لڑکی کو آزادی دلا کر خود اپنے عہد سے آزادی حاصل کرتا ہے۔ ایک مغل شہنشاہ[1] بے دریغ دشمنوں سے جان بچا کر کسی مامن کی تلاش میں اپنی

---

[1] شہنشاہ ہمایوں جب اپنے افغان دشمنوں سے جان بچا رہا تھا (باقی حاشیہ صفحہ ۳۹۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

سلطنت کی سرحد کی طرف چلا جارہا ہے کہ ایک غیر مذہب کی رانی کا بھیجا ہوا ایک کنگن اُسے پیش کیا جاتا ہے، وہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اس کا منہ بولا بھائی ہے جس سے وہ مدد کی التجا کر رہی ہے۔ وہ اپنی مصیبت اور ضرورت کو بھول کر قدم لوٹا لیتا ہے، رانی کے دشمنوں کو شکست دیتا ہے اور از سرِ نو اپنے سفرِ غریب الوطنی پر روانہ ہو جاتا ہے۔

اولسنر (Oelsner) عنترہ کو "شولری" کا باپ کہتا ہے۔ حضرت علی شجاعت "شولری" کا منتہائے کمال تھے، یعنی شجاعت، جرأت اور فیاضی کا ایک مجسمہ، پاکباز، شریف النفس، صاحبِ علم و دانش، بے خوف و بے داغ۔ انھوں نے غازیانہ خلقِ عظیم کی بہترین مثال دنیا کو پیش کی۔ آپ کی پاکیزہ سیرت، جو سیرتِ نبوی کی ہو بہو شبیہ تھی، دنیائے اسلام پر چھا گئی اور آنے والے ادوار کی رُوحِ زندگی بنی۔ صلیبی محاربوں کی بدولت وحشی یورپ کو مشرقِ اسلامیہ کے تمدن سے مس حاصل ہوا اور مسلمانوں کی شان و شوکت اور نفاست کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن جس چیز نے بالخصوص یورپ کو "شولری" سے آشنا کیا وہ اسلامی اندلوسیہ کے وہ اثرات تھے جو اُس کے ہمسایہ عیسائی صوبوں پر پڑے۔ "ٹروبدور" (The Troubadours)، جنوبی فرانس کے "ترووِر" (The Trouveurs) اور جرمنی کے "منی سنگرز" (The Minnesingers) جنھوں نے جنگ میں شجاعت و غیرت کے گیت گائے، قرطبہ، غرناطہ اور ملقا کے رُومان نویس شاعروں (Romanceurs) کے بلا واسطہ اخلاف تھے۔ پیٹرارک[1]، (Petrarch) اور بوکیچیو[2] (Boccacio)، بلکہ ٹیسو[3] (Tasso) اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۸) بچا کر کابل کی طرف کوچ کر رہا تھا تو اسے رانی جودھپور کا کنگن استمداد کی نشانی کے طور پر پیش کیا گیا۔ وہ اپنی مصیبت کو بھول کر فوراً اس کی مدد کو پہنچا۔ میں نے مسلمانوں کی جوانمردی کی صرف دو مثالیں بیان کی ہیں، لیکن سینکڑوں پیش کی جا سکتی ہیں۔

[1] اطالوی شاعر (۱۳۷۴ - ۱۳۰۴ء)

[2] اطالوی افسانہ نویس (۱۳۷۵ - ۱۳۱۳ء)

[3] اطالوی حماسہ نویس - (۱۵۹۵ - ۱۵۴۴ء)

چاسر[1] (Chaucer) بھی اسلام کے سرچشمے سے سیراب ہوئے۔ لیکن یورپ کے وحشیوں کی اُجڈ عادتوں اور فحش خیالوں نے خالص "شولری" کو لے کر کثافت و غلاظت سے آلودہ کر دیا۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مشرقی اسلامی حکومت کے اختتام تک، عورتوں کو قریب قریب ویسا ہی بلند درجہ حاصل تھا جیسا جدید معاشرے میں ہے۔ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے اپنے زمانے کی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے محاسن و فضائل کی بدولت ایسا نام چھوڑا جس کی آئندہ نسلوں نے عزّت کی۔ فروخ مدنی کی بیوی حمیدہ نے اپنے میاں کی غیر حاضری میں، جو بیس سال تک جنگی مہموں میں مصروف تھا، تن تنہا اپنے نو عمر لڑکے کی سرپرستی اور تربیت کی اور اسے تعلیم دے کر اپنے وقت کے برگزیدہ علمائے فقہ کے زمرے میں داخل کر دیا[2]۔ حضرت امام حسینؑ[3] کی بیٹی اور حضرت علیؓ کی پوتی سکینہ اپنے وقت کی عورتوں میں سب سے زیادہ طبّاع و ذہین، باکمال اور پاکباز تھیں۔ پیراں (Perron) اُن کی شان میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے "اپنے زمانے کی خاتونِ خواتین، سب سے جمیل، سب سے سلیقہ الطبع، سب سے بڑھ کر ستودہ صفات" وہ نہ صرف خود اعلیٰ درجے کی فضیلت سے آراستہ تھیں، بلکہ انھیں علماء و اتقیا کی مجلسوں میں شرکت بہت مرغوب تھی۔ رسُولِ خدا کی ازواجِ مطہرات اور خانوادہٴ نبوی کی دوسری خواتین علم و فضل اور زُہد و تقویٰ میں برگزیدہ تھیں۔ خلیفہ مامون الرشید کی بیوی پُوران، اُن کی بہن اُمّ الفضل جو آٹھویں علوی امام کی بیوی تھیں اور مامون کی بیٹی اُمّ الحبیب سب کی سب علم و فضل میں مشہور تھیں۔ پانچویں صدی ہجری میں شیخہ شہدہ، جن کا لقب فخر النسا تھا، بغداد کی جامع مسجد میں ادب، بیان و بلاغت اور شاعری پر بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب کیا کرتی تھیں۔ اسلام کی تاریخ میں انھیں ممتاز ترین علماء کے برابر رُتبہ حاصل ہے۔ اگر یہ خاتون سینٹ سرل (Saint Cyril) کے

---

[1] انگریزی شاعر (۱۴۰۰ – ۱۳۴۰ء)

[2] عمر فروخ، ۲۷ سال تک خراسان میں مصروفِ جنگ تھا۔ اس کے بیٹے کا نام ربیعۃ الرّے تھا۔

[3] حضرت امام حسینؑ کی شادی آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی سے ہوئی تھی۔

ہم مذہبوں میں ہوتیں تو اُن کا کیا حال ہوتا اس کا اندازہ ہائی پیشیا (Hypatia) کی سرگزشت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ جوشیلے عیسائی اُن کی تکا بوٹی نہ کر دیتے۔ لیکن یہ تو یقینی ہے کہ انھیں ایک جادوگرنی کی طرح جیتے جی آگ میں جلا دیا جاتا۔ ذاتِ الہمۃ[1] رشیر کے دل والی جن کے نام کو بگاڑ کر ذمّہ (Zemma) کہا جاتا ہے کئی جنگوں میں شریک اور مردوں کے دوش بدوش تیغ آزما ہوئیں۔

رسُولِ عربی کے توانین وہدایات کی بدولت عورتوں کی حیثیت میں جو بہتری ہوئی اُس کا اعتراف تمام غیر متعصّب مصنفین نے کیا ہے، لیکن متعصّب کج بحث اب بھی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام نے عورتوں کی حیثیت کو پست کر دیا۔ اس سے جھوٹا الزام اسلام کے عظیم بانی پر نہیں لگایا گیا۔ اُنیس صدیوں کی مسلسل ترقی نے ایک قدیم تر تہذیب کے ورثے سے ساتھ مل کر اور انتہا درجے کے موافق نسلی حالات اور آب وہوا سے فائدہ اُٹھا کر بیشتر عیسائی ملکوں میں عورتوں کو مردوں سے بلند تر معاشرتی درجہ عطا کر دیا ہے اور آداب و مراسم کا ایک ایسا ضابطہ قائم کر دیا ہے جو کم از کم بظاہر عورتوں کو یہ حق بخشتا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں اُن کا زیادہ احترام کیا جائے، لیکن عیسائی دنیا کی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوموں میں بھی عورتوں کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ ماضیٔ قریب تک اور تو اور انگلستان میں بھی ایک شادی شدہ عورت کو اپنے خاوند سے علیحدہ کوئی حقوق حاصل نہ تھے۔ اگر مسلمان عورت نے آئندہ سو برس میں اپنی یورپین بہن کے برابر معاشرتی درجہ حاصل نہ کر لیا تو نظامِ اسلامی کے خلاف جوشیلی تقریریں حق بجانب ہوں گی۔ لیکن جس معلّم نے ایک ایسے زمانے میں جب کوئی ملک، کوئی نظام، کوئی جماعت عورت کو، چاہے وہ کنواری ہو یا بیاہی ہوئی، ماں ہو یا بیوی، کسی قسم کے حقوق نہ بخشتی تھی اور ایک ایسے ملک میں جہاں بیٹی کی پیدائش کو ایک بلائے آسمانی سمجھا جاتا تھا، عورتوں کو ایسے حقوق عطا کیے جو بیسویں صدی میں بھی مہذب قومیں انھیں طوعاً و کرہاً اور بامرِ مجبوری

---

[1] اسلام کی ممتاز خواتین کے مکمل تذکرہ کے لیے دیکھیے،
'*Nineteenth Century*' (May 1899) and *The Short History of Sarances*

دے رہی ہیں، وہ معلّمِ نوعِ انسانی کے تشکریے کا مستحق ہے۔ اگر پیغمبرِ اسلامؐ اور کچھ بھی نہ کرتے تو پھر بھی انھیں محسنِ انسانیت کہلائے جانے کا غیر متنازعہ فیہ حق پہنچتا تھا۔ فقہ کی کتابوں میں جس طرح قوانینِ اسلامی مندرج ہیں اگر انھیں اُس طرح بھی قبول کر لیا جائے تو اس صورت میں بھی مسلمان عورتوں کی قانونی حیثیت یورپی عورتوں کی قانونی حیثیت سے بہت بہتر ہے۔ ہم اس موضوع سے ایک اور جگہ تفصیلی بحث کر آئے ہیں۔ یہاں ہم صرف اتنا کریں گے کہ ضابطۂ اسلامی میں عورتوں سے متعلق جو قوانین ہیں اُن پر ایک اجمالی نگاہ ڈالیں۔ جب تک عورت ناکتخدا رہتی ہے وہ اپنے ماں باپ کے زیرِ سایہ بسر کرتی ہے، اور جب تک وہ سنِ بلوغ کو نہیں پہنچتی وہ کسی نہ کسی حد تک باپ یا اُس کے نمائندے کے قبضۂ اختیار میں ہوتی ہے، لیکن جس دن وہ سنِ بلوغ کو پہنچے اسی دن قانون اُسے وہ تمام حقوق بخش دیتا ہے جو ایک خود مختار فردِ انسانی کی حیثیت سے اس کا پیدائشی ورثہ ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے دوش بدوش اپنے ماں باپ کی جائداد کی وارث ہوتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس کا حصہ نسبتاً کم ہوتا ہے، لیکن یہ امتیاز بھائی اور بہن کی اضافی حیثیت پر مبنی ہے۔ اگر کوئی عورت بالغ و عاقل ہو تو کسی قسم کے حالات میں بھی اُس کی شادی اُس کی علانیہ رضامندی کے بغیر "کسی بادشاہ سے بھی"[1] نہیں کی جا سکتی۔ شادی کے بعد وہ اپنی انفرادیت سے محروم نہیں ہو جاتی بلکہ معاشرے کا ایک خود مختار فرد رہتی ہے

شادی سے پہلے خاوند کا بیوی کو مہر دینا ایک لازمی شرط ہے۔ اور اگر وہ اپنی خوشی سے مہر نہ دے تو قانون اُس کی رقم عورت کی حیثیت کے مطابق مقرر کر دیتا ہے۔ مسلمانی طریقے کا نکاح ایک قانونی معاہدہ ہوتا ہے، جس کے لیے نہ کسی قاضی کا التزام ہے نہ کسی رسم کا۔ معاہدۂ عقد مرد کو عورت کے وجودِ جسمانی پر کوئی اختیار نہیں بخشتا سوائے اس اختیار کے جس کی تصریح قانون کرتا ہے، اور نہ وہ اُسے عورت کے اموال و املاک پر کوئی اختیار بخشتا ہے۔ ایک ماں کی حیثیت سے اُس کے جو حقوق ہیں وہ انفرادی قاضیوں کی من مانی رایوں پر مبنی نہیں ہوتے۔ نہ کسی مسرف خاوند

---

[1] مسلم فقہا کے یہ قانون وضع کرنے کے صدیوں بعد عیسائی دنیا کے بادشاہ و اُمرا اکثر اپنی رعایا عورتوں کی شادی اُن کی مرضی کے خلاف کر دیا کرتے تھے۔

کو یہ اختیار ہے کہ وہ بیوی کی ذاتی محنت کی کمائی کو ضائع کرے، نہ کسی ظالم خاوند کو یہ قدرت ہے کہ بے خوفِ پاداشں بیوی سے بدسلوکی کرے۔ اگر وہ بالغ و عاقل ہو تو اپنی ذات اور جائداد سے متعلق ہر معاملے میں وہ خاوند یا باپ کی مداخلت کے بغیر عمل کی مختار ہوتی ہے۔ وہ کھلی عدالت میں اپنے قرض داروں پر کسی رشتہ دار کو شامل کئے بغیر یا اپنے خاوند کے نام کی آڑ لئے بغیر بذاتِ خود دعویٰ دائر کر سکتی ہے۔ جب وہ اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو کر میاں کے گھر جاتی ہے تو وہ اُن تمام حقوق کی مالک رہتی ہے جو قانون مردوں کو دیتا ہے۔ عورت اور بیوی کی حیثیت سے اُسے جو خصوصی رعایات حاصل ہیں اُن کے ضامن محض معاشرے کے آداب و رسوم نہیں جن میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، بلکہ کتابِ قانون کی عبارت ہے۔ بحیثیتِ مجموعی اُس کی حیثیت اکثر یورپین عورتوں سے کمتر نہیں، بلکہ بہت سی باتوں میں یقیناً بہتر ہے۔ اس کی نسبتہً پس ماندہ حالت اسلامی جماعتوں میں تمدن و شائستگی کے عام فقدان کا نتیجہ ہے، نہ کہ قوانینِ اسلامی کی کسی خصوصیت کا۔

چھٹا باب

بندگی (غلامی)

"جہاں تک تمھارے غلاموں کا تعلق ہے، انھیں وہی کھانا دو جو تم خود کھاتے ہو اور ویسے ہی کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو۔" (قولِ رسولِ مقبولؐ)

غلامی کو بعض خصوصیتوں کے اعتبار سے بجا طور پر تعدّدِ ازدواج سے مشابہ کہا گیا ہے۔ تعدّدِ ازدواج کی طرح وہ بھی ہر قوم میں رائج رہی ہے اور فکرِ انسانی کی ترقی اور اس کی حسِ عدل کی نشوونما کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی گئی ہے۔ تعدّدِ ازدواج کی طرح وہ بھی اس نفس پرستی اور رعونت کا نتیجہ تھی جو اجتماعی و انفرادی ارتقاء کے بعض مرحلوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے لیکن جہاں تعدّدِ ازدواج میں کوئی بنیادی بے انصافی نہ تھی وہاں غلامی ابتدا ہی سے اس لعنت میں مبتلا تھی۔

ابتدائی مراحل میں جب نوعِ انسانی کو انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا پورا پورا فہم نہیں ہوتا، جب قوانین محض ایک شخص یا چند اشخاص کے احکام ہوتے ہیں جن کی اطاعت باقی سب لوگوں پر لازم ہوتی ہے، جب زبردستوں کی مرضی سب کے لیے اصولِ زندگی اور دلیلِ راہ ہوتی ہے، اس وقت وہ عدم مساوات، خواہ وہ معاشرتی ہو یا جسمانی یا دماغی، جو فطرت نے نوعِ انسانی میں مقدر کی ہے ہمیشہ غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور نتیجۃً ایک ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے جو اعلیٰ کو ادنیٰ پر مطلق اختیار بخش دیتا ہے[1]۔ کمزوروں کے

---

[1] مقابلہ کے لیے دیکھیے
L' *Influence des Croisades sur L,Etat dest Europe, peuples de L*, by Maxime de Choiseul D' Aillecourt, Paris, 1809.

یوں زبردستوں کے حلقہ بگوش ہونے نے مؤخرالذکر کو یہ توفیق عطا کی ہے کہ انسان پر انجیل کے بیان کے مطابق جو لعنت عائد کی گئی تھی، یعنی یہ کہ "جب تک تو مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہو جاتا اس وقت تک تو اپنے ماتھے کا پسینہ بہا کر روٹی کھائے گا،" وہ اس لعنت سے اپنے آپ کو مبرا کر لیں اور اس طرح جو فرصت انھیں حاصل ہو اُسے مرغوب مشغلوں میں صرف کریں۔ "قدیم آئین" (Ancient Law) کا مصنف کہتا ہے کہ "کسی اور کی جسمانی طاقت کو اپنے آرام و آسائش یا راحت و مسرت کے لیے استعمال کرنے کی خواہش ہی بلاشک و شبہ غلامی کی بنیاد ہے اور یہ خواہش اتنی ہی قدیم ہے جتنی فطرتِ انسانی"[1]

غلامی کا دستور نوعِ انسانی کا ہم عمر ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کے آثار ہر زمانے اور ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا بیج اس وقت پڑا جب انسانی معاشرہ وحشت کے مرحلے میں تھا اور وہ اُس وقت بھی پھلتا پھولتا رہا جب مادّی تہذیب کی ترقی نے اس کی ضرورت کو رفع کر دیا تھا۔

یہودی، یونانی، رُومی اور قدیم المانی قوموں میں جن کے قانونی و معاشرتی اداروں نے جدید زمانے کے رسم و رواج اور شعائر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے، دونوں طرح کی غلامی، یعنی زرعی کمین پن بھی اور خانگی خدمت گذاری بھی، قانوناً جائز اور عملاً رائج تھی۔[2]

جب سے عبرانی ایک ملّت کی حیثیت سے وجود میں آئے اُسی وقت سے اُن کے یہاں دو قسم کی غلامی مروّج تھی۔ ایسے اسرائیلیوں کو جو پاداشِ جُرم میں غلام بنتے تھے غیر نسل کے غلاموں سے اونچا درجہ دیا جاتا تھا۔ اسرائیلی غلام چھ سال کی خدمت کے بعد قانوناً آزاد ہو جاتا تھا، البتہ اس کو اختیار تھا کہ اس قانونی حق سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے،

---

[1] Maine, *Ancient law*, p. 104

[2] Caesar (*De Bell. Gall.* lib. vi), Tacitus (*De Moribus German*. cap. 24,25) And Pothier (De Stat. Servor apud Germ. Lib, i)

یہ سب جرمن غلامی کی سختی پہ شاہد ہیں۔

لیکن غیر ملکی غلام، چاہے وہ اُن قوموں سے تعلق رکھتے ہوں جنھیں بنی اسرائیل نے بیرحمانہ جنگوں کے ایک باقاعدہ سلسلے کے ذریعے زرعی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، یا دغابازانہ حملوں میں گرفتار کئے گئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، بہرصورت آزادی حاصل کرنے کے اس حق سے محروم تھے۔ یہ امتیاز قطعاً قومی جانبداری اور یہودیوں کی خصوصی علیحدگی پسندی پر مبنی تھا[1]۔ ان غلاموں اور لونڈیوں کو سخت سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں۔ چاہے وہ زمینوں کے کمیرے ہوں، چاہے گھروں کے خدمت گزار، اُن سے نفرت کی جاتی تھی، اُنھیں ذلیل سمجھا جاتا تھا اور وہ اپنے بے رحم آقاؤں کی خدمت میں دائمی محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے۔

عیسائیت نے نہ ایک معاشرتی نہ ایک مذہبی نظام کی حیثیت سے غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس نے اس فتنے کو کم کرنے کے لیے نہ کوئی قاعدہ نافذ کیا نہ کوئی اصول وضع کیا۔ غلاموں کی نافرماں برداری کے بارے میں[2] چند جملوں اور آقاؤں کو غلاموں کا معاوضہ ادا کرنے کی نصیحت کے سوا حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں، جیسے کہ وہ عیسوی روایات میں پیش کی گئی ہیں، غلامی کی مذمت میں ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس عیسائیت نے غلام اور لونڈی کو آقا کی مکمل اطاعت کی تلقین کی۔ اُس نے غلامی کو رُومی سلطنت کا ایک مسلّمہ ادارہ پایا اور اس کے مُضر اوصاف کو کم کرنے یا اسے تدریجاً ختم کرنے یا غلاموں کی حالت بہتر بنانے کی ذرّہ برابر کوشش کئے بغیر اُس نے اس نظام کو اپنا لیا۔ ملکی قانون کی رُو سے غلام محض چیز بست کی حیثیت رکھتے تھے۔ عیسائی اقتدار کے تحت بھی اُن کی یہی حیثیت رہی۔ رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آرہی تھی۔ غلام، خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، خالی خولی مال اسباب سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے آقاؤں کو اُن پر زندگی و موت کا اختیار تھا۔ بہرحال اُس

---

[1] احبار ۲۵ - ۴۴ - ۴۵

[2] نیا عہد نامہ۔ تیمتھیس اوّل ۶ - ۲

تدریجی اصلاح کی بدولت جس نے بارہ تختیوں (The Twelve Tables) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین (Hadrian) کے جامع ضابطۂ قوانین میں تبدیل کیا غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود جو رومی شہنشاہوں کی انسان نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں غلام کا وجودِ جسمانی کلیتہً مالک کی مرضی کے تابع تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے، جنھیں ذرا ذرا سے قصور پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے۔

یورپ میں انسانوں کو محض چیزِ ملکیت کی سی جو حیثیت حاصل تھی، عیسائیت کی آمد سے اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی تو وہ صرف کلیسائی منصب داری کے دائرے کے اندر ہوئی۔ ایک غلام راہبیت کا مسلک اختیار کر کے آزادی حاصل کر سکتا تھا، بشرطیکہ تین سال کے اندر کوئی شخص اس کی ملکیت کا دعوےٰ نہ کرے[1]۔ لیکن اور باتوں کے لحاظ سے غلامی کا دور دورہ اسی طرح برقرار رہا جیسا عہدِ مشرکیت میں تھا۔ ایک عیسائی شہنشاہ کے زیرِ حکومت قوانین کا جو خلاصہ مرتب ہوا اس نے اعلان کیا کہ غلامی قانونِ فطرت ہے اور ضابطۂ رومی نے غلاموں کی زیادہ سے زیادہ قیمت ان پیشوں کے مطابق مقرر کی جن کے لیے وہ مطلوب ہوتے تھے غلام اور لونڈی کی باہمی شادی قانوناً تسلیم نہ کی جاتی تھی۔ غلام مرد کی شادی آزاد آزاد عورت سے اور غلام عورت کی شادی آزاد مرد سے قطعاً ممنوع تھی اور شدید سزاؤں کی متوجب سمجھی جاتی تھی[2]۔ اس کا نتیجہ تھا غیر محدود جاریہ بازی، جس پر کلیسائی منصب دار بھی کاربند تھے[3]۔

---

[1] Milman, *Latin Christianity*, vol. i, p-358

[2] اگر کوئی آزاد عورت کسی غلام سے شادی کر لیتی تو اس کے لیے سزاؤں میں ایک سزا یہ تھی کہ وہ قتل کر دی جاتی اور غلام کو زندہ جلا دیا جاتا۔ Millman نے *Latin Christianity* (ii، v) میں اس موضوع پر جو شاندار باب لکھا ہے وہ اپنے مدافعانہ انداز کے باوجود قابلِ ملاحظہ ہے۔

[3] Milman, *Latin Christianity*, vol. ii, p. 369, Du Cange, *Concubina*,

یہ تھی صورتِ حال غلامی کی اُس نظامِ قوانین کے تحت جو دنیائے قدیم کا سب سے ترقی یافتہ نظام تھا۔ یہ قانون تیرہ صدیوں کی دانشمندی کے آئینہ دار تھے اور اُن کے ارتقا کے آخری دور میں دنیا کے بزرگ ترین معلمانِ اخلاق میں سے ایک معلم کی تعلیمات کا تھوڑا سا پیوند بھی اُن پر لگ چکا تھا۔

جب رومی سلطنت کے کھنڈروں پر مغربی اور شمالی وحشیوں کی حکومت کی بناء رکھی گئی تو انفرادی غلامی کے علاوہ علاقائی غلامی بھی، جس سے رومی ناآشنا تھے، نوآباد ملکوں میں عام ہوگئی۔ آقاؤں کو اپنی رعایا اور اپنے زرعی غلاموں پر جو مختلف اختیارات تھے وہ اخلاقی زبونی اور پستی کا ایک کراہت انگیز نقشہ پیش کرتے تھے[1]۔ رومی ضابطے کی طرح بربری ضابطے بھی غلامی کو نوعِ انسانی کی ایک معمولی حالت تصور کرتے تھے اور اگر غلام کو کسی طرح کی امان وحفاظت میسر تھی تو محض اپنے آقا کے مملوک کی حیثیت سے، جو حکومت کے علاوہ اُس کی زندگی و موت کا واحد مختار ہوتا تھا۔

عیسائیت غلامی کو محو کرنے یا اُس کی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں یکسر ناکام رہی تھی۔ اور تو اور، خود کلیسا کے قبضے میں غلام تھے اور وہ صریح الفاظ میں اس مُضر دستور کو مطابق قانون تسلیم کرتا تھا۔ کلیسا کے زیرِ اثر یورپ کے عظیم ترین مقننوں نے غلامی کی حمایت

---

[1] مقابلے کے لیے دیکھیے: De Choiseul نیز ملاحظہ کیجیے اس موضوع پر Stephan: *Commentaries on the Laws of Englland*, book. ii, part. I, Chapter. II

مالکِ زمین کو جو قابلِ نفرت خصوصی حقوق برطانیہ میں حاصل تھے، اُن میں سے ایک کا نام Culiage تھا، جسے بعد میں جرمانہ میں تبدیل کر دیا گیا، جیسا کہ صحیح طور پر خیال کیا گیا ہے۔ انگلستان کے بعض حصوں میں اراضی کی وراثت کا جو قانون رائج ہے، اور جسے Borough English کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اسی Culiage کے رواج پر ہے۔

کی تھی اور اس پر اصرار کیا تھا کہ وہ ناداری اور چوری کے انسداد کا ایک مفید وسیلہ ہے[1] اور کلیسا کے زیر اثر ہی امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے اعلیٰ تمدن سے آراستہ عیسائیوں نے اُن بدقسمت انسانوں کو جو غلامی کی حیثیت سے ان کے قبضۂ اختیار میں تھے (اور جن میں بہت سے ان کے ہم نسل تھے) انسانیت سوز سلوک کا تختۂ مشق بنایا اور غلامی کی لعنت کو برقرار رکھنے کی خاطر لہو کی ندیاں بہائی ہیں۔ اگر کسی شخص میں کسی ادنیٰ نسل کے خون کا شائبہ بھی ہوتا تو چاہے اس کے کوئی آثار بھی نمایاں نہ ہوں وہ اُسے غلاموں کی تمام عقوبتوں کا مورد بنانے کے لیے کافی تھا۔ نیگرو لونڈیوں کے ساتھ سفید رنگ مردوں کے ناجائز تعلقات سے جو بچے پیدا ہوتے اُن کے باپ اُنھیں کبھی قانوناً اپنی اولاد تسلیم نہ کرا سکتے تھے۔ کوئی سفید رنگ مرد اپنی نیگرو لونڈی سے عقد نہ کر سکتا تھا۔ اس کے ناجائز بچوں کی ماں کو بھی اور خود بچوں کو بھی اُس کی سفید رنگ بیوی جب چاہتی بیچ سکتی تھی۔ خدا کی نگاہوں میں انسانوں کی مساوات سے متعلق داعیٔ عیسائیت کی جو تعلیمات تھیں عیسائیت اُن کی رُوحِ رواں کو سمجھنے سے قاصر رہی۔

اسلام رنگ و نسل کے کسی امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا۔ سفید و سیاہ، شہری و فوجی، حاکم و رعایا، سب اس کے نزدیک نہ صرف نظری طور پر بلکہ عملی طور پر بھی کاملاً مساوی ہیں۔ میدانِ کارزار ہو کہ مہمان خانہ، خیمہ ہو کہ شاہی محل، مسجد ہو کہ بازار، ہر جگہ مسلمان بلا تکلف و بلا اکراہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اسلام کا پہلا موذّن، پیغمبرِ اسلامؐ کا ایک باوفا رفیق اور معزز صحابی، ایک حبشی غلام تھا۔ سفید فام عیسائی کے لیے اس کا سیاہ فام ہم مذہب آسمانی بادشاہی میں اس کا ہمسر ہو تو ہو، اس دنیا کی بادشاہی میں ہرگز نہیں۔ مسیح کی حکومت میں

---

1. Pufendorff, *Law of Nature and Nations*, book. vi. C, 3, 5, 10, Ulricus Huberus, Praelect Jur. cire. 1. i. tit. 4, 5,6, Pothier, *De statu Servorum*, and Grotius, De Jure Bell, 1,ii.c.5,s,

ہو تو ہو مسیحیت کی حکومت میں مطلقاً نہیں ممکن ہے قانون اسے مجبور کرے اور خون کی ندیوں میں بہ کر آیا ہوا ایک وسیع تر تصورِ انسانیت اس سے تقاضا کرے کہ اپنے سیاہ فام بھائی کو شہری حقوق عطا کرے لیکن نسل و رنگ کا غرور مساوات کا اعتراف نہیں کرتا۔ چنانچہ خدا کے گھر میں بھی سفید فام اور سیاہ فام ایک دوسرے سے علیحدہ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات نے غلامی کے رواج کو ایک ضربِ شدید لگائی، اور اگر ہمسایہ قوموں میں اُس کی جڑیں اتنی گہری نہ ہوتیں اور انسانی فطرت میں کچھ ردی نہ ہوتی تو اُس وقت جو لوگ اس رواج پر کاربند تھے اُن کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی وہ خود بخود معدوم ہو جاتا۔

بجا طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ چونکہ اسلام کے قوانین، احکام اور تعلیمات کی اشاعت کو بیس سال لگے، اس لیے قدرتی طور پر زمانۂ ماقبلِ اسلام کے بہت سے دستور جو بعد میں منسوخ ہو گئے شروع میں یا تو خاموشی سے جاری رہنے دیئے گئے یا علانیہ قانوناً تسلیم کر لیے گئے۔[1] انہی میں ایک غلامی کا دستور تھا۔ یہ ایک بُرائی تھی جو عربوں کے گھر سے گھر سے باہمی تعلقات کے تار و پود سے گندھی ہوئی تھی۔ اسے محو کرنے کا طریقہ یہ نہ تھا کہ جتنے غلام اُس وقت موجود تھے اُن سب کو فی الفور آزادی دے دی جاتی (جو کہ اخلاقی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے ناممکن تھا) بلکہ یہ کہ باحکمت اور انسانیت نواز قوانین کے ذریعے اُسے آہستہ آہستہ زائل کیا جاتا۔ چنانچہ بہت سے قوانین سلبی بھی اور ایجابی بھی، غلاموں کی آزادی کو رفتہ رفتہ وجود میں لانے کی خاطر وضع کیے گئے۔ اگر اس کے مخالف کوئی طریقِ عمل اختیار کیا جاتا تو نوزائیدہ جمہوریہ کی عمارت زمیں بوس ہو جاتی۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے بار بار خدا کے نام پر اپنے تابعین کو تلقین کی کہ وہ غلاموں کو رہائی بخشیں "جس سے بڑھ کر کوئی عمل اللہ کو قبول نہیں"۔ آپؐ نے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص اپنے

---

[1] تہذیب الاخلاق، ۱۵ رجب ۱۲۸۸ھ صفحہ ۱۱۸۔

غلام سے متعلق بعض فرائض ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو اُس کی سزا یہ ہو کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ آپؐ نے یہ حکم بھی دیا کہ غلاموں کو خدمت کی اُجرت کے طور پر آزادی حاصل کرنے کا حق ہونا چاہیئے اور اگر کوئی غلام جس کے پاس فدیہ ادا کرنے کے لیے کافی رقم نہ ہو کسی اور جگہ کام کر کے فدیے کی رقم ادا کرنا چاہے تو آقا کو چاہیئے کہ اس کے ساتھ معاہدہ کر کے اسے اس کی اجازت دے دےؔ۔ آپؐ نے یہ مزید ہدایت کی کہ غلاموں کو فدیہ ادا کرنے کے لیے بیت المال سے قرض دیا جائے۔ بعض بعض صورتوں میں حکم دیا گیا کہ آقا کی مداخلت کے بغیر بلکہ ضرورت ہو تو اُس کی مرضی کے خلاف غلام کو آزاد کر دیا جائے۔ اگر کسی معاہدے یا پیمان میں ذرا سے شک وشبہ کی بھی گنجائش ہوتی تو اس کی تعبیر غلام کے حق میں کی جاتی اور اگر آقا کی طرف سے آزادی کا تھوڑا سا وعدہ بھی ہوتا تو غلام کو آزادی دلانے کی خاطر اس پر عمل کرایا جاتا۔ نبیٔ کریمؐ نے غلاموں سے مہربانی کو وہی درجہ دیا جو آپؐ نے "رشتہ داروں، ہمسایوں، ہم سفروں اور مسافروں" کے حقوق ادا کرنے کو دیا۔ آپؐ نے آزادیٔ غلاماں کی تا حدِّ امکان ہمت افزائی کی اور یہ ہدایت بھی کی کہ آزادی کے علاوہ "اس دولت کا جو تمھیں خدا نے مرحمت فرمائی ہے ایک حصّہ اُنھیں دو" علاوہ بریں آپؐ نے آقاؤں کو اس کی ممانعت کی کہ وہ غلاموں اور لونڈیوں پر اپنے اقتدار کو شہوت رانی کی خاطر استعمال کریں اور وعدہ فرمایا کہ جن غلاموں اور لونڈیوں سے یہ زیادتی کی جائے گی خدا اُن پر رحم کرے گا اور زیادتی کرنے والوں کو سزا دے گا۔ کسی مومن کے لاعلمی میں قتل کرنے کا یا بعض قسم کی دروغ گوئیوں کا کفّارہ ایک غلام کو آزاد کرنا تھا۔ تعلیماتِ محمّدی کا سارا مطلب ومنشا ہی یہ تھا کہ غلاموں کو محض چیزِ بست سمجھنے کو اور ذات پات کی تفریق کو ناممکن بنا دیا جائے۔

"غلامی کا لفظ جس معنیٰ میں انگریزی میں Slavery استعمال ہوتا ہے اس معنی میں اسلامی قانون کے تحت اس کا اطلاق کسی شخص کی حیثیت پر نہیں ہو سکتا۔

شارعِ اسلام نے حکم دیا کہ اگر کوئی پناہ گیر اسلامی مملکت میں پناہ لے تو اُس میں قدم رکھتے

ؔ النور۔ ۳۳ وغیرہ۔

ہی آزاد ہو جائے، لونڈی کی اولاد کو اپنے باپ کی حیثیت عطا کی جائے اور باپ کی موت پر لونڈی کو آزادی حاصل ہو جائے، غلام اپنی آزادی کے لیے آقا سے عہد و پیمان کر سکے اور زکوٰۃ کے محاصل کا ایک حصّہ غلاموں کا فدیہ ادا کرنے کی خاطر استعمال کیا جائے۔ آقاؤں کو اپنے غلاموں سے اُتنا ہی کام لینے کی اجازت تھی جتنا از روئے انصاف اُن سے لیا جانا چاہیئے تھا اور جتنا اُن کی حدِ مقدور کے اندر تھا۔ اُنھیں تاکید کی گئی تھی کہ غلاموں سے غلام کہہ کر خطاب نہ کریں، بلکہ "میرا بچّہ" اور "میری بچّی" کے شفقت آمیز الفاظ سے پکاریں۔ اور اُنھیں اسی طرح کا لباس پہننے کو دیں جیسا وہ خود پہنتے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ کسی حالت میں بھی ماں کو بچّے سے، بھائی کو بھائی سے، باپ کو بیٹے سے، میاں کو بیوی سے اور ایک رشتے دار کو دوسرے رشتے دار سے جُدا کرنے کی اجازت نہ تھی[1]۔

معلّمِ عربیؐ نے غلاموں سے سلوک کے بارے میں جو اخلاقی قوانین بنائے اُن میں آقا و غلام کے باہمی فرائض اُس یک طرفہ طریقے پر مقرر نہ کیے گئے تھے جو اکثر دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے[2]۔ انسانی فطرت کے ایک نسبتہً زیادہ عمیق اور زیادہ صحیح علم کی مدد سے آپؐ نے محسوس کیا کہ طاقت وروں سے متعلق جو فرائض کمزوروں پر عائد ہوتے ہیں اُن کی تعیین اتنی ضروری نہیں جتنی اُن فرائض کی جو طاقت وروں پر کمزوروں کے بارے میں واجب ہیں۔ اسلام کے نزدیک غلام ہونے میں کوئی عار نہیں، غلام ہونا محض ایک اتفاقی حادثہ ہے، نہ کہ فطرت کا ایک انتظام، جیسا کہ ملکی قوانین اور آبائے کلیسا تصور کرتے ہیں۔ رسولِ خدا کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ کو اکثر فوجوں کی قیادت پر مامور کیا جاتا تھا اور بڑے بڑے اشراف بطیبِ خاطر

---

[1] میں ان مطالب پر اسناد پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ یہ مسلّمہ امور ہیں بہرحال مشتاقانِ علم اُن احادیث سے جو مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور بحار الانوار میں جمع کی گئی ہیں اپنی تشنہ کامی کی تسکین کر سکتے ہیں۔ مؤخر الذکر میں اہل بیت النبی کی فیاضی اور جود و سخا کی بے شمار مثالیں جمع کی گئی ہیں۔

[2] نیا عہد نامہ کلیسوں کے نام خط بابؔ ۔ ۲۲ تیمتھس کے نام پہلا خط باب ۔ ۱

اُن کے تابعِ فرمان ہوتے تھے۔ حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ اس لشکر کے سپہ سالار تھے جو حضرت ابوبکرؓ نے یونانیوں کے خلاف مہم پر بھیجا۔ قطب الدین ایبک، دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ اور اس اعتبار سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اصلی بانی، ایک غلام تھا۔ اسلام میں جس غلامی کی اجازت تھی وہ اس غلامی سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھی جو کل تک دنیائے عیسائیت میں رائج تھی یا جو امریکہ میں ۱۸۶۵ء تک رائج تھی جب کہ ایک مذہبی جنگ نے اُس لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

اسلام میں آج کا غلام کل کا وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وہ کسی کی چہ میگوئیوں کے بغیر اپنے آقا کی بیٹی سے شادی کر سکتا ہے اور خاندان کا سربراہ بن سکتا ہے۔ غلاموں نے سلطنتوں پر حکومت کی ہے اور شاہی خاندانوں کی بنا ڈالی ہے۔ محمود غزنوی غلام زادہ تھا۔ کیا عیسائیت اس کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟ کیا عیسائیت اپنی تاریخ کے اوراق میں غلاموں کے ساتھ اس قسم کے انسانیت نواز سلوک کی کوئی رُوداد دکھا سکتی ہے؟

ہم نے جو کچھ اُوپر بیان کیا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ شارعِ اسلام نے غلامی کو ایک عارضی رواج تصور کیا اور آپ کو یقین تھا کہ ترقیٔ افکار اور تغیرِ حالات کی بدولت اس کا ایک دن خاتمہ ہو جائے گا۔ قرآن غلاموں کا تذکرہ ہمیشہ ان الفاظ میں کرتا ہے کہ غلام وہ ہیں جنھیں تم نے اپنے دائیں ہاتھ سے حاصل کیا ہے۔" قرآن کے نزدیک غلام یا لونڈیاں حاصل کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اس کے نزدیک صرف ایک قسم کی غلامی جائز تھی، یعنی جہادِ شرعی میں اسیر کئے ہوئے لوگوں سے خدمت وصول کرنا۔ تمام وحشی اقوام میں اسیرانِ جنگ کی جان بخشی محض خود غرضانہ مقاصد سے کی جاتی ہے[1] یعنی ان کے زرِ فروخت یا

---

[1] ملاحظہ کیجئے Milman, *Latin Christianity*, vol. ii, p. 387

قدیم قانون سازوں کے نزدیک جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حق انھیں قتل کر دینے کے حق پر مبنی تھا۔ اس بارے میں Albericus Gentilis (*De Jur*). *Gent. cap.* de Survitude, Grotius. اور ربانی حاشیہ صفحہ ۴۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

اُن کی محنت کے ذریعے انفرادی یا قومی دولت میں اضافہ کرنے کی خاطر[1]۔ دوسری قدیم قوموں کی طرح اعرابِ جاہلیت بھی اپنے قیدیوں کی جاں بخشی صرف نفع اندوزی کے مقصد سے کرتے تھے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رواج کو عربوں میں متداول پایا۔ اس موضوع پر نظریہ بازی یا حکمت فروشی کرنے کے بجائے آپ نے عربوں کی ہدایت کے لیے سخت قاعدے وضع کیے اور حکم دیا کہ صرف ایسے لوگ غلام بنائے جا سکتے ہیں جو ایک جائز جنگ یعنی جہادِ شرعی میں گرفتار کیے گئے ہوں اور وہ بھی اس وقت تک جب تک اُن کا فدیہ ادا نہ کیا جائے یا وہ خود خدمت کی اُجرت کی شکل میں اپنی آزادی کی قیمت ادا نہ کر دیں۔ بلکہ جب کبھی یہ طریقے بھی پوری طرح کامیاب ثابت نہ ہوتے تھے تو آپ مسلمانوں کے جذبۂ اتقاء کو حرکت میں لاتے اور انھیں غلاموں کے مالکوں کے بھاری بھر کم فرائض یاد دلاتے تھے جس کا نتیجہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ آقا غلاموں کو آزادی عطا کر دیتے تھے۔ بردہ اندوزی اور بردہ فروشی کو جس کی سرپرستی عیسائیت کرتی تھی[2]، اور جس کی اجازت یہودیت نے دی تھی، مطلقاً مردود و نامحمود قرار دیا گیا۔ غلاموں کی تجارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۳) Pufendorff نے ان کا تتبع کیا۔

Montesquieu پہلا قانون ساز تھا جس نے جنگی قیدیوں کو ہلاک کرنے کے اس فرضی حق سے انکار کیا۔ اِلّا اس صورت میں کہ یہ قطعاً ناگزیر ہو یا تحفظِ نفس کے لیے ضروری ہو۔

Spirit of laws. کے مصنف نے اس کا انکار اس لیے کیا کہ وہ کلیسا کی غلامی سے آزاد تھا۔

[1] Milman: Hist. of the Jews, vol. iii, p. 48

[2] کرامویل کے ہاتھوں ڈروہیڈا کے قتلِ عام اور آئرلینڈ کی بغاوت کے فرو کیے جانے کے بعد انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے آئرلینڈ کے مردوں اور عورتوں کو ورجینیا، پنسلوانیا اور دوسرے مقامات کے نوآبادکاروں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ Monmouth کی بغاوت کے بعد پھر یہی ہوا۔

کرنے والے کو مطعون خلائق کہا گیا۔ غلاموں کو آزادی دینے کو ایک افضل کارِ ثواب بیان کیا گیا[1]۔ کسی مسلمان کو غلام بنانے کی قطعی ممانعت کی گئی، لیکن یہ ایک شرمناک حقیقت ہے کہ بہت سے مدعیانِ اسلام نے اسلامی قوانین کی ظاہری تعمیل تو کی مگر معلمِ اسلامؐ کی ہدایات کی روح سے کامل تغافل برتا اور ان ہدایات کے علی الرغم غلامی کی گرم بازاری کو خرید و فروخت اور دوسرے ذرائع سے برقرار رکھا۔ قرآنی آئین کے تحت کسی غلام کو قبضے میں لانے کی بنیادی شرط یہ تھی کہ وہ کسی ایسی لڑائی میں ہاتھ آیا ہو جو خلوصِ نیت سے دفاعِ ذات کی خاطر کافر و مشرک جارحین سے لڑی گئی ہو اور اس کی اجازت اس مقصد سے دی گئی تھی کہ وہ جنگی قیدیوں کی حفاظت و سلامتی کی ضمانت بنے۔ آس پاس کی قوموں اور قبیلوں کی دشمنی کی بدولت امتِ مسلمہ ابتداً جس حالتِ جنگ و جدال میں مبتلا تھی، اس حالت کی تبدیلی خود بخود غلامی کا خاتمہ کر دیتی، کیونکہ نئے غلام قبضے میں لائے جاتے اور جو موجود تھے وہ رفتہ رفتہ آزاد ہو جاتے۔ لیکن، یا تو مشرق و مغرب کی اخلاقاً زوال یافتہ قوموں اور شمال کی وحشی نسلوں سے مس کے باعث یا اس وجہ سے کہ لعنتِ غلامی کی جڑیں معاشرے کے ہر طبقے میں گہری گڑی ہوئی تھیں، بہت سے مسلمانوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح غلامی کی رسم کو جائز سمجھا اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن وحشی ترکمان یا افریقی عرب، جو غلام اندوزی کی تخریب مشق کرتے ہیں، اسی قدر اسلام کے نمائندے ہیں جس قدر جنوبی امریکہ کے گیاہستانوں کی بادیہ نوردی کرنے والے گواچو Guacho عیسائیت کے نمائندے ہیں[2]۔ تعددِ ازدواج کی طرح غلامی کی رسم بھی، جو نوعِ انسانی کی نشو و نما کے کسی نہ کسی

---

[1] امام جعفر صادق کی ایک مشہور اور مسلم الثبوت روایت کے مطابق۔

[2] ترکمان (جو متشدد سنی تھے) شارعِ اسلام کے حکم کی لفظی خلاف ورزی سے بچنے کی خاطر اپنے قیدیوں کو (چاہے وہ سنی ہوں یا شیعہ) اپنے آپ کو کافر کہنے پر مجبور کرتے تھے۔ اسی طرح افریقی عرب کافر حبشیوں کی بستیوں پر چھاپے مارتے ہیں۔ انھیں وہ جہاد کا نام دیتے ہیں۔ مشہور افریقی سیاح Mr. Joseph Thompson لنڈن ٹائمز کے شمارہ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۱۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

مرحلے میں ہر قوم میں رائج تھی۔ اب کم از کم ان قوموں میں جو تہذیب یافتہ ہونے کی مدعی ہیں غیر ضروری ہو گئی ہے، کیونکہ جن مقاصد کے لیے وہ وجود میں آئی تھی وہ اب معدوم ہو چکے ہیں، اور یقینی ہے کہ جلد یا بدیر وہ غائب ہو جائے گی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ اسلام نے، جیسا کہ از روئے مخاصمت دعویٰ کیا جاتا ہے، غلامی کو "تقدس" نہیں بخشا، بلکہ غلاموں کی ملکیت کو تنگ ترین دائرے کے اندر محصور کر کے اس رسم کے نیست و نابود کرنے کا ہر ممکن اہتمام کیا ہے۔ اسلام نے کسی من مانے حل سے اس اہم مسئلے کو سلجھانے کی کوشش نہیں کی۔ جب اس نے تمام افرادِ انسانی کی فطری مساوات کا شدّ و مدّ سے اعلان کیا تو اس نے یہ نہیں کیا کہ اسی وقت، نتائج سے بے نیاز ہو کر، تمام غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کا اعلان بھی کر دے۔ ابھی دنیا انسان کی اخلاقی و ذہنی آزادی کے اس درجے کے لیے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس قسم کا اعلان بڑی خرابیوں کا باعث ہوتا۔

انسانی جسم کے قطعِ اعضاء کی بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے صریح الفاظ میں ممانعت کی اور اس دستور کی، جو ایرانی اور بازنطینی دونوں سلطنتوں میں رائج تھا، سخت الفاظ میں مذّمت کی۔ خلفاء راشدین کے زمانے میں غلاموں کی خرید و فروخت کا دستور نہ تھا۔ کم از کم اس امر کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱۵) مورخہ ۱۴۔ نومبر ۱۸۸۷ء میں ایک خط میں مشرقی افریقہ میں غلامی کے موضوع پر یوں رقمطراز ہیں: "میں کسی پس و پیش کے بغیر کہتا ہوں اور آپ کے تمام نامہ نگاروں کے مقابلے میں مشرقی مرکزی افریقہ کے زیادہ تجربے کی بناء پر کہتا ہوں کہ اگر ان علاقوں میں غلاموں کی تجارت جاری ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اسلام کی اشاعت نہیں ہوئی۔ اسلام کی اشاعت کے معنی یہ ہوتے کہ غلاموں کی تجارت بالکل بند ہو جاتی۔ جن پُر امن طریقوں سے اسلام مغربی افریقہ اور مرکزی سوڈان میں پھیلا ہے ان کی جو کیفیت مسٹر تھامپسن نے بیان کی ہے وہ ہر قاری کی توجہ کی مستحق ہے۔ وہ کہتے ہیں: یہ یہاں اسلام ایک زندہ اور فاعل قوت ہے، جس میں وہی ابتدائی ایام کی توانائی اور تب و تاب ہے اور اسے اپنی تبلیغ میں اسی طرح کی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔"

کوئی مستند تحریری شہادت موجود نہیں کہ اُن کے عہد میں کسی شخص کو خرید کر غلام بنایا گیا ہو۔ لیکن بنو اُمیّہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی اسلام کی رُوح میں ایک تغیّر واقع ہو گیا۔ حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے لوگوں کو خرید کر غلام بنانے کے دستور سے دنیائے اسلام کو روشناس کرایا۔ اسی طرح وہ پہلے خلیفہ تھے جنھوں نے حرم شاہی کی حفاظت پر خواجہ سرا مامور کیے۔ ابتدائی خلفائے عباسی کے عہد میں امام جعفر صادق نے غلامی کے خلاف تبلیغ شروع کی۔

اب وقت آ گیا ہے جب نوعِ انسانی کو بحیثیتِ مجموعی چاہیے کہ غلامی کے خلاف چاہے وہ کسی شکل یا نام کے بھیس میں ہو، صدائے احتجاج بلند کرے۔ بالخصوص مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے عظیم پیغمبر کی عزت کی خاطر اپنی تاریخ سے اس سیاہ صفحے کو محو کر دیں۔ یہ صفحہ چاہے دوسرے مذاہب کے مدعیوں کے خوفناک نامۂ اعمال کے مقابلے میں کتنا ہی روشن کیوں نہ دکھائی دیتا ہو، پھر بھی ایک سیاہ صفحہ ہے اور اگر مسلمان اسلامی قوانین کی رُوح کی خلاف ورزی نہ کرتے تو یہ کبھی نہ لکھا جاتا۔ وہ دن آ گیا ہے جب وہ آواز جس نے ساری نوعِ انسانی کی حُرّیت، مساوات اور اخوت کا اعلان کیا تھا چودہ صدیوں کی روحانی زندگی اور روحانی امور سے حاصل کی ہوئی قوت کے ساتھ دوبارہ سُنی جائے۔ یہ مسلمانوں کے کرنے کا کام ہے کہ صریح الفاظ میں یہ اعلان کریں کہ غلامی کو اُن کے مذہب نے معلون اور اُن کے ضابطۂ قانونی نے ممنوع قرار دیا ہے اور اس طرح اُن الزامات کو رَد کریں جو اُن کے عظیم اور خیر البشر نبی پر لگائے گئے ہیں۔

ساتواں باب

اِسلام کی سیاسی رُوح

"ذمّی کا خون اور مسلمان کا خون دونوں ایک جیسے ہیں" حضرت علی رضؓ

اب تک ہم نے رسولِ عربی کی تعلیمات کا امتحان صرف ایک نقطۂ نگاہ سے کیا ہے، یعنی اس نقطۂ نگاہ سے کہ وہ انسانی کردار کے لیے کہاں تک قواعد اور انسان کے جو فرائض اپنے خالق اور اپنے ہم جنسوں کی نسبت ہیں، اُن کے بارے میں کہاں تک ہدایت مہیا کرتی ہیں۔ اب ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ اسلام نے انسانیت پر من حیث المجموع کیا اثر مرتب کیا، یعنی صرف افراد ہی پر نہیں، بلکہ قوموں پر اور من حیث الکلُ نوعِ انسانی کی تقدیر پر۔

اس بات کو سات صدیاں گزر چکی تھیں کہ پیغمبرِ ناصری غریبوں اور زیردستوں کے لیے آسمانی بادشاہی کا پیغام لے کر آیا۔ دعوتِ نبوت ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک حسین و جمیل زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اب کرۂ ارض کی سلطنتوں اور بادشاہیوں پر مکمل مایوسی چھائی ہوئی تھی اور خدا کے بندے، رنج و تعصب میں ڈوبے ہوئے، اس نجاتِ معہود کا بیتابی سے انتظار کر رہے تھے جو آنے میں اتنی دیر لگا رہی تھی۔

کیا مشرق اور کیا مغرب، دونوں میں عوام الناس کی حالت اتنی خستہ و خراب تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ اُنھیں نہ کوئی ملکی حقوق حاصل تھے، نہ کوئی سیاسی رعایات۔ دونوں یا تو دولت مندوں اور طاقت وروں کی بلاشرکتِ غیرے ملکیت تھے یا مذہبی تقدس رکھنے والے طبقوں کی۔ امیر و غریب، قوی و ضعیف، اعلیٰ و ادنیٰ کے لیے ایک ہی قانون نہ تھا۔

ساسانی ایران میں کشیش اور زمینوں کے مالک جنھیں دہقان کا لقب دیا جاتا تھا، تمام اقتدار و اختیار پر قابض تھے اور ملک کی ساری دولت اُن کی مٹھی میں تھی۔ کسان اور غریب لوگ ایک لاقانون آمریت کی چکّی میں پسے جاتے تھے۔ بازنطینی سلطنت میں کلیسا کے منصب دار، اکابر و اعاظم، اربابِ نشاط اور قیصر و حکّام کی عیش پرستیوں کی حاجت برآری کرنے والے دولت، قوّت اور رسوخ کے مالک تھے۔ عام لوگ انتہائی خستہ حالی میں بسر کرتے تھے۔ بربری مملکتوں میں، سچ تو یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی نظامِ جاگیرداری رائج تھا، آبادی کا بیشتر حصّہ زرعی اور خانگی غلاموں پر مشتمل تھا۔

کسانوں کی عام حیثیت غلاموں کی سی تھی۔ شروع شروع میں زرعی اور خانگی غلامی میں بہت کم فرق تھا۔ دونوں قسم کے غلام اپنے بیوی بچّوں اور ساز و سامان سمیت مالکِ زمین کی ملکیت ہوتے تھے، اور وہ جیسا سلوک چاہتا اُن کے ساتھ کرتا[1]۔ بعد میں زرعی غلام یا تو جاگیردار کی جاگیر سے منسلک ہو گئے اور جس حصّہ جاگیر سے وہ منسلک ہوتے تھے اسی کے ساتھ خرید و فروخت ہونے لگے یا جاگیردار کے ذاتی ملازم بن گئے اور ایک جاگیر سے دوسری جاگیر کو منتقل ہونے لگے۔ وہ آقا کی اجازت کے بغیر اس کی ملازمت سے علیحدہ نہ ہو سکتے تھے، اور اگر وہ اس کی ملازمت چھوڑ کر بھاگ جاتے یا اغوا کر لیے جاتے تو ڈھور ڈنگر اور مال اسباب کی طرح قانون کی مدد سے واپس لائے جا سکتے تھے۔ یہ درست ہے کہ انھیں اپنے اور اپنے بال بچّوں کے گزارے کے لیے تھوڑی سی زمین ملتی تھی، لیکن یہ زمین آقا کی مرضی پر منحصر ہوتی تھی اور وہ جب چاہتا غلام کو اس سے نکال سکتا تھا۔ زرعی غلام نہ زمین نہ اشیاء منقولہ کی ملکیت حاصل کر سکتا تھا، اور اگر وہ زمین یا اشیاء منقولہ خریدتا بھی تو آقا اُسے بیدخل کر کے خود قبضہ لینے کا حق رکھتا تھا۔

---

[1] کلیسا اپنے غلاموں کو سب سے زیادہ مدت تک اپنے قبضے میں رکھتا تھا،
Sir Thomas Smith نے اپنی کتاب Commonwealth
میں بڑے تلخ الفاظ میں پادریوں کی ریاکاری کا تذکرہ کیا ہے۔

زرعی اور خانگی دونوں طرح کے غلاموں کا امتیازی نشان لوہے کا طوق تھا۔ غلام جتھوں کی صورت میں مویشیوں کے ریوڑوں کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکے جاتے تھے، انھیں جانوروں کی طرح کھانا کھلایا جاتا تھا، رہنے سہنے کے لیے ایسی جگہیں دی جاتی تھیں جو جانوروں کے لیے بھی موزوں نہ ہوتی تھیں، اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق ڈال کر انھیں ایک زنجیر سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا۔

انسانی گوشت و پوست کا تاجر ایک موٹا سا گٹھیلا کوڑا ہاتھ میں لیے گھوڑے پر سوار غلاموں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور کوڑے کی ضربوں سے تھکے ماندے غلاموں کو چلتے رہنے پر آمادہ کرتا تھا۔ جب کبھی یہ کوڑا لگتا اور جس کے لگتا اس کی کھال کی ایک بوٹی اڑا دیتا۔ مرد، عورتیں اور بچے اس طرح لٹکتے ہوئے چیتھڑے پہنے، لہولہان ٹخنے اور آبلوں سے چھلنی ننگے پاؤں گھسیٹتے ہوئے، ایک جگہ سے دوسری جگہ ہنکا کر لے جائے جاتے تھے۔ اگر کوئی بدقسمت تھک کر گر پڑتا تو اسے زمین پر لٹا کر اتنے کوڑے رسید کیے جاتے کہ اس کی کھال ادھڑ جاتی اور وہ ادھ موا ہو جاتا۔ مڈل پیسج The Middle Passage کے ہولناک واقعات، جنگِ آزادی سے پہلے امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں غریب نیگروؤں نے جو سختیاں جھیلیں، سوڈانی بردہ فروشوں نے جو مظالم توڑے، ان سب سے ہم ان مصائب کا قدرے اندازہ لگا سکتے ہیں جو غلاموں کو عیسائی اقتدار کے تحت بعثتِ اسلام سے لے کر پندرھویں صدی کے اخیر تک برداشت کرنے پڑے۔ اب بھی جب کہ حضرت عیسیٰؑ کی بادشاہی کو تقریباً دو ہزار سال گزر چکے ہیں، مہذب دنیا کی قوی ترین سلطنتوں میں سے ایک سلطنت میں عیسائی بےکس عورتوں کو کوڑے مار کر

---

[1] برطانیہ کی پارلیمانی جنگ میں طرفین نے اپنے دشمنوں کو غلام بنا کر نوآبادکاروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب ڈیوک آف مانمتھ کی بغاوت فرو کی گئی، تو اس کے تمام پیرو غلام بنا کر بیچ دیئے گئے۔ نئی آبادی میں پلگرم فادرز (Pilgrim Fathers) اور ان کی اولاد نے غلاموں سے جو سلوک روا رکھا وہ ناگفتہ بہ ہے۔

ہلاک کرتے ہیں اور واقعی یا فرضی سیاسی جرائم کی بنا پر قید میں ڈالتے ہیں۔[1]

نام نہاد آزاد کردہ غلاموں کی حالت کسی طرح بھی عام زرعی غلاموں کی حالت سے بہتر نہ تھی۔ اگر وہ اپنی زمینیں بیچنا چاہتے تو انھیں پہلے جاگیر کے مالک کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ زمین خریدنا چاہتے تو اُس صورت میں بھی اُنھیں جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ ایک بھاری محصول ادا کئے بغیر وہ وراثتاً بھی کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ اُنھیں غلہ پیسنا ہوتا تھا یا روٹی پکانی ہوتی تھی تو اُس صورت میں بھی اُنھیں مالک کو حصّہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنی فصلیں بھی نہ کاٹ سکتے تھے جب تک گرجا کو دسواں، بادشاہ کو بیسواں اور بادشاہ کے درباریوں کو اس سے چھوٹا حصّہ نہ دے چکتے۔ آقا کی اجازت کے بغیر وہ گھر بھی نہ بنا سکتے تھے اور آقا کو اختیار تھا کہ جب چاہے اُنھیں بیگار میں جوت دے۔ آقا کے بیٹے بیٹی کی شادی پر اُنھیں نذرانے دینے پڑتے تھے۔ لیکن جب کسی آزاد کردہ غلام کی بیٹی کی شادی ہوتی تھی تو اُسے انتہا درجے کی شرمناک بے حُرمتی کا تختۂ مشق بننا پڑتا تھا اور اگر خود بشپ یا کوئی اور کلیسائی منصب دار جاگیر کا مالک ہوتا تو وہ بھی اس وحشیانہ حق سے دست کش نہ ہوتا تھا۔ وحشی رسموں کے ان ستم کشوں کا موت بھی مداوا نہ بن سکتی تھی۔ جیتے جی تو وہ انسانوں کی انسانیت سوزی کے مورد بنتے ہی تھے، مر کر بھی اُن کے نصیبوں میں ابدی عذاب ہوتا تھا، کیونکہ جس شخص نے خودکشی کی ہو وہ ملعون ترین گناہگاروں میں شمار کیا جاتا تھا اور اُسے گز بھر زمین کا حق بھی نہ پہنچتا تھا۔ اتنا بھی بہت تھا کہ آدھی رات کے اندھیرے میں اُس کی لاش چوری چھپے کسی ناپاک زمین میں داب دی جاتی تھی اور اس کے سینے میں ایک کھونٹا گاڑ دیا جاتا تھا، تاکہ دوسروں کو تنبیہہ ہو۔

یہ تھی اس زمانے میں عام لوگوں کی زبون و خوار حالت۔ لیکن جاگیردار کو اپنے ایوان میں، بشپ کو اپنے محل میں اور راہب کو اپنے حجرے میں عوام کے آلام و مصائب کی کیا

---

[1] یہ عبارت روس کے رومانوف (Romanoff) خاندان کے ہبوط سے پیشتر لکھی گئی ہے۔

پر دالتی ؟ یورپ اور افریقہ کے حسین ترین خطوں پر تاریکی کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر جگہ زبردستوں کی مرضی ملک کا قانون اور حق کا معیار تھی۔ کلیسا روندے ہوؤں اور کچلے ہوؤں کی کوئی مدد نہ کرتا تھا۔ اس کی تعلیمات ہی نسلِ انسانی کو بہیمانہ طاقت کے پنجے سے نجات دلانے کے منافی تھیں۔ متقدمینِ آبائے کلیسا نے اولو الامر کی مخالفت کو ایک گناہِ کبیرہ قرار دیا تھا۔ ان کے نزدیک کوئی تشدد، کوئی جبر، کوئی انسانیت سوز زیادتی اس امر کا جواز مہیا نہ کرتی تھی کہ رعایا حاکموں کی ناانصافیوں سے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر طاقت کا استعمال کرے۔ مسیح کے خادموں نے ان لوگوں سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا جن کی اس معلمِ انسانیت نے مذمت کی تھی، یعنی دولت مند اور طاقت ور جابروں سے۔ انھوں نے جاگیرداری کو اپنا لیا تھا اور زمینوں کے مالکوں، جاگیرداروں اور شہزادوں کی حیثیت میں اس کی عطا کردہ رعایاتِ خصوصی سے متمتع ہوتے تھے۔

غیر عیسائی، یعنی یہودی، مشرکین اور کفار، عیسائی اقتدار کے تحت تذبذب و تشویش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا ہلاک کیا جانا یا نہ کیا جانا، غلام بنایا جانا یا نہ بنایا جانا، محض اتفاق پر منحصر تھا، انھیں کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ زندہ رہنے کی اجازت ہی اُن کے لیے بہت تھی۔ اگر کوئی عیسائی کسی غیر عیسائی سے ناجائز طور پر عقد کرتا (جائز عقد کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا) تو اُسے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ یہودیوں کو اجازت نہ تھی کہ عیسائیوں کے ساتھ اُٹھیں بیٹھیں یا ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھائیں یا ان کا سا لباس پہنیں۔ ہر وقت ممکن تھا کہ جاگیردار یا بشپ یا ایک مشتعل ہجوم کی مرضی سے اُن کے بچے چھین لیے جائیں اور ان کا مال متاع لوٹ لیا جائے۔ یہ حالات سترہویں صدی کے اخیر تک قائم رہے۔

جب تک معتکفِ حرا نے بانگِ حریت بلند نہ کی، جب تک اس نے نوعِ انسانی کی عملی مساوات کا اعلان نہ کیا، جب تک اس نے اُونچی ذات کی تمام خصوصی مراعات کو نہ مٹایا اور محنت کاروں کو آزادی نہ دی، اُس وقت تک اُس زنجیر کے حلقے درہم برہم نہ ہوئے جس نے اقوامِ عالم کو اسیر کر رکھا تھا۔ وہ وہی پیغام لے کر آیا جو اس کے پیش رو

لائے تھے اور اُس نے اُس پیغام کو عملی جامہ پہنایا۔

اسلام کے سیاسی فلسفے کا جوہر اُس منشورِ حقوق میں پایا جاتا ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنے ورودِ مدینہ کے بعد یہودیوں کو عطا کیا اور اُن قابلِ یادگار پیغاموں میں جو نجران اور اُس کے نواح کے عیسائیوں کے نام اس وقت بھیجے گئے جب اسلام جزیرہ نمائے عرب پر اپنا تسلّط قائم کر چکا تھا۔ مؤخر الذکر دستاویز تمام مسلم فرمانرواؤں کے لیے غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک کے بارے میں ایک ہدایت نامہ رہی ہے اور اگر کسی فرمانروا نے اُس سے انحراف کیا ہے تو اس کا سبب اُس فرمانروا کی شخصی سیرت میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہم اس سیاسی ضرورت سے قطع نظر کر لیں جس نے اکثر اپنے آپ کو مذہب کے لباس میں پیش کیا ہے تو اسلام سے بڑھ کر کوئی مذہب دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے رواداری نہیں برتتا۔[1] گاہے گاہے ایسا ہوا ہے کہ ملکی مقتضیات نے کسی مسلم حکمران کو قدرے ناروا داری کا اظہار کرنے یا دین کے معاملے میں وحدت کا مطالبہ کرنے پر مجبور کیا ہے لیکن اسلامی نظام نے فی نفسہٖ ہمیشہ پوری پوری رواداری کو قائم رکھا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں سے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کے بارے میں کبھی مزاحمت نہیں کی گئی اور انھیں کبھی تبدیلیٔ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا۔ اگر اُن سے جزیہ لیا جاتا ہے تو وہ عسکری خدمت سے بریّت کے معاوضے کے طور پر لیا جاتا ہے، اور یہ ہے بھی واجب کہ جو لوگ مملکت کی امان سے مستفید ہوتے ہیں وہ مملکت کا مالی بار اُٹھانے میں کسی حد تک شریک ہوں۔ بُت پرستوں کے بارے میں نظریاتی طور پر ذرا زیادہ سختی مطلوب تھی لیکن عملی طور پر قانون اُن کے ساتھ اُتنی ہی فیّاضی برتتا تھا جتنی دوسرے غیر مسلموں یعنی اہلِ کتاب کے ساتھ۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ اُن کے ساتھ سختی کا سلوک کیا گیا ہے تو اس کا سبب تلاش کرنے پر حکمران کے ذاتی جذبات یا جمہورِ مسلمین کے وقتی جذبات میں پایا جائے گا۔ مذہب کی آڑ

---

[1] Gobineau, *Les Religions et les Philosophies dans l' Asie Centrale*

تو محض ایک بہانے کے طور پر لی گئی تھی۔

اس فرسودہ دعوے کی تائید میں کہ اسلامی مملکتوں کی غیر مسلم رعایا شدید قانونی محرومیوں سے دوچار رہوتی ہے نہ صرف متاخرین علماء وفقہاء کی تنگ نظرانہ آراء کا حوالہ دیا جاتا ہے، بلکہ قرآن کی چند آیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شارعِ اسلامؐ غیر مسلموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور آپ کو یہ منظور نہ تھا کہ آپ کے متبعین اُن کے ساتھ دوستانہ مراسم رکھیں[1]۔ اس موضوع پر بحث کرتے وقت ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ وہ آیتیں جب نازل ہوئیں تو اسلام کس زندگی و موت کی کش مکش میں مبتلا تھا اور یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ کیا کفار اور کیا یہودی و عیسائی مسلمانوں کو ورغلانے اور دینِ حق سے منحرف کرنے کی خاطر کیسے کیسے دغابازانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ ایسے میں معلّمِ دین کے لیے لازمی تھا کہ آپ اپنے تابعین کو مخالفوں کی چالبازیوں اور مکّاریوں سے آگاہ کر دیں۔ تقابلی تاریخ کا کوئی متعلّم آپ کو اپنی چھوٹی سی مملکت کے تحفّظ کے لیے قابلِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ بہرحال جب ہم آپ کے اس سلوک کو دیکھتے ہیں جو آپ نے اپنی غیر مسلم رعایا سے بحیثیتِ عمومی روا رکھا تو ہمیں اس میں ایک وسیع المشرب رواداری اور ہمدردی کی وافر شہادت ملتی ہے۔

کیا کسی فاتح قوم یا مذہب نے محکوم قوموں کو حسنِ سلوک کی اس سے بہتر ضمانت دی ہے جو رسولِ عربیؐ کے مندرجہ ذیل الفاظ میں پائی جاتی ہے؟ "نجران اور اس کے نواحی کے عیسائیوں کو اُن کی زندگی، اُن کے دین اور اُن کی املاک کے بارے میں خدا کی امان اور رسولؐ کی ضمانت دی جاتی ہے، اُن کو بھی جو موجود ہیں اور اُن کو بھی جو آنے والے ہیں۔ نہ اُن کے فرائضِ مذہبی کی بجا آوری میں کسی قسم کی مزاحمت اور نہ اُن کے حقوق و مراعات میں کسی قسم کی تبدیلی کی جائے گی۔ کوئی اسقف اپنے منصب سے برطرف نہ کیا جائے گا، کوئی راہب اپنے راہب خانے سے نہ نکالا جائے گا، اور کوئی پادری اپنے عہدے سے علیحدہ

---

[1] ملاحظہ کیجیے: Sell's Essays on Islam

نہ کیا جائے گا۔ یہ لوگ ہر بڑی اور چھوٹی چیز سے اسی طرح متمتع رہیں گے جس طرح اب ہیں۔ کسی مجسمے یا صلیب کو تباہ نہ کیا جائے گا۔ نہ اُنھیں کسی پر ظلم کرنے دیا جائے گا اور نہ کوئی اُن پر ظلم کرے گا۔ اُن کے لیے ممنوع ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی طرح قصاصِ خون کی رسم پر عمل کریں۔ اُن سے کوئی محصول وصول نہ کیا جائے گا اور نہ اُن سے یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اسلامی سپاہ کے لیے رسد مہیا کریں[۱]"

تسخیرِ حیرہ کے بعد جب وہاں کے باشندے بیعت کا حلف اُٹھا چکے تو حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک اعلان شائع کیا جس کی رُو سے اُنھوں نے مسلمانوں کو عیسائیوں کی جان و مال اور آزادی کا کفیل ٹھہرایا اور یہ حکم دیا کہ "اُنھیں ناقوس بجانے سے نہ روکا جائے گا" اور اس امر کی اجازت دی جائے گی کہ مذہبی تقریبوں پر صلیبوں کو اُٹھا کر جلوس نکالیں[۲]۔ امام ابویوسفؒ کا ارشاد ہے کہ "اس اعلان کو خلیفہ[۳] اور اُن کی مجلسِ شوریٰ[۴] کی منظوری دی گئی۔"

غیر مسلموں کو نئے گرجا اور معبد بنانے سے نہ روکا گیا۔ صرف ایسے علاقوں میں جہاں صرف مسلمان آباد تھے ذرا سی نظریاتی پابندی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ "کسی ایسے شہر میں جہاں صرف مسلمان بستے ہیں، کوئی نیا گرجا یا معبد نہیں بنایا جا سکتا، لیکن ایسے علاقوں میں جہاں ذمّی پہلے سے آباد ہیں ہمیں اپنے عہد کو پورا کرنا چاہیے[۵]" لیکن عملاً یہ ممانعت مطلقاً نظرانداز کر دی گئی۔ خلیفہ المامون کے عہد میں مملکتِ اسلامیہ میں عیسائیوں کے گیارہ سو کلیساؤں

---

[۱] اور نہ فوجیوں کو اُن کے گھروں یا بستیوں میں مقیم کیا جائے گا (فتوح البلدان از بلاذری صفحہ ۶۵۔ کتاب الخراج از امام ابویوسف) میور (Muir) آنحضرتؐ کی اس ضمانت کا اجمال پیش کرتا ہے۔ جلد دوم صفحہ ۲۹۹۔

[۲] خلیفہ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ۔

[۳] حضرت ابوبکرؓ

[۴] حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور چند دیگر ممتاز صحابہ ملاحظہ کیجیے کتاب الخراج" صفحہ ۸۴۔

[۵] کتاب الخراج۔

کے علاوہ یہودیوں کے سینکڑوں صومعے اور زرتشتیوں کے بے شمار آتشکدے تھے۔ اس روشن خیال حکمران نے، جسے عیسائیوں کا دشمنِ جانی کہا گیا ہے، اپنی مجلسِ شوریٰ میں اپنی تمام محکوم جماعتوں کے نمائندے شامل کیے تھے۔ مسلمان، یہودی، عیسائی، زرتشتی اور صابی۔ اور اس نے عیسوی کلیسا کے منصب داروں کے تمام حقوق و مراعات کا باحتیاط تمام تحفظ کیا۔

یہ ایک قابلِ ملاحظہ امر ہے، جس کی نظیر جدید تاریخ میں بھی نہیں ملتی، کہ فتحِ مصر کے بعد حضرت عمرؓ نے عیسائی کلیسا کے اوقاف کی حفاظت ایک امانت کے طور پر کی اور سابقہ حکومت کی طرف سے پادریوں کے لیے جو وظیفے مقرر تھے وہ جاری رکھے۔[1]

ابتدائی مسلم حکومتوں نے جس رواداری کا ثبوت دیا اس کی بہترین شہادت خود عیسائیوں نے مہیا کی ہے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں میری (MERY) کے عیسائی بطریق نے فارس کے اسقف شمعون نامی کے نام ایک خط میں ذیل کی عبارت لکھی: "عرب جنھیں خدا نے دنیا کی حکومت عطا کی ہے دینِ عیسوی پر حملہ نہیں کرتے، اس کے برعکس وہ ہمارے ممد ہوتے ہیں: وہ ہمارے خدا اور ہمارے اولیاء کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور راہب خانوں کو مالی عطیے دیتے ہیں۔" مبادا زور زبردستی کا شائبہ تک بھی دکھائی دے، کسی مسلمان کو اجازت نہ تھی کہ وہ کسی ذمی کی زمین کی قیمت ادا کر کے بھی حاصل کر سکے۔ نہ امام (سلطان) کو اختیار تھا کہ کسی ذمی کی املاک پر قابض ہو۔

قانون کی نگاہوں میں مسلمان اور ذمی برابر کا درجہ رکھتے تھے۔ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا: "ان کا خون بھی ہمارے ہی خون سا ہے۔" مسلمانوں کا نظم و نسق بہت سی جدید حکومتوں کے لیے، جن سے بعض مہذب ترین حکومتیں بھی مستثنیٰ نہیں، ایک قابلِ تقلید نمونہ تھا۔ جرائم کی سزا کے معاملے میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی تمیز نہ کی جاتی تھی۔ اسلام کا قانون یہ ہے کہ اگر ایک ذمی ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے تو موخر الذکر کو بھی وہی سزا ملے گی جو صورتِ معکوس میں مقدم الذکر کو دی جاتی۔[2]

---

[1] مقریزی

[2] ذیلعی تخریج الہدایہ میں ایک مقدمہ کا ذکر کرتا ہے (ریاقی حاشیہ صفحہ ۴۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

خلفائے بغداد کو، اپنے حریف خلفائے قرطبہ کی طرح، غیر مسلموں کی فلاح کا اتنا خیال تھا کہ انھوں نے ذمیوں کی سلامتی اور اُن کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک خاص شعبہ قائم کیا۔ اس شعبے کے سربراہ کا لقب بغداد میں کاتب الجہبذہ اور ہسپانیہ میں کاتب الذمام تھا۔

خلیفہ متوکل نے، جس نے امام الشہداء حضرت امام حسین رضؓ کے روضۂ مبارک کو مسمار کیا اور اُس کی زیارت کی ممانعت کر دی، مسلم معتزلہ کی طرح غیر مسلموں کو بھی سرکاری ملازمتوں سے خارج اور بہت سے حقوق سے محروم کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ متاخرین کی کتبِ فقہ میں، جو ایک ایسے زمانے میں لکھی گئیں جب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک طرف تو لقائے محض کی خاطر اور دوسری طرف اقتدارِ محض کی خاطر، جنگ و جدل جاری تھی، ایسی عبارتیں نظر آتی ہیں جن سے سطحی طور پر اس الزام کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام نے ذمیوں سے ذلّت کا سلوک کیا۔ لیکن شارعِ اسلام یا خلفائے راشدین کے وضع کردہ قوانین میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جس سے اس الزام کی توثیق ہو۔ اس پر یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ متاخرین فقہاء کی تعصب آمیز آراء پر کبھی عمل نہیں کیا گیا۔ رواداری و فیاضی کا جو سلوک غیر مسلموں سے کیا گیا اُس کی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ ذمّی اکثر مسلمانوں کے وصی مقرّر ہوتے تھے اور اسلامی جامعوں اور تعلیمی اداروں کے شیخ اور مسلمانوں کے اوقاف کے مہتمم بنائے جاتے تھے۔ صرف ایک شرط پر کہ انھیں کوئی مذہبی فرائض تفویض نہ کیے جائیں۔ جب کبھی کوئی قابلِ وقعت اور ممتاز غیر مسلم وفات پاتا تو مسلمان انبوہ در انبوہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۶) جو حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ بکر بن وائل نامی ایک مسلمان نے حیروت نامی ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے وارثین کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ ملزم حیروت کے وارث حنین کے حوالے کر دیا گیا۔ حنین نے اسے قتل کر دیا (دہلی ایڈیشن صفحہ ۳۳۰)۔ اسی طرح کا ایک مقدمہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد خلافت سے متعلق بھی بیان کیا جاتا ہے۔

اس کے جنازے میں شریک ہوتے تھے ۔

شروع شروع میں ، بدیہی اسباب کی بناء پر ، فوج کی قیادت غیر مسلموں کو نہ سونپی جاتی تھی ، لیکن مشاہرہ دار اور ذمّہ دار مناصب پر وہ مسلمانوں کی طرح مامور ہو سکتے تھے ۔ یہ مساوات محض نظریاتی نہ تھی ۔ پہلی صدی ہجری ہی سے عیسائی ، یہودی اور مجوسی اہم سرکاری عہدوں پر فائز دکھائی دیتے ہیں ۔ عباسی خلفاء ، باستثنائے معدودے چند ، مذہب کی بناء پر اپنے محکوموں میں کوئی امتیاز نہ کرتے تھے اور اُن کے بعد جو خاندان برسرِ اقتدار آئے انھوں نے دیانت داری سے ان کی مثال کی تقلید کی ۔

غیر مسلموں سے اسلامی ممالک میں جو سلوک کیا جاتا ہے اگر اس کا مقابلہ اُس سلوک سے کیا جائے جو یورپی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تو انسان دوستی اور فیاضی کے معاملے میں اس کا پلّہ بحیثیتِ عمومی بھاری پایا جائے گا ۔ دہلی کے مغل شہنشاہوں کی حکومت میں ہندو فوجوں کے کمانڈر ، صوبوں کے حاکم اور شہنشاہ کی مجلسِ شوریٰ کے رُکن بنتے تھے ۔ اگلے وقتوں سے قطعِ نظر ، کیا موجودہ دور میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی یورپی سلطنت میں ، جس کی رعایا مختلف نسلوں اور مختلف مذہبوں کے لوگوں پر مشتمل ہے ، مذہب رنگ اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ۔ ؟

اسلام کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس کے بانی نے وحدت اللہ اور انسانی مساوات کے جن اصول کی تعلیم دی تھی اُسے نوعِ انسانی میں نافذ کیا جائے ۔ وحدت اللہ اور نبوتِ محمدیؐ پر ایمان کی حد کے اندر اسلام انسانی ضمیر کو پوری آزادی دیتا ہے ۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سرزمین میں بھی اسلام کے مبلغ و مجاہد نے قدم رکھا پامال عوام اور تکفیر کے فتووں کے ستم رسیدہ لوگوں نے اُسے آزادی اور رغلامی سے نجات کا نقیب سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا ۔ اسلام ان کے لیے قانونی مساوات اور بااصول ٹیکسوں کی نوید لے کر آیا ۔

جس طرح یرموک اور اجنادین کے غزوے شامیوں ، یونانیوں اور مصریوں کے لیے نجات کا پیغام تھے ۔ اسی طرح قادسیہ کی لڑائی ، جس سے مسلمان ایران پر قابض ہوئے ، ایرانیوں کے لیے ایک مبارک واقعہ تھی ۔ یہودیوں نے جنھیں زرتشتیوں نے وقتاً فوقتاً

نہہ تیغ کیا تھا، اور عیسائیوں نے، جنھیں وہ در بدر پھراتے تھے، اس پیغمبر کے زیرِ سایہ اطمینان کا سانس لیا جس کے دین کا اصل الاصول اخوتِ انسانی تھا۔ ہر ملک میں لوگوں نے مسلمانوں کو اپنے نجات دہندہ سمجھ کر اُن کا استقبال کیا۔ اگر کہیں مزاحمت ہوئی تو وہ صرف مذہب پیشہ لوگوں اور طبقۂ اُمراء کی طرف سے ہوئی۔ عوام اور محنت پیشہ لوگوں نے، جنھیں زرتشتی مذہب نے راندۂ درگاہ گردانا تھا، مسلم فاتحین کی حمایت کی۔ محض کلمۂ حق کا زبان پر لانا اُنھیں اپنے فاتحین سے برابری بخشنے کے لیے کافی تھا۔

جاگیردارانہ نظام کے تحت قبیلوں اور گاؤں کے جو سردار تھے اُن کے حقوق، اعزازات اور مقامی اثر کو برقرار رکھا گیا۔ گوبینو (Gobineau) کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ظلم و تعدّی کے بارے میں مبالغہ آمیز باتیں کی گئی ہیں۔"

افریقہ اور ہسپانیہ کی فتح کے بعد بھی یہی ہُوا، ایرین (Arian)، پلاجی (Pelagians) اور دوسرے بدعت پسند طبقے، جو اب تک تقلید پسندوں کے موردِ غضب تھے، اور عوام الناس، جنھیں لاقانون فوجیوں اور اُن سے بھی بڑھ کر لاقانون مذہبی منصب داروں نے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا، اسلام کے زیرِ سایہ امن و امان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ حالات کی بوالعجبی دیکھئے (اور یہ بوالعجبی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر قدیم یونانیوں کے نظریۂ مکافات (Nemesis) پر یقین آنے لگتا ہے) کہ مسلمان یہودیوں کے بہترین محافظ ثابت ہوئے، حالانکہ یہودیوں نے پیغمبرِ اسلامؐ سے کینے کی بنا پر اسلامی مملکت کی تباہی میں کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی۔ تمام عیسائی قوموں نے تو انھیں توہین، تاخت و تاراج اور نفرت و حقارت کا مورد بنایا، لیکن اسلام نے اُنھیں مردم آزاری سے وہ امان دی جو عیسائیت نے اُن کے حق میں روا نہ رکھی تھی۔

اسلام نے لوگوں کو ایک ایسا ضابطۂ قوانین عطا کیا جس کی ظاہری سادگی پر قدامت پسندی کا دھوکا ہوتا تھا، لیکن جس میں یہ صلاحیت تھی کہ مادّی تہذیب کی ترقی کے پہلو بہ پہلو پوری پوری نشوونما پاتا رہے۔ اُس نے مملکت کو ایک ایسا لچک دار دستور بخشا جو انسانی حقوق اور انسانی فرائض کی صحیح پرکھ پر مبنی تھا۔ اس نے سرکاری محصولوں

کو واجب حدود کے اندر رکھا، افراد کو قانون کی نگاہوں میں مساوات کی حیثیت دی اور خود اختیاری حکومت کے اصولوں کو پروان چڑھایا۔ اس نے انتظامیہ کو قانون کا تابع بنا کر سلطانی اختیارات پر پابندیاں عائد کیں اور یہ قانون بھی ایسا قانون تھا جس کی اساس احکامِ دین اور اخلاقی فرائض پر قائم تھی۔ ارکرٹ (Uroquhart) کے قول کے مطابق "یہ دونوں اصول ایسے تھے کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے بانی کو شہرتِ دوام دینے کے لیے کافی تھا۔ ان کی عمدگی اور مؤثریت نے باقی قوانین کو توقیر بخشی، اور سب قوانین نے مل کر اس نظام کو جو ان پر مشتمل تھا ایک ایسی قوت اور توانائی سے مالا مال کر دیا جو کسی اور سیاسی نظام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ یہ قانون ایسے لوگوں میں رائج کیا گیا جو وحشی، جاہل اور ہیچ و پوچ تھے، لیکن ایک ہی شخص کی میعادِ حیات کے اندر وہ قلمروِ روم سے بھی وسیع تر علاقے میں پھیل گیا۔ جب تک اس کی ابتدائی خصوصیات قائم رہیں وہ ایک ناقابلِ مدافعت قوت سے معمور رہا۔"[1]

حضرت ابوبکرؓ کا مختصر دورِ خلافت ریگستانی قبیلوں میں امن و امان قائم کرنے ہی میں صرف ہو گیا۔ چنانچہ انھیں صوبوں کی باقاعدہ تنظیم کی مہلت نہ ملی، لیکن جب حضرت عمرؓ، جو صحیح معنوں میں ایک عظیم انسان تھے، مسندِ خلافت پر بیٹھے تو اس وقت محکوم قوموں کی فلاح و بہبود کے بارے میں ان تھک کوششوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ابتدائی مسلم حکومتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمانوں کی جو سیاسی حالت تھی اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو جو منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ ایک عوامی حکومت کا ہے جس کا سربراہ ایک منتخب شدہ امیر تھا جو محدود اقتدار کا مالک تھا۔ رئیس مملکت کے خصوصی اختیارات انتظامی اور اہتمامی امور کے دائرے کے اندر محصور تھے۔ مثلاً محکمۂ احداث یعنی پولیس کی

---

[1] Urquhart, Spirit of the East ,vol.I, Introduction, Page xxviii.

نگرانی، فوج کا نظم و نسق، امورِ خارجہ کا انصرام، مالیات کی تقسیم وغیرہم۔ لیکن وہ کسی حالت میں بھی اس کا مجاز نہ تھا کہ مسلّمہ قوانین سے سرِمو انحراف کرے۔

عدالتیں حکومت کی مطیع نہ تھیں۔ حکومت اُن کے فیصلوں میں دخل اندازی نہ کر سکتی تھی: یہاں تک کہ ابتدائی خلیفوں کے ہاتھ میں اتنا اختیار بھی نہ تھا کہ ایسے لوگوں کو جنھیں عدالتوں نے مستوجبِ سزا قرار دیا ہو معافی بخش سکیں۔ قانون سب کے لیے ایک تھا، امیر کے لیے بھی اور غریب کے لیے بھی، صاحبِ اقتدار کے لیے بھی اور کھیت میں محنت و مشقّت کرنے والے کے لیے بھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس نظام کی سختی میں ڈھیل آتی گئی۔ پھر بھی اس کا ہیئتی ڈھانچہ برقرار رہا۔ یہاں تک کہ جن غاصبوں نے، کسی حق کے بغیر، دغا بازی اور کشت و خون کی مدد سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی، اور جو ایّامِ کفر کے اُس عدیدی اقتدار کے نمائندے تھے جسے اسلامی تعلیمات نے برطرف کیا تھا، انھوں نے بھی ایک نمائندہ حکومت کے تابعِ قانون سربراہانِ انتظامیہ کی ظاہری صورت قائم رکھی۔ جب بعد میں آنے والے خاندانوں کے حکمرانوں نے من مانے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو اجماعِ فقہاء کے اُن فیصلوں نے جو تمام مسلم مملکتوں میں حکمرانوں کی منہ زوری پر ایک قانونی لگام کا کام کرتے ہیں انھیں اس سے روک دیا۔ بہرکیف ابتدائی دور میں صحابہؓ کی جماعت گویا پیغمبرِ اسلامؐ کی مجلسِ شوریٰ تھی۔ کیا لشکر گاہ میں اور کیا شہر میں، "صحابیِ رسولؐ" کے لقب کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ صحابہؓ کو جو اثر و نفوذ حاصل تھا وہ اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ صحابیؓ ہونے کے معنی تھے صاحبِ تقدّس اور صاحبِ فضیلت سمجھا جانا۔ جس شخص کو یہ لقب نصیب ہوتا تھا وہ اگر کوئی کام شروع کرتا تو عامۃ المسلمین جوق در جوق آکر اُس کے مقتدی بن جاتے۔ سب سے اُونچا رتبہ اُن صحابیوں کا تھا جنھوں نے پیغمبرِ صلعم کے ہمراہ مکّہ سے ہجرت کی تھی، یعنی مہاجرین کا، پھر اُن انصار کا جنھوں نے بصد عقیدت آپؐ کا خیر مقدم کیا تھا اور بدر و اُحد کے میدانوں میں جہاد فی سبیل اللہ کیا تھا، پھر اُن کا جنھیں آپؐ کوئی کام تفویض کرتے تھے اور ان کا جنھوں نے آپؐ کی زیارت کی تھی،

جو آپ سے ہم کلام ہوئے تھے، جنھوں نے آپ کے ارشادات سُنے تھے۔ سب سے آخری رُتبہ اُن کا تھا جنھوں نے صحابہؓ کی متابعت کی تھی اور یوں بالواسطہ حلقۂ نبویؐ کے حاشیہ نشین رہے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک واقعہ پیش آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانوں میں کس قسم کی مطلق مساوات تھی۔ غسانی بادشاہ جبلہ (Jabala) جو مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا، خلیفۃ المسلمین کے دربار میں حاضری کی خاطر مدینے آیا۔ وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، اور ہر طرح کی تکریم کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ جب وہ کعبے کا طواف کر رہا تھا تو معمولی حیثیت کے کسی اور حاجی کے احرام کا ایک گوشہ اُس کے شانوں پر گر پڑا۔ جبلہ نے فرطِ غضب سے مُڑ کر حاجی کے منہ پر اس زور سے طمانچہ رسید کیا کہ بیچارے کے دانت ٹوٹ کر منہ سے نکل گئے۔ واقعے کا باقی ماندہ حصہ ہم اُن قابلِ یادگار الفاظ میں بیان کرتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے اس کی روئداد حضرت ابوعبیدہؓ کو، جو شام میں عساکرِ اسلامی کے سپہ سالار تھے، لکھی۔ "غریب حاجی میرے پاس آکر دادخواہ ہوا۔ میں نے جبلہ کو بُلا بھیجا اور جب وہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایک مسلمان بھائی کے ساتھ ایسی بدسلوکی کیوں کی تھی۔ اُس نے جواب دیا 'اس آدمی نے میری توہین کی ہے، اور اگر کعبے کا احترام ملحوظ نہ ہوتا تو میں اُسے وہیں ڈھیر کر دیتا۔' میں نے کہا 'تمھارے ان الفاظ نے تمھارے جرم کو اور بھی سنگین بنا دیا ہے اور اگر تم نے اس آدمی سے مُعافی نہ مانگی اور اُس نے تمھیں معاف نہ کیا تو تمھیں قانونی سزا بھگتنی پڑے گی۔' جبلہ نے جواب دیا 'میں ایک بادشاہ ہوں اور وہ ایک معمولی آدمی ہے۔' میں نے کہا 'تم بادشاہ ہو یا نہیں ہو، تم دونوں مسلمان ہو اور قانون کی نگاہوں میں تم دونوں کی ایک ہی حیثیت ہے۔' اُس نے درخواست کی کہ سزا کو کل تک ملتوی رکھا جائے۔ چنانچہ مظلوم کی مرضی دریافت کر کے میں نے سزا کا ملتوی رکھنا منظور کر لیا۔ جبلہ راتوں رات بھاگ کھڑا ہوا، اور اب سگِ نصرانی سے جا ملا ہے[1]۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمھیں اُس پر اور اُس جیسے مردودوں پر فتح عطا فرمائے گا۔"

---

[1] ابتدائی مسلمان بازنطینی شہنشاہ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے۔

یہ خط ابو عبیدہؓ نے لشکر کو پڑھ کر سنایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی خلیفوں کے زمانے میں اس قسم کے مراسلے اکثر بھیجے جاتے تھے۔ کیا لشکر گاہ میں اور کیا شہر میں، کوئی شخص امورِ مملکت سے ناواقف نہ رکھا جاتا تھا۔ ہر جمعہ کو نماز کے بعد امیر المومنین جماعت کو روزمرہ کے اہم واقعات سے آگاہ کرتا تھا۔ صوبوں کے حاکم اپنے اپنے علاقوں میں اس کی مثال کی تقلید کرتے تھے۔ ان عام مجمعوں میں ہر مسلمان شامل ہونے کا مجاز تھا۔ جمہوریت اپنی بہترین صورت میں حکمراں تھی۔ خلیفۂ اسلام امیر المومنین الوہیت کے ہالے میں گھرا ہوا نہ تھا۔ وہ اپنی مملکت کے نظم ونسق کے معاملے میں اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ تھا۔ خلفاء راشدین نے جس سخت گیری سے اپنے آپ کو عوام کی بہبود کے لیے وقف کر رکھا تھا اور جس انتہائی سادگی سے وہ زندگی بسر کرتے تھے وہ ہادئ اسلام کی مثال کی پوری پوری تقلید تھی۔ وہ اپنے آقا کی طرح مسجد میں جا کر شریکِ نماز ہوتے تھے اور جماعت سے خطاب کرتے تھے، اپنے مکان پر غریبوں اور مظلوموں سے ملتے تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ شخص کی فریاد پر کان دھرتے تھے۔ انھوں نے خدم وحشم اور ظاہری شان وشوکت کے بغیر محض اپنے حسنِ کردار وسیرت کی مدد سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی۔ حضرت عمرؓ نے جب بیت المقدس کی اطاعت قبول کرنے کے لیے شام کا سفر کیا تو ان کے ہمراہ صرف ایک غلام تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ورثے میں کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک اونٹ اور ایک غلام چھوڑا۔ حضرت علیؓ کو بیت المال سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ ہر جمعے اسے غریبوں اور دکھیاروں میں تقسیم کر دیتے تھے اور قاضیوں کے فیصلوں کا پورا پورا احترام کر کے انھوں نے لوگوں کو ایک اعلیٰ مثال پیش کی۔ جب تک اسلامی جمہوریت قائم رہی، کسی خلیفہ کو مجال نہ ہوئی کہ معتبر عدالتوں کے فیصلوں میں تصرف یا ان کی خلاف ورزی کرے[1]۔

---

[1] یہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں پہلی بار ہوا کہ ایک عدالت کے فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا گیا۔ وہ یوں ہوا کہ انھوں نے ایک شخص کو جسے قاضی نے مجرم قرار دیا تھا اتنی سی بات پر معاف کر دیا کہ اس نے خلیفہ کی شان میں ایک قصیدہ پڑھ کر سنایا۔

کسی نئی حکومت کے لیے، جس نے بزورِ شمشیر اقتدار حاصل کیا ہو، یہ قدرتی طور پر مشکل ہوتا ہے کہ محکوموں کو فوراً اپنا گرویدہ بنا لے۔ لیکن ابتدائی مسلمانوں نے مفتوحہ قوموں کو انتہائی اعتماد اور وابستگی کے محرکات مہیا کئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ جیسے معتدل مزاج اور نرم طبع حاکموں کی سرداری میں، جنھوں نے خالد بن ولیدؓ جیسے سپاہیوں کی سختی و درشتی کو حدود کے اندر رکھا، انھوں نے اپنے محکوموں کے شہری حقوق کا مکمل تحفظ کیا۔ اُنھوں نے تمام مفتوحہ قوموں کو پوری پوری مذہبی آزادی دی۔ اس معاملے میں اُن کا کردار موجودہ زمانے کی بہت سی مہذب حکومتوں کے لیے قانونی اور مذہبی رواداری کی افضل ترین مثال ہے۔ نہ تو اُنھوں نے کوڑے مار کر عورتوں کو ہلاک کیا، اور نہ انھیں جلا وطن کر کے سائبیریا بھیجا، تاکہ وہاں کانوں میں محنتِ شاقہ کریں اور اپنے محافظوں کی زیادتیاں اور دست درازیاں سہیں۔ اُن میں اتنی دانشمندی تھی کہ انھوں نے کسی مفیدِ خلائق معاشرتی ادارے میں دخل اندازی نہیں کی جو کسی مفتوحہ ملک میں موجود تھا اور جو ان کے دین کے منافی تھا۔

حضرت عمرؓ نے زرعی خوشحالی کو فروغ دینے کی خاطر جو اقدامات کئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں لوگوں کی فلاح اور اُن کے مفادات کو ترقی دینے کا کتنا خیال تھا۔ زمین پر جو لگان لگایا گیا وہ ایک معتدل اور منصفانہ بنا پر مقرر کیا گیا۔ مملکت کے ہر حصے میں نہریں کھدوائی گئیں۔ جاگیرداری کے زمانے سے جو محاصل اور خراج کاشت کاروں کے لیے عذابِ جان بنے ہوئے تھے وہ سب کے سب منسوخ کر دیئے گئے۔ چنانچہ صدیوں کا بوجھ اُن کے سر پر سے اُتر گیا۔ ایک قاتل کے ہاتھوں اس عادل اور بیدار مغز حکمران کی شہادت اسلامی مملکت کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ تھی۔ اُن کی سیرت، جس میں سختی کے ساتھ عدل کا عنصر بھی تھا، اُن کی عملی دانشمندی اور اُن کی مردم شناسی، ان صفات کی بدولت وہ اس کام کے لیے خاص طور پر موزوں تھے کہ بنواُمیّہ کے اقتدار اندوزانہ منصوبوں کی روک تھام کر سکیں۔ اُنھوں نے اپنے بسترِ مرگ پر چھ ممتاز افراد کو یہ فرض سونپا کہ اُن کے جانشین کا انتخاب کریں۔ ان حضرات نے حضرت علیؓ بن ابوطالب کو انتخاب کر کے انھیں منصبِ خلافت پیش کیا، لیکن بنواُمیّہ کی سازشوں کے باعث اس کے ساتھ ایک ایسی شرط لگا دی گئی

جس کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ حضرت علیؓ اسے قبول نہ کریں گے۔ وہ شرط یہ تھی کہ وہ امورِ مملکت میں صرف شریعتِ الٰہی اور سنتِ نبویؐ پر ہی عمل نہ کریں گے، بلکہ اپنے دو پیشروؤں کے احکام و اعمال کا بھی اتباع کریں گے۔ حضرت علیؓ کی آزادہ روی اور غیور طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ وہ یہ پابندی اپنے اُوپر عائد کر لیں۔ چنانچہ، جیسی کہ بنو اُمیّہ کو توقع تھی، منصبِ خلافت اُن کے قرابت دار حضرت عثمانؓ کو پیش کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے کہ جسے اولادِ ہاشم کے ساتھ پُرانی اور دلی دشمنی تھی۔ اس خاندان کے لوگوں نے ہادیٔ اسلام کو اس حد تک اپنے بُغض و کینہ کا موردِ ستم بنایا تھا کہ آپ ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے۔ انھوں نے دینِ حق کو ابتدائے طفولیت ہی میں تباہ کرنے کے لیے سب جتن کیے تھے اور آخری وقت تک اُس کی بربادی پر تُلے رہے تھے۔ ان کا آپس میں زبردست گٹھ جوڑ تھا اور قبائلِ مُضر پر، جن میں وہ ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کا بہت اثر و نفوذ تھا۔ قوت و اقتدار کو اپنے ہاتھوں سے جاتے دیکھ کر اُن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ فتحِ مکّہ کے بعد اُنھیں ناگزیر حالات کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا تھا، لیکن محمدؐ بن عبداللہ نے جس طرح اُن کی سطوت کے طلسم کو توڑا تھا اس کے لیے انھوں نے خاندانِ ہاشم کو معاف نہ کیا تھا۔ جب تک رسول اللہؐ زندہ رہے یہ غدار آپ کی عظیم شخصیت سے مرعوب ہو کر دبکے بیٹھے رہے۔ اُن میں سے بہت سوں نے ذاتی[1] مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر اور مسلم فتوحات کی بدولت جو مالِ غنیمت ملک میں آ رہا تھا اس میں شریک ہونے کی غرض سے اسلام کا اقرار باللسان تو کر لیا تھا، لیکن پیغمبر نے جس جمہوریت کا اعلان کیا اس سے انھوں نے نفرت کرنا ترک نہ کیا تھا۔ یہ لوگ شہوت پرست، مسرف، بے اصولے، ظالم اور باطنی طور پر کافر تھے۔ چنانچہ انھیں ایک ایسے مذہب سے جو مساوی حقوقِ انسانی کا اعلان کرتا تھا اور جو اخلاقی فرائض اور عفتِ ذاتی کی سخت گیرانہ تاکید کرتا تھا قدرتی طور پر چڑ تھی۔ اُنھوں نے جس حکومت کی اطاعت کا حلف

---

[1] اسی لیے انھیں "مؤلفۃ القلوب" کہتے تھے۔ (ادارہ)

اُٹھایا تھا اس کی بربادی کی اور جن لوگوں پر اس حکومت کا دارومدار تھا اُن کی تباہی کی وہ شروع ہی سے تدبیریں کر رہے تھے۔ پہلے دو خلفاء راشدین نے اُن کی حبِ جاہ کو حدود کے اندر محدود رکھا تھا اور ان کی ریشہ دوانیوں اور غدّارانہ سازشوں کو سر اٹھانے کا موقعہ نہ دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے مسند نشین ہوتے ہی وہ سب کے سب مدینے میں آکر جمع ہو گئے۔ اُن کا خلیفہ بننا تھا کہ نفرت کا وہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا اور ہوس رانی و نفس پرستی کا وہ فاسد مادہ بہ نکلا جس نے اسلامی دنیا کا سینہ دہلا دیا اور اس کے بہترین اور اشرف ترین نفوس کو لقمۂ اجل بنا دیا۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں شیخین کے قائم کئے ہوئے نظامِ حکومت کا رُخ بدل گیا۔ سب پرانے والیانِ صوبجات اور فوجی سردار جو مقربینِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں سے انتخاب کیے گئے تھے، معزول کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ حقِ خدمت اور جاں نثاری کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔ اعتبار اور منفعت والے تمام عہدے بنو اُمیّہ نے سنبھال لیے۔ صوبوں کی ولایت ایسے ایسے لوگوں کو عطا کی گئی جو اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دے چکے تھے اور انہیں بیت المال سے بے اندازہ فائدے پہنچائے گئے۔ اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے ہم انھیں قدرے تفصیل کے ساتھ دینِ محمدیؐ کے فرقوں سے بحث کے ضمن میں بیان کریں گے۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حکام کی بدعنوانیاں، روایاتِ ماسبق سے بے اعتنائی، پیرانہ سال خلیفہ کی اقربا پروری اور شکایتوں سے لاپروائی، یہ سب چیزیں مل کر صحابۂ نبی اور جمہورِ مسلمین کے دلوں میں رنجیدگی اور برگشتگی پیدا کرنے کا باعث ہوئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت ہوئی اور اس میں حضرت عثمانؓ نے شہادت پائی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر اجماعِ اُمّت نے حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ اس کے بعد جو فتنۂ بغاوت برپا ہوا وہ اسلامی تاریخ کی المناک داستانوں میں سے ہے۔ اولسنر (Oelsner) کہتا ہے کہ "اگر حضرت علیؓ کو امن و اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع دیا جاتا تو ان کے محاسنِ ذاتی، ان کی ثابت قدمی اور ان کی اخلاقی فضیلت کی بدولت پرانی جمہوریت کو اور اس کے سیدھے سادے طریقوں کو دوام حاصل ہو جاتا۔[1]" "ایک قاتل کے خنجر نے اسلام کی اُمیدوں کا خاتمہ کر دیا۔ میحد

[1] Oelsner, *Des Effects de la Religion de Muhammed*

اوزبرن (Major Osborn) کا قول ہے کہ "حضرت علیؓ کی موت ایک ایسے شخص کی موت تھی جو اُن تمام افراد میں جن کی یاد تاریخِ اسلامی نے محفوظ رکھی ہے سب سے صادق القلب اور افضل ترین مسلمان تھا۔" اگر حضرت علیؓ سات صدیاں پہلے دنیا میں آئے ہوتے تو انھیں عیسوی کلیسا کی طرف سے ولایت کا درجہ عطا ہوتا اور اگر تیرہ صدیاں بعد آتے تو ان کی فطنت و قابلیت، ان کی نیک سیرتی و شجاعت مہذب دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرتی۔ ایک حکمران کی حیثیت سے وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان میں صداقت پسندی، حلم و تواضع اور رحمدلی کی جو صفات تھیں اُن کے ہوتے ہوئے بنو امیہ کی غداریوں اور دروغ بافیوں سے نبٹنا اُن کے بس کا کام نہ تھا۔

امیر معاویہ کے آمرانہ نظام کے قائم ہوتے ہی اسلام کی سیاست میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اب پہلے کی طرح حکمران ایک جمہوریہ کا سربراہ نہ تھا، جو عوام کی مرضی سے منتخب ہوتا تھا اور جو محض رعایا کی فلاح و بہبود اور دین کی عظمت و شوکت کی خاطر حکومت کرتا تھا۔ امیر معاویہ کے عہد سے یہ دستور ہو گیا کہ خلیفۂ وقت اپنا جانشین خود نامزد کرتا تھا اور خواص و عوام خلیفہ کے حضور میں یا اُس کے نمائندے کے سامنے وفاداری کا حلف اُٹھا کر اُس نامزدگی پر مہرِ توثیق ثبت کر دیتے تھے۔ اس نظام میں جمہوریت اور آمریت دونوں کی خرابیاں تھیں، لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی خوبیاں نہ تھیں۔ جمہوریت کے زمانے میں نہ صرف خلیفہ کی معاونت کے لیے صحابۂ نبی پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ تھی، بلکہ اس قسم کی مجلسِ شوریٰ ہر والیٔ صوبہ کی بھی رہنمائی کرتی تھی۔ خلافتِ اموی کے دور میں حکومت محض شخصی حکومت تھی جس پر اعتدال عائد کرنے والی صرف ایک قوت تھی، یعنی بادیہ نشین عربوں اور علماء دالفقہا کی آزادیٔ گفتار، جس کی بدولت وہ اکثر قرآن کے کلمات یا شعراء کے اشعار پڑھ کر خلیفہ کی کیفیتِ مزاج کو بدل دیتے تھے۔ پہلے پانچ خلفائے عباسی کے زمانے میں بھی حکومت شخصی سلطنت رہی ہے، اگرچہ ملکوں کے وزراء امراء اور اکابرِ بنو عباس مشیروں کی ایک غیر رسمی جماعت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک ایسی باقاعدہ مجلسِ شوریٰ جو ان تمام جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل تھی جنھوں نے خلیفہ کی وفاداری کا حلف اُٹھایا تھا پہلی بار مامون اعظم

کے عہد میں قائم ہوئی۔ بُوَیدوں، سامانیوں، سلجوقیوں اور ایوبیوں کے زمانے میں بھی ایسی مجلسیں تھیں جو عوام کی کم و بیش نمائندگی کرتی تھیں۔

لیکن ابتدائی عبّاسیوں کے عہد میں مطلق العنان حکومت مسلمان قوموں کی ذہنی نشو و نما اور مادی ترقی میں ممد ہوئی۔ اُن کے اسلوبِ حکمرانی میں جو توانائی تھی اور جس مضبوطی سے انھوں نے عنانِ اقتدار کو تھامے رکھا اُس کے اعتبار سے وہ انگلستان کے ٹیوڈر (Tudor) خاندان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ خلافتِ عباسیہ کا سیاسی اور انتظامی ساز و سامان، جو بعد میں آنے والے خاندانوں نے اُن سے مستعار لیا، بانیٔ بغداد خلیفہ منصور کی اختراعی فطانت کی تخلیق تھا۔ تقسیمِ کار کی مؤثر ترتیب اور جزئیات پر نگرانی کے اعتبار سے وہ جدید زمانے کے کامل ترین نظاموں کا ہم پلہ تھا۔

عبّاسیوں نے اپنی خلافت کے آغاز ہی میں، جو چند صدیوں تک رہی، ایک بیت المال اور ایک دیوان الخاتم قائم کیا۔ اوّل الذکر کا کام تھا محاصل کا وصول کرنا اور انھیں اخراجاتِ مملکت کے لیے تقسیم کرنا اور ثانی الذکر کا کام تھا فرامینِ شاہی کو مستند قانونی حیثیت دینا۔ امورِ سلطنت کے بہتر تفصیلی انصرام کی خاطر مزید سرکاری محکمے جنھیں دیوان کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا قائم کیے گئے۔ ان میں بڑے بڑے یہ تھے:۔ دیوان الخراج (یعنی محاصل کا مرکزی دفتر یا مالیات کا محکمہ) دیوان الضیاع السلطانیہ (یعنی املاکِ سرکاری کا محکمہ) دیوان الزّمام (یعنی تنقیح اور حساب داری کا محکمہ)، دیوان الجُند (یعنی دفترِ جنگ) دیوان الموالی و الغلمان (یعنی مملوکوں اور غلاموں کا محکمہ) جہاں خلیفہ کے غلاموں اور آزاد کردہ غلاموں کا ایک رجسٹر رکھا جاتا تھا اور ان کے نان و نفقہ کا انتظام کیا جاتا تھا۔ دیوان البرید، دیوان الزمام و النّفقات (یعنی محلسرائے شاہی کے اخراجات کا دفتر) دیوان الرّسائل (یعنی دفترِ خط و کتابت) دیوان التّوقیع (یعنی درخواستوں کا دفتر) دیوان النّظر فی المظالم (یعنی شکایتوں کی تفتیش کا دفتر) دیوان الاحداث و الشّرطہ (یعنی رضا کار فوج اور پولیس کا محکمہ) اور دیوان العطاء (جس کا کام تھا فوجیوں کی تنخواہیں تقسیم کرنا) غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ ایک خاص دفتر کو سونپا گیا تھا، جس کے سربراہ کا لقب کاتب الجہبذہ تھا۔

ہر سرکاری دفتر کے انتظام پر ایک صدر یا رئیس مامور تھا اور اس کی نگرانی کے لیے مُشرف یا ناظر مقرر تھے[1]

اس کے علاوہ ایک اور عہدیدار تھا جس کا لقب حاجب تھا اور جس کا کام تھا دوسرے ممالک کے سفیروں کا تعارف اور قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف مرافعے کی درخواستوں کی شنوائی۔ عباسیوں نے ایک وزیر (یعنی وزیرِ اعظم) بھی مقرر کیا، جس کے ذمے یہ کام تفویض تھا کہ جن امورِ مملکت میں خلیفہ کے احکام لازمی ہوں، انھیں خلیفہ کے سامنے پیش کرے۔ انھوں نے صوبائی نظم و نسق میں باقاعدگی پیدا کی اور صوبوں سے جو خراج لیا جاتا تھا اس کی پکی رقوم مقرر کیں۔ انھوں نے کاروانوں کے لیے سرائیں تعمیر کیں، بغداد سے لے کر مکّہ تک سڑک کے کنارے حوض اور نہریں کھدوائیں، دو رویہ درخت لگوائے اور ہر جگہ مسافروں اور حاجیوں کے لیے سرِ راہ آرامگاہیں بنوائیں۔ انھوں نے مکّہ اور مدینہ کے درمیان سڑک تیار کرائی اور حجاز و یمن کے درمیان آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے کی خاطر گھوڑوں اور اُونٹوں کی ڈاک چوکیاں بٹھائیں۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کو ڈاک لے جانے کے لیے انھوں نے ڈاکیے مقرر کیے۔ دارالخلافہ میں انھوں نے ایک مرکزی دفتر قائم کیا جس میں مملکت کی قدیم دستاویزات محفوظ رکھی جاتی تھیں اور اپنی قلمرو کے ہر حصّے میں پولیس کا عمدہ انتظام کیا۔ تجارتی کاروبار کی نگرانی، تاجروں کے درمیان تنازعوں کے تصفیے اور دھوکے بازی کی روک تھام کی خاطر انھوں نے ایک شرکتِ تجار قائم کی۔ نہ صرف ہر تجارتی مرکز میں سوداگروں کی ایک باقاعدہ انجمن تھی، بلکہ ہر اہم شہر اور قصبہ میں ایک مجلسِ بلدیہ بھی تھی۔ انھوں نے ایک محتسب بھی مقرر کیا جو ہر روز بازار کا دورہ کرتا تھا اور تاجر پیشہ لوگوں اور دوکانداروں کے آلاتِ وزن و پیمائش کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔ انھوں نے مقامی خود اختیاری حکومت کو فروغ دیا اور شہری اداروں کی حوصلہ افزائی

---

[1] عباسیوں کے سیاسی و ملکی بندوبست کے تفصیلی بیان کے لیے The Short History of the Saracens, (pp.402-443) ملاحظہ کیجیے۔

کی ۔کاشتکاروں کو قرضے دے کر زراعت کو ترقی دی گئی ۔عوام کی خوشحالی اور ملک کی حالت کے بارے میں صوبائی عمّال سے میعادی کیفیت نامے طلب کئے جاتے تھے ۔اگرچہ تمام عبّاسی خلفاء کو شان وشوکت پسند تھی، لیکن اس کے باوجود اُن میں سے بہت سوں نے جمہوریت کے ظاہری محاسن کو برقرار رکھا ۔اُن کی لکھی ہوئی کتابیں اور اُن کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں بازاروں میں بکتی تھیں اور اُن کے جو دام وصول ہوتے تھے اُن سے خلیفے اپنی ذاتی احتیاجات پوری کرتے تھے ۔اُنھوں نے رعایا کی فلاح وبہبود کے معاملے میں جو سرگرمی دکھائی اُس سے اُن مظالم کی جو اُنھوں نے خانوادۂ علوی پر توڑے کسی حد تک تلافی ہو جاتی ہے ۔ مامون اور اُس کے پہلے دو جانشینوں کے عہد میں مملکت اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ۔

اسلام کا سیاسی مزاج کتنا وسیع المشرب ہے اور وہ کس طرح اپنے آپ کو ہر نوعیت اور ہر ہیئت کے معاشرے سے ہم آہنگ بنا سکتا ہے ، اس کی بہترین مثال خلافتِ ہسپانیہ ہے ۔وحشی لشکروں نے اس ملک پر بڑی شدید مصیبتیں نازل کی تھیں ۔ملک کے طول وعرض میں اُنھیں جہاں کہیں کوئی ادارہ نظر آیا ، اُنھوں نے اُسے ملیامیٹ کر دیا تھا ۔اُنھوں نے رُومی حکومت کے کھنڈروں پر جو بادشاہتیں قائم کی تھیں وہ کچھ ایسے کینڈے کی تھیں کہ سیاسی نشوونما کے تمام امکانات اُن کی بدولت ختم ہو گئے تھے ۔اُنھوں نے رعایا پر جاگیردارانہ مطالبات کا اتنا بھاری بھرکم بوجھ لاد دیا تھا کہ رعایا اس کے نیچے پس کر رہ گئی تھی ۔بہت سے بڑے بڑے علاقے آبادی سے خالی ہو گئے تھے ۔ضابطۂ اسلامی کے نفاذ نے لوگوں کو بھی اور زمینوں کو بھی جاگیردارانہ نظام کی جکڑ بند سے رہائی بخشی ۔صحرا لہلہاتے کھیت بن گئے ، ہر طرف مرفّہ الحال شہر آباد ہو گئے اور نظم وضبط نے بے آئینی کی جگہ لے لی ۔ہسپانیہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عربوں نے ایک منشور جاری کیا جس میں اُنھوں نے محکوم قوموں کو ، نسل ومذہب کے امتیاز کے بغیر ، وافر آزادی کا یقین دلایا ۔سُوئیوی Suevi گوتھ (Goth) وندال (Vandal) رُومی ، یہودی غرض سب کو مسلمانوں کے برابر حیثیت بخشی گئی ۔عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ، اپنی

عبادت گاہوں کو آزادانہ استعمال کرنے کی اجازت اور جان و مال کی امان کی مکمل ضمانت دی گئی - یہ تو یہ، انھیں اس کی اجازت بھی دی گئی کہ مقررہ حدود کے اندر اپنے قوانین پر عمل درآمد کریں - اس سے بڑھ کر یہ کہ انھیں نہ صرف دیوانی مناصب بلکہ فوجی عہدوں پر بھی فائز کیا گیا - اُن کی عورتوں کو فاتحوں کے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دی گئی - عربوں کا ہسپانیہ میں جو رویہ رہا، اگر اس کا مقابلہ اس سلوک سے کیا جائے جو اکثر یورپین قوموں نے، قدیم زمانے میں نہیں بلکہ جدید زمانے میں، محکوم قوموں سے روا رکھا، تو کیا ایک حیرت انگیز اختلاف دکھائی نہیں دیتا؟ جہاں تک قدیم زمانوں کا تعلق ہے، جس طرح نارمنوں نے انگلستان پر یا عیسائیوں نے صلیبی محاربوں کے دوران شام پر حکومت کی، اُس کا مقابلہ عربوں کی حکومت سے کرنا عقلِ سلیم اور انسانیت کی توہین ہے - عربوں نے ایفائے عہد میں جو اُستواری دکھائی اور ہر طبقے سے، کسی قسم کے امتیاز کے بغیر، جو مساویانہ انصاف کیا، اُس کی بدولت لوگوں کو اُن پر اعتماد ہو گیا - انھی باتوں میں نہیں، بلکہ فراخدلی میں، حسنِ اخلاق میں اور مہمان نوازی میں بھی، عرب اُس زمانے کی تمام دوسری قوموں پر فضیلت رکھتے تھے[1] یہودیوں نے وحشیوں کی حکومت میں عیسائی پادریوں کے اثر و رسوخ کی بدولت بڑے ستم اُٹھائے تھے - عربوں کا آنا اُن کے لیے سب سے زیادہ سُودمند ثابت ہُوا - اعلیٰ سے اعلیٰ طبقوں کی ہسپانوی خواتین نے جن میں پلاجیس (Pelagius) کی بہن اور روڈرک (Roderick) کی بیٹی کا بھی شمار ہوتا ہے، "ملحدوں" کے ساتھ (جس لقب سے جاں ماریانا (Jean Mariana) مسلمانوں کو ملقب کرتا ہے) شادیاں کیں - اُن کے مرتبے سے جو حقوق و مراعات متعلق تھے وہ اُنھیں پوری طرح حاصل تھے اسا تھ ہی ساتھ اُنھیں پوری آزادیٔ ضمیر بھی نصیب تھی - جن جاگیرداروں نے روڈرک

---

[1] کونڈے Conde's History of the Spanish Moops

کی چیرہ دستیوں سے بچنے کی خاطر پہاڑوں میں پناہ لے رکھی تھی مسلمانوں نے ان سب کو واپس آنے کی دعوت دی۔ بد قسمتی سے ان کے علاقوں سے اتنے زیادہ لوگ فرار ہو گئے تھے کہ وہ انھیں دوبارہ آباد کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ایسے غیر ملکی کاشتکاروں کو جو جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں آباد ہونے کو تیار تھے نہایت فراخدلانہ ترغیبیں دیں۔ ان ترغیبوں کی بدولت افریقہ اور ایشیا سے محنت پیشہ آبادکار بڑی تعداد میں ہسپانیہ آ گئے۔ پچاس ہزار یہودی بہ یک وقت اپنے بیوی بچوں سمیت اُندلس آ کر آباد ہو گئے۔

ہسپانیہ سات صدیوں تک مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ اندرونی جھگڑوں اور خاندانی لڑائیوں کے باوجود ان کے دشمن بھی اس امر کے شاہد ہیں کہ ان کی حکومت ہسپانیہ کے لیے ایک رحمت تھی۔ ہسپانوی عرب ثقافت کی جس بلند سطح پر جا پہنچے تھے اُسے کبھی کبھی مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی شادیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان شادیوں نے ہسپانوی مسلمانوں کی نشو و نما پر بہت سا اثر ڈالا اور ان کی وہ حیرت انگیز تہذیب جس سے جدید یورپ نے علوم و فنون کی ترقی میں کسبِ فیض کیا بڑی حد تک اس کی مرہونِ منت تھی[1] جو کچھ ہسپانیہ میں ہوا وہی اور ملکوں میں بھی ہوا جس جس ملک میں مسلمان گئے اُس اُس ملک کی حالت بدل گئی۔ نظم و ضبط نے بے آئینی کی جگہ لے لی اور امن و امان اور خوشحالی کی چہل پہل ہر طرف نظر آنے لگی۔ جس طرح سپاہ گری کسی ایک طبقے کا مخصوص پیشہ نہ تھی، اسی طرح حرفت و دستکاری میں کسی قسم کی ذلت تصور نہ کی جاتی تھی۔ کاشتکاری ہر طبقے میں اتنی ہی مقبول تھی جتنی جنگ آزمائی[2]

بادشاہوں پر رعایا سے متعلق جو فرائض عاید ہوتے ہیں انھیں اسلام کتنی اہمیت دیتا ہے اور وہ کس طرح رعایا کی آزادی و مساوات کو فروغ دیتا ہے اور اُسے کس طرح حاکموں کے ظلم و ستم سے امان بخشتا ہے، اس کی کیفیت حاکم و محکوم کے باہمی حقوق

---

[1] رینان Averries et Averroisme,

[2] Oelsner

کے موضوع پر ایک نمایاں تصنیف میں بیان کی گئی ہے جس کا مصنف صفی الدین محمد بن علی بن طباطبائی (المعروف بہ ابن الطقطقی) ہے۔ یہ کتاب ۷۰۱ ہجری (۲-۱۳۰۱ عیسوی) میں تالیف ہوئی اور فخر الدین عیسیٰ ابن ابراہیم امیرِ موصل سے معنون ہے۔

پہلے حصے میں اس سے بحث کی گئی ہے کہ رعایا کے معاملے میں بادشاہوں کے کیا کیا فرائض ہیں اور (امورِ عامہ کے انصرام اور معاشی مسائل کے حل کے کیا کیا اصول و قواعد ہیں۔ مصنف کے نزدیک بادشاہ میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں: دانشمندی، عدل، رعایا کی ضرورتوں اور خواہشوں کا علم اور خوفِ خدا۔ خوفِ خدا کے بارے میں وہ نہایت شدّ و مدّ سے کہتا ہے کہ یہ تمام اوصافِ حمیدہ کی بیخ و بُن اور تمام برکات کی کلیدِ باب ہے۔ " وھذہ الخصلۃ ھی اصل کل خیر و مفتاح کل برکۃ، ان الملک متی خاف اللہ آمنۃ عباد اللہ "۔ "جب بادشاہ کو خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا شعور ہوگا تو اُس کے ملازموں کو امن و امان کی برکتیں نصیب ہوں گی۔" بادشاہ میں رحم (العفو عن الذّنوب) کی صفت بھی ہونی چاہیئے، جو خصائلِ حسنہ میں سب سے احسن خصلت ہے۔" اس کے دل میں اپنی رعایا کی بہتری کی ایک ہمیشہ موجود رہنے والی خواہش ہونی چاہیئے اور اسے چاہیئے کہ رعایا سے اس کی خواہشیں دریافت کرتا رہے کیونکہ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ہمیشہ صحابۂ کرام سے مشورہ کیا کرتے تھے اور خدا نے ارشاد فرمایا ہے: "ہر معاملے میں اُن سے مشورہ کرو۔" امورِ مملکت کے انتظام میں بادشاہ کا فرض ہے کہ سرکاری آمدنی پر نگاہ رکھے، رعیت کے جان و مال کی حفاظت کرے، امن و امان قائم رکھے، جرائم کی روک تھام کرے اور رعایا کو ہر طرح کے گزند سے بچائے۔ اُسے ہمیشہ اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔ اس پر مصنف نہایت معنی خیز الفاظ میں اضافہ کرتا ہے کہ "رعایا کا فرض فرمانبرداری ہے، لیکن ظالم حاکم کی فرمانبرداری رعایا کا فرض نہیں۔" ابن رُشد کا قول ہے کہ "آمرِ جابر وہ ہے جو رعایا کی خاطر نہیں بلکہ اپنی خاطر حکومت کرتا ہے۔"

مسلمانوں کے قوانین جو انصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں اور جن کی امتیازی خصوصیت سادگی اور وضاحت ہے، کسی ایسی قسم کی فرمانبرداری کا تقاضا نہ کرتے تھے جو دشوار اور دُو بھر

تھی یا انسانی فہم و ذکاء کے منافی تھی جن جن ملکوں میں مسلمانوں نے اپنی حکومت قائم کی وہ جاگیردارانہ نظام اور جاگیردارانہ ضابطۂ قوانین کے تباہ کن نتائج سے مصئون رہے[1]۔ "ان کے قوانین نے، جو خصوصی مراعات اور ذات پات کو تسلیم نہ کرتے تھے، دو شاندار نتائج پیدا کئے —— ایک تو یہ کہ وحشیانہ قوانین نے زمینوں پر جبلی مطالبات کا جو بوجھ لاد دیا تھا وہ اُن سے رہا ہو گئیں، دوسرا یہ کہ افراد کو کامل مساواتِ حقوق حاصل ہو گئی[2]۔"

---

[1] کورسیکا، سارڈینیا، صقلیہ اور جنوبی اٹلی میں جاگیردارانہ نظام عربوں کے اخراج کے بعد رائج ہوا۔

[2] Oelsner

آٹھواں باب

سیاسی فرقہ بندیاں

اس باب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کے متعلق عالم اسلام میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ فاضل مصنف نے بعض مقامات پر بیشتر ایک ہی مکتب فکر کی ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں چند مختصر تعلیقات کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ ۵۳۰ (ادارہ)

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

حافظ

تاریخ مذاہب کا فلسفیانہ مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو اس باب کا عنوان پڑھ کر تعجب ہوگا اور ہر اُس مسلمان کو جسے اپنے مذہب کے رہنما سے محبت ہے کرب و ندامت کا احساس ہوگا۔ مقامِ افسوس ہے کہ انسانیت اور عالمگیر اخوت کا مذہب بھی اندرونی نزاع و اختلاف کی لعنت سے مبرا نہ رہ سکا اور وہ دین جسے ایک سراسیمہ دنیا کو امن و امان اور جمعیت خاطر کی دولت بخشی تھی غرور و غضب ناک جذبات اور ہوسِ اقتدار کے ہاتھوں فتنۂ تفریق کا شکار ہو گیا۔ ہم نے عیسائیت کا ذکر کرتے وقت جن خرابیوں پر اظہار افسوس کیا تھا اُن کا سرچشمہ نظام عیسوی کا نامکمل اور حوائجِ انسانی سے ناموافق ہونا تھا۔ اسلام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں اور جن کا ذکر ہمیں کرنا ہوگا، وہ ایک طرف توجاہِ دنیوی کی حرص کا نتیجہ تھیں اور دوسری طرف ایسے افراد اور طبقوں کی انقلاب انگیزیوں کا جنھیں اخلاقی نظم و ضبط راس نہ آتا تھا۔

معلمِ عربیؐ کی غیر معمولی فطانت، اس کی حیرت انگیز شخصیت اور اس تے مذہبی اتحاد اور عالمگیر شہریت کی جو دعوت دی اُس دعوت کی دل نشینی کا بین ترین ثبوت وہ عالمی تحریک ہے جس کا وہ پیش کرنے والا تھا اور جس نے خاندانوں کی خانہ جنگیوں کے باوجود اُس کی قت

کو فتح و نصرت کی ایک سیلابی موج پر سوار کر کے کرۂ ارض کے ایک گوشے سے دوسرے
گوشے تک پہنچا دیا۔ عرب، جواب تک مختلف قبیلوں اور خاندانوں کا میدان کارزار
تھا جن میں صدیوں پُرانی باہمی عداوتیں تھیں، اس میں ایک مشترک مقصد نے یکایک
ایک نئی روح پھونک دی۔ اب تک عربوں کی باہمی جنگ و جدل اور ان کے باہمی
معاہدے، اُن کی خوبیاں اور بُرائیاں، اُن کی حرّیت پسندی اور جرگہ بندیاں اتحادِ عمل
کی راہ میں حائل رہی تھیں۔ یکایک گلّہ بانوں کی ایک جماعت ایک حکمران قوم اور نیم
خانہ بدوشوں کی ایک نسل ایک عالمی مذہب کی پیشوا اور ایک ہمہ گیر قانون کی امین بن گئی۔
تین برِاعظموں کے درمیان رہنے والے بادیہ گرد قبیلوں کے اس متفرق مجموعے نے
عدیم النظیر تن دہی اور نفس کُشانہ جاں نثاری سے کام لے کر دینِ حق کا جھنڈا اپنے ہاتھوں
میں لیا اور اسے اقصائے عالم میں سربلند کر دیا۔ "تم اس امر پر مبعوث ہوئے ہو کہ
ساری نوعِ انسانی کو رحمتِ ربّی اور وحدت اللہ کا پیغام پہنچاؤ" یہ تھی وہ صلائے عام
جو اُنھیں سنائی گئی۔ اور انھوں نے ایک ایسے راسخ ارادے سے جو کسی سدِ راہ کو خاطر
میں نہ لاتا تھا اس پر لبّیک کہا۔ عقیدے کی وہ شدّت جس کی بدولت وہ مخالف مذہبوں
اور نسلوں کی صفیں چیرتے ہوئے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے
اس پُراسرار انقلاب کی کلید ہے جو انھوں نے برپا کر دیا۔
حقیقت ازلی و ابدی ہے۔ پیغامِ محمدیؐ کوئی نیا پیغام نہ تھا۔ یہ پیغام پہلے بھی دیا گیا
تھا، لیکن اس نے انسان کے دل میں گھر نہ کیا تھا۔ محمد مصطفیٰؐ کی آواز ایک صُور تھی
جس نے مرے ہوؤں کو زندہ کر دیا اور جو مر رہے تھے اُنھیں مزید زندگی بخشی۔ انسانیت
کی نبض صدیوں کی جمع شدہ قوّت کے ساتھ چلنے لگی۔ عربوں کا اس زبردست محرک کے زیرِاثر
اپنے وطن سے خروج جس وسیع پیمانے پر وہ ظہور میں آیا اور وہ دُوررس اثرات جو اس
نے مرتب کیے ـــ یہ عصرِ جدید کی تاریخ کے سب سے حیرت انگیز مظاہر میں ہے۔ عرب نوعِ انسانی
کے معلّم بن کر اپنے صحرائی سنسان خانوں سے نکلے۔ تیس سالوں کے اندر (جو خلافتِ راشدہ
کی مدتِ موعود تھی) وہ ہندوکش سے لے کر بحرِ اوقیانوس کے ساحل تک ہر قوم کے

دروازے پر دستک دے رہے تھے تاکہ اُسے وہ پیغام دیں جو اُنھیں تفویض کیا گیا تھا۔ وصالِ نبویؐ سے لے کر جمہوریتِ راشدہ کے اختتام تک جو قلیل مدت گذری اُس مدت میں اُنھوں نے ایک ایسی سلطنت بنا کر رکھ دی جو وسعت میں اُس سلطنت پر سبقت لے گئی جسے رومیوں نے تیرہ صدیوں کی مسلسل توسیع کے بعد قائم کیا تھا۔ ابن الاثیر، طبری یا ابوالفدا کی تاریخوں کی ورق گردانی کیجیے تو آپ کو اس کی ایک سلسلہ وار روداد ملے گی کہ فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب کس طرح تمام ان منفعت بخش عناصر کو جو اُسے رستے میں ملے اپنے اندر حل کرتا ہُوا اور اس سرزمین کو جس پر سے وہ گزرا زرخیزی عطا کرتا ہُوا پھیلتا چلا گیا۔

لیکن وہی اسباب جنھوں نے عربوں کو ظہورِ محمدیؐ سے پہلے ایک واحد قوم بننے سے روک رکھا تھا، یعنی وہی قبائلی رقابتیں اور مخالفتیں جن کے بدنما داغ آج بھی دنیائے اسلام کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں، بالآخر نہ صرف جمہوریتِ راشدہ کی تباہی بلکہ سلطنتِ اسلامیہ کی بربادی کا باعث بنے۔ دوسوں d'Ohsson کا کہنا ہے کہ "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے ہادی کی دکھائی ہوئی راہ پر چلتے اور خلفائے راشدین کی مثال کی تقلید کرتے تو اُن کی سلطنت رُومی سلطنت سے وسیع تر اور محکم تر ہوتی۔" لیکن بنی اُمیّہ کی حرص نے، جو عربوں کی شوریدہ پشتی نے اور ان کی اس انفرادیت پرستی نے جو ایک مشترک دشمن کے خلاف صف آرائی کے دوران بھی اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر نہ رہتی تھی، اس عظیم الشان عمارت کو مسمار کر دیا جو ابتدائی مسلمانوں کی شجاعت اور عقیدت نے کھڑی کی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب فرانس کا شہر تُور Tours اُن کے قبضے میں آنے ہی والا تھا تو اُن کی فتح یکایک شکست میں تبدیل ہو گئی۔ ہسپانیہ سے بھی وہ اسی لیے نکالے گئے کہ وہ اپنی قدیم صحرائی رقابتوں کو فراموش کر کے مشترک طور پر دشمن کا مقابلہ نہ کر سکے۔

بہرحال، اگرچہ جمہوریت ختم ہو گئی اور عصائے سلطانی عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا، تاہم دینِ اسلام زندہ رہا۔ وہ صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ اور انسان کی مذہبی نشوونما کا

آخری مرحلہ تھا۔ اس لیے اس کی ہستی یا اس کی ترقی سلطنتوں کے قیام یا انسانوں کی بقا پر منحصر نہ تھی۔ چنانچہ جیسے جیسے وہ پھلتا پھولتا اور بڑھتا پھیلتا گیا ہر قوم اور ہر عہد اپنی اپنی روحانی ضروریات اور اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اس کی تعلیمات سے استفادہ کرتا رہا۔

تفرقوں اور تنازعوں نے کلیسائے عیسوی کی طرح ملّتِ محمدیؐ کے بھی ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ جو امور انسان کے دائرۂ وقوف کے اندر ہیں اُن پر اختلافِ آرا نے کبھی اتنی تلخی اور دشمنی پیدا نہیں کی جتنی ایسے مجرّد موضوعات پر اختلافِ آرا نے کی ہے جن کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ ممکن ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی سرشت کے بارے میں مناظروں نے لاکھوں انسانوں کا خون بہایا۔ اس سوال نے کہ انسان مختار ہے یا مجبور اگر دنیائے اسلام میں اُتنا خون نہیں بہایا تو اُتنے ہنگامے ضرور برپا کیے ہیں۔ پاپائے روم کے دعوئ معصومیت نے دنیائے عیسائیت کی بنیادیں ہلا دیں۔ اجماعِ اُمّت اور اکابرِ ائمّہ کے بری از خطا ہونے کا نظریہ متعدد قیمتی زندگیوں کی تباہی کا باعث بنا۔

دینِ محمدیؐ میں جو فرقے ہیں اُن کے اصلی اسباب سیاسی اور خاندانی اختلافات ہیں، یعنی پرانی قبائلی عداوتیں اور بالخصوص آلِ ہاشم سے دوسرے قریش کا حسد و رشک عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اسلام کی روحانی اور دنیاوی پیشوائی کے لیے صریح طور پر کسی کو اپنا جانشین نامزد نہیں کیا۔ لیکن یہ خیال واقعات کے بارے میں ایک غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ اس امر کی وافر شہادت ملتی ہے کہ آپؐ نے اپنی جانشینی کے معاملے میں متعدد مرتبہ حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بالخصوص حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران جب آپؐ نے مقامِ خُم پر قیام فرمایا تو آپؐ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کیا اور اُن سے خطاب کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کیے جو اس باب میں شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپؐ کا کیا عندیہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"علیؓ کا مجھ سے وہی رشتہ ہے جو ہارون کا موسیٰؑ سے تھا۔ الٰہ العالمین، تو اس کے دوستوں کا دوست رہیو اور اس کے دشمنوں کا دشمن۔ جو لوگ اس کی مدد کریں ان کی مدد کیجو،

اور جو لوگ اس سے غداری کریں اُن کی اُمیدوں کو خاک میں ملا دے۔"[1] دوسری طرف رسولِ پاک کی بیماری کے ایام میں حضرت ابوبکرؓ کا امامتِ نماز کے فرائض پر مامور ہونا ایک مختلف انتخاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیغمبر کی وفات پر جب اُمتِ مسلمہ کا امیر منتخب کرنا ضروری ہوا تو یہ سوال زیرِ بحث آیا۔ بنو ہاشم کا اصرار تھا کہ وراثت کے علاوہ تقرر کے ذریعے یہ منصب حضرت علیؑ کا حق تھا۔ دوسرے قریش رائے دہندگی کے ذریعے انتخاب پر اڑے ہوئے تھے۔ جب اہلِ بیت رسولِ خدا کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے، تو اسی دوران میں بعض قریش اور انصارِ مدینہ کی رائے سے حضرت ابوبکرؓ خلافت کے لیے انتخاب کیے گئے اس عجلت کی توجیہہ یوں کی جا سکتی ہے کہ حکومت کی صدارت پر کسی کا فوراً مامور کیا جانا لازمی تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنی طبعی فیاضی اور حُبِّ دین سے کام لے کر اور اس خوف سے کہ مبادا متبعینِ نبی میں کسی قسم کا رخنہ پڑ جائے، فوراً حضرتِ ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ تین مرتبہ انھیں خلیفہ کا تقرر کرتے وقت نظر انداز کیا گیا اور تینوں مرتبہ انھوں نے انتخاب کرنے والوں کا فیصلہ بطیبِ خاطر منظور کیا۔ انھوں نے ایک مرتبہ بھی اپنے آپ کو ایک اُمیدوار کی حیثیت سے پیش نہ کیا، عام اس سے کہ اُن کے حامیوں اور طرف داروں کے جذبات اس معاملے میں کیا تھے۔ انھوں نے پہلے دو خلفاء کو معاملاتِ مملکت میں رائے اور مشورہ دینے سے کبھی دریغ نہ کیا۔ پہلے دو خلفاء نے بھی اُن کے مشوروں اور تعلیماتِ نبویؐ کی تشریح و تفسیر کا ہمیشہ احترام کیا۔ جن حالات میں حضرتِ عثمانؓ منصبِ خلافت پر فائز ہوئے ہم اُن کا ذکر اُوپر کر آئے ہیں۔ یہاں ہم اس کے بعد کے واقعات[2] کو بیان

---

[1] ابن خلکان۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۸۳۔ ابن خلکان کہتا ہے، الحازمی کے قول کے مطابق خم ایک وادی کا نام ہے جو کہ اور مدینہ کے درمیان اور الجحفہ کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ اس میں ایک تالاب (غدیر) ہے، جس کے نزدیک رسولِ اکرمؐ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:۔ یہ ۱۸ ذوالحجہ کا واقعہ ہے، کیونکہ ابن خلکان کے کہنے کے مطابق یہ عیدِ غدیر کی تاریخ ہے اور غدیر کو غدیرِ خم بھی کہتے ہیں۔ [2] ان امور کے متعلق اس باب کے آخر میں حاشیہ دیکھیے۔ (مترجم)

کریں گے تاکہ اس امر کی صراحت کر سکیں کہ وہ افسوسناک رخنہ جس نے ملّتِ اسلامیہ کو دو فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے کیونکر پیدا ہوا۔ حضرت عثمانؓ میں نہ تو حضرت ابوبکرؓ کی سی زیرکی تھی، نہ حضرت عمرؓ کی سی ذہنی استعداد اور عزم و جزم۔ اُن کی نیک طینتی اور سادہ دلی نے انھیں اپنے اعزّہ و اقربا کے ہاتھوں میں بے بس کر دیا۔ ایک طرف یہ فرشتہ خصال بزرگ اپنے مطلب پرست رشتہ داروں کے حلقے میں گھرا ہوا، دوسری طرف صوبے اپنے مسائل کے حل طلب کرتے ہوئے اور تیسری طرف جمہورِ مسلمین ایک پُرملال خاموشی کے ساتھ صدرِ مملکت کا منہ تکتے ہوئے —— یہ ہے اس عہد کا ایک عبرت آموز اور غمناک مرقع۔ ڈوزی (Dozy) نے نہایت برجستہ الفاظ میں اس شریف النّفس خلیفہ کی تصویر کھینچی ہے: "حضرت عثمانؓ کی شخصیت ایسی نہ تھی کہ وہ خلافت کے لیے انتخاب کئے جاتے۔ یہ بجا ہے کہ وہ غنی اور سخی تھے۔ انھوں نے مالی قربانیوں کے ذریعے پیغمبرِ اسلامؐ اور اسلام کی مدد کی تھی۔ وہ صائم الدہر اور قائم الصلوٰۃ اور خلیق و حلیم تھے۔ لیکن وہ طبیعت کے کڑے نہ تھے۔ علاوہ بریں پیرانہ سالی نے انھیں بڑی حد تک ضعیف کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ جب انھیں منبر پر بٹھا دیا جاتا تو بڑی دیر تک خطبہ شروع نہ کر سکتے۔ اس پر آفت یہ ہوئی کہ انھیں اپنے رشتہ داروں سے حد درجہ محبت تھی جو مکّہ کے اکابر و اعیان تھے اور جنھوں نے بیس سالوں تک پیغمبر کی توہین کی تھی، آپ کو ستایا تھا اور آپ سے لڑائیاں لڑی تھیں۔ بہت جلد یہ عالم ہو گیا کہ ان رشتہ داروں نے خلیفہ کو شیشے میں اُتار لیا۔ اُن کا چچا ہشام اور ہشام کا لڑکا مروان فی الحقیقت ملک کے حکمران تھے۔ حضرت عثمانؓ صرف برائے نام خلیفہ تھے اور اس لقب کی بدولت ایسے ایسے مشتبہ امور کے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے تھے جن کی انھیں اکثر خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں اشخاص کی پختگی ایمان موضوعِ شک تھی۔ ہشام نے تسخیرِ مکّہ کے بعد اسلام قبول کیا تھا اور رموزِ سلطنت کے افشا کی پاداش میں جلا وطن کیا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اس حکم کو جو خود پیغمبرؐ نے صادر کیا تھا، برقرار رکھا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے نہ صرف ہشام کو واپس بلوا لیا بلکہ سرکاری بیت المال سے ایک لاکھ نقرئی سکّے عطا کئے اور املاکِ سرکاری میں سے زمین کا ایک قطعہ بھی دیا۔ انھوں نے مروان کو اپنا منشی اور وزیر مقرر کیا۔ اس نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کی اور اسے افریقہ سے

لائے ہوئے مالِ غنیمت سے مالا مال کر دیا۔[1] اگرچہ ابوسفیان اور ہندہ نے پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف اُحد کی خوں ریز لڑائی لڑی تھی، لیکن حضرت عثمانؓ نے نہ صرف اُن کے بیٹے معاویہؓ کو شام کی گورنری سے سبکدوش نہ کیا، بلکہ اُن کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن سعدؓ بن سرح کو مصر کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہ وہی عبداللہ ہے جو ایک زمانے میں رسولِ اکرمؐ کا منشی تھا اور جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ جب آنحضرتؐ اُسے آیاتِ قرآنی پڑھ کر سناتے تھے تو وہ اُن کے الفاظ میں ردّ و بدل اور اُن کے معانی کو مسخ کر دیا کرتا تھا۔ جب اس کی اس نازیبا حرکت کا پردہ فاش ہو گیا تو وہ فرار ہو کر ازسرِ نو بُت پرست بن گیا۔ حضرت عثمانؓ کا ایک اور سوتیلا بھائی ولید کوفہ کا گورنر مقرر ہُوا۔ اگرچہ اس کے باپ نے آنحضرتؐ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، یہاں تک کہ ایک موقع پر گلا گھونٹ کر آپؐ کو مار ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ ایک ایسا گیا گزرا عیاش و اوباش اور رِندِ سے مے پرست تھا جس کی زندگی مسلمانوں کے لیے باعثِ عار تھی۔ ایک دن وہ نمازِ فجر کے وقت مسجد میں آیا تو ایسی بُری طرح نشے میں چُور تھا کہ اس میں فرائضِ امامت ادا کرنے کے لیے کھڑا ہونے کی سکت بھی نہ تھی۔ جب آس پاس کے لوگوں نے سہارا دے کر اسے کھڑا کر دیا تو اس نے ہکلاتی ہوئی آواز میں مزید شراب کا مطالبہ کیا۔ یہ تھے وہ لوگ جو خلیفہ کے دستِ راست تھے۔ انھوں نے جونکوں کی طرح رعایا کا خون چُوس لیا اور بے دریغانہ استحصال سے کام لے کر دولت بٹورنے لگے۔ مملکت کے گوشے گوشے سے مدینے میں شکائتیں آنے لگیں لیکن سخت و سُست الفاظ کے سوا شکایتوں کا کوئی جواب نہ دیا گیا۔[2] بالآخر بارہ ہزار افراد کا ایک وفد جس کے سربراہ حضرت محمد بن ابوبکرؓ تھے، حضرت عثمانؓ کی خدمت میں لوگوں کی شکایات پیش کرنے اور اُن کے تدارک کی درخواست گزارنے کی خاطر دارالخلافہ میں آیا۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت

---

[1] Dozy, Hist. des Mussulmans dans l'Espagne, vol. i, p.44)

[2] ابن الاثیر۔ جلد ۳۔ صفحہ ۱۲۵ ۔

علیؓ کی وساطت کی فرمائش کی۔ حضرت علیؓ نے شکایات کے ازالے کا وعدہ کرکے لوگوں کو رخصت کیا۔ ابھی وفد کے افراد نے مدینے سے ایک دن کی مسافت ہی طے کی تھی کہ حضرت عثمانؓ کے کاتب کا لکھا ہوا ایک خط اُن کے ہاتھ لگا جس پر مہرِ خلافت ثبت تھی اور جس میں حضرت معاویہؓ کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ان سب لوگوں کے سر قلم کر دیں*۔ اس بدعہدی پر برافروختہ ہو کر وہ لوگ مدینے واپس آئے اور انھوں نے کاشانۂ خلافت میں داخل ہو کر حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔ آن کی شہادت نے بنو اُمیہ کو وہ چیز مہیا کر دی جس کے وہ ایک مدت سے متمنی تھے، یعنی اسلام کے خلاف، اس کی جمہوریت کے خلاف، اس کی مساواتِ حقوق کے خلاف اور اس کے سخت گیر اخلاقی ضوابط کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کا بہانہ۔ اہلِ مکہ کو اس شہادت نے اس کا عذر بہم پہنچا دیا کہ اہلِ مدینہ کے خلاف، جن سے انھیں سخت نفرت تھی، سازش کا بازار گرم کریں۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کی جان بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اوّل اوّل تو انھیں یہ مصلحت اندیشانہ مشورہ دے کر کہ وہ اپنے بے اصولے رشتہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہ بنیں اور آخری مرتبہ مغلوب الغضب سپاہیوں کا سامنا کرکے اور انھیں اس کی تلقین کرکے کہ ضعیف العمر جانشینِ نبی کا لحاظ کریں۔ حضرت عثمانؓ کی حفاظت کی خاطر انھوں نے اپنے بیٹوں کی جانوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی وفات پر وہ جمہور مسلمین کی متفقہ رائے سے منصبِ خلافت پر سرفراز ہوئے۔ وصالِ نبویؐ کے وقت سے اس وقت تک اگرچہ انھوں نے کبھی مملکت کی مشاورتی مجلسوں میں حاضر ہونے میں ناغہ نہ کیا تھا، لیکن ہمیشہ ایک پُر وقار خاموشی اور ایک عالی ظرفانہ آزادطبعی قائم رکھی تھی۔ ایک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر انھوں نے اپنا وقت زیادہ تر مطالعۂ کتب اور خانگی زندگی کے پُرامن مشاغل میں گزارا تھا۔ جب انھیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے حسبِ عادت انتہائی سادگی سے بیعت قبول کی اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اگر کوئی شخص منصبِ خلافت کا اُن سے زیادہ اہل ہو تو وہ بطیبِ خاطر اس کے حق میں سبکدوش ہو جائیں گے۔

سیدیو (Sedillot) لکھتا ہے کہ "اگر موروثی جانشینی کا اصول حضرت علیؓ

* دیکھیے تعلیقات صفحہ ۵۳۰

کے حق میں ابتدا ہی سے تسلیم کر لیا جاتا تو وہ منافقشانگیز دعوے جنھوں نے اسلام کی تاریخ کو مسلمانوں کے خون سے رنگین کر دیا پیدا نہ ہوتے ...... فاطمہؓ کے شوہر کو وارثِ نبی کی حیثیت سے بھی اور انتخاب کی بناء پر بھی جانشینی کا حق پہنچتا تھا۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان کی عظمت و منزلت کے سامنے ہر کوئی سرِ تسلیم خم کر دے گا لیکن ایسا ہونا مقدّر نہ تھا۔" سب سے پہلے تو زبیرؓ اور طلحہؓ نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ انھیں امید تھی کہ انتخابِ جمہور کا قرعہ اُن کے نام پڑیگا۔ اس میں انھیں جو ناکامی ہوئی اُس پر تازیانہ یہ ہُوا کہ حضرت علیؓ نے انھیں بصرہ اور کوفہ کا حاکم بنانے سے انکار کر دیا۔ اُن کی اعانت حضرت عائشہؓ بنت ابوبکرؓ نے کی جنھوں نے سابق انتخابات میں سرگرمی سے حصّہ لیا تھا۔ وہ بغاوت کی روحِ رواں تھیں اور خود اُونٹ پر سوار ہو کر لشکر کے ہمراہ میدانِ جنگ میں آئیں۔ حضرت علیؓ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت عبداللہؓ بن عباس کو باغیوں کے پاس بھیجا تاکہ وہ انھیں ان کے فرائضِ دینی یاد دلا کر اُنھیں جنگ کے ذریعے فیصلہ کرانے سے باز رکھیں۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ زبیر اور طلحہ نے خُریبہ کے مقام پر خلیفہ کی فوجوں کا مقابلہ کیا۔* انھیں شکست ہوئی اور وہ ایامِ جنگ میں مارے گئے۔[1] حضرت عائشہؓ گرفتار ہوئیں، ان کے ساتھ مروّت و عزّت کا سلوک کیا گیا اور انھیں کمال احترام کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا گیا۔ ابھی یہ بغاوت فرو ہی ہوئی تھی کہ حضرت علیؓ کو امیر معاویہؓ کی شام میں بغاوت کی خبر ملی۔ حضرت عثمانؓ کے دوسرے رشتہ داروں کی طرح جنھیں انھوں نے صوبوں کے عمّال مقرر کیا تھا، امیر معاویہ نے بھی اُس زر و مال کی مدد سے جو خلیفۂ سوم نے انھیں عطا کیا تھا اور جو انھوں نے شام کی حکومت کے دوران حاصل کیا تھا، پیشہ ور سپاہیوں کی ایک معتدبہ تعداد اپنے گرد جمع کر لی تھی۔ حضرت علیؓ کو اُن کے مشیروں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے کافی مضبوط نہ ہو جائیں اس وقت تک حضرت عثمانؓ کے مامور کیے ہوئے حاکمانِ صوبجات کو برطرف نہ کریں۔ لیکن اسلام کے

---

[1] اس مناسبت سے کہ حضرت عائشہؓ اس لڑائی میں اُونٹ پر سوار ہو کر شریک ہوئیں اس کا نام جنگِ جمل رکھا گیا۔ جس مقام پر لڑائی ہوئی اور جہاں زبیر و طلحہ مارے گئے اس کا نام وادی السّبع ہے۔

* دیکھیے تعلیقات بر صفحہ ۵۳۰

بایارڈ (Bayard)[1] بے خوف و بے عیب شجاع[2] "کو کسی قسم کی منافقت اور بے انصافی کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت گوارا نہ تھی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے جن جن لوگوں کو برسرِ اقتدار کیا تھا اور جو اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تھے اُن سب کی معزولی کے حکم جاری ہو گئے۔ امیر معاویہ نے فی الفور کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ انھیں متعدد لڑائیوں میں جو صفین کے میدان میں لڑی گئیں شکست ہوئی۔ لڑائی کے آخری دن، جب ان کے سپاہی مالک الاشتر کے حملوں کی تاب نہ لا کر تتر بتر ہو رہے تھے، اُنھیں اپنے سپاہیوں کو تباہی سے بچانے کی ایک نئی ترکیب سوجھی۔ اُنھوں نے اپنے چند سپاہیوں کے نیزوں پر قرآنِ پاک بندھوا دیا اور وہ سپاہی نیزے بلند کر کے آگے بڑھے، بہ آوازِ بلند یہ کہتے ہوئے کہ "مسلمانوں کے خون کو بہنے سے روک لو، اگر شام کی فوج تباہ ہو گئی تو مملکت کی سرحدوں کو یونانیوں سے کون بچائے گا۔؟ اگر عراق کی فوج تباہ ہو گئی تو ترکوں اور ایرانیوں سے مملکت کی سرحدوں کو کون محفوظ رکھے گا؟ کلامِ الٰہی کو ہمارے درمیان فیصلہ کرنے دو"۔ حضرت علیؓ جو باغیوں کے سرغنے اور اس کے شریکِ سازش عمرو بن العاص کی سیرت سے خوب واقف تھے، اس چال کو سمجھ گئے اور انھوں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس دامِ تزویر سے بچنا چاہیئے، لیکن اس کے باوجود سپاہیوں کی ایک کثیر جماعت نے لڑائی جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ "تنازعے کا فیصلہ ثالثی کے ذریعے کرایا جائے۔ حضرت علیؓ نے اُنھیں یقین دلانا چاہا کہ امیر معاویہ محض اپنی جان بچانے کی خاطر قرآن پاک کو ایک حیلے کے طور پر استعمال کر رہے تھے لیکن ان لوگوں نے ایک نہ مانی، بلکہ رفاقت سے منحرف ہو جانے کی دھمکی دی۔ چنانچہ[3] مالک الاشتر میدان سے واپس بُلا لیے گئے، لڑائی بند کر دی گئی اور اس وقت تک

---

[1] مترجم کا نوٹ، بایارڈ فرانس کا ایک مشہور جنگ آزما ہے (۱۴۷۳ء تا ۱۵۲۴ء) جسے "بے خوف و بے عیب جنگ آزما" کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[2] یہ وہ الفاظ ہیں جو میجر اوزبرن (Osborn) نے حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کئے ہیں۔

[3] شہرستانی۔ حصہ اوّل، صفحہ ۸۵۔

کی فتح یابی سے جو کچھ حاصل ہُوا تھا وہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتا رہا۔ ثالثی کا اہتمام کیا گیا۔ جن متعصب لوگوں نے حضرت علیؓ کو مجبور کیا تھا کہ عین اس وقت جب فتح قریب تھی تلواریں میان میں رکھ لیں اُنہی لوگوں نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ اپنی رائے اور مرضی کے برخلاف حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خانوادۂ نبوی کا نمائندہ مقرّر کریں۔ حضرت ابوموسیٰؓ اشعری اپنی سادگی کی وجہ سے اس قابل نہ تھے کہ عمرو بن العاص کی چالاکی و ہوشیاری کا مقابلہ کر سکتے، جو کہ خاندانِ معاویہ کے نمائندہ مقرّر ہوئے۔ چنانچہ وہ عمرو بن العاص کی چال کا شکار ہو گئے۔ عمرو بن العاص نے اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ حضرت علیؓ کی منصبِ خلافت سے اور امیر معاویہ کی حاکمیتِ شام سے برطرفی اور کسی اور شخص کی خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے مسند نشینی ہی میں مسلمانوں کی بہتری تھی۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے منبر پر چڑھ کر حضرت علیؓ کی سبکدوشی کا اعلان کر دیا۔ وہ یہ اعلان کر کے دل ہی دل میں اس احساس سے خوش کہ اُنھوں نے ایک بڑا نیک کام کیا ہے منبر پر سے اُترے۔ اُن کا اُترنا تھا کہ عمرو بن العاص مُسکراتے ہوئے منبر پر چڑھے اور حضرت علیؓ کی برطرفی کا فیصلہ قبول کر کے معاً امیر معاویہ کے منصبِ خلافت پر تقرّر کا اعلان کر دیا۔ بیچارے ابوموسیٰ اشعریؓ ششدر رہ گئے۔ بہر حال، چونکہ جو چالبازی کی گئی تھی وہ بدیہی تھی، ہاشمیوں نے فیصلے کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ دومۃ الجندل کے مقام پر ظہور میں آیا۔ بنو اُمیّہ کی فریب کاری سے بنی فاطمہ بیحد برافروختہ ہوئے، چنانچہ دونوں فریق ایک دوسرے سے ہمیشہ کی نفرت کا عہد کر کے علیحدہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی مدّت بعد حضرت علیؓ کوفہ کی ایک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے شہید ہو گئے۔[2] اُن کی شہادت سے فائدہ اُٹھا کر امیر معاویہ نے شام اور

---

[1] جن لوگوں نے خلیفہ کو ثالثی کے ذریعے فیصلہ کرانے پر مجبور کیا انہی لوگوں نے بعد میں اس فیصلے کو رَدّ کر دیا اور ان کے خلاف اس بات پر بغاوت کر دی کہ انھوں نے کیوں ان کا مطالبہ مانا تھا۔ یہ لوگ اوّلین خوارج تھے جنھوں نے آگے چل کر دنیائے اسلام میں بے انتہا فتنہ و فساد برپا کیا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

[2] اپنی امتیازی عالی ظرفی سے حضرت علیؓ نے اپنے غدّار دشمنوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا (باقی حاشیہ صفحہ ۴۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

حجاز دونوں میں اپنے آپ کو مضبوط کر لیا۔ حضرت علیؓ کی وفات پر ان کے بیٹے حضرت حسنؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ حضرت حسنؓ کو امن وسکون پسند تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خاندان کے دشمن سے صلح کر لی اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن بنو اُمیہ کے بُغض نے انھیں وہاں بھی چین سے نہ جینے دیا۔ چنانچہ چند مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ اُنھیں زہر پلا کر شہید کر دیا گیا۔ اب ہند کے بیٹے کا ستارہ بلندی پر تھا اور ابوسفیان کے دل میں مکّہ کا بادشاہ بننے کی جو تمنا تھی وہ اس کے بیٹے امیر معاویہ نے اس سے بھی شاندار پیمانے پر پوری کر دی۔ پیغمبرِ اسلام کے دو سب سے بڑے دشمنوں کا بیٹا یوں مسندِ خلافت پر متمکّن ہوا۔ تقدیر کی اس سے بڑی بوالعجبی دنیا کی تاریخ میں درج نہیں۔

امیر معاویہ کے برسرِ اقتدار آتے ہی زمانۂ جاہلیت کے عدیدی نظام نے اسلام کے جمہوری نظام حکومت کی جگہ لے لی۔ بے دینی اپنی تمام بُرائیاں لیے ہوئے عود کر آئی۔ اُموی حاکم اور شامی سپاہی جہاں کہیں جاتے تھے فسق و فجور کو اپنے جلو میں لے جاتے تھے۔ حجاز اور عراق غاصب کے پنجے میں کراہ رہے تھے لیکن اس نے اسلام کا ٹیٹوا ایسی مضبوطی سے دبا رکھا تھا کہ اُس کا چھڑانا آسان نہ تھا۔ جو زر و مال وہ بے دردی کے ساتھ رعایا سے وصول کرتا تھا وہ سب اپنے بھاڑے کے سپاہیوں پر خرچ کر دیتا تھا۔ چنانچہ سپاہی شکایات کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ اپنی وفات سے پہلے امیر معاویہ نے فوج کے عمائد کو جمع کیا اور ان سے اپنے بیٹے یزید کے حق میں حلفِ وفاداری اُٹھوایا، جسے انھوں نے اپنا جانشین نامزد کیا۔ یہ تھا لے شے کر یزید کا حق منصبِ خلافت پر!

یزید طبعاً جابر و ظالم تھا۔ اس پر طُرّہ یہ کہ اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اپنی ستم رانیوں کو ملکی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۵) کے خلاف جنگ میں بھی اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ حملہ کرنے میں کبھی پہل نہ کریں، پناہ مانگنے والوں کو پناہ دیں، قیدیوں سے عزّت کا سلوک کریں اور عورتوں کی بے حرمتی نہ کریں۔ اپنے دمِ واپسیں سے انھوں نے اپنے بیٹوں کو یہ وصیّت کی کہ قاتل کو ایک ہی وار سے قتل کریں، اور اُسے کسی قسم کی غیر ضروری ایذا نہ پہنچائیں۔

مصلحتوں کے بھیس میں چھپا سکے۔ اُس کی خبیث فطرت رحم و انصاف کے نام سے بھی آشنا نہ تھی۔ انسانوں کو قتل کرنا اور ایذا پہنچانا اس کے لیے محض ایک مشغلہ تفریح تھا۔ جیسا وہ خود بدترین عیوب کا پتلا تھا، ویسے ہی اس کے ہم پیالہ و ہم نوالہ دونوں اصناف کے رذیل ترین افراد تھے۔ یہ تھا وہ شخص جو اپنے وقت کا خلیفہ اور امیرالمومنین تھا! حضرت علیؓ کے دوسرے بیٹے امام حسینؓ نے اپنے باپ کی ساری شجاعت اور نیکوکاری ورثے میں پائی تھی۔ محاصرۂ قسطنطنیہ میں انھوں نے بہادری اور جنگی مہارت کے جوہر دکھائے تھے۔ اُن کی ذات میں فرزندِ علیؓ کا حقِ وراثت اور نبیرۂ نبی کی مقدس شخصیت دونوں مجتمع تھیں۔ امیر معاویہؓ اور امام حسنؓ کے درمیان جو معاہدۂ صلح ہُوا تھا اُس میں مسندِ خلافت پر اُن کا حق صراحۃً محفوظ رکھا گیا تھا۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے دعویٰ خلافت کو قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ جب مسلمین کوفہ نے اُن سے درخواست کی کہ انھیں بنی اُمیہ کے قبضے سے نجات دلائیں تو انھوں نے ان کی مدد کو اپنا فرض سمجھا۔ اہلِ کوفہ نے انھیں یقین دلایا کہ اُن کے آتے ہی سارا عراق غاصب کو تخت پر سے اُتارنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو گا۔ اس پر اعتماد کرکے وہ اہل و عیال کے ہمراہ عازمِ کوفہ ہوئے۔ اپنے بھائی حضرت عباسؓ، مٹھی بھر تابعین اور عورتوں اور بچوں کے ایک ننھے قافلے کو ساتھ لیے ہوئے وہ صحرائے عرب کو تو عبور کر گئے لیکن جب وہ سرحدِ عراق کے قریب پہنچے تو جس عام بغاوت کا وعدہ اُن سے اہلِ کوفہ نے کیا تھا انھیں اس کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے۔ اُن کے دل میں اندیشہ پیدا ہُوا کہ بنو اُمیہ پھر ایک بار اپنے مرغوب حربے یعنی غداری سے کام لے رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے دریائے فرات کے مغربی کنارے کے قریب مقامِ کربلا پر پڑاؤ ڈالا۔ اس مقام پر جو واقعات ظہور میں آئے تاریخ کا کوئی واقعہ دردناکی میں اُن پر سبقت نہیں لے جاتا۔ امام حسینؓ کے دل میں غداری کا جو اندیشہ تھا وہ صحیح ثابت ہُوا۔ ایک اُموی لشکر نے جس کی کمان شقی اور خونخوار عبیداللہ ابن زیاد کے ہاتھ میں تھی، انھیں گھیرے میں لے لیا، کئی دنوں تک اُن کے خیمے گھِرے رہے۔ ان کمینے کُتّوں میں اتنی جرأت تو نہ تھی کہ میدان میں آ کر فرزندِ حیدر کی تلوار کا مقابلہ کرتے۔ انھوں نے بس اتنا کیا کہ لشکرِ حسینؓ پر دریا تک جانے کا راستہ بند کر دیا۔ اس بندش کی وجہ سے شہیدوں کے اس گروہ پر

جو مصیبتیں گزریں وہ بیان سے باہر ہیں۔ حضرت حسینؓ نے فوجِ یزیدی کے سردار کے سامنے تین باعزت شرائط پیش کیں۔ پہلی یہ کہ انھیں مدینے واپس جانے دیا جائے، دوسری یہ کہ ترکوں کے خلاف لڑنے کے لیے سرحد کی کسی چوکی پر بھیج دیا جائے۔ تیسری یہ کہ انھیں صحیح و سالم یزید کے سامنے پیش کیا جائے[1] لیکن اُموی غاصب نے اپنے سپہ سالار کو کڑا اور اٹل حکم دے رکھا تھا کہ امام حسینؓ اور اُن کے ساتھیوں پر کسی قسم کا رحم نہ کرے، بلکہ انھیں مجرموں کی حیثیت سے دربارِ خلافت میں حاضر کرے تاکہ اُموی عدل اُن سے جو سلوک روا رکھے وہ سلوک اُن سے کیا جائے۔ آخر میں امام حسینؓ نے ظالم دشمنوں سے یہ درخواست کی کہ وہ بے بس عورتوں اور بچوں کو گزند نہ پہنچائیں بلکہ اُن کی جان لے کر جنگ کا خاتمہ کریں۔ لیکن ان ظالموں کو رحم چھُو بھی نہ گیا تھا۔ جب وہ اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو امام حسینؓ نے اپنے رفیقوں کو تاکید کی کہ وقت کو غنیمت جان کر بھاگ جائیں اور اپنی جان بچائیں لیکن اُن سب نے بہ یک آواز اپنے محبوب آقا کو چھوڑ کر چلے جانے یا اُن کے بعد زندہ رہنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر دشمن کے ایک سردار کے دل میں نبیرۂ نبی سے جنگ کرنے کے خیال سے خدا کا خوف آیا اور وہ اُن کی شہادت میں شریک ہونے کا تہیہ کر کے اپنے تیس آدمیوں کے ساتھ آ کر اُن سے مل گیا۔ جتنے دست بہ دست یا دو بدو مقابلے ہوئے اُن میں دشمنوں کے پاس اولادِ فاطمہ کی دلاوری کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ دشمن کے تیر اندازوں نے دُور ہی سے اُن پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی اور ایک ایک کر کے انھیں جامِ شہادت پلا دیا۔ تا آں کہ رسولِ خدا کا نواسا تنِ تنہا رہ گیا۔ زخموں سے چور اور جاں بلب

---

[1] صاحب روضۃ الصفا یہ شرائط بیان کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ خدامِ حسینؓ میں سے ایک شخص نے جو مقتلِ کربلا سے اتفاقاً بچ نکلا، اس دعوے کو غلط بتایا کہ امام حسینؓ نے اُموی سردار کے سامنے کسی قسم کی شرائط صلح پیش کیں۔ ممکن ہے کہ اس خادم نے یہ انکار یہ ظاہر کرنے کی خاطر کیا ہو کہ امام حسینؓ نے صلح کی تجویز کر کے اپنے آپ کو دشمن کے سامنے ذلیل نہیں کیا، لیکن میرے نزدیک صلح کی تجویز سے حضرت حسینؓ کی سیرتِ عالیہ کی کسی طرح کسرِ شان نہیں ہوتی۔

امام حسینؓ اپنے چھلنی جسم کو گھسیٹتے ہوئے پانی کے ایک آخری گھونٹ کی خاطر دریا پر پہنچے لیکن دشمنوں نے تیروں کی بارش کر کے انھیں وہاں سے پیاسا لوٹا دیا۔ اپنے خیمے میں داخل ہو کر انھوں نے اپنے شیر خوار بچے کو گود میں لیا۔ معاً ایک تیر بچے کے آ کر لگا اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ سید الشہداء نے رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اپنے بے رحم دشمنوں کے مقابلے کی مزید تاب اپنے میں نہ پا کر، بے یار و مددگار اور تھکے ماندے، وہ آ کر خیمے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک عورت نے ان کی پیاس بجھانے کے لیے انھیں پانی کا ایک پیالہ دیا۔ وہ پیالہ اٹھا کر ہونٹوں تک لے جا لے نہ پائے تھے کہ ایک تیر آ کر ان کے منہ پر لگا۔ اُن کے فرزند اور بھتیجے اُن کی گود میں جنت کو سدھارے۔ اس وقت انھوں نے اپنے لہولہان ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور تمام لوگوں کے لیے دُعائے مغفرت کی۔ اُس کے بعد وہ سربکف ہو کر اُٹھے اور لشکرِ اُموی پر ٹوٹ پڑے۔ وہ جدھر جاتے دشمن پیچھے ہٹ جاتے لیکن خون کے بہہ جانے سے اُن پر اتنی نقاہت طاری ہو گئی تھی کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ پھر کیا تھا؟ قاتلوں کی ایک ٹولی اُن پر ٹوٹ پڑی۔ ملعونوں نے سید الشہداء کا سر تن سے جُدا کر دیا، اُن کے جسم کو پاؤں تلے لتاڑا اور ہند کی تقلید میں ہر ممکن طریقے سے اُس کی بے حرمتی کی۔ سرِ مبارک کو اُٹھا کر وہ کوفے کے قلعے میں لے گئے، جہاں انسانیت سے گرے ہوئے عبید اللہ بن زیاد نے اس مردہ سر کے منہ پر ایک بید مارا۔ ایک بوڑھا مسلمان چلّا اُٹھا: "میں نے اپنی آنکھوں سے ان ہونٹوں پر رسولِ خدا کے ہونٹ دیکھے ہیں۔" گبن (Gibbon) لکھتا ہے: "ایک بعید زمانے اور ملک میں حسینؓ کی شہادت کا جگر خراش واقعہ سرد مہر سے سرد مہر شخص کے دل میں بھی جذبۂ ہمدردی پیدا کرے گا۔" شہادتِ حسینؓ کی یاد میں ہر سال حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد کے پیرو جو ماتم و شیون اور اظہارِ غم و غصہ کرتے ہیں، ہم اُس سے متفق ہوں یا نہ ہوں، اس شہادت کی کیفیت سننے کے بعد اس کا سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

یوں رخصت ہوا اس دنیا سے اپنے زمانے کا ایک اشرف الشرفا مرد اور اس کے ساتھ اس کے خاندان کے سب افراد، کیا بوڑھے اور کیا جوان، چل بسے، سوائے

ایک نجیب و نزار بچے کے، جسے امام حسینؓ کی بہن حضرت زینبؓ نے قتلِ عام سے بچا لیا۔ اس بچے کا نام دادا کے نام پر علی تھا اور وہ آگے چل کر زین العابدین کے لقب سے مشہور ہوا۔ امام زین العابدین ایران کے آخری ساسانی بادشاہ یزدگرد کی بیٹی کے بطن سے امام حسینؓ کے بیٹے تھے۔ اس طرح ان کی ذات خانوادۂ محمدی کی آخری یادگار تھی۔ دوسری طرف وہ ماں کے وسیلے سے تختِ ساسانی کے آخری دعویدار تھے۔

امام حسینؓ اور ان کی اولاد پر جو قیامت ٹوٹی اس سے عالمِ اسلام میں کہرام مچ گیا۔ اس کی بدولت عوام کے احساسات و جذبات میں جو انقلاب آیا وہ اسلام کے حق میں ایک آیۂ رحمت ثابت ہوا۔ بنی اُمیہ کے دربارِ دمشق سے فسق و فجور کا جو دھارا بہ رہا تھا وہ بند ہو گیا۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے عامۃ المسلمین کی خاطر جو کچھ کیا تھا اس کی یاد ان کے دلوں میں تازہ ہو گئی اور انھیں اس کا احساس ہو گیا کہ دشمنانِ رسولؐ کی اولادِ اسلام کو کیسے کیسے نقصان پہنچا رہی تھی۔ بہرحال بنو اُمیہ نے تلوار اور زہر کی مدد سے ایک صدی تک حکومت کی۔ انھوں نے مدینے کو تاخت و تاراج کر دیا اور انصار کی اولاد کو شہر بدر کر کے دور دراز ملکوں میں بھیج دیا۔ جس شہر نے پیغمبرِ اسلامؐ کو بُت پرستوں کے مظالم سے پناہ دی تھی، جس سے آپؐ کو محبت تھی، جس کی خاک کو آپؐ کی قدمبوسی کا شرف نصیب ہوا تھا، جس کے چپّے چپّے پر آپؐ کی دعوتِ حق نے مہرِ تصدیق ثبت کی تھی، اس کی ہر مذموم طریقے سے بے حرمتی کی گئی۔ جن لوگوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر مصائب کا مقابلہ کیا تھا اور آپؐ کو دین کی عمارت کھڑی کرنے میں مدد دی تھی ان پر ایسے ایسے دہشت ناک اور انسانیت سوز مظالم توڑے گئے جن کی مثال یا تو فرانس کے کنسٹبل (Constable) (Of France) کے سپاہیوں یا روم کی تباہی کے موقع پر جارج فرنڈزبرگ (George Frundsberg) کے ماتحت لوتھر کے پیرووں کی خون آشامی کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ مرد چن چن کر تہ تیغ کیے گئے۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور بچوں کو طوقِ غلامی پہنا دیا گیا۔ جامع مسجد اصطبل بنا دی گئی۔ مقدس عمارتیں ڈھا دی گئیں، اور ان کا ساز و سامان لوٹ لیا گیا۔ خلافتِ اُموی کے زمانے میں شروع سے لے کر

آخر تک مدینۂ منوّرہ جنگلی جانوروں کا مسکن بنا رہا[1]۔ مکّہ میں کفر و شرک کو از سرِ نو غلبہ حاصل ہو گیا۔ ڈوزی (Dozy) کا کہنا ہے کہ اس نے اسلام سے نہایت وحشت انگیز اور گھناؤنا انتقام لیا۔ اسلام نے اپنی فتح و نصرت کی گھڑی میں اہلِ مکّہ اور بنی اُمیّہ سے جو رحم و عفو کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ انھوں نے یہ دیا! بنی اُمیّہ میں ایسے متعدد لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے زہد و تقویٰ میں امتیاز حاصل کیا۔ اُن کے سرِ فہرست حضرت عمر بن عبد العزیز کا نام ہے، جنھیں عربوں کا مارکس آریلیس[2] (Marcus Aurelius) کہنا چاہیے۔ وہ ایک مردِ متقی، ایک حاکم عادل اور ایک خدا ترس مسلمان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو اپنے عظیم ہم نام کی زندگی کے سانچے میں ڈھالا۔ لیکن ان برگزیدہ لوگوں کو چھوڑ کر اُموی خلیفے کھُلّم کھُلّا، بلکہ بڑے فخر سے احکامِ دین کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

اگر اُمویوں کی مفسدہ پردازی نہ ہوتی تو جو لوگ اہلِ بیت[3] کے پیرو اور مسندِ خلافت پر حضرت علیؓ کے حقِ جانشینی کے حامی تھے اور جن لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ دینی قیادت اور دنیوی ریاست دونوں کے لیے عامۃ المسلمین کو انتخاب کا حق ہے اُن کے باہمی اختلافات اس حد تک نہ بڑھتے کہ تفرقے کی صورت اختیار کر لیتے بلکہ حضرت علیؓ کی مسند نشینی کے بعد خود بخود کوئی مصالحت یا مفاہمت ہو جاتی۔ اولادِ اُمیّہ کے تشدّد اور غداری نے ان اختلافات کے رفع ہونے کا امکان ہی مٹا دیا۔ چونکہ بنی اُمیّہ خون کے دریا کی شناوری کر کے تختِ سلطنت تک پہنچے تھے، اس لیے اُن کے لیے ضروری تھا کہ اپنے منصب کو قانونی جواز کا لباس پہنائیں۔ چنانچہ وہ حقِ انتخاب کی بناء پر امیر المومنین کے لقب کے مدعی تھے، اگرچہ انتخاب خود اُن کے بھاڑے کے حامی اور اُن کے بے دین طرفدار ہی کرتے تھے۔ مدینے کی بربادی اور خانوادۂ نبوی اور مہاجرین و انصار کے مارے جانے یا اطراف ملک

---

[1] عبد الملک بن مروان نے تو یہاں تک کیا کہ روضۂ نبوی کی زیارت کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیا۔

[2] روم کا فلسفی شہنشاہ (۱۲۱ تا ۱۸۰ء) مترجم۔

[3] اس ترکیب کے معنی کے لیے صفحہ ۲۴۳ پر کا ذیلی حاشیہ ملاحظہ کیجیے۔

میں بکھر جانے کے بعد خلافتِ راشدہ سے نظیریں سند میں پیش کرنا یا اگر ایسی نظیریں نہ ملیں تو انھیں تراش لینا آسان تھا۔ امیر المومنین کا لقب اختیار کر لینا بھی مشکل نہ تھا، جسے خلفائے راشدین چاہتے تو اختیار کر سکتے تھے لیکن جس سے انھوں نے احتراز کیا، اس لیے کہ وہ عامۃ المسلمین کے حقِ انتخاب کے مؤید تھے۔ جن عظیم الشان لوگوں نے جمہوریت کی بنیاد رکھی تھی وہ یا تو مر چکے تھے یا مارے جا چکے تھے، اُن کے بچے یا تو دُور دراز گوشوں میں پناہ گزین تھے یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لقب کے بارے میں، جو اتنی ہوشیاری سے اپنا لیا گیا تھا، سوال اٹھانے والا اب کون تھا؟ بنو اُمیّہ کے بعد جو خاندان برسرِ اقتدار آیا، اُس نے اُنھی کے مسلک کی تقلید کی۔ جس شدید رشک سے کام لے کر بنی اُمیّہ اولادِ فاطمہؓ کے ستانے اور مٹانے کے درپے رہے وہی رشک آلِ نبی کے بارے میں بنی عبّاس کے رویّے کا محرّک تھا۔ خود بنی عبّاس کو خلافت پر کوئی حق نہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ عوام کو اولادِ فاطمہؓ سے جو محبت تھی اُنھوں نے اُسے تختِ سلطنت پر متمکّن ہونے کا وسیلہ بنایا اور جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کا معاوضہ اُنھوں نے بنی فاطمہؓ کو انتہائی ظلم و ستم کی صورت میں دیا۔ اُن کا قانونی حق بھی ایک قسم کے نام نہاد انتخاب پر مبنی تھا، اس لیے قدرتی طور پر انھوں نے بھی بنی اُمیّہ کی طرح تمام ایسے لوگوں کو چُن چُن کر مارا جو اُن کے دعوے پر معترض تھے یا اس نظریے کے حامی تھے کہ منصبِ امامت سلسلۂ نبوی کا موروثی حق ہے۔ ہر قسم کے اختلافِ رائے کو جبراً دبا دیا گیا۔ یہاں تک کہ فقہائے عصر بھی اگر کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کی جرأت کرتے جو خلیفۂ وقت کے نزدیک مقبول نہ تھی تو اُنھیں سزا دی جاتی[1]۔ جن حالات میں بنی عبّاس کو غیر متوقع اور ناگہانی طور پر اقتدار حاصل ہُوا اگر ہم اُن حالات کو نظرانداز کر دیں تو ہمیں اُن کا برسرِ اقتدار آنا ایک حیرت انگیز واقعہ معلوم ہوگا۔ بنی اُمیّہ نے اولادِ فاطمہؓ پر جو جگر خراش مظالم توڑے اُنھوں نے اور جس عالی ہمتی سے اولادِ فاطمہؓ نے اپنے

---

[1] سنّی مذہب کے تیسرے امام مالک ابن انس کو اس جرم کی سزا علی الاعلان دی گئی۔

مصائب کو برداشت کیا اس نے ان غاصبوں کے خلاف ایک عام جذبۂ نفرت پیدا کر دیا تھا اور مظلوموں کو اپنے پیروؤں اور معتقدوں کی نگاہوں میں عظمت کے ایک نورانی ہالے سے مجلّٰی کر دیا تھا۔ جفا شعاری چاہے کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو ہمیشہ اپنے مقصد میں ناکام رہی ہے۔ وہ جس فرقے یا جماعت کے خلاف بھی عمل میں لائی گئی اُس کے ایمان یا عقیدے کو ختم نہیں کر سکی بلکہ اُسے اظہار کے نئے طریقے سکھاتی اور اُسے تقویت بخشتی رہی ہے۔ عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی میدانِ جنگ کے خطرات اور مظلومیت کے درد و کرب نے اُن چیزوں کو جن کی خاطر ان خطرات کا مقابلہ کیا گیا اور یہ درد و کرب سہا گیا ایک مافوق العادۃ شان و شوکت عطا کر دی۔ چنانچہ بنی فاطمہؓ، جو انسانوں کی بے انصافی کا تختۂ مشق بن کر دنیا سے کنارہ کش اور علمی و دینی مشاغل میں منہمک ہو گئے تھے، ہتھیاروں، خزانوں اور حشم و خدم کے بغیر لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے تھے اور لشکروں کے سرداروں اور قصرِ سلطانی کے مکین خلیفہ کی بہ نسبت انھیں عوام کی بدرجہا زیادہ عزت حاصل تھی۔ اُمویوں کی ستم رانیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں اور لوگ اُن کے ہاتھوں سے نجات کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے میں جعلی خلیفوں کی بدعنوانیوں اور بدنظمیوں نے یہ ولولہ انگیز تمنّا پیدا کر دی تھی کہ آلِ رسولؐ کو اس کا حق مل جائے۔ لوگ بے تابی سے ائمۂ اہلِ بیت کے اشارے کے منتظر تھے، لیکن یہ اہل اللہ دنیا سے رشتہ منقطع کر چکے تھے اور اُس کے کاموں سے اُنھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی مظلومیوں کا انتقام لینے کے لیے کئی جانبازؔ[1] اُٹھے تھے، لیکن اپنے شامی دشمنوں کی صف بستہ فوجوں کے ہاتھوں تباہ ہو گئے تھے۔ لوگوں کو اس کا انتظار تھا کہ خدا کی طرف سے اُن کے جو رہبر مقرر ہوئے ہیں وہ انھیں بغاوت کا حکم دیں۔ لیکن ان ہادیانِ دین نے تشدد کی ممانعت کر دی تھی ایسے میں کیا کیا جا سکتا تھا؟ اہلِ بیت میں سے چند افراد نے بزرگانِ خاندان کے مشورے کے برخلاف اور اُن کی رضامندی کے بغیر بنی اُمیّہ کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے، لیکن وہ سب اپنی

---

[1] سلیمان ابن صُرَد، المختار اور یزید ابن مہلّب۔

اولوالعزمی اور اپنے دینی جوش کی قربان گاہ پر قربان ہو گئے تھے۔ اضطراب و بے اطمینانی کے اس لمحے میں، جب لوگ خاندانِ نبوی کی طرف سے کسی اشارے کے لیے چشم براہ تھے، بنو عباس منظرِ عام پر آئے۔ بنو عباس رسولِ خدا کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد تھے، حضرت عباس نے دلی شفقت سے اسلام کی خدمت کی تھی اور جب اہلِ مدینہ نے وہ حلف اٹھایا جو "بیعت النسا"[1] کے نام سے مشہور ہے تو وہ رسولؐ اللہ کے ہمراہ تھے، لیکن کسی مصلحت کی بنا پر انھوں نے فتح مکہ سے پہلے علانیہ طور پر اسلام قبول نہ کیا۔ پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ان سے بڑی محبت اور مروت کا سلوک کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اس بارے میں آپؐ کی تقلید کرتے تھے۔ اگر عمِ رسولؐ کبھی انھیں راستہ میں پیادہ پا چلتے ہوئے مل جاتے تو وہ گھوڑے پر سے اتر پڑتے اور اکثر اوقات ان کے ساتھ چل کر انھیں گھر پہنچا آتے۔[2] ان کی وفات بعض روایات کے مطابق ۳۲ سنہ ہجری میں ہوئی اور بعض روایات کے مطابق ۳۴ سنہ ہجری میں۔ ان کے چار بیٹے تھے: عبد اللہ (ابو العباس عبد اللہ ابن عباس)، فضل، عبید اللہ اور قثم۔ حضرت عبد اللہ، جو تاریخ اور روایات میں ابن عباس کے نام سے مشہور ہیں، ۶۱۹ء میں مکہ میں پیدا ہوئے، یعنی ہجرت سے تین سال پہلے۔ قرآن اور فقہ میں انھیں حضرت علیؓ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ قرآن اور خلفائے راشدین کے فیصلوں کے علم اور تفسیر میں انھیں اتنی شہرت حاصل تھی کہ ان کے خطبے سننے کے لیے اطرافِ مملکت سے لوگ جوق در جوق آتے۔ وہ ہفتے میں ایک دن تفسیرِ قرآن کا، دوسرے دن فقہ کا، تیسرے دن صرف و نحو کا، چوتھے دن تاریخِ اعراب کا اور پانچویں دن شعر و شاعری کا درس دیتے۔ قرآن کی مشکل الفہم عبارتوں کی تشریح وہ اکثر قدیم شعرائے عرب کے کلام سے مثالیں پیش

---

[1] بیعت النسا کو بیعتِ عقبۂ اولیٰ بھی کہتے ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت عباسؓ اس بیعت کے وقت نہیں بلکہ دوسری بیعتِ عقبہ (یعنی بیعت الحرب) کے وقت موجود تھے۔ (مترجم)

[2] حضرت عباس کو تاریخِ اسلام کا John of Gaunt کہہ سکتے ہیں۔

کرکے کیا کرتے تھے۔ اس کی بدولت ادب جاہلیت کے مطالعے اور تحفظ کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ وہ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ "جب کبھی تمھیں قرآن کے سلجھنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو اس کا حل شعرائے عرب کے کلام میں ڈھونڈو، کیونکہ وہ عرب قوم کا صحیفہ ہے"[1]
حضرت ابن عباسؓ اور اُن کے بھائیوں کو حضرت علیؓ سے جو عقیدت تھی وہ ضرب المثل تھی۔ چاروں بھائی جنگِ جمل میں شریک ہوئے اور جنگِ صفّین میں حضرت ابن عبّاس نے، جو ایک عالم متبحر ہونے کے علاوہ فنِ حرب کے بھی ماہر تھے، حضرت علیؓ کی سوار فوج کی قیادت کی۔ متعدد موقعوں پر وہ حضرت علیؓ کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ جب سرکش سپاہیوں نے حضرت علیؓ کو اس پر مجبور کر دیا کہ ان کے اور امیر معاویہ کے درمیان جو متنازعہ تھا اس کا فیصلہ تحکیم سے کرائیں تو اُن کی یہ خواہش تھی کہ ابن عبّاس کو خانوادۂ محمدیؐ کا نمائندہ مقرر کریں[2]۔ ابنِ عبّاسؓ نے امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اُن کے غم میں گھُل کر ۷۰ھ ہجری میں، جب کہ اُن کی عمر ستّر سال کی تھی، طائف کے مقام پر وفات پائی۔ اُن کے بیٹے علیؓ کو بھی باپ کی طرح اولادِ فاطمہؓ سے والہانہ محبت تھی۔ اُن کی وفات ۱۱۷ھ ہجری میں ہوئی اور اُن کے بیٹے محمدؒ اُن کی جگہ خاندان کے سربراہ بنے۔

بنی اُمیّہ کے مظالم سب سے زیادہ ایران، عراق اور حجاز نے سہے تھے۔ چنانچہ اس وقت اُن ملکوں میں بہت سی خفیہ جماعتیں اُن کا تختہ اُلٹنے کی تدبیریں کرنے میں مصروف تھیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ سرگرم بنی عبّاس تھے، اوّل اوّل تو غالباً اس لیے کہ وہ خلوصِ دل سے بنی فاطمہؓ کو اُن کا حق دلوانے کے خواہشمند تھے، لیکن بعد میں اپنے ذاتی مفادات کی خاطر۔ محمد ابن علی ابن عبداللہ پہلے شخص تھے جن کے دل میں خود خلیفہ بننے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ بڑے قابل اور دُور دُور کی سوچنے والے آدمی تھے۔ بظاہر تو وہ فاطمیوں کی

---

[1] حضرت ابن عباس سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ انھوں نے اتنا وسیع علم کیونکر حاصل کیا۔ انھوں نے جواب دیا: "پوچھنے والی زبان اور سمجھنے والے دل کی مدد سے۔"

[2] شہرستانی حصہ اوّل۔ صفحہ ۸۵۔

خاطر سرگرمِ کار رہے، لیکن درپردہ انھوں نے رفتہ رفتہ اپنے خاندان کا دعویٰ منوانے کا بندوبست کر لیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک نیا نظریہ ایجاد کیا۔ وہ یہ تھا کہ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد اسلام کی رُوحانی قیادت اُن کے پسماندہ بیٹے علیؓ (زین العابدین) کے حصّے میں نہیں بلکہ محمد ابن الحنفیہ کے حصّے میں آئی، جو قبیلۂ حنیفہ کی ایک خاتون کے بطن سے (جو حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کی زوجیت میں آئیں) حضرت علیؓ کے بیٹے تھے، اور محمد ابن الحنفیہ کی وفات کے بعد یہ میراث اُن کے بیٹے ہاشم کو ملی، جنھوں نے اُسے باقاعدہ طور پر محمدِ عبّاسی کو بخش دیا۔ اس دعوے پر بعض لوگوں کو اعتماد تھا، لیکن عوام کو، جنھیں اہلِ بیت سے پختہ عقیدت تھی عبّاسیوں کے داعیوں نے اسی خیال میں رکھا کہ وہ اہلِ بیت کی خاطر مصروفِ کار تھے۔ اب تک عبّاسیوں نے اہلِ بیت سے محبت کا دم بھرا تھا اور اپنی تمام کارروائیوں اور منصوبوں کو یوں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ جیسے ان کا مقصد اولادِ فاطمہؓ کو اس کا حق دلانا ہے۔ ان دعووں کے پردے میں جو غدّاری چھپی ہوئی تھی، اہلِ بیت کے نمائندوں اور حامیوں کو ان کا سان گمان بھی نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے محمد بن علی اور اُن کے رفیقوں کی کارروائیوں کی تائید کر کے انھیں وہ سندِ اعتبار بخش دی جس کی انھیں بے حد ضرورت تھی۔ ایرانیوں کو فاطمیوں کی کامیابی سے جو وابستگی تھی اس کے اسباب تاریخی اور قومی روابط تھے۔ فاطمی یزدگرد کی بیٹی کی وساطت سے تختِ ایران کے وارث تھے۔ تبلیغِ اسلام کے آغاز ہی سے حضرت علیؓ نے ان ایرانیوں کے ساتھ جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا انتہائی مروّت اور دوست داری کا سلوک کیا تھا۔ حضرت سلمان فارسی، جن کا شمار ممتاز ترین صحابۂ نبی میں ہوتا ہے۔ مدتوں تک حضرت علیؓ کے ندیم و رفیق رہے۔ جنگِ قادسیہ کے بعد حضرت علیؓ کا دستور تھا کہ مالِ غنیمت کا جو حصّہ اُنھیں ملتا وہ اُسے قیدیوں کو رہائی دلوانے پر خرچ کرتے، بلکہ اُنھوں نے حضرت عمرؓ کو بھی ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ رعایا پر محاصل کے بوجھ ہلکے کریں۔ ان احسانوں کے بدلے میں ایرانیوں کے لیے حُبِّ اہلِ بیت ایک قدرتی بات تھی۔ محمد بن علی نے اس سے فائدہ اُٹھایا اور ایرانیوں کو یہ یقین دلا کر کہ اُنھیں عربوں کے ظلم و ستم سے رہائی ملنے ہی والی

تھی ، اپنا گرویدہ بنا لیا۔ خراسان ، فارس اور ایران کے دوسرے صوبوں میں جو لوگ آباد تھے اُنھیں بھی اہلِ بیت سے اُتنی ہی محبت تھی اور ان کے سینوں میں نئے مظالم نے اپنے قدیم دشمنوں یعنی بنی مضر کے خلاف نفرت کی آگ اور بھی بھڑکا دی تھی۔ محمد بن علی نے اُنھیں یہ بتایا کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے آلِ رسولؐ کی خاطر کر رہے تھے۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فوجی قائد ابومسلم کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ، جو اب تک اولادِ علی کے پُرجوش طرفداروں میں تھا۔ محمد بن علی نے اپنی وفات سے پہلے ، جو ۱۲۵ سنہ ہجری میں واقع ہوئی ، اپنے دو بیٹوں ، یعنی ابراہیم عبداللہ ابوالعباس (ملقب بہ سفّاح) اور عبداللہ ابوجعفر (ملقب بہ المنصور) کو یکے بعد دیگرے اپنا جانشین نامزد کیا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں یمنیوں اور مضریوں کے درمیان خراسان میں جو شدید جنگ چھڑی اُس سے فائدہ اُٹھا کر عباسیوں نے اس بارود بھری سُرنگ کو جو وہ ایک مدت سے تیار کر رہے تھے آگ لگا دی۔ ابومسلم نے خراسان کے ہر شہر اور گاؤں میں اپنے طرفداروں کو علمِ بغاوت بلند کرنے کا حکم دے دیا۔ جس مقصد کا اعلان کیا گیا وہ یہ تھا کہ اہلِ بیت کو غاصب بنی اُمیّہ سے اپنا حق واپس دلوایا جائے۔ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ امام علی زین العابدین کے پوتے یحییٰ نے بغاوت کی تھی۔ وہ شہید ہو گئے تھے اور ان کی لاش اُموی خلیفہ مروان کے حکم سے پھانسی پر لٹکا دی گئی تھی۔ ابومسلم نے حکم دیا کہ جواں مرگ علوی سردار کی لاش کو پھانسی پر سے اُتار لیا جائے اور عزت و احترام کے ساتھ اس کی تجہیز و تکفین کی جائے۔ ابومسلم کے متبعین امام یحییٰ کے سوگ میں اور اپنے عزمِ انتقام کی علامت کے طور پر سیاہ پوش ہو گئے۔ چنانچہ اُس دن سے سیاہ لباس عباسیوں کے حامیوں کا امتیازی نشان بن گیا اور جب غاصبوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی عام دعوت دی گئی تو مقررہ مقام پر سیاہ پوشوں کا جمِ غفیر جمع ہُوا وہ اُس کا عینی ثبوت تھا کہ بغاوت کس زور و شور سے اور کتنی دُور تک پھیل گئی تھی۔ اجتماع ۱۲۷ ہجری میں رمضان کی پچیسویں تاریخ کو ہونا قرار پایا تھا اور لوگوں کو بلانے کی نشانی یہ تھی کہ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بڑے بڑے الاؤ جلا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ صوبے کے گوشے گوشے سے خلقت کے ہجوم آ کر

مرو پر ٹوٹ پڑے، جہاں اُس وقت ابومسلم کا قیام تھا۔ خلیفہ مروان نے ابراہیم کو، جو محمد بن علی کی موت کے بعد عبّاسیوں کے سربراہ تھے، گرفتار کرواکر مرواڈالا۔ لیکن محمد بن علی نے مرنے سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی ابوالعباس کو ایک تحریر بھجوادی جس میں انھوں نے اپنے باپ کی وصیت کے مطابق خاندان کی سربراہی انھیں سونپ دی۔ ابومسلم نے تھوڑے ہی عرصے میں سارے خراسان پر قبضہ کرلیا اور اپنی فتح مند فوج کے ہمراہ عراق کی طرف کُوچ کردیا۔ اس تحریک کا جو اصلی مقصد تھا وہ ابھی تک لوگوں پہ واضح نہ کیا گیا تھا۔ سیاہ جھنڈے کے نیچے مختلف طبقوں کے جو لوگ جمع ہوئے وہ سب اہلِ بیت کے نام پر میدان میں آئے تھے۔ کُوفہ نے فوراً اطاعت قبول کرلی۔ ابومسلم کا نائب حسن ابن قحطبہ اپنی فوج لیے شہر میں داخل ہُوا۔ ابوسلمہ جعفر ابن سلیمان الخلّال بھی، جو صاحبِ روضۃ الصفا[1] کے قول کے مطابق آلِ محمد کا وزیر نامزد کیا گیا تھا، فوراً آپہنچا۔ بظاہر یہ شخص خانوادۂ نبوی کے سربراہ کا نمائندہ تھا۔ عباسی قائدِ لشکر نے اُس کی بڑی آؤ بھگت کی، اُس کے ہاتھ چوم کر اُسے عزت کی جگہ بٹھایا اور اُسے بتایا کہ ابومسلم نے ہر معاملے میں اُس کی اطاعت کی تاکید کی تھی۔ ابوسلمہ اس خوشامد سے پھُولا نہ سمایا۔ لیکن وہ اب تک عبّاسیوں کے اصلی منصوبے سے قطعاً ناواقف تھا۔ ابوسلمہ اور حسن ابن قحطبہ کے مشترک ناموں پر ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں باشندگانِ کُوفہ کو دوسرے دن جامع مسجد میں جمع ہونے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ لوگ کسی اہم اعلان کی توقع دل میں لیے جامع مسجد میں جوق در جوق جمع ہوئے۔ بہرحال منصوبہ ابھی پختہ نہ ہُوا تھا، اس لیے حسن اور دوسرے عباسیوں نے اس وقت اپنے اصلی مقصد کا افشا مناسب نہ سمجھا۔ دریں اثنا ابوالعبّاس اور اس کا بھائی ابوجعفر دونوں اُموی پہرہ داروں کی نظر بچا کر کُوفہ میں وارد ہو چکے تھے۔ وہاں وہ مزید واقعات کے انتظار میں چھپے بیٹھے رہے۔ ابوسلمہ ابھی تک اپنے اصلی آقاؤں کا خیرخواہ تھا۔ چنانچہ اس نے امام جعفر صادق کو خفیہ پیغام بھیجا کہ وہ آکر اپنا حق وصول کریں۔ امام

---

[1] روضۃ الصفا۔ ابن الاثیر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۱۲ و بعدہم۔

جعفر صادق عراقیوں کے نامہ و پیام کی حقیقت سے خوب واقف تھے۔ اُنھوں نے لفافہ کھولے بغیر خط کو جلا دیا۔ لیکن ابوسلمہ اُن کے جواب کا انتظار کیے بغیر ابوالعباس کو خلیفہ قبول کر چکا تھا۔ اُس نے اہلِ بیت کے نام پر لوگوں کو اگلے دن، جو جمعہ کا دن تھا، خلیفہ کے انتخاب کے لیے جمع ہونے کی دعوتِ عام دی۔ اُس دن کوفہ ایک عجیب و غریب منظر پیش کر رہا تھا۔ لوگوں کے انبوہ بنی عبّاس کا سیاہ لباس پہنے ہوئے وہ اعلان سننے کی خاطر جس کا اُنھیں مدّتوں سے انتظار تھا، ہر طرف سے جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ابوسلمہ سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے لوگوں کے سامنے آیا۔ اُس کے رفقائے کار کے سوا کسی کو اس کا علم نہ تھا کہ اس نے کیونکر اپنے ایمان کو عبّاسیوں کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اُسے اپنے آقا کے مفاد کے مقابلے میں اپنی جان عزیز تھی۔ نماز کی امامت کرنے کے بعد اُس نے لوگوں کو وہ مقصد بتایا جس کی خاطر اس نے اُنھیں جمع ہونے کی دعوت دی تھی۔ اُس نے کہا: "لوگو، ابومسلم دین کا محافظ اور اہلِ بیت کا مؤیّد ہے۔ اُس نے ظالم بنی اُمیّہ کا قلع قمع کر دیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ امام اور خلیفہ کا انتخاب کیا جائے۔ زُہد و تقویٰ، قابلیت اور دوسرے تمام اوصاف کے لحاظ سے جو اس منصب کے لیے لازمی ہیں، ابوالعباس سے بڑھ کر کوئی اس کے لیے موزوں نہیں۔ میں آپ کو اُس کے انتخاب کی دعوت دیتا ہوں۔" اس وقت تک ابوسلمہ اور عبّاسیوں کو بالیقین معلوم نہ تھا کہ اس اعلان کا لوگوں پر کیا اثر ہوگا۔ اُنھیں خوف تھا کہ اُنھوں نے خاندانِ علوی سے جو غدّاری کی تھی اور فوراً اور کہیں اہلِ کوفہ بھی اُسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ لیکن عراقیوں نے اپنی ضرب المثل متلوّن المزاجی کا مزید ثبوت بہم پہنچا دیا۔ اُنھوں نے بار بار بنی فاطمہ کی حمایت میں ہتھیار اُٹھائے تھے اور ہر بار اُن لوگوں سے دغا کی تھی جن کی مدد کا اُنھوں نے وعدہ کیا تھا یا جن سے اُنھوں نے مدد مانگی تھی۔ وقتی جذبات کی رَو میں بہہ کر اُنھوں نے بسا اوقات حامیانِ حق کی حیثیت سے غدّاری کی تھی۔ واقعۂ کربلا کے بعد اُنھیں اتنی پشیمانی ہوئی تھی کہ اُن میں سے بیس ہزار لوگ رات بھر امام حسینؓ کے روضے پر مغفرت کی دُعائیں مانگنے کے بعد یزید کی صفِ در صفِ فوجوں پر پل پڑے

تھے۔ لیکن ان کی پشیمانی دیر تک قائم نہ رہی۔ وہ ایسے متلوّن الطبع، شورہ پشت، بیوفا اور ناقابلِ اعتماد تھے کہ صرف تازیانۂ الٰہی حجّاج بن یوسف ہی اُنھیں قابو میں رکھ سکا۔ اس موقعہ پر ابوسلمہ کے منہ سے ابوالعباس کے انتخاب کے بارے میں الفاظ نکلے ہی تھے کہ سب نے نعرۂ تکبیر بلند کرکے انتخاب کو قبول کر لیا۔ ابوالعباس جہاں رُوپوش تھا وہاں سے اُسے لانے کے لیے ایک ہرکارہ جلدی جلدی بھیجا گیا۔ ابوالعباس کا مسجد میں داخل ہونا تھا کہ لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے دیوانہ وار ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے، چنانچہ انتخاب مکمل ہو گیا۔ ابوالعبّاس نے منبر پر چڑھ کر خطبہ دیا اور مسلمانوں کا امام و خلیفہ بن گیا[1]۔ یوں بنی فاطمہ کی ہر دلعزیزی کے کندھے پر سوار ہو کر بنی عبّاس تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اس کا معاوضہ انھوں نے بنی فاطمہ کو اُلٹا دیا۔ دنیوی اقتدار کی ہوس بڑائی حاصل کرنے کی خواہشوں میں سب سے بُری خواہش ہے۔ انسان کے جذباتی تقاضوں کے کسی اور مظاہرے نے نوعِ انسانی پر اتنے مصائب نازل نہیں کیے جتنے اس نے کیے ہیں۔ یہ ہوس اپنے مقصود کے حاصل کرنے میں اچھے اور بُرے وسائل کے درمیان تمیز نہیں کرتی۔ وہ اپنے منصوبوں کو چھپانے کے لیے جرائم سے کام لیتی ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اُنھیں نیکی کے بھیس میں پیش کرتی ہے، اور تو اور اس نے مذہب کو بھی اپنا آلۂ کار بنانے میں کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ بڑائی کی خواہش نے مذہب کا بھیس بدل کر دنیا کو بڑی دہشت ناک مصیبتوں کا مورد بنایا ہے۔ رُوم کے پاپاؤں نے اپنے دنیوی اقتدار کو قائم رکھنے کی اُن تھک کوششوں کی بدولت مہذّب دنیا کو انسانی خون کے سیلاب میں غرق کر دیا۔ اسلام کے پیشواؤں، یعنی عبّاسیوں، مصری فاطمیوں اور اُمویوں نے دینی و دنیوی اختیارِ اعلیٰ کے اُن ابلہ فریبانہ دعووں کو جو اُن کے خوشامدیوں نے تراشے بڑے ذوق و شوق سے اپنا لیا اور رعایا کی مکمل اطاعت حاصل کرنے کی آرزو میں عالمِ اسلام کو خونیں کشمکشوں کا ہنگامہ زار بنا دیا۔

---

[1] پوری تفصیل کے لیے The short History of the Saracens ملاحظہ کیجیے۔

اوّلین عبّاسی خلفا بڑی قابلیت، دُور اندیشی اور سیاسی تدبر والے لوگ تھے جس وقت اہلِ کوفہ کے آوازۂ قبولیت نے انھیں مسندِ خلافت پر بٹھایا اُسی وقت سے انھوں نے اپنی تمام توتیں اس پر مرکوز کر دیں کہ تمام روحانی اور سیاسی اختیارات پر مضبوطی سے قابض ہو جائیں اور اس نظریے کو کہ انتخابِ عام کا قاعدہ عین حکمِ الٰہی کے مطابق ہے، ایک منطقی معقولیت اور ٹھوس پن بخشیں۔ حقِ وراثت کی بنا پر خلافت کی جانشینی کے اصول کا انعقاد اور انتخابِ جمہور کو یوں پیش کرنا جیسے وہ ایک مقدس فریضہ ہو، اب ایک نہایت ضروری کام بن گیا۔

یوں بظاہر تو سفّاح[1] کے عہدِ حکومت میں ابومسلم سے لحاظ و مدارات کا سلوک کیا گیا، لیکن چونکہ اس کا میلانِ طبع علانیہ فاطمیوں کے حق میں تھا اس لیے اُس سے درپردہ نفرت کی جاتی تھی اور اُسے شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ سفّاح کے جانشین کے زمانے میں اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا اور اُسے زندیق کا لقب دے کر قتل کر دیا گیا۔ خاندانِ نبوی کے ممتاز افراد کو، جو نیک و پاک زندگیاں بسر کرتے تھے، جمہورِ مسلمین کے دلوں میں جو انتہائی احترام حاصل تھا اُس کی بناء پر عبّاسی اُن سے حسد کرتے تھے۔ اس حسد کی وجہ سے انھوں نے وقتاً فوقتاً اولادِ فاطمہ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں۔ ہارون نے برامکہ کو جو اس کی سلطنت کے رُکنِ رکین تھے اور جن کی بدولت اُس نے شہرت پائی، صرف اس لیے تباہ کر دیا کہ اُسے اُن پر فاطمیوں سے مل کر سازش کرنے کا شبہ تھا۔ یہ صورتِ حالات عبداللہ المامون کے دورِ حکومت تک برقرار رہی۔ مامون نے، جو عبّاسی خلفاء میں سب سے شریف النفس خلیفہ تھا، تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی فاطمیوں کو اُن کے واجب حقوق دینے کا عہد کر لیا۔ چنانچہ اُس نے علی ابن موسیٰ رضا کو، جو فاطمیوں کے آٹھویں امام تھے، اپنا

---

[1] "سفّاح" کے معنی ہیں خونخوار۔ ابوالعباس عبداللہ کو یہ لقب اس لیے ملا کہ وہ اپنے مخالفوں کو تہ تیغ کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ اس کے اخلاف میں سے ایک کو (یعنی معتضد باللہ کو) سفّاحِ ثانی کا خطاب دیا گیا۔ یہی خطاب عثمانی شہنشاہ سلیم اوّل کو ملا۔

ولی عہد نامزد کیا اور اُن سے اپنی بیٹی اُمّ الفضل کی شادی کر دی۔ اس نے عباسیوں کا سیاہ لباس ترک کر کے سبز رنگ کا لباس اختیار کیا، جو فاطمیوں کے جھنڈے کا رنگ تھا[1]۔ مامون نے بنی فاطمہ سے جو مروّت کا سلوک کیا وہ اس کے بعد کے دو خلفاء معتصم اور واثق[2] نے جاری رکھا۔ لیکن متوکل کی تخت نشینی کے ساتھ ہی فاطمیوں پر ستم طرازی کا ایک نیا دور شروع ہُوا اور جب تک اُس کی پانزدہ سالہ مدّتِ حکومت، جو بدترین سیاہ کاری، اور جفاشعاری کی مدّت تھی، ختم نہ ہوئی اُس وقت تک قائم رہا۔ جب متوکل کا بیٹا منتصر گدّی پر بیٹھا تو اس نے پہلا یہ کام کیا کہ حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کے مزاروں کی مرمّت کرائی، جنھیں متوکل نے مسمار کرا دیا تھا اور اس کے باپ نے ان کے مقدّس ناموں کی جو بے حُرمتی کی تھی اس کی ہر طرح تلافی کی۔ اس خلیفہ کے تدبّر کی تقلید اُس کے بعد کے خلفاء نے کی۔ چنانچہ اُس کے بعد شیعانِ علی سے کسی نہ کسی حد تک رواداری کا سلوک کیا جانے لگا۔ ۳۳۴ سنِ ہجری (۹۴۵ء) میں آلِ بُویہ کا بادشاہ معزّالدّولہ دیلمی بغداد میں قصرِ خلافت کا مہتمم مقرر ہُوا۔ وہ آلِ فاطمہ کا دلدادہ و شیدا تھا۔ چنانچہ اُس نے عباسی خلیفہ مطیع اللہ کو معزول کر کے اہلِ بیت میں سے کسی کو اس کی جگہ تخت پر بٹھانے کا منصوبہ سوچا، لیکن اُسے مصلحتِ وقت کے خلاف پا کر اُسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ معزّالدّولہ نے امام حسینؓ اور ان کے اہلِ بیت کی شہادت کی یاد میں یومِ عاشورہ منانے کا قاعدہ بھی رائج کیا۔ ۶۴۵ سنِ ہجری (۱۲۴۷ء) میں جب کہ مستعصم باللہ خلیفہ تھا، شیعوں پر ایک نئی قیامت ٹوٹی، جس کے عواقب اسلامی تہذیب کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے اور جس نے سارے مغربی ایشیا میں بربادی پھیلا دی۔ اپنے متعصب حواریوں کے فتنہ پردازانہ مشوروں پر عمل کر کے اس ضعیف العقل خلیفہ نے تمام شیعہ مردوں کے قتلِ عام کا فرمان جاری کر دیا۔ اس فرمان میں اس نے سُنّیوں کو اس کی اجازت بھی دیدی کہ

---

[1] فاطمیوں نے آنحضرتؐ کے مرغوب سبز رنگ کو اختیار کیا، بنی اُمیّہ نے سفید رنگ کو اور بنی عباس نے سیاہ رنگ کو۔

[2] معتصم باللہ (محمد) اور واثق باللہ (ہارون)

وہ شیعوں کے مال و اسباب کو لوٹ لیں، اُن کے گھروں کو منہدم کر دیں، اُن کے کھیتوں کو جلا دیں اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں۔ اس ظلم کی پاداش میں چنگیز کا پوتا ہلاکو قہرِ الٰہی بن کر بغداد پر نازل ہُوا۔ مسلسل تین دنوں تک تاتاری سرداروں نے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ تیسرے دن بنی عبّاس کا سینتیسواں خلیفہ انتہائی ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا گیا اور یوں خاندانِ عباسی کا خاتمہ ہُوا۔[1]

امیر معاویہ کے عہد تک اہلِ بیت[2] نے کوئی امتیازی لقب اختیار نہ کیا۔ وہ صرف بنو ہاشم کہلاتے تھے۔ بنی فاطمہ اور بنو عبّاس ایک دوسرے سے متاثر نہ تھے۔ اُن کے درمیان خون کے بہت قریبی رشتے تھے۔ امیر معاویہ کے حصولِ اقتدار کے بعد خاندانِ محمدؐ کے پیروؤں نے اپنے آپ کو شیعہ (پیرو) اور اپنے دشمنوں کو نواصب (باغی) اور خوارج[3] (باہر جانے والے) کہنا شروع کر دیا۔ بنی اُمیّہ اپنے آپ کو اموی کہتے تھے۔ اس وقت تک اہل السنّت والجماعت کا نام ایجاد نہ ہُوا تھا۔ یہ منصور اور ہارون کے زمانے میں وجود میں آیا۔ دسویں صدی عیسوی

---

[1] بنی عبّاس میں سے ایک شخص فرار ہو کر مصر چلا گیا۔ چنانچہ عباسیوں کی خلافت برائے نام وہاں قائم رہی تا آں کہ عثمانی سلطان سلیم نے آخری عباسی خلیفہ کو اپنے حق میں دست بردار ہونے پر مجبور کیا۔

[2] اہلِ بیت (اہلِ بیت النبیؐ) اس نام سے عموماً حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد و اخلاف کو یاد کیا جاتا ہے۔ ابنِ خلدون نے ہر جگہ انھیں اور اُن کے متبعین و معتقدین یعنی شیعوں کا ذکر اسی نام سے کیا ہے۔ آلِ محمدؐ کی لوگوں کے دلوں میں جو قدر و منزلت ہے، سنائی نے اس کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا ہے:۔

جز کتاب اللہ و عترت ز احمد مرسل نماند یادگاری کو تواں تا روزِ محشر داشتن

[3] خوارج کا نام خاص طور پر اُن لشکریوں کو دیا گیا جنھوں نے دومۃ الجندل کے میدان میں حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسلام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔ بعد میں یہ نام اُن لوگوں کو دیا جانے لگا جنھوں نے اصلی خوارج کے فاسد عقیدے اختیار کیے (اس اجمال کی تفصیل آگے چل کر دی جائے گی۔)

میں علوی خاندان کے ایک رُکن نے عباسیوں سے مصر کی حکومت چھینی اور ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی جس نے سلطان صلاح الدین کے خروج تک مصر اور شام پر حکومت کی۔ وہ تبّرے جو بغداد اور قاہرہ کے خلیفے ایک دوسرے پر بھیجتے تھے، وہ طوُمار در طوُمار روایتیں جوان دونوں خاندانوں کے متضاد دعووں کی تکذیب کے لیے کُرید کُرید کر نکالی گئیں اور وہ فتوے جو ان دونوں کے علماء نے صادر کئے۔ ان سب نے مل کر ان حریف خاندانوں کے حامیوں اور طرف داروں کی باہمی کش مکش کو اور بھی بڑھا دیا۔ سلطان صلاح الدّین نے مصر میں فاطمی خاندان کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور مشرقی افریقہ میں سُنّی مذہب کو از سرِ نو غلبہ بخشا لیکن بنی فاطمہ کی متعدد شاخیں دونوں برِاعظموں کے مختلف حصوں میں اپنے خاندان کا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئیں[1]۔ صرف اثنا عشریہ، جو ان تارک الدنیا اور ولی صفت اماموں کے متبعین ہیں جنھوں نے طاقت کے استعمال کی مخالفت کی اور صرف روحانی امامت کا دعویٰ کیا، دنیاوی معاملات سے بالکل کنارہ کش رہے۔ اُن کا یہ رویہ اس وقت بدلا جب شاہ عبّاس صفوی نے مذہبِ اثنا عشری کو اپنی مملکت کا سرکاری مذہب بنایا۔ اس فلسفی مزاج اور صوفی منش بادشاہ نے جو خاندانِ نبوی سے تعلق رکھتا تھا، یہ محسوس کیا کہ لوگوں کو اس خاندان سے جو محبّت و عقیدت تھی اسے قومی بیداری اور استحکام کا ایک وسیلہ بنانا چاہیئے۔ چنانچہ اثنا عشریت آج تک ایران کا سرکاری مذہب ہے۔

جنوبی ہند کے بہمنی اور عادل شاہی خاندان، جنھیں اورنگ زیب نے ملیا میٹ کیا اور اس طرح اُن مرہٹہ لٹیروں کا راستہ ہموار کیا جنھیں بہمنی بادشاہوں نے سر نہ اُٹھانے دیا تھا، ائمۂ اہلِ بیت کے متبعین تھے۔ یہ ہے فاطمی خاندان کی سیاسی سرگزشت جس کے جلی نقوش اس کے مذہبی نظریات پر مرتسم دکھائی دیتے ہیں۔

---

[1] فاطمیانِ مصر کے علاوہ بنی فاطمہ کی دوسری شاخوں نے امیر، امام، شریف، خلیفہ وغیرہ کے لقب سے اسلامی دنیا کے مختلف حصوں میں حکومت کی ہے، مثلاً مکہ میں بنی اُخیضر، بنی موسیٰ اور بنی قتادہ، شمالی یمن میں بنی طباطبا، جنوبی یمن میں بنی زیاد اور مراکش میں بنی ادریس۔

اسلام کی دینی و دنیوی پیشوائی پر بنی عبّاس کا جو دعویٰ تھا اس کی اساس تھی بیعت، جو ایک قسم کا نام نہاد انتخاب تھی۔ سفّاح کی تخت نشینی سے شروع کر کے عبّاسی خلفائے نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی تھی کہ اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشینوں کے حق میں اکابرِ ملّت سے حلفِ اطاعت اٹھوا لیا تھا۔ چنانچہ یہ لازمی ہو گیا کہ انتخاب کے نظریے کو متقدّمین کی مثالوں کی سند عطا کی جائے۔ اُدھر مصر میں فاطمیوں کے خروج نے اور خلفائے بغداد سے مشرقی علاقوں کی حکومت چھیننے کی جو مستقل کوششیں وہ کر رہے تھے انھوں نے یہ اور بھی ضروری بنا دیا کہ آلِ فاطمہؓ کے دعووں کی تکذیب کی جائے اور ان نظریوں کو جن کے مطابق عبّاسی خلفاء اسلام کی رُوحانی پیشوائی کے حق دار تھے ایک مربوط و منتظم شکل دی جائے۔[1]

عبّاسیوں کے حقِ خلافت کی تائید کرنے والی روایات عراق و حجاز کے گوشے گوشے میں تلاش کی گئیں۔ علمائے فقہ کو حکم دیا گیا کہ صحتِ عقیدہ کے اصول باضابطہ طور پر اور صریح الفاظ میں وضع کریں۔ چنانچہ اس طرح سنّی مذہب کا مہتم بالشّان ڈھانچا کھڑا کرنے میں دیگر

---

[1] ارسلان البساسیری نے، جو عبّاسی فوج کا ایک اعلیٰ عہدیدار لیکن مصری فاطمیوں کا حامی تھا، بغداد کے خلیفہ قائم بامر اللہ کو شہر سے نکال دیا اور اسے اس پر مجبور کیا کہ امیر العرب (یہ ایران کے ایل خانی کے مماثل ایک خطاب تھا) کے یہاں جا کر پناہ گزین ہو۔ بالآخر الپ ارسلان کے باپ طغرل نے، جو سلجوقی خاندان کا بانی تھا، خلیفہ کو واپس لا کر دوبارہ تخت پر بٹھایا۔ خلیفہ کی غیر حاضری کے دوران بغداد میں فاطمی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ خطبہ وہ وعظ ہے جو مسلم ملکوں کی جامع مسجدوں میں جمعہ کے دن منبر پر سے دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اسمائے الٰہی کے ذکر، وحدت اللہ کے اقرار اور رسولِ خدا، آلِ رسولؐ اور جانشینانِ رسولؐ کے حق میں درود سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد خلیفۂ وقت اور سربراہِ مملکت کے حق میں دُعا کی جاتی ہے۔ خطبے میں مذکور ہونا اور اپنے نام کا سکّہ جاری کرنا۔ یہ ہیں وہ سب سے بڑے حقوق جو بادشاہِ وقت کو حاصل ہوتے ہیں اور جن کی بدولت اس کی حکمرانی قانوناً مسلّم ہوتی ہے۔

عوامل کے علاوہ عباسیوں کے ذاتی مفادات بھی کسی حد تک بروئے کار آئے۔ جن علماء و فقہاء نے سُنی مذہب کی نشو و نما میں مدد دی۔ ان کی کامیابی میں مصری فاطمیوں کے بعض افکار کو بھی دخل تھا۔ ایک تو یہ امر کہ مصری فاطمیوں کے عقائد شیعہ اماموں اور سُنی فقیہوں دونوں کی تعلیمات سے متبائن تھے۔ دوسرے حسن بن صبّاح (شیخ الجبال) کے حکم سے بہترین اشخاص کے جو قتل وا قع ہوئے تھے، نیز وہ ملحدانہ خیالات جو قدیم کلدانی مجوسیت (Chaldaeo Magism) کے زیر اثر مختلف طبقوں میں رائج ہو گئے، اور جو مخرّبِ اسلام تھے ـــــ ان سب نے مل کر اس نظامِ عقائد کو تقویت دی جو جماعۃ المسلمین کی نگاہوں میں دشمنانِ اسلام کی یورشوں کے خلاف ایک سدِّ سکندری تھا۔ شیعہ اماموں نے مانی و مزدک کے مصنّفین اور اشتراکیت پرور خیالات کی پُر زور تردید کی، لیکن ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ لادینیت کا سر کچل سکتے یا وحدتِ فکر نافذ کر سکتے۔ سُنی مذہب کو عباسی خلفاء کی دنیاوی طاقت کے بل بوتے پر اس کی توفیق تھی اور اس نے اس سے کام لیا۔ نتیجۃً اُسے ایسے تمام لوگوں کی نگاہوں میں مقبولیت حاصل ہوئی جو توارثِ خلافت کے مجرّد مسئلے کے بارے میں اپنا سر نہ کھپاتے تھے۔

جو لوگ اہلِ بیت کے موروثی حقِ خلافت کے حامی تھے اور جو لوگ اس خیال کے تھے کہ جمہور کو اپنے دینی و دنیوی پیشواؤں کے انتخاب کا حق ہے۔ ان دونوں میں بنی عباس کے خروج تک اتنا کم فرق تھا کہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ حجاز کے لوگ اور بالخصوص انصارِ مدینہ، جنھیں اُمویوں نے اس بے دردی سے تباہ کیا، یوں تو انتخاب کے اصول پر مُصر تھے، لیکن انھیں وہ ناانصافی بہت شاق گزری تھی جو آلِ فاطمہ سے کی گئی تھی۔ شہادتِ امام حسینؓ کے بعد اسلام کے سینے سے واویلے کی صدا اٹھی تھی۔ چنانچہ دونوں مقدّس شہروں کے لوگ اسلحہ بند ہو کر غاصب کے خلاف اُمڈ کھڑے ہوئے تھے، جس کی انھوں نے بڑی سخت سزا بھگتی تھی۔ اہلِ بیت کے طرف داروں نے بھی اور پہلے خلفائے ثلاثہ کے پیروؤں نے بھی دین کے تحفّظ کی خاطر بڑی شدید اذیتیں سہی تھیں۔ لیکن جب خاندانی مفادات کی خاطر دونوں جماعتوں کے درمیان ایک خلیج حائل کرنا ضروری ہو گیا تو دونوں طرف تفریق کے عناصر آسانی سے مہیا ہو گئے۔ ان میں جو نظریاتی اور قانونی اختلافات تھے، انھوں

نے اس وقت وہ صورت اور وہ شدت اختیار کرنی شروع کر دی جو زمانۂ حال میں پائی جاتی ہے۔

مامون کے عہد میں اور اس کے فوراً بعد جو خلفاء آئے اُن کے عہد میں، جب کہ انسانیت نواز علوم اور فلسفے نے ہر طبقے کے افکار کو متاثر کر دیا تھا سُنّی مذہب کی نشوونما میں رخنہ پڑ گیا۔ ان عہدوں کو چھوڑ کر خلافت عبّاسیہ کی ساری مدت[1] سُنّی مذہب کے عقائد کی تقویت و استحکام پر صرف ہوئی۔ دین و دنیا کو ایک دوسرے سے مربوط کر دیا گیا: خلیفہ امام بھی تھا، یعنی دنیوی سربراہ بھی اور دینی پیشوا بھی۔ قانون و فقہ کے علماء سب اس کے ملازم تھے۔ وہ اُن کے مباحثوں کی صدارت اور اُن کے فیصلوں کی ہدایت کرتا تھا۔ یہ ہے راز سُنّی مذہب کی سالمیت کا۔ جن فرقوں[2] میں وہ ابتداءً منقسم تھا اُن میں سے اکثر رفتہ رفتہ معدوم ہو گئے ہیں، لیکن اب بھی اس کے چار بڑے بڑے فرقے ہیں جو عقائد اور رسوم عبادت کے بہت سے معاملوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اُن میں جو اختلافات ہیں اُنھیں اُن اختلافات سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو رومن کیتھولک کلیسا اور مقلد یونانی، آرمینائی اور شامی کلیساؤں میں پائے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف شیعیت میں دین اور مملکت ایک دوسرے سے منقطع ہو گئے ہیں، اور شارحین قانون نے، کم از کم ایک طبقے میں، وہی اقتدار و اختیار حاصل کر لیا ہے جو عیسائیت میں کلیسائی منصب داروں کو حاصل ہے، چنانچہ جس طرح پروٹسٹنٹ مذہب میں آزادیٔ رائے نے ایک سو اسّی فرقے پیدا کر دیئے ہیں، اُسی طرح اس نے شیعوں کو لاتعداد فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ شیعہ مذہب میں نظریات و عقائد کا جو تنوع پایا جاتا ہے وہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ کوئی مختارِ کل سیاسی طاقت ایسی نہ تھی جو بزورِ شمشیر وحدت و یکسانی عائد کرتی۔

---

[1] سنہ ۷۵۰ء سے لے کر ۱۲۵۸ء تک۔

[2] امام جعفر طوسی (بحوالہ دبستان) کے قول کے مطابق سُنّیوں کے ابتداءً پینسٹھ فرقے تھے۔

امامت[1]، یعنی اُمّتِ مسلمہ کی دینی قیادت، کا مسئلہ اس عہد کے بعد جس کا ہم نے ابھی ابھی

---

[1] ڈاکٹر پرسی بیجر (Dr, Percy Badger) نے لفظِ "امامت" کی بڑی عمدہ تعریف کی ہے: "لفظِ امام ایک عربی مادّے سے ماخوذ ہے جس سے عبارت ہے مقصود بنانا، تقلید کرنا۔ اس مادّے کے جتنے مشتقات ہیں اُن میں سے اکثر میں یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ چنانچہ "امام" کا بنیادی مطلب ہے مثال پیش کرنے والا، وہ جس کی مثال کی تقلید کی جانی چاہیے۔ ان معنوں میں اس کا اطلاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے کہ وہ سیاسی اور دینی معاملات میں مسلمانوں کے ہادی و رہنما تھے۔ اسی طرح اس کا اطلاق خلفاء پر بھی ہوتا ہے، اس حیثیت سے کہ وہ دین و دنیا دونوں میں پیغمبرِ اسلام کے جائز جانشین اور قائم مقام تھے۔ خالصتہً مذہبی معنوں میں یہ لفظ مسلمانوں کے چار مقلد طبقوں یعنی حنفیوں، شافعیوں، مالکیوں اور حنبلیوں کے مجتہدوں کے بارے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ محدود معنوں میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو مسجد میں نماز پڑھاتا ہے۔ یہ منصب عموماً ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اتقا کی شہرت رکھتے ہوں۔ یہ لوگ ناظر کے حکم سے برطرف کیے جا سکتے ہیں اور اس صورت میں نہ صرف اپنے منصب اور مشاہرے سے، بلکہ لقبِ "امام" سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔" امام کی اصطلاح قرآن میں کسی قوم کی کتاب یا صحیفے کے معنوں میں بھی استعمال کی گئی ہے اور کسی معلّمِ دین کے بارے میں بھی۔ قیاس چاہتا ہے کہ مسلمانوں نے اسے مؤخر الذکر معنوں میں قرآن ہی سے اخذ کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چند کلمات کہہ کر ابراہیمؑ کو آزمایا اور ابراہیمؑ اس آزمائش میں پورا اُترا تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تجھے قوم کا امام بنا دیا۔" ایک اور جگہ ابراہیمؑ، اسحٰق اور یعقوب کے ذکر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ہم نے انھیں امام بنایا تاکہ وہ ہمارے حکم کے مطابق دوسروں کی ہدایت کریں۔" مزید "ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی۔ پس اس بارے میں شک نہ کرو کہ اسے کتاب ملی، اور ہم نے حکم دیا کہ یہ کتاب بنی اسرائیل کے لیے صحیفۂ ہدایت ہو اور ہم نے اُن میں سے بعضوں کو امام مقرر کیا، تاکہ وہ ہمارے ارشاد کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کریں۔" بیجر کی کتاب "عمان کے ائمہ و سادات" "Imams and Syeds of Oman, appendix A

ذکر کیا ہے سُنیّوں اور شیعوں کے درمیان سب سے بڑا باب النزاع بن گیا[1]۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی رُوحانی وراثت حضرت علی رضؓ کو اور اُن کی وساطت سے اُن کی اولاد کو ملی۔ چنانچہ وہ اس نظریے کی تردید کرتے ہیں کہ جماعت کو اہل بیت النبی کے جائز حقوق نظر انداز کر کے خلیفہ منتخب کرنے کا حق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیعوں کے نزدیک امامت کا سلسلہ پشت بہ پشت خاندانِ نبوی میں چلتا ہے۔ آلِ نبی سے ہونے کے علاوہ امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ چند اوصاف کا مالک ہو۔ وہ اوصاف یہ ہیں کہ وہ معصوم یعنی بری از گناہ ہو، اس کی سیرت بالکل بے داغ ہو اور وہ صدق و صفا میں اپنے تمام معاصرین سے ممتاز ہو۔ اُن کے خیال میں نہ یہ مناسب ہے اور نہ منشائے ربی ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی سیرت الزام سے بالا نہیں لوگوں کے ضمیر کا رہنما بنے۔ انسانی انتخاب غلط ہو سکتا ہے، جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے، لوگوں نے بسا اوقات بدترین افراد کی سربراہی قبول کی ہے۔ انسان کی مذہبی ضروریات کے معاملے میں ناممکن ہے کہ خدا نے اسے اس کی ناقص عقل کے رحم پر چھوڑ دیا ہو۔ اگر امام کی ضرورت ہو تو وہ کوئی

---

[1] مسعودی لکھتا ہے: "امامت کا مسئلہ مختلف فرقوں کے درمیان بحث و تکرار کا موضوع ہے، بالخصوص القائلون بالنص (تقرر کے معتقدین) اور اصحاب الاختیار (نظریۂ انتخاب کے حامیوں) کے درمیان نظریۂ تقرر کے حامی امامیہ یا اہل الامامۃ کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ علی ابن ابی طالب اور فاطمہ کے بطن سے اُن کے جو بچے ہوئے اُن کے شیعیان (تابعین) کا ایک طبقہ ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایک ایسا شخص مبعوث کیا ہے جو دینِ حق کی حفاظت اور ملت کی امامت کرتا ہے۔ ایسے اشخاص باقی ہوتے ہیں یا نبیوں کے وصی۔ نظریۂ انتخاب کے حامی ہیں خوارج کا ایک فرقہ، مرجیہ، اہل السنۃ والجماعۃ، بعض معتزلہ اور زیدیوں کا ایک فرقہ۔ ان لوگوں کے عقیدے کے مطابق اللہ اور رسولؐ کا منشا یہ ہے کہ قوم خود اپنے میں سے ایک آدمی کو چنے اور اُسے اپنا امام بنائے، کیونکہ ایسے زمانے بھی ہوتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کوئی وصی نہیں بھیجتا۔ شیعوں کے نزدیک اس طرح مقرر کیے ہوتے اشخاص منصبِ امامت کے غاصب ہوتے ہیں۔" مروج الذہب۔

ایسا شخص ہونا چاہیے جسے انسانی ضمیر قبول کرتا ہے۔ ان دلائل کی بناء پر اہلِ تشیع کہتے ہیں کہ اگر امام کا انتخاب عوام کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے تو ملت کے اخلاق کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہٰذا نوعِ انسانی کی رُوحانی ہدایت مبعوث من اللہ اشخاص کو سونپی گئی ہے[1]۔

سُنیوں کا عقیدہ ہے کہ امامت آلِ نبی تک محدود نہیں۔ نیز یہ لازمی نہیں کہ امام عادل متقی اور معصوم ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ افضل الناس یعنی اپنے وقت کا بہترین شخص ہو۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ وہ آزاد، بالغ اور صحیح الحواس ہو اور مملکت کے معمولی امور کے انصرام کی قابلیت رکھتا ہو۔ جس شخص میں بھی یہ صفات موجود ہوں وہ منصبِ خلافت کے لیے منتخب ہونے کا اہل ہے۔ اُن کا ایک اور نظریہ جس میں وہ کلیسائے رُوم سے متفق الرائے ہیں، اسلامی دنیا کے لیے بڑے اہم نتائج کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ نہ امام کی بدکرداری اور نہ اس کی ستم شعاری اس کی معزولی کا جواز مہیا کرتی ہے[2]، جس طرح کہ امام نماز

---

[1] اس ضمن میں ہم ابنِ خلدون سے جس میں اُتنی ہی ژرف نگاہی تھی جتنی ہمہ دانی تھی، چند اقتباسات پیش کرتے ہیں: "نہ بادشاہ کی ذاتی وجاہت، نہ اُس کی علمی فضیلت، نہ اس کی ذکاوت و فراست، اور نہ اس کے کوئی اور ذاتی کمالات رعایا کے حق میں مفید ثابت ہوتے ہیں .... بادشاہ کا وظیفۂ منصبی محض اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے۔" "ایک حکمران کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ انسانوں کے لیے ایک جگہ مل جُل کر رہنا ضروری ہے۔ اگر معاشرے کے نظام کو قائم رکھنے والا کوئی نہ ہو تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ ایک دنیاوی حاکم صرف انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل درآمد کراتا ہے۔ لیکن ایک ملہم من اللہ شارع کے بنائے ہوئے قوانین دو قسم کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں، یعنی نوعِ انسانی کی اخلاقی و معاشرتی صلاح و فلاح۔ خلیفہ نبی کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے۔ وہ محض ایک دنیاوی حاکم ہی نہیں ہوتا، بلکہ رُوحانی قائد بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفہ کو امام کا لقب دیا جاتا ہے۔ فقہ کے نقطۂ نگاہ سے اس کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو نمازیوں کی ایک جماعت کے نقطۂ نگاہ سے امام نماز کی ہوتی ہے۔ امام کا تقرر ایک فریضہ ہے۔ وہ قانون جس کی رُو سے یہ لازمی قرار پایا یا اصحابِ نبی کے اجماع پر مبنی ہے۔ امام رُوحانی پیشوا اور خلیفہ یا سلطان دنیاوی طاقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔"

[2] اس نظریے کے باوجود، جو اُن جابر خلیفوں کے حکم پر (باقی حاشیہ صفحہ ۴۸۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

کی بدی بالکل روی مقتدی مومنوں کی نماز کو باطل نہیں کردیتی[1]۔ سنیوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ امامت ناقابلِ تقسیم ہے اور بیک وقت دو اماموں کا ہونا قانوناً ناممکن ہے۔ جس طرح عیسائیت میں ایک ہی پوپ کی اطاعت جائز ہے، اسی طرح اسلام میں صرف ایک خلیفہ کی بیعت ہو سکتی ہے۔ لیکن جس طرح بسا اوقات تین تین پوپ بہ یک وقت کلاہِ پاپائی کے مدعی رہے ہیں، اسی طرح تین تین اُمراء المسلمین نے بھی بہ یک وقت حاکمیتِ اعلیٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ جب ایشیا میں بنو اُمیہ کو زوال آ گیا تو اُس خاندان کے ایک فرد نے ہسپانیہ میں ایک خود مختار حکومت قائم کی اور اُسی زمانے میں بنو عباس دجلہ کے کناروں پر اور بنی فاطمہ نیل کے کناروں پر حکمران تھے۔ اس امر کی بناء پر کہ مختلف زمانوں میں دو یا تین حکمرانوں نے بہ یک وقت خلیفۃ المسلمین کا لقب اختیار کیا ہے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ خلافت کے لاتجزّی ہونے کے اصول کا اطلاق صرف ایک ملک پر یا دو متصل ملکوں پر ہوتا ہے۔ لیکن جب دو ملک ایک دوسرے سے اس قدر دُور ہوں کہ ایک ملک کے امام کا اختیار دوسرے ملک پر عائد نہیں ہو سکتا تو دوسرے امام کا انتخاب بھی جائز قرار دیا جاتا ہے۔ امام تمام مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۰) ایجاد کیا گیا جو اپنے ظلم و ستم کی مکافات سے محفوظ رہنا چاہتے تھے، لوگوں نے اسے بالکلیہ منظور نہیں کیا۔ اُموی خلیفہ ولید کے عہد میں (جسے سیاہ کاریوں کی بناء پر فاسق کا خطاب دیا گیا) رعایا نے بغاوت کر دی اور اُسے تخت سے برطرف کر دیا۔ اسی طرح جب عباسی خلیفہ متوکل کی زیادتیاں حدِ برداشت سے تجاوز کر گئیں تو خود اس کے بیٹے منتصر نے اُسے معزول کر ڈالا۔ عثمانی ترکوں کی تاریخ میں بھی اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے کسی ظالم یا نااہل سلطان کے خلاف بغاوت کی۔ اس قسم کا آخری واقعہ ناشاد و نامراد عبدالعزیز کے زمانے میں ہوا۔

[1] اس نظریے کے خلاف اس وقت اہلِ سنت والجماعۃ میں بغاوت پھیلی ہوئی ہے۔ غیر مقلدین (جن سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے) یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر امام متقی اور پاکباز نہ ہو تو جماعت کی نماز فسخ ہو جاتی ہے۔

کا مربّی و ناظم اور دنیا و عقبیٰ میں اُن کی فلاح کا محافظ ہوتا ہے۔ اُسے یہ اختیار ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی رضامندی سے اپنا جانشین نامزد کرے۔ مسلمانوں کی رضامندی اس لیے ضروری سمجھی جاتی ہے کہ خلیفہ کا منصب اُن کی دینی و دنیوی بھلائی کے لیے ہے۔[1]

توقع کی جا سکتی تھی کہ شیعوں پر جو مشکلیں پڑیں وہ اُنھیں متحد رکھیں گی۔ لیکن اگرچہ سب شیعوں کا اس پر اتفاق تھا کہ منصبِ خلافت سلسلۂ نبوی تک محدود ہے، اُن میں سے بعض خاندانِ نبوی کے مسلّم بزرگوں سے رُوگرداں ہو کر عمداً یا میلاناً اس خاندان کے دوسرے افراد سے وابستہ ہو گئے۔ مسلّم امام اور اُن کے متبعین تو گوشۂ اعتکاف میں جا گزیں رہے اور اہلِ بیت ایک طرف تو دشمنوں سے برسرِ پیکار رہے اور دوسری طرف خانہ جنگیوں میں مشغول رہے۔ وہ وعظ بھی دیتے رہے، مباحثے اور مناظرے بھی کرتے رہے اور تکلیفیں بھی سہتے رہے۔

شہرستانی نے شیعوں کو پانچ فرقوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی زیدیہ، اسمٰعیلیہ، اثنا عشریہ یا امامیہ، کیسانیہ اور غالیہ یا غلاۃ۔ لیکن فی الواقعہ، جیسا کہ ہم بعد میں واضح کریں گے، ان فرقوں میں اور بالخصوص اُن شاخوں میں جن میں وہ منقسم ہو گئے حضرت علیؓ سے ایک مبالغہ آمیز محبت کے سوا خالص تشیّع کی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اس کے برعکس وہ فی الاصل غیر اسلامی ہیں۔

زیدیوں کی بابت شہرستانی کہتا ہے کہ وہ زید بن علی زین العابدین ابن حسین کے پیرو ہیں۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علیؓ سے شروع ہو کر پہلے امام حسنؓ کو، پھر امام حسینؓ کو، پھر علی ثانی امام زین العابدینؒ کو ملی۔ زین العابدین کے بعد وہ محمد الباقر کو نہیں ملی، جیسا کہ اثنا عشریہ بلکہ مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ ہے۔ بلکہ زید کو۔ خلافت کے بارے میں زیدی بڑی حد تک اہلِ سُنّت سے مشابہ ہیں۔ اُن کے خیال میں عوام کو یہ حق ہے کہ وہ خانوادۂ نبوی میں سے کسی کو اپنا رُوحانی پیشوا انتخاب کریں۔ چنانچہ اُنھوں نے انتخاب کے اصول کو اور اس اصول کو کہ امامت اہلِ بیتِ نبوی تک محدود ہے،

---

[1] ابن خلدون، حصۂ اوّل کا باب اوّل ملاحظہ کیجیے۔

جمع کر دیا ہے۔ اُن کا یہ خیال بھی ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کا انتخاب جائز ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ حضرت علیؓ صحابۂ رسولؐ میں سب سے برگزیدہ تھے اور حقِ وراثت کی بنا پر بھی اور اپنے ذاتی اوصاف کی بنا پر بھی امامت کے مستحق تھے لیکن ملکی مصلحتوں کے پیشِ نظر اور اُن شورشوں کو فرو کرنے کی خاطر جو آنحضرتؐ کے وصال پر برپا ہوئیں ایک زیادہ پختہ عمر کے آدمی کا منصبِ خلافت پر مامور ہونا ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں کو اطمینان دلا سکے اور ان کے اختلافات کو رفع کر سکے۔ علاوہ بریں حضرت علیؓ حفاظتِ دین کی خاطر جس جہاد میں مشغول رہے تھے اُس کی وجہ سے اُن لوگوں کے سینے میں جنھوں نے مسلمانوں سے لڑائیاں لڑی تھیں اور جنھیں مسخر ہوئے زیادہ مدت نہ گزری تھی حضرت علیؓ کے خلاف شدید جذبۂ انتقام تھا۔ اس امر کا احتمال تھا کہ یہ لوگ حضرت علیؓ کی صولت کے آگے بھی آسانی سے نہ جھکتے۔ یہی دلیل وہ حضرت عمرؓ کے انتخاب کے جواز میں پیش کرتے ہیں[1]۔ پہلے دو خلیفوں کی امامت کو تسلیم کرنے کی بنا پر زیدیوں کو دوسرے شیعوں نے روافض کا لقب دیا، جس کے معنی ہیں اختلاف کرنے والے۔ زیدیوں کا ایک اور عقیدہ اتنا اہم ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ پرہیزگاری، صداقت، علمی فضیلت اور معصومیت کے جن اوصاف کا خالص شیعوں کے نزدیک امام میں موجود ہونا ضروری ہے اُن کے علاوہ اس میں شجاعت اور اپنا حق بزورِ شمشیر منوانے کی صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ امام محمد الباقر نے، جو اپنے باپ حضرت علی ثانی کے جانشین بنے، قوت کے استعمال کو مذموم قرار دیا۔ امام زید اس معاملے میں اُن سے مختلف الرائے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ہشام ابن عبدالملک اموی کے خلاف بغاوت کی اور ناکام رہ کر جوارِ کوفہ میں شہید ہوئے۔ اُن کے جانشین اُن کے بیٹے یحییٰ بنے، جنھوں نے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر امام جعفر صادق کے مشورے کے خلاف اپنا دعوے اسلحہ بندانہ طاقت سے منوانے کی کوشش اور خراسان میں ایک لشکر جمع کر لیا، لیکن انھیں شکست

---

[1] شہرستانی حصۂ اوّل صفحہ ۱۱۵۔

ہوئی اور وہ ہشام کے ایک سردارِ فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

امام یحییٰ کی وفات پر زیدیوں کے عقیدے کے مطابق، امامت اُن کے خاندان کے ایک اور فرد کو ملی، یعنی محمدؐ بن عبداللہ (النفس الزکیہ) کو، جنھوں نے مہدی کا لقب اختیار کیا اور خلیفۂ عباسی منصور کے خلاف حجاز میں عَلَم بغاوت بلند کیا۔ انھوں نے مدینے میں منصور کے بھتیجے عیسیٰ کے ہاتھوں زک اُٹھائی اور شہادت پائی۔ اُن کے بعد اُن کے بھائی ابراہیم امام بنے۔ انھوں نے بھی عباسیوں سے جنگ آزمائی کر کے جامِ شہادت پیا۔ اُن کے تیسرے بھائی عیسیٰ نے بھی اپنا دعویٰ بزورِ شمشیر منوانا چاہا، لیکن گرفتار ہوئے اور منصور کے حکم سے عمر بھر کی قید میں ڈال دیئے گئے۔ یہ واقعات بیان کرنے کے بعد شہرستانی لکھتا ہے: "ان پر جو اُفتاد پڑی اُس کی پیش گوئی جعفر صادقؑ نے کی تھی، جنھوں نے یہ کہا تھا کہ دنیوی اقتدار اُن کے خاندان کا حصہ نہ تھا، بلکہ امامت کا عباسیوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بننا مقدّر تھا۔"

زیدیہ کی ایک شاخ کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت ابراہیم سے ادریس کو ملی، جنھوں نے مغرب الاقصیٰ اور شہر فس کے خاندانِ ادریسی کی بنیاد رکھی۔ ادریسیوں کے زوال کے بعد زیدیوں کا شیرازہ بکھر گیا، لیکن اب بھی اس فرقے کے تام لیوا ایشیا اور افریقہ کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ زیدیوں کی ایک شاخ نے ایک طویل مدّت تک طبرستان میں حکومت کی اور شمالی یمن میں اب بھی ایک زیدی امام ہے۔ شہرستانی کے کہنے کے مطابق زیدیہ کے چار ذیلی فرقے تھے، یعنی جارُودیہ، سلیمانیہ، طبریہ اور صالحیہ۔ اُن میں جو اختلاف ہے وہ اس بارے میں ہے کہ حضرت زیدؓ کے بعد امامت کس کو ملی۔ جارُودیہ نے، جو عیسیٰ کے مقابلے میں محمد نفس الزکیہ کے حامی تھے، منصور کے عہد میں سخت تکلیفیں اُٹھائیں۔ سلیمانیہ اپنے بانی سلیمان ابن جریر کے نام سے موسوم ہیں، جنھوں نے یہ اعلان کیا کہ امامت کا دارومدار اجماعِ ملّت پر ہے۔ "امامت سے یہ مقصود نہیں کہ دین کی تنظیم کی جائے یا خدا، خدا کی وحدت اور جو قوانین خدا نے دنیوی حکومت کے لیے بنائے ہیں اُن کا علم حاصل کیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں تو عقل کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ امامت کا مقصد ہے روئے زمین پر حکومت

کرنا، مجرموں کو سزائیں دینا، عدل کرنا اور مملکت کا تحفظ کرنا۔ امام کے لیے افضل ہونا لازمی نہیں۔"[1] اہلِ سُنّت کے ایک فرقے کی رائے اس سے مماثل ہے۔ اس فرقے کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ امام عالم یا مجتہد ہو، صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ صاحبِ فہم ہو اور اس کا کوئی ایسا مشیر ہو جو قوانینِ شریعت کی تشریح کرنے کا اہل ہو۔" سلیمانیہ اور صالحیہ پہلے دو خلیفوں کے تسلیم کرنے کے بارے میں ایک دوسرے سے متفق ہیں۔ موخرالذکر کی رائے ہے کہ چونکہ حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے حق میں اپنے فائق دعوے سے دستبردار ہو گئے اس لیے لوگوں کو یہ حق نہیں کہ ان کی امامت کے بارے میں سوال اٹھائیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ کے بارے میں انھیں شک ہے۔ وہ کہتے ہیں "جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے کس طرح بنی اُمیّہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے جتن کیے، تو ہم انھیں دوسرے صحابہ سے مختلف پاتے ہیں۔"

اسمٰعیلیہ جنھیں کبھی کبھی سابعون[2] بھی کہا جاتا ہے، امام جعفر صادق کے بیٹے امام اسمٰعیل سے منسوب ہیں، جنھوں نے اپنے باپ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادق کی وفات پر امامت اسمٰعیل کے بیٹے محمد المکتوم[3] کے حصے میں آئی، نہ کہ جعفر کے بیٹے موسیٰ الکاظم کے حصے میں، جیسا کہ اثنا عشریہ اور عموماً دوسرے مسلمانوں کا عقیدہ

---

[1] شہرستانی - حصّہ اول، صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰ -

[2] یہ اس لیے کہ یہ لوگ صرف سات اماموں کو تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی (۱) حضرت علیؓ (۲) حضرت حسنؓ (۳) حضرت حسینؓ (۴) حضرت علی ثانیؓ (۵) حضرت محمد الباقر (۶) حضرت محمد جعفر الصادق اور (۷) حضرت اسمٰعیل۔

[3] مقریزی کے بیان کے مطابق یہ لقب انھیں اس لیے دیا گیا کہ انھیں عباسیوں کے پنجۂ ستم سے بچانے کی خاطر اُن کے پیروؤں نے اُنھیں چھپائے رکھا۔ امام اسمٰعیل امام جعفر صادق کے سب سے بڑے لڑکے تھے، نہایت نرم خُو اور دلآویز طور طریقوں کے آدمی۔ مقریزی کہتا ہے کہ یمن فطامہ اور افریقی صوبوں میں اُن کے معتقد بڑی تعداد میں تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۴۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

ہے۔ اسماعیلیوں کے خیال کے مطابق محمد المکتوم کے جانشین جعفر المصدق تھے جن کے بیٹے محمد الحبیب آخری امامِ مکتوم تھے۔

امام محمد الحبیب کے بیٹے ابو محمد عبد اللہ نے فاطمی خاندان کی بنا ڈالی جس نے تین صدیوں تک شمالی افریقہ پر حکومت کی۔ انھیں عباسی خلیفہ معتضد باللہ سفاح ثانی نے قید میں ڈال دیا تھا، لیکن انھوں نے سجلماسہ کے زیرِ زمیں زندان سے نکل کر بربری میں خروج کیا۔ جہاں انھوں نے عبید اللہ اور مہدی (یعنی ہادیٔ موعود) کے القاب اختیار کئے۔ متبعین چاروں طرف سے آکر اُن کے گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے ایک صوفی کی مدد سے تھوڑی ہی مدت میں اغلبیوں کو، جو خلیفۂ بغداد کے نام پر افریقی صوبوں پر حکومت کر رہے تھے، حکومت سے برطرف کر دیا اور ایک نئی سلطنت قائم کی جو مغرب الاقصیٰ سے لے کر سرحدِ مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے ایک جانشین معد ابو تمیم (المعز لدین اللہ) نے عباسیوں سے مصر اور شام کا ایک حصہ فتح کر لیا۔ دشمنانِ اہلِ بیت پر اپنی اس فتح کی یادگار کے طور پر انھوں نے قاہرہ کی بنیاد رکھی اور اپنا دار الخلافہ مہدیہ سے، جو قیروان کے نزدیک عبید اللہ المہدی نے قائم کیا تھا، اس نئے شہر میں منتقل کر لیا۔ اُس وقت ان کی قلمرو میں سارے شمالی افریقہ کے علاوہ سارڈینیا اور صقلیہ کے جزیرے بھی تھے۔ قاہرہ میں انھوں نے مسجد الازہر بنائی، ایک بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا اور متعدد دار العلوم کھولے جنھیں انھوں نے رقومِ خطیر عطا کیں۔ ان میں صرف و نحو، ادب، تفسیرِ قرآن، اصولِ فقہ، طب، ریاضی اور تاریخ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایک معتبر مؤرخ کہتا ہے "اُن کی حکومت کا امتیازی وصف عدل و انصاف تھا"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۵) شہرستانی سے روایت ہے کہ امام اسمٰعیل کی والدہ کی زندگی میں امام جعفر نے دوسری شادی نہیں کی، جیسے کہ رسولِ خدا نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں نہیں کی۔"

[1] مارسل (Marcel) منتی العقیدہ جمال الدین تغری بردی (باقی حاشیہ صفحہ ۴۸۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

مصری فاطمیوں کے جتنے وقائع ہمارے پاس موجود ہیں وہ سب کے سب اُن کے مخالفوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ جب سے معزؔ کے سپہ سالار جوہر نے مصر اور شام کو خلفائے بغداد سے فتح کیا اُسی وقت سے دونوں خلافتوں میں حقِ خلافت کے مسئلے پر جنگ وجدل کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ فاطمیوں کے منجملۂ اہلِ بیت ہونے کے دعوے کی بدولت اُنھیں لوگوں کی جو عقیدت حاصل تھی اُس نے عبّاسیوں کے دلوں میں یہ بیتاب خواہش پیدا کی کہ جس طرح بھی ہوسکے اپنے حریفوں کے سلسلۂ نسب کی تغلیط کریں اور دُنیا پر اُن کے نقیضِ اسلام عقائد کا پول کھولیں۔ قادر باللہ کے عہدِ حکومت میں خوفزدہ خلیفہ کے حکم سے علمائے فقہ کا ایک خفیہ اجتماع اس مقصد سے ہوا کہ فاطمیوں کے بارے میں یہ فتوٰے صادر کیا جائے کہ وہ حضرت فاطمہؓ کے حقیقی اخلاف نہیں ہیں۔ فاطمیوں نے اس کا جواب ایک فتوائے تکفیر کی صورت میں دیا جس پر قاہرہ کے سربرآوردہ علمائے کے دستخط تھے، جن میں مالکی اور شافعی عقیدے کے علماء بھی شامل تھے۔ بہرحال فاطمیوں کی صحتِ نسب کے بارے میں عبّاسی علماء نے جو شبہات پیدا کردیئے ہیں اُن کے باوجود مقریزی، ابن خلدون اور ابو الفداء جیسے موقّر مؤرخین نے ان کے دعاوی کو صحیح مانا ہے۔

مقریزی اس موضوع پر بڑی صاف گوئی سے کام لیتا ہے اور صراحتہً بنی عبّاس کے طرفداروں پر کذب بیانی اور جعل سازی کا الزام لگاتا ہے۔ عبّاسیوں کے اس بیان سے کہ عبیداللہ المہدی آلِ رسولؐ سے نہ تھا بحث کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: "واقعات کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ محض دروغ بافی ہے۔ اُس زمانے میں حضرت علیؓ بن ابی طالبؑ کے متعدد اخلاف موجود تھے اور شیعہ لوگ اُن سب کا احترام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۶) اپنی کتاب موردِ اللطافۃ میں لکھتا ہے: "اگرچہ معزؔ اہلِ افتراق میں سے تھا، تاہم وہ ذی فہم، صاحبِ علم، فیّاض اور اپنی رعایا کے حق میں عادل تھا۔ (وکان المعزّ افضنیا الاانہ کان فاضلاً عاقلاً ادیباً حازماً جواداً ممدحاً فیہ عدل الرعیۃ")

فاطمیوں کی مفصل سرگزشت کے لیے A short History of the Saracens ملاحظہ کیجئے۔

کرتے تھے۔ پھر ایسی کونسی چیز تھی جو ان اہل بیت النبی کے طرف داروں کو اس پر آمادہ کر سکتی تھی کہ وہ انھیں چھوڑ کر ایک ایسے شخص کو خلیفہ تسلیم کریں جو مجوسی الاصل اور یہودی النسل تھا۔؟ کوئی شخص جس کی عقل ٹھکانے تھی ایسی حرکت نہ کر سکتا تھا۔ یہ روایت کہ عبیداللہ المہدی اصل و نسل کے اعتبار سے یہودی یا مجوسی تھا کم ہمت عباسی بادشاہوں کی ایجاد ہے، جن کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ فاطمیوں سے کیونکر اپنی گلو خلاصی کرائیں۔ فاطمیوں کی حکومت لگاتار ۲۷۰ برس تک قائم رہی اور انھوں نے عباسیوں کو افریقہ، مصر، شام، دیار بکر، مکۂ طیبہ اور مدینۂ منورہ اور یمن سے محروم کر دیا۔ اور تو اور، خود بغداد میں چالیس ہفتوں تک اُن کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ عباسی فوجیں اُن کے سامنے بے دست و پا تھیں۔ اس لیے لوگوں کے دلوں میں فاطمیوں سے برگشتگی پیدا کرنے کی خاطر عباسیوں نے فاطمیوں پر اُن کے حسب و نسب کے بارے میں بہتان باندھے۔ جو عباسی حکام اور امراء فاطمیوں کے مقابلے سے عاجز آ گئے تھے، اُنھوں نے بخوشی ان جھوٹی کہانیوں کو آلۂ انتقام بنایا۔ جن قاضیوں نے قادر باللہ کے بُلائے ہوئے علماء کے فتوے کی تصدیق کی۔ انھوں نے یہ محض خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں اور سُنی سنائی باتوں کی بنا پر کیا۔ چنانچہ اس وقت سے اب تک مؤرخین اندھا دُھند اور بے سوچے سمجھے عباسیوں کے ایجاد کئے ہوئے افترا کو دُہراتے چلے آتے ہیں۔" مقریزی ایک ایسا عمیق النظر مؤرخ اور ممتاز عالم قانون ہے جو تمام علمائے مشرق میں اونچا پایۂ شہرت رکھتا ہے[1]۔ اس کے اس بیان سے صریح تر اور کیا ہو سکتا ہے۔؟

فاطمیوں کے عقائد کو بھی اسی طرح مسخ کیا گیا ہوگا۔ پھر بھی اس میں کچھ شک نہیں کہ انھوں

---

[1] مقریزی کا انتقال ۸۴۵ھ میں ہوا۔ جمال الدین ابوالمحاسن یوسف بن طغری بردی اپنی کتاب "النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ" میں مقریزی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔
توفی الشیخ الامام العالم المحدث المتقن عمدۃ المؤرخین ورأس المحدثین تقی الدین احمد بن علی بن عبدالقادر بن محمد بن ابراہیم بن محمد بن تمیم بن عبدالصمد البعلبکی الاصل المصری المولد۔

نے عبداللہ ابن میمون المعروف بہ قدّاح کے سرّی عقائد بڑی حد تک اپنا لیے تھے اور اس نے خفیہ داعیوں کا جو طریقہ رائج کیا تھا اُسے سیاسی تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔

دنیوی اقتدار کی ہوس سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اس کا کچھ اندازہ ہمیں تاریخ عیسائیت کے چند واقعات سے ہوتا ہے، مثلاً عالم عیسائیت کی سربراہی کے لیے پوپ اور شہنشاہ کی طویل کش مکش، سی سالہ جنگ جس نے انسانوں پر جگر خراش مصیبتیں نازل کیں اور فرانس کے پروٹسٹنٹ ہیوگناٹوں (Huguenots) پر جو مظالم توڑے گئے محض مذہبی تعصّب کی بناء پر ہی نہیں بلکہ خاندانی اقتدار طلبی کی وجہ سے بھی۔ یہی تاریخ اسلام میں ہوا۔ عبّاسیوں نے پہلے اُمویوں سے اور بعد میں مصری فاطمیوں سے جو جنگ آزمائی برسوں تک جاری رکھی اُس سے بڑے آفت انگیز نتائج رونما ہوئے۔

جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت عجمی سلطنت کے مشرقی صوبوں میں گوناگوں یارانِ طریقت جمع تھے۔ وہاں نہ صرف زردشتی مجوسی تھے، جو اسلام کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے آگے دوڑ رہے تھے، بلکہ ہندوستان کے بہت سے وھرموں کے نمائندے بھی تھے، جو اپنے ساتھ آواگون، وشنو کے اوتار، کرشن کے آکاش سے اُتر کر آنے اور اپنی گوپیوں کے ساتھ پریم کی لیلا سے جی بہلانے کے عقیدے اور قصّے بھی لے کر آئے تھے۔ وہ انقلابی خیالات اور بدعتیں جنھوں نے آخری ساسانی بادشاہوں کے عہد میں معبدوں اور شاہی محلوں کی بُنیادیں ہلادی تھیں اور جن کی بیخ کنی کی کسریٰ انوشیرواں نے زورِ شمشیر سے کوشش کی تھی ابھی تک موجود تھیں۔ کم از کم اُن میں اتنا دم خم باقی تھا کہ رُوپ بدل کر نئے سرے سے اسلامی بھیس میں نمودار ہو جائیں۔

راوندی، ہندی مجوسیوں کا ایک فرقہ جو تناسخ ارواح کا معتقد تھا، اور سفید جامگاں[1] جن کی بُنیاد حاکم بن ہاشم مقنّع[2] نے رکھی، ان دونوں فرقوں نے خراسان میں شورش برپا کر دی۔ مقنّع تعلیم

---

[1] یہ نام انھیں اس لیے دیا گیا کہ یورپ کے ٹیبوریوں (Taborides) کی طرح وہ سفید لباس پہنتے تھے۔

[2] یہ وہی جعلساز ہے جسے مُور (Mooré) نے خراسان (باقی حاشیہ صفحہ ۴۹۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

دیتا تھا کہ خدا نے انسان کی شکل اختیار کر لی تھی، کیونکہ اس نے فرشتوں کو آدمؑ کی پرستش کا حکم دیا تھا، چنانچہ اس وقت سے فطرتِ الٰہی یکے بعد دیگرے نبیوں میں حلول کرتی رہی تھی اور اِس وقت اس کی شخصیت میں مجسّم تھی[1]۔

اسی زمانے میں مزدکیت نے، جس نے اڑھائی صدیاں پہلے قلمروِ خسرواں میں آگ لگا دی تھی اور جسے نوشیروانِ اعظم نے پاؤں تلے روند دیا تھا، خلیفوں کے ماتحت دوبارہ سر اُٹھایا۔ اس سانپ کا سر نہیں کچلا گیا تھا بابکِ خرّمی اپنے پیش رو مزدک کی طرح عدمیت و انکاریت کی تبلیغ کرتا تھا، مثلاً یہ کہ عورتیں اور مال و جائیداد سب سماج کی مشترکہ ملکیت ہیں، اور یہ کہ انسانی اعمال میں نہ کوئی خیر کا پہلو ہے اور نہ کوئی شر کا پہلو۔ بیس سال تک اس نے خلافت کے سارے علاقے میں بربادی و غارت گری پھیلائے رکھی۔ بالآخر معتصم باللہ کے زمانے میں وہ شکست کھا کر گرفتار ہوا اور خلیفہ کی موجودگی میں قتل کر دیا گیا۔ یہ اُسی پرانی داستان کی تکرار تھی۔ اسلام کو اُنہی آزمائشوں میں سے گزرنا تھا جن میں سے عیسائیت گزر چکی تھی۔ پہلی صدی کے آغاز سے لے کر نویں صدی کے اختتام تک عیسائیت پُرانے مذہبوں سے برسرِپیکار رہی، جو نئے رُوپ دھار کر اُن تمام ملکوں میں رُونما ہو رہے تھے جنھوں نے عیسائیت کو قبول کر لیا تھا۔ اس جنگ و جدل کے بعد عیسائیت پر افسردگی چھا گئی۔ تقلید پرستی نے نہ صرف انقلاب پسند مونتانیوں (Montanists) اور مانوی پالیوں Manichaean (Paulicians) کو بلکہ عقلیت پسند ایریئنوں (Arians) کو بھی پامال

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۹) کے نقاب پوش پیغمبر کے نام سے شہرت دی ہے۔ اُسے مقنّع اس لیے کہا جاتا تھا کہ یا تو اپنی بدصورتی کو چھپانے یا اپنے پیروؤں کو مرعوب کرنے کی خاطر وہ ہر وقت منہ پر نقاب ڈالے رہتا تھا۔ اُسے "سازندۂ ماہ" بھی کہتے تھے، کیونکہ ایک مرتبہ اُس نے نخشب میں سیماب کے ذرّوں سے ایک ایسی چیز بنا کر لوگوں کو دکھائی تھی، جو چاند کی سی معلوم ہوتی تھی۔

[1] ابنِ خلدون۔ کتاب العبر (مصری ایڈیشن) جلد سوم۔ صفحہ ۲۰۶۔

کر ڈالا تھا۔ چنانچہ ریفارمیشن (Reformation) کے زمانے تک کلیسائیت اور تقلید پرستی نے ذہنِ انسانی کو غلامی کے بندھنوں میں جکڑے رکھا۔ اسلام کو بھی ایسے ہی امتحانوں میں سے گزرنا پڑا۔ لیکن اس کی ریفارمیشن کا آغاز حال ہی میں ہوا ہے۔

اسلام نے اپنے متبعین سے صرف یہ تقاضا کیا کہ وہ ایک ابدی صداقت کا زبانی اقرار کریں اور چند اخلاقی فرائض پورے کریں۔ باقی سب معاملات میں اس نے پوری آزادی فیصلہ دی۔ اس نے وحدت اللہ کے نام پر تمام مذہبوں اور فرقوں کو جمہوری مساوات کی پیشکش کی۔ نتیجۃً ہر مذہب کے ستم رسیدہ بدعتی علمِ محمدی کے نیچے آکر جمع ہوگئے، جو ان کے لیے پروہتوں کی غلامی سے چھٹکارے کا ضامن تھا۔ اوستائی اہلِ کتاب، آزاد خیال زردشتیوں، مانویوں، عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں سب نے اس نئے نظام کا خیر مقدم کیا، جو ان کے مذہبی وحدت کے خواب کی تعبیر تھا۔ غناسطی فرقوں کے وہ دَل جنھوں نے دوسری صدی سے لیکر تیسری صدی تک عیسوی کلیسا کو پریشان کر رکھا تھا یا تو دینِ محمدیؐ میں مدغم ہوگئے تھے یا خلفاء کی رواداری کے سایۂ عافیت میں تقلید پسند یونانیوں اور کیتھولکوں کی دخل اندازیوں سے مصئون، امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اوّل الذکر نے دینِ محمدیؐ کو قبول تو کر لیا تھا لیکن اپنے قدیم عقائد کو بھی برقرار رکھا تھا۔ اسی امتزاج نے اسلام کے اُن رُوح پرست (Docetic)[1] فرقوں کو جنم دیا جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

کسی قوم کی جبلّی خصوصیات، جس آب و ہوا میں وہ زندگی بسر کرتی ہے، اُس کے ماحول کے طبعی نقش و نگار، قدیم تر مذاہب کے اثرات، یہ سب چیزیں مل ملا کر اس کے مذہب اور عقائد کو رنگ رُوپ بخشتی ہیں۔ کیا عیسائیت اور کیا اسلام، دونوں میں یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایران نے غناسطیت کو جنم دیا۔ ایران ہی سے وہ رُوح پرستانہ تصورات اُٹھے جو رُومی دنیا میں سرایت کر گئے اور جنھوں نے یہودی الاصل عیسائیوں کے ابتدائی

---

[1] عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا جسم انسانی نہیں تھا بلکہ کسی آسمانی جوہر سے مرکب تھا، یعنی خالصۃً رُوح تھا۔

عقائد پر ایک ایسے خدا کے تصور کا رنگ چڑھا دیا جو دنیا کے لوگوں سے آئے دن کا میل جول رکھتا تھا۔ توہمات اور فلسفے کا وہ عجیب و غریب مرکب جسے ماتویت کہتے ہیں اور جس سے عیسائیت نے کسی اعتراف کے بغیر اتنا کچھ مستعار لیا ہے۔ زردشتیوں اور عیسائیوں کے جبر و تشدد کے باوجود ابھی تک جوں کا توں قائم تھا۔ ایک عجیب الخلقت صاحب فطانت کی یہ تخلیق، ایک قوم کی فطری خصوصیات کی یہ پیداوار غالباً کبھی بھی فنا نہ ہوگی۔ علمائے دینیات اس کے قلع قمع کی لاکھ کوشش کریں وہ اسے کبھی نیست و نابود نہ کر سکیں گے۔ سُنی مذہب کی افسردہ طبعی ایران کی آب و ہوا کے زیرِ اثر ایک رنگین خیال فلسفے میں تبدیل ہو گئی۔ حضرت علیؓ کی شخصیت نے مازیت کے تخیل کو اُکسا دیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کی طرح وہ بھی لوگوں کے تصور میں ایک سماوی جوہر بن گئی۔ انسان کو خدا بنانے کا یہ عمل حضرت علیؓ تک ہی محدود نہ تھا۔ اُن کے جانشینوں کو بھی خُدائی کا درجہ دے دیا گیا۔ چنانچہ سُنی مسلک کی طرح شیعہ مسلک کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو وہ سیدھا سادہ اور خالص تشیع ہے جو پیغمبرِ اسلامؐ کے ابتدائی جانشینوں کا مسلک تھا اور جس سے ہم تھوڑی دیر بعد بحث کریں گے۔ دوسرا وہ روح پرستانہ تشیع ہے جو توہمات کا ایک مجموعہ ہے اور جن لوگوں میں وہ پھیلا اُن کے قدیم عقائد کے زیرِ اثر اصلی تشیع کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ پھر انتہا پسندانہ تشیع رُوح پرستانہ تشیع سے اُتنا ہی مختلف ہے جتنا انتہا پسندانہ سُنی مسلک یا نواصبیت رُوح پرستانہ سُنی مسلک سے۔ تنگ نظرانہ خود پسندی کسی ایک دین یا مذہب ہی کی خصوصیت نہیں، اور اتھینیسیس کا مسلک (The Athanasian Creed) دوسرے مسلکوں کو جو خوف دلاتا ہے کہ اُن پر خدا کی برقِ غضب گرے گی وہ عیسائیت تک ہی محدود نہیں۔ اسلام کے فرقے بھی (باستثنائے معدودے چند) ایک دوسرے کو قہرِ الٰہی کے سپرد کرتے ہیں، ہمیشہ کے لیے تو نہیں (جیسا کہ اکثر عیسائی کرتے ہیں)، لیکن پھر بھی اتنی مدت کے

---

[1] عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کا جسم انسانی نہیں تھا بلکہ کسی آسمانی جوہر سے مرکب تھا، یعنی خالصتہً رُوح تھا۔

لیے ضرور کر اُن پر اختلافِ عقیدہ کی خرابیاں پوری طرح واضح ہو جائیں۔ بہر حال نارِ جہنم کی اُن دھمکیوں کے باوجود جو مختلف فرقے ایک دوسرے کو دیتے ہیں، کسی فلسفی مزاج طالبِ علم کی نظر سے اسلام کی عالمگیر وسیع المشربی مخفی نہیں رہ سکتی۔

ساتویں صدی کے وسط کے لگ بھگ کونسٹینٹین سیلوانس Constantine Syluanus نے تابعینِ پال کے مانوی فرقے کی داغ بیل ڈالی۔ تابعینِ پال مانوی کے لقب کو رد کرتے ہیں، لیکن اُن کے عقائد اُن عقائد سے جن کی تعلیم مانی نے دی قریب کی مشابہت رکھتے ہیں اور ملنز (Milner) کے سوا سب عیسائی مصنفین یہی کہتے ہیں کہ وہ مانویت سے ماخوذ ہیں۔ تابعینِ پال یورپ کے اصلاح یافتہ کلیساؤں کے حقیقی موجد تھے۔ انھیں بت پرستی اور تبرک پرستی سے جو نفرت تھی وہ غالباً اسلامی اثرات کا نتیجہ تھی۔ مریم پرستی، اولیاء پرستی اور مرئی چیزوں کو معبود بنانے سے وہ جو پرہیز کرتے تھے اس میں وہ مسلمانوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ لیکن مانی کی طرح ان کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ ایک رُوحِ محض تھے جو اپنی زندگی میں صرف ظاہری طور پر جسم سے مشابہ تھی اور اُن کی صلیب کشی محض ایک فریبِ نظر تھی۔ اُن کے نزدیک مادہ قدیم اور ابدی ہے، اور ایک ایسے وجودِ فاعل کا مبداء ہے جس نے یہ مرئی دنیا پیدا کی اور جو اُس وقت تک اپنی دنیوی حکومت کو قائم رکھے گا جب تک بدی اور موت کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ عیسوی اناجیل کی تعبیر کے بارے میں وہ کنایہ و مجاز سے کام لیتے ہیں اور مانی کی طرح الفاظ کے مخفی معانی سے واقف ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں — وہ اس کو جائز قرار دیتے ہیں کہ مصلحتاً کسی دوسرے مذہب کا ظاہری اقرار کیا جائے، جو جدید ایران میں کتمان یا تقیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یونانی کلیسا اور بازنطینی دربار نے متبعینِ پال پر سخت جبر کیا اور تقریباً دو صدیوں تک وہ شمالی آرمینیا اور کیپڈوشیا میں بازنطین کے مذہبی دیوانوں اور مستبد حاکموں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے، جس میں طرفین نے ایک دوسرے پر ہیبت ناک مظالم کئے[1] بالآخر انھیں

---

[1] کہا جاتا ہے کہ مینوئل (Manuel) کی ماں (باقی حاشیہ صفحہ ۴۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

اپنے سے زبردست قوت کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے لیکن اگرچہ اس فرقے کے قلعے اور شہر مسمار کر دیئے گئے، پھر بھی وہ زندہ رہا۔ اس نے اپنے عقائد بلغاریوں کو منتقل کر دیئے، جنھیں تقلید پسند کلیساؤں نے ہمیشہ ناپسندی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایشیا میں ختم ہو جانے کے بعد متبعینِ پال تیرہویں صدی میں از سرِ نو جنوبی پروانس اور سیوائے میں نمودار ہوئے۔ یورپی تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ ان ملکوں میں اُن کا کیا حشر ہوا۔ انھیں تلوار اور آگ کے ذریعے تباہ کر دیا گیا، یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کی بھی جان بخشی نہ کی گئی۔ جو عورتیں اور بچے زندہ بچ گئے انھیں غلام بنا لیا گیا۔ اس کے باوجود پالیت کا خاتمہ نہ ہوا۔ اس نے انگلستان میں خروج کیا، جہاں اس کے پیرووں نے جنھیں لولرڈ (Lollards) کہتے تھے، وہی مصیبتیں سہیں جو ان کے پیشرووں نے ایشیا، سیوائے اور پروانس میں سہی تھیں۔ پھر وہ ہس (Huss) کے ماتحت بوہیمیا میں نمودار ہوئی، اور بالآخر لوتھر (Luther)، اور کیلون (Calvin) کے علم کے نیچے اپنے متعصب مخالفوں پر ظفریاب ہوئی۔ ہم نے اب تک اس فرقے کی سرگزشت اس لیے بیان کی ہے کہ اسی زمانے میں عالمِ اسلام کے اندر جو مذہبی و سیاسی تحریکیں برو‌ئے کار تھیں اُن پر اس نے اپنے اصلی وطن میں بہت نمایاں اثر مرتب کیا۔

اُس طوفانی دور میں، جب کائرو سیر پالی Chyroseir the Paulician نے بازنطینی قلمرو کے مشرقی حصوں میں تباہی مچا رکھی اور ایشیائے کوچک کے شہروں میں بربادی و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، فارس کے شہر اہواز میں ایک ایسا شخص رہتا تھا جو اپنی ہمہ دانی، اپنے کمالات کی ہمہ گیری اور اپنے تبحرِ علمی کے اعتبار سے مانی کا ہم رتبہ تھا اور جسے دینی تاریخ میں مانی کے برابر کا کردار ادا کرنا تھا۔ عبداللہ ابن میمون القداح کو اس کے دشمن مجوسی النسب کہتے ہیں اور اس کے معتقد اُسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۳) تھیوڈورا (Theodora) کے حکم سے ایک لاکھ متبعینِ پال تلوار، سولی اور آگ کی نذر کر دیئے گئے۔

حضرت علیؓ کے اخلاف میں شمار کرتے ہیں۔ حقیقت الامر چاہے کچھ بھی ہو، یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ محبانِ اہلِ بیت میں تھا۔ اس کی تعلیمات سے جو فتنہ انگیز نتائج بلاواسطہ یا بالواسطہ برآمد ہوئے ہیں اُن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ابن خلدون جیسے مؤرخوں کے لیے بھی اس شخص کو اور اُس کے عقائد کو بری از تعصب نگاہوں سے دیکھنا ناممکن تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ عبد اللہ ابن میمون اُنھی غدارانہ طریقوں سے جو اُس کے پیشروؤں نے عیسائیت کے خلاف استعمال کئے تھے قلمروِ اسلام کو زیر وزبر کرنے کا خواہشمند تھا۔ اُسے اس امر کا احساس تھا کہ جب تک لوگوں کا ضمیر اور سیاسی طاقت اسلام کی پشت پناہ ہیں اس وقت تک اُس سے کھلم کھلا جنگ ایک خطرناک مہم ہے۔ اس لیے اس نے مانی کی طرح خفیہ کارروائیوں کا تہیہ کیا۔ اس نے اپنے نظام کو رموز و اسرار کے پردے میں چھپا لیا اور مذہب کے مثبت اقتدار کو ختم کرنے کی خاطر فیثا غورثیوں (Pythagoreans) کی طرح اپنے پیروؤں کو سات درجوں میں تقسیم کیا۔ آخری درجے میں وہ لوگ تھے جو مذہب کو یکسر ناکارہ کہتے تھے اور انسانی اعمال کو خیر و شر سے بری سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک نہ دنیا میں اور نہ عقبیٰ میں اعمال کی کوئی جزا یا سزا تھی۔ اُس نے اپنے داعی مقرر کئے اور اُنھیں اطرافِ ملک میں بھیجا تاکہ مریدوں کو اس کے حلقے میں داخل کریں اور ہر ایک کی قابلیت کے مطابق اُسے کسی نہ کسی درجے کی تربیت دیں۔ ابنِ اسمٰعیل کے دعووں کو ان لوگوں نے سیاسی عذر کے طور پر استعمال کیا۔ وہ ظاہر میں تو اس کی خاطر کام کر رہے تھے، لیکن دراصل وہ خفیہ طور پر اپنے عقیدتی کے مبلغ تھے۔[1]

شہرستانی[2] نے اس فرقے کے ارکانِ عقیدہ کو زیادہ فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس محسن فانی نے دبستان میں اُن کی ایک قدرے خوش آئند تصویر پیش کی ہے جس کے نقش و نگار اُس نے فرقے کے افراد سے اخذ کئے ہیں۔ لیکن اگر دونوں کا بامعانِ نظر مطالعہ کیا جائے تو

---

[1] نویری۔ ژورنال ایشیاٹیک (Journal Asiatique) جلد اوّل صفحہ ۲۹۸

[2] شہرستانی حصہ اوّل، صفحہ ۲۹۰ –

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ عبد اللہ ابن میمون مادہ پرست بھی تھا اور خدا پرست بھی اور مانی کی طرح اُس کی یہ دلی آرزو تھی کہ ایک ایسا طبیعی مذہب ایجاد کرے جس میں مختلف مذہبوں کی اچھی باتیں جمع ہوں اور جو فلسفے اور اثباتی دین کے باہمی تضاد کو مٹا دے۔ اس کے پیرووں کے جو مدارج تھے وہ صوفیوں کے مقامات سے مماثل تھے۔ میر خوند اس کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مصری فاطمیوں نے اپنے صوفیانہ عقائد زیادہ تر عبد اللہ ابن میمون سے اخذ کیے[1]۔

عبد اللہ اہواز سے بصرہ گیا اور وہاں سے ملکِ شام میں، جہاں اُس نے سالمیہ کے مقام پر سکونت اختیار کر لی۔ سیر و سفر کے دوران میں اُسے تابعینِ پال سے واسطہ پڑا اور اُن سے اُس نے بہت سے عقائد اکتساب کیے۔ تابعینِ پال نے باز نطینیوں سے جو سیادلہ مدتوں تک جاری رکھا اور اُنھیں اپنی تبلیغی کوششوں میں آخر الامر جو کامیابی ہوئی اسی کی بنا پر اس نے چنانچہ یہی منصوبہ تیار کیا۔ اس نے اپنے نظریوں کو کسی حد تک مانی اور کسی حد تک مسلم صوفیوں کی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالا۔ مانویت خود بنیادی طور پر ہمہ اوست کی ایک شکل تھی، جس کے نقوش فیثاغورسی فلسفے، زرتشتیت اور عیسائیت سے مستعار لیے گئے تھے۔ عبد اللہ کے پیرووں کو اس بنا پر کہ وہ اثباتی دین کے احکام کے اندرونی معانی سے آگاہ ہونے کا دعوے کرتے ہیں باطنیہ کا نام دیا گیا ہے۔ یہی دعوے مانویوں اور پالیوں نے کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابن میمون نے مادے کو غیر فانی کہا۔ مزید بریں اس نے یہ اعلان کیا کہ "خدا اپنے شہود سے علیحدہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس کے بارے میں وثوق سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود ہے یا غیر موجود، عالمِ کُل ہے یا نہیں، کیونکہ اس کے بارے

---

[1] مصری فاطمی عام اسمٰعیلیوں سے ایک بات میں مختلف تھے۔ عام اسمٰعیلیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے آخری امام حضرت اسمٰعیل پردۂ غیب میں چھپ گئے تھے اور اُن کا ظہور دوبارہ اس وقت ہو گا جب آسمانی بادشاہت جلوہ نما ہو گی۔ اس کے برخلاف مصری فاطمی یہ کہتے تھے کہ امام اسمٰعیل عبید اللہ المہدی اور اُن کے جانشینوں کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے۔

میں کوئی ایسی بات کہنا یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وہ اپنی مخلوقات سے مشابہت رکھتا ہے۔ علّت العلل نے ایک امرِ واحد سے یعنی محض ایک عملِ ارادی سے ایک ایسا اصولِ اوّل پیدا کیا جو ازل سے بطون میں مضمر تھا اور جس کا نام عقل ہے، اور اس اصولِ اوّل نے ایک اصولِ ثانوی پیدا کیا جسے نفس کہتے ہیں اور جو پہلے اصول سے وہی رشتہ رکھتا ہے جو بیٹے کا باپ سے ہوتا ہے۔ اس اصول کی لازمی صفت زندگی ہے اُسی طرح کہ جس طرح عقل کی لازمی صفت علم ہے۔ دوسرے اصول نے پہلے تو قدیم الوجود مادّے کو شکل بخشی جس کی لازمی صفت انفعالیت ہے اور اس کے بعد زمان و مکان، عناصرِ اربعہ، ثوابت و سیارا اور تمام اشیائے کائنات کو پیدا کیا۔ چونکہ اصولِ ثانی کے اندر اس بات کی ایک لامتناہی خواہش ہے کہ پہلے کون اصول کی سطح پر پہنچے، اس لیے اُس نے اپنے آپ کو انسان کی شکل میں ہویدا کیا۔ تمام انسانی نفوس یا رُوحوں کا مقصد یہی ہے کہ اصولِ خلّاق یعنی عقل کی طرف صعود کریں۔ انبیاء اس اصولِ خلّاق کے مجسّمے یا مظاہر ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کو مادّے سے مجاہدہ کرنے میں مدد دیں۔ اس لیے انبیاء کو ناطق کہا جاتا ہے۔ انبیاء ستیاروں کی طرح تعداد میں سات ہیں۔ دنیا ایک سلسلۂ ادوار میں سے گزر رہی ہے اور آخری دور میں قیامتِ کبریٰ واقع ہو گی، جب اثباتی دین اور قانون کے احکام منسوخ ہو جائیں گے؛ کیونکہ گردشِ افلاک اور احکامِ دین کی تعمیل محض اس لیے ہے کہ رُوح کو کمال حاصل ہو، اور رُوح کا کمال اس میں ہے کہ عقل کا درجہ حاصل کرے اور واقعتہً اس میں ضم یا مدغم ہو جائے۔ قیامتِ کبریٰ میں سب چیزیں، کیا آسمان، کیا عناصر، کیا ذی حیات مخلوقات تحلیل ہو کر رہ جائیں گی، زمین بدل جائے گی، آسمانوں کے طبق ایک کتاب کے اوراق کی طرح بند ہو جائیں گے، نیکی بدی سے علیحدہ ہو جائے گی، فرمانبردار بندے نافرمانبرداروں سے جدا ہو جائیں گے، حق نفسِ کُل میں اور باطل اپنے منبع یعنی شیطان میں ضم ہو جائے گا۔" چنانچہ یوں (عبداللہ ابن میمون کے عقیدے کے مطابق) حرکت کے آغاز سے لے کر اُس کے اختتام تک پہلا مرحلہ (یعنی مبداء) ہے اور حرکت یا عمل کے اختتام سے لے کر کمال کا درجہ ہے[1]۔ اور تمام احکامِ دین و قانون کے لیے پیمانے ہیں جن

---

[1] کما تحرکت الافلاک بتحریکات النفس والعقل والطبائع (باقی حاشیہ ۴۹۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

سے وہ ناپے جا سکتے ہیں۔"........ "ہر حرف اور لفظ کے دو معانی ہوتے ہیں کیونکہ ہر تنزیل کی تاویل ہوتی ہے اور ہر مرئی چیز کا ایک مثنیٰ عالمِ غیب میں ہوتا ہے۔ حق کا علم عقل سے نہیں بلکہ رُشد و ہدایت سے حاصل ہوتا ہے۔" عبداللہ ابن میمون کے شاگردوں نے اس کے نظریوں پر یہ اضافہ کیا کہ قیامت کے معنی ہیں امام کا ظہور اور ایک آسمانی سلطنت کا قیام جس میں تمام شرعی تکالیف رفع ہو جائیں گی۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب میں ریاکاری مباح ہے، تمام احکامِ قرآنی کے ایک مخفی معنی ہیں، تدین سنونِ ظاہری کی پابندی پر نہیں بلکہ باطنی جذبات و احساسات پر مشتمل ہے۔ ہر وہ چیز جو مضر نہیں جائز ہے، روزہ داری امام کے راز کو محفوظ رکھنے کے سوا کچھ نہیں۔ زناکاری کی جو ممانعت ہے اس میں یہ معنی مضمر ہیں کہ مرید کو اپنے مذہب کے اسرار فاش نہ کرنے چاہئیں۔ زکوٰۃ کا مطلب ہے امام معصوم کو اپنی آمدنی کا عشر دینا۔ یہ نظامِ عقائد بہت سے مذاہب اور فلسفوں کی عجیب و غریب معجون ہے اور اس کے اثرات قانون اور اخلاق کے نقیض ہیں۔

عبداللہ ابن میمون نے شام میں مستقل سکونت اختیار کی جو عیسوی غناسطیت کا مرزبوم تھا۔ وہاں اس نے اپنے نظریوں کے خاکے میں اور رنگ بھرے اور حمدان کو اپنا ہم عقیدہ بنایا، جو قرمط کے نام سے اسلام کی تاریخ میں رُسوا ہے۔

لوگوں کو مرید بنانے کا جو طریقہ عبداللہ ابن میمون کے شاگردوں نے اختیار کیا وہ وہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۷) کذلک تحرکت النفوس والاشخاص بالشرائع بتحریک النبی والوصی فی کل زمان واسبوا علی سبعۃ سبعۃ حتی ینتھی الی الدور الاخیر ویدخل زمان القیامۃ وترتفع التکالیف وتضمحل السنن والشرائع۔ وانما ھذہ الحرکات الفلکیۃ والسنن الشرعیۃ لتبلغ النفس الی حال کمالھا وکمالھا بلوغھا۔ الی درجۃ العقل واتحادھا بہ ووصولھا الی مرتبتہ فعلاً وذلک ھو القیامۃ الکبری فتنحل تراکیب الافلاک والعناصر والمرکبات وینشق السماء وتتناثر الکوکب وتبدل الارض غیر الارض وتطوی السماوات کطی السجل للکتاب المرقوم فیہ ویحاسب الخلق ویتمیز الخیر عن الشر والمطیع عن العاصی ویتصل جزئیات الحق بالنفس الکل وجزئیات الباطل بالشیطان المبطل۔

پرانا ماتوی طریقہ تھا، یعنی مبتدی کو شر انگیز سوالوں اور مبہم جوابوں سے شک و تذبذب کے سمندر میں غوطے دینا۔ محسن فانی کو جس داعی نے مطلع کیا اس کے کہنے کے مطابق اس عمل کا مقصد بُرا نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف یہ کہ " جویائے حق و حکمت کو منزلِ کمال تک پہنچا یا جائے[1]" مختلف اشخاص کے مذہبی نقطۂ نگاہ کے مطابق اس عمل میں جزئی تبدیلیاں کی جاتی تھیں۔ داعی شروع شروع میں تو مُرید کے عقائد کو کسی اعتراض کے بغیر تسلیم کر لیتا تھا، لیکن اس کے بعد اس کے دل میں شکوک و شبہات ڈال کر رفتہ رفتہ اس کے دماغ کو مذبذب کر دیتا تھا اور بالآخر اُسے تمام مسائل کا حل باطنی عقائد کی صورت میں سمجھاتا تھا۔ مثلاً اگر داعی کو کسی شیعہ کا مُرید بنانا منظور ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اہلِ بیت کے ایک شیدائی کے رُوپ میں پیش کرتا۔ اُن پر جو مظالم توڑے گئے، اُن سے جو ناانصافیاں کی گئیں، امام حسینؑ کی شہادت، مقتلِ کربلا کے واقعات، وہ اُن سب کی داستان دُہراتا۔ اس طرح زمین تیار کر کے وہ اپنے متعلم کے ذہن میں باطنیہ کے مخفی عقائد کا بیج بو دیتا۔ اگر داعی کو کسی یہودی سے سابقہ پڑتا، تو وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذمت کرتا اور اپنے متعلم سے مسیحائے موعود کے مسئلے پر اتفاق کر کے بتدریج اُسے اس بات کا یقین دلاتا کہ یہ مسیحائے موعود امام اسمٰعیل کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر اس کا مقصد کسی عیسائی کو اپنے فرقے میں داخل کرنا ہوتا تو وہ یہودیوں کی ہٹ دھرمی اور مسلمانوں کی جہالت پر لمبی چوڑی تقریریں کرتا اور دینِ عیسوی کے تمام ایمانیات کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ اشارہ کرتا کہ وہ محض مجازی ہیں اور اُن کے عمیق تر معانی تک رسائی صرف باطنی نظام کے وسیلے سے ممکن ہے۔ مبتدی کو اس طرح شیشے میں اتار نے کے بعد وہ اُسے یہ سمجھاتا کہ عیسائیوں نے فارقلیط کے نظریے کا مطلب غلط سمجھا ہے اور حقیقی فارقلیط اسمٰعیلی امام ہے[2]۔ عبد اللہ ابن میمون نے تقیہ کا مطلب بھی متعین کیا، یعنی کسی غیر مذہب کے عقائد و سُنن کی ظاہری پابندی۔ یہ نظریہ تمام ماتوی فرقوں میں رائج رہا تھا اور تابعینِ بابل بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ عبد اللہ ابن میمون نے اسے دو مقاصد

---

[1] دبستان۔ صفحہ ۲۵۶

[2] مانی خود فارقلیط ہونے کا مدعی تھا۔

کو پیش نظر رکھ کر از سرِ نو رائج کیا : ایک تو مذہبی تشدد سے بچنے کی خاطر اور دوسرے لوگوں کو باطنیہ فرقے میں داخل کرنے کے کام کو آسان بنانے کی خاطر۔ تقیہ زبردستوں کے خلاف کمزوروں کا قدرتی دفاعی حربہ ہے۔ ہر شخص میں شہید بننے کی ہمت نہیں ہوتی، چنانچہ اکثر لوگ جب مقابلے سے عاجز آجاتے ہیں تو اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ ابتدائی عیسائیوں کو تقیہ پر کاربند ہونا پڑا۔ جہاں تک باطنیوں کا تعلق ہے اُن کے لیے تو خاص طور پر ضروری تھا کہ عباسی خلافت کے زیرِ نگیں تمام ملکوں میں اپنے اصلی عقائد کو چھپائیں۔ چنانچہ یہ پرانی عادت ہوتے ہوتے فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ اُن سے شیعوں نے تقیہ کا قاعدہ سیکھا۔ جب تک ایران اور ترکیہ میں دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہوئے کوئی شیعہ سُنّی رسوم کی پابندی کے بغیر حج کرنے کا مجاز نہ تھا۔ چنانچہ جو شیعہ مقدس مقامات کی زیارت کا خواہشمند ہوتا اس کے لیے تقیہ ایک امرِ مجبوری تھا۔ لیکن تقیہ، جو جبر و تشدد اور خوف کی قدرتی پیداوار ہے، ایرانیوں کی طبیعت میں اس طرح رچ گیا ہے کہ وہ ایسے حالات میں بھی اس پر عمل کرتے ہیں جن میں اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عموماً وہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے احساسات و جذبات کو صدمہ نہ پہنچانے کی خاطر اس پر عمل کرتے ہیں، بالکل اُسی طرح جس طرح آج کل کے پروٹسٹنٹ کیتھولک ملکوں میں رُومی رسوم کا ظاہری احترام کرتے ہیں۔

حمدان نے (جس کا دوسرا نام، جیسا کہ ہم اُوپر کہہ آئے ہیں، قرمط تھا) اپنے پیرو مُرشد سے علیحدہ ہو کر اپنا ایک نیا فرقہ قائم کیا۔ عبداللہ ابن میمون نے تبلیغی کام میں جبر اور قوت کے استعمال کو پسند نہ کیا تھا۔ قرمط نے اُسے اپنے فرقے کا بنیادی رُکن بنایا۔ ممکن ہے کہ کاتروسیر کی طرح وہ بھی متعصب لوگوں کی زیادتیوں کے ہاتھوں ایسا کرنے پر مجبور ہُوا۔ اس نے العشا اور البحرین میں بغاوت کھڑی کی۔ خلیفہ کی فوجوں کی کمزوری کی بدولت اُسے فتح نصیب ہوئی۔ اس پر وہ اپنے پیروؤں کی ایک کثیر تعداد جمع کر کے البحرین سے نکل کھڑا ہُوا اور کاتروسیر کی طرح قتل و غارت کرتا ہُوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ قرمطیوں کے البحرین اور العشا میں جو قلعے تھے اُن میں قلعہ بند ہو کر اُنھوں نے ایک صدی تک خلفائے بغداد کے ساتھ ایک خونیں جنگ جاری رکھی۔ اور مقامات کا تو ذکر ہی کیا، اُنھوں نے مکّہ کو بھی تاخت و تاراج کیا اور عہدِ ابراہیمی کی

یادگار سنگِ اسود کو بھی اُٹھا کر لے گئے۔ یہ بے ادبی اُنھوں نے اپنے ہم مشرب پالیوں (Paulicians) کی تقلید میں کی جنھوں نے الفیسس میں لوٹ مار مچائی تھی، یوحنا ولی کے مزار کو مسمار کر دیا تھا اور اُن کے گرجا کو گھوڑوں اور گدھوں کا اصطبل بنا دیا تھا۔ آخر کار خلیفہ معتضد باللہ نے قرامطہ کا قلع قمع کیا۔

قرامطہ کی بیخ کنی کے بعد اسمٰعیلیت حکماً ممنوع ہو گئی اور اس کے نام لیوا چُن چُن کر مارے گئے۔ جب تک عبید اللہ المہدی نے افریقہ کو عباسیوں سے فتح نہ کیا اُس وقت تک اسمٰعیلی فرقہ جہاں جہاں بھی تھا رُوپوش رہا۔

فاطمیانِ مصر علم و ادب اور سائنس کے بڑے سرپرست تھے لیکن اپنی رعایا میں اشاعتِ علم کے ساتھ ساتھ وہ اُن سیاسی فوائد سے بھی غافل نہ رہے جو اُنھیں عبد اللہ ابن میمون کی شروع کی ہوئی تبلیغ سے پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے مقاصد کی خاطر اس کے باطنی اور رمازی عقائد کو کسی حد تک اپنا لیا۔ اُنھوں نے کالج، کتب خانے اور دار الحکمت (سائنس کے دار العلوم) قائم کئے، اُنھیں فیاضانہ پیمانے پر کتابیں اور آلاتِ ریاضی مہیا کئے اور کثیر التعداد معلّم اُن میں درس دینے کے لیے مقرر کئے۔ کتب خانوں میں جو نادر علمی و ادبی کتابیں تھیں اُن تک ہر خاص و عام کی رسائی تھی اور ہر کوئی کاغذ قلم دوات مفت استعمال کر سکتا تھا۔[1] خلیفہ آئے دن مجالسِ مباحثہ منعقد کرتا تھا، جن میں اُن درس گاہوں کے مختلف شعبوں کے معلّم، منطقی، ریاضیات دان، مقنّن، طبیب، خلعتیں پہنے ہوئے شامل ہوتے تھے۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں آج تک جو گون پہنے جاتے ہیں اُن میں عربی خلعت یا کفتان کی وضع قطع باقی ہے۔

معلّموں اور دوسرے منصب داروں کی تنخواہ کے لیے، درس و تدریس کے لوازم کے لیے اور سائنسی تعلیم کے آلات اور نمونوں کے لیے ان اداروں کو دو لاکھ ستاون ہزار طلائی سکّے سالانہ عطا ہوتے تھے، جو نہایت احتیاط سے لگائے ہوئے محاصل کے ذریعے جمع کئے

---

[1] مقریزی Chrestomathie Arabe (De Sacy), vol. I, p.158

جاتے تھے۔ ان اداروں میں علمِ انسانی کے تمام شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مرکزی دارالحکمت کے ساتھ ایک بہت بڑی جلسہ گاہ ملحق تھی، جس میں اسمٰعیلی مسلک کے باطنی نظریوں کے طالبانِ علم کو ارکانِ عقیدہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہفتے میں دو بار یعنی پیر اور بدھ کے دن داعی الدّعاۃ مجلسیں منعقد کرتا تھا، جن میں مرد اور عورتیں سفید لباس پہنے ہوئے اور علیحدہ علیحدہ بیٹھے ہوئے شرکت کرتے تھے۔ ان مجلسوں کو مجالس الحکمۃ کہتے تھے۔ رسمِ داخلہ سے پہلے داعی الدّعاۃ خلیفہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اُسے وہ خطبہ سناتا تھا جو اس نے مبتدیوں کے سامنے پڑھنے کے لیے لکھا ہوتا۔ خلیفہ خطبہ سُننے کے بعد مسودے کے لفافے پر اپنے دستخط کرتا۔[۱] خطبے کے بعد شاگرد داعی الدّعاۃ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور دستخطِ شاہی کو پیشانی سے لگاتے۔

اس جلسہ گاہ میں محرمی کے مختلف مدارج کی جو کیفیت مقریزی نے بیان کی ہے وہ فری میسنری کی ایک بیش بہا رُوداد ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قاہرہ کی جلسہ گاہ اُن تمام لوجوں (Lodges) کا نمونہ بنی جو بعد میں عیسائی ممالک میں قائم کی گئیں۔ عبداللہ ابن میمون نے محرمی کے سات درجے مقرر کیے تھے، وہ اس لیے کہ سات ایک مقدس عدد تھا: سیّارے سات تھے، ہفتے میں سات دن تھے اور اماموں کی تعداد سات تھی۔ قاہرہ میں یہ ہُوا کہ مصرِ قدیم میں جو قاعدہ تھا کہ مندر کا سب سے بڑا پُجاری لوگوں کو مذہب کے اسرار بتاتا تھا وہ ماتری رسوم پر عائد ہو گیا چنانچہ وہاں درجوں کی تعداد نو ہو گئی۔[۲] سب سے مشکل درجہ پہلا درجہ تھا اور اس میں مبتدی کے ذہن

---

۱ مقریزی

۲ محرمی کے مختلف مرحلوں کی ایک نہایت عمدہ رُوداد دُساسی (De Sacy) نے Journal Asiatique (جلد اوّل، صفحہ ۲۹۸) میں دی ہے۔ مبتدی کو پہلے درجے کا حلف اُٹھانے کی ترغیب دلانے کی خاطر اس کے دماغ کو شکوک و شبہات سے مذبذب کر دیا جاتا تھا۔ اثباتی مذہب اور عقل کے درمیان جو تضادات تھے انھیں بیان کیا جاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتایا جاتا تھا کہ ظاہری و لغوی مفہوم کے پسِ پردہ ایک زیادہ گہرا مطلب ہے۔ الفاظ محض چھلکے تھے اور مخفی مطلب اصل مغز تھا۔ لیکن جب تک مبتدی ایک غیر مشروط قسم نہ کھاتا (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

کو سانچے میں ڈھالنے اور اُسے باطنی نظریئے پر اندھا دُھند ایمان اور اس کی غیر مشروط اطاعت کی قسم اُٹھانے پر آمادہ کرنے کے لئے بڑی مدت درکار ہوتی تھی۔ اس کے بعد معاملہ سیدھا سادہ ہو جاتا تھا: نو مُرید سے رفتہ رفتہ سارے نظریئے تسلیم کرا لیے جاتے تھے اور اُسے فرقے کا بول بالا کرنے کے عزم کا آلۂ کار بننے پر آمادہ کر لیا جاتا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۲) اس وقت تک اُس کی یہ خواہش کہ اسے مخفی مطلب سمجھایا جائے پوری نہ کی جاتی تھی۔ جب وہ غیر مشروط قسم کھا لیتا تھا تو اُسے دوسرے درجے میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ اس درجے میں اُسے یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے اماموں پر ایمان لائے، جو ہر قسم کے علم کا منبع تھے۔ جب اُس کا ایمان اُن اماموں پر پختہ ہو جاتا تو تیسرے درجے کی تعلیم شروع ہو جاتی۔ اُس میں اُسے یہ بتایا جاتا تھا کہ اماموں کی تعداد سات سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جس طرح خدا نے سات آسمان، سات زمینیں، سات سمندر، سات سیارے، سات رنگ، سات سُر، سات دھاتیں بنائی ہیں، اسی طرح اُس نے اپنے سات برگزیدہ ترین بندوں کو اپنے مکشوف امام بنا کر بھیجا ہے، یہ ہیں علیؓ، حسنؑ، حسینؑ، علی ثانیؓ (زین العابدین)، محمد الباقرؒ، جعفر الصادقؒ اور اُن کے بیٹے اسمٰعیل جو ساتویں اور آخری امام ہیں۔ چوتھے درجے میں یہ تعلیم دی جاتی تھی کہ ابتدائے آفرینش سے سات ناطق آئے ہیں جن میں کلامِ الٰہی مجسّم تھا اور جن میں سے ہر ایک نے حکمِ ربی سے اپنے پیش رَو کے نظریوں کو منسوخ کیا۔ ہر ناطق کے سات نائب تھے، جو ایک ناطق اور دوسرے ناطق کے درمیان یکے بعد دیگرے آئے۔ چونکہ انھوں نے اپنے آپ کو ظاہر نہ کیا اس لیے اُنھیں صامت کہا جاتا ہے۔ سات ناطق یہ تھے: آدمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ اور اسمٰعیل ابن جعفر الصادق (یا امامِ زمان)۔ اُن کے سات نائب حسبِ ذیل تھے: شیث، شیم، اسمٰعیل ابن ابراہیم، ہارون، شمعون، علیؓ اور محمد ابن اسمٰعیل۔ ہر ناطق کے ساتھ ایک صامت کو وابستہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہادیوں اور نبیوں کو اس امر کی آزادی ہو کہ وہ جسے چاہیں اپنے وقت کا صامت نامزد کریں۔ پانچویں درجے کی تعلیم اس پر مشتمل تھی کہ دینِ حق کی اشاعت کے لیے ہر صامت کے ساتھ بارہ نقیب وابستہ تھے، کیونکہ سات کے بعد بارہ سب سے متبرک عدد ہے، چنانچہ بارہ بُرج ہیں، بارہ مہینے ہیں اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہیں۔ چھٹے درجے میں مافوقیت کے اصول مبتدی کے دل میں جاگزیں کئے جاتے تھے اور جب تک وہ اُن کی حکمت کو پوری طرح تسلیم نہ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

معدیہ اور اس کے بعد قاہرہ کی مجلس گاہیں اس طرح ایک وسیع اور دُور رس سیاسی پروپیگنڈا کے مرکز بن گئیں۔ لیکن جن نظریوں پر وہ کاربند تھیں اُن کا علم صرف معدودے چند لوگوں کو ہوتا تھا، الیوسسٹس[1] (Eleusis) کی پُراسرار رسوم اور ٹمپلروں[2] (The Templars)، الیومیناتی[3] (The Illuminati) اور فرانس کے انقلابیوں کے مخفی نظریوں کی طرح باطنی نظریے صرف چیدہ چیدہ اور آزمودہ افراد کو کُلی یا جزئی طور پر بتائے جاتے تھے: کُلی طور پر صرف ایسے لوگوں کو جنھیں دشمنوں کی طاقت کو کمزور کرنے کی خاطر استعمال کرنا منظور ہوتا تھا۔ عوام اور نامحرموں کے لیے سرکاری مذہب اسلام تھا اور اسلام کے اخلاقی احکام اور شرعی حدود کی نہایت سخت گیری سے پابندی کرائی جاتی تھی۔ بیشتر خلفا جن میں معز خاص طور پر ممتاز تھا، بڑے متدین ومتقی اور پابندِ شریعت تھے۔[4] اُن کے ماتحت جو علمائے قانون اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۳) کرتا تھا اُس وقت تک اسے ساتویں درجے میں داخل نہ کیا جاتا تھا جہاں وہ فلسفے سے تجاوز کرکے تصوف کی اقلیم میں قدم رکھتا تھا۔ ساتویں درجے سے گزرنے کے بعد وہ عارفین کے زُمرے میں شامل ہو جاتا تھا۔ آٹھویں درجے میں وہ اثباتی دین کی تکالیفِ شرعی کی بیڑیاں اپنے پاؤں پر سے اُتار پھینکتا تھا۔ پردہ اس کی آنکھوں کے آگے سے اُٹھ جاتا تھا اور اس کے بعد وہ چونکہ خود پاک وصاف ہوتا تھا اس لیے ہر چیز اُس کے لیے پاک وصاف ہوتی تھی۔ ان نظریوں میں جو رُجحان مضمر ہے وہ بیان کی بہ نسبت تصوّر کی مدد سے بہتر سمجھا جا سکتا تھا۔

[1] قدیم یونان کا ایک مقام جہاں دیمیتر دیوتا اور پرسیفونی دیوی کے اعزاز میں مخفی مذہبی رسوم ہر سال ادا کی جاتی تھیں۔ (مترجم)

[2] فری میسنوں کی ایک جماعت۔

[3] عیسائیوں کا ایک فرقہ جو خاص دماغی اور رُوحانی قوّتوں کا مدعی ہے۔

[4] محسن فانی لکھتا ہے: "ائمۂ اسمٰعیلیہ مغرب ہمہ مقید باموِر شرعی بودند" کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کا چھٹا فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ، جسے آج کل بھی دروزی (اسمٰعیلیوں کی ایک شاخ) خدا کا اوتار تصوّر کرتے ہیں، تفاوت کا مجسمہ تھا۔ اس کی سیرت ایک عجیب وغریب اجتماعِ ضدّین تھی۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

حکّام مملکت تھے وہ بھی دیندار اور پرہیزگار مسلم تھے۔ اس کے باوجود اس امر نے کہ ایک خفیہ جماعت پُر اسرار طریقوں سے سلطنت کے کاموں میں دخل انداز ہو رہی تھی معاشرے کے تمام بند ڈھیلے کر دیئے۔ خفیہ کارکنوں کی ریشہ دوانیوں نے ایک طرف عبّاسیوں کی نگرانی کو تو کمزور کر دیا اور دوسری طرف نہ فاطمیوں کی گرفت کو دائمی طور پر مضبوط بنایا، نہ اُن کے اقتدار کو کوئی وسعت بخشی۔

فاطمیانِ مصر کو مغربی اسمٰعیلیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ نام انھیں اُن اسمٰعیلیوں سے ممتاز کرتا ہے جو حسن ابن صبّاح حمیاری، المعروف بہ حسن صبّاح، کے پیرو تھے ——
یہ حسن صبّاح وہی ہے جو مغربی تاریخ میں فرقۂ حشیشین[1] کے بانی کی حیثیت سے بدنام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۴) مقریزی کا خیال ہے، اور غالباً یہ خیال صحیح ہے کہ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کبھی تو وہ پہلے درجے کا جابر و ظالم بن جاتا تھا اور کبھی ایک دانا اور خدا ترس حکمران۔ اس نے اپنی قلمرو میں نسل و مذہب کے تمام امتیازات مٹا دیئے، رہرووں کی حفاظت کی خاطر قاہرہ کے گلی کوچوں میں شمعیں روشن لگوا دیں، پولیس کا نظام قائم کیا اور شدید جرائم کا انسداد کیا۔ حاکم بامر اللہ کے بارے میں مزید بیان کے لیے ملاحظہ کیجیئے، Short History of the Saracens، صفحہ ۲۰۲۔
یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ آئیوانِ خوفناک (Ivan the Terrible) جو بالکل اسی طرح کا مجسمۂ شیطنت تھا، اس کے زمانے کے عام روسی اُسے ایک قابل اور مضبوط سیرت کا حکمران تصوّر کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گالیئتسو ماریا سفورتسا (Galeazzo Maria Sforza) نے، صقلیہ کے نارمن سردار نے جو اپنے مخالفوں کی آنتیں نکلوا دیا کرتا تھا، پوپ پال اور پوپ الیگزانڈر ششم نے، انگلستان کے دو بادشاہوں، رچرڈ اور جان، نے اور دوسرے لوگوں نے جو ظلم و ستم کیے، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب غیر ذمہ دار قوت اور ایک شقی فطرت یکجا ہو جائیں تو ملک و مذہب کے امتیاز کے بغیر نتیجہ ایک ہی سا ہوتا ہے۔

[1] سولیسترو ساسی (Sylvestre de Sacy) کا خیال ہے کہ یہ نام حشیش (بھنگ) سے ماخوذ ہے جو حسن صبّاح کے پیرو پیتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

ہے، لیکن جسے اس کے پیرو سیدنا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے پیرووں کو اسمٰعیلیۂ مشرقی یا المرتیہ یا ملاحدۂ کوہستان کہا جاتا ہے۔

حسن ایک شیعہ عالم کا بیٹا تھا جو، جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے، عربی النسب تھا اور ایران کے شہر خُوسے میں رہتا تھا۔ حسن کو بچپن میں اُس وقت کے تمام علوم متداولہ کی باقاعدہ تعلیم دی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ نظام الملک (جو بعد میں بلادِ مشرق کے دو عظیم سلجوقی بادشاہوں، یعنی الپ ارسلان اور ملک شاہ کا مشہور وزیر بنا) اور نامور صوفی شاعر عمر خیّام کا ہم مکتب تھا۔ لیکن یہ روایت اب معتبر نہیں رہی[1]۔ ملک شاہ کے دربار میں اپنے عزائم ترقی پورے نہ ہوتے دیکھ کر وہ قاہرہ پہنچا اور دربارِ خلافت میں حاضر ہوا۔ قاہرہ میں وہ اسمٰعیلی تعلیم کے سارے مدارج طے کر کے محرمانِ اسرار میں داخل ہوا۔ ایران اس وقت سُنّی شدید العقیدگی کے کفایت کرنے والے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا، کیونکہ سلجوقی سلاطین ٹھیٹھ اشعریت کے پکّے حامی تھے۔ حسن افریقہ سے ایشیا واپس آیا اور کسی حد تک زور زبردستی اور کسی حد تک چالاکی و عیاری سے ایک ناقابلِ تسخیر قلعے کا مالک بن گیا جسے قدیم فارسی یا پہلوی میں الموت[2] (یعنی عقاب کا نشیمن) کہتے تھے اور جو شمالی ایران کے پہاڑوں کی ایک نہایت دشوار رس بلندی پر واقع تھا۔ پینتیس سالوں تک وہ اس قلعے پر قابض رہا اور اس ساری مدت کے دوران اُس نے تہدید و تخویف کے ایک باضابطہ بند نظام کے ذریعے ایشیا، افریقہ اور مشرقی یورپ میں تہلکہ مچائے رکھا[3]۔ اُس کے فدائی تلوار کا جواب خنجر سے اور ظلم کا جواب قتل سے دیتے تھے۔ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۵) کے طور پر استعمال کرتے تھے، اور یہ آجکل عموماً تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے تاریخ ادبیاتِ ایران از پروفیسر براؤن، جلد دوم۔ محسن فانی حسن صباح کا ذکر ذیل کے تمہیدی الفاظ سے شروع کرتا ہے: "چوں احوال او در تواریخ باقلام تعصب نگارش یافتہ لاجرم بہ تحریر آن چنانچہ نزد اسمٰعیلیہ است مبادرت می نماید"۔

[1] پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیاتِ ایران۔ جلد دوم۔

[2] "قلعۂ الموت یعنی آن آشیانۂ عقابیست"۔ دبستان۔

[3] "واز قتل و لنبک و نہب و فتکِ ملاحدہ امن و امان از میانِ مسلمانان مرتفع شد"۔ دبستان۔

خود احکامِ شرعی کا سخت پابند تھا اور اپنی قلمرو کی حدود میں میخواری اور رقص و سرود کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس کی باطنیّت مغربی اسمٰعیلیوں کی باطنیت سے مختلف معلوم ہوتی ہے۔ شہرستانی اور محسن فانی نے اس کے عقائد کو تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن دونوں اس کا ذکر قدرے خوف کے ساتھ کرتے ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے فدائیوں کے خنجروں سے غافل نہ تھے[1]۔ اس کے نظریوں کے صوفیانہ پہلو سے قطع نظر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے محرمی کے صرف چار درجے مقرر کیے۔ پہلے تین درجوں کو عبور کرنے والوں کو علی الترتیب فدائی، رفیق اور رداعی کہا جاتا تھا۔ حسن اس ادارے کا پہلا آقائے اعظم تھا، اگرچہ وہ رسمی طور پر خلفائے مصر کا مطیع تھا۔ الموت کے چوتھے آقائے اعظم حسن بن محمد نے جو اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر قاہرہ کے خلیفہ مستنصر باللہ کے بیٹے نزار سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتا تھا، تمام شرعی احکام کو منسوخ کر دیا۔ اس کا دعوےٰ یہ تھا کہ قیامت آچکی تھی، امام کا ظہور اس کی ذات میں ہو چکا تھا اور آسمانی

---

[1] امام فخر الدین رازی کے بارے میں ذیل کی حکایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا خوف بے سبب نہ تھا۔ امام رازی اپنے آبائی شہر رے میں اصولِ فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے درس کے دوران اسمٰعیلیوں کی مذمت کی۔ اس جسارت کی خبر الموت پہنچی چنانچہ فی الفور ایک فدائی اس عیر محتاط مدرس کی عقل درست کرنے پر مامور کیا گیا۔ فدائی رے آکر امام صاحب کے شاگردوں میں داخل ہو گیا۔ سات مہینوں تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنے کے موقعہ کا منتظر رہا۔ آخرکار ایک دن اس نے امام صاحب کو اپنے حجرے میں تنہا پایا۔ یہ دیکھتے ہی اس نے حجرے میں گھس کر دروازہ بند کر دیا اور امام صاحب کو فرش پر بچھاڑ کر خنجر ان کے گلے پر رکھ دیا۔ امام صاحب نے خوف زدہ ہو کر پوچھا "مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟" فدائی نے جواب دیا "اس لیے کہ تم نے اسمٰعیلیوں کو برا بھلا کہا ہے۔" امام صاحب نے وعدہ کیا کہ پھر کبھی اسمٰعیلی برادری کی برائی نہ کریں گے۔ فدائی نے یہ وعدہ اس شرط پر قبول کیا کہ امام صاحب فدائیوں کے آقائے اعظم یا کبیر الدعاۃ Grand Master سے وظیفہ لینا منظور کریں اور ان کے نمک خوار بنیں۔

سلطنت اخلاقی قوانین سے مکمل آزادی کو ساتھ لیے ہوئے نازل ہو چکی تھی[1] اس فاتر العقل انقلابی کو تاریخ الموت میں علیٰ ذکرہ السلام کے الفاظ سے نوازا گیا ہے (جنھیں بگاڑ کر ذکرہ السلام بنا دیا گیا) اس وقت سے لے کر الموت کی تباہی تک ان حسنین کے مریدوں نے معاشرے سے ایک بے محابا جنگ جاری رکھی، جس میں حریفین نے دشمن کو کسی قسم کی امان نہ دی۔ یہ لوگ دنیائے اسلام کے نہلسٹ (Nihilists) یعنی منکرانِ مذہب و اخلاق تھے۔ کیا مسلمان اور کیا عیسائی دونوں ان کے خنجروں کا شکار ہوئے۔ بالآخران پر ہلاکو نے حملہ کیا اور ان کے کوہستانی قلعوں کو تباہ کر کے انھیں اطرافِ ملک میں تتر بتر کر دیا جہاں یہ چُن چُن کر نیست و نابود کیے گئے[2]

---

[1] حسن کی موت ۵۰۸ ھ میں واقع ہوئی۔ وصاف ہلاکو کے وزیر اور جہانگشا کے مصنف جوینی کے حوالے سے ان اسمٰعیلیوں کا تذکرہ ذیل کے تلخ، لیکن پھر بھی منصفانہ الفاظ میں کرتا ہے:۔
"چون امام غشوم بمنبر برآمد چون مرغِ شوم بر درختِ زقوم نشست و از تمہیدی فراخور معتقد مذموم خارج شدہ مژدہ داد کہ ابوابِ رحمت بمفتاحِ ہدایت گشادہ است و قیامتِ موعود منقود شدہ و تبیح بن مذمم اعنی حسن ابن محمد امام بحق و خلیفۂ مطلق است و مولانا تا ہا بفہم ایشان تجدای رسانید و انواع تکلیف برداشت و چون از منبر نزول کرد سماطِ عید گستردہ آنرا عید قیام خواند و بشرب خمور و نشرِ لہو و سرور اشتغال نمود و ابن حسن را با اصطلاح بی استصلاح علیٰ ذکرہ السلام گفتندی۔"

[2] الموتیوں اور ان کے انسانیت سوز جرائم کی تفصیلی رُوداد کے لیے وان ہیمبر (Von Hammer) کی کتاب تاریخِ حشیشین، (History of the Assassins) دیکھیے جس کا ترجمہ انگریزی میں وُڈ (wood) نے کیا ہے۔ اور تو اور، عیسائی حکمران بھی بسا اوقات اپنے دشمنوں کا خاتمہ کرنے کی خاطر الموتی فدائیوں سے کام لیتے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ نے مونٹ فرّاکے کونرڈ (Conrad of Montferrat) کو الموت کے ایک فدائی کے ہاتھ سے مروا دیا۔ ایک پوپ نے بھی ایک فدائی کو (باقی حاشیہ صفحہ ۵۰۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

یورپ میں جو مذہبی اور غیر مذہبی خفیہ سوسائٹیاں قائم ہوئیں اُن کا بنیادی تصوّر صلیبی مجاہدوں نے اسمٰعیلیوں سے اکتساب کیا۔ ٹمپلروں (Templars) اور ہاسپٹلروں (Hospitallers) کے ادارے، سوسائٹی آف جیزس (The Society of Jesus جسے اگنیشیش لویولا Ignatius Loyola) نے قائم کیا اور جو ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جن کے ایثارِ نفس اور حُبِّ دین پر سبقت لے جانا ہمارے زمانے میں ممکن معلوم نہیں ہوتا۔ خونخوار ڈومینیکن (Dominicans) اور مقابلتہً نرم خُو فرانسسکن (Franciscan) ان سب کا ابتدائی نمونہ قاہرہ یا الموت میں ملتا ہے۔ بالخصوص نائٹس ٹمپلر (The Knights Templar)، جن کے یہاں گرینڈ ماسٹروں، گرینڈ پرائروں، مذہبی شیدائیوں اور مدارجِ محرمی کا ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے، مشرقی اسمٰعیلیوں سے بہت قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ مغربی اسمٰعیلیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اب بھی یمن، مصر اور بربری میں پائے جاتے ہیں، جہاں اُن میں اور عامۃ المسلمین میں تمیز کرنا مشکل ہے لیکن ہندوستان کے مغربی ساحل پر ایک کثیر التعداد جماعت ہے جو خوجہ کہلاتی ہے اور جو اصلی مشرقی اسمٰعیلیوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ یہ لوگ دراصل ہندو تھے، لیکن گیارہویں یا بارہویں صدی عیسوی میں انھیں ایک داعی پیر صدرالدین نے فرقۂ اسمٰعیلیہ میں داخل کیا۔ اس کی تعلیمات کا اُن کے اپنے مذہبی تصوّرات سے بہ آسانی جوڑ لگ گیا۔ چنانچہ ہندو دھرم کی کچھ باتیں اسمٰعیلی نظریوں کے ڈھانچے میں جڑ دی گئیں[1]۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۸) فریڈرک باربروسا (Frederick Barbarossa) کے قتل پر مامور کیا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ الموت، رودبار اور دوسرے قلعوں کی بربادی کے بعد تاتاریوں نے الموتیوں کو بے دریغی سے تہ تیغ کیا۔

[1] گلگت اور ہنزہ کی پہاڑیوں میں بھی اسمٰعیلیوں کی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔

کیسانیہ اور ہاشمیہ دونوں نوعیت میں سیاسی تھے لیکن اُن پہ مجوسیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ یہ دونوں فرقے اب معدوم ہو چکے ہیں اس لیے ان کا مزید ذکر غیر ضروری ہے۔

غالیہ یا غلاۃ (یعنی مبالغہ کرنے والے) جنھیں ابن خلدون اور شہرستانی نے شیعوں کا ایک فرقہ تصور کیا ہے، دراصل قدیم غناسطیوں کے جانشین ہیں جن کا اسلام صرف اس پر مشتمل ہے کہ انھوں نے حضرت محمدؐ یا حضرت علیؓ (بالخصوص حضرت علیؓ) کو حضرت عیسیٰؑ کا قائم مقام بنا دیا۔ اسلام میں ان کی وہی حیثیت ہے جو عیسائیت میں ڈوسیٹوں (Docetes) یعنی روح پرستوں کی تھی۔ نصیری جو حضرت علیؓ کی الوہیت کے معتقد ہیں، اسحاقیہ، نعمانیہ، خطابیہ اور چند دوسرے فرقے جو تشبیہی ہیں یا اوتاروں اور کایا پلٹ کو مانتے ہیں ——— سب کے سب اُنھی خیالات کی نمائندگی کرتے ہیں جو مارسیوناٹوں (The Marcionites) ''ولنٹینیوں'' (The Valentinians) اور دوسرے روح پرست عیسائیوں میں رائج تھے۔ ان میں سے بعض نے عیسوی تثلیث کو تخمیس میں بدل دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ایمان ہے کہ حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ (پنج تنِ پاک) مجموعی طور پر خدائی کا رتبہ رکھتے ہیں۔ ایک طرح کی روح پرستی سُنیوں کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ کردستان کے پہاڑوں میں ایک سُنّی ولی[1] کو عقیدۂ عوام میں وہی درجہ حاصل ہے جو غناسطیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیا۔

روشنیہ، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، عیسائیت کے الیومی ناتی (The Illuminati) کے مثنیٰ ہیں۔ اکبر کے تختِ ہندوستان پر بیٹھنے سے پہلے شورش، بدامنی اور کشت و خون کا جو دور تھا اس دور میں اس

---

[1] شیخ عبدالقادر گیلانی۔ بعض سُنّی ان کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ پرستش میں تھوڑی ہی سی کسر رہ جاتی ہے۔ وہ انھیں غوثِ اعظم، محبوبِ سبحانی، قطبِ ربّانی کے القاب سے ملقب کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر ایک صوفی اور فاطمی النسب تھے۔ صوفیوں اور درویشوں کے زمرے میں انھیں نہایت اونچا درجہ حاصل ہے۔

فرقے کا ظہور افغانستان میں ہُوا۔ ان کا بانی بایزید[1] ، جو افغانستان میں پیدا ہُوا لیکن نسلاً عرب تھا، معلوم ہوتا ہے کہ بڑی فطری قابلیت اور اعلیٰ درجے کی فطانت کا آدمی تھا عنفوانِ شباب ہی میں اُسے اُن اسمٰعیلیوں کی ہوا لگ گئی جو خراسان کے پہاڑی علاقوں میں ابھی تک زور دل پر تھے۔ شروع شروع میں اس نے جن عقائد کی تبلیغ کی وہ صوفیوں کے عقائد سے اساساً مختلف نہ تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ اسلامی ایمانیات کے راستے سے بھٹک گیا۔ جیسے جیسے اس کے پیروؤں کی تعداد اور اقتدار میں ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے وہ مذہب کے ساتھ سیاست کا رنگ پکڑتے گئے۔ تھوڑی ہی مدت میں انھوں نے اتنی ترقی کر لی کہ تقریباً سارے افغانستان پر چھا گئے۔

جن عقائد کی بایزید نے تعلیم دی اُن کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تصوف اور وحدت الوجود کا ایک ایسا ڈھانچہ تھا جو اسمٰعیلیت کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا۔ لیکن کسی غائر نگاہ رکھنے والے طالب علم سے یہ مخفی نہ رہے گا کہ اس کی تعلیمات و رسوم فقیروں کی برادری کے مسلک سے ایک عجیب و غریب مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ یہ پرچار کرتا تھا کہ خدا ہر جگہ موجود ہے، تمام اشیائے موجود اُس کی مختلف صورتیں ہیں، پیر لوگ اس کی تجلی کے پرتو ہیں نیکی اور بدی کا واحد معیار یہ ہے کہ پیر کے دکھائے ہوئے راستے پر چلا جائے، شریعت کے تمام احکام میں صوفیانہ معانی مضمر ہیں اور وہ محض دین میں کمال حاصل کرنے کی خاطر صادر کئے گئے ہیں، شریعت کے صوفیانہ معانی تک رسائی صرف عبادات و وظائف اور پیر کی ہدایت کے ذریعے ممکن ہے، ان معانی تک رسائی دینی کمال کا سرچشمہ ہے، اور جب یہ کمال حاصل ہو جائے تو شریعت کی تکالیفِ ظاہری واجب نہیں رہتیں بلکہ منسوخ ہو جاتی ہیں۔

باطنی، اسمٰعیلی اور ان کے تمام متجانس فرقے مسلمانوں کی عام جماعت سے اس امر میں مختلف ہیں کہ اُن کے نظریوں کا بنیادی اصول ایمان ہے۔ اس معاملے میں وہ عیسائیت

---

[1] وہ بعد میں میاں روشن بایزید کے نام سے مشہور ہُوا۔

کے بیشتر اصلاح یافتہ کلیساؤں سے قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ لوتھر کی طرح اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ ایمان اصلی ذریعۂ نجات ہے۔ لوتھر نے شدومد سے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان تمام گناہگاروں کو گناہوں کی سزا سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ اسمٰعیلیوں، باطنیوں اور اُن کی تمام شاخوں نے ایمان کو، یعنی ربانی امام پر پختہ یقین کو، اپنے مذہب کا رکنِ رکین بنایا اگر کسی شخص کو ایمان کی سعادت حاصل ہو تو اس کے ظاہری اعمال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اب ہم خالص شیعوں سے یعنی ائمۂ اہلِ بیتِ نبوی کے پیروؤں سے بحث کریں گے جنھیں عموماً اثنا عشریہ کا نام دیا جاتا ہے، اس مناسبت سے کہ وہ بارہ اماموں کو مانتے ہیں۔ اثنا عشریہ کا عقیدہ ہے کہ منصوب من اللہ ائمہ کا سلسلہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ اسد اللہ الغالب (متوفی سنہ ۴۰ھ مطابق ۶۶۱ء)

۲۔ حضرت حسن مجتبیٰ (متوفی سنہ ۴۹ھ مطابق ۶۶۹ء)

۳۔ حضرت حسینؑ، شہیدِ کربلا (متوفی سنہ ۶۱ھ مطابق ۶۸۰ء)

۴۔ حضرت علی ثانی زین العابدین (متوفی سنہ ۹۴ھ مطابق ۷۱۳ء)

۵۔ حضرت محمد الباقر، جو ایک عالمِ فاضل اور زاہدِ کامل تھے (از ۵۷ھ مطابق ۶۷۶ء تا ۱۱۳ھ مطابق ۷۳۱ء)

۶۔ حضرت جعفر الصادق، جو امام محمد الباقر کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی پیدائش ۸۰ھ مطابق ۶۹۹ء میں بمقام مدینہ ہوئی۔ ایک عالم، ادیب اور محقق کی حیثیت سے وہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں معزز و محترم ہیں۔ اُن کی علمی فضیلت، اُن کے اوصافِ حمیدہ اور اُن کے صدق و صفائے سیرت نے دشمنانِ اہلِ بیت سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا۔ انھوں نے بڑی عمر پائی اور ان کی وفات مدینے میں ۱۴۸ھ مطابق ۷۶۵ء میں ہوئی۔ اس وقت عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر المنصور مسند نشین تھا۔

۷۔ حضرت ابوالحسن موسی الکاظم، امام جعفر الصادق کے بیٹے۔ انہیں زُہد و اتقا کی بنا پر العبد الصالح کا خطاب دیا جاتا ہے۔ وہ ۱۲۹ھ مطابق ۷۴۶-۴۷ء میں بمقام مدینہ پیدا ہوئے۔

ان کی وفات ۲۵ رجب ۱۸۳ھ مطابق یکم ستمبر ۷۹۹ء میں بغداد کے قید خانے میں ہوئی جہاں انھیں خلیفہ ہارون نے جو اُس احترام کی بناء پر جو انھیں حجاز میں حاصل تھا اُن سے حسد کرتا تھا، کئی سالوں سے قید کر رکھا تھا۔ وساسی Desacy کہتا ہے کہ امام موسیٰ کو ہارون کے حکم سے خفیہ طور پر مار ڈالا گیا۔ اُن کی مصیبتوں اور اُن کی نیک و پاک سیرت کے باعث تمام مسلمان انھیں عزیز رکھتے تھے۔ کاظم کا لقب ان کے صبر و تحمل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۸۔ حضرت ابوالحسن علی الرضا۔ رضا کا لقب اُن کی صفائے سیرت پر دلالت کرتا ہے۔ وہ صفِ اوّل کے عالم، شاعر اور فلسفی تھے۔ اُن کی ولادت مدینے میں ۱۵۳ھ مطابق ۷۷۰ء اور وفات خراسان کے شہر طوس میں ۲۰۲ھ مطابق ۸۱۷ء میں ہوئی۔ اُن کی بیوی اُمّ الفضل خلیفہ مامون کی بہن تھی۔

۹۔ حضرت ابوجعفر محمد الجواد التقی۔ اُن کے القاب اُن کی فیاضی اور پارسائی کے نشان وہ ہیں۔ وہ خلیفہ مامون کے بھتیجے تھے اور اُن کی بیوی اُمّ الحبیب مامون کی بیٹی تھی۔ مامون اور اس کا جانشین معتصم دونوں اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ولادت ۱۹۵ھ مطابق ۸۱۱ء اور وفات ۲۲۰ھ مطابق ۸۳۵ء میں ہوئی۔

۱۰۔ حضرت علی رابع نقی (متوفی ۲۶۰ھ مطابق ۸۶۸ء)

۱۱۔ حضرت ابومحمد الحسن ابن علی العسکری الہادی۔ عسکری انھیں اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خلیفہ متوکّل کے حکم سے سرّمن رائی[1] کے مقام پر، جسے العسکر بھی کہتے تھے، ایک مدّتِ مدید تک نظر بند رہے۔ وہ زہد و تقویٰ میں ممتاز فضیلتِ اخلاق کی وجہ سے ہر دلعزیز اور ایک شاعر و ادیب کی حیثیت سے نامور تھے۔ ان کی پیدائش ۲۳۱ھ مطابق ۸۴۵-۴۶ء میں بمقام مدینہ اور وفات ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۴ء میں بمقام العسکر ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں متوکّل کے حکم سے

---

[1] یہ مقام بغداد سے کئی دنوں کی مسافت پر تھا۔

زہر دیا گیا۔

۱۲۔ حضرت محمد المہدی (متوفی ۲۶۰ھ مطابق ۸۷۳ء - ۸۷۴ء) شیعہ عقیدے کے مطابق یہ آخری امام پانچ برس کی عمر میں سرمن رائی کے ایک غار میں غائب ہو گئے۔[۱] شیعوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں اور وہ بڑی تمناؤں سے اُن کے ظہورِ ثانی کے لیے چشم براہ ہیں تاکہ وہ آ کر عالمی خلافت کو نئے سرے سے قائم اور نوعِ انسانی کا تزکیہ کریں۔ انھیں امام غائب، امام منتظر اور امام قائم کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔[۲]

اثنا عشریہ، جنھیں بدرجۂ اتم شیعہ یا امامیہ کہا جاتا ہے، دو ذیلی فرقوں میں منقسم ہیں، یعنی اصولیہ اور اخباریہ (اصولوں کے پابند اور روایات کے پابند) جہاں تک امامت کے مسئلے کا اور امامت کے امامِ آخری تک پہنچنے کا تعلق ہے، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن ان میں اس موضوع پر اختلاف ہے کہ مجتہدوں کی تشریحوں کو، جو اپنے آپ کو اماموں کے نائب کہتے ہیں، کہاں تک مستند سمجھا جائے۔ اصولی شیعہ یہ کہتے ہیں کہ شارحینِ قانون کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ انفرادی رائے کو مقید کریں۔ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ قانونِ شریعت بجائے خود پوری طرح صریح و مبین ہے اور ہر شخص کا فرض ہے کہ عقل اور فکرِ انسانی کی ترقی کی روشنی میں خود اس کی تشریح کرے اور اس معاملے میں ایسے لوگوں کی رائے کو اپنا رہنما نہ بنائے جو خود اس کی طرح ناقص ہیں اور جن کا ذاتی فائدہ اس میں ہے کہ دنیا کو جہالت میں رکھیں۔ اُن کی رائے میں آیاتِ قرآنی کا مقصد یہ نہ تھا کہ

---

[۱] اس المناک واقعے کی رُوداد کے لیے ملاحظہ کیجیے حصۂ اوّل اور
Short History of the Saracens, vol.I

[۲] اور اس سے خاص طور پر کرسٹاڈیلفین فرقے (The Christadelphians) کا مقابلہ کیجیے جس کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دنیاوی سلطنت قائم کرنے کے لیے دوبارہ آئیں گے۔

منشائے الٰہی کو مشکل الفہم الفاظ کے پردے میں چھپا رکھا جائے۔ اُن کا رُوئے سخن پیغمبرؐ کی وساطت سے نوعِ انسانی کی طرف تھا تاکہ وہ اُنھیں سمجھے اور ان پر عمل کرے۔ جو احکامِ الٰہی پیغمبرؐ کے ذریعے انسانوں کو دیئے گئے وہ کسی مُلّا یا قانون دان کی تفسیر و تعبیر کے محتاج نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس اخباری شیعہ مجتہدوں کی تفسیروں کو بے چون وچرا مانتے ہیں اور ان پر اندھا دھند عمل کرتے ہیں۔

اصولی نظریوں کے مطابق رسُولِ خدا کے زبانی ارشادات احکامِ قرآنی کے ضمیمے ہیں اور اُن کی فرضیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کہاں تک تعلیماتِ قرآنی سے ہم آہنگ ہیں۔ چنانچہ ایسی حدیثیں جو قرآن کی ہدایات سے مطابقت نہیں رکھتیں موضوع تصوّر کی جاتی ہیں۔ اُن کی تخریج مسلّمہ اصولوں کے مطابق کی جاتی ہے جو منطقی قاعدوں اور حتمی معلومات پر مبنی ہیں۔ ان قاعدوں نے معتزلہ کے یہاں ایک امتیازی وضع اختیار کر لی ہے اور ان کی مدد سے معتزلہ نے چند ایسی حدیثوں کو حدیثِ قدسی سے خارج کیا ہے جو یوں تو آنحضرتؐ سے منسوب کی گئی ہیں، لیکن آپ کی پختہ تعلیمات سے جیسے کہ اُن کی تفسیر و توضیح حکما، و فقہائے بیت النّبی نے کی ہے، موافقت نہیں رکھتیں۔

اصولی شیعہ حدیثوں کو چار عنوانوں کے تحت تقسیم کرتے ہیں، یعنی (ا) صحیح، (ب) حسن، (ج) موثّق اور (د) ضعیف۔ حدیثِ صحیح وہ ہے جس کی سند کا سراغ قطعی طور پر ائمۂ معصوم تک لگایا جا سکے، اور وہ بھی ایک امامِ عادل کی روایت کی بنا پر، جس کی دیانت کے بارے میں اربابِ حدیث کا اجماع ہو۔ روایت عادلوں کے ایک لگاتار سلسلے سے ہم تک پہنچی ہو۔ حدیثِ حسن وہ ہے جس کا سلسلہ حدیثِ صحیح کی طرح ائمۂ معصوم تک پہنچتا ہے، لیکن کسی ایسے قابلِ احترام امام کی وساطت سے جس کے بارے میں مؤرخین اور اربابِ سِیر نے اگرچہ ثقہ اور عادل کے الفاظ استعمال نہ کئے ہوں پھر بھی اسی قسم کے الفاظ میں اس کی تعریف کی ہو۔ حدیثِ موثّق کسی ایسی حدیث کو کہتے ہیں جس کے راویوں کو مؤرخین نے ثقہ اور عادل تسلیم کیا ہے، لیکن اُن میں سے بعض یا سب کے سب غیر امامیہ ہیں (یعنی شیعیانِ علیؓ میں سے نہیں) حدیثِ ضعیف کا نام کسی ایسی

حدیث کو دیا جاتا ہے جو مندرجۂ بالا شرائط میں سے کسی شرط کو بھی پورا نہیں کرتی۔ اصولی صرف پہلی تین قسم کی حدیثوں کو قبول کرتے ہیں۔

صرف ایسی حدیثیں قابلِ قبول سمجھی جاتی ہیں جن کا سلسلۂ روایت متواتر ہو۔ سلسلۂ روایت کے متواتر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کثیر التعداد لوگ ایک قرن سے لے کر دوسری قرن تک ایک ہی روایت کو دُہراتے چلے آئے ہوں حتیٰ کہ کسی ایسے راوی کا سراغ مل جائے جو ائمۂ معصوم میں سے ہو لیکن اس میں بھی یہ شرط ہے کہ ہر قرن میں راویوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ لوگوں کے دروغگوئی میں اجماع کا احتمال نہ رہے۔ اگر راویوں کی تعداد کسی ایک قرن میں یا تمام قرنوں میں مجموعی طور پر اتنی زیادہ نہ ہو تو حدیث غیر معتبر سمجھی جاتی ہے۔ ایسی حدیثوں کو علمائے حدیث کی اصطلاح میں اخبار الاحاد کہتے ہیں۔

قانون کی تشریح اور حدیثوں کے قبول، تعیل اور تفسیر کے معاملے میں اصولی اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر ان کی عقل یا ضمیر انھیں یہ بتائے کہ کسی مجتہد کی تفسیر الہامی شریعت یا فطری قانون یا عقل و عدل کے متناقض ہے تو وہ اپنے آپ کو اُس کے ماننے پر مجبور نہیں سمجھتے۔ اخباریوں نے حدیثوں کی جو کثیر تعداد کسی تنقیح یا اصولِ تفسیر پر پرکھنے کے بغیر قبول کر لی ہے وہ اس پر معترض ہیں۔ یوں کہنا چاہئیے کہ عیسائیت میں جو حیثیت براڈ چرچ (The Broad Church) کی ہے وہی حیثیت اسلام میں، یا کم از کم شیعہ مذہب میں، اصولیوں کی ہے۔

صاحبِ دبستان کے قول کے مطابق اخباریوں کی وجہِ تسمیہ یہ ہے کہ وہ کُلیتہً اخبار یعنی احادیث پر اعتماد کرتے ہیں اور اجتہاد کو رَدّ کرتے ہیں، کیونکہ وہ اسے سُنّتِ ائمہ کے نقیض سمجھتے ہیں۔ رائج حدیثوں میں سے جو جو بھی کسی امام یا رسولِ خدا سے منسوب ہیں وہ ان سب کو مسلّم الثبوت تصور کرتے ہیں۔ کسی روایت کا حدیث کہلایا جانا ہی اُن کے لیے کافی ہے۔ اس نام سے موسوم ہوتے ہی روایت اُن کی نظروں میں فی نفسہٖ مستند ہو جاتی ہے[1] اور اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ اس کے ماخذوں کی تحقیق و تدقیق کی جائے۔

---

[1] اسے وہ آورِ عقلی سمجھتے ہیں۔ یعنی ایسا حتمی فیصلہ جو استفسار (باقی حاشیہ صفحہ ۵۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

بدیہی ہے کہ اس آسان قاعدے کے طفیل روایات و اقوال کی ایک بہت بڑی تعداد اسلامی تعلیمات میں مخلوط ہوگئی ہے، حالانکہ ان دونوں میں کوئی بات مشترک نہیں۔ قدیم عقائد ابھی تک لوگوں کے دلوں میں زندہ تھے۔ چنانچہ یہ ناممکن تھا کہ ایک قومی مذہب کے قائم ہوتے ہی پرانے خیالات عود نہ کر آئیں اور نئی وضع قطع کے مقبول لباس پہن کر اپنے آپ کو ظاہر نہ کریں۔ گوبینور (Gobineau) نے قدرے درشتی سے کام لے کر لیکن پھر بھی بجا طور پر انتہائی قسم کی اخباریت کو یہ الزام دیا ہے کہ اس نے اسلام کے عظیم بانی کو ہرمزد اور اس کے اخلاف کو امشاسپند بنا ڈالا۔

اخباریت غیر تعلیمیافتہ لوگوں اور نیم تعلیمیافتہ ملاؤں کا مرغوب مذہب ہے۔ اصولیت ارباب علم و دانش اور علمائے دین کے فاضل ترین طبقے میں مقبول ہے۔ ماضی قریب کے اُن ممتاز ترین علماء میں جو اصولیت کے حامی تھے ملّا صدرہ[1] (محمد بن ابراہیم شیرازی) تھا جو غالباً اپنے زمانے کا فاضل ترین عالم اور منطقی تھا۔ اس نے ایرانیوں میں فلسفے اور انسانیت سے تعلق رکھنے والے علوم کا احیاء کیا۔ آلِ بُویہ کے زوال سے صفویوں کے خروج تک ایران پر ایک نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ آبائیت نما قدامت پرستی نے فلسفہ اور سائنس کو ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ بوعلی سینا کے نام تک سے لوگوں کو نفرت تھی اور اس کی تصنیفات سرِعام نذرِ آتش کی گئیں۔ نتیجۃً قدرتی طور پر ان صدیوں میں بہت سی مزد کی روایات نے جو اسلامی بھیس میں تھیں غیر تعلیم یافتہ عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ حقیقی فاطمی ارباب علم زاویۂ عزلت میں جا بیٹھے تھے اور ملاؤں کی ایک جماعت جو قومی تعصبات سے مملو تھی اور جس کا مقصد صرف لوگوں کو جہالت کی تاریکی میں رکھنا تھا وجود میں آگئی تھی۔ چنانچہ ملّا صدرہ کو کٹر ملاؤں کی ایک ایسی منڈلی کا مقابلہ کرنا پڑا جو اپنے حقوق کے تحفظ میں اُتنی ہی منضبط تھی جتنی عالمِ عیسائیت میں پادریوں کی جماعت تھی اور جو پادریوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۱۶) سے بالاتر اور تنقید و تنقیح سے بے نیاز ہے۔

[1] ملّا صدرہ شاہ عباس ثانی کے عہد حکومت میں تھا۔

کی طرح اپنے پاسبانِ دین کے اجارے پر کسی حملے کی بھنک پاتے ہی چراغ پا ہو جاتی تھی۔ لیکن ملّا صدرہ کو استقلال اور موقع شناسی کا ملکہ عطا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ سب مخالفتوں پر غالب آ کر فلسفے اور سائنس کے مطالعے کو دوبارہ زندہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس طرح اصولیت نے نئے سرے سے عروج پایا۔

اصولیت کا فلسفیانہ ہمزاد اعتزال یقیناً اسلام کا سب سے زیادہ عقلیت پسند اور وسیع الخیال مسلک ہے۔ اس کی فراخدلی اور فکرِ انسانی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں کشادہ نظری، اس کی بلند حوصلہ رجائیت اور اس کی عالی ظرفی، یہ سب صفات اس امر کا نتیجہ ہیں کہ وہ حکمائے بیت النبی کے خیالات کا آئینہ دار ہے جو خود ہادیِ اسلام کے خیالات کا پرتو تھے۔

وہ سیاسی فرقہ بندیاں جنھوں نے شیعوں میں اب تک پھوٹ ڈال رکھی تھی غائب ہو رہی ہیں اور باقی تمام فرقے تیزی سے اثنا عشریہ میں مدغم ہو رہے ہیں۔ ایران، عرب، مغربی افریقہ اور ہندوستان کے بیشتر شیعے اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اثنا عشریت تشیّع کی مترادف بن گئی ہے۔

اخباریوں کی طرح سنّی بھی اپنے عقائد کی بنیاد حدیثوں کی ثقاہت پر رکھتے ہیں۔ لیکن وہ اس سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ صرف ایسی حدیثوں کو قبول کرتے ہیں جو تنقیح کے چند اصولوں پر جو اُن کے مذہب سے مخصوص ہیں پوری اترتی ہوں۔ اس بارے میں وہ اصولیوں سے مشابہ ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ متعدد خلفاء اور اجماعِ اُمّت کے متفق علیہ فیصلے احکام و ارشاداتِ قرآنی کے ضمیمے اور تقریباً اُنھی کے برابر مستند ہیں۔

سنّیوں کے بہت سے ذیلی فرقے ہیں جو ایک دوسرے سے اعتقادات و نظریات میں اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ اختلاف بسا اوقات باہمی پرخاش اور زیادتیوں کا باعث بنے ہیں۔ بہرحال وہ اپنے عقائد و نظریات کے بنیادی ارکان کے بارے میں بڑی حد تک متفق ہیں اور ان ارکان کے چار مآخذ ہیں:۔

۱۔ قرآن

۲ - حدیث یا سُنّت (یعنی وہ روائتیں جو پیغمبرِ اسلامؐ سے منسوب ہیں -)
۳ - اجماعِ اُمّت (یعنی متبعینِ رسُولؐ کا اتفاقِ رائے)۔
۴ - قیاس (یعنی انفرادی رائے)

حدیث میں یہ چیزیں شامل ہیں :-

ا - آنحضرتؐ کے اقوال، ارشادات وہدایات (سُنّتِ قولی)

ب - آپؐ کے اعمال، افعال اور روزانہ زندگی کے طورطریقے (سنّتِ فعلی) اور

ج - آپؐ کا سکوت، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ کے رُوبرو صحابہؓ نے جو کام کئے آپؐ نے اُنھیں خاموشی سے پسند یا ناپسند فرمایا (سنّتِ تقریری)

ان ضمنی ماخذوں سے جو قاعدے مستنبط کئے گئے ہیں اُن کی حجیّت اور سندیت کے مختلف مراتب ہیں - اگر یہ قاعدے یا منقول احکام شہرتِ عام رکھتے ہوں (یعنی احادیثِ متواترہ ہوں) تو وہ قطعی الثبوت اور فیصلہ کُن سمجھے جاتے ہیں - اگر یہ صورت ہو کہ وہ لوگوں کی ایک بڑی اکثریت میں تو معروف ہیں لیکن شہرتِ کُلّی نہیں رکھتے تو انھیں احادیثِ مشہورہ کا نام اور احادیثِ متواترہ کے بعد کا درجہ دیا جاتا ہے - ان دو اصنافِ حدیث کے مقابلے میں اخبارِ احاد کو، جن کی صحت جُدا جُدا افراد کی سند پر منحصر ہوتی ہے، بہت کم وقعت دی جاتی ہے - اس طرح ہر وہ حدیث جو معاصرین وصحابۂ رسُولؐ میں سے کسی ایک سے مروی ہو، قطعِ نظر اس سے کہ راوی کو آنحضرتؐ سے کیا نسبت تھی مستند اور صحیح سمجھی جاتی ہے، البتہ ضروری ہے کہ چند شرائط جو شہادتِ شخصی کے جانچنے کے لیے وضع کی گئی ہیں پوری ہو جائیں - اجماعِ اُمّت کی ترکیب میں اتفاقِ عمومی کا مفہوم مضمر ہے - شارع کے بنائے ہوئے تمام قوانین اور ممتاز صحابۂ رسُولؐ، بالخصوص خلفائے راشدین نے دینی مسائل، امورِ مدنی اور اوامر ونواہی کے بارے میں جو تفسیریں، تشریحیں اور فیصلے کئے وہ سب اس میں شامل ہیں -

لیکن آٹھویں صدی عیسوی سے قوانین ونظریات کے یہ مآخذ تغافل کی نذر ہو گئے ہیں اور ہر فرقہ شریعت کی تفسیر اور نظریات کی تصریح کے معاملے میں اپنے اپنے اساتذۂ فقہ وحدیث

کی اندھا دھند اطاعت کرتا ہے۔ اسے تقلید کہتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص اکابر اساتذہ میں سے کسی ایک کی پیروی نہ کرے وہ صحیح العقیدہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔

سُنیوں کے چار اہم ترین مسلک یا فرقے ہیں[1] جو اپنے اپنے بانی کے نام کی نسبت سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلاتے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ[2]، جن کے نام پر پہلے فرقے کا نام رکھا گیا، ۸۰ھ میں، جب کہ عبدالملک ابن مروان مسند نشینِ خلافت تھا، پیدا ہوئے۔ انھوں نے شیعی دبستانِ فقہ میں تعلیم پائی، مبادئ قانون امام جعفر صادق سے اکتساب کیے اور ابو عبداللہ ابن المبارک اور حامد ابن سلیمان سے حدیثیں سنیں۔ ابو حنیفہ اکثر اوقات امام جعفر صادق سے استفادہ کرتے تھے۔ اپنے آبائی شہر کوفہ میں واپس آکر وہ پہلے کی طرح خاندانِ علوی کے پرجوش اور زبردست حامی تو رہے لیکن انھوں نے شیعی دبستانِ فقہ سے قطع تعلق کر کے اپنا ایک نیا دبستان قائم کیا جو شیعی عقائد سے بعض اہم مسائل میں بالکل مختلف ہے لیکن پھر بھی دونوں کی تعبیرِ قانون اور خیالات و آرا میں اس قدر قریب کی مشابہت ہے کہ ابو حنیفہ کے شیعی دبستان سے کسبِ فیض کرنے کے بارے میں شبہ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ انھوں نے قانون کی تشریح میں ذاتی رائے کو جو آزادی دی وہ یقیناً فاطمی ائمۂ فقہ کی آرا کا پرتو ہے۔ امام ابو حنیفہ کے متبعین انھیں امامِ اعظم کے لقب سے ملقب کرتے ہیں۔ اُن کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ ان کی تعلیمات ہندی مسلمانوں، افغانوں، ترکمانوں، تقریباً سارے وسطی ایشیا کے مسلمانوں، ترکوں اور مصریوں میں رائج ہیں۔ اُن کے پیرو دوسرے فرقوں کے پیرووں سے تعداد میں کہیں زیادہ ہیں۔

دوسرے مسلک کے بانی امام ابو عبداللہ مالک بن انس تھے جنھوں نے ہارون الرشید کے عہدِ خلافت میں ۱۷۹ھ میں وفات پائی۔

امام شافعی تیسرے مسلک کے بانی تھے۔ اُن کی ولادت شام کے مقام غزہ پر امام

---

[1] انھیں مذاہبِ اربعہ کہتے ہیں۔

[2] ابو حنیفہ النعمان ابن ثابت (از ۶۹۹ء تا ۷۶۷ء)

ابو حنیفہ کے سالِ وفات میں ہوئی اور وفات مصر میں ۲۰۴ھ میں، جب خلیفہ مامون حکمران تھا۔ وہ امام علی ابن موسیٰ الرضا کے ہم عصر تھے۔ شافعی عقائد عموماً شمالی افریقہ، مصر کے ایک حصّے، جنوبی عرب اور جزیرہ نمائے ملایا میں اور سیلون کے مسلمانوں میں رائج ہیں۔ بمبئی کی بوہرہ[1] جماعت میں بھی اُن کے چند پیرو پائے جاتے ہیں۔

چوتھے دبستان کی بنیاد امام ابن حنبل نے رکھی۔ ان کا زمانۂ حیات مامون اور معتصم باللہ کا دورِ خلافت تھا۔ یہ دونوں خلیفے معتزلی تھے۔ امام ابن حنبل میں جو بے پناہ مذہبی جوش تھا اس کے باعث اُن کی ان دونوں خلیفوں سے نہ بنی۔ انھوں نے ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ معتزلی عقائد کے ساری سلطنت میں پھیلانے میں مامون کو جو ناکامی ہوئی اور اس کی جھنجلاہٹ نے مسلمانوں کے خون کی جو ندیاں بہائیں اُن کی ایک بڑی وجہ امام ابن حنبل کی مخالفت تھی۔

میں نے ایک اور جگہ[2] مختلف سُنّی فرقوں کے قانونی اختلافات تفصیلاً بیان کئے ہیں۔ اُن کے نظری اختلافات میں آدابِ عبادت کی جزئیات بھی شامل ہیں، جن سے تفصیلی بحث اس کتاب میں، جو عام طلباء کے لیے ہے ضروری نہیں۔ بہر حال اتنا بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ حنبلی نہایت بیّن طور پر تشبیہی تھے۔ اُن کے نزدیک خدا ایک انسان نما ہستی تھا جو آسمان پر تخت نشین تھا۔ دوسرے فرقوں کے یہاں یہ تصوّر اقتضائے زمانہ اور قومی طبیعت کے مطابق متنوّع شکلوں میں پایا جاتا تھا لیکن سب میں عنصرِ غالب تشبیہیت تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان فرقوں میں سب سے زیادہ وسیع الخیال فرقہ حنفیہ تھا۔ اس کے برخلاف شافعیت اور مالکیت دونوں اپنی ہمدردیوں اور خیالات میں تنگ اور محدود تھیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ جیسے جیسے آمریت لوگوں کی عادات و رسوم پر مسلط ہوتی گئی اور خلیفہ یا سلطان متقن یا فقیہ کی مداخلت کے بغیر ان کی قسمتوں کا مختار بنتا گیا، ملّایانہ آبائیت تمام طبقوں کے دلوں پر قبضہ جماتی چلی گئی۔ آبائے کلیسا کے احکام کی طرح آبائے فقہِ اسلامی کے احکام نے قوانین

---

[1] بمبئی کے بعض بوہرے شافعی ہیں اور بعض مصری قسم کے اسمٰعیلی۔

[2] Muhammadan Law

کی حیثیت اختیار کر لی۔ حنفی اپنے آپ کو اہل الرائے والقیاس کہتے تھے اور اُن کے حریف فرقوں نے بھی انھیں یہی خطاب دیا۔ اس کے مقابلے میں دوسرے فرقے اہل الحدیث کہلاتے تھے لیکن مدت ہوئی کہ حنفی بھی امورِ شرعی یا نظری میں ذاتی رائے سے کام لینا ترک کر بیٹھے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آبائے دین جو فیصلے کر گئے ان میں تصرف یا اُن پر بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام اسکیموؤں کے ملک میں جاتا ہے تو جائے لیکن اُسے اپنے ساتھ وہ سارے قاعدے قانون لے جانے ہوں گے جو عراقیوں کے لیے بنائے گئے تھے۔!

آبا پرستی نے یوں سُنّی حلقے کے اندر ترقی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے لیکن سُنّی مذہب نے وحدتِ عقیدہ و عمل کو قائم رکھنے کی خاطر جو کوششیں کی ہیں وہ گزشتہ سو سال میں دو اندرونی بغاوتوں کا باعث ہوئی ہیں۔ وہابیت، جس نے انیسویں صدی کے آغاز میں خروج کیا، صحرائے عرب سے اُٹھی۔ غیر مقلدیت، جو بہ مرِ اقتدار مذہب کی سخت گیر فرقیت سے راہِ فرار ڈھونڈتی ہے، دلِ انسان کے اندرونی سرچشموں سے نکلی۔ غیر مقلدوں کو وہابیوں کے ساتھ خلط کر کے اُن سے ناانصافی کی گئی ہے۔ وہ بلا شک و شبہ تمام دوسرے سُنّی مسلکوں کے پیروؤں کے مقابلے میں زیادہ فلسفی مزاج اور عقلیت پسند ہوتے ہیں۔ غیر مقلدیت تنگ نظر اور محدود ضرور ہے لیکن پھر بھی وہ سُنّی مذہب کی واحد تحریک ہے جس کے مستقبل سے اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

وہ مباحثہ جو یورپ میں ریفارمیشن (The Reformation) کا پیش خیمہ بنا حنفیوں میں شروع ہو گیا ہے اور یقینی ہے کہ بہت جلد مسلمانوں کے دوسرے فرقوں اور مسلکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ کیا قرآن کے ترجمے عربی زبان کے قرآن کے مساوی رتبہ رکھتے ہیں؟ اگر کوئی شخص جو عربی سے نابلد ہے، اپنی زبان میں نماز ادا کرے تو کیا اس کی نماز اُتنی ہی مستحقِ ثواب ہوگی جتنی حجاز کی زبان میں ادا کی ہوئی نماز؟ —— یہ ہے نوعیت اُن سوالوں کی جنھوں نے اس وقت ہندی مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے — یہ مباحثہ کافی باہمی رنجشوں اور تلخ کلامیوں کا باعث ہوا ہے، یہاں تک کہ اس نے راسخ العقیدہ علماء سے تکفیر کے فتوے بھی صادر کرائے ہیں۔ موجودہ مفادات کے محافظین ہر

جدت پر جو اعتراض ہمیشہ کرتے چلے آئے ہیں اُس کا جواب اصلاحی تحریک کے رہنما ذیل کے سوالوں کی صورت میں دیتے ہیں: کیا عربی واحد زبان ہے جسے اللہ تعالےٰ سمجھتا ہے؟ اگر ایسا نہیں تو رسول اللہ نے جس نماز کی تلقین اور ابتداء کی اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر اس کا مقصد عبادت گزار کو خدا کے قریب لانا اور اس میں صفائے قلب پیدا کرنا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ عبادت گزار ایسے الفاظ کو جن کا مطلب وہ بالکل نہیں سمجھتا اناپ شناپ منمنا کر اپنی طبیعت میں وہ بلندی محسوس کرے جو عبادت سے پیدا ہونی چاہیئے؟ استدلال سے آگے بڑھ کر وہ رسولِ خدا کی مثال پیش کرتے ہیں جنھوں نے ایرانی نومسلموں کو اپنی زبان میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے دی تھی[1]۔ یہ تحریک جس سے یورپ کے لوگ بھی ناآشنا ہیں، اپنے اندر نشو ونما کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ یہ اسلام میں ریفارمیشن کی ابتدا ہے۔ اب تک قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح اسلام کے علمائے دین ایک ایسی زبان کا علم رکھنے کی بدولت جس سے جمہور اور حکام دونوں نابلد ہیں چھائے رہے ہیں۔ جس دن وہ اصول جس کی خاطر مصلحین سرگرمِ کار ہیں تسلیم ہو گیا اسی دن یہ ضروری ہو جائے گا کہ جو قوانین نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ایسے لوگوں کے لیے بنائے گئے تھے جنھیں آج کل کی تہذیب و تمدن سے دُور کا واسطہ بھی نہ تھا وہ ایک ہزار سالوں کی روشنی میں سمجھے اور سمجھائے جائیں۔

خارجیت کو کبھی کبھی سُنّی مذہب کی ایک شاخ سمجھا گیا ہے، اگرچہ درحقیقت وہ سُنّی مذہب کے قیام سے بہت پہلے وجود میں آئی۔ جن سرکش لشکریوں نے حضرت علیؓ کو فتح صفّین کے جان جوکھوں سے کمائے ہوئے ثمر سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا اور بعد میں نہروان کے مقام پر اُن کے خلاف بغاوت کر دی، خارجی کا نام پہلے پہل اُن کو دیا گیا (خارجی کے معنی ہیں مفرور یا باغی) شہرستانی نے اس شورش کی سرگزشت بڑی صراحت سے بیان کی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس پر مُصر تھے کہ خلیفہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کے درمیان

---

[1] اس کی تفصیل اُوپر آ چکی ہے۔..........

جو تنازعہ تھا اس کی تحکیم کرائی جائے۔ اُنھوں نے حضرت علیؓ کو اس پر بھی مجبور کر دیا تھا کہ ابو موسیٰؓ اشعری کو خانوادۂ محمدی کا نمائندہ مقرر کریں۔ اگرچہ حضرت علیؓ کا دل گواہی نہ دیتا تھا کہ ابو موسیٰ اس کے لیے موزوں ہیں۔ تحکیم کی شرائط طے ہوئی ہی تھیں کہ یہ سپاہی پیشہ ماہرینِ دینیات، اسلام کے یہ منتقدین ایک دوسرے کے ساتھ اس بحث میں اُلجھ گئے کہ آیا کسی امرِ دینی کو انسانی فیصلے کا موضوع بنانا جائز ہے یا نہیں۔ مسلمانوں کو دشمنوں کی آنکھوں کے سامنے ایک دوسرے کا کشت و خون کرنے سے روکنے کی خاطر حضرت علیؓ اپنی فوج کے بیشتر حصے کو ساتھ لے کر عازمِ کوفہ ہو گئے اور تحکیم کے نتیجے کا انتظار کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا دستہ دومۃ الجندل میں چھوڑ گئے۔ باغیوں نے کوفہ پہنچتے ہی بارہ ہزار کی تعداد میں حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ دیا اور نہروان جا کر عساکرِ مملکت کے خلاف ایک خطرناک مورچہ قائم کیا۔ حضرت علیؓ کی طبیعت چونکہ خونریزی سے نفور تھی، اس لیے اُنھوں نے ان لوگوں کو بار بار تاکید کی کہ جادۂ اطاعت پر لوٹ آئیں۔ اس کا جواب اُنھوں نے اُن کے قتل کی دھمکی سے دیا۔ اب حضرت علیؓ کا پیمانۂ تحمل لبریز ہو گیا۔ چنانچہ اُن پر حملہ کر دیا گیا اور اُنھیں دو لڑائیوں میں شکست دی گئی۔ شہرستانی کہتا ہے کہ چند باغی بچ کر بھاگ گئے اور بحرین جا کر، جو اسلام کے تمام شترانِ بے مہار کی جائے پناہ تھا، اُنھوں نے اس خطے کے غیر متمدن باشندوں میں اپنے فتنہ انگیز نظریئے پھیلائے۔ عبدالملک کے زمانے میں اُنھوں نے دوبارہ سر اُٹھایا لیکن منہ کی کھا کر واپس چلے گئے اور احسا، اور بحرین میں اُن کے جو قلعے تھے اُن میں گھس کر چھپ گئے۔ مروان ثانی کے عہد میں وہ پھر نکلے اور یمن، حجاز اور عراق میں پھیل گئے۔ اُن پر حملے کئے گئے اور اُنھیں شکست دے کر عمان میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا جہاں وہ آج تک آباد ہیں۔ عباسیوں کے دورِ خلافت میں انھوں نے افریقہ کے بربروں میں اپنے نظریوں کی اشاعت کی اور بربروں سے خلفائے بغداد کے خلاف مکرر بغاوتیں کرائیں۔ خوارج کو اسلام کے کیلونسٹ (Caluinists) کہنا چاہیئے۔ اُن کے نظریئے تاریک، درشت، مسرت سے عاری اور تعصب سے مملو ہیں۔ وہ کٹر قسم کے جبریہ ہیں۔ وہ حضرت عمرؓ کے بعد کسی خلیفہ کی امامت کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے سرداروں کو ائمۂ برحق تصور کرتے

ہیں۔جہاں دوسرے سُنّی امام کے لیے یہ لازمی قرار دیتے ہیں کہ وہ قریشی اور آزاد ہو، وہاں خارجی اُسے ضروری نہیں سمجھتے۔اُن کے نزدیک غیر قریشیوں اور غلاموں کو بھی خلیفہ منتخب ہونے کا حق ہے۔شہرستانی خارجیوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں سب سے اہم یہ ہیں: ازارقہ (ابو رشید نافع ابن ازرق کے پیرو) اباضیہ (عبداللہ ابن اباض کے پیرو، جس کا خروج آخری اُموی خلیفہ مروان کے عہد میں ہوا) نجدۃ العاذریہ (نجدۃ ابن عامر کے پیرو) عجاردہ (عبدالکریم بن عجرد کے پیرو) اور صفریۃ الزیادیہ۔

ان فرقوں میں ازارقہ سب سے بڑھ کر کٹّر، اکل کھرے اور تنگ نظر ہیں۔اُن کا عقیدہ ہے کہ اُن کے سوا سب فرقے داخلِ جہنّم ہوں گے۔اس لیے انھیں یا تو جبراً راہِ راست پر لانا چاہیے یا نیست و نابود کر دینا چاہیے۔کسی مشرک کو زندہ نہ رہنے دینا چاہیے (مشرک کی اصلاح کو وہ بڑے وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں سب کو شامل کر لیتے ہیں) تمام گناہوں کا اُن کے نزدیک ایک ہی درجہ ہے۔قتل، زنا، خمر، تمباکو نوشی سب اُن کے مذہب میں مستوجبِ عذاب ہیں۔جہاں دوسرے مسلمانوں کا، عام اس سے کہ وہ سُنّی ہوں یا شیعہ، یہ عقیدہ ہے کہ ہر بچّہ مسلمان بن کر دنیا میں آتا ہے[1] اور جب تک تعلیم اُسے بگاڑ نہیں دیتی مسلمان ہی رہتا ہے وہاں ازرقی یہ کہتے ہیں کہ کافر کا بچّہ کافر ہوتا ہے۔جس طرح راسخ العقیدہ عیسائیوں کا یہ ایمان ہے کہ جس بچّے کو بپتسمہ نہ دیا گیا ہو وہ دوزخ میں جائے گا، اسی طرح خارجی یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس بچّے کو کلمہ نہ پڑھایا گیا ہو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔حجاج بن یوسف نے ازرقیوں کا قلع قمع تو کر دیا لیکن اُن کے سنگدلانہ نظریوں نے تو صدیوں کے بعد وہابیت کی صورت میں عود کیا۔

اباضیہ ازارقہ سے یقیناً کم متعصب ہیں۔وہ زیادہ تر عمّان میں آباد ہوئے اور ابھی تک مسقط میں پائے جاتے ہیں۔ازارقہ اور اُن کے بعد وہابی اباضیہ کے ساتھ برسرِ جدال رہے۔

---

[1] کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام

اباضیہ کے نزدیک عامۃ المسلمین ملحد تو ہیں لیکن مشرک نہیں۔ اس لیے اُن کے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ نکاح جائز ہے۔ اس امر میں اور بہت سے دوسرے امور میں وہ ازارقہ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ اپنے فرقے کے لوگوں کے خلاف دوسرے مسلمانوں کی گواہی قبول کرتے ہیں اور حالتِ جنگ کے سوا دوسرے مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ جہاں تک کافروں کے بچّوں کے کافر ہونے کا سوال ہے شہرستانی کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کرتے لیکن اصحاب کبار پر تبرّا بھیجنے کے معاملے میں وہ ازارقہ سے متفق ہیں۔

اباضیہ اب تک عمّان پر قابض رہے ہیں۔ وہابیوں نے اُن پر زبردست دباؤ ڈالا اس کے باوجود وہ مشرقی عرب کے ساحل پر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں لیکن وہ بڑی سرعت سے مسلمانوں کی عام جماعت میں مدغم ہوتے جا رہے ہیں۔ مسٹر پیلگریو (Mr. Palgrave, نے اپنی کتاب Travels in Central Arabia) میں وہابیوں کا نقشہ قدرے خوش آئند رنگوں میں کھینچا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ بلا واسطہ اُن ازرقیوں کے جانشین ہیں جنھوں نے حجاج بن یوسف کے ہاتھوں شکست کھا کر وسطی عرب میں پناہ لی۔ محمد بن عبدالوہاب کے عقائد و نظریات نافع بن ازرق کے پیروؤں کے عقائد و نظریات سے نہایت قریب کی مشابہت رکھتے ہیں۔ ازرقیوں کی طرح وہابی بھی تمام دوسرے مسلمانوں کو مشرک کہتے ہیں اور اُن کا مال لوٹنے اور انھیں غلام بنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ آج کل کے مسلمانوں میں جو تشبیہ پرستانہ رسوم رائج ہیں اُن کے خلاف وہابیوں کی بغاوت چاہے کتنی ہی قابلِ تحسین ہو حقیقت یہ ہے کہ نجد کے اخوان کی طرح دین اور خدا کی حاکمیت کے بارے میں وہ جو عقائد رکھتے ہیں اُن میں کیلون (Caluin) کے پیروؤں کے خیالات کی سی سختی ہے اور وہ ترقّی اور نشو و نما سے متصادم ہیں۔

بابیت انیسویں صدی کے اوائل میں ایران میں نمودار ہوئی اسے بہت خوشگوار رنگوں میں نیز اور بہت ناخوشگوار رنگوں میں بھی پیش کیا گیا ہے مسلم اہل الرائے کے نزدیک وہ مزدکیت یعنی ایک قسم کی

مشرقی اجتماعیت و اشتراکیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بابیوں کے یہاں مردوں اور عورتوں کی جو ملی جلی مجلسیں ہوتی ہیں اُنھیں اُنھی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے جن نگاہوں سے ابتدائی عیسائیوں کی عشقیہ ضیافتوں (Agapae)* کو پُرانے مذہبوں کے لوگ دیکھتے تھے۔ دوسری طرف ایک یورپی عالم[1] جو تحقیق اور فضیلت میں اُونچا پایہ رکھتا ہے اور جس نے بابیوں کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اُن کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھا ہے بابیت کے بارے میں کہتا ہے کہ ایرانیوں کی سرشت میں جو وحدت الوجودی میلانات مضمر ہیں اُن کے اندر سے خذ ما صفا ودع ما کدر کا جو انقلاب اُبھر رہا ہے یہ اس کے تازہ ترین مظاہر میں سے ہے۔

یہی مصنف کہتا ہے کہ محمد شاہ[2] کے زمانۂ حکومت میں ملاؤں اور مذہبی عمال کی ریائی پارسائی اور بدکرداری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ تغیر ناگزیر ہوگیا تھا۔ لوگوں کی سیاسی اور معاشرتی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ان حالات میں شیراز کے ایک ملّا، مرزا علی محمد نے جو فاطمی خیال کیا جاتا ہے اور جو بہت سا مطالعہ اور بہت سی سیر و سیاحت کرچکا تھا، حج سے بھی مشرف ہوچکا تھا اور کافی مدت تک عرب اور شام میں بود و باش بھی کرچکا تھا، ایران میں معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کی ایک تحریک شروع کی۔ اس نے عام ملاؤں کے نمائشی زہد کی مذمت کی اور انھیں اس پر زجر و توبیخ کی کہ وہ نواہی و مکروہات کو مباح بنانے کی خاطر مشتبہ حدیثوں کو قبول کرتے ہیں۔ اُس کی باتیں لوگوں کے دل کو لگیں اور انھوں نے جوش و خروش سے اُس کے خیالات کا خیر مقدم کیا۔ بہت سے لوگ آکر اس کے مُرید ہوگئے جن میں قزوین کی ایک نوجوان عورت بھی تھی جس کی علمیت اور فصاحت و بلاغت اس کی تحریک کے حق میں ایک قوی پشت پناہ ثابت ہوئی۔ اس نوجوان عورت کا نام قرۃ العین تھا۔ نہ جانے مُریدوں کی خوشامد نے مرزا علی محمد کا دماغ خراب کر دیا یا

---

[1] گوبینو (Gobineau)

[2] ایران کا تیسرا قاچار بادشاہ جو اپنے دادا فتح علی شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا۔

خود بخود اس کے دل میں تکبر پیدا ہو گیا۔ بہر حال ہوا یہ کہ اس پر ہمہ اوست کی دیوانگی کا دورہ پڑا اور اس نے اپنے آپ کو باب حضرتِ اعلیٰ کے لقب سے ملقب کر کے جزوِ خدائی ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اس کے پیروؤں نے دینی اور ملکی اولی الامر کے خلاف مسلح بغاوت کر دی لیکن شکست کھائی۔ ملاؤں کے تعصب اور سیاسی مصلحتوں نے مل کر بیخ کنی اور تشدد کی ایک ایسی مہم شروع کی جس کے لیے اور نو اور گوبینو بھی خود بابیوں کو قابلِ الزام ٹھہراتا ہے۔ باب اپنے بیشتر ممتاز مریدوں کے ہمراہ قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کی تعلیمات زندہ رہیں۔ اس کے معاشرتی احکام گوبینو کی رائے میں اُس وقت کے مستند نظریوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ وہ نکاح کے رشتے کو بہت اہم سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب تک پہلا نکاح قائم رہے اس وقت تک دوسری بیوی کی اجازت صرف چند شرائط کے ماتحت دیتا تھا۔ جاریہ بازی کو اُس نے یک قلم حرام قرار دیا، طلاق کی ممانعت کی اور عورتوں کو بے پردہ سرِعام آنے جانے کی اجازت دی۔ پردے کی رسم، جیسا کہ گوبینو منصفانہ طور پر کہتا ہے، بڑی خرابیاں پیدا کرتی ہے اور بچوں کی ابتدائی تعلیم پر بہت مضر اثر ڈالتی ہے۔ یہ رسم کسی حکمِ دینی پر مبنی نہیں، بلکہ محض بغرضِ سہولت وجود میں آگئی ہے۔ ایرانِ باستان کے بادشاہ اسے رعب داب کی ایک نشانی سمجھ کر اس پر عمل کرتے تھے۔ مسلم بادشاہوں اور امیروں نے اُسے اُن کی تقلید میں اختیار کیا۔ عربوں کے یہاں قبائلی عورتیں پوری آزادی سے اندر باہر آتی جاتی ہیں۔ بیتِ نبوی کی خواتینِ مطہرات صحابہؓ کے ساتھ ہمکلام ہوتی تھیں اور اُن سے گھر پر ملاقات کرتی تھیں، بلکہ بسا اوقات مردوں کے ساتھ کھانا کھاتی تھیں، لہٰذا گوبینو کی رائے میں مرزا علی محمد نے عورتوں کو اس نقصان دہ دستور کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی جو کوشش کی اس میں کوئی بدعت نہ تھی۔ اس کے مذہبی نظریئے اساسی طور پر وحدت الوجودی ہیں۔

جہاں تک اس کے اخلاقی ضابطے کا تعلق ہے، وہ ڈھیلا نہیں بلکہ بے حد

کرتا ہے[1]۔

بعض مسلم مصنفین نے اسلامی فرقوں کو دو جامع گروہوں میں تقسیم کیا ہے، یعنی اہلِ باطن، جو احکامِ شریعت کے معنی کو دیکھتے ہیں اور اہلِ ظاہر، جو محض اُن کے لغوی معنوں پر انحصار کرتے ہیں۔ لیکن اہلِ باطن کو باطنیہ کے ساتھ خلط نہیں کرنا چاہیئے۔ اہلِ باطن کے گروہ میں صوفیہ، متکلمین اور ارباب فکر شامل ہیں، یعنی زمخشری کے الفاظ میں "ایسے تمام لوگ جو کمالِ الہٰی کی جڑوں کو اپنے دل کے اندر نصب کرتے ہیں"۔ وہ لوگ جو انسانی محاسن کے بلند ترین درجے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، وہ لوگ جو احکامِ شریعت پر کاربند رہتے ہوئے اُن کے اندر یہ منشائے ربی دیکھتے ہیں کہ دنیا کی قوموں میں اتفاق، ہم آہنگی، امن و آشتی اور باہمی خیر خواہی کو فروغ دیا جائے[2]۔

---

[1] اس قابلِ ملاحظہ مذہبی تحریک سے تازہ ترین بحث: بابی نقطۂ نگاہ سے، پروفیسر ای۔جی۔براؤن (Professor E.G. Browne) نے اپنی کتاب (New History of the Bab) میں کی ہے۔ یہ کتاب بابی تصنیف "تاریخِ جدید" کا ترجمہ ہے۔ پروفیسر براؤن نے جو مقدمہ لکھا ہے، وہ نہایت دلچسپ ہے۔ "تاریخِ جدید" میں قرۃ العین کی دلفریب شخصیت کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس عظیم مستشرق نے اپنی نئی کتاب Materials for the Study of the Babi Religion میں بابی مذہب کی نشوونما اور اشاعت کے بارے میں بہت سا مزید مواد مہیا کیا ہے۔ بہائیت، جو اس کی تازہ ترین صورت ہے، زیادہ تر ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔ اس نے بڑی حد تک کرسچین سائنس (Christian Scince) کے نظریوں کو اپنا لیا ہے۔

[2] ملاحظہ کیجئے حصۂ دوم۔ گیارھواں باب۔

(تعلیقات متعلقہ صفحہ ۴۵۲ ، ۴۵۳)

✻ والئ مصر کا نام عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح تھا (ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ مؤلفہ ابن کثیر جلد ۷ ۱ صفحہ ۱۷۰ طبع مصر) یہ خط اسی والئ مصر کی طرف سے لکھا گیا تھا (ایضاً ۱۷۵) نہ کہ حضرت معاویہؓ کی طرف۔ مروان بن حکم نے حضرت عثمانؓ کے علم و اطلاع کے بغیر اس پر مہرِ خلافت ثبت کر دی تھی (ایضاً ۱۸۶ تفصیلات کے لیے دیکھیے ص ۱۶۶ تا ۲۲۲)

(ادارہ)

✻ حضرت علیؓ نے جنگِ جمل کے موقع پر میدانِ جنگ میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے الگ الگ گفتگو کی جس سے متاثر ہو کر یہ دونوں حضرات جنگ سے کنارہ کش ہو گئے۔ لیکن اتنے میں حضرت طلحہؓ کو تیر مارا گیا جس کے نتیجے میں ان کی موت واقع ہوئی (ایضاً ص ۲۴۶ ، ۲۴۷) حضرت زبیرؓ جنگ سے دستبردار ہو کر واپس جا رہے تھے کہ ایک شخص نے نماز کی حالت میں ان پر تلوار کا اس قدر شدید وار کیا کہ ان کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے اس سانحہ پر سخت افسوس اور خفگی کا اظہار فرمایا۔ (ایضاً ۲۴۸، ۲۴۹)

(ادارہ)

نواں باب

اِسلام کی ادبی وسائنسی رُوح

تعلموا العلم فان تعلمه لله حسنة و دراسته تسبیح
والبحث عنه جهاد وطلبه عبادة وتعلیمه صدقة
وبذله لاهله قربة[1]

رسُولِ عربیؐ کو علم اور سائنس سے جو محبت تھی اور جو آپ کو تمام دوسرے معلّمینِ دین سے امتیاز بخشتی اور جدید دنیائے فکر سے آپ کو ایک نہایت قریبی رشتۂ مؤانست میں منسلک کرتی ہے ہم اس کا تذکرہ اُوپر کر آئے ہیں۔ مکّہ پر کفّار کا قبضہ ہو جانے کے بعد اسلام کی جمہوری حکومتِ الٰہیہ کا مستقر، مدینہ، مرجعِ خلائق بن گیا جہاں نہ صرف عرب کے مختلف حصّوں سے بلکہ دُور دراز ملکوں سے بھی طالبانِ حق جوق در جوق آنے لگے۔ مدینے کی شہرت ایرانیوں، یونانیوں، شامیوں، عراقیوں، افریقیوں غرض مختلف رنگوں اور نسلوں کے لوگوں کو دیارِ شمال و مغرب سے کھینچ کھینچ کر لانے لگی۔ بعض لوگ تو غالباً محض یہ دریافت کرنے کے لیے آئے کہ مدینے میں کیا ہو رہا ہے لیکن بیشتر لوگ تحصیلِ علم اور پیغمبرِ اسلامؐ کی باتیں سننے کے لیے عازمِ مدینہ ہوئے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کا ایک محبوب موضوع علم کی قدر و منزلت تھا۔ "علم حاصل کرو، کیونکہ جو شخص راہِ حق میں علم حاصل کرتا ہے وہ ایک کارِ تقویٰ انجام دیتا ہے؛ جو شخص اس کا ذکر کرتا ہے وہ خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے؛ جو شخص اس کی جستجو

---

[1] اس حدیث کا ترجمہ متن میں دیا گیا ہے۔

کرتا ہے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے۔ جو شخص علم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے وہ خیرات تقسیم کرتا ہے۔ جو شخص ایسے لوگوں کو جو علم کے اہل ہیں علم بخشتا ہے وہ ایک عملِ صالح کرتا ہے۔ علم جس کے پاس ہو اُس کو اس امر کی استعداد عطا کرتا ہے کہ ممنوعہ اور غیر ممنوعہ چیزوں میں امتیاز کر سکے۔ وہ ہمارے لیے آسمان کی شمعِ راہ ہے، وہ صحرا میں ہمارا رہبر، خلوت میں ہمارا انیس اور بے یاری کے عالم میں ہمارا یار ہے۔ وہ خوشی میں ہمیں راہِ راست پر رکھتا ہے اور غم میں ہماری ڈھارس بندھاتا ہے، وہ دوستوں کی بزم میں ہماری زینت ہے اور عرصۂ رزم میں ہمارا حربۂ دفاع۔ علم کی مدد سے خدا کا بندہ نیکی کی بلندیوں کو پا لیتا ہے، شرف کے مدارج حاصل کرتا ہے، اس دنیا میں بادشاہوں کا ہم صحبت بنتا ہے اور دوسری دنیا میں سعادتِ ابدی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔[1]"

آنحضرتؐ اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"عالم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے"۔ اور آپؐ اکثر اپنے صحابہؓ کو تاکید کیا کرتے تھے کہ "علم چین میں ہو تو وہاں سے بھی اُسے حاصل کرو"۔[2] "وہ شخص جو علم کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے خدا کی راہ پر گامزن ہوتا ہے"۔ "جو شخص علم کی جستجو میں سفر کرتا ہے اُسے خدا جنّت کا راستہ دکھاتا ہے"۔[3]

قرآن خود علم اور سائنس کی فضیلت پر شاہد ہے۔ زمخشری سورۃ العلق کی تفسیر میں قرآن کے الفاظ کا منشا یوں واضح کرتا ہے: "خدا نے انسانوں کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہ جانتے

---

[1] یہ حدیث ماخوذ ہے ملّا باقر بن محمد تقی المجلسی کی "بحار الانوار" (جلد اوّل۔ باب علم) سے۔ بحوالۂ امام جعفر صادق۔ یہ "مستطرف" (باب چہارم) میں بھی معاذ ابن جبال سے مروی ہے۔ نیز حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" میں (فلوگل کا ایڈیشن صفحہ ۴۴)

[2] "مصباح الشریعت"

[3] "جامع الاخبار"

تھے اور یہ اس کی رحمت کی ایک بڑی نشانی ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو اُن چیزوں کا علم بخشا جن سے وہ ناواقف تھے۔ اس نے انھیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی عطا کی اور انھیں فنِ تحریر کی بیش بہا برکات سے آگاہ کیا کیونکہ اس کی بدولت ایسے بڑے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کا حال صرف خدا کو معلوم ہے۔ تحریر کے علم کے بغیر دوسرے علوم پر عبور حاصل ہو سکتا، نہ سائنس کے مختلف شعبے احاطۂ علم میں لائے جا سکتے، نہ قدما کی تاریخ سے واقفیت بہم پہنچائی جا سکتی، نہ اُن کے اقوال محفوظ رکھے جا سکتے، نہ کتبِ آسمانی قلمبند کی جا سکتیں۔ اگر یہ سارے علوم موجود نہ ہوتے تو امورِ دین و دنیا کا انتظام ممکن نہ ہوتا۔"

ظہورِ اسلام کے وقت تک اس خطّے میں جو صحیح معنوں میں دنیائے عرب کہلاتا ہے یعنی جزیرہ نمائے عرب اور اس کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں چند علاقے علم و دانش کی نشوونما کے کوئی آثار ہویدا نہ ہوتے تھے۔ شاعری، خطابت اور نجوم (محض عدالتی فیصلوں کے لیے) ماقبلِ اسلام کے عربوں کے مرغوب مشغلے تھے لیکن سائنس اور ادب کے دلدادہ مفقود تھے۔ ہادیٔ اسلام کی تلقین نے عرب قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو جگا کر اُن میں ایک نئی حرکت پیدا کر دی۔ آپ کی مدتِ حیات کے اندر ہی ایک تعلیمی ادارے کی داغ بیل پڑ گئی جس کی بنیاد پر آئندہ سالوں میں بغداد، سالرنو، قاہرہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ یہاں معلمِ اسلام بنفسِ نفیس صفائے قلب اور پاکیزگیٔ روح پیدا کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔ "صانعِ حقیقی کے کاموں پر ایک گھنٹے کا غور و تامل ستر سالوں کی عبادت سے بہتر ہے[1]،" "علم و حکمت کا سبق سننے میں ہزار شہیدوں کی نمازِ جنازہ پڑھنے یا ہزار راتیں قائم الصلوٰۃ رہنے سے زیادہ ثواب ہے۔" "جو طالبِ علم تلاشِ علم میں نکلے گا، خدا اُسے جنت الماوٰی میں اونچا مقام دے گا۔" "اس کا ہر قدم مبارک ہے اور اس کے ہر سبق کا اُسے ثواب ملے گا۔" "فرشتے جنت کے دروازے پر جویائے علم کا خیر مقدم

---

[1] ایضاً

کریں گے۔" "اہلِ علم کی باتوں کا سُننا اور سائنس کے سبقوں کا دل پر نقش کرنا مذہبی ریاضتوں سے بہتر ہے ...." "ایک سو غلاموں کے آزاد کرنے سے بھی بہتر ہے۔" "جو شخص علم اور عالموں کی حمایت کرے گا خدا اس پر عقبیٰ میں مہربان ہوگا۔" "جو شخص عالموں کی عزت کرتا ہے وہ میری عزت کرتا ہے۔" حضرت علیؓ علم کے ایسے شعبوں کا درس دیتے تھے جو اس نوخیز جمہوریہ کی ضرورتوں کے لیے سب سے موزوں تھے۔ اُن کے منقول ارشادات میں ذیل کے ارشادات ہیں۔ "علم و حکمت میں ناموری سب سے بڑی عزت ہے۔" "جو شخص علم کو زندگی بخشتا ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔" "کسی آدمی کا سب سے اچھا زیور علم ہے۔"

ہادیٔ اسلام اور اُن کے رئیس التلامذہ کی زبان سے اس قبیل کے خیالات کے اظہار کا قدرتی نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک وسیع مشرب قائم ہوگیا اور مسلمانوں کے تمام طبقوں میں علم کا ذوق و شوق پیدا ہوگیا۔ کوئی فنِ خطاطی نے، جو ایک صحابی نے حیرہ میں سیکھا، مسلمانوں کی ابتدائی نشو و نما کو اور بھی پروان چڑھایا۔ لیکن وہ زمانہ بدرجۂ افضل سنجیدہ طبعی اور ترقیٔ ایمان کا زمانہ تھا۔ جب کہ روحِ انسانی بے مقصد، مُردہ اور جامد فلسفے کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ مذہب پر کار بندی ایمان و تقوےٰ کی روح کو برقرار رکھنا اور علم کے ایسے شعبوں کی ترقی جو زندگی کے جہادِ شبانہ روز میں عملی طور پر مفید تھے ــــ یہ تھے وہ معاملات جن پر اس وقت مسلمانوں کی توجہ اور سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر مرکوز تھی۔

فلسفیانہ قیاس کا دور شروع ہونے ہی والا تھا۔ اس کا ہیولےٰ معلّمِ اسلام کے مثبت ارشادات نے مہیا کر دیا تھا۔ اودھر آپ مصروفِ کار تھے، اُدھر آپ کا شاگردِ رشید محوِ فکر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے خود اعلان کیا تھا کہ جو شخص آپ کی تعلیمات کو سمجھنا چاہتا ہو اُسے علی مرتضیٰ سے رجوع کرنا چاہیے۔[1] آپ کے ارشادات کا مطلب آپ کے رفیقِ شفیق، آپ کے شاگردِ معتمد، آپ کے جاں نثار چچیرے بھائی سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا؟ وہ تعلیم جو نرمی اور ہم آہنگی سے بچپن میں دی گئی تھی بالآخر بار آور ہوئی۔

---

[1] انا مدینۃ العلم و علی بابہا۔

خلفائے متقدّمین کے تحت عرب قوم میں جو شورش و بدامنی رہی اُس کے باوجود ابتدائی اسلام کے دارالخلافہ میں ادب و فن سے تغافل نہیں برتا گیا۔ حضرت علیؓ اور اُن کے چچیرے بھائی حضرت ابن عباسؓ شعر و شاعری، صرف و نحو، تاریخ اور ریاضی کا درس دیتے تھے۔ دوسرے صحابہ شعر خوانی اور خطابت سکھاتے تھے اور چند اور صحابہؓ فنِ کتابت کی ترویج کرتے تھے جو زمانۂ سلف میں ایک بے بہا شعبۂ علم تھا۔

حضرت عثمانؓ کی المناک وفات پر جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں، آوازۂ خلق نے حضرت علیؓ کو خلافت کی ذمہ داری سونپی۔ اپنی گوشہ نشینی کے دوران وہ عقل کی روشنی میں ارشاداتِ نبوی کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہے تھے۔ ایک فرانسیسی مؤرخ ان کے بارے میں لکھتا ہے: "اگر وہ قتل نہ کر دیئے جاتے تو دنیائے اسلام پیغمبر کی تعلیمات کو عقل اور شریعت کے وصال کی صورت میں اور حقیقی فلسفے کے بنیادی اصولوں کو مثبت عمل کی صورت میں مجسم دیکھ پاتی"۔ علم و حکمت سے جو والہانہ محبت آنحضرتؐ کی امتیازی صفت تھی وہ محبت آپ کے شاگرد کے ہر لفظ سے ٹپکتی ہے۔ اُن میں جہاں ایک ایسی وسیع المشربی تھی جو اپنے وقت سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھی وہاں ایک پُرخلوص جذبۂ دینداری اور رسوخِ ایمان بھی تھا۔ اُن کے مواعظ و خطبات جو اُن کے ایک جانشین نے پوری امانت داری کے ساتھ قلمبند کئے اور اُن کی دعائیں منبعِ خیرِ کل سے جیتی جاگتی التجائیں اور انسان کی خیر کوشی اور سعادت طلبی پر ایک بے پایاں ایمان کے اعلان ہیں۔ بنی اُمیّہ کا تختِ سلطنت پر متمکّن ہونا دنیائے اسلام کی ترقیٔ علم اور آزادیٔ فکر کے حق میں ایک صدمہ تھا۔ اُن کے طوفانی ادوارِ حکومت نے قوم کو سائنس کے درس و تدریس جیسے پُرامن مشاغل کی مہلت ہی نہ دی۔ اس پر آفت یہ ہوئی کہ اُموی حکمران سب ماضی کے پرستار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں جنگ اور سیاست کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ ایک صدی کی طویل مدتِ حکومت میں خاندانِ اُموی نے صرف ایک ایسا شخص پیدا کیا جسے علم و ادب سے شغف تھا۔ یہ شخص ابو ہاشم خالد ابن یزید "حکیم بنی مروان"[1] تھا۔

[1] "مأخذِ علوم" از مولوی سید کرامت علی۔ بہ صاحبِ فضیلت عالم (باقی حاشیہ صفحہ ۵۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

جسے اس کی علمیت و فضیلت کے باعث جانشینی کے معاملے میں نظرانداز کر دیا گیا۔
اولادِ ابوسفیان و ہند کے انتہاء رشک و حسد اور انتھک دشمنی نے اہلِ بیتِ نبویؐ کو مسکینی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے جدِ امجد کے ارشادات پر خلوص اور دیانت داری سے عمل کیا اور ذہنی مشاغل کو اپنے لیے ذریعۂ تسکین بنایا۔ انھیں علم سے جو عاشقانہ لگاؤ تھا اور حُبِ انسانیت کا جو بیتاب جذبہ اُن کے اندر کارفرما تھا (کیونکہ ان کی نگاہیں شریعت کی لغوی تفسیروں سے بلند تر حقائق پر جمی ہوئی تھیں) اس سے اسلام کی روحانیت اور وسعتِ قلب آشکار ہوتی ہے[1] امام جعفر صادق نے علم کی جو تعریف کی ہے اُس سے کسی حد تک پتہ چلتا ہے کہ حکمائے اہلِ بیت کو انسان کی ترقی پر کتنا گہرا ایمان تھا۔ "قلب کی تنویر اُس کا جوہر ہے۔ حق اس کا سب سے بڑا مقصد، الہام اُس کا رہبر، عقل اُس کی قائل، خدا اس کا مصدرِ الہام اور نطقِ انسانی اُس کا متکلم"[2]
ابتدائی اہلِ بیت کے گرد جن لوگوں کو محبت، عقیدت اور ہمدردی نے جمع کر رکھا تھا قدرتی بات تھی کہ وہ اُن لوگوں کے گوناگوں خیالات سے اثر پذیر ہوتے۔ اس کے باوجود اُن کا فلسفہ کبھی وہ زندگی اور ذوق و شوق سے معرّا لفظی مجادلہ بن کر نہیں رہ جاتا جو ایتھنز اور خاندانِ بطلیموسی کے تحت اسکندریہ کے مکاتبِ فلسفہ بن کر رہ گئے تھے۔
اگرچہ حکمران ادب اور فلسفے سے غافل بلکہ اُن کے مخالف تھے، پھر بھی ائمۂ اہلِ بیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۵) چالیس سال تک ہیگل کے امام باڑے کا مہتمم تھا۔
[1] ملاحظہ کیجئے "حدیثِ اہلاج" از امام علی ابن موسیٰ الرضا، مروی از مفضل بن عمر جعفی (بحار الانوار)
[2] "تاریخ الحکماء" از جمال الدین ابن القفطی، جو اسی نام کی ایک اور کتاب پر مبنی ہے جس کا مصنف شہاب الدین سہروردی تھا۔ شہاب الدین ایک افلاطونی (یعنی اشراقی) تھا اور اس لیے صلاح الدین ایوبی کے بیٹے کے دورِ حکومت میں علماء کے ایک مجمع کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ تقابلی مقابلے کے لیے دیکھیے "نہج البلاغۃ" کا پہلا خطبہ اور "بحار الانوار" میں علم پر جو حدیثیں منقول ہیں۔

نے جوشاں تمام کی اس نے سوریوں اور محکوم قوموں کی دماغی سرگرمیوں کو بڑی حد تک متاثر کیا جہاں بنی اُمیہ نے پرامن ذہنی مشاغل کی ہمت شکنی کی وہاں بنی فاطمہ نے نمایاں فراخدلی سے علم وفضل کی سرپرستی کی۔ وہ ماضی کے غلام نہ تھے۔ سلف اُن کا واحد رہنما نہ تھا۔ ارشاداتِ نبوی کو مشعلِ راہ بنا کر انھوں نے انسانی ارتقا کو پیشِ نظر رکھا اور اپنے آپ کو سائنس اور علم وادب کے تمام شعبوں کی ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ پیغمبرِ اسلامؐ اور خلفائے راشدین کی طرح انھوں نے اُن اربابِ علم وفضل کا خیر مقدم کیا جنھیں قیصر جسٹینین (Justinian) کے جانشینوں کے متعصبانہ جبر وتشدد نے غیر ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ فلسفے اور طب کے جو دارالعلوم نسطوریوں نے اڈلیسا اور نسیبیس میں قائم کیے تھے وہ ٹوٹ چکے تھے اور ان کے مدرس اور طلبا ایران اور عرب میں پناہ گزین تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے، جیسا کہ رسولِ اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اُن کے پیش روؤں نے کیا تھا، مدینے کا رُخ کیا جو اُمویوں کی تاخت وتاراج کے بعد از سرِ نو علم کا مرکز بن گیا تھا اور جسے امام جعفر صادق اور اُن کے حاشیہ نشین علماء وفضلاؔ کے مجمع النجوم نے منور کر رکھا تھا۔ مدینۃ النبی میں مختلف اور متنوع علوم وفنون کے اربابِ کمال کے جمع ہونے نے مسلمانوں میں سائنس اور ادب کو فروغ دیا۔ مدینے سے غیر معمولی ذہنی سرگرمیوں کا ایک دریا دمشق کی طرف بہنے لگا۔ دمشق، جو صحرائے عرب کی شمالی حدود پر اور مکہ ومدینہ سے شام جانے والے تجارتی راستے کے کنارے واقع ہے، قدیم زمانے سے اُمویوں کے ساتھ وابستہ رہا ہے اور شام کے عرب اس خاندان کے ساتھ جسے اُن کی مدد نے تختِ خلافت پر متمکن کیا تھا مفادات اور قرابت داری کے رشتوں میں مربوط تھے چنانچہ بنی اُمیہ نے قدرتی طور پر دمشق ہی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اگرچہ صحیح العقیدہ مسلمان اس سے دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے پھر بھی دارالخلافہ کی حیثیت سے یہ شہر اُن مختلف قوموں کے نمائندوں کا مرکز بن گیا جو اسلام کے دائرۂ حکومت میں آچکی تھیں۔ یونانیوں اور عربوں میں جو مذہبی مناظرے ہونے لگے وہ منطق اور فلسفۂ یونان کے مطالعے کا ایک زبردست محرک ثابت ہوئے اور اعراب کی ایجاد نے صرف ونحو اور لسانیات کو ترقی دی۔ اس

زمانے میں دو سربرآوردہ عیسائی مصنف تھے جنھوں نے اپنے ہم مذہبوں کے تشدد سے نجات پانے کی خاطر دمشق کو اپنا مامن بنا لیا تھا۔ ان کے نام تھے جوہینز دمیسینس (Johannes Damascenus) اور تھیوڈورس ابوکرہ (Theodorus Abucara) ان مصنفین نے مسلمانوں کے خلاف جو مناظراتی کتابیں لکھیں اور اپنے قدامت پرست ہم مذہبوں کے ساتھ جو عقلیاتی اور فلسفیانہ مباحثے کئے انھوں نے مدنی دبستان کے اثرات کے ساتھ مل کر جو اس وقت امام محمد الباقر اور امام جعفر صادق کے زیرِ سرپرستی عروج پر تھا، بہت جلد عربوں کے یہاں فلسفیانہ رجحانات پیدا کر دیئے۔ صدیوں سے ایرانی یونانی فلسفے سے واقف چلے آرہے تھے۔ نسطوریوں نے جسٹینین کی حکومت کے آغاز ہی سے کشورِ خسرواں میں پھیلنا شروع کر دیا تھا لیکن جب تک اسلام نے متفرق اجزا کو ملا کر ایک نامیاتی کلیت پیدا نہ کی اس وقت تک یونانی سائنس اور ثقافت نے مغربی ایشیا کی ذہنی نشو ونما پر کوئی حقیقی اثر مرتب نہ کیا۔ بہر حال اُموی خلافت کے اختتام کے قریب چند مسلم مفکرین منظرِ عام پر آئے جنھوں نے ایسے مسائل کو موضوعِ بحث بنایا جو اس وقت لوگوں کے ذہنوں کو دعوتِ حل دے رہے تھے۔ ان مفکرین کے افکار و تصورات نے آنے والی نسلوں کے خیالات پر بڑا گہرا اثر کیا۔

لیکن مسلمانوں کی ادبی اور سائنسی سرگرمیاں صحیح معنوں میں دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئیں۔ ان کا سب سے بڑا محرک عربوں کا شہروں میں آباد ہونا تھا۔ اُس وقت تک وہ چھاؤنیوں میں رہتے چلے آئے تھے جو محکوم قوموں کی بستیوں سے علیحدہ ہوتی تھیں۔ حضرت عثمانؓ نے عربوں کو مفتوحہ ملکوں میں زمینیں حاصل کرنے یا محکوم قوموں کے ساتھ شادی بیاہ کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ اس ممانعت کا مقصد ظاہر تھا؛ کیا قدیم زمانوں میں اور کیا جدید زمانوں میں ہر فاتح قوم نے یہی وتیرہ اختیار کیا تھا۔ برطانوی ہندوستان اور فرانسیسی الجزائر میں اسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ بنی اُمیّہ کی ساری مدتِ حکومت کے دوران عرب لوگ معاشرے کا مقتدر طبقہ رہے تھے یعنی محکوم قوموں کے درمیان فوجی اعیان و اشرافت کا

ایک گروہ۔ اُن کی اکثریت فنونِ حرب میں مشغول تھی۔ علم وادب اور سائنس کے پُرامن مشاغل ہاشمیوں اور انصار کی اولاد پر چھوڑ دیے گئے تھے، یعنی حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اخلاف پر۔ عربوں کے یہاں رُومیوں کی طرح متعلقین کا جو قاعدہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا تھا عرب اُسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس قاعدے میں یہ فائدہ تھا کہ محکوموں کو حفاظت اور رعایات مل جاتی تھیں اور فاتحوں کو زراعت میں مدد کے لیے مزید آدمی مل جاتے تھے۔ چنانچہ مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی سربرآوردہ مقامی خاندانوں نے چیدہ چیدہ صحرائی قبیلوں سے تعلق قائم کیا اور اس طرح فاتحوں کے "مولا" یا متعلقین (نہ کہ اُن کے آزاد کردہ غلام، جیسا کہ بعض لوگوں نے سہواً خیال کیا ہے) بن گئے۔ ہاشمیوں میں سے اور انصار ومہاجرین کی اولاد میں سے جو لوگ مدینے کی تاخت وتاراج کے بعد بچ گئے تھے اُن کے علاوہ اُن متعلقین کے حصے میں اُموی حکومت کے دوران فضل وکمال اور علم وفنون آئے۔ عباسیوں کے برسرِاقتدار آتے ہی ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ عباسیوں نے ایرانیوں کی مدد سے اقتدار حاصل کیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے عرب سے آئے ہوئے فوجی نوآبادوں کی ناقابلِ اعتبار دوستی کی بہ نسبت جمہور رعایا کی وفاداری اور خیر خواہی پر زیادہ بھروسا کرتے تھے۔ ابوالعباس سفّاح کے ہاتھوں میں صرف دو سال عنانِ حکومت رہی۔ اُس کے بھائی اور جانشین المنصور نے اگرچہ فاطمیوں پر بڑے ستم ڈھائے، لیکن وہ ایک اُونچے پائے کا سیاسی مدبر تھا۔ اُس نے مملکت کی باقاعدہ تنظیم کی، ایک مستقل فوج اور پولیس قائم کی اور نظم ونسق میں مضبوطی اور باضابطگی پیدا کی۔ عرب اب تک پیشۂ سپاہگری میں ہمہ تن منہمک رہے تھے۔ المنصور نے جو اسلوبِ حکومت اختیار کیا اُس نے عربوں کے طبعی جوہر کو ایک نیا رجحان بخشا۔ انھوں نے شہروں میں سکونت اختیار کی، جاگیریں خریدیں اور جس ذوق وشوق سے وہ پہلے جنگی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے اسی ذوق وشوق سے وہ علم وادب کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے۔

فرات کی زرخیز وادی، جسے مغربی ایشیا کے دو بڑے دریا سیراب کرتے ہیں قدیم ترین

زمانوں سے سامراجی حکومتوں کا مرکز اور تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ یہی وہ اقلیم ہے جہاں بابل، طیسفون (Ctesiphon) اور سلوشیہ (Seleucia) کی تہذیبیں منصۂ شہود پر آئیں۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس زمانے میں یہاں بصرہ اور کوفہ کے شہر تھے جن کے باشندے شورش پسند اور تنیز طبع تھے۔ اسلامی فتوحات کی ابتدا ہی سے یہ شہر تجارتی کاروبار کے اہم مرکز تھے۔ کوفہ کچھ مدت تک دارالخلافہ بھی رہ چکا تھا۔ بصرہ اور کوفہ میں بلادِ مشرق کے تمام منچلے آکر جمع ہو گئے تھے جو بنی امیہ کے دارالخلافے میں یا تو جا نہ سکتے تھے یا جانا نہ چاہتے تھے۔ عباسیوں کے لیے دمشق نہ صرف کشش سے خالی بلکہ خطروں سے پُر تھا۔ رہے بصرہ اور کوفہ، سو وہ اپنے سیماب فطرت اور ناقابلِ اعتبار باشندوں کی بدولت دارالخلافہ بننے کے قابل نہ تھے۔ المنصور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بالآخر اس نے وہ مقام انتخاب کیا جہاں آجکل بغداد ہے۔ یہ مقام بصرے سے چھ دن کی مسافت پر تھا۔

کہتے ہیں کہ بغداد ایران کے مشہور بادشاہ کسریٰ انوشیروان کی زمستانی آرامگاہ تھا اور اس کا نام "باغِ داد" (انصاف کا باغ) اُسی عادل فرمانروا کے نام نیک کی یادگار ہے۔ ایرانی بادشاہی کے خاتمے کے ساتھ ہی اُس باغ کا بھی خاتمہ ہو گیا جہاں ایشیا کا شہنشاہ اپنی کثیر التعداد رعایا کی دادرسی کیا کرتا تھا۔ پھر بھی روایت نے اس کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ یہ خوبصورت مقام جو مرکزی بھی تھا اور صحت بخش بھی منصور کو بھا گیا، چنانچہ اپنے وقت کے بہترین ماہرِ تعمیرات کے عصائے جادو کی ایک جنبش سے خلیفوں کا شاندار شہر اس طرح نمودار ہوا جس طرح سمندر کی دیوی وینس جو پیٹر دیوتا کے حکم سے یکایک سمندر کی لہروں کے اندر سے جلوہ گر ہو گئی تھی۔

منصور کے بغداد کی بنیاد ۱۴۵ھ میں دریائے دجلہ کے کنارے پر رکھی گئی۔ تھوڑی ہی مدت میں ایک اور شہر (ایک نیا بغداد) ولی عہدِ خلافت کی نگرانی میں، جس نے خلیفہ بن کر المہدی کا لقب اختیار کیا، دریا کے مشرقی کنارے پر پیدا ہو گیا۔ یہ نیا شہر اپنی عمارتوں کی شان و شوکت کے اعتبار سے منصوریہ کی خوبصورتی اور عظمت کا جواب تھا۔ بغداد

جس کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ چنگیزی لشکروں کا وہ سیلاب جس نے مغربی ایشیا میں عربی تہذیب کے تمام آثار ملیامیٹ کر دیئے اسے بھی اُن کے ساتھ برباد کر دے، اپنے عروج کے زمانے میں ایک نظر فریب اور پُرشکوہ شہر اور خلفائے اسلام کے شایانِ شان پایۂ تخت تھا۔[1]

مغلوں کی تاخت و تاراج سے پہلے بغداد کی جو خوبصورتی اور شان و شوکت تھی اُسے انوری نے، جو شوکتِ الفاظ کے اعتبار سے فارسی قصیدہ گویوں کا بادشاہ ہے، ذیل کے اشعار میں زندۂ جاوید کر دیا ہے:۔

خوشا نواحیٔ بغداد جائے فضل و ہنر — کہ کس نشان ندہد در جہان چنان کشور
سوادِ او بمثل چون سپہر مینا رنگ — ہوای او بصفت چون نسیم جان پرور
بخاصیت ہمہ سنگش عقیقِ لؤلؤ بار — بمنفعت ہمہ خاکش عبیرِ غالیہ بر
صبا سرشتہ بخاکش طراوتِ طوبیٰ — ہوا نہفتہ در آبش حلاوتِ کوثر
کنارِ دجلہ ز ترکانِ سیمتن خلخ — میانِ رحبہ ز خوبانِ ماہرخ کشمر
ہزار زورقِ خورشید شکل بر سرِ آب — بدان صفت کہ پراگندہ بر سپہر شرر

بغداد کو دارالسلام کا جو نام دیا گیا وہ منجمِ شاہی نوبخت کی ایک پیشگوئی پر مبنی تھا کہ اس شہر کی چاردیواری کے اندر کسی خلیفہ کی وفات نہ ہوگی جو حیرت انگیز طور پر سینتیس خلیفوں کے بارے میں ٹھیک نکلی۔ اس کی چار دیواری کے اندر یا اس کے اردگرد اولیاء و اصفیاء کے اتنے مزار ہیں جن کا سب مسلمان احترام کرتے ہیں کہ اُسے Bulwark of the Holy ۔ حصن الاولیاء کا لقب مل گیا ہے۔ یہاں بہت سے اکابر ائمہ اور مشائخِ اصفیا کے روضے ہیں۔ یہاں امام موسیٰ کاظم کی ابدی آرامگاہ ہے۔ یہاں امام ابوحنیفہ، شیخ جُنید، شیخ شبلی اور شیخ عبدالقادر گیلانی جیسے کاملین و عارفین کے مرقد ہیں۔

ائمہ اور مشائخ کے مزاروں کے درمیان خلفاء اور ان کی بیویوں کے مقبرے تھے۔

---

[1] بغداد کے بارے میں تفصیلی بیان Short History of the Saracens میں دیکھئے۔

شہر میں جو لیے شمار مکتب، مدرسے اور دار العلوم تھے اُن میں دو اپنے طلبہ کی تعداد اور درجۂ علمیت کے اعتبار سے سب سے اہم تھے۔ یہ تھے مدرسۂ نظامیہ اور مدرسۂ مستنصریہ۔ اوّل الذکر پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں سلطان ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک نے قائم کیا تھا اور مؤخر الذکر دو صدیاں بعد خلیفہ مستنصر باللہ نے۔

خلفاء کے زمانے میں ترقیٔ تمدن کا ایک مؤرخ[1] لکھتا ہے: "یہ ایک ملاحظہ طلب بات ہے کہ جس حکمران کے اخلاقی اور دماغی اوصاف نے اس کی فطرت کے تاریک پہلو پر پردہ ڈال دیا اُسی نے اس علمی و فکری تحریک میں جان ڈالی جس کا آغاز اس وقت دنیائے اسلام میں ہوا۔"

منصور ایک مؤقر عالم اور ماہرِ ریاضی بھی تھا اور علم و ادب کا مربی بھی تھا۔ اس کے حکم سے غیر ملکوں کی ادبی اور سائنسی تصنیفوں کے ترجمے عربی زبان میں کیے گئے۔ ہندوستانی کہانیوں کا مشہور مجموعہ "ہت اُپدیش" فلکیات پر ہندوستان کی مشہور تصنیف "سدھانت" ارسطو کی بہت سی کتابیں، کلاڈیس بطلیموس کی "المجسطی" (The Almagest) اقلیدس (Euclid) کی تصنیفات اور متعدد یونانی، بازنطینی، ایرانی اور شامی کتابیں عربوں کی زبان میں منتقل کی گئیں۔ مسعودی کہتا ہے کہ ان ترجموں کے شائع ہوتے ہی لوگوں نے انھیں ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔

منصور کے جانشین نہ صرف علماء و فضلاء کے سرپرست تھے، جنھوں نے ہجوم در ہجوم ملک کے گوشے گوشے سے دارالخلافہ کا رُخ کیا، بلکہ خود بھی ہر شعبۂ علم میں کسبِ کمال کے ساعی تھے۔ چنانچہ ان کے زیرِ سایہ مسلمانوں نے یا دوسرے الفاظ میں مختلف قوموں نے جو خلافت کی وسیع قلمرو میں آباد تھیں، حیرت انگیز سرعت سے علم و فکر میں ترقی کی۔

ہر بڑی قوم کی تاریخ میں ایک عہدِ زرّیں ہو گزرا ہے۔ ایتھنز کی تاریخ میں وہ پیریکلیز

---

[1] Kremer, Culturgeschichte des Orients unter des Chalifen, vol. 2, p.412

کا زمانہ تھا اور روم کی تاریخ میں آگسٹس (Augustus) کا۔ (Periclean) دنیائے اسلام کا بھی ایک دورِ عظمت تھا۔ لیکن ہم عادلانہ طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جو زمانہ منصور کی تخت نشینی سے لے کر معتضد باللہ کی وفات تک گزرا وہ متوکل کی خلافت کے مختصر سے وقفے کو نظر انداز کر کے، اُس پہلے دورِ عظمت کا ثانی تھا بلکہ شوکت وسطوت میں اُس سے بھی آگے نکل گیا۔ پہلے چھ عباسی خلفاء اور بالخصوص مامون کے عہدِ حکومت میں مسلمان تہذیب کا مقدمۃ الجیش بنے۔ ایک تو عرب قوم کی سرشت میں مادۂ قبول تھا جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدل سکتی تھی۔ دوسرے اُسے ایک مرکزی جغرافیائی حیثیت حاصل تھی۔ ایک طرف قریبِ مرگ یونان اور روم کا بیش بہا ورثہ تھا، دوسری طرف ایران کا گنجِ شائیگاں اور تیسری طرف صدیوں کی نیند کے ملتے چین اور ہندوستان تھے۔ چنانچہ عرب قوم معلمِ انسانیت بننے کے لیے بدرجۂ اتم موزوں تھی۔ اس کے پیغمبر کی الہامی ہدایت نے اسے ایک ضابطۂ اخلاق اور ایک ضابطۂ ملی تو عطا کر ہی رکھا تھا۔ اس پر جب اس کے حکمرانوں کی سرپرستی کا اضافہ ہوا تو اس نے مشرق و مغرب کی دولت سمیٹ لی اور اُسے اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ شامل کر کے سپاہیوں کی ایک قوم سے عالموں کی ایک قوم بن گئی۔ ہمبولٹ (Humboldt) کہتا ہے: "عربوں کو ایک ایسا مقام حاصل تھا کہ اُن کا مشرق و مغرب کے درمیان توسط کا ذریعہ بننا اور فرات سے لے کر وادیٔ الکبیر اور وسطِ افریقہ تک تمام قوموں پر اثر انداز ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اُن کی عدیم النظیر ذہنی سرگرمیوں نے دنیا کی تاریخ میں ایک مستقل باب کا اضافہ کیا۔"

اُموی خلافت کا زمانہ مسلمانوں کے لیے آموزش و آزمائش کا دور تھا، جس میں وہ اُس عظیم کام کے لیے جو انھیں تفویض ہوا تھا اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے عباسیوں کے زمانے میں وہ ساری دنیا کے علم و فضل کے خزانہ دار بن گئے۔ خلیفوں کے عاملوں نے سلطنت کی جمع شدہ دولت حاصل کرنے کی خاطر کرۂ ارض کا چپہ چپہ چھان ڈالا جو کچھ جہاں بھی ملا وہ اُسے اُٹھا لائے اور لا کر مشتاقانِ علم کے سامنے بکھیر دیا۔ ہر طرف مدرسے

اور دار العلوم بن گئے، ہر شہر میں کتب خانے قائم ہو گئے جن تک ہر کس و ناکس کی رسائی تھی۔ قرآن کے ساتھ ساتھ قدیم دنیا کے اکابرِ فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ ہونے لگا۔ جالینوس (Galen)، دیوسکوریدیز (Dioscorides)، تمستیس (Themistius)، ارسطو، افلاطون، یوکلڈ، بطلیموس، اپولونیس (Appollonius) سب کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ خلیفے خود ادبی محفلوں اور فلسفیانہ مباحثوں میں شریک ہوتے تھے۔ تاریخِ انسانیت میں پہلی مرتبہ ایک دینی اور آمرانہ حکومت فلسفے کی مؤید و حامی بنی اور اس کا بول بالا کرنے میں کوشاں ہوئی۔

سلطنت کے تمام شہر علم و فن کی ترقی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ صوبوں کے عمال و حکام بادشاہ کی مثال کی تقلید کرتے تھے۔ علم کی تلاش میں سفر کرنا ہادیٔ اسلام کی تعلیم کے مطابق ایک مقدس فریضہ تھا۔ چنانچہ چار دانگِ عالم سے طلبہ قرطبہ، بغداد اور قاہرہ جاتے تھے تاکہ دانشورانِ اسلام کے وعظ سن سکیں۔ اور تو اور، یورپ کے دور افتادہ گوشوں سے عیسائی طلبہ بھی مسلمانوں کی درسگاہوں میں آ کر زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے لوگ جو بعد میں عیسوی کلیسا کے سربراہ بنے مسلم اساتذہ کے شاگرد تھے[1]۔ جب المعز الدین اللہ کے عہد میں قاہرہ کو عروج نصیب ہوا تو عباسی اور فاطمی خلفاء کی سرپرستیٔ علم میں رقابت کی روح پیدا ہو گئی۔ المعز گویا مغرب کا مامون تھا یا یوں کہئے کہ مسلم افریقہ کا میسیناس[2] Maecenas تھا۔ مسلم افریقہ اس وقت مصر کی مشرقی حدود سے لے کر بحر اوقیانوس کے ساحل اور صحرا کے کنارے تک پھیلا ہوا تھا۔ المعز اور اس کے پہلے تین جانشینوں کے زمانے میں علوم و فنون نے بادشاہِ وقت کی خاص سرپرستی کے طفیل خوب ترقی کی۔ معز نے جو دار الحکمت

---

[1] مثلاً گربرٹ (Gerbert) جو بعد میں پوپ سلوسٹر ثانی — Pope Sylvester II — بنا، قرطبہ سے فارغ التحصیل ہوا۔

[2] میسیناس روم کا ایک سیاسی مدبر تھا جس کا نام یورپ میں سرپرستیٔ علم کے لیے ضرب المثل ہے۔ مترجم

(سائنسی ادارہ) قاہرہ میں قائم کیا وہ ایک ایسا ادارہ تھا جس کا تصور بھی یورپ کے ذہن میں اس وقت تک پیدا نہ ہوا جب تک بیکن نے کئی صدیاں بعد ایک مثالی یونیورسٹی کا خاکہ پیش نہ کیا۔ فاس کے ادریسی اور ہسپانیہ کے موری حکمران ادب و فن کی سرپرستی میں ایک دوسرے کے حریف تھے: بحرِ اوقیانوس کے ساحل سے لے کر بحر الہند تک، بلکہ اور بھی مشرق کی طرف بحر الکاہل تک مسلمانوں کی حمایت اور ہدایت کے طفیل فلسفہ و حکمت کا آوازہ بلند تھا۔ جب مشرقی سلطنت بنی عباس کے ہاتھوں سے نکل گئی تو اس کے مختلف خطوں میں جن سرداروں نے حکومتیں قائم کیں انھوں نے بھی خلفائے عباسی کی طرح جن کی نیابت کے وہ مدعی تھے، علم و ادب کی پاسبانی کی۔ ملائیت کے اقتدار اور اس کی علم دشمنی اور حکمت آزاری کے باوجود یہ شاندار دور تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تاخت و تاراج تک جاری رہا لطف کی بات تو یہ ہے کہ جن وحشیوں نے خلافت کا تختہ اُلٹا اور اسلامی تہذیب کا شیرازہ بکھیر دیا وہ جب دائرۂ اسلام میں آئے تو خود علم و حکمت کے پُرجوش حامی و مُربی بن گئے!

اس وقت عیسائی دنیا میں علم اور سائنس کی کیا حالت تھی؟ قسطنطین اور اس کے راسخ العقیدہ جانشینوں کے ماتحت طب و حکمت کے ادارے ہمیشہ کے لیے بند کر دیئے گئے۔ غیر الہامی کتاب شاہنشاہوں کی فیاضی نے جو کتب خانے قائم کئے تھے وہ منتشر یا تباہ کر دیئے گئے۔ علم و حکمت کو "جادو کی طرح حرام اور بغاوت کی طرح گردن زدنی" قرار دیا گیا، فلسفہ اور سائنس کا قلع قمع کر دیا گیا۔ کلیسا کو علوم دنیوی سے جو نفرت تھی اس کا اظہار اس ضرب المثل میں ہوا کہ "جہالت عقیدت کی ماں ہے"۔ اور پوپ گریگوری اعظم (Pope Gregory the Great) نے جو کلیسا کے اعلیٰ اقتدار کا بانی مبانی تھا اس رجعت پرستانہ ضرب المثل کو یوں عملی جامہ پہنایا کہ اس نے سائنسی تحقیق و تدقیق کو روم سے شہر بدر کر دیا اور آگسٹس سیزر (Augustus) کے قائم کئے ہوئے کتب خانۂ شاہی کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس نے قدمائے یونان و روم کی کتابوں کے مطالعے کو ممنوع قرار دیا۔ اُن کی جگہ اس نے وہ ضمیاتی عیسائیت رائج کی جس کا رکنِ رکین مقدس شخصیتوں کے واقعات اور تبرکات کی پرستش

تھا اور جو صدیوں تک یورپ کا متداول مذہب رہی ۔ سائنس اور ادب کو کلیسائی عیسائیت نے قانوناً ناجائز ٹھہرایا اور انھیں کہیں جا کر اس وقت آزادی ملی جب فکر آزاد نے وہ بند توڑ کر رکھ دیئے جو دنیا نوسیت نے نفسِ انسانی کی ترقی کی راہ میں حائل کر رکھے تھے ۔

عبداللہ المامون کو بجا طور پر عربوں کے آگسٹس کا خطاب دیا گیا ہے " وہ اس امر سے ناواقف نہ تھا کہ جو لوگ اپنی زندگیاں اپنے قوائے عقلی کی تہذیب کے لیے وقف کر دیتے ہیں وہ خدا کے برگزیدہ بندے اور اس کے بہترین و مفید ترین خادم ہوتے ہیں ۔ ...... وہ معلمینِ حکمت کو دنیا کے حقیقی نیّر اور مقنن سمجھتا تھا"[1]

مامون کے بعد متعدد طبّاع خلیفے آئے جنھوں نے اس کے کام کو جاری رکھا ۔ مامون کے عہد میں بھی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں بھی بغدادی دبستان کا سب سے نمایاں وصف اس کا قرار واقعی سائنسی مزاج تھا ، جو اس کی تمام کارگزاریوں پر ثبت نظر آتا ہے ۔ منطق کے استنباطی قاعدے سے ، جسے اہلِ یورپ بڑے فخر و مباہات سے جدید یورپ کی ایجاد اور غیر مشترک ملکیت کہتے ہیں ، مسلمان پوری طرح واقف تھے " معروف سے مجہول کی طرف قدم بڑھا کر بغدادی دبستان نے معلول سے علت کا پتہ چلانے کی خاطر مظاہر کی صحیح توجیہ کی اور صرف ایسی چیزوں کو تسلیم کیا جن کا ثبوت تجربے سے بہم پہنچتا ہے ۔ یہ تھے وہ اصول جن کی تعلیم مسلم اساتذہ دیتے تھے " جس مصنّف کی رائے سے ہم یہ اقتباس پیش کر رہے ہیں وہ آگے چل کر کہتا ہے : " نویں صدی ہجری کے عرب اس نتیجہ خیز اسلوب سے بدرجۂ اتم آشنا تھے جو کئی صدیوں کے بعد عصرِ جدید کے محققوں کے قبضے میں آ کر ان کے جمیل ترین انکشافات کا وسیلہ بنا "

سائنس اور علم کے جو ماہر اس زمانے میں گزرے اور جنھوں نے کسی نہ کسی طریقے سے انسانی ترقی کی تاریخ پر اپنے نشان چھوڑے ، اگر ان کی فہرست تیار کی جائے تو وہ بہت سی جلدوں پر مشتمل ہو گی ۔ ماشاءاللہ اور احمد ابن محمد النہاوندی ، عربوں میں سب سے

---

[1] ابوالفرج

پہلے ماہرینِ فلکیات (ہیئت) منصور کے عہد میں ہوئے۔ مقدم الذکر نے جسے ابوالفرج اپنے زمانے کا "ففنقس" (Phoenix) کہتا ہے: اصطرلاب اور کرۂ مشبک (ذوات الحلق) اور اجرامِ فلکی کی ماہیت اور حرکت پر متعدد رسالے لکھے جن کی آج بھی سائنس دان تعریف کرتے ہیں۔ احمد نہاوندی نے اپنے مشاہدات کی بناء پر ایک زیج (Astronomical Table) تیار کی جس کا نام المستعمل تھا اور جو یونانیوں اور ہندوؤں دونوں کے خیالات پر ایک حتمی اضافہ تھی۔ مامون کے عہدِ حکومت میں بطلیموس کی المجسطی (Almagest) کا دوبارہ ترجمہ کیا گیا اور سند ابن علی، یحییٰ ابن ابی منصور اور خالد ابن عبدالملک جیسے مشہور ہیئت دانوں نے ازیاج مصدقہ تیار کیں۔ انھوں نے اعتدالین (Equinoxes) کسوف وخسوف، دُمدار تاروں کے ظہور اور دوسرے سماوی مظاہر کے بارے میں جو مشاہدات کئے وہ نہایت قابلِ قدر اور علمِ انسانی میں معتدبہ اضافے تھے۔

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے مامون کی فرمائش پر "سدھانت" (سند ہند) یعنی زیجِ ہندی کا ازسرِنو ترجمہ کیا اور اس پر حاشیے بھی لکھے۔ الکندی نے مختلف مضامین مثلاً حساب، ہندسہ، فلسفہ، کائنات الجو، مناظر و مرایا اور طب پر دوسو رسالے لکھے۔ وہ یونانی زبان پر قدرتِ تامہ رکھتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے بیش بہا رسالوں میں جو معلومات قلمبند کیں اُن کا کچھ حصہ اس نے ایتھنز اور اسکندریہ کے مکاتب سے اخذ کیا۔ سیدّیو (Sedillot) کہتا ہے کہ "اس کی تصنیفات عجیب وغریب اور دلچسپ واقعات سے مملو ہیں"۔ ابو معشر نے (جس کے نام کو قرونِ وسطیٰ کے اہلِ یورپ نے بگاڑ کر البومزر Albumazar بنا دیا) مظاہرِ فلکی کو اپنا خصوصی موضوعِ تحقیق بنایا چنانچہ اُس کی "زیج ابی معشر" آج تک فلکیاتی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ موسیٰ ابن شاکر کے تین بیٹوں، محمد، احمد اور حسن نے، جو مامون اور اس کے پہلے دو جانشینوں کے زمانے میں ہوئے، آفتاب اور دوسرے اجرامِ فلکی کی اوسط حرکت کے بارے میں اور اس کے علاوہ دوسرے موضوعوں پر جو انکشافات کئے وہ تقریباً اُتنے ہی صحیح ہیں جتنے یورپ

کے جدید ترین انکشافات۔ انھیں جو ناقص آلات میسر تھے انھیں ملحوظ رکھا جائے تو جس صحت سے انھوں نے خطِ کسوف و خسوف کی کجی دریافت کی اس پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں سب سے پہلے لوگ تھے جنھوں نے قمری ارتفاعوں کی تبدیلیوں کا نقشہ بنایا۔ علاوہ بریں انھوں نے کمال درستی سے اعتدالین کے سلسلے اور اوجِ آفتاب کی حرکتوں کا مشاہدہ کیا اور ان کی تعیین کی (یونانی ان سے قطعاً ناواقف تھے) انھوں نے بحیرۂ احمر کے ساحل پر ایک درجے کی پیمائش کر کے زمین کے حجم کا اندازہ لگایا۔ یہ ایک ایسے زمانے میں جب عیسوی یورپ شد و مد سے یہ دعوے کر رہا تھا کہ زمین سپاٹ ہے۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی، جس کی توصیف وہ ان الفاظ میں کرتا ہے: "ایک نلکی جس کے دونوں سروں پر مؤیدِ بینائی شیشے لگے ہوتے ہیں"۔ ان "نلکیوں" کی بعد میں اصلاح ہوئی اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ مراغہ اور قاہرہ کی رصدگاہوں میں استعمال کیا گیا۔ البتانی اور محمد ابن عیسیٰ ابوعبداللہ نے شاکر کے بیٹوں[1] کا عظیم الشان کام جاری رکھا۔ البتانی کے آنے سے پہلے ہی مسلمان قدماء کی اٹکل پچو فلکیات کو ایک باقاعدہ اور مربوط سائنس میں تبدیل کر چکے تھے۔ اگرچہ بعد میں آنے والے ماہرینِ فلکیات البتانی[2] سے آگے نکل گئے، پھر بھی وہ اس علم کے اُستادوں میں بڑا اونچا درجہ رکھتا ہے۔ ایک قابلِ وقعت مصنف کی رائے ہے کہ اس نے عربوں میں وہی کردار ادا کیا جو بطلیموس نے یونانیوں میں ادا کیا تھا۔ اُس کی زیج جس کا ترجمہ لاطینی میں کیا گیا، کئی صدیوں تک یورپ میں فلکیات کی اساس رہی لیکن اُسے سب سے زیادہ شہرت ریاضیات کی تاریخ میں حاصل ہے، اور وہ اس لیے کہ اس نے ہیئت اور مثلثات میں وتر کی جگہ جیب اور جیبِ تمام کو متعارف کرایا۔

دسویں صدی عیسوی کے اختتام پر بغداد میں جو لاتعداد ماہرینِ فلکیات تھے ان میں دو شخص سب سے نمایاں ہیں، یعنی علی ابن اماجور اور ابوالحسن علی ابن اماجور، جنھیں عموماً یکجا کر کے

---

[1] ان کے نام اوپر بیان کیے جا چکے ہیں۔ محمد ابن موسیٰ ابن شاکر کی وفات ۲۵۹ھ (مطابق ۸۷۳ء) میں ہوئی۔

[2] ابوعبداللہ محمد ابن جابر ابن سنان البتانی حرّان کا باشندہ تھا۔ اس کی وفات ۳۱۷ھ (مطابق ۹۲۹-۳۰ء) میں ہوئی۔

بزا ماجور کہا جاتا ہے۔ وہ چاند کی حرکتوں کا حساب لگانے کے لیے مشہور ہیں۔

مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث دور افتادہ علاقوں میں دربارِ خلافت کے اقتدار کا قائم رکھنا سال بسال مشکل ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب سلطنت کے سرحدی خطّوں میں بہت سی نیم خودمختار ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ہسپانیہ تو عباسیوں کی خلافت کے آغاز ہی میں اُن کے ہاتھوں سے جا چکا تھا۔ اسی زمانے کے لگ بھگ بنی ادریس نے فاس میں، بنی رستم نے تاہرت میں اور بنی اغلب نے قیروان میں اپنی اپنی سلطنتیں قائم کرلیں۔ یہ سب سلطنتیں شمالی افریقہ میں تھیں لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد بنی فاطمہ نے سارے شمالی افریقہ کو مسخر کرلیا۔ اُن کے آتے ہی شمالی افریقہ میں فن وادب کا ایک اور زرّیں دور شروع ہو گیا۔ فاس، مکناسہ، سجلماسہ، تاہرت، تلمسان، قیروان اور اُن سب سے بڑھ چڑھ کر قاہرہ تمدّن، ثقافت اور علم کے مرکز بن گئے۔ خراسان میں طاہریوں نے، ماوراءالنہر میں سامانیوں نے، اور بُویدوں نے پہلے طبرستان میں اور پھر ایران و بغداد میں قصرِ خلافت کے مہتمموں کی حیثیت سے سائنس کے ماہروں اور عالموں کی فیاضانہ سرپرستی کی۔ عبدالرحمان صُوفی، جو اپنے زمانے کے قابل ترین طبیعیات دانوں میں شمار ہوتا ہے، بُویدامیر عضدالدولہ کا انیس و جلیس تھا جسے بجا طور پر عربوں کا آگسٹس ثانی کہا جاتا ہے۔ عبدالرحمن نے ستاروں کی روشنی سنجی میں اصلاح کی۔ عضدالدولہ[1] خود بھی ایک عالم اور ماہرِ ریاضیات تھا اور علم و فضل کا مربّی۔ اقصائے عالم سے جو عالم بغداد آتے وہ اپنے محل میں معزز مہمانوں کی طرح اُن کا خیر مقدم کرتا اور ان

---

[1] عضدالدولہ (فنا خسرو) نے بغداد میں بہت سے شفا خانے اور یتیم خانے قائم کیے۔ نجف اور کربلا میں حضرت علیؓ اور امام حسینؑ کے روضے بنوائے اور شیراز کے قریب جو دریا ہے اس پر بند بندھوا کر جو بندِ امیر کے نام سے مشہور ہے: ایک بڑے رقبے کو زراعت کے قابل بنایا۔

کے علمی مباحثوں میں شریک ہوتا۔ خلیفہ مکتفی باللہ کے بیٹے جعفر نے دُمدار ستاروں کی بے قاعدہ گردش کے بارے میں چند اہم مشاہدات کئے اور اُن پہ ایک رسالہ لکھا۔ دوسرے شہزادے بھی علوم طبیعی کے مطالعے اور تحقیق میں مصروف رہتے تھے۔

آلِ بُویہ کے ماتحت ہیئت، طبیعیات اور ریاضیات کے بیشمار ماہر ہوئے جن میں سے صرف دو کا ذکر کافی ہوگا۔ وہ الکوہی اور ابوالوفا تھے۔ الکوہی نے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کیا اور اس پر رسالے لکھے۔ راس السرطان اور موسمِ خزاں کے اعتدالِ شب و روز کے بارے میں اس نے جو انکشافات کئے انھوں نے علمِ انسانی کے ذخیرے میں معتدبہ اضافہ کیا۔ ابوالوفا ۹۳۹ء میں خراسان کے شہر بُزجان میں پیدا ہوا[1]۔ ۹۵۹ء میں اس نے عراق میں سکونت اختیار کی اور وہاں رہ کر ریاضیات اور فلکیات کی تحقیق میں مصروف رہا۔ اُس کی "زیج الشامل" تجسّس و تفحّص اور صحتِ مشاہدہ کے اعتبار سے معرکے کی تصنیف ہے۔ اس نے مثلثات اور فلکیاتی مشاہدوں میں قاطع اور مماس کو متعارف کرایا۔ سیدیو کہتا ہے: "اسی پر بس نہیں بطلیموس کے نظریۂ قمری کے نقائص کو محسوس کرکے اس نے قدیم مشاہدات کی جانچ کی اور مرکز و اخراج کی مساوات سے قطعِ نظر کرکے ایک تیسری عدم مساوات دریافت کی۔ یہ وہی انحراف ہے جو چھ سو سال بعد ٹیکو براہے (Tycho Brahe)[2] نے متعین کیا۔"

فاطمیانِ مصر کے دورِ خلافت میں قاہرہ علم و ادب اور سائنس کا ایک نیا مرکز بن گیا تھا، یہاں عزیز باللہ[3] اور حاکم بامراللہ کے زمانے میں ایک فخرِ روزگار محقق تھا، ابن یونس، جس

---

[1] ابوالوفا کی وفات ۳۸۶ھ (مطابق ۹۹۶ء) میں ہوئی۔

[2] ڈنمارک کا ماہرِ فلکیات ۱۵۴۶ء سے سن ۱۶۰۱ء تک)

[3] عزیز باللہ کا شمار تاریخِ مصر کے عظیم ترین حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی رعایا سے محبت کرتا تھا اور رعایا اس سے محبت کرتی تھی۔ اس نے ایک عیسائی خاتون سے شادی کی تھی جس کے بھائی یربیا اور آرسینیس یروشلم اور اسکندریہ کے بطریق تھے۔ دونوں راسخ العقیدہ ملکی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

نے آونگ (رقاصۂ ساعت) (Pendulum) کو ایجاد کیا اور اُس کے جھُولنے سے وقت کی پیمائش کی۔ لیکن اُس کی وجہِ شہرت اس کی عظیم تصنیف "زیج الاکبر الحاکمی" ہے جس کا عنوان اُس نے اپنے مربّی اور سلطان کے نام پر رکھا۔ اس تصنیف نے بہت جلد کلاڈیس بطلیموس کی تصنیف کو ایک تقویم پارینہ بنا دیا۔ اُسے ایرانیوں سے ہیئت دان شاعر عمر خیام (۱۰۷۹ء) نے رُوشناس کرایا۔ یونان میں اس کا چربہ کریسو کوکا، (Chrysococca) کی کتاب "سنٹیکس" (Syntax) میں اُتارا گیا۔ منگولوں کو اس سے نصیر الدین طوسی نے اپنی "زیج الخانی" کے ذریعے متعارف کرایا، چین میں اس کا تتبع کوچیون کنگ (Co-Cheon- King) کی فلکیات کی صورت میں ہُوا۔ چنانچہ وہ علم جو چین کی قدیم تہذیب سے منسوب کیا جاتا ہے مسلمانوں سے لی ہوئی ایک شے مستعار ہے۔[1]

ابن یونس نے ۱۰۰۸ء میں وفات پائی۔ اُس کے انکشافات کو ابن النبدی Ibn un - Nabdi نے، جو ۱۰۴۰ء کے لگ بھگ قاہرہ میں مقیم تھا، اور حسن ابن الہیثم نے، جو یورپ میں "الہزن" کے نام سے معروف ہے اور فضائی انعطاف کے انکشاف کے لیے مشہور ہے جاری رکھا۔ اُس کا زمانہ گیارھویں صدی کے اختتام کے قریب تھا اور وہ ایک ممتاز ہیئت دان اور ماہرِ مناظر و مرایا تھا۔ وہ ہسپانیہ میں پیدا ہُوا، لیکن زیادہ تر مصر میں رہا، مناظر و مرایا پر اُس کی جو تصنیفات ہیں وہ زیادہ تر اُن کی بدولت یورپ میں مشہور ہے۔ اُن میں سے ایک تصنیف کا ترجمہ رزنر (Risner) نے لاطینی میں کیا۔ بصارت کے بارے میں یونانیوں کا جو غلط خیال تھا اُس نے اُس کی تصحیح کی اور وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ ثابت کیا کہ روشنی کی شعاعیں آنکھ سے نکل کر باہر کی چیزوں پر نہیں پڑتیں، بلکہ باہر کی چیزوں سے آنکھ کے اندر آتی ہیں۔ اُس نے یہ دریافت کیا کہ بینائی کا مقام آنکھ کا پردۂ شبکی ہے اور یہ ثابت کیا کہ اس پردے پر جو نقوش مرتسم ہوتے ہیں وہ عصبِ بصری کے ذریعے دماغ کو منتقل ہو

---

[1] ضمیمہ ۳ ملاحظہ کیجیے

جاتے ہیں۔ بصارت کے ایک ہونے کی توجیہ اس نے یوں کی کہ بصری تصویریں دونوں پردہ ہائے شبکی کے متناسب حصّوں میں بنتی ہیں۔ اُس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ روشنی کا انکسار کرۂ ہوائی کے درجۂ کثافت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے اور کرۂ ہوائی کی کثافت کا دارومدار بلندی پر ہوتا ہے۔ اُس نے بڑی صحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بتایا کہ کیونکر اس انکسارِ روشنی کے باعث اجرام فلکی طلوع سے پہلے ہی دکھائی دینے لگتے ہیں اور غروب کے بعد بھی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جھٹ پٹے کا خوشنما منظر یوں ظہور میں آتا ہے کہ فضائی انکسارِ روشنی ہوا کے اُس انعکاسی عمل کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے جو وہ روشنی کی شعاعوں کی روش پر کرتی ہے۔ اپنی کتاب "میزان الحکمت" میں وہ حرکی اصولوں پر بحث کرتا ہے جنھیں عام طور پہ جدید سائنس کی خصوصی اختراع سمجھا جاتا ہے۔ وہ بڑی تفصیل کے ساتھ کرۂ ہوائی کے وزن اور اس کی کثافت کے باہمی تعلق کو بیان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کیونکر اجسام مادّی کا وزن لطیف فضا میں کچھ اور رہتا ہے اور کثیف فضا میں کچھ اور۔ وہ پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے اجسام کے ڈوبنے سے بحث کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ انھیں کسی ہلکی یا کسی بھاری مائع میں ڈبویا جائے تو کس زور سے سطح پر اُبھرتی ہیں۔ وہ گرتے ہوئے اجسام کی رفتاروں، فاصلوں اور مدتوں کے باہمی تعلق سے بخوبی واقف ہے اور جذبِ شعری کا بھی ایک واضح تصور رکھتا ہے[1]۔

ہسپانیہ میں بھی جبل البرنات (پیرینیز) سے لے کر آبنائے جبل الطارق تک اسی طرح کی ذہنی سرگرمی برسرِ کار تھی۔ اشبیلیہ، قرطبہ، غرناطہ، مرسیہ، طلیطلہ اور دوسرے شہروں میں سرکاری کتب خانے اور دارالعلوم تھے، جہاں سائنس اور ادب کی تعلیم مفت دی جاتی تھی۔ قرطبہ کے

---

[1] وقائع نگار علیبی کہتا ہے کہ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس زمانے میں قاہرہ کے کتب خانے میں بیس لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں، جن میں سے چھ ہزار صرف ریاضیات اور ہئیت سے متعلق تھیں۔ اس زمانے میں، جب کہ اسلام کی روح اپنے عروج پر تھی، جو ہزاروں ماہرین ریاضیات و طبیعیات ہوئے ہیں ان میں سے محض معدودے چند کا ذکر کیا ہے۔

بارے میں ایک انگریز مصنف لکھتا ہے :۔ "یہی نہ تھا کہ قرطبہ کے محل اور باغ خوبصورت تھے، بلکہ زیادہ وقیع امور میں بھی یہ شہر قابلِ تعریف تھا۔ اس کا باطن اُتنا ہی حسین تھا جتنا اُس کا ظاہر۔ اس کے پروفیسروں اور اُستادوں نے اُسے یورپی تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا۔ یورپ کے تمام حصّوں سے طالب علم اس کے مشہور علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے لیے آتے تھے ۔ اوروں کا تو کیا ذکر، راہبہ روزوِیدا (Hroswitha) نے بھی جب سیکسنی کے دُور دراز شہر گوورزہائم (Gaudersheim) کے راہب خانے میں بیٹھ کر یولوجیس (Eulogius) کی شہادت کی داستان بیان کی تو قرطبہ کی تعریفوں کے گیت گائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اُسے دنیا کے شاندار مظاہر میں سب سے شاندار کہتی ہے۔ سائنس کی ہر شاخ کا وہاں سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ خصوصاً جہاں تک طب کا تعلق ہے صدیوں کی اس طویل مدت میں جو جالینوس کے زمانے کے بعد گزری تھی اس میں جتنے اضافے ہوئے تھے ان سے بدرجہا زیادہ اضافے اندلوسیہ کے طبیبوں اور جراحوں نے کئے...... ہیئت، جغرافیہ، کیمیائیات، طبیعی تاریخ، ان سب کا مطالعہ قرطبہ میں ذوق وشوق سے ہوتا تھا۔ رہیں ادب کی رعنائیاں، تو یورپ میں کبھی کوئی ایسا زمانہ نہ گزرا تھا جب شاعری اس طرح لوگوں کی روزمرّہ کی زبان بن گئی ہوگی۔ ہر طبقے کے لوگ عربی میں شعر کہتے تھے۔ ہسپانیہ کے "منسٹرلوں"[1] (Minstrels) اور پروانس اور اٹلی کے "تروبدوروں"[2] (Troubadours) کے جو "بیلڈ"[3] (Ballads) اور

---

[1] "منسٹرل" قرونِ وسطیٰ میں یورپ کے گویّے شاعر جو بربط یا عود بجاتے ہوئے اور غنائی اشعار گاتے ہوئے شہر بشہر پھرا کرتے تھے۔ (مترجم)

[2] "تروبدور" گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں جنوبی فرانس اور اٹلی میں رہنے والے شاعر جو رزمیہ اور عشقیہ شعر کہتے تھے۔ مترجم

[3] "بیلڈ" رومانی اور جذباتی نظمیں جن میں محبّت یا بہادری کی کوئی مقبولِ عام کہانی بیان کی جاتی ہے۔ مترجم

"کینتسونیت" (Canzonettes) ہیں۔[1] وہ غالباً انہی عربی اشعار کے نمونے پر لکھے گئے۔ ہر تحریر اور تقریر اشعار سے مرصّع ہوتی تھی اور یہ اشعار یا تو فی البدیہہ کہے جاتے تھے یا مشہور شاعروں کے اشعار ہوتے تھے جنھیں لوگ تزئینِ کلام کے لیے ازبر کر لیا کرتے تھے۔[2] اس پر ہم رنان (Renan) سے ایک اقتباس کا اضافہ کرتے ہیں:

"بیسویں صدی کے آتے آتے دنیا کے اس قابلِ رشک خطے میں سائنس اور ادب کے ذوق نے ایک ایسی رواداری قائم کر دی تھی جس کی مثال جدید زمانوں میں مشکل ملے گی۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان ایک ہی بولی بولتے تھے، سب کے گیت ایک تھے اور سب مل جل کر ادبی اور سائنسی درس و تدریس میں شرکت کرتے تھے۔ مختلف قوموں کے درمیان کوئی دیواریں حائل نہ تھیں۔ سب ایک مشترکہ تہذیب کو ترقی دینے میں ایک دوسرے کے دوش بدوش مصروفِ کار تھیں۔ قرطبہ کی مسجدیں، جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ تعلیم پاتے تھے، فلسفیانہ اور سائنسی مطالعوں کے مرکز بن گئیں۔"[3]

یورپ میں پہلی رصدگاہ عربوں نے بنائی۔ اشبیلیہ کا مینار جیرالدہ (The Giralad) عظیم ریاضیات دان جابر ابن افلح کے زیرِ نگرانی فلکی مشاہدات کے لیے ۱۱۹۰ء میں تعمیر ہوا۔ اس کا جو حشر ہوا وہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے اخراج کے بعد اُسے ایک گرجا کا گھنٹہ گھر بنا دیا گیا، کیونکہ ہسپانیوں کو اس کا کوئی اور مصرف ہی نہ سوجھا!

ماہرینِ طبیعیات میں ہم صرف چار کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں، یعنی عمر

---

[1] "کینتسونیت" اٹلی اور پروونس کے ابتدائی ادوار کی غنائیہ نظمیں جو گا کر سنائی جاتی تھیں۔ مترجم

[2] سٹینلی لین پول Stanley Kane Poole کی کتاب The Moors in Spain۔ قرطبہ کے بارے میں مفصل بیان کے لیے دیکھیے: The History of the Saracens;

[3] رنان (Renan) کی کتاب Averroes et Averroism

(بقایا حاشیہ صفحہ ۵۵۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

ابن خلدون، یعقوب ابن طارق، مسلمہ المغربی اور شہرۂ آفاق ابو الولید محمد ابن رُشد (Averroes) مغربی افریقہ بھی اس زمانے میں علمی سرگرمیوں سے خالی نہ تھا۔ سیوطہ اور طنجہ، فاس اور مراقش سب کے سب قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کے حریف تھے۔ انھوں نے بھی بڑے بڑے اساتذہ پیدا کیے، جن کی لاتعداد عالمانہ تصنیفات نے اس امر کی مزید شہادت بہم پہنچائی کہ مسلمانوں کو ہر شعبۂ علم سے کتنا شغف تھا۔

گیارھویں صدی عیسوی کا آغاز ایشیائے وسطیٰ کے سیاسی حالات میں ایک بہت بڑے تغیّر کا ہراول تھا۔ عظیم غزنوی فاتح، یمین الدولہ، امین الملّت محمود[1]، کے برسرِاقتدار آنے کی بدولت ماوراءالنہر، افغانستان اور ایران غزنی کے قبضۂ تسلّط میں آگئے۔ محمود نے اپنے گرد ایسے ایسے عالم اور ادیب جمع کیے جنھوں نے اس کے درخشاں عہدِ حکومت کو چار چاند لگا دیے۔ یہ بجا ہے کہ وہ اشعری کی تجدید یافتہ صحیح العقیدگی کا دلدادہ اور اس لیے عقلیت پسند دبستانِ فکر کا مخالف تھا۔ یہ بھی بجا ہے کہ جن شاعروں نے اس کے نام کو دنیا کی تاریخ میں مشہور کر دیا، اُس نے اُن سے فیاضی کا حق ادا نہ کیا۔ پھر بھی اس میں اتنی ذکاوت تھی کہ اس نے فلسفی، ماہرِ ریاضیات اور جغرافیہ دان ابو ریحان محمد ابن احمد البیرونی، ملک الشعرا، فردوسی اور اساتذۂ سخن دقیقی اور عنصری جیسے لوگوں کی قدردانی کی۔ البیرونی جامع العلوم تھا۔ فلکیات پر اس کی تصنیف، جسے اس نے اپنے مربّی سلطان مسعود[2] کے نام پر "القانون المسعودی" کا نام دیا، ایک معرکے کی تصنیف ہے۔ اُس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۴) ہسپانیہ میں ادب اور سائنس کا عہدِ زرّیں حکم المستنصر باللہ کا زمانۂ حکومت تھا جس نے ۹۷۶ء میں وفات پائی۔ اس کے کتب خانہ کی فہرست ۱۱×۱۰ انچ کی تقطیع کی چوالیس جلدوں میں تھی۔ اس نے کرۂ ارض کے ہر حصے میں آدمی مامور کیے تاکہ جس قیمت پر بھی ہو سائنس کی قدیم و جدید کتابیں فراہم کریں۔ اس نے مشہور مجموعۂ منتخبات "کتاب الاغانی" کے پہلے نسخے کے لیے ابو الفرج اصفہانی کو ایک ہزار طلائی دینار عطا کیے۔

[1] ۹۹۷ء سے ۱۰۳۰ء تک۔

[2] محمود فاتح کا بیٹا اور جانشین۔

ہندوستان کی سیاحت کی، ہندوؤں کی زبان، علوم، فلسفہ اور ادب کا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات کو ایک کتاب کی صورت میں مجسّم کیا جسے حال ہی میں انگریزی زبان کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ وہ جس فلسفیانہ ژرف نگاہی، سائنسی صداقت پسندی اور وسیع ہمدردی کے ساتھ اپنے موضوع سے بحث کرتا ہے وہ اس اسلوب سے جو آج تک مغربی مصنّفین غیر ممالک کے حالات بیان کرنے وقت اختیار کرتے ہیں بہت مختلف ہے اور اسلام کی ذہنی صداقت شعاری پر شاہد ہے۔ البیرونی کی تاریخ الہند[1] سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان کس حد تک یونان کے علمی گنجینوں کو اپنے تصرّف میں لے آئے تھے اور انہوں نے ان گنجینوں کو کیسے مفید طریقوں سے استعمال کیا۔ ان دو عظیم تصانیف کے علاوہ البیرونی نے ریاضیات، علم ترتیب التواریخ، ریاضیاتی جغرافیہ، طبیعیات اور علم کیمیا پر متعدد رسالے لکھے۔

البیرونی نے ہندوؤں سے جو خیالات اخذ کئے اور جو معلومات حاصل کیں اُن کے بدلے میں اُس نے انہیں بغدادی دبستان کے علوم سے واقف کیا۔ اُسے ہندوؤں کے یہاں یونانی سائنس کی باقیات ملیں۔ یونانی سائنس یا تو زمانۂ عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں ہندوستان آئی تھی یا غالباً اس سے بھی پہلے یونانی باختری خاندانوں کے دورِ حکومت میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے یہاں اپنے کوئی ترقی یافتہ فلکیاتی علوم نہ تھے، ورنہ جیسا کہ سیدیو بجا طور پر کہتا ہے، اسکندر یا سلیوکی خاندان کے زمانے کے یونانی مصنّفین ضرور اُن کا تذکرہ کرتے۔ چینیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنے سائنسی خیالات زیادہ تر غیر ملکی مآخذ سے حاصل کئے اور اپنی قومی خصوصیات کے مطابق اُن میں ردّ و بدل کر لیا۔

محمود کے جانشینوں کے زمانے میں علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا اور سلجوقیوں نے علم و فضل اور سائنس سے جو شاندار فیاضی برتی وہ عباسیوں کے دورِ زرّیں کی علم پروری کا مقابلہ کرتی تھی۔ طغرل، الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر نہ صرف عظمت و اقتدار کے لحاظ

---

[1] اس کی ایک اور مقتدر تصنیف آثار الباقیہ ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر ساچو (Sachau) نے کیا ہے۔

سے اور رعایا کی فلاح و بہبود کا ایک واضح تصور رکھنے کے معاملے میں ممتاز تھے، بلکہ وہ بھی کمالات اور علم سے پُرجوش محبت میں بھی سر برآوردہ تھے۔ جلال الدین ملک شاہ[1] اور اس کے وزیر خواجہ حسن نظام الملک نے اپنے گرد چوٹی کے ہیئت دان، شاعر، عالم اور مؤرخ جمع کئے تھے۔ اس کے عہدِ حکومت میں ماہرینِ ہیئت کے ایک گروہ نے جس کے مقتدا عمر خیام اور عبدالرحمٰن الخازنی تھے، جو فلکیاتی مشاہدے کئے اُن کی بدولت ایک اصلاح شدہ تقویم مرتب ہوئی جو گریگوری کے کیلنڈر سے چھ سو سال پہلے وجود میں آئی اور جسے ایک صاحبِ[2] رائے نے مؤخر الذکر سے بھی زیادہ صحیح قرار دیا ہے۔ ان مشاہدات کی بناء پر جلالی نظامِ سنوات Era رائج کیا گیا، جس کا نام ملک شاہ کے لقب پر رکھا گیا۔

اُن عیسائی غارت گروں نے جو اپنے آپ کو صلیبی مجاہد کہتے تھے مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ پر جو تباہ کُن حملے کئے، ان کے اثرات علم اور سائنس کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوئے۔ یہ لوگ نرے وحشی تھے جنھیں سرپھرے پادریوں نے بھڑکا کر قتل و غارت کی مہموں پر بھیج دیا تھا۔ چنانچہ نہ ان میں اتنی انسانیت تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا لحاظ کرتے اور نہ اتنی عقل کہ علم و فن کی قدر کرتے۔ انھوں نے نہایت بے دریغی سے طرابلس کے شاندار کتب خانے کو تباہ کر دیا اور اسلامی ثقافت و فن کے کئی عظیم مرکزوں کو راکھ کے ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ مسیحی یورپ نے کتب خانۂ اسکندریہ کی تباہی کو تو موضوعِ طعن بنایا ہے، حالانکہ وہ جولیس سیزر (Julius Caesar) کے زمانے میں پہلے ہی جل چکا تھا اور اس کے مسلمانوں کے ہاتھوں برباد کئے جانے کی کہانی سراسر مشکوک الاصل روایتوں پر مبنی ہے لیکن اس کے اپنے صلیبی جنگجوؤں نے صدیاں بعد جو جرائم کیے اُن کے بارے میں وہ خاموش ہے۔ صلیبی جنگجوؤں نے جو آفتیں

---

[1] ۱۰۷۳ء سے ۱۰۹۲ء تک۔

[2] سیدیو

ڈھائیں اُن کے اثرات بہت دیرپا ثابت ہوئے۔ چنانچہ صلاح الدین ایوبی اور اس کے بیٹوں نے شام کی علمی و ادبی زندگی بحال کرنے کی جو کوششیں کیں ان کے باوجود وہ آج تک بحال نہیں ہو سکی۔

محمود کے عروج اور بغداد کے زوال کے درمیان جو وقفہ گزرا اس میں بہت سے فلسفی اور سائنس داں ہوئے، جن میں سب سے درخشاں نام ابو علی حسین ابن سینا[1]، فتح ابن نالبغہ خاقانی، بشر ابن احمد اور اس کے بیٹے محمد کے ہیں[2]۔

منگولوں کا جو فتنہ اسلامی دنیا میں اٹھا وہ رُوم پر شمالی وحشیوں کے حملے سے مماثل نہ تھا۔ رُوم پر جو وحشی حملہ آور ہوئے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے تھے۔ چنانچہ سلطنت کی حدود کے اندر داخل ہونے کے بعد اُس کے مرکز کی طرف قدم بڑھانے کے عمل میں اُن کی اصلی وحشت کسی حد تک زائل ہو چکی تھی اور اُن کی طبیعتوں میں قدرے نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ غارتگر چنگیز کے لشکر کا معاملہ جدا تھا۔ وہ ایک پہاڑی ندی کی طرح طوفان برپا کرتا ہوا مغربی ایشیا پر چڑھ آیا۔ جدھر سے وہ گزرا اُدھر تباہی و بربادی اپنے پیچھے چھوڑ گیا[3]۔ اس کی وحشیانہ تاخت و تاراج اور سفاکانہ کشت و خون نے ایشیا کے ذہنی ارتقا کو کچھ مدت کے لیے بند کر دیا۔ لیکن ان وحشیوں کا اسلام قبول کرنا تھا کہ ان میں ایک تبدیلی واقع ہو گئی۔ یہی علم و فن کے مرکزوں کی اینٹ سے اینٹ بجانے والے مدرسوں اور جامعوں کے بانی اور ارباب علم کے سرپرست بن گئے۔ سلطان خدابندہ (اُلجائتو خان)، جو چھٹی پشت میں چنگیز کا وارث تھا، صاحبِ کمال بھی تھا اور اہلِ کمال کا مربی بھی۔

---

[1] متوفی ۱۰۳۷ء۔

[2] متوفی ۱۰۸۲ء۔

[3] متوفی ۱۱۳۵ء۔

[4] تاتاریوں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے

Short History of the Saracens

لیکن چنگیز کے لشکر نے شہریوں کے جو قتلِ عام کئے تھے اُن میں علم پیشہ طبقے کے بیشتر لوگ تہِ تیغ ہو گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ سمرقند اور بخارا جیسے شہروں نے از سرِ نو عروج پایا، لیکن وہاں جو علمی اور ثقافتی روایات قائم ہوئیں وہ کچھ محدود قسم کی تھیں اور ان میں دینیاتی مسائل اور سوفسطائی بحث و تکرار کا عنصر غالب تھا۔ اس کے باوجود منگولوں نے ناصر الدین طوسی، مؤید الدین العرضی دمشقی، فخر الدین المراغی، محی الدین المغربی، علی شاہ بخاری اور اسی قبیل کے اور فلسفیوں کی پشت پناہی کی۔ اس طرح ہلاکو کے جانشینوں نے اسلام کو وہ چیزیں واپس دلانے کی کوشش کی جو اُن کے اسلاف نے برباد کر دی تھیں۔ ادھر منگول ایران میں تہذیب کی خدمت کر کے تلافیٔ ما فات کر رہے تھے، ادھر قبلائی خان عربوں کے علوم کو چین لے گیا۔

کوچیو کنگ نے ۱۲۸۰ء میں جمال الدین سے ابن یونس کی زیج وصول کی اور اسے چینیوں کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ابن شاطر نے، جو مصر کے مملوک سلطان محمد ابن قلاؤن کے عہدِ حکومت میں ہوا ہے، ریاضیات و فلکیات کو مزید ترقی دی۔ ایسے میں مشرق کے اُفق پر وہ شہابِ ثاقب طلوع ہوا جو تاریخ میں تیمور کے نام سے مشہور ہے۔ "چودھویں صدی کی اس عظیم شخصیت نے سمرقند سے اُٹھ کر ایک ایسی سلطنت قائم کی جس کی سی وسعت اس سے پہلے ایشیا کی کسی سلطنت کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایران و تُوران کی قدیم دشمنی اس کے ناقابلِ مزاحمت ارادے کے سامنے یک قلم مٹ گئی۔" وہ سائنس اور شاعری کا مربی، اربابِ علم و فن کی صحبت کا دلدادہ اور اعلیٰ پائے کا مصنف و مقنن تھا[۱]۔ اس محیّر العقول انسان نے جو شاندار دار العلوم، پُرشکوہ مسجدیں اور وسیع کتب خانے قائم کئے وہ اس کے ذوقِ علم کے شاہد ہیں۔ اُس نے نو آبادیوں کا ایک نظام نافذ کر کے مشرقی ایشیا کے شہروں اور بالخصوص سمرقند کو مغرب کے تمام علوم و فنونِ متعارفہ کے گنجینوں سے مالا مال کر دیا۔ بنی اُمیّہ نے اندلس میں اور شروع کے عباسی خلفاء نے عربستان میں

---

[۱] "ملفوظاتِ تیموری" کا اسلوبِ بیان وہی ہے جو آشوری اور کلدانی بادشاہوں کی تحریروں کا تھا۔

جو سلطنتیں قائم کیں اُن کے بعد تاریخ اسلام کی سب سے بڑی سلطنت وہ تھی جس کا بانی تیمور تھا۔ زبدۂ علوم جامی، Pilpay کا مترجم سُہیلی اور علی شیر امیر اُن لوگوں میں ممتاز تھے جنھوں نے تیمور کے جانشینوں کی حکومتوں کو رونق بخشی۔ تیمور کی ملکہ بی بی خانم نے جس دارالعلوم کی بنیاد رکھی اور جو اُسی کے نام سے موسوم ہوا، اس کی عمارت اسلامی فنِ تعمیر کی سب سے جاذبِ نظر اور مرعوب کُن تخلیقوں میں شمار ہوتی ہے۔ تیمور کے بیٹے شاہرخ مرزا نے فن و ادب کے اکتساب اور سرپرستی میں اپنے باپ کی تقلید کی۔ اس کا پُرامن عہدِ حکومت، جسے تقریباً نصف صدی کی طویل مدت نصیب ہوئی، اعلیٰ ادبی کارناموں اور سائنسی مطالعوں کی بدولت شہرت رکھتا ہے۔ جب اس نے اپنا پایۂ تخت سمرقند سے ہرات منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی سمرقند کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ اس کے بیٹے اُلغ بیگ نے، جسے ماوراءالنہر کا نظم و نسق سپرد کیا گیا، سمرقند کے علمی و ادبی مرتبے کو برقرار رکھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا ہیئت دان تھا اور جن فلکیاتی مشاہدوں نے اس کے نام کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اُن کی نگرانی خود کیا کرتا تھا۔ جن زیجوں میں ان مشاہدوں کو مجسّم کیا گیا وہ فکرِ عربی کے تتمّے اور تکملے ہیں۔ اُلغ بیگ اور جدید فلکیات کے بانی کپلر (Kepler) کے درمیان صرف ڈیڑھ صدیوں کا فاصلہ تھا۔

مسلمانوں نے صرف فلکیات ہی کی تہذیب و اصلاح نہیں کی، بلکہ ریاضیاتِ عالیہ کے ہر شعبے پر بھی اُن کے اختراعی و تحقیقی بنوغ کی مُہر ثبت نظر آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یونانی جبر و مقابلہ کے موجد تھے لیکن جیسا کہ اولسنر (Oelsner)[۴] نے عادلانہ کہا ہے اُنھوں نے اس سے صرف گردشِ جام کی پیمائشوں میں تفریحاً کام لیا۔ مسلمانوں نے اسے اعلیٰ مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اُسے ایک نئی قدر و قیمت بخش دی۔ دوسرے درجے کی مساوات وہ مامون کے عہد میں دریافت کر چکے تھے۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اُنھوں نے دودرجی مساوات کا نظریہ اور دوعددی مسئلہ بھی اختراع کر لیا۔ صرف جبر و مقابلہ، ہندسہ اور حساب ہی نے نہیں بلکہ مناظر و مرایا اور علمِ جرِّثقیل نے بھی مسلمانوں کی بدولت ترقی پائی۔ اُنھوں نے کروی مثلثات ایجاد کی، وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے جبر و مقابلہ کا اطلاق

ہندسہ پر کیا، مماس کو متعارف کرایا اور مثلثاتی حسابوں میں قوس کی جگہ جیب کو داخل کیا۔ انھوں نے ریاضیاتی جغرافیہ میں جو ترقی کی وہ بھی کچھ کم نمایاں نہ تھی۔ ابن حوقل، مقریزی، الاصطخری مسعودی البیرونی، الکومی، الادریسی، قزوینی، ابن الوردی اور ابوالفداء کی تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اس شعبہ علم میں، جسے انھوں نے رسم الارض کا نام دیا، کیسے کیسے معرکے کے کام کئے۔ ایک ایسے زمانے میں جب یورپ کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ زمین سپاٹ ہے اور وہ اس عقیدے کے مخالفوں کو زندہ جلا دینے سے دریغ نہ کرتا تھا عرب جغرافیے کی تعلیم کُروں کے ذریعے دیتے تھے۔

طبیعی سائنسوں کی نشو و نما بھی ایسی ہی تن دہی سے کی گئی۔ نظریوں کی جگہ تجربوں سے کام لیا گیا اور اس طرح قدماء کے ناتراشیدہ علوم کو مثبت علوم کی شکل دی گئی[1]۔ کیمیائیات، نباتیات، ارضیات (علم طبقات الارض) طبیعی تاریخ اور ان کے متجانس علوم قابل ترین لوگوں کی توجہ کے مرکز اور ان کی دماغی کاوشوں کے موضوع رہے۔

کیمیائیات ایک مدون علم کی حیثیت سے قطعی طور پر مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ ابوموسیٰ جابر (جسے عیسائی مصنفین Geber کہتے ہیں[2]) جدید کیمیائیات کا حقیقی بانی مبانی ہے۔ "اس کا نام علم کیمیا کی تاریخ میں یادگار رہے، کیونکہ اس سے اس علم کے ارتقاء کا ایک ایسا دور منسوب ہے جو پریسٹلی (priestley) اور لاوُوازیے (Lavoisier) کے ادوار کے برابر اہمیت رکھتا ہے۔" اس کے بعد چند دوسرے عالم آئے جن کی جدتِ طبع، محنت و کاوش، تبحرِ علمی اور ذکاوتِ مشاہدہ سے پڑھنے والا محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور دورِ حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی جمود پہ افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

---

[1] ہمبولٹ (Humboldt) عربوں کو طبیعی سائنسوں کا حقیقی موجد کہتا ہے۔

[2] ابوموسیٰ جابر ابن حیان سطرطوس کا باشندہ تھا۔ ابن خلکان اس کی بابت لکھتا ہے، "جابر نے دو ہزار صفحوں کی ایک کتاب تالیف کی جس میں اس نے اپنے استاد امام جعفر صادق کے مسائل یکجا کئے جو پانچ سو رسالوں پر مشتمل تھے۔" مزید ملاحظہ کیجئے "تاریخ الحکماء"

علم طب اور فنِ جراحی کو بھی جو کسی قوم کی فطری استعداد کی بہترین کسوٹی اور کسی مذہب کے عقلیت پسندانہ مزاج کا ایک کڑا امتحان ہیں درجۂ کمال تک ترقی دی گئی۔ یہ درست ہے کہ یونانیوں نے طب میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کر لی تھی لیکن انھوں نے طب کو جس مرحلے تک پہنچایا تھا عرب اسے اس مرحلے سے بہت آگے بڑھا کر جدید زمانے کے معیاروں کے قریب لے آئے۔ عربوں نے کئی صدیوں تک علمِ انسانی کے اس شعبے کی جو خدمت کی اور طبیعی سائنس کی ترقی کے سلسلے میں جو کارنامے کئے ہم یہاں اُن کا محض اجمالی تذکرہ کر سکتے ہیں۔

دواؤں کی خاصیتوں کا مطالعہ جس کا خیال دبستانِ اسکندریہ کے حکیم دیوسکورائدیز (Dioscorides) کے ذہن میں پیدا ہوا، اپنی سائنسی شکل میں عربوں کی تخلیق ہے۔ وہ کیمیائی دواسازی کے موجد اور ان اداروں کے پہلے بانی تھے جنھیں ہم آجکل ڈسپنسریاں یعنی دواخانے کہتے ہیں[1]۔ انھوں نے ہر شہر میں دارالشفا یا "مارستان" (بیمارستان کا مخفف) قائم کئے جن کے خرچ کی سرکار متحمل ہوتی تھی۔

ابو اصیبعہ کی "طبقات الاطباء" کی پوری ایک جلد عرب طبیبوں کے ناموں پر مشتمل ہے۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی[2] جو قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں (Rhazes) کے نام سے معروف تھا اور جو دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا[3]۔

---

[1] جو لوگ دواخانوں میں دوائیں تیار کر کے مریضوں کو دیتے تھے ان پر حکومت کی طرف سے نگرانی ہوتی تھی۔ دواؤں کی مقداریں اور قیمتیں باضابطہ طور پر مقرر کی جاتی تھیں۔ بہت سے سرکاری دواخانے بھی تھے۔ طبیبوں اور دواسازوں کے باقاعدہ امتحان ہوتے تھے اور جو امیدوار ان میں کامیاب ہوتے تھے انھیں سندیں دی جاتی تھیں۔ صرف سند یافتہ لوگوں کو طبابت کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت تھی۔ اس ضمن میں کریمر (Kremer) اور سیدیلو (Sediliot) کی تصنیفات ملاحظہ کیجیے۔

[2] یہ عظیم طبیب، جو ایران کے شہر رے میں پیدا ہوا، یکے بعد دیگرے رے، جندی شاپور اور بغداد کے شفاخانوں کا سربراہ تھا۔ اس کی تصنیف "حاوی" کو سیدیو (باقی حاشیہ صفحہ ۵۶۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

علی ابن عباس[1]، ابو علی حسین ابن سینا، ابوالقاسم خلف ابن عباس، ابو مروان ابن عبدالملک ابن زہر[2]، ابوالولید محمد ابن رشد[3] اور عبداللہ ابن احمد ابن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۲) طبی معلومات کا ایک نہایت مؤقر ذخیرہ کہتا ہے۔ اس نے چیچک اور خسرے پر جدید رسالے لکھے اُن سے تمام ملکوں کے طبیب استفادہ کرتے رہے ہیں۔ اُس نے minoratives کے استعمال کی ابتدا کی۔ زخم کشا ڈورا ایجاد کیا اور عصبِ حجرہ دریافت کیا۔ اس نے دو سو طبی رسالے لکھے جن میں سے بعض کی اشاعت ۱۵۱۰ء میں وینس میں ہوئی۔ الرازی نے ۳۱۱ھ (مطابق ۹۲۳/۲۴ء) وفات پائی۔

[1] علی ابن عباس کا زمانہ رازی کے زمانے کے نصف صدی بعد ہے۔ اس نے طب کے نظری و عملی پہلوؤں پر ایک کتاب لکھی جو بیس جلدوں میں تھی اور جسے اُس نے بُویدا امیر عضدالدولہ کے نام پر معنون کیا۔ اس کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۱۲۷ء میں ہوا اور اسے لیون (Lyons) میں مشل کیپلا (Michel Capella) نے ۱۵۲۳ء میں شائع کیا۔ علی ابن عباس نے بقراط اور جالینوس کی بہت سی غلطیوں کی اصلاح کی۔

[2] ابن زہر (جو یورپ میں Aven Zoar کے نام سے معروف تھا) اپنے زمانے کے ممتاز ترین اطبا میں تھا۔ اس کی پیدائش پنیا فلور Penaflor میں ہوئی۔ طبی اور سائنسی علوم سے فارغ التحصیل ہو کر وہ افریقہ کے مشہور المرابطی سلطان یوسف ابن تاشفین کی ملازمت میں داخل ہوا۔ ابن تاشفین نے اس کی بہت عزت و توقیر کی۔ ابوالقاسم کی طرح ابن زہر نے بھی طبابت اور جراحی دونوں پیشے بہ یک وقت اختیار کیے۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے نرخرے کو چیرا اور اس عمل میں جو ہڈیاں اُتر گئیں یا ٹوٹیں اُن کا صحیح صحیح نقشہ ذہن میں رکھا۔ اس عمل کے ذریعے اس نے بہت سی اہم بیماریاں اور اُن کے علاج دریافت کیے۔ اُس کا بیٹا اس کے نقشِ قدم پر چلا اور یوسف ابن تاشفین کی فوج کا اعلیٰ جراح اور طبیب بنا۔

[3] ابن رشد (Averroes) مغرب کا ابن سینا تھا۔ اس کی سیرت اور تصنیفات کو رینان (Renan) نے دنیا کے آگے پیش کیا۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۵۶۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

علی البیطار[1]، یہ ہیں چند صاحبِ کمال اور نامور طبیب جنھوں نے جریدۂ علم و فکر پر ایک نقشِ دائم چھوڑا۔ ابوالقاسم نہ صرف صفِ اوّل کا طبیب بلکہ صفِ اوّل کا جرّاح بھی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے شعبۂ طب میں بلکہ دایہ گری کے شعبے میں بھی بہت سے عملِ جرّاحی کیئے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ چونکہ عورتوں کی جرّاحی میں شرم و حیا کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا اس لیے باقاعدہ طور پر تربیت یافتہ عورتیں اس کی معاون ہوتی تھیں۔ اس کے زمانے میں جو آلاتِ جراحت استعمال ہوتے تھے انھیں اس نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اُن سے اس امر کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ فنِ جرّاحی نے عربوں کے یہاں کتنی ترقّی کر لی تھی[2]۔ ابنِ سینا بلاشک و شبہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا صاحبِ کمال تھا۔ وہ خود بھی جامع العلوم تھا اور اس کی تصنیفات بھی ایک قاموس المعارف ہیں، وہ فلسفی بھی تھا، ریاضیات دان بھی، ماہرِ فلکیات بھی، شاعر بھی طبیب بھی۔ اس کے اثرات دو برّاعظموں کی تاریخ پر مرتسم ہیں اور وہ مشرق کا ارسطو کہلائے جانے کا بہمہ وجوہ مستحق ہے۔ قدامت پرستوں کے رشک و رقابت کے باوجود اس کے فلسفیانہ خیالات کئی صدیوں تک مشرق و مغرب دونوں کے دبستانوں پر مستولی رہے۔ ابن سینا مشرق میں شیخ الرئیس کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کا باپ ماوراءالنہر کا گورنر تھا اور وہ اس صوبے کے ایک گاؤں میں جس کا نام افشانہ تھا ۹۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶۳) وہ ابن زُہر، ابن باجہ اور ابن طفیل کا معاصر تھا۔ ابن رُشد اور اس کے معاصرین کا مزید تذکرہ ہم آئندہ باب میں کریں گے۔

ان کے علاوہ چند اور نام قابل ذکر ہیں۔ یعنی ابوالحسن ابن تلمید مصنّفِ "الامانی" ابوجعفر احمد ابن محمد الطالب جس نے ذات الجنب پر رسالے لکھے۔ اور ہبت اللہ

[1] البیطار نے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سارے مشرق کا سفر کیا اور ان پر ایک جامع رسالہ لکھا۔ عرب طبیبوں نے ریوند، تبزیابت، سنا مکی، کافور، تمر ہند وغیرہ کے استعمال کو رائج کیا۔

[2] مثانے کی پتھری نکالنے کے عملِ جرّاحی میں وہ آجکل کے بہترین سرجنوں کا ہم پایہ تھا۔

طبی تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر اس نے اپنی غیر معمولی سیاسی اور فلسفیانہ زندگی شروع کر دی۔ محمود فاتح کی ملازمت قبول کرنے سے متواتر انکار کی بدولت اُسے غزنوی قلمرو سے وطن نکالا ملا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد شمس الدولہ امیرِ ہمدان نے اُسے اپنی وزارت پر مامور کیا۔ اس کے بعد علاؤ الدولہ امیرِ اصفہان کا وزیر بنا۔ اصفہان میں اس نے اپنے سائنسی اور فلسفیانہ کارنامے انجام دیئے اور اپنی معرکۃ الآراء تصانیف "قانون" اور "ارجوزہ" لکھیں جو آگے چل کر علم طب کی اساس بنیں۔

یونانیوں کو تشریح الاعضاء سے بہت کم واقفیت تھی اور انھیں دوا سازی کا جو علم تھا وہ بھی بہت محدود تھا۔ مسلمانوں نے تشریح الاعضاء کو بھی اور دوا سازی کو بھی ترقی دے کر مستقل علوم کی حیثیت بخش دی۔ اسلامی سلطنت کی وسعت کی بدولت مسلمانوں کو کرۂ ارض کے ہر گوشے میں تحقیق و تجسس کرنے کا موقعہ ملا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے وقت کے ذخیرۂ ادویہ کو بے شمار گراں قدر اضافوں سے مالا مال کر دیا۔ نباتیات کو دیاسکوریدیز (Dioscorides) نے جہاں پہنچایا تھا اُسے وہ اس سے بہت آگے لے گئے اور یونانیوں کو جو جڑی بوٹیاں معلوم تھیں اُن کی تعداد میں انھوں نے دو ہزار کا اضافہ کیا۔ طالب علموں کی تعلیم کے لیے قرطبہ اور بغداد، قاہرہ اور فاس میں باقاعدہ باغات تھے۔ جہاں نباتات اور دوا سازی کے ماہر درس دیتے تھے۔

محمد الدمیری نے جانوروں کی جو تاریخ لکھی اس کی بدولت وہ سارے عالمِ اسلامی میں مشہور ہے۔ اس تصنیف کو بفاں (Buffon) کی تصنیفات پر سات صدیوں کا تقدم حاصل ہے۔

ارضیات کو عرب علم تشریح الارض کہتے تھے۔ اُسے بھی انھوں نے پروان چڑھایا۔

فنِ تعمیر میں مسلمانوں کو جو تفوق حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، کیونکہ مشرق و مغرب میں جو مسلم عمارات یا اُن کی باقیات ہیں وہ آج بھی دنیائے جدید سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ مصوری اور مجسمہ سازی میں مسلمانوں کی پسماندگی اسلام سے منسوب کی گئی ہے،

لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن نے اس بارے میں جو ممانعت کی وہ اُس ممانعت سے مشابہ ہے جو عہد نامۂ عتیق کی کتابِ احبار میں کی گئی تھی۔ یہ کوئی نئی ممانعت نہ تھی، بلکہ آئینِ موسوی کی تکرار تھی جس نے یہودیوں کے یہاں "تراشیدہ بتوں" کا بنانا مؤثر طریقے سے مسدود کر دیا تھا اور اس کا جواز، اعرابِ جاہلیت کی پرانی رسمِ بت پرستی سے واضح ہے۔ چنانچہ ابتدائی مسلمان مصوری اور مجسمہ سازی کو کفر و شرک کی علامت تصور کر کے انھیں قابلِ نفرت اور حرام سمجھتے تھے اور اس بت شکنی نے جو اُن کی طبیعت میں رچ گئی تھی انھیں دوسری قوموں کی طرح بت پرستی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔ لیکن جب مسلمانوں کا سیدھا سادہ ابتدائی معاشرہ ایک مہذب و متمدن سلطنت میں تبدیل ہو گیا اور ان کے یہاں علم و حکمت اور سائنس کو عروج حاصل ہوا تو انھوں نے اس ممانعت کے حقیقی منشاء کو سمجھ لیا اور لفظی تقلید کے بندھن توڑ دیئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع کے عباسیوں اور اندلسی خلیفوں نے فنونِ لطیفہ کی جو ہمت افزائی کی اس کی حقیقی وجہ عقلیت کی وہ روح تھی جس نے اُن پر اتنا گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ ساری اسلامی دنیا میں ادب اور سائنس کی ترقی کے پہلو بہ پہلو مصوری اور مجسمہ سازی کا ذوق بھی عام ہوتا گیا۔ خلیفوں کے محل، اُن بادشاہوں کے محل جو اُن کے نقشِ قدم پر چلے اور وزرا، و اُمراء کے مکان تصویروں اور مجسموں سے مزین ہوتے تھے۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے مسجدوں میں بتوں اور تصویروں کی جو ممانعت کی ہم عربوں کے فنِ نقاشی کے لیے اس کے ممنون ہیں، جو مشرقی عمارتوں کو عجیب و غریب دلکشی بخشتا ہے اور جس کا یورپ نے بڑی حد تک چربہ اُتارا ہے۔ جب عربوں کو دوسری قوموں کے فنون سے آشنائی حاصل ہوئی تو انھوں نے جانور، پرندے اور پھل پھول بھی اپنی نقاشی میں داخل کر دیئے۔ پھر بھی مسجدوں کی زیب و زینت میں انسانوں اور حیوانوں کی شکلیں قطعاً ممنوع رہیں۔ ہیئت کی پاکیزگی، خاکے کی سادگی، وضع قطع کی لطافت اور زینا سب کی بے عیبی میں، تمام جزئیات کی ہم آہنگی میں، دستکاری کی عمدگی میں اور تخیل کی بلندی میں مسلمانوں کا فنِ تعمیر کسی ملک کے فنِ تعمیر سے کم پایہ نہیں۔ بالخصوص جس نزاکت اور خوش اسلوبی

سے مسلمانوں کی سب سے شاندار عمارتوں کی آرائش کی گئی ہے وہ ایک ایسے نکھرے ہوئے ذوق اور نفاستِ طبع کی دلیل ہے جس کی نظیر یونانِ قدیم کی یادگاریں یا جدید یورپ کی عمارتیں پیش نہیں کر سکتیں۔ مسلمانوں کے فنِ تزئین کی ایک اور شاخ خطِ طغرا ہے جو مسجدوں، مقبروں اور محلوں کی آرائش میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن کی پوری پوری سورتیں گنبدوں اور میناروں، دیواروں اور محرابوں پر خطِ طغرا میں کھودی یا جڑی جاتی ہیں۔ اس مرصع کاری اور منبت کاری کا سرچشمہ وہی مذہبی جوش ہوتا ہے جو عیسوی کلیساؤں کے اندر اولیائے و شہداء کی تصویروں میں جلوہ گر دکھائی دیتا ہے، لیکن اس کا مزاج خالصۃً موحدانہ ہوتا ہے۔

اشاعتِ اسلام سے پہلے عربوں کے یہاں گانے بجانے کا پیشہ یا تو اُن غلاموں اور لونڈیوں سے مخصوص تھا جو شام یا ایران سے لائی جاتی تھیں یا طوائفوں سے جنھیں قیان کہتے تھے۔ پیغمبر صلعم نے بدیہی اخلاقی وجوہ کی بناء پر ان رذیل طبقوں کے رقص و سرود کو ناپسند فرمایا تھا۔ لیکن عباسیوں اور اُندلسی خلیفوں کے زمانے میں جب موسیقی کو ایک علم کا درجہ حاصل ہو گیا اور اس کی مشق کو ایک فن تسلیم کیا گیا تو معاشرے کے تمام طبقوں میں اس کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ گیت جمع کیے گئے اور راگوں اور سُروں کے مطابق اُن کو مرتب کیا گیا۔ قدماء کے آلاتِ موسیقی کی اصلاح کی گئی اور نئے آلات ایجاد کیے گئے لیکن عقلیت اور ملائیت، معنویت اور لفظ پرستی کے درمیان جو آویزش بارھویں صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوئی اُس نے اس شیریں ترین فنون کو پھر اربابِ نشاط کا ذریعۂ معاش یا درگاہوں کا مجرائی بنا دیا۔

تجارت، زراعت، دستکاری اور صنعت پر بہت کچھ لکھا گیا۔ دستکاری اور صنعت میں چینی کے برتنوں سے لے کر آلاتِ حرب تک بیشمار چیزیں شامل تھیں۔

تاریخی تحقیق میں بھی مسلمان زمانۂ قدیم یا زمانۂ جدید کی کسی قوم سے پیچھے نہیں رہے۔ شروع شروع میں زیادہ تر سیرتِ نبوی پر توجہ دی گئی۔ لیکن بہت جلد تاریخ کا تصور وسیع تر ہو گیا۔

آثاریات[۱]، جغرافیہ، علم الاقوام[۲] تینوں کو تاریخ میں شامل سمجھا جاتا تھا اور بہترین دماغ ان کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ ابن اسحاق کی سیدھی سادی تصنیف اور ابن خلدون کی عالمی تاریخ میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن ان دونوں کے درمیان لاتعداد مصنف ہوئے جن کی تصنیفات سے اس امر کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کے فیضانِ اثر کی بدولت مسلمانوں نے کیسے کیسے ذہنی کارنامے انجام دیئے۔

بلاذری جس کی وفات ۲۷۹ھ (مطابق ۸۹۲ء) میں ہوئی، بغداد میں پیدا ہوا اور ساری عمر وہیں رہا۔ اس کی "فتوح البلدان" نہایت دلکش پیرائے میں لکھی گئی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے تاریخی مذاق میں کتنی ترقی ہو گئی تھی۔

ہمدانی نے جس کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا اختتام اور چوتھی صدی کا آغاز تھا، دنیا کو جنوبی عرب کی ایک جامع تاریخ دی جس میں اس نے اس خطے کی قوموں کے احوال بیان کئے، اُن کے دلچسپ آثارِ قدیمہ کی تفصیلات (اُن کے کتبوں کی شرحوں کے ساتھ) دیں اور بالخصوص یمن کے جغرافیہ اور اُس کے لوگوں کی نسلی خصوصیات سے بحث کی۔ لیکن جن تصنیفات میں مسلمانوں کی قدرتِ تاریخ نویسی پورے عروج پر دکھائی دیتی ہے وہ مسعودی، البیرونی، ابن الاثیر، طبری، ابن خلدون (جسے مول Mohl اسلام کا مونتسکیو (Montesquieu) کہتا ہے) مقریزی، مقری، ابوالفدا، نویری، میرخوند کی تصنیفات ہیں۔ یہ لوگ اپنے فن کے خصوصی ماہر ہی نہ تھے، بلکہ جامع العلوم تھے، یعنی فلسفی، ریاضیات دان اور ساتھ ہی ساتھ مؤرخ۔ مسعودی باشندہ تو بغداد کا تھا، لیکن نسلاً شمالی عرب تھا اور اس نے عنفوانِ شباب میں دنیائے اسلامی کے بیشتر حصے کی سیاحت کی تھی۔ سب سے پہلے وہ ہندوستان گیا جہاں اس نے ملتان اور منصورہ کی سیر کی۔ پھر وہ ایران اور کرمان گیا، وہاں سے ہندوستان لوٹا اور کچھ مدت کمباجہ (Kombaja) اور دکن میں رہا۔ پھر

---

[۱] آثارِ قدیمہ کا مطالعہ (Archaeology)

[۲] (Ethnolgy) نوعِ انسانی کی مختلف نسلوں اور قوموں کا مطالعہ۔

سیلون گیا۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مڈغاسقر (Madagascar) پہنچا۔ وہاں سے عازم عمان ہوا اور غالباً جزیرہ نمائے ہند و چین اور چین کی سیر بھی کر آیا۔ وسطی ایشیا میں سفر کرتا ہوا وہ بحیرۂ خزر تک پہنچا۔ سیاحت ختم کر کے وہ کچھ مدت طبریہ اور انطاکیہ میں مقیم رہا اور بعد میں بصرے کا شہری بنا، جہاں اس نے سب سے پہلے اپنی عظیم تصنیف "مروج الذہب" شائع کی۔ بعد ازاں اس نے فسطاط میں سکونت اختیار کی اور وہاں اس نے پہلے "کتاب التنبیہ" اور پھر "مرآۃ الزمان" شائع کی۔ مؤخر الذکر ایک ضخیم تصنیف ہے جس کا محض ایک حصہ باقی رہ گیا ہے۔[1] "مروج الذہب" میں وہ اپنی زندگی کے گوناگوں تجربات کو ایک ایسے شخص کے شگفتہ اور دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے جس نے ملک ملک کی سیاحت کی ہے اور زندگی کے سب رنگ دیکھے ہیں اور جو پڑھنے والے کو صرف سبق ہی نہیں دینا چاہتا بلکہ اس کے لیے تفریح طبع کا سامان بھی بہم پہنچانا چاہتا ہے۔ ہمارے دماغ پر سندوں کی لمبی لمبی فہرستوں کا بوجھ ڈالے بغیر، ہمیں طولانی تمہیدوں میں الجھائے بغیر وہ لطف لے لے کر ایسی چیزوں کو نمایاں کرتا ہے جو اسے عجیب و غریب، نادرالوجود اور دلچسپ معلوم ہوتی ہیں اور بڑے اجمال اور محاکاتی چابکدستی کے ساتھ لوگوں اور ان کے طور طریقوں کے نقشے کھینچتا ہے۔"

طبری (ابو جعفر محمد ابن جریر) کو عربوں کے لوی Livy کا خطاب دیا گیا ہے۔ اس نے ۹۲۲ء میں بغداد میں وفات پائی۔ اس نے جو تاریخ لکھی وہ ۳۰۲ھ (مطابق ۹۱۴ء) پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد المکین (Elmacin) نے اس کا تتمہ لکھا جو بارھویں صدی عیسوی کے اختتام تک کے واقعات

---

[1] مجھے بتایا گیا ہے کہ دنیا کی لائبریری میں اسی مصنف کی ایک تاریخی تصنیف ہے جو تقریباً تیس جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کا نام "اخبار الزمان" ہے۔ غالباً یہ وہی تصنیف ہے جو "مرآۃ الزمان" بھی کہلاتی ہے۔

پر حاوی ہے۔

ابن الاثیر، ملقب بہ عزّالدین، عراق کے جزیرۂ بنی عمر کا رہنے والا تھا، لیکن زیادہ تر موصل میں مقیم رہا، جہاں اس کا مکان ممتاز ترین علماء و فضلائے عصر کا مرجع تھا۔ اُس کی تاریخِ عالم، جس کا نام "الکامل" ہے اور جو ۱۲۳۱ء پر ختم ہوتی ہے، جدید یورپ کی بہترین تصانیف کا مقابلہ کرتی ہے۔

مقریزی (تقی الدین احمد) ابن خلدون کا ہم عصر تھا۔ اس نے مصر پر جو کتاب لکھی وہ اس ملک کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تجارتی، آثاریاتی اور انتظامی حالات کا ایک واضح نقشہ پیش کرتی ہے۔

ابوالفدا، جس کا ذکر ہم ایک جغرافیہ داں کی حیثیت سے کر چکے ہیں، چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں حماۃ کا شہزادہ تھا۔ وہ فنونِ حرب میں اُتنا ہی ممتاز تھا جتنا علم و ادب میں۔ اپنے بیشمار اوصافِ حمیدہ کی بدولت وہ مشرق کے علما اور سائنس دانوں میں اُونچا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی عظیم تصنیف کا وہ حصّہ جو اسلام کی سیاسی و ادبی تاریخ سے اور اسلام کے بازنطین کے ساتھ مراسم سے تعلق رکھتا ہے بڑا بیش بہا ہے۔

ابن خلدون کا زمانہ چودھویں صدی عیسوی تھا۔ وہ تونس میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا۔ چنانچہ چودھویں صدی عیسوی میں جن انقلابات نے افریقہ کو ایک ہنگامہ زار بنا رکھا تھا اس نے اُن کے درمیان زندگی بسر کی۔ اس کی مہتم بالشان تاریخ کا مقدمہ بجائے خود معلومات اور فلسفیانہ بحثوں کا ایک گراں قدر ذخیرہ ہے مقدمے میں وہ معاشرے کی ابتدا کا سراغ لگاتا ہے، تہذیب کی نشوونما کے مدارج بیان کرتا ہے اور سلطنتوں اور خاندانوں کے عروج و زوال کے اسباب کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ دوسرے مسائل کے ضمن میں وہ اس کا بھی تجزیہ کرتا ہے کہ قوموں کے شمائل و خصائل پر آب و ہوا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ابن خلدون نے ۱۴۰۶ء میں وفات پائی۔

عربوں نے قطب نما ایجاد کیا اور علم کی تلاش میں یا تجارت کے سلسلے میں دنیا کے تمام حصوں کی سیاحت کی۔ انھوں نے افریقہ میں، مجمع الجزائر ہند میں، ہندوستان کے ساحل پر اور جزیرہ نمائے ملایا میں نوآبادیاں قائم کیں۔ اور تو اور، چین نے بھی اپنے ہمیشہ بند رہنے والے دروازے مسلم نوآبادکاروں اور تاجروں کے لیے کھول دیئے۔ انھوں نے پرتگال کے مغرب میں جزائر ازور دریافت کئے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ غالباً ساحلِ امریکہ تک جا پہنچے۔ قدیم برّاعظموں کی سرحدوں کے اندر انھوں نے ہر طرح کی انسانی محنت و مشقت کو ایک ایسے طریقے سے پروان چڑھایا جس کی نظیر نہ اُن سے پہلے تھی نہ اُن کے بعد ملتی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے محنت کو ایک فرض قرار دے کر اس کی تاکید کی تھی، صنعت و حرفت کو ایک مقدّس مشغلہ کہا تھا، تجارت اور زراعت کی یہ کہہ کر تلقین کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہ مستحقِ ثواب کام ہیں۔ ان ہدایات کا نتیجہ نکلنا تھا اور نکلا۔ تاجر، دکاندار اور حرفت پیشہ لوگ اسلامی معاشرے میں عزّت پاتے تھے۔ صوبوں کے عمّال، فوج کے اعلیٰ منصب دار اور ارباب علم و فضل اپنی کنیتوں یا خطابوں میں اپنے آبائی پیشوں کا اعلان کرنے میں کوئی ننگ و عار محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ امن و امان جس سے سلطنت کے طول و عرض میں کاروان آمد و رفت کرتے تھے، سڑکوں کی مکمل سلامتی اور بے خطری، وہ حوض، تالاب اور سرائیں جو سڑکوں کے کنارے ہر جگہ موجود تھیں — ان سب چیزوں نے مل کر تجارت اور صنعت و حرفت کو ہر طرح ترقی دی۔

جن جن ملکوں میں عرب آباد ہوئے وہاں انھوں نے جا بجا نہریں بنائیں۔ ہسپانیہ کو انھوں نے آبپاشی کا ایک ایسا نظام بخشا جو بندوں، پانی روکنے والے تختوں، پنّوں اور پمپوں پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے علاقے جو اب غیر آباد اور بنجر پڑے ہیں زیتون کے جھنڈوں سے سرسبز و شاداب تھے۔ دوسرے شہروں سے قطعِ نظر کیجئے اشبیلیہ کے گرد و نواح میں روغنِ زیتون نکالنے کے ہزاروں کولھو تھے۔ چاول، شکر اور

کپاس تینوں عربوں ہی کے طفیل ہسپانیہ میں آئے۔ جتنے پھل اس وقت اس ملک میں ہیں اُن کے باغات پہلے پہل انہی نے لگوائے۔ ان کے علاوہ انھوں نے کئی نئی قسموں کے پودے مثلاً ادرک، زعفران، مُرّ کی متعارف کرائے۔ اُنھوں نے تانبے، گندھک، پارے اور لوہے کی کانیں کھولیں، ریشم کی پیداوار شروع کی، کاغذسازی اور پارچہ بافی کو رواج دیا، چینی اور مٹّی کی ظروف سازی، لوہے، فولاد اور چمڑے کی صنعتیں قائم کیں۔ قرطبہ کا مشجّر قالین نما کپڑا، مرسیہ کا اُونی کپڑا، غرناطہ، المریہ اور اشبیلیہ کا ریشمی کپڑا، طلیطلہ کی فولاد اور سونے کی بنی ہوئی چیزیں، شاطبہ کا کاغذ ـــــ ان سب چیزوں کی ساری دنیا میں مانگ تھی۔ مالقہ قرطاجنتہ الحلفاء، برشلونہ اور قادس کی بندرگاہیں درآمد برآمد کی بڑی بڑی منڈیاں تھیں۔ اُندلسی عربوں کے پاس اُن کے زمانۂ عروج میں ایک ہزار سے زائد تجارتی جہازوں کا بیڑا تھا۔ ڈینیوب کے کناروں پر اُن کے کارخانے اور تجارتی نمائندے تھے۔ قسطنطنیہ کے ساتھ اُن کا ایک وسیع سلسلۂ تجارت تھا جو بحیرۂ عام اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل سے لے کر اندرون ایشیا تک پھیلا ہوا تھا اور جو ایک طرف ہندوستان اور چین کی بندرگاہوں تک اور دوسری طرف ساحلِ افریقہ کے ساتھ ساتھ بدغسقر تک پہنچتا تھا۔ "دسویں صدی عیسوی کے وسط میں، جب کہ یورپ کی وہی حالت تھی جو اب کیفریریا (Caffraria) کی ہے، ابوالقاسم جیسے روشن ضمیر مُورتجارت اور سوداگری کے اصولوں پر رسالے لکھ رہے تھے۔" تجارتی مہم آزمائیوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر اور سیروسیاحت کے شوق کو ترقی دینے کی خاطر جغرافیائی رجسٹر، فرہنگیں اور رہنمائے مسافراں کتابچے سرکاری طور پر شائع کیے جاتے تھے، اور اُن میں مختلف مقامات کی جُزئی تفصیلات، راستوں کے کوائف اور دوسرے ضروری امور درج کیے جاتے تھے۔ ابنِ بطوطہ جیسے جہاں گرد معلومات کی جستجو میں غیر ملکوں کی سیاحت کرتے تھے اور جن جن ملکوں میں جاتے تھے وہاں کے لوگوں پر، وہاں کے جانوروں اور پودوں پر، وہاں کی معدنی پیداوار پر، اُن کی آب وہوا اور طبعی خصوصیات پر ضخیم کتابیں لکھتے تھے جو فراست وکیاست اور

صحت مشاہدہ کے حیرت انگیز نمونے ہوتی تھیں۔

علم و فن کا شوق صرف مردوں کی خصوصی ملکیت نہ تھا۔ عورتیں بھی مردوں کے برابر علمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اور ادب و سائنس سے شغف رکھتی تھیں۔ اُن کے علیحدہ دارالعلوم تھے[1]، وہ طب اور فقہ کا مطالعہ کرتی تھیں، بلاغت و بیان، اخلاقیات اور ادبِ لطیف کے درس دیتی تھیں اور مردوں کے دوش بدوش ایک شاندار تہذیب کے کارناموں میں شریک ہوتی تھیں۔ سلاطین اور وزراء و اُمراء کی بیویاں اور بیٹیاں اپنی جائدادیں دارالعلوم قائم کرنے، یونیورسٹیوں کو مالی عطیات دینے، بیماروں کے لیے شفا خانے کھلوانے اور مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کے لیے دارالامانوں کے بنوانے میں خرچ کرتی تھیں[2]۔

عرب قبیلوں کی باہمی مخالفتوں اور رقابتوں نے اگرچہ مقامی زبانوں کو ایک دوسرے میں آمیز ہو کر ایک واحد زبان نہ بننے دیا، لیکن اس قومی زبان کو جو حجاز میں بولی جاتی تھی الفاظ کے گنجینے سے مالا مال کر دیا۔ عکاظ میں جو سالانہ میلہ ہوتا تھا اور جس میں شاعر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے اُس نے بھی حجاز کی زبان کو صرفی و نحوی باضابطگی اور

---

[1] اس قسم کا ایک مشہور ادارہ قاہرہ میں مملوک سلطان ملک ظاہر کی بیٹی نے ۶۸۴ھ میں قائم کیا۔

[2] ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ نے اس قبیل کے بہت سے دارالامان قائم کیے۔ عضد الدولہ کی بیوی نے جو شفا خانہ بنوایا وہ اس کے شوہر کے شفا خانے سے کسی طرح ہیٹا نہ تھا۔ ملک اشرف کی بیٹی خاتون نے دمشق میں ایک عظیم الشان کالج کی بنیاد رکھی۔ حمص کے سلطان ناصر الدولہ کی بیوی زمرد خاتون نے بھی حمص میں ایک کالج قائم کیا۔ کئی مسلمان عورتوں نے شعر و شاعری میں امتیاز حاصل کیا۔ حضرت فاطمہ بنتِ رسولؐ شعرائے عرب میں اونچا پایہ رکھتی ہیں۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء (المتخلص بہ مخفی) بھی اسی زمرے میں ہے۔ جب ارکرٹ (Urquhart) نے ترکی کا سفر کیا (باقی حاشیہ صفحہ ۵۷۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

شگفتگی و رفتگی بخشی۔ لیکن حقیقت میں وہ قرآن تھا جس نے عربی زبان کو اپنی اصلی اور خالص صورت میں برقرار رکھا۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جس کی مدد سے عربوں نے اسکندرِ اعظم کی فتوحات سے بھی زیادہ وسیع فتوحات کیں اور روم کی سلطنت سے بھی بڑی سلطنت قائم کی اور وہ بھی اس مدت کے دسویں حصے میں جو روم نے اپنی فتوحات مکمل کرنے میں صرف کی۔ قرآن ہی کے فیض سے انھیں یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ تمام سامی اقوام میں پہلے لوگ تھے جو یورپ میں حکمران بن کر داخل ہوئے، جہاں فینیقی تاجر بن کر آئے تھے اور یہودی پناہ گیر یا قیدی بن کر۔ یہ قرآن ہی کی برکت تھی کہ انھوں نے ایسے وقت میں جب چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، یونان کے علم و حکمت کو دوبارہ زندہ کیا، مغرب کو فلسفہ، طب، ہیئت اور موسیقی کا زریں فن سکھایا جیسے انھوں نے یہ چیزیں مشرق کو سکھائی تھیں، تہذیب کے گہوارے کی نگہداشت کی اور ہم بعد میں آنے والوں سے اس دن کا ماتم کرایا جب غرناطہ اُن کے قبضے سے نکل گیا۔ [1] قرآن کی زبان کی بے تصنع عظمت، اس کے اندازِ بیان کی بےساختہ دلکشی، اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا تنوع، اُس کی کیفیاتِ مزاج کی بجلی کی کوندوں سی تبدیلیاں، جن میں کہیں معلمِ اخلاق ہدایات دے رہا ہے، کہیں فلسفی نظریے پیش کر رہا ہے، کہیں آزردہ محبِ وطن اپنے ہم قوموں کی اخلاق سوزی اور ذلت کی پرجوش مذمت کر رہا ہے اور کہیں خود خدائے غفور الرحیم اپنے نبی کے ذریعے اپنے بھٹکے ہوئے بندوں کو راہِ راست کی طرف بُلا رہا ہے —— ان سب چیزوں نے مل کر قرآن کو صحائفِ دینی میں ایک امتیازی شان بخشی ہے۔ اس کلام کو سن کر شعرائے وقت پر جو ہیبت طاری ہوگئی اور ان کے دلوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷۳) تو اس وقت وہاں تین خواتین صفِ اوّل کے شعراء میں شمار ہوتی تھیں اور ان میں سے ایک سلطان مصطفیٰ کی پرائیویٹ سیکرٹری تھی۔

[1] ڈوئچ (Deutsch)

جو جذبۂ تعظیم و تکریم پیدا ہوا اُس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عام لوگوں کے دلوں پر اس نے کتنا گہرا اثر کیا ہو گا۔ یہ کلام مختلف وقتوں میں نازل ہوا کبھی ستم رسیدگی اور رنج والم کے لمحوں میں، کبھی مستعدانہ سرگرمیوں کے دوران کبھی لوگوں کو عملی ہدایات دینے کی ضرورت پیش آنے پر۔ لیکن وہ چاہے کسی کیفیت میں نازل ہوا ہو شروع سے لے کر اخیر تک اس کے ہر لفظ میں ایسی تاثیر، ایسی سنجیدگی، ایسی توانائی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے جو کسی اور مذہبی کتاب میں نہیں ملتی۔

مبادا یہ سمجھا جائے کہ ہماری رائے طرف داری پر مبنی ہے۔ ہم اس عظیم مستشرق کی رائے سے، جس کا ہم پہلے بھی حوالہ دے چکے ہیں، ایک اور اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

"عربی کی خطیبانہ شوکت، آواز کے زیر و بم سے خوشی و غم، محبت و شجاعت اور ولولہ و جوش کا اظہار کرنے کی قوت، جس کی صرف ایک مدھم سی گونج ہمارے کانوں تک پہنچتی ہے، نزولِ قرآن کے وقت اپنی بلند آہنگی کے پورے عروج پر تھی۔ ضروری تھا کہ قرآن نہ صرف اپنے زمانے کے بہترین خطیبوں اور شاعروں کی برابری کرے، بلکہ اُن پر سبقت لے جائے تاکہ اُس کے کلام اور لحن کی فوقیت بجائے خود اس کے پیغام کی سچائی کی علامت و شہادت ہو۔۔۔۔۔۔۔۔اس سے پہلے کے شاعروں نے عشق و محبت کے نغمے گائے تھے۔۔۔۔۔۔ عنترہ، جو خود عرب کی مشہور ترین داستان کا ہیرو ہے، اپنی محبوبہ عبلہ کے مکان کی بربادی کے مرثیے گاتا ہے۔ اُس کے خیالات اُن کھنڈروں کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں لیکن عبلہ اُن سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی داستانیں نہیں ملتیں۔ اُس کا کلام عشقیہ شاعری نہیں۔ اس دُنیا کی خوشیاں، تیغ آزمائی، ناقہ سواری، رشک و رقابت، انتقام و دشمنی، قبیلوں کی بڑائیاں،

اگلوں کی تعریفیں، انسان کی بے معنی اور چند روزہ زندگی — یہ چیزیں قرآن کے موضوع نہیں۔ اُس کا موضوع ہے اسلام، اور اسلام کی تعلیم قرآن نے آسمان کے پردے پھاڑ کر اور زمین کے طبق اُلٹ کر دی۔ آسمان اور زمین سے شہادت پیش کر کے دی، زندوں اور مُردوں کو گواہ بنا کر دی۔"

ایک اور بڑا مصنف قرآن کے بارے میں یہ کہتا ہے:-

"اگر قرآن کا کلام شاعری نہیں اور یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ شاعری ہے یا نہیں، تو وہ شاعری سے کوئی بڑی چیز ہے۔ وہ تاریخ نہیں، سیرت نگاری نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے پہاڑی وعظ کی طرح وہ مقولوں اور کہاوتوں کا ایک گلدستہ نہیں، بدھ مت کے سُوتروں کی طرح ایک فلسفیانہ بحث نہیں۔ افلاطون نے دانا اور نادان اُستادوں سے جو مذاکرے کئے اُن کی طرح دانشمندانہ نصیحتوں کا ایک مجموعہ نہیں۔ وہ ایک پیغمبر کی پکار ہے، ایک سامی پیغمبر کی پکار، سامیت کی تمام خصوصیتیں لیے ہوئے لیکن اس کی پکار کے معنی اتنے عالمگیر ہیں اور وہ اتنی برِوقت ہے کہ اُس زمانے کی تمام آوازیں، چاہے بخوشی چاہے مجبوراً، اُسے دُہراتی ہیں، تا آنکہ محل اور صحرا، شہر اور ملک اس سے گونج اُٹھتے ہیں۔ پہلے تو وہ اپنے خاص مخاطبوں کے سینوں میں دنیا کی تسخیر کا ولولہ پیدا کرتی ہے، پھر وہ ایک تعمیری قوت بن جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعے یونان اور ایشیا کی ساری تخلیقی روشنی عیسوی یورپ کی گہری تاریکی کا پردہ چاک کر کے اس کے اندر داخل ہو جائے، کیونکہ عیسائیت اس وقت رات کی ملکہ تھی۔"[1]

ادب و دانش کی تمام بڑی بڑی اصناف میں جو انسان کی ذہنی کارپردازیوں کے

---

[1] جانسن (Johnson)

تمام پہلوؤں پر حاوی ہیں، مثلاً اخلاقیات، مابعدالطبیعیات، منطق اور بلاغت و بیان، مسلم مصنفین سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ شاعری میں مسلمانوں پر کوئی سبقت نہیں لے گیا۔ عربوں کے شاعر متنبّی سے لے کر (قطعِ نظر اُن شعراء کے جو پیغمبرِ اسلام کے ہم عصر تھے) حالی تک شاعروں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ متنبّی دسویں صدی عیسوی میں ہوا اور اسے امیر سیف الدّولہ (ابوالحسن علی بن حمدان) کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ابن دُرید[1]، ابوالعلاء[2]، ابن فارض[3]، طغرائی[4] اور بےشمار دوسرے شاعر آئے۔ اُندلسی عرب وہبی شاعر تھے؛ اُنھوں نے شاعری کی مختلف اصناف ایجاد کیں جن کا تتبع بعد میں مغربی یورپ کے عیسائی شعراء نے کیا۔ اُندلس کے عرب شاعروں میں مشہور ترین نام احمد ابن محمد (ابوعمر[5]) کا ہے۔ محمود کے دربار میں جو شعراء ہوئے ان کا تذکرہ ہم اُوپر کر چکے ہیں۔ اُن میں فردوسی، جس نے ایران کے بادشاہوں اور بہادروں کو حیاتِ ثانیہ بخشی، شہرت میں محمود کا حریف ہے، جس کی اس نے پہلے تعریف اور بعد میں ہجو کی۔ بعد کے غزنوی بادشاہوں کے عہد میں چند بہت بڑے شاعر ہوئے۔ مثلاً سوزنی[6]، جو فارسی عروض کا موجد تھا، رشید وطواط قصیدے کے استاد انوری[7]، خاقانی[8] اور ظہیر فاریابی[9]۔ صوفی شعراء سنائی[10]، جن کا "حدیقہ" فارسی شاعری

---

[1] متوفی ۹۳۳ء
[2] متوفی ۱۰۵۷ء
[3] متوفی ۱۲۵۵ء
[4] متوفی ۱۰۹۲ء
[5] ۱۱۷۵ء، ۵۶۹ھ
[6] ۱۱۷۸ء، ۵۷۳ھ
[7] انوری نے سلطان سنجر پر جو قصیدہ کہا وہ فارسی زبان کے بہترین قصیدوں میں شمار ہوتا ہے۔ سودا نے اپنے اُس قصیدے میں جو اُس نے نواب آصف الدّولہ کی شان میں کہا بڑی کامیابی سے انوری کا تتبع کیا۔
[8] ۱۱۸۶ء، ۵۸۲ھ
[9] ۱۲۰۲ء، ۵۹۸ھ
[10] ۱۱۸۶ء، ۵۷۶ھ

کا مایۂ ناز ہے اور فرید الدین عطار[1] اور مثنوی گو نظامی جس نے خسرو اور شیریں کی داستانِ محبت اور سکندر کی کارگزاریاں بیان کیں۔ آتابکوں کے عہد میں، جو سلجوقیوں کے زوال کے بعد برسرِ اقتدار آئے، اخلاقی شاعر سعدی اور صوفی شاعر جلال الدین رومی ہوئے۔ تیمور کے زمانے میں حافظِ غزل گو ہوا، جسے ایران کا انیکری اون (Anacreon) کہتے ہیں۔ اقلیمِ شاعری کے ناموروں میں سے یہ محض چند ایک کے نام ہیں۔ مسلمانوں نے شاعری میں جو کمال کر دکھائے انھیں ابن خلکان اور لطف علی آذر[2] اس سے زیادہ بلیغ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

یہ تھے مسلمانوں کے کارنامے علم و ادب کے میدان میں، اور یہ سب کچھ معلمِ اسلام کے فیضان سے ہوا۔ اس کی آواز نے انھیں اُس قعرِ وحشت و جہالت سے نکالا جس میں وہ حال و مستقبل کی کسی اُمید کے بغیر پڑے ہوئے تھے اور جب وہ نکلے تو انھوں نے دنیا میں اُجالا کر دیا۔ پسماندہ اور ستم رسیدہ انسانیت کو ایک نئی زندگی اور تہذیب و تمدن کی دولت مل گئی۔ اُدھر یورپ کے وحشی، جنھوں نے ایک ناتوان و نزار سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا تھا، جہالت اور بہیمیت کی تاریکی میں بھٹک رہے تھے، اور ادھر مسلمان ایک عظیم الشان تہذیب کی عمارت کھڑی کر رہے تھے۔ یورپ کی اخلاقی و ذہنی ویرانی و خراب حالی کی طویل صدیوں میں اسلام ترقی کا ہراول تھا۔ عیسائیت نے اپنے آپ کو قیصروں کے تخت پر تو متمکن کر لیا تھا، لیکن وہ اقوامِ عالم کو نئی زندگی نہ بخش سکی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی سے لے کر بارھویں صدی تک یورپ کی تاریکی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ شدید تعصب کے اس دور میں کلیسائیت نے تمام وہ روزن بند کر رکھے تھے جن میں سے علم، انسانیت یا تہذیب کی روشنی داخل ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جہالت کے اس

---

[1] سنہ ۱۱۹۰ء سنہ ۵۸۶ھ

[2] لطف علی آذر کا "آتشکدہ" فارسی شعراء کا تذکرہ ہے جس میں اُن کے سوانح حیات اور کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔

حصنِ حصین میں اسلام کی باریابی کے تمام رستے مسدود تھے۔ اس کے باوجود اسلامی تمدن کے فیض رساں اثرات رفتہ رفتہ عیسوی دنیا کے ہر گوشے میں سرایت کر گئے۔ سلرنو، بغداد دمشق، قرطبہ، غرناطہ اور مالقہ کی درسگاہوں سے فلسفے کی مشفقانہ تعلیمات اور سائنس کی مقابلۃً سخت علمی ہدایات دنیا کو تہذیب کے سبق دیتی رہیں۔[1]

عقلیت کے پہلے مظاہر مغرب کے اس حصے میں نمودار ہوئے جو سب سے بڑھ کر اسلامی دنیا کے زیرِ اثر آیا۔ کلیسائیت نے اس نورس کلی کو مسل ڈالا اور دنیا کی ترقی کو تین صدیاں پیچھے دھکیل دیا۔ لیکن آزادیٔ فکر کے اصول جو اسلام کی اصل و اساس ہیں، مسیحی یورپ میں نئی روح پھونک چکے تھے۔ ایبیلارڈ (Abelard)[2] ابن رشد کی تعلیمات سے، جو ساری مغربی دنیا میں روشنی پھیلا رہی تھیں، کسبِ ضو کر چکا تھا۔ اُس نے فکرِ آزاد کے حق میں اعلانِ جنگ کیا جس کی بدولت عیسائی دنیا کو بالآخر عیسائیت کی حلقہ بگوشی سے رہائی ملی۔ ابن باجہ اور ابن رشد دیکارت[3] (Descartes) ہابز[4] (Hobbes) اور لاک[5] (Locke) کے پیش رو تھے۔

---

[1] اسلام نے ذہنی ارتقاء کو جو محرک مہیا کیا اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس کے فیض اثر سے ترقی کی دوڑ میں ایسی قوموں نے بھی حصہ لیا جو اس وقت تک بے خبری کی نیند سو رہی تھیں۔ اسلام نے انسانیت کی نبض میں تیزی پیدا کی اور مری ہوئی یا مرتی ہوئی قوموں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

[2] pierre Abelard ۱۰۷۹ء تا ۱۱۴۲ء فرانسیسی فلسفی اور عالمِ دینیات۔

[3] Rene Descartes ۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء فرانسیسی فلسفی اور ریاضی دان۔

[4] Thomas Hobbes ۱۵۸۸ء تا ۱۶۷۹ء۔ انگریز فلسفی۔

[5] John Locke ۱۶۳۲ء تا ۱۷۰۴ء۔ انگریز تجربی فلسفی۔

ایبیلارد اور اس کے مکتب کے خیالات جلد ہی انگلستان میں نفوذ کر گئے۔ وِکلف[1] (Wycliffite) کی جدّتِ فکر اور آزادیٔ روح اس کے پیش روؤں کے جرأت آمیز خیالات کی مرہونِ منّت تھی۔ بعد کے جرمن مصلحین نے اپنے خیالات ایک طرف تو قسطنطنیہ کے بُت شکنوں سے اور دوسری طرف البیجینوں[2] (the Albigenses) اور وِکلفیوں (The Whcliffites) سے مستعار لیے کہ اس اصلاحی کام کو جو دوسروں نے غیر ملکی عقلیاتی اثرات کے تحت شروع کیا تھا پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

جب مسیحی یورپ نے علم و دانش کو جبر و تشدّد کا تختۂ مشق بنا رکھا تھا جب خلیفۃ المسیح نے خود اپنے ہاتھوں سے فکرِ آزاد کے طفلِ شیر خوار کا گلا گھونٹا اور اس کی ابتدائی تلاطموں کو خاموش کر دیا، جب پادری لوگ ہزاروں بے ضرر انسانوں کو محض عقلی بے راہ روی کی بنا پر آگ کا ایندھن بنانے میں پیش پیش تھے، جب مسیحی یورپ لوگوں کے سروں پر سے خبیث روحوں کا سایہ اُتارنے اور مقدّس ہڈیوں اور چیتھڑوں کی پوجا کرنے میں مصروف تھا، ایک ایسے زمانے میں مسلمان بادشاہوں کے زیرِ سایہ علم کا بول بالا تھا اور وہ یوں پھل پھول رہا تھا کہ جیسا پہلے کبھی نہ پھلا پھولا تھا۔ محمدؐ کے خلیفوں نے ترقیٔ تہذیب کو فریضۂ منصبی بنا لیا اور آزادیٔ فکر و تحقیق کو، جس کی ابتدا خود پیغمبرِ اسلامؐ نے کی اور جسے آپؐ نے اپنے قول و فعل کے ذریعے تقدّس بخشا تھا، فروغ دیا۔ انھوں نے مذہب کی خاطر جبر نہ کیا اور چاہے ان کا سیاسی کردار کیسا ہی تھا، جیسی رواداری اور غیر جنبہ داری انھوں نے تمام مذہبوں سے برتی اُس کی نظیر اُن سے پہلے دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ طبیعی علوم کی تحصیل اور پرورش، جو کسی قوم کی ذہنی آزادی کی سب سے بڑی نشانی ہے

---

[1] John wycliffe ۱۳۲۰ء تا ۱۳۸۴ء۔ انگریز مذہبی مصلح جس نے انجیل کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔

[2] The Abbigenses جنوبی فرانس کے شہر آلبی کا ایک مذہبی فرقہ جو ۱۰۲۰ء سے ۱۲۵۰ء تک قائم رہا جسے الحاد کی بنا پر ختم کر دیا گیا۔

مسلمانوں کا ایک مرغوب مشغلہ تھا۔

عربوں کو جو دو ناکامیاں ہوئیں، ایک تو قسطنطنیہ کے محاذ پر اور دوسری فرانس میں، اُنھوں نے دنیا کی ترقی کو صدیوں کے لیے روک دیا۔ اگر عربوں کو مالِ غنیمت سمیٹنے کی نہ پڑگئی ہوتی اور ان کا آپس میں اتفاق رہتا اور اگر وہ شارلز مارٹل (Charles Martel)[1] کے وحشی لشکر کو مار بھگاتے تو دنیا کی تاریخ کے تاریک ترین دور کی داستان کبھی نہ لکھی جاتی۔ تحریکِ احیاء العلوم، تہذیب کی بحالی، عقل و فکر کی آزادی، یہ سب چیزیں جس وقت ظہور میں آئیں اُس سے کئی صدیاں پہلے آگئی ہوتیں۔ ایلبی جینیوں (The Albigenses) اور ہوگناٹوں The Huguenots کے قتلِ عام اور ٹیوڈر بادشاہوں اور پروٹیکٹوریٹ (The protectorate) کے زمانے میں انگریز پروٹسٹنٹوں کے ہاتھوں آئرلینڈ کے کیتھولکوں کے کشت و خون کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی سرگزشتیں پڑھ کر ہمیں اپنے دل کو رنج نہ پہنچانا پڑتا۔ ہمیں برونو[2] (Bruno) اور سروتیس[3] (servetus) کا ماتم نہ کرنا پڑتا جنھیں ایسے لوگوں نے جنھوں نے مادرِ کلیسا کے خلاف بغاوت کر دی تھی، موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اٹو دا فے[4] (auto-da-fe) کی جگر خراش

---

[1] فرنگیوں یعنی Franks کا بادشاہ جس نے مسلمانوں کو تُور Tours کے مقام پر ۷۳۲ء میں شکست دی اور اُن کی فتح یورپ کو روک دیا۔ ۶۸۵ء تا ۷۴۱ء۔

[2] جوردانو برونو ۱۵۴۸ء تا ۱۶۰۰ء۔ اطالوی فلسفی جس نے کوپرنیکس کے نظریۂ فلکیات کی تائید کی اور اس جرم کے لئے "انکوئی زیشن" (The Inquisition) کے حکم سے زندہ جلا دیا گیا۔

[3] ہسپانوی طبیب اور طبیعیات دان (۱۵۱۱ء تا ۱۵۵۳ء) جسے الحاد کے الزام پر نذرِ آتش کر دیا گیا۔

[4] Auto-Da-Fa پرتگالی زبان کی ایک ترکیب حاشیہ صفحہ ۵۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

داستان، انکوئی زیشن کے بہیمانہ قتلوں کی روداد، ازٹکوں[1] (The Aztecs) اور
انکوں[2] (The Incas) کے قتلِ عام کے رُوح فرسا قصے یہی سالہ جنگ
(The Thirty Years War) اور اس کی نازل کی ہوئی مصیبتوں کی دل ہلا دینے
والی کہانی — ان میں سے کسی کے لکھے جانے کی نوبت نہ آتی۔ سب سے اہم بات تو یہ
ہے کہ ہسپانیہ، جو کسی زمانے میں علم و فن کا ملجا و ماویٰ تھا، صدیوں کی گراں بہا میراث کھو
کر ذہنی اعتبار سے ایسا ویران نہ ہو جاتا جیسا وہ اب ہے۔ کون ہے جسے اس
عالی ظرف قوم کے انجام کا حال پڑھ کر قلق نہ ہوا ہو جسے عیسائی بادشاہوں کے مجنونانہ تعصب
نے اس وطنِ مالوف سے دیس نکالا دیا جسے اس نے اقوامِ عالم میں ممتاز کر دیا تھا۔ کسی
نے کیسے منصفانہ طور پر کہا ہے :۔

"وہ ایک منحوس گھڑی تھی جب غرناطہ کے میناروں پر صلیب نے ہلال کی
جگہ لے لی۔"

ابنِ رُشد اور ابنِ باجہ Waladch اور عائشہ اور دوسرے زندگانِ بزرگ
کی رُوحیں اپنی قوم کی بنائی ہوئی عالیشان عمارتوں کے کھنڈروں میں بیٹھی رو رہی ہوں گی، جہاں
اب نہ وہ اگلی سی شاعری اور موسیقی کی محفلیں ہیں، نہ وہ سپاہ گری کے کرتب، نہ وہ علم و
دانش کی درس و تدریس اور جہاں اگر اب کوئی آواز سنائی دیتی ہے تو صرف مذہبی مناظروں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۱) ترکیب ہے جس کے معنی ہیں "عملِ ایمان" انکوئی زیشن کے زیرِ فرمان اہلِ
بدعت پر مقدمہ چلانے، انھیں سزا کا حکم سنانے اور پھر انھیں زندہ جلا دینے کے سارے عمل پر اس
ترکیب کا اصطلاحاً اطلاق ہوتا تھا۔

[1] ازٹک میکسیکو کے قدیم باشندے تھے جنھوں نے ایک قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب قائم کی
تھی اور جو ہسپانیوں کے آنے سے پہلے میکسیکو میں حکمران تھے۔

[2] انکہ پیرو کے قدیم باشندے تھے جو ہسپانوی فتح سے پہلے وہاں آباد تھے اور جو ایک اعلیٰ
تہذیب کے مالک تھے۔

اور سیاسی مجادلوں کے شور و غل کی گونج۔ عیسائیت نے اُن مسلم اندلوسیوں کے نام لیواؤں کو نکال کر صحرا میں دھکیل دیا اور جو خوبصورت سرزمین اُن سے چھینی اس کا تمام عرقِ زندگی نچوڑ کر اُسے ایک ذہنی و اخلاقی صحرا بنا دیا۔[1]

اگر مسلم قسطنطنیہ کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جاتا جو صحیح العقیدگی کی پُرجوش حامی اور اپنے سگے بیٹے کی قاتلہ ملکہ آئرین (Irene) کا دارالحکومت تھا تو وہ سیاہ کارنامے جن سے اسوریوں (The Issurians) کومنینیوں (The Comneni) اور پیلیولوگیوں[2] (the Palaeologi) کی تاریخ کے صفحات داغدار ہیں، وہ دہشت ناک نتائج جو لاطینیوں کی تسخیرِ بازنطین سے پیدا ہوئے اور اُن سے بھی بڑھ کر وہ ناپاک محاربے جن میں عیسوی یورپ نے ایشیائی قوموں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی غالباً کبھی معرضِ وقوع میں نہ آتے۔ بہرحال ایک بات یقینی ہے وہ یہ کہ اگر قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا تو بُت شکنی کی تحریک ناکام ثابت نہ ہوتی اور عیسوی کلیسا کی اصلاح بہت پہلے ہو چکتی۔ لیکن مشیتِ ایزدی کو کچھ اور منظور تھا۔ فکرِ آزاد کی وہ لہریں جو اسلامی علاقوں سے اُٹھ کر اسوری شہنشاہوں کی مملکت میں پہنچیں جہالت، توہم پرستی اور تعصب کی چٹانوں پر سر پٹک کر رہ گئیں۔ فکرِ آزاد کی قوت اس وقت تک محسوس نہ کی گئی جب تک سیلرنو اور قرطبہ کے مکاتب کے مشترک عمل نے، یعنی ابن رُشد اور غالباً چند سرچشمۂ اسلام سے فیض یافتہ یونانیوں کے مجموعی اثر نے کلیسائیت کی فصیل کو توڑ نہ دیا۔

---

[1] مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں اسپین کی جو اقتصادی حالت تھی اور علوم و فنون نے جو ترقی وہاں کی اس کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے:

A Short History of the Saracens

[2] بازنطینی سلطنت کے تین حکمران خاندان۔ (مترجم)

اسلام نے ذہنی آزادی کی حکومت قائم کی۔ صحیح طور پر کہا گیا ہے کہ جب تک اسلام نے اپنے شمائل کو برقرار رکھا اُس وقت تک وہ علم و تہذیب کا پُرجوش حامی اور سرپرست، ذہنی آزادی کا محب و معاون رہا لیکن جب خارجی اثرات نے اُس میں نفوذ شروع کیا اُسی وقت سے وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہنے لگا۔

لیکن مسلمانوں پر دورِ حاضر میں جو جمود طاری ہے اُس کی توجیہ کے لیے ضروری ہے کہ بارہویں اور سترھویں صدی عیسوی کے درمیان ہسپانیہ، افریقہ اور ایشیا میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ہم ان پر دوبارہ نگاہ ڈالیں۔ ہسپانیہ میں عیسائیت نے لوگوں کی ذہنی زندگی تلف کر دی۔ مسلمانوں نے ہسپانیہ کو ایک باغ بنا دیا تھا۔ عیسائیوں نے اُسے ایک صحرا میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں نے ملک کے چپے چپے پر مدرسے اور دارالعلوم قائم کئے تھے عیسائیوں نے انھیں مقدس شخصیتوں اور بتوں کی پوجا کے لیے گرجوں میں تبدیل کر دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے علم و سائنس کے جو ذخیرے جمع کئے تھے عیسائیوں نے انھیں جلا کر راکھ کر دیا۔ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے چن چن کر ذبح کئے گئے یا زندہ جلا دیئے گئے۔ جو تھوڑے سے بچ گئے اُنھیں غلام بنا لیا گیا، جو بچ کر بھاگ نکلے وہ افریقہ کے ساحلوں پر جا جا کر بے خانماں فقیروں کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ہسپانیہ کے عیسائیوں نے اندلسی مسلمانوں پر جو مظالم توڑے اُنھیں فراموش یا معاف کرانے کے لیے حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمدؐ دونوں کا مشترک عفو و رحم درکار ہوگا۔ بہرحال سزا میں دیر نہ لگی۔ ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ہسپانیہ کا آتشکدہ ٹھنڈا پڑ گیا[1]۔

---

[1] مغربی افریقہ میں فاطمی حکومتوں کے زوال کے بعد ایک خاندان جس کا جدِّ امجد مقابی "مربوط" رولی تھا، برسرِ اقتدار آئی، جسے اپنے بانی کی مناسبت سے المرابطہ کہا جاتا ہے۔ ابن ذہر کا مربّی یوسف ابن تاشقین اسی خاندان سے تھا۔ اُس کا بیٹا الموحدین کے بانی عبدالمومن کے ہاتھوں مارا گیا۔ عبدالمومن نے مراکش اور فاس کو تاخت و تاراج کیا۔ موحدین وسطی عرب کے وہابیوں اور اخوان سے قریب کا رشتہ رکھتے تھے اور غالباً لیبیا کے مہدیوں سے بھی کچھ بہت مختلف نہیں تھے۔ اس خاندان کے پہلے دو بادشاہوں، عبدالمومن اور یوسف نے علوم و فنون کی پرورش کی لیکن (باقی حاشیہ صفحہ ۵۸۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

معربی افریقہ میں تیسرے الموحد حکمران کے دورِ حکومت میں ملّائیت نے جو زور پکڑا اور بربروں نے جو مذہبی جوش دکھایا ان دونوں نے مل کر ترقی کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا، صدیوں سے آگے بڑھتی ہوئی تہذیب کے قدم روک لیے اور علوم وفنون کے مرکزوں کو تعصّب اور جہالت کے مرکز بنا دیا۔ بربری کے ساحل پر کورسیئروں (The Corsairs) کے آباد ہونے نے اور آخری مملوک سلاطین کے تخت جو تاراج پھیلا اُس نے پُرامن علمی کارروائیوں کی حوصلہ شکنی کی۔ ایشیا میں خاندانِ تیموری کے زوال اور غیر متمدن اور متعصّب اُزبکوں کے تیموری دارالحکومت پر قابض ہونے نے لوگوں کی ذہنی طاقتوں کو تلف کر دیا۔ ایران میں صفویوں کے تحت سائنس اور ادب میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ لیکن یہ نشاۃ الثانیہ محض عارضی ثابت ہوئی۔ وحشی غزیلوں (Ghihzais) کے فتنے نے بہت جلد اس کا خاتمہ کر دیا۔ وسطی ایشیا کے ان بدقسمت ملکوں پر ایک مُردنی سی چھائی ہوئی ہے، البتہ افغانستان میں یہ آہستہ آہستہ رفع ہو رہی ہے۔

عثمانی قلمرو میں سلیم اول، سلیمان اور مُرادین کے ماتحت علم کی قدر ہوئی، لیکن عثمانی بحیثیت مجموعی فوجی لوگ تھے۔ پہلے تو اپنے فاتحانہ عزم پورے کرنے کے لیے، لیکن بعد میں مجبوراً اور اپنی حکومت برقرار رکھنے کے لیے وہ ایک ایسے بے پناہ دشمن سے برسرِ پیکار تھے جس کی فتنہ پردازی کی کوئی حد نہ تھی اور جس کے ارادوں کا کچھ پتہ نہ لگ سکتا تھا۔ وہ دشمن اب نیست و نابود ہو چکا ہے لیکن ترک قوم کو ابھی اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرنی ہوگی۔ ایسے حالات میں ادب وفن کا پنپنا معلوم۔ اسلام پر رجعت پسندی کا جو بہتان باندھا جاتا ہے اس سے بحث کرتے ہوئے موسیو گوبینو (Gobineau) یہ لکھتا ہے کہ:-

"یورپ کے کسی ملک میں ڈھائی سو سال تک اُس قسم کی فوجی اور سیاسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۴) تیسرے بادشاہ یعقوب المنصور کے عہدِ حکومت میں تعصب کو عروج ملا۔

آمریت تصور کیجئے جیسی کہ ترکی میں رہی ہے، اس طرح کا جنگی مزاج خیال میں لایئے جیسا کہ غیر ملکی غلاموں، سرکیشینوں، گرجستانیوں، ترکیوں اور البانیوں کے زیرِ اقتدار مصر میں رہا ہے، وہ حملے جو افغانوں نے ۳۰، اُکے بعد ایران پر کئے اُن کا نقشہ ذہن میں جمائیے، نادر شاہ کے جبر و استبداد کی اور اس ظلم و ستم اور تاخت و تاراج کی خیالی تصویر کھینچئے جو قاچاریوں کے تخت نشین ہونے کے وقت ظہور میں آئی ۔۔ ان سب واقعات کو ان کے اسباب و عوارض کے ساتھ یکجا کیجئے تو پھر آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ اگر کسی یورپی ملک میں یہ سب کچھ ہوا ہوتا تو ایک یورپی ملک ہونے کے باوجود اس کا کیا حشر ہوتا اور آپ کو مشرقی ملکوں کی تباہی و بربادی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کوئی مزید تجسس نہ کرنا پڑے گا، نہ آپ کو اس امر کی ضرورت پیش آئے گی کہ اسلام پر کوئی بھی غیر منصفانہ الزام عائد کریں۔"

ساتویں صدی عیسوی سے لے کر جب کہ اسلام کا ظہور ہُوا سترھویں صدی عیسوی تک (بعد کی صدیوں سے قطعِ نظر) اسلام میں ایک سائنسی اور ادبی رُوح کارفرما تھی جو اُتنی ہی قوی تھی جتنی وہ رُوح جس کا مظاہرہ جدید یورپ کر رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو ترقی کی ایک لہر پر اٹھا کر آگے بڑھا دیا اور انھیں اعلیٰ درجے کی مادی خوشحالی اور ذہنی نشو و نما حاصل کرنے کی توفیق بخشی۔ گاتھوں (The Goths) اور وینڈلوں (The Vandals) کے فتنے کے بعد سے یورپ کی ترقی کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہُوا۔ جب ایٹلا (Attila) فرانس سے واپس گیا اس وقت سے لے کر اب تک یورپ کو ایسی کسی آفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جیسی تاتاریوں اور اُزبکوں کی صورت میں ایشیا پر نازل ہوئی۔ اس نے جو جنگیں لڑیں وہ ضرور شدید تھیں، خونریز تھیں، انسانیت سوز تھیں، لیکن وہ انسانیت یا عدمِ انسانیت کی مساوی شرائط پر لڑی گئیں۔ کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں نے بیشک ایک دوسرے کو زندہ جلایا ہے، لیکن غریب اندلسی مسلمانوں کے قتلِ عام سے لے کر اب تک یورپ کو کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا جس کا مقابلہ اُس جلّادانہ کشت و خون سے کیا جا

سکتا ہو جو تاتاریوں نے تہذیب و ثقافت کے تمام مرکزوں میں کیا اور جس نے وہ تمام صاحب کمال طبقے تباہ کر دیئے جو اُمتِ مسلمہ کی ریڑھ کی ہڈی تھے[1] اور اب

پردہ داری می کند در قصرِ قیصر عنکبوت   بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

---

[1] منگولوں نے بغداد میں جو ہنگامۂ تاخت و تاراج برپا کیا وہ اس ہنگامے کا نمونہ تھا جو انھوں نے دوسرے شہروں میں برپا کیا لیکن ان وحشیوں نے جو دہشت ناک مظالم توڑے اُن کا خاطر خواہ نقشہ کھینچنے کے لیے کسی گبنِ ثانی کی ضرورت ہے۔ تین دن تک کوچہ و بازار میں لہو کی ندیاں بہتی رہیں، یہاں تک کہ کئی میلوں تک دریائے دجلہ کا پانی سرخ ہو گیا۔ لوٹ مار، کُشت و خون، حُرمت شکنی، عصمت دری اور انسانیت سوز افعال کا سلسلہ چھ ہفتوں تک جاری رہا۔ محل، مسجدیں اور مقبرے جلا دیئے گئے یا منہدم کر دیئے گئے تاکہ اُن کے گنبدوں پر جو سونا تھا وہ اُتار لیا جائے۔ شفاخانوں میں مریضوں کو اور مدرسوں اور مکتبوں میں اُستادوں اور طالب علموں کو تہِ تیغ کر دیا گیا۔ مقبروں میں سے مشائخ و ائمہ کے فانی باقیات اور جامعوں میں سے علما و فضلاء کی غیر فانی تصنیفات نکال نکال کر راکھ کے ڈھیر کر دی گئیں۔ کتابوں کو یا تو آگ میں پھینک دیا گیا یا اگر آگ نزدیک نہ تھی اور دجلہ قریب تھا تو انھیں دریا کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح پانچ صدیوں کا جمع شدہ خزانۂ علم و حکمت ہمیشہ کے لیے نوعِ انسانی کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ قوم کے برگزیدہ اشخاص کو چن چن کر مار دیا گیا۔ لیکن ان میں سے دو اہم اشخاص بچ گئے۔ ہلاکو کا قاعدہ تھا کہ وہ جس ملک میں سے گزرتا مصلحۃً وہاں کے چند شہزادوں اور عمائدِ سلطنت کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ اُن میں سے ایک سعد بن زنگی تھا جو فارس کا اتابک تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سعدیؔ بھی اپنے دوست اور مربی کے ساتھ ہو لیا۔ چنانچہ اُس نے بغداد کی تباہی اور اس کے باشندوں کی جگر خراش مصیبتوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ذیل کے دردناک ابیات میں (جو اس کے مشہور شہر آشوب سے مقتبس ہیں۔ مترجم) اپنے جذبات کو بیان کرتا ہے :۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں   بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک   سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

دسواں باب

اسلام کی عقلیاتی اور فلسفیانہ رُوح

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

ازمنۂ قدیمہ کی اور تمام قوموں کی طرح زمانۂ قبلِ اسلام کے عرب بھی بڑی سختی سے قسمت کے قائل تھے۔ ان کی قدیم شاعری کا جو حصہ اب تک محفوظ ہے اور جو اُن کے خیالات اور اوضاع و اطوار کی واحد تحریری یادگار ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اشاعتِ اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب کے تمام باشندوں نے اس عقیدے کے آگے سپر ڈال رکھی تھی کہ ایک اٹل اور اندھی قوت اس دنیا کا کارخانہ چلا رہی ہے اور انسان اُس کے ہاتھوں میں محض ایک کھلونا ہے۔ اس عقیدے کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دلوں میں نہ موت کا خوف تھا نہ زندگی کی کوئی وقعت۔ اسلام کی تعلیمات نے عربوں کے خیالات میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ کائنات پر ایک افضل و اعلیٰ عقل کی حکمرانی کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں انسانی ارادے کی آزادی پر مبنی اعتمادِ نفس اور اخلاقی ذمہ داری کا ادراک بھی پیدا ہُوا۔ قرآن کے نمایاں اوصاف میں ایک وصف وہ عجیب و غریب طریقہ ہے جس سے وہ دو ایسے تصورات کو جو بادی النظر میں باہم متضاد معلوم ہوتے ہیں یکجا کرتا ہے۔ یعنی ایک طرف تو ایک ارادۂ ربّی کا وجود، جو صرف تمام چیزوں کا بندوبست ہی نہیں کرتا بلکہ انسانوں پر بھی براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے اور اُن کے خیالات کے سرچشموں پر اختیار رکھتا ہے اور دوسری طرف انسان کی آزادیٔ عمل اور آزادیٔ عقل کا دعویٰ۔ یہ وصف کچھ قرآن ہی سے مخصوص نہیں بلکہ

انجیل میں بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن قرآن میں انسانی ذمّہ داری پر اتنا زیادہ زور دیا گیا ہے کہ ان دو تصورات میں مطابقت کا سوال قدرتی طور پر ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بادی النظر میں متناقض معلوم ہوتی ہے کہ جب انسان کے تمام اعمال ایک قادرِ کل ارادے کے زیرِ فرمان ہیں تو اس کے باوجود اسے اعمال کی جزا و سزا دی جائے، جو کہ اسلامی اخلاقیات کا بنیادی اصول ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے دل میں ایک ہمیشہ زندہ رہنے والے اصولِ فعّال پر جو ایمان تھا اور انھیں انسان کی ترقی پر جو اعتماد تھا، یہ دونوں چیزیں مل کر اس پُر اسرار معمّے کا حل مہیا کرتی ہیں۔ میں اپنا مطلب قرآن سے دو طرح کی عبارتیں پیش کر کے واضح کروں گا۔ یعنی ایک تو ایسی عبارتیں جن میں ارادۂ ربّی کی مطلقیت بیان کی گئی ہے اور دوسرے ایسی عبارتیں جو انسانی ارادے کی آزادی کا دعویٰ کرتی ہیں :۔ "خدا کا انتظام ایک معینہ قاعدے کے مطابق ہے...... سورج جو اپنی منزل کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ اُس زبردست اور باخبر کا بنایا ہوا ایک معمول ہے[۱]...... اور اس کی نشانیوں میں سے ایک آسمانوں اور زمین کا بنانا ہے اور اُن جانوروں کا بنانا جو اس نے زمین پر بکھیر دیئے ہیں اور جنھیں وہ جب چاہے اکٹھا کر سکتا ہے[۲]...... کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے زمین اور آسمان بنائے اور اُن کے بنانے میں نہ تھکا وہ مردوں کو جلانے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیوں نہیں؟ وہ ہر چیز پر قادر ہے[۳]...... اور ایک فتح اور بھی ہے جو تمھارے قابو میں نہیں آتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گھیر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے[۴]...... کوئی ایسی چیز نہیں جس کے ہمارے پاس خزانے نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں[۵]...... آسمان و زمین کے بھید اللہ کے پاس ہیں اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے[۶]...... اُنھیں دنیا کی زندگی کی حقیقت اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسا دیا تو زمین کے پودے خوب گھنے ہو گئے اور کل وہی پودے بھُس بن کر رہ گئے جنھیں ہوائیں اُڑاتے

---

[۱] یٰسین - ۳۸ ؛ [۲] الشوریٰ - ۲۹ ؛ [۳] الاحقاف - ۳۳ ؛ [۴] الفتح - ۲۱ ؛
[۵] الحجر - ۲۱ ؛ [۶] النحل - ۷۷ ؛

لیے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[1]....... اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے[2]...... اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے[3]....... وہی ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی[4]....... تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے[5]....... دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ زمین کے مُردہ ہو جانے کے بعد وہ اُسے کس طرح زندہ کر دیتا ہے۔ یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے[6]....... آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور جو کچھ تمھارے دل میں ہے چاہے تم اُسے ظاہر کرو اور چاہے چھپاؤ اللہ ہر حال تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر اُسے اختیار ہے کہ جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[7]....... کہو اے اللہ، ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلت دے۔ ہر بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے[8]....... اللہ جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے[9]....... آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے جو کچھ ان میں ہے وہ اُسی کا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے[10]....... اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے[11]....... اللہ رات اور دن کو ناپتا ہے[12]....... اپنے رب اعلیٰ کی تعریف کر جس نے ہر شے کو بنایا اور صورت بخشی اور پھر راہ دکھائی[13]....... اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے لیے برابر ہے خواہ تم انھیں خبردار کرو یا نہ کرو۔ وہ کبھی ماننے کے نہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے[14]....... اگر اللہ چاہتا تو سارے انسانوں کو ہدایت دے دیتا[15]..... وہ کبھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہ بدلے[16].....

---

[1] الکہف ۔ ۴۵؛ [2] الحج ۔ ۳۹؛ [3] النور ۔ ۴۵؛ [4] الفرقان ۔ ۲؛ [5] الفرقان ۔ ۵۴؛ [6] الروم ۔ ۵۰؛ [7] البقرۃ ۔ ۲۸۴؛ [8] آل عمران ۔ ۲۶؛ [9] المائدہ ۔ ۱۸؛ [10] المائدہ ۔ ۱۲۰؛ [11] الطلاق ۳؛ [12] المزمل ۔ ۲۰؛ [13] الاعلیٰ ۔ ۱ تا ۳؛ [14] البقرۃ ۔ ۶ اور ۷؛ [15] الرعد ۔ ۳۱؛ [16] الرعد ۔ ۱۱؛

اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف اُس نے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے[1]

ملاحظہ کیا گیا ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات میں سے اکثر میں تقدیرِ ربّی سے صراحتاً قانونِ فطرت مراد ہے۔ ہر ستارے کا مقام اور ہر سیارے کا مدار مقرر ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر شے کا ایک لگا بندھا دستور ہے۔ اجرامِ فلکی کی گردش، فطرت کے مظاہر، زندگی و موت، ہر چیز ایک قانون کی تابع ہے۔ دوسری عبارتیں بلاشک و شبہ انسانی ارادے پر خدا کی فاعلیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، لیکن ان عبارتوں کی تشریح ایک تیسری قسم کی عبارتوں میں کی گئی ہے جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی فاعلیت کا انحصار انسانی ارادے پر ہے۔ خدا صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی مدد کے طالب ہوں۔ وہ صرف ایسے لوگوں کو سعادت بخشتا ہے جو اپنے دل کو ناپاک خواہشوں سے پاک کر لیں۔ معلمِ عربی کے لیے، اُسی طرح جس طرح اس کے پیش رووں کے لیے ایک قادرِ مطلق، صورت گرِ کائنات، عالمِ موجودات کا وجود عین الیقین کا درجہ رکھتا تھا۔ تمام زمانوں میں ایک حادیٔ کل، علیم و خبیر شخصیت پر ایمانِ واثق انسانوں کے لیے ایک قوی محرک رہا ہے۔ دشتِ زندگی کے تھکے ہارے رہ نوردوں کے لیے اس ادراک سے بڑھ کر کوئی چیز ڈھارس بندھانے والی اور اس کے سینے میں ایک بہتر و پاکیزہ تر دنیا کی جو شدید تمنا ہے اس کی تسکین کرنے والی نہیں کہ ایک ایسی قوت موجود ہے جو انسانوں سے برتر و بالاتر ہے اور جو مظلوموں کی دادرس، اُمیدواروں کی امیدیں پوری کرنے والی اور بیکسوں کی یار و مددگار ہے۔ ہمارے دل میں خدا پر جو ایمان ہے اس کا سرچشمہ ہی خدا کے تقدیری احکام ہیں۔ وہ اسی طرح صحیح معنوں میں قوانین ہیں جس طرح وہ قوانین جن کے مطابق اجرامِ فلکی کی گردش واقع ہوتی ہے۔ لیکن خدا کا ارادہ ایک من مانا اور

---

[1] الرعد - ۲۷

بے قاعدہ و بے اصول ارادہ نہیں، وہ ایک تعلیمی و تلقینی ارادہ ہے جس کی اطاعت عالم کو اپنے علمی مشاغل میں اور عابد کو اپنے حجرۂ عبادت میں کرنی پڑتی ہے۔

بہرکیف قرآن کی جن آیات میں انسانی ذمہ داری اور انسانی ارادے کی آزادی پر زور دیا گیا ہے وہ خدا کی مطلقیت کے تصور کی تعریف و تحدید کرتی ہیں۔ "اور جو کوئی گناہ کماتا ہے وہ خود اپنی ذمہ داری پر کماتا ہے[1]...... چھوڑ دو ایسے لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا سمجھا اور جنھیں اس دنیا کی زندگی نے بہکا دیا۔ مگر تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں مبتلا نہ ہو جائے[2]...... جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر کاربند پایا ہے اور اللہ نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہو اُن سے کہ اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیتا[3]...... اُن لوگوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا[4]...... اس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزہ چکھ لے گا[5]...... جو کوئی گمراہ رہے اس کی گمراہی کی ذمہ داری خود اس پر ہے[6]۔"

اپنے محدود دائرۂ زندگی کے اندر انسان کاملاً اپنے کردار کا مختار ہے۔ وہ اپنے اعمال کے لیے اور جو قوا اُسے دیئے گئے ہیں اُن کے صحیح یا غلط استعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ اس کا سیدھی راہ پر چلنا یا بھٹک جانا خود اس کے میلانات پر منحصر ہے۔ جو شخص خدا سے توفیق و ہدایت مانگے خدا کی مدد اس کے شاملِ حال ہوتی ہے۔ خدا نے جس اعانت کا وعدہ فرمایا ہے کیا اس کا طلب کرنا بجائے خود تزکیۂ نفس کا باعث نہیں؟ کیا ربّ الاعلیٰ سے تسکین و تقویت کی دعا مانگ کر کمزوروں کو قوت اور مظلوموں کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا؟ یہ تھے ہادیٔ اسلام کے خیالات اللہ کی حاکمیت اور انسانی ارادے کی آزادی کے بارے میں۔ قضا و قدر یا جبر و اختیار کے بارے میں آپ کے جو تصورات تھے اُن کے سمجھنے میں ہمیں آپ کے منقول ارشادات سے مدد ملتی ہے جو ہم تک ایسے وسائل سے پہنچے ہیں جنھیں ہم قطعی الثبوت قرار دے سکتے ہیں۔ نہ صرف آپ کے ارشادات

---

[1] النساء - ۱۱۱؛ [2] الانعام - ۷۰؛ [3] الاعراف - ۲۸؛ [4] التوبہ - ۷۰؛ [5] یونس - ۳۰؛
[6] یونس - ۱۰۸؛

بلکہ آپ کے داماد اور وصیِ علم اور اُن کے اوّلین جانشینوں کے ارشادات بھی جنھوں نے اپنے خیالات براہِ راست آپ سے اخذ کئے، انسان کی آزادیٔ عمل کے مسئلے کی کلید سمجھے جا سکتے ہیں جو صدیوں تک مختلف فرقوں کے درمیان مابہ النزاع رہا ہے لیکن اس مسئلے سے بحث کرتے وقت ہمیں یہ نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ جن روایت کو خدا پرستی اور ملائیت نے عقل کی فضیلت کے خلاف حربوں کے طور پر استعمال کیا ہے اُن میں سے اکثر روائتیں قرائن سے موضوع اور من گھڑت معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی روائتیں خود زبانِ حال سے بیان کرتی ہیں کہ وہ کیونکر وجود میں آئیں۔ ان میں سے بعض پر جن کی بابت یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مروی ہیں جنھیں آنحضرتؐ سے سرسری ملاقات کا موقع ملا، متوسط راویوں کے ذہنوں اور حافظوں میں تبدیل و تحریف کے صریح نشان ثبت ہیں۔ بہرحال مستند روایات کافی بڑی تعداد میں ہیں۔ میں اُن میں سے صرف چند ایک کا حوالہ دے کر اس امر کی جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں تشریح کر دوں گا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے دل میں پہلے جہاں خدائے علیم و حکیم کی شخصیت پر بیّن اعتماد تھا، وہاں اس کے ساتھ ساتھ ارادۂ انسانی کی آزادی کا کامل یقین بھی تھا۔ آپ نے موروثی خباثت اور جبلّی معصیت کا شدومد سے انکار کیا "ہر انسان مسلم (یعنی سلیم الفطرت) پیدا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا صابی بنا دیتے ہیں، جس طرح جانور کا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو کیا جب تک تم اس کا کوئی عضو خود نہ کاٹو تو تمھیں اس کا کوئی عضو کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے؟"[1] نومولود بچوں کی کوئی مثبت اخلاقی سیرت نہیں ہوتی۔ جو لوگ عنفوانِ عمر ہی میں مرجاتے ہیں" اُن کی بابت خدا ہی سب سے بہتر جانتا ہے کہ ان کا کردار کیا ہوتا" (اگر وہ سنِ بلوغ تک زندہ رہتے)۔ "ہر انسان میں دو قسم کے میلانات ہوتے ہیں: ایک تو وہ جو اُسے نیکی کی طرف لے جاتے ہیں اور نیکی کرنے پر مجبور کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اُسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں اور بدی کرنے

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یھودانہ وینصرانہٗ ویمجّسانہ، کما تنتج البھیمۃ بھیمۃ جمعاء ھل ترے فیھا جدعاء۔

پر مجبور کرتے ہیں۔[1] لیکن خدا کی نصرت ہر وقت قریب رہتی ہے اور جو کوئی اپنی نفسانی خواہشات پر غالب آنے کے لیے خدا کی مدد مانگے خدا اس کی مدد کرتا ہے۔" "وہ تمہارے اپنے افعال ہیں جو تمہیں جنت یا جہنم میں لے جائیں گے، یوں کہ جیسے ان میں سے ایک جگہ تمہارے لیے مقدر تھی۔" کسی شخص کا کردار قسمت کا نتیجہ نہیں ہوتا اور کوئی اٹل حکم تقدیر اُسے جنت یا جہنم میں نہیں لے جاتا۔ اس کے برعکس اس کی عاقبت اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا جوابدہ اور اپنی عاقبت کا مختار ہے۔" "ہر اخلاقی فاعل کو عمل کے مواقع میسر آجاتے ہیں" یا جیسا کہ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے "ہر شخص کو خدا کی طرف سے اپنی سیرت کے مطابق وسائل مہیا ہو جاتے ہیں"[2] انسانی کردار کسی صورت میں محض اتفاقی نہیں ہوتا۔ ایک عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زندگی قسمت اور سیرت کے معنی ہیں ایسے واقعات و اعمال کا ایک مربوط سلسلہ جو ایک محکم قانون یعنی مشیّتِ ربی کے ذریعے ایک دوسرے سے علت و معلول کے رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ حضرت علیؓ کے مواعظ میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔" اس سے پیشتر کہ تمہارے اعمال کے جانچنے کا وقت آئے اپنے نفس کو جانچو، اس سے پیشتر کہ اس زندگی میں تم نے جو کام کئے اُن کا حساب تم سے مانگا جائے آپ اپنا محاسبہ کرو، اس سے پیشتر کہ تمہاری رُوح کو اپنے نشیمنِ خاکی سے رخصت ہونا پڑے نیک و پاک کام کرنے کی کوشش کرو اور حق و راست بازی کے رستے پر ثابت قدم رہو۔ سچ یہ ہے کہ اگر تم اپنی تنبیہہ اور اپنی ہدایت آپ نہ کرو گے تو کوئی دوسرا انھیں راہِ راست نہ دکھا سکے گا۔"[3] "میں تمھیں تلقین کرتا ہوں کہ صدق و صفا کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ اس

---

[1] بخاری۔ باب عنوان ــــ ما قیل فی اولاد المسلمین "وہ محفوظ ہے جس کی اللہ مدد کرے" مروی از ابو سعید الخدری۔

[2] اعملوا فکلّ میسّر لما خلق لہٗ۔

[3] "نہج البلاغۃ" "حضرت علیؓ کے خطبات کا مجموعہ جو ان کے ایک جانشین شریف رضا نے تالیف کیا۔ اور جس کا تذکرہ ابن خلکان نے کیا ہے ۱۲۹۹ھ میں تبریز میں شائع ہوا۔ ۳ "نہج البلاغۃ"

نے تمھیں نجات کی راہ بھی دکھائی ہے اور اس دنیا کی آزمائشوں سے بھی آگاہ کیا ہے۔ بُرائی سے بچو، چاہے وہ تمھیں اچھی ہی کیوں نہ لگے گناہ سے پرہیز کرو، خواہ وہ کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو"۔[1] ...... "اے بندگانِ خدا، جو فرائض تم پر عائد کئے گئے ہیں اُنھیں پورا کرو کیونکہ اُن سے غفلت برتنے سے تمھیں ذلت نصیب ہوگی۔ صرف تمھارے نیک کام موت کو تم پر آسان کریں گے۔ یاد رکھو کہ ہر گناہ قرض کے اس بوجھ کو جو تمھارے سر پر ہے بڑھاتا ہے اور تمھاری زنجیر کو اور بھی بھاری بناتا ہے۔ رحمت کی خوشخبری تمھیں مل گئی ہے حق کا راستہ صاف ہے۔ تمھیں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کی اطاعت کرو، پاک زندگیاں بسر کرو، تقوے سے کام لو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ تمھاری کوششوں میں تمھاری مدد کرے اور تمھاری خطاؤں سے درگزر کرے"۔

"اپنے اندر حلم اور عاجزی پیدا کرو، پرہیزگاری اور راست بازی سے کام لو، آپ اپنے نفس کا محاسبہ کرو، کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے اُسے اجرِ عظیم ملتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا بڑے گھاٹے میں رہتا ہے۔ جو کوئی تقوے پر عمل کرتا ہے اپنی رُوح کو سکون بخشتا ہے، جو شخص تنبیہہ پہ کان دھرتا ہے وہ حق کو سمجھ لیتا ہے، جو شخص حق کو سمجھ لیتا ہے اُسے کمالِ علم حاصل ہو جاتا ہے"۔

ان ارشادات میں قضا و قدر کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس وہ ایک ایسے قلب کے آئینہ دار ہیں جس میں خدا پر ایک جیتا جاگتا ایمان تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھروسہ بھی تھا کہ انسان ذاتی اجتہاد کے ذریعے جس کا سرچشمہ اس کی اپنی قوّتِ ارادی ہے، اصلاح و ترقی کے مدارج طے کر سکتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام ؐ نے عقل اور علم، مقیّد و مطلق، محدود و غیر محدود کی جو تعریف کی وہ ہمیں ارسطاطالیسی الفاظ و افکار کی یاد دلاتی ہے اور حضرت علی رضؓ نے اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کا پڑھنا اخلاقیاتِ ارسطو کے مدّاحوں کے لیے

---

[1] "نہج البلاغہ"

فائدہ بخش ہوگا۔

"احتجاج الطبرسی"[2] ہمیں ایسا مزید مواد مہیا کرتی ہے جس کی مدد سے ہم اس بارے میں صحیح رائے قائم کرسکتے ہیں کہ اسلام میں قضا و قدر کا مسئلہ کیا ہے۔ ایک دن کسی نے حضرت علیؓ سے قضا و قدر کا مطلب دریافت کیا۔ آنھوں نے جواب دیا: "قضا کے معنی ہیں احکام الٰہی کی اطاعت اور گناہ سے پرہیز۔ قدر کے معنی ہیں تقوے کی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت، ایسے کام کرنے کی استعداد جو انسان کو قربِ الٰہی بخشتے ہیں اور ایسے کاموں سے پرہیز کرنے کی قابلیت جو انسان کو کمالِ الٰہی سے دور لے جاتے ہیں"۔ .... یہ نہ کہو کہ انسان مجبور ہے، کیونکہ ایسا کہنا خدا کی طرف ظلم کو منسوب کرنا ہے۔ یہ بھی نہ کہو کہ انسان کو اختیار[1] کلی حاصل ہے بلکہ یہ کہو کہ خدا کا فضل و کرم ہماری نیک کام کرنے کی کوششوں میں ہماری مدد کرتا ہے اور ہم گناہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہم اس کے احکام سے غفلت برتتے ہیں"۔ عقبہ ابن ربیعہ نے ایک دن حضرت علیؓ سے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کے معنی دریافت کیے۔ آپؓ نے جواب دیا: "اس کے معنی یہ ہیں کہ میں خدا کے عذاب سے نہیں بلکہ اس کی پاکی سے خائف ہوں۔ مجھ میں اس کے احکام بجالانے کی طاقت نہیں، مجھ میں جتنی طاقت ہے وہ سب اس کی مدد سے ہے[2]۔"

خدا نے ہمیں دنیا میں اس لیے بھیجا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اس نے جو توفیق بخشی ہے اس کے مطابق اس کا امتحان لے۔ اس کے بعد جو آیتیں تھیں ان کا اور قرآن کی دوسری عبارتوں کا حوالہ دے کر حضرت علیؓ نے مزید فرمایا: "خدا کہتا ہے 'ہم یہ دریافت کرنے کے لیے تمہارا امتحان لیں گے کہ تم میں سے کون مجاہدین اور کون صبر و تقوے والے ہیں اور ہم بتدریج تمہیں وہ کچھ حاصل کرنے میں مدد دیں گے جس کا تمہیں علم تک حاصل نہیں'[3] .... ان عبارتوں

---

[1] یعنی نیکی یا بدی کرنے کا اختیار

[2] احتجاج الطبرسی (الاحتجاج علیٰ اہل اللجاج از ابومنصور احمد الشیخ الطبرسی)

[3] ولنبلونکم حتیٰ نعلم المجاھدین منکم والصابرین ونبلوا اخبارکم (فی قولہ) وسنستدرجھم من حیث لا تعلمون۔

سے انسانی ارادے کی آزادی ثابت ہوتی ہے[1]۔ قرآن کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہ "خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے" حضرت علی رض نے ارشاد کیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا لوگوں کو نیکی یا بدی پر مجبور کرتا ہے۔ نہ یہ کہ وہ کسی وجہ کے بغیر ہدایت دیتا ہے یا ہدایت سے انکار کر دیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسانی ذمہ داری کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا حق کا راستہ دکھاتا ہے اور اس کے بعد انسانوں کو اختیار بخش دیتا ہے کہ اس راستے پر چلیں یا نہ چلیں[2]۔

فلسفۂ عرب نے جس کی پرورش بعدۂ دوسرے گہواروں میں ہوئی، درس گاہِ مدینہ میں جنم لیا۔ انسانی ارادے کی آزادی، جو اس نظریئے پر مبنی تھی کہ انسان کو اس کے مطابق جزا یا سزا ملے گی کہ اس نے اپنی عقل کو کیونکر استعمال کیا ہے، ہادیٔ اسلام کی تعلیمات کا ایک اہم جزو تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ راسخ عقیدہ بھی ان کی تعلیم میں شامل تھا کہ ایک افضل و اعلیٰ قدرت کائنات پر حکمران ہے۔ اس خیال نے پیغمبرؐ کے شاگردِ رشید کے ارشادات میں ایک زیادہ واضح اور متعین شکل اختیار کر کے ایک فلسفے کی حیثیت حاصل کر لی۔ مدینہ سے یہ فلسفہ دمشق، کوفہ، بصرہ اور بغداد پہنچا اور وہاں پہنچ کر اس نے اُن اخاذ دبستانوں کو جنم دیا جنھوں نے ابتدائی عباسی خلفاء کے ادوارِ حکومت کو آب و تاب بخشی۔

کربلا کے معرکۂ قتال اور مدینے کی تاخت و تاراج کے ہاتھوں اماموں کی درسگاہ بند ہو گئی تھی لیکن جب امام جعفر صادقؑ اہلِ بیت کے سربراہ بنے تو انھوں نے اُسے نئے سرے سے زندگی بخشی۔ وہ عالم بھی تھے، شاعر بھی تھے، فلسفی بھی، غیر ملکی زبانوں پر بھی قادر تھے، خیالات میں بیحد وسیع المشرب اور عقلیت پسند تھے اور عموماً یہودی، عیسائی اور زرتشتی اربابِ فضل سے تبادلۂ آراء اور مابعد الطبیعیاتی مباحثوں میں مصروف رہتے تھے چنانچہ انھوں نے دبستانِ مدینہ کو فلسفیانہ رنگ میں رنگ دیا۔ قضا و قدر کے بارے میں اُن کے جو خیالات تھے

---

[1] احتجاج الطبرسی

[2] ایضاً

اُن میں سے بعض اس قابل ہیں کہ اُن کا ذکر کیا جائے۔ مسئلہ جبر کی بابت جو اس وقت دمشق میں اُٹھا، اُنھوں نے ذیل کی رائے ظاہر کی:۔ "جو لوگ جبر کے معتقد ہیں وہ خدا کو اپنے گناہوں میں شریک کرتے ہیں اور اُسے ایک حاکمِ جابر قرار دیتے ہیں جو اُنھیں ایسے گناہوں کی سزا دیتا ہے جن کے کرنے پر وہ فطرتاً مجبور ہیں: یہ کفر ہے" پھر وہ ایک ایسے نوکر کی مثال دیتے ہیں جسے اس کے آقا نے بازار سے کوئی چیز خرید لانے کے لیے بھیجا ہے لیکن اُس چیز کی قیمت ادا کرنے کے لیے پورے پیسے نہیں دیئے: جب نوکر خالی ہاتھ بازار سے واپس آتا ہے تو آقا اُسے سزا دیتا ہے۔ یہ مثال دے کر وہ کہتے ہیں: "مسئلہ جبر کی رُو سے تو خدا ایک غیر منصف آقا ثابت ہوتا ہے[1]" جہاں تک مسئلہ جبر کے مخالف مسئلہ تفویض کا تعلق ہے (جس کے معنی انسانی ارادے کی آزادی نہیں بلکہ خیر و شر کے انتخاب میں مکمل اختیار) اُنھوں نے فرمایا کہ اس قسم کا اصول اخلاق کی بُنیادیں اُکھیڑ کر رکھ دے گا اور تمام انسانوں کو اذنِ عام دے دے گا کہ جی کھول کر اپنی نفسانی خواہشات پوری کریں کیونکہ اگر ہر شخص کو یہ اجازت دے دی جائے کہ چاہے تو نیکی پر اور چاہے تو بدی پر کاربند ہو تو کسی قسم کی تکلیف شرعی باقی ہی نہیں رہتی[2]۔ چنانچہ امام صاحب اختیار کو تفویض سے مختلف قرار دیتے ہیں۔ "خدا نے ہر انسان میں یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ اُس کے احکام کو سمجھ سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔ جو لوگ صدق و صفا کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ اُن کی مدد کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کو مقبول ہیں۔ جو لوگ اُس کی حکم عدولی کرتے ہیں وہ گناہگار ہوتے ہیں" آٹھویں امام علی رضا نے ان خیالات کو شدّ و مدّ سے دُہرایا۔ اُنھوں نے جبر و تشبیہہ کو کفرِ مطلق کہا اور اُن کے مدعیوں کو دُشمنانِ دین گردانا، بلکہ علی الاعلان اُن پر روایات گھڑنے کا الزام لگایا۔ ساتھ ہی ساتھ اُنھوں نے اپنے پیرؤوں کو تنبیہہ کی کہ مسئلہ تفویض کو تسلیم نہ کریں۔ اُنھوں نے یہ کُھلے کُھلے عام اصول وضع کئے: "خدا نے تمھیں دو راستے دکھائے ہیں:

---

[1] احتجاج الطبرسی

[2] ایضاً

ایک تمھیں اس کی طرف اور دوسرا تمھیں اُس کے کمال سے دُور لے جاتا ہے۔ خوشی یا رنج، جزا یا سزا کا دارومدار تمھارے اعمال پر ہے۔ لیکن انسان میں یہ طاقت نہیں کہ بدی کو نیکی میں اور گناہ کو کارِ ثواب میں تبدیل کر سکے۔"

بنی اُمیّہ، جن میں سے بہت سے قبولِ اسلام کے بعد بھی دل سے مُشرک ہی رہے، اپنے آباؤ اجداد کی طرح قسمت کے قائل تھے۔ اُن کے عہدِ حکومت میں ایک ایسا دبستان ظہور میں آیا جس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کے عقائد سلف یعنی قدمائے اسلام سے ماخوذ تھے۔ قدمائے اسلام سب کے سب دنیا سے رحلت کر چکے تھے، اس لیے ہر قسم کی روائتیں تراشنا اور اُنھیں اُن میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کر دینا آسان تھا۔ اس دبستان کا نام جبریہ تھا اور اس کا بانی جہم بن صفوان تھا۔ کیلون (Calvin) کی طرح جبریہ[1] بھی اس امر سے منکر تھے کہ انسان آزاد ارادے کا مالک ہے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ "انسان اپنے اعمال کا ذمّہ دار نہیں، کیونکہ اس کے اعمال خُدا کی طرف سے ہوتے ہیں، نہ اس میں عمل کرنے کی قوّتِ فیصلہ ہوتی ہے اور نہ ارادہ کرنے کی قوّت۔ وہ اپنے اعمال میں خدا کی مالکیتِ علی الاطلاق کا محکوم ہے اور نہ قوّتِ عمل رکھتا ہے، نہ قوّتِ ارادی اور نہ قوّتِ انتخاب ــــ خدا اُس کے اندر اسی طرح فعلیت پیدا کرتا ہے جس طرح وہ غیر ذی رُوح چیزوں میں کرتا ہے۔ انسانی اعمال کی جزا و سزا کا دارومدار خدا کی حاکمیتِ مطلقہ پر ہے۔" صفاتِ الٰہی کے بارے میں بھی جبریہ کے چند نظریے تھے، جن کی کوئی اہمیت نہیں۔[2] شہرستانی کے قول کے مطابق جبریہ کے تین گروہ تھے۔ جہمیہ، نجّاریہ اور ضراریہ، جن میں چھوٹے چھوٹے جزئی اختلافات تھے لیکن جہاں تک مسئلہ قضا و قدر کا

---

[1] شہرستانی جبریہ کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک تو خالص جبریہ اور دوسرے مقابلتہً معتدل جبریہ۔ اوّل الذکر کا نظریہ یہ تھا کہ نہ تو عمل انسان کا ہوتا ہے نہ اُس میں کسی قسم کی صلاحیتِ عمل ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان عمل کی قدرت تو رکھتا ہے لیکن وہ مؤثر نہیں ہوتی۔

[2] شہرستانی۔

تعلق تھا ہجوں اس پر متفق تھے کہ انسان آزاد ارادے کا مالک نہیں۔ نجاریہ، جو تغیّر کے متعدد مراحل طے کر کے دو صدیوں کے بعد اشعریہ میں تبدیل ہو گئے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ خدا اپنے بندوں کے اعمال کا خالق ہے، عام اس سے کہ وہ اعمال نیک ہوں یا بد اور انسان اُن اعمال کے مالک بن جاتے ہیں۔ جبریہ عقائد نے اُموی خلفاء کی مقبولیت حاصل کی اور بہت جلد عوام میں پھیل گئے۔

جبریہ کا تقدیر کے بارے میں جو اٹل عقیدہ تھا اس نے اربابِ فکر کو بغاوت پر آمادہ کیا، اس بغاوت کے سربراہ معبد الجہنی، یونس الاسوار اور غیلان دمشقی تھے جنھوں نے اپنے بہت سے خیالات بداہتہً فاطمیوں سے اخذ کئے تھے۔ اُنھوں نے اُمویوں کے دارالحکومت میں، یعنی نظریۂ قضاء و قدر کے قلعے کی چار دیواری کے اندر، انسان کی مختاری کا اعلان کیا[1] لیکن انسانی آزادی کا دعوےٰ کرتے وقت وہ کبھی کبھی مسئلۂ تفویض کی سرحدوں کے قریب پہنچ جاتے تھے۔ دمشق سے یہ مباحثہ بصرہ پہنچا اور وہاں دونوں فرقوں کے اختلافات زیادہ شدید ہو گئے۔ جبریہ ایک نئے فرقے میں جس کا نام صفاتیہ تھا ضم ہو گئے۔ صفاتیہ مسئلہ تقدیر کے ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ اللہ میں چند صفات ہیں جو اُس کی ذات سے علیحدہ ہیں۔ جبریہ اس کے منکر تھے۔ جبریہ اپنے آپ کو سلف کے بلا واسطہ جانشین کہتے تھے۔ شہرستانی کے قول کے مطابق یہ پیروانِ سلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا میں چند دائمی صفات ہیں یعنی علم، قدرت، زندگی، ارادہ، سمع، بصر، کلام، جبروت، کریمی، فیاضی، رحمت، کبریائی، عظمت، لیکن وہ صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ عملیہ میں کوئی تمیز نہیں کرتے .... وہ بعض صفاتِ خبریہ کو بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ اور رحمت اور وہ ان صفات کی کوئی تعبیر نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ یہ خدا کی الہامی توصیف میں داخل ہیں اور اسی لیے اُنھوں نے اُن کو صفاتِ خبریہ کا نام دیا ہے۔" جبریہ کی طرح صفاتیہ بھی قضاء و قدر کے مُردہ دلانہ نظریے پر شدّت سے اڑے رہے۔ صفاتیہ سے مُشبّہہ کی شق نکلی جو صفاتِ باری کو مخلوقات کی طرح صفات[2]

---

[1] شہرستانی۔

[2] التشبیہ بصفات الحدثات۔

سے تشبیہ دیتے تھے اور جنھوں نے خدا کو اپنی ذات کی تمثال بنا دیا۔[1] اس زمانے میں جو علما جامیان[؟] قضا و قدر کے مخالف تھے اُن میں سب سے ممتاز امام حسن بصری تھے۔ امام صاحب مدینے میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے حکمائے بیت النبی کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا تھا۔ اُن سے انھوں نے وسیع النظری اور عقلیت پسندی اخذ کی تھی۔ بصرے میں اقامت اختیار کرنے کے بعد انھوں نے اپنی درسگاہ کھولی جس میں سارے عراق سے طلبہ جوق در جوق آنے لگے۔ اس درسگاہ میں وہ مابعد الطبیعیات کے مسائل پر اپنے استادوں کی طرح آزادانہ اظہارِ خیال کرتے تھے۔

امام حسن بصری کے شاگردوں میں ایک ممتاز شاگرد واصل ابن عطاء الغزال[2] تھا، جو بڑی دماغی استعداد کا مالک اور علوم عقلیہ و نقلیہ اور روایات کا جیّد عالم تھا۔ اس نے بھی ابتداء میں درسگاہِ مدینہ سے استفادہ کیا تھا۔ ایک مسئلۂ ایمانی پر اختلاف کے باعث امام صاحب نے اُسے اپنے درس سے نکال دیا۔ چنانچہ اُس نے اپنی ایک علیحدہ درسگاہ کھولی۔ اس بناء پر اس کے متبعین کو معتزلہ یا اہل اعتزال یعنی اختلاف[3] کرنے والے کہتے ہیں۔ بہت جلد اُس نے

---

[1] شہرستانی صفاتیہ تشبیہیوں کو بعد کے تشبیہیوں سے ممتاز کرتا ہے: "جو لوگ عقیدۂ سلف پر قائم تھے انھوں نے جو کچھ کہا بعد میں چند اشخاص اس سے بھی آگے نکل گئے اور انھوں نے یہ دعوے کیے کہ صفاتِ باری کو بیان کرنے والے جتنے کلمات ہیں وہ سب لغوی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں اور ان کی تفسیر من و عن کی جانی چاہئیے، یعنی کسی مجازی تاویل کے بغیر، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واجب نہیں کہ محض ان کے لغوی معانی پر اصرار کیا جائے، کیونکہ اس طرح تو وہ خالص تشبیہہ (تشبیہ الصرف) بن جاتے ہیں جو عقیدۂ سلف کے منافی ہے۔"

[2] ابو حذیفہ واصل ابن عطاء الغزال عبدالملک، ولید اور ہشام کے ادوارِ خلافت میں ہُوا۔ ۸۳ھ میں پیدا ہُوا اور ۱۳۱ھ میں وفات پائی۔

[3] شہرستانی، "گوہرِ مراد"، "غیاث اللغات" اور "فرہنگ" (لکھنؤ ۱۸۰۹ء) میں معتزلہ کا تلفظ ز کے اوپر فتحہ سے کیا گیا۔

اپنے اُستاد کے برابر شہرت حاصل کرلی۔ بلکہ اُستاد کا مکتب اس کے مکتب میں مدغم ہو گیا۔ اُسے ذہنی اُمویت سے جو دشمنی تھی اُس کے باعث وہ متعدد مرتبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا اور بالخصوص اُن متنازعہ فیہ مسائل پر جو امیر معاویہ کی بدولت پیدا ہوئے تھے ایسے خیالات کا اظہار کر گیا جو درسگاہِ مدینہ کے خیالات سے لگا نہ کھاتے تھے۔ بہرحال اس کے مکتب کی عمومی عقلیت پسندی نے اس زمانے کے آزاد خیال اربابِ فکر و نظر کو اس کے علم کے نیچے جمع کر دیا۔ فاطمی فلاسفہ کے طریقِ استدلال کو اختیار کر کے، اُن کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کر کے اور ان خیالات کو اپنا کر جو انھوں نے بسا اوقات زوردار الفاظ میں بیان کئے تھے، اُس نے اُن مسائل کو جن میں اُسے قائلینِ قضا و قدر سے اور عموماً تقلید پسندوں سے اختلاف تھا مستقل مباحث کی شکل دی۔ کئی صدیوں تک اس کا مکتب لوگوں کے ذہنوں پر مسلط رہا اور اس زمانے میں جو روشن دماغ حکمران برسرِ اقتدار تھے اُن کی حمایت کی بدولت اس نے مسلمانوں کے عقلی و فکری ارتقاء کو ایک ایسا محرک بہم پہنچایا جیسا اس سے پہلے کبھی بہم نہ پہنچا تھا۔ سربرآوردہ علماء، طبیعیات داں، ماہرینِ ریاضیات، مورخین، غرض علم و فکر کی ساری دنیا جس میں خود خلفاء بھی شامل تھے مکتبۂ معتزلہ سے وابستہ تھی۔[1]

ابوالہذیل حمدان،[2] ابراہیم ابن سیار النظام،[3] احمد ابن حائط، فضل الحدثی اور ابو علی محمد الجبائی[4] جیسے لوگوں نے، جو یونانی فلسفہ و منطق پر کامل عبور رکھتے تھے، بہت سے خیالات کو جو انھوں نے یونان سے اخذ کئے مدنی مکتب کے خیالات سے ملا دیا اور اس طرح مسلمانوں کے فلسفیانہ تفکر کو ایک

---

[1] ہم یہاں دو تین چوٹی کے معتزلہ کے نام لیتے ہیں جنھیں ابھی تک شہرتِ عام حاصل ہے۔ امام زمخشری جن کی کتاب "کشاف" قرآن کی بہترین تفسیر تسلیم کی جاتی ہے، امام مسعودی، فلسفی اور مورخ الحسن بن الہیثم، ابوالوفاء اور میر خوند۔

[2] اُس نے متوکل کے عہدِ حکومت کے آغاز میں ۲۳۵ھ (مطابق ۸۴۹-۸۵۰ء) میں وفات پائی (غالباً صحیح نام ہے، محمد بن الہذیل العلاف۔ مترجم)

[3] ابوالہذیل کا بھتیجا یا بھانجا تھا۔ [4] متولد ۸۶۱ھ، متوفی ۹۳۳ھ۔

نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ ارسطو، پورفری (Porphyyr) اور دوسرے حکمائے یونان و اسکندریہ کی تصنیفات سے استفادہ کر کے معتزلہ نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی جس کا نام علم الکلام ہے (یعنی عقل کا علم۔ کلام بمعنی نُطق یعنی Logos۔ اس نئے علم کے حربے سے اُنھوں نے اسلام کے خارجی دشمنوں کا بھی اور داخلی دشمنوں کا بھی مقابلہ کیا، یعنی ان غیر مسلموں کا بھی جو اسلام کی تعلیمات پر اعتراض کرتے تھے اور ان مسلموں کا بھی جو اندر سے اس کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جن سیاسی مسائل نے حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خلفشار پیدا کیا تھا اُن کے بارے میں واصل کے جو انتہا پسندانہ خیالات تھے وہ بہت جلد ترک کر دیئے گئے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مذہبِ اعتزال میں جو معتدل عناصر تھے وہ فاطمی مکتب کی عقل پسندی میں ضم ہو گئے جس سے اُن کا خمیر اُٹھا تھا۔ یہ ایک معروف امر ہے کہ تمام بڑے بڑے فلاسفہ معتزلہ نے فاطمیوں کی درسگاہ میں تعلیم پائی تھی اور اس معاملے میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اعتدال پسند اعتزال حضرت علیؓ اور اُن کے سب سے وسیع المشرب ابتدائی جانشینوں، بلکہ خود رسولِ خدا کے خیالات کی عکاسی کرتا تھا۔ معتزلہ کے عقائد کا بامعان جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ وہ یا تو حرف بحرف وہی عقائد تھے جن کی تعلیم ابتدائی فاطمیوں نے دی تھی یا اُن عقائد کی ترمیمیں تھے جو یا تو ایک ترقی یافتہ معاشرے کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر کی گئیں یا فلسفۂ یونان و اسکندریہ کے مطالعے کا نتیجہ تھیں۔

حضرت علیؓ نے پُر زور الفاظ میں ذاتِ باری کے تمام ایسے تصوّرات کی مذمت کی تھی جن میں انسان سے جسمانی یا جذباتی مشابہت کا پہلو پایا جائے۔ خدا کسی ایسی چیز سے مشابہ نہیں جس کا تصور ذہنِ انسانی میں آسکتا ہے، اُس کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جاسکتی جس کا ادراک انسانوں کو اشیائے مادّی کے علم کے ذریعے حاصل ہُوا ہو۔ کمالِ تقویٰ عرفانِ ذاتِ باری میں ہے۔ کمالِ عرفان اُس کی حقیقت کے اثبات میں ہے۔ کمالِ حقیقت اس میں ہے کہ پورے خلوص سے اس کی وحدت کو تسلیم کیا جائے اور کمالِ خلوص اس میں ہے کہ اُس کی طرف کوئی صفات منسوب نہ کی جائیں (کمال الخلاص لہٗ نفی الصفات عنہ) جو شخص خدا کی طرف کوئی صفت منسوب کرتا ہے وہ اس صفت کو خدا سمجھتا ہے، اور جو شخص اس طرح کسی صفت کو خدا سمجھتا ہے وہ خدا کو دو یا کسی

اکائی کا ایک حصہ خیال کرتا ہے ۔......... جو شخص یہ پوچھتا ہے کہ خدا کہاں ہے وہ خدا کو ایک چیز تصور کرتا ہے ۔ خدا خالق ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ خود مخلوق ہے، خدا موجود ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ کبھی غیر موجود تھا ۔ وہ ہر چیز کے ساتھ ہے لیکن متشابہت یا اتصال کی وجہ سے نہیں، وہ ہر چیز سے باہر ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ اُس سے جُدا ہے، وہ سببِ اوّل ہے لیکن حرکت یا عمل کے معنوں میں نہیں ۔ وہ بصیر ہے لیکن کسی کی بصارت اُسے دیکھ نہیں سکتی ۔ اُسے مکان، زمان یا عدد و مقدار سے کوئی تعلق نہیں[1] .... خُدا عالمِ کُل ہے کیونکہ علم اُس کی ذات ہے، وہ قادر ہے کیونکہ قدرت اُس کی صفت ہے، وہ مُحبّ ہے کیونکہ محبت اُس کی ذات ہے .... اس لیے نہیں کہ یہ صفات اُس کی ذات سے جُدا ہیں .... زمان و مکان کی قیود کا اُس پر کسی طرح اطلاق نہیں ہو سکتا[2] ۔" متبعینِ سلف تقدیر کی جو تشریح قضاء و قدر کے معنوں میں کرتے تھے اس کا مطلب تھا "جانچنا" "امتحان لینا" "آزمائش کرنا" ۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اعتزال کیا ہے ۔ بہت سے غیر اہم اور ضمنی امور میں اکابرِ معتزلہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن میں یہاں اُن نظریات کا خلاصہ پیش کروں گا جن پر وہ متفق تھے ۔ شہرستانی کہتا ہے، "معتزلہ[3] یہ اعلان کرتے ہیں کہ قِدم وجودِ باری کی امتیازی

---

[1] نہج البلاغہ ۔ اس پر ابن ابی الحدید معتزلی کا حاشیہ دیکھئے ۔

[2] امام جعفر صادق "نہج البلاغہ"

[3] شہرستانی کا قول ہے کہ "معتزلہ اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید کہتے تھے اور کبھی کبھی قدریہ بھی" لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو قدریہ کے لقب سے ملقب نہیں کیا ۔ یہ لقب اُن کے مخالفوں نے اُن انتہا پسند معتزلہ کو دیا جو مسئلۂ تفویض کے قائل تھے، جسے ائمۂ فاطمیہ نے مذموم قرار دیا تھا ۔ معتزلہ خود ہمیشہ قدریہ کے لقب کو رَد کرتے تھے اور اس کا اطلاق حامیانِ قضا و قدر پر کرتے تھے جن کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا ہر انسانی عمل کا خالق ہے ۔ شہرستانی یہ تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے "وقالو الفظ القدریہ یطلق علی من یقول بالقدر خیرہٗ وشرہٗ من اللہ تعالیٰ" لیکن وہ حامیانِ قضا و قدر پر لقبِ قدریہ کے اطلاق کی تردید کرتا ہے "اس کا اطلاق ایسے لوگوں پر کیونکر ہو سکتا ہے جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں" ؟ ۔۔۔ شہرستانی ۔

صفت ہے۔ خدا قدیم ہے، کیونکہ قدم اس کی ذات کا ایک خاص وصف ہے۔ وہ بالاتفاق صفاتِ قدیمہ کے (ذاتِ باری سے جُدا) وجود کے مُنکر ہیں اور یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ وہ اپنی ذات میں عالمِ کُل ہے، اپنی ذات میں حی و قیوم ہے، اپنی ذات میں قادرِ مطلق ہے، اس لیے نہیں کہ علم، حیات اور قدرت اس کی صفاتِ قدیمہ کی حیثیت سے اُس میں موجود ہیں، کیونکہ علم، حیات اور قدرت تو اس کی ذات کے اجزا ہیں۔ اگر بصورتِ دیگر ان صفات کو وجودِ باری کی صفاتِ قدیمہ خیال کیا جائے (یعنی اس کی ذات سے علیحدہ) تو یہ متعدد قدیم وجودوں کو تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا۔ ...... وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ کلام اللہ مخلوق ہے اور مخلوق ہونے کی حیثیت سے الفاظ اور اصوات کی صورت میں ظاہر ہُوا ہے ...... اسی طرح وہ متفقہ طور پر اس سے منکر ہیں کہ ارادہ کرنا، سُننا اور دیکھنا ایسے خیالات ہیں جو فی نفسہم وجودِ باری میں موجود ہیں۔ اگرچہ شانِ وجود اور مابعد الطبیعیاتی حیثیت کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں"...... "وہ بالاتفاق اس سے منکر ہیں کہ خدا کو دارالقرار میں جسمانی آنکھوں سے دیکھا جا سکے گا۔ وہ اس کو ممنوع قرار دیتے ہیں کہ خدا کی توصیف اشیائے مادّی کی کسی صفت سے کی جائے، چاہے وہ جہت ہو یا مقام یا صورت یا جسم یا تغیّر یا اختتامِ عمل یا تحلیل۔ قرآن کی جن عبارتوں میں ایسے کلمات استعمال کیے گئے ہیں جو ان صفات پر محمول کیے جا سکتے ہیں، اُن کی تفسیر وہ یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ یہ کلمات مجازاً استعمال کیے گئے ہیں نہ کہ لغواً۔ اس نظریئے کو وہ توحید کہتے ہیں، یعنی وحدت اللہ کا اقرار ...... وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ انسان اپنے اعمالِ نیک و بد کا فاعلِ خالق ہے (لافعاله خیرها وشرها ان العبد قادر خالق) اور عقبیٰ میں اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا پائے گا اور کسی شرِ اخلاقی، سوءِ عمل، نفیِ عقیدہ یا عدمِ اطاعت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اگر وہ ظلم یعنی گمراہی کو وجود میں لائے تو وہ خود ظالم ثابت ہوتا ہے (لانه لو خلق الظلم کان ظالماً) ...... وہ یہ بھی متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ حکیمِ کل صرف ایسے کام کرتا ہے جن میں صلاح و خیر ہو اور اس لیے از روئے حکمت اپنے بندوں کی بھلائی کا خیال رکھنا خدا پر واجب ہے اگرچہ وہ اس مسئلے پر مختلف الرائے ہیں کہ آیا زیادہ سے زیادہ صلاح و خیر کا وجود میں لانا اور بندوں پر

لطف و کرم کرنا خدا کا فرض ہے۔ اس نظریئے کو وہ نظریۂ عدل کہتے ہیں"۔
اُن کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسانی عمل کے بارے میں کوئی دائمی اور قدیم قانون موجود نہیں اور انسان کی ہدایت کے لیے جو خدائی احکام یعنی اوامر و نواہی ہیں وہ تدریجی ترقی کے ذریعے وجود میں آتے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص نیکی کرتا ہے وہ ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جو شخص بدی کرتا ہے وہ عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اس دعوے کو وہ مطابقِ عقل قرار دیتے ہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال بھی ہے کہ علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور صرف عقل کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ نیکی و بدی کا عرفان اُن کے نزدیک عقل کا کام ہے۔ جب تک عقل ہمیں صواب و خطا کا فرق نہ بتلائے ہم اُن میں تمیز نہیں کر سکتے۔ احکام شریعت کے صادر ہونے سے بھی پہلے عقل ہم پر یہ فرض عائد کر دیتی ہے کہ خدا کے احسانوں کا شکر بجا لائیں۔ خدا کے عرفان کو بھی وہ عقل کے دائرے میں داخل سمجھتے ہیں۔ ذاتِ باری کے سوا ہر چیز کو وہ تغیّر پذیر اور فانی خیال کرتے ہیں۔" اُن کا یہ ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اس مقصد سے بھیجے کہ وہ انسان کو اس کے احکام سمجھائیں............ امامت کے مسئلے پر اُن میں اختلافِ رائے ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وہ تقرر کے ذریعے ایک امام سے دوسرے امام کو ملی۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ جمہور کو اپنا امام انتخاب کرنے کا حق ہے۔" چنانچہ معتزلہ صفاتیہ کی عین ضد ہیں۔" کیونکہ وہ اور تمام دوسرے اہلِ سنّت اس کے قائل ہیں کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے، کیونکہ اپنی قلمرو کا حاکمِ مطلق ہے اور اپنی مرضی کے مطابق حکم دیتا ہے...... اُن کے نزدیک یہ عدل ہے۔ اہل الاعتزال کہتے ہیں کہ جو چیز مطابقِ عقل و حکمت ہو صرف وہ چیز عدل ہوتی ہے اور وہ صرف انسان کے لیے صواب و مصلحت کی حامل ہوتی ہے..... اہل العدل کہتے ہیں کہ خدا نے مخلوق کلام کے ذریعے اوامر و نواہی صادر کیے ہیں۔ اہل السنّت (یعنی صفاتیہ) کہتے ہیں کہ تکالیفِ شرعی کا علم سمع و خبر کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ عقل کی وساطت سے صرف علمِ و نبوی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ عقل ہمیں یہ نہیں بتا سکتی کہ کونسی چیز نیک ہے، کونسی بد اور کون سی واجب۔ (اس کے برعکس) اہل العدل کہتے ہیں کہ تمام علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے[1]۔ احادیث میں تقدیر کا جو لفظ آیا ہے اُس سے وہ مُراد لیتے ہیں امتحان

---

[1] شہرستانی

اور نجات، ادبار و اقبال، بیماری اور تندرستی، موت اور زندگی اور خدا کے دوسرے کام خیر و شر اور حسن و قبح کو وہ انسان کی ذمہ داری اور تقدیر کے دائرے سے خارج قرار دیتے ہیں۔"

ایک مکتب کی حیثیت سے معتزلہ کے جو خیالات تھے اب تک ہم نے انھیں مجموعی طور پر بیان کیا ہے لیکن اس مکتب کے ممتاز حکماء نے بعض انفرادی آراء کا اظہار کیا جو اس کے باوجود کہ وہ اُن کے خاص خاص شاگردوں کے حلقے تک محدود رہیں ملاحظے کی مستحق ہیں۔ مثلاً ابو ہذیل حمدان کا عقیدہ تھا کہ خدا علم کی بدولت عالم ہے لیکن اُس کا علم اس کی ذات ہے، وہ زندگی کی بدولت زندہ ہے لیکن اس کا علم اس کی ذات ہے وہ قدرت کی بدولت قادر ہے لیکن اس کی قدرت اس کی ذات ہے۔ وہ زندگی کی بدولت زندہ ہے لیکن اس کی زندگی اس کی ذات ہے۔ شہرستانی کہتا ہے کہ یہ رائے ابوالہذیل نے بظاہر فلاسفہ سے لیکن درحاصل درسگاہِ مدینہ سے اخذ کی۔ ابوالہذیل نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ آزاد ارادہ یا اختیار (جسے وہ "سلامت" کہتا ہے) ایک عرض ہے جو کمال ترقی اور "صحت" (یعنی صحیح الفطرتی) پر مستزاد ہے۔ ابراہیم ابن سیّار نظّم جس نے فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کیا، یہ رائے رکھتا تھا کہ الہامی کشف کے بغیر بھی انسان غور و فکر کی مدد سے خدا کو پہچان سکتا ہے اور نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے اور نیکوکار میں بدی کرنے کی قوّت ہی نہیں ہوتی۔" معمر ابن عباد السلمی نے افلاطون کا نظریۂ امثال پیش کیا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ عوارض اشیاء کی جس نوع میں ہوتے ہیں اس میں دائمی طور پر موجود رہتے ہیں اور ہر عرض کسی جوہر میں ہوتا ہے لیکن اس کے وجود کا دارو مدار اس پر ہوتا ہے کہ ذہنِ انسانی میں اس کا خیال ہو۔ معمر اور اُس کے تابعین کو اس بنا پر اصحاب المعانی (Idealists) کا نام دیا گیا۔ ابوعلی محمد ابن عبدالوہاب عرف ابوعلی الجبّائی کا یہ خیال تھا کہ عمل کا تعلق انسان سے یوں ہے کہ انسان اُس کا موجد و مبداء ہوتا ہے چنانچہ وہ اخلاقی خیر و شر اور اطاعت و نافرمانی کو انسان کا ایک خصوصی حق سمجھتا ہے۔ اختیار کو (جسے وہ استقامت کے نام سے موسوم کرتا ہے) وہ عمل کی ایک شرطِ پیشیں تصوّر کرتا ہے اور ایسے ایک ایسی قوّت کہتا ہے جو جسمانی صحت اور سلامتیٔ اعضاء پر مستزاد ہے۔ امام الحرمین ابوالمعالی الجُوینی اگرچہ اپنے آپ کو معتزلی نہیں کہتے تھے بلکہ معتزلہ کے مخالفوں نے اُنھیں اپنے زمرے میں

شمار کیا ہے، پھر بھی اُن کا قول تھا کہ انسان کو استقامت اور اختیار سے خالی قرار دینا عقل و شعور کے منافی ہے اور یہ کہنا کہ انسان میں قابلیت تو ہے لیکن کسی قسم کی مؤثریت نہیں قابلیت کے کُلی انکار کے مترادف ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ کوئی ناقابلِ فہم اثر عملِ انسانی کا سببِ محرک بنتا ہے یہ کہنے کے برابر ہے کہ انسان پر کوئی خاص اثر کارفرما ہی نہیں ہوتا۔ چونکہ شرائط و حالات اُن لوگوں کے اصول کے مطابق جو اُن کا دعویٰ کرتے ہیں موجود یا غیر موجود نہیں کہے جا سکتے بلکہ اپنی اصل کے حوالے سے تشریح کے محتاج ہوتے ہیں، اس لیے انسان کا عمل (ایک حالتِ موجودہ کی حیثیت سے) فی الحقیقت اس کی قابلیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ بجا ہے کہ اُس کی قابلیت اُن کا مبداء و خالق نہیں ہوتی کیونکہ تخلیق کے معنی ہیں قدرتِ مطلقہ کے ذریعے کسی ایسی چیز کو وجود میں لانا جو پہلے موجود نہ تھی۔ عمل کے وجود کا دارو مدار انسان کی قابلیتِ عمل پر ہے اور یہ قابلیت خود کسی اور سبب پر منحصر ہوتی ہے جس کے ساتھ اُس کا وہی تعلق ہوتا ہے جو انسان کے عمل کا تعلق انسان کی قابلیت کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ اس طرح ہر سبب کا دار و مدار کسی دوسرے سبب پر ہوتا ہے تا آں کہ یہ سلسلہ مسبب الاسباب پر جا کر ختم ہوتا ہے، یعنی اسباب اور اُن کی مؤثریت کے خالق پر جو مطلقاً قائم بالذات اور مکتفی بالذات ہے۔ شہرستانی کہتا ہے کہ "ابو المعالی نے یہ رائے موحدین (The Theistic School) کے مکتب سے مستعار لی لیکن اُسے کلام کا جامہ پہنا دیا۔"[1]

یہ ہے ایک اجمالی خاکہ معتزلہ کے خیالات کا چند ایسے معرکۃ الآراء مسائل پر جنھوں نے ہر زمانے اور ہر ملک میں ذہنِ انسانی کو مخمصے میں ڈالا ہے اور کیا مشرق اور کیا مغرب دونوں میں بسا اوقات خونریز ہنگامے برپا کیے ہیں۔

چونکہ وہ خدا کی وحدت کے ایسے طور پر مدعی تھے کہ اُس میں انسان سے شباہت کا

---

[1] جوینی کے خیالات کا مقابلہ ابن رُشد کے خیالات سے کیجیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہرستانی ائمۂ فاطمی کے خیالات سے واقف نہ تھا۔ ابو المعالی کے خیالات اُس جیسے صحیح العقیدہ شخص کو پسند نہ آ سکتے تھے۔

شائبہ تک نہ تھا اور چونکہ وہ انسان کی اخلاقی ذمہ داری کے بھی حامی تھے اس لیے انھوں نے قدرتی طور پر اپنے آپ کو اصحاب العدل والتوحید کہا اور اپنے مخالفین کو مُشبّہہ یعنی تشبیہیوں کا لقب دیا۔ ان کا طریق استدلال حسب ذیل تھا: ۔اگر معصیت کا مبداء یا خالق خدا ہے اور انسان کا اس میں مبتلا ہونا مقدّر ہے تو اُسے اس کے لیے مستوجب سزا قرار دینا خدا کو غیر منصف گردانتا ہے، اور یہ کُفر ہے۔ لہٰذا عقل اور وحیِ الٰہی دونوں ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ تقویٰ اور گناہگاری، نیکی اور بدی، خیر و شر انسانی ارادے کی پیداوار ہیں: اگرچہ انسان کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ کونسی چیز صحیح ہے اور کونسی چیز غلط، پھر بھی وہ اپنے اعمال پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔ خطا و سزا کا دارو مدار عدل پر ہے، کیونکہ خدا کی کائنات عدل کے زیرِ فرمان ہے۔ عقل اور عدل انسانی اعمال کے اصولِ رہنما ہیں، منفعتِ عمومی اور جمہورِ نوعِ بشر کی راحت و سعادت کا پروان چڑھانا خطا و صواب کے سب سے بڑے معیار ہیں۔ کیا خدا نے خود نہیں کہا: "دونوں راستے انسان کی بھلائی کی خاطر اُسے دکھا دیئے گئے ہیں۔ کیا خود اس نے انسان کو اپنی عقل سے کام لینے کی تلقین نہیں کی؟" وہ چونکہ عقلیت پسند اور افادیت پسند تھے اس لیے انھوں نے قانونِ اخلاقی کی بنیاد عقل اور آیاتِ الٰہی کی باہمی مطابقت پر رکھی۔ وہ معلّمِ اسلام اور آپ کے ابتدائی جانشینوں کے نقشِ قدم پر چلے۔ ہر ایسے قانون کو جو انسانوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرتا ہے ترقی اور نشوونما کے ایک مسلسل عمل کا نتیجہ کہہ کر انھوں نے مسئلہ ارتقاء کی حمایت کی۔ انسان کے ایک طویل مدّت سے کرۂ ارض پر موجود ہونے کے بارے میں[1] اُن کے جو خیالات تھے ان کے اعتبار سے وہ دنیائے جدید کے طبیعی فلاسفہ کے مقابلے میں ایک مقامِ تفوق رکھتے ہیں۔

معتزلی مذہب اسلامی سلطنت کے ہر گوشے کے صاحبِ فکر و فرہنگ طبقوں میں بڑی سرعت سے پھیلا اور ہسپانیہ میں داخل ہو کر اس نے اندلسی دارالعلوم اور درسگاہوں پر قبضہ جما لیا۔ منصور اور اس کے ابتدائی جانشینوں نے عقلیت کی حوصلہ افزائی کی لیکن علانیہ

---

[1] انھوں نے یہ خیالات ایک حدیث سے اخذ کئے جو حضرت علیؓ سے "بحارالانوار" (بابِ تکوین) میں مروی ہے۔

طور پر معتزلی عقائد کا اقرار نہ کیا۔ مامون نے جو تمام ایشیائی حکمرانوں سے بڑھ کر "اعظم" کے لقب کا مستحق ہے، مکتبِ معتزلہ سے وابستگی کا اعتراف کیا۔ اس نے اور اس کے بھائی معتصم اور بھتیجے واثق نے ساری دنیائے اسلام میں عقلیت کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کے ادوارِ حکومت میں عقلیت کو ایک ایسا غلبہ حاصل ہوا جیسا غالباً اُسے زمانۂ حاضرہ کے یورپی ملکوں میں بھی نصیب نہیں۔ علمائے معقولات مسجدوں میں خطبے اور مدرسوں میں درس دیتے تھے، ملت کے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل اُن کے ہاتھوں میں تھی، خلیفوں کے مشیروں میں وہ ایک اونچے مقام کے مالک تھے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے اثر و نفوذ کا استعمال دانشمندی سے کیا۔ انھوں نے پروفیسروں، خطیبوں، سائنسدانوں، طبیبوں، وزیروں اور صوبائی حاکموں کی حیثیت سے اُمتِ مسلمہ کی نشو و نما کو فروغ دیا۔ جب مذہبِ معتزلہ کی شان و شوکت ایشیا میں ختم ہو گئی تو مغربی افریقہ میں بنی ادریس کے عروج اور دولتِ فاطمیہ کے قیام نے اُسے ایک نئی زندگی بخشی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خود پیغمبرِ اسلامؐ اور حکمائے بیت النبیؐ نے مسئلۂ تقدیر کو قبول نہ کیا اور عقل کو اندھی تقلید کا غلام بنانے کو ناپسند فرمایا تو یہ عقائد اسلامی دنیا کے فکر و عمل پر بالآخر کیونکر مسلط ہو گئے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر آیئے ہم مسلمانوں کی ذہنی سرگرمیوں کے ایک اور پہلو کی نشو و نما کا سراغ لگائیں۔ مذہبِ معتزلہ کو، بظاہر بڑی حد تک معقول طور پر، یورپ کی قرونِ متوسط کے فلسفۂ مدرسیہ[1] سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مدرسیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "وہ ایک ذہنی تحریک تھی جس کا مقصد عیسائیت کے مسائلِ ایمانیہ کا جواز عقل کی مدد سے پیش کرنا تھا۔" معتزلہ مذہب نے بھی عقل اور مثبت الہام میں مطابقت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نقطے پر پہنچ کر اعتزال اور مدرسیت کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے۔ عیسوی کلیسا میں جو ایمانیات تشریح اور جواز کے محتاج تھے اُن کی تعداد بہت بڑی تھی تثلیث کے اندر وحدت، "تین" "فطرتوں" کا ایک فطرت میں جمع ہونا۔ جبلّی معصیت، استحالۂ عشائی، ان

---

[1] Scholastic Philosophy

سب مسائل نے بہت سی ذہنی کش مکش پیدا کی۔ لہٰذا اس سے پیشتر کہ سائنس اور فکرِ آزاد کو عیسائیت میں داخلہ ملتا کلیسا کے ایمانیات کو مدرسیت کی قسم کے کیمیائی عمل کی ضرورت تھی۔ اسلام کا معاملہ جُدا تھا۔ مسئلۂ توحید کے سوا، جو دینِ اسلام کا اصل الاصول تھا، کسی مسئلۂ ایمانی پر کسی ایسی صورت میں اصرار نہ کیا گیا تھا کہ عقل اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی۔ مبداء و معاد (یعنی خدا سے آنا اور خدا کے پاس لوٹ جانا) اور انسانی اختیار کا مسئلہ ایک سببِ اوّل یعنی مبداءِ جملہ موجودات کے تصورات پر مبنی تھا۔ دانشمند اور جاہل دونوں کسی نہ کسی صورت میں یہ مانتے چلے آئے ہیں کہ انا Ego اپنے پیراہنِ جسمانی سے جُدا ہونے کے بعد بالکل نیست و نابود نہ ہو جائے گی بلکہ جسم کی تحلیل کے بعد ایک خود آشنا ہستی کی حیثیت سے قائم رہے گی۔ بعض لوگوں نے ایک آئندہ زندگی کا انکار کیا ہے لیکن بیشتر لوگوں نے اسے قبول کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس آئندہ زندگی کی نوعیت کے بارے میں اُن کے خیالات مختلف ہیں۔ اسی طرح جہاں تک انسانی ذمہ داری کا تعلق ہے، اس بارے میں بہت سا اختلافِ آراء ہے کہ انسان اپنے اخلاقی فرائض سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے لیکن اس موضوع پر سب متفق ہیں کہ وہ اپنی قوتوں کے صحیح یا غلط استعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ ان دونوں مسائل پر معلّمِ اسلام کے ارشادات آزادئ رائے کی بہت سی گنجائش چھوڑتے ہیں۔ اصلی تصورات کے قائم رکھنے اور قبول کرنے کی حدود کے اندر دینِ اسلام وسیع المشربانہ سے وسیع المشربانہ اور عقلیت پسندانہ سے عقلیت پسندانہ خیالات کی اجازت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ایسے عبوری مرحلے سے گزرنے کے بغیر جس کی ضرورت عیسائیت کو پیش آئی دورِ قبول سے نکل کر دورِ عمل اور دورِ ایمان سے نکل کر دورِ عقل میں داخل ہو گیا۔

یہ درست ہے کہ دورِ رسالت میں اور اسی طرح خلافتِ راشدہ کے دور میں قدرتی طور پر غالباً بجا طور پر، بلا روک ٹوک استفسار کی بہت افزائی نہ کی گئی۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اربابِ اقتدار کے خوف نے سوالات یا شبہات کی زبان بندی کر دی ہو۔ اگر مدرس کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوتا تو وہ کمالِ انکسار کے ساتھ اپنی معذوری کا اقبال کرتا۔[1]

---

[1] عموماً جواب یہ ہوتا تھا:۔ "واللہ اعلم بالصواب"

مذہب اعتزال کو اس لیے ذہنِ انسانی کی ترقی میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ وہ یورپ کی مدرسیت سے ملتا جلتا ہے لیکن درحقیقت طبعاً دورِ حاضر کی عقلیت سے قریب کا رشتہ رکھتا ہے۔ مدرسیت نے کلیسا کے زیرِ سایہ کام کیا۔ اعتزال دینِ اسلام کے پیشواؤں کا شریک کار رہا۔ اسلام کی مدرسیت نے بعد میں ظہور کیا۔

علومِ طبیعیہ کی نشو و نما نے مسلمانوں کی فطری طبّاعی کو ایک نئی جہت بخشی۔ مفکرّین کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا ہو گئی۔ انھیں حکماء کا لقب دیا گیا (لفظِ حکیم سائنسدان اور فلسفی دونوں کو محیط ہے) ان لوگوں کا طریقِ استدلال آج کل کی سائنس کے طریقِ استدلال کے مماثل تھا، ان میں سے اکثر معتزلی تھے لیکن بعضوں کے خیالات پر ارسطو اور اسکندریہ کی افلاطونیتِ جدیدہ کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اگرچہ تعصب اور جہالت نے انھیں کافر ملحد اور زندیق کے ملامت آمیز لقب دے کر مطعون کیا لیکن تاریخی صداقت شعاری کو یہ تسلیم کرتے ہی بن آتی ہے کہ ان لوگوں نے کبھی اپنے آپ کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا۔ نہ انھوں نے کبھی کوئی ایسا نظریہ پیش کیا جس کی سند انھیں بانیٔ اسلام یا آپ کے ابتدائی جانشینوں کے اقوال میں نہ ملی۔

ارتقاء اور تدریجی نشو و نما کے جس نظریے پر یہ فلاسفہ ثابت قدمی سے جمے رہے وہ اُن کے ایک ممتاز نمائندے الہیثم نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اُس کے جو "فلسفیانہ خیالات" ہیں اُن کا اجمال یہ ہے: "مادّی موجودات کی اقلیم میں سب سے نیچے جمادات ہیں ان کے اوپر نباتات اُن کے اُوپر حیوانات اور سب سے اُوپر انسان جسمانی لحاظ سے وہ مادّی دنیا کا باشندہ ہے لیکن اپنی روح کی بدولت وہ غیر مادّی یا رُوحانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس سے اُوپر خالصتاً رُوحانی ہستیاں ہیں یعنی ملائکہ[1]۔ اُن کے اُوپر صرف خدا ہے۔ اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کے ایک سلسلے نے اسفل کو اعلیٰ سے مربوط کر رکھا ہے لیکن انسانی

---

[1] مصنف "گوہرِ مراد" (جس سے میں آگے چل کر تفصیلی بحث کروں گا) کہتا ہے کہ جنھیں الٰہیات کی زبان میں ملائکہ کہا جاتا ہے حکمت کی زبان میں وہ قوائے فطرت ہیں۔

رُوح دائماً مادے کی زنجیریں اُتار پھینکنے کی کوشش کرتی ہے اور آزاد ہو کر وہ خدا کی طرف پرواز کر جاتی ہے جس سے وہ ابتداءً آئی تھی۔" بعد میں یہی خیالات مولانا رُوم نے جن کی صحتِ عقیدہ پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا، اپنی مثنوی میں بیان کیے ہیں:۔

از جمادی مُردم و نامی شُدم — وز نما مُردم بحیواں سر زدم
مُردم از حیوانی و آدم شُدم — پس چہ ترسم کی زمُردم کم شوم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک بال و پر
بارِ دیگر از ملک پراں شوم — آنچہ اندر وہم نائد آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم کانا الیہ راجعون

بزرگ ترین فلاسفہ کندی، فارابی، ابن سینا، ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رُشد تھے۔[1]

کندی (ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق) جسے حکیم الحکماء کا لقب دیا گیا ہے، کندہ کے مشہور خاندان سے تھا اور اُس کے آباؤ اجداد میں عرب کے متعدد بادشاہ تھے اس کا باپ، اسحٰق بن الصّباح، مہدی، ہادی اور ہارون کے ادوارِ حکومت میں کوفہ کا حاکم تھا۔ کندی نے بصرہ اور بغداد میں تعلیم پائی اور مامون و معتصم کے زمانوں میں اپنی ہمہ دانی اور تعمقِ علمی کی بدولت شہرت پائی۔ اُس نے فلسفہ، ریاضیات، ہیئت، طب، سیاست، موسیقی اور دوسرے مضامین پر کتابیں لکھیں۔ وہ چونکہ یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی زبانیں اچھی طرح جانتا تھا اور ان کے علوم و فلسفہ پر عبور رکھتا تھا، مامون نے اُسے ارسطو کی

---

[1] شہرستانی اور بہت سے فلاسفہ کے نام گنواتا ہے: مثلاً یحییٰ نحوی، ابو الفرج مفسّر، ابو سلیمان سنجری ابوبکر ثابت بن قرہ، ابو سلیمان محمد مقدسی، ابو تمام یوسف بن نیشاپوری، ابو زید احمد بن سہل البلخی، ابو محارب الحسن بن سہل بن محارب القمی (Al-kumi)، احمد بن طیب سرخسی، طلحہ بن محمد نفسی، ابو حامد احمد بن محمد الاسفزاری، عیسیٰ بن علی الوزیر، ابو علی احمد بن مسکویہ، ابو زکریا یحییٰ بن عدی۔ غالباً ابو زکریا یحییٰ بن عدی التکریتی المنطقی۔ مترجم۔ ابو الحسن عامری۔ وہ کسی اندلسی فلسفی کا نام نہیں لیتا۔

دوسرے یونانی مصنفین کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور کیا۔ منک (Munk) کے قول کے مطابق "کاردان (Cardan) اُسے چوٹی کے اُن بارہ اربابِ فطانت میں شمار کرتا ہے جو سولہویں صدی عیسوی تک دنیا میں آئے۔"

ابو نصر فارابی (ابو نصر محمد بن محمد ترخان الفارابی) جو ماوراء النہر کے شہر فاراب میں پیدا ہوا، ایک سربرآوردہ طبیب، طبیعیات داں، ماہرِ ریاضیات اور فلسفی تھا۔ وہ ارسطو کے شارحین میں سب سے صاحبِ فضیلت اور دقیقہ سنج شمار کیا جاتا ہے۔ اُسے حکمرانِ حلب سیف الدولہ علی بن حمدان کی سرپرستی حاصل تھی۔ اُس نے دمشق میں ماہِ رجب ٣٣٩ھ (مطابق دسمبر ٩٥٠ء) میں وفات پائی۔ ہم اس کی متعدد تصنیفات میں سے چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ یہ ظاہر کریں کہ اس زمانۂ کثیر التصنیفی میں ذہنِ عربی کا رجحان کیا تھا۔ وہ اپنی انسائیکلوپیڈیا "احصاء العلوم" میں متداول سائنسوں پر ایک عمومی تبصرہ کرتا ہے۔ اس تصنیف کے ایک لاطینی خلاصے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ اُس کے پانچ حصے ہیں جن میں علم کے مختلف شعبوں سے بحث کی گئی ہے یعنی زبان، منطق، ریاضیات، طبیعی سائنس اور سیاسی و معاشرتی اقتصاد۔ فارابی کی ایک اور تصنیف ارسطو کی ارگنن Qrganon کی شرح تھی جس سے روجر بیکن (Roger Bacon) اور البرٹس میگنس (Albertus Magnus) نے بہت سا استفادہ کیا۔ اُس کا رسالہ "الجمع بین رأی الحکیمین افلاطون الالٰہی و ارسطوطالیس" اخلاقیات پر اس کی کتاب "السیرۃ الفاضلہ" سیاسیات پر اس کی "السیاست المدنیہ" جو ایک ضخیم تر اور جامع تر کتاب "مبادی الموجودات" کا ایک حصہ ہے۔ یہ سب کتابیں اس کے دماغ کی ہمہ گیری کی شاہد ہیں۔ فلسفے اور طب کے علاوہ فارابی نے موسیقی کا بھی مطالعہ کیا اور اسے منضبط علم کی حیثیت بخشی۔ اس نے موسیقی کے نظریہ اور فن دونوں پر اور ساتھ ہی ساتھ آلاتِ موسیقی کے بنانے پر بہت سے رسالے لکھے۔ ان میں سے ایک رسالے میں اُس نے قدما کے نظامہائے موسیقی کا موازنہ اپنے وقت کے نظامِ موسیقی سے کیا۔ ابو القاسم، جو کوئی کم پایہ اہل الرائے نہ تھا، فارابی کو ابنِ سینا کا ہمسر

کہتا ہے[1]

ابن سینا کا ایک طبیب کی حیثیت سے میں پہلے ہی تذکرہ کر چکا ہوں۔ ایک فلسفی کی حیثیت سے اس کا مرتبہ کسی طرح ارسطو کے مرتبے سے کم نہیں۔ وہ لاریب اپنے زمانے کا استادِ اجل تھا اور اس تعصب و خود غرضی نے اُس کے خلاف جو ہنگامہ برپا کیا اُس کے باوجود وہ بعد میں آنے والے زمانوں کے افکار پر اپنے غیر فانی نقوش چھوڑ گیا۔ اس کی ضخیم اور کثیر التعداد کتابیں اس کے دماغ کی جامعیت کا ثبوت ہیں[2]۔ اُس نے ارسطو کے فلسفے کو ایک نظام کی صورت میں مرتب کیا اور ارسطو کی نامکمل نفسیات میں خدا اور انسان کے درمیان جو خلا تھا اُسے عقولِ افلاک کے نظریے سے، جسے اس نے سائنسی قاعدے کے مطابق وضع کیا، پُر کر دیا۔ فلاسفۂ عربی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو وحدتِ کائنات کا ایک ایسا نظریہ عطا کریں جو نہ صرف ذہن کی بلکہ شعورِ دینی کی بھی تسکین کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے سائنس کے اخلاقی و رُوحانی پہلو کو اس کے فلسفیانہ پہلو سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش کا نتیجہ تھا اُن کا نظریۂ عقلین — یعنی ایک تو عقلِ منفعل (یا نفسِ مجرّدہ) جو صُورِ مادّی سے مس رکھتی ہے اور اس مس کی بدولت تغیر پذیر اور فنا پذیر ہے اور دوسری عقلِ فعال، جس کا تعلق تغیر ناپذیر چیزوں سے ہے اور اس لیے خود بھی متغیر نہیں ہوتی۔ قلب و رُوح کی جانکشانہ ریاضت سے انسان عقلِ اعلیٰ کا وصال حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ ریاضت صرف ذہنی ہی نہیں بلکہ روحانی و اخلاقی بھی ہونی چاہیے۔ ابن سینا بدرجۂ اتم ان خیالات کا نمائندہ تھا۔ وہ اپنے زمانے کے فلسفیانہ ولولوں کا صادق ترین اور مخلص ترین ترجمان تھا۔ اخلاقی سنجیدگی

---

[1] ملاحظہ کیجئے اُس کی "عیون المسائل" (ویت ری جی کا ایڈیشن، صفحہ ۵۲)، جہاں وہ استخراجی دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ تکوین ایک عقلِ کاملہ کا کام ہے اور اس کائنات میں کوئی چیز اتفاقی یا بے مقصد نہیں۔

[2] فلسفے اور سائنس پر اس کی جو دو سب سے بڑی تصانیف ہیں، یعنی "شفا" اور "نجات" وہ اب تک صحیح و سالم موجود ہیں۔

کے معاملے میں ابن سینا کی تعلیمات سے زیادہ رُعب انگیز تحریر مشکل ہی سے دستیاب ہو گی۔ اس کی تمام تصنیفات کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے اس پر نہایت منطقیانہ طریقے سے بحث و استدلال کرتا ہے۔ اُس کی تمام کوششوں کا سب سے بڑا مقصد اس نظریے کو ثابت کرنا تھا کہ رُوحِ انسانی اور سببِ اوّل مطلق کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہے۔ یہی نظریہ جلال الدین رُومی کے ہر شعر سے مترشح ہوتا ہے۔

ابن سینا نے اپنی مختلف تصنیفات میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے شہرستانی نے ان کا ایک اجمالی لیکن جامع خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ بیان کرنے کے بعد کہ ابن سینا نے مختلف علوم منطق اور متجانس مضامین سے کیونکر بحث کی ہے شہرستانی کہتا ہے کہ ابن سینا نے اپنے مابعد الطبیعیاتی نظام کو دس مقالوں میں پیش کیا۔ پہلے پانچ مقالوں کے مباحث میں علم کی اصل تجربہ استقرا اور استخراج، مادّہ اور قوّت، علّت و معلول کا باہمی تعلق، مبادیات و حادثات، کلّیات اور جزئیات۔ چھٹے اور ساتویں مقالے میں وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سببِ اوّل، یعنی وہ ہستی جس کا وجود اُس کی ذات کے سبب سے واجب ہے، واحد اور مطلق ہے۔ آٹھویں اور نویں مقالے کے موضوع ہیں کائنات کی وحدت اور انسانی رُوح کا تعلق سببِ اوّل سے اور عقلِ فعّال سے جو سب سے پہلے خلق کی گئی۔ آخری مقالے میں وہ آئندہ زندگی یعنی معاد کے مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ وہ انسانی رُوح کی انفرادی دائمیت کا اعلان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جسم مادّی سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھے گی لیکن زندگی معاد میں جو خوشی ہوگی یا غم ہوگا اُس کی نوعیت رُوحانی ہو گی اور اس کا دار و مدار اس پر ہو گا کہ انسان نے کمال حاصل کرنے کی دماغی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کا صحیح یا غلط استعمال کیا ہے۔ آخری موضوع کے ضمن میں وہ اس امر پر استدلال کرتا ہے کہ نوعِ انسانی کو نبوّت کی حاجت ہے۔ نبی انسانوں کو قوانینِ الٰہی سمجھاتا ہے اور ایسی مثیلوں اور قصّوں کی مدد سے جو عوام الناس کی سمجھ میں آ سکتے ہیں اور جو اُن کے دل کو لگتے ہیں خدا کے اخلاقی احکام کو ان پر واضح کرتا ہے۔ نبی لوگوں کو رشک و حسد بغض و کدورت اور افعالِ شنیعہ سے باز رکھتا ہے اور معاشرتی اور اخلاقی نشو و نما کی بنیادیں ڈالتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ وہ صحیح معنوں میں رُوئے زمین پر خدا کا پیامبر ہوتا ہے۔

ابوبکر محمد ابن یحییٰ ابن الصائغ، جو عام طور پر ابن باجہ کے نام سے مشہور ہے (جسے یورپی شارحین نے بگاڑ کر ابن پاچے Aven Pacee بنا دیا) اعرابِ اندلس کے نامور ترین فلاسفہ میں شمار ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف طبیعیات، ریاضیات اور ہندسہ میں ممتاز تھا بلکہ صفِ اول کا ماہرِ موسیقی بھی تھا۔ وہ گیارھویں صدی عیسوی کے لگ بھگ سرقسطہ میں پیدا ہوا۔ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ء میں وہ اشبیلیہ میں مقیم تھا۔ بعد میں وہ افریقہ چلا گیا، جہاں وہ مرابطین کے دربار میں کسی اونچے عہدے پر فائز ہوا۔ اس کی رحلت فاس میں ۱۱۳۸ء میں ہوئی۔ اس کی بہت سی تصنیفات بالکل صحیح و سالم ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دماغی کارروائیوں کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔

ابن طفیل (ابوبکر محمد ابن عبدالملک ابن طفیل القیسی) بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں وادی آش میں پیدا ہوا، جو غرناطہ کے صوبے کا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ وہ ایک طبیب، ریاضیات دان، فلسفی اور شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا اور الموحد خاندان کے پہلے دو حکمرانوں کے دربار میں ایک معزز عہدے پر مامور تھا۔

اس نے ۱۱۸۵ء میں مراکش میں وفات پائی۔ وہ فلسفۂ عربیہ کے استغراقی مکتب سے تعلق رکھتا ہے جسے اشراقیہ کہتے ہیں اور جو افلاطونیتِ جدیدہ کی ایک شاخ اور ذوق و شوق کے اعتبار سے متأخرین کے تصوف سے مشابہ ہے لیکن اس کا فلسفہ صوفیانہ وجد پر مبنی نہیں بلکہ ایک ایسے طریقے پر مبنی ہے جس میں وجدان اور استدلال کو یکجا کیا گیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب "حیّ بن یقظان" میں اس نے ایک قصّے کی صورت میں انسانی عقل و فہم کی تدریجی نشو و نما کو بیان کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ایک انسان میں کس طرح دوسروں کی تعلیم و تربیت کے بغیر ادراک کی قوّت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے[۱]۔

ابن رُشد[۲] (ابوالولید محمد ابن احمد) ۵۲۰ھ (مطابق ۱۱۲۶ء) میں قرطبہ میں پیدا ہوا، جہاں اُس

۱؎ ضمیمۂ سوم ملاحظہ کیجیے۔
۲؎ Averroes

کا خاندان مدتوں سے ممتاز چلا آرہا تھا۔ اُس کا دادا مُرابطین کے عہد میں سارے اُندلس کا قاضی القضاۃ تھا۔ ابن رُشد اصولِ فقہ کا چوٹی کا عالم تھا لیکن اُس نے زیادہ تر ریاضیات، طب اور فلسفے پر توجہ مبذول کی۔ اُسے ابن طفیل کی وساطت سے ابویعقوب یوسف کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی جہاں اُس کی بہت سی قدردانی کی گئی۔ ۱۱۶۹ء۔۷۰ میں وہ اشبیلیہ کا اور ۱۱۸۲ء میں قرطبہ کا قاضی مقرر ہُوا جب یعقوب المنصور مُوحّدوں کے تخت پر بیٹھا تو چند سالوں تک ابن رُشد کی بہت قدر و منزلت ہوتی رہی، لیکن اُس کے بعد جب بربروں کے تعصب کا رُکا ہُوا سیلاب پھُوٹ پڑا تو فقیہوں اور مُلّاؤں کا عتاب سب سے پہلے اُس پر نازل ہُوا، کیونکہ ایک تو وہ اس کی فلسفیانہ تصانیف کی بناء پر اُس سے ناراض تھے اور دوسرے اس کی قابلیت و فضیلت کے باعث اس سے حسد کرتے تھے۔ ابن رُشد کا شمار عرب دنیا کے جلیل ترین علماء و فلاسفہ میں ہوتا ہے اور مُنک (Munk) اُسے ارسطو کے سب سے عمیق النظر شارحین کے زُمرے میں شامل کرتا ہے۔ ابن رُشد کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کی بلند ترین مساعی کا مقصد کمال، یعنی عقلِ فعّالِ کُل کا وصال حاصل کرنا ہونا چاہیئے اور یہ کمال صرف اس طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان مطالعہ اور فکر و تامّل میں مستغرق رہے اور تمام ایسی خواہشات کو ترک کر دے جو اس کی رُوح کی سفلی قوتوں سے اور بالخصوص حواس سے تعلق رکھتی ہیں لیکن محض یہ مقصد فکر و تامّل کافی نہیں۔ اس کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ الہامِ نبوی کا وجود ضروری ہے تاکہ جن دائمی حقائق کا اعلان دین اور فلسفہ دونوں نے کیا ہے اُن کی اشاعت دنیا میں کی جاسکے۔ دین خود اس کی تلقین کرتا ہے کہ علم کے ذریعے اُن حقائق کا تجسس کیا جائے۔ دین اُن حقائق کی تعلیم عام فہم زبان میں دیتا ہے۔ صرف فلسفہ تشریح و تعبیر کے ذریعے دین کی تعلیمات کے حقیقی معنی کو بے نقاب کرسکتا ہے۔ عوام النّاس صرف اُن کے لغوی اور ظاہری معانی کو سمجھ سکتے ہیں۔ جہاں تک مسئلہ تقدیر کا تعلق ہے اُس کا خیال تھا کہ انسان نہ تو اپنے اعمال کا کُلّی طور پر مختار ہے اور نہ غیر متغیر اور اٹل احکام کا حلقہ بگوش لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ سچائی وسط میں ہوتی ہے (الامر بین الامرین)۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو ائمہ فاطمیہ نے استعمال کئے اور جن کی تصریح انھوں نے اسی طریقے پر کی۔ اُس کے نزدیک ہمارے اعمال کسی حد تک ہمارے

ارادے پر دارومدار رکھتے ہیں اور کسی حد تک خارجی اسباب پر۔ ہمیں اس کا اختیار ہے کہ ایک خاص طریقے سے عمل کرنے کی خواہش کریں اور اسی طریقے سے عمل کریں لیکن خارجی اسباب ہمارے ارادے پر حدود و قیود عائد کر دیتے ہیں۔ یہ اسباب عام قوانینِ فطری کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا تقدم و تاخر صرف اللہ کو معلوم ہے۔ اسی کو دینیات کی اصطلاح میں قضا و قدر کہتے ہیں۔ ابنِ رُشد کے سیاسی نظریے ہر طرح کے انسانی جبر و استبداد کی مخالفت پر مبنی تھے۔ اس کی رائے میں خلافتِ راشدہ ایک مثالی حکومت اور افلاطون کے خواب کی تعبیر تھی۔ امیر معاویہ نے اُموی ملوکیت قائم کر کے اس خواب کو پریشان کر دیا اور اُمتِ مسلمہ کو ہر قسم کی آفات کا آماجگاہ بنا دیا۔ ابنِ رُشد عورتوں کو ہر اعتبار سے مردوں کا ہمسر تصور کرتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ جنگ، فلسفہ، علم غرض ہر قسم کی کارروائی میں وہ مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس ضمن میں وہ عرب، افریقہ اور یونان کی جنگجو عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے۔ بالخصوص موسیقی میں اُن کے تفوق کا ذکر کر کے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ اگر عورتوں کو وہی حیثیت اور تعلیم و تربیت دی جائے جو مردوں کو حاصل ہوتی ہے تو وہ تمام علوم و فنون میں اپنے شوہروں اور رہنمائیوں کی برابری کر سکیں گی۔ اُن کی پسماندگی کو وہ اُن کے محدود دائرۂ زندگی کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ابنِ رُشد کی تصنیفات میں فلسفۂ عرب اپنی معراج کو پہنچ گیا۔ اُس کے اور پیغمبرِ اسلامؐ کے درمیان چھ صدیوں کا فاصلہ تھا۔ ان چھ صدیوں کے دوران عربوں کے ذہن نے ہر جہت میں ترقی کی تھی۔ ابنِ سینا اور ابنِ رُشد جیسے لوگوں نے صدیوں کے جمع شدہ گنجینۂ علم و دانش کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اُن تمام مہماتِ مسائل پر غور و فکر کیا جو زمانۂ حاضرہ میں انسانی توجّہ کا مرکز ہیں اور منطقی صحت و صراحت کے ساتھ اپنے خیالات پیش کیے جو آج کل کے روشن دماغ سے روشن دماغ سائنس دانوں کے خیالات سے بہت تھوڑا اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ سب مفکّرین اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور اُس زمانے کے بہترین نفوس اُنھیں مسلمان تسلیم کرتے تھے۔ ابنِ سینا پر متعصب لوگوں نے یا حاسد دشمنوں نے کُفر کے جو فتوے صادر کیے اُس نے غصّے اور حقارت کے ساتھ اُن کی تردید کی چنانچہ اسلام کے سب سے بڑے صوفی شعرا میں سے ایک یعنی سنائی نے جس کی صحیح العقیدگی اس کے ذاتی دشمنوں کی

نگاہوں میں تو مشکوک تھی لیکن اور کسی کی نگاہوں میں مشکوک نہیں، "بوعلی سینا" کو ایک مشہور قصیدے میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے[1]

ابن رُشد نے دین اور فلسفہ کی باہمی مطابقت کے موضوع پر قلم اُٹھایا۔ اُس کے عزیز دوستوں میں سے ایک یعنی عبدالکبیر، جو ایک انتہائی متدین شخص تھا، کہتا ہے کہ اس کے دل میں دین و فلسفہ کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی زبردست خواہش تھی[2]۔ انصاری اور عبدالولید دونوں کہتے ہیں کہ ابن رُشد اسلام کا والہ و شیدا تھا۔ اس کا جدید ترین سیرت نگار لکھتا ہے "ہمیں کوئی چیز یہ تسلیم کرنے سے مانع نہیں کہ ابن رُشد خلوصِ دل سے اسلام کا معتقد تھا، خاص کر جب ہم اس امر پر غور کریں کہ اس مذہب کے بنیادی ایمانیات میں جو فوق العادۃ عنصر ہے اُس میں کوئی چیز منافیٔ عقل نہیں اور یہ مذہب خالص ترین خدا پرستی (Deism) سے بہت قریب کا تعلق رکھتا ہے[3]۔"

دسویں صدی عیسوی کا آخری حصّہ عقلیت اور سائنس کے حق میں نحوست کا زمانہ تھا۔ ابن سینا کا ستارہ ابھی طلوع نہ ہُوا تھا لیکن کندی و فارابی جیسے اساتذہ عربوں کے آسمانِ علم پر نمودار ہو چکے تھے اور اُسے ہمیشہ کے لیے منوّر کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ اسلامی دنیا کا جو حصّہ بھی عبّاسیوں کے دینی یا دنیوی اقتدار کے زیرِ سایہ تھا اُس میں قدامت پرستی کا دور دورہ تھا جن علمائے معقولات اور فلاسفہ نے مسلمانوں کا نام دنیا کی تاریخ میں روشن کیا تھا، اربابِ فقہ نے اُن پر کفر و بدعت کے فتوے عائد کر دیئے تھے۔ اہلِ دینیات پر ایک بے حسّانہ تنگ نظرانہ اور جابرانہ ظاہر پرستی مستولی تھی ۔ ایک ریاکارانہ عیش پرستی نے امیروں پر اور ایک جاہلانہ تعصب نے غریبوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ تاریکی روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی اور اسلام کے قدم ڈگمگاتے ہوئے اُسی گڑھے کی طرف جا رہے تھے جس میں کلیسائیت نے مذہبِ عیسوی

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمۂ سوم

[2] اپنی کتاب "فصل المقال" میں (مُلّر کا ایڈیشن، مطبوعہ میونخ ۱۸۵۹ء) جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ المؤحد سلطان یوسف ابن تاشفین کی فرمائش پر لکھی گئی وہ اس ہم آہنگی کو ثابت کرتا ہے۔

[3] رینان۔ Averroes-et Averroism- Renan

کو گرایا تھا۔ شیدائیانِ حق کے لیے یہ مصیبت اور رنج و غم کا زمانہ تھا۔ ایسے میں مفکّرین کی ایک چھوٹی سی جماعت نے مسلمانوں کی شمعِ علم کو روشن رکھنے، عوام کے مزاج میں صحت پیدا کرنے، مسلمانوں کو جہالت و تعصّب کے بیابان کی طرف رواں دواں جانے سے روکنے، الغرض ملّت کے شیرازے کو درہم برہم ہونے سے بچانے کی خاطر ایک انجمن قائم کی۔ اس انجمن کا نام اخوان الصفا تھا۔ یہ انجمن بصرے میں قائم ہوئی، جو خلافت کی تیزی سے مٹتی ہوئی مملکت میں دوسرے درجے کا شہر اور عقلی و فکری سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اخوان الصّفا میں صرف بے عیب سیرت اور اخلاقِ حمیدہ رکھنے والے لوگوں کو شمولیت کی اجازت تھی؛ اس حلقۂ خواص میں داخلے کے لیے جو پروانۂ راہداری درکار تھا وہ شیفتگیٔ علم اور انسان دوستی تھا۔ اس میں کسی قسم کی علیحدگی پسندی یا رمزیت نہ تھی۔ البتہ حالاتِ وقت کے اقتضا کے باعث اور اس زمانے میں جس مذہبی و سماجی آمریت کا دور دورہ تھا، اس کے خیال سے اُسے اپنی نقل و حرکت کو کسی حد تک پردے میں رکھنا پڑتا تھا۔ اخوان الصّفا خاموشی سے اپنے سربراہ زید بن رفاعہ کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور ہر طرح کے فلسفیانہ اور اخلاقی مسائل پر ایسی بے تکلفی اور وسیع المشربی سے تبادلۂ خیال کرتے تھے کہ اس کی نظیر ہمارے زمانے میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مملکت کے ہر شہر میں اور جہاں کہیں انھیں ایسے اربابِ فکر ملے جو اُن کے سائنسی طریقے پر عمل کرنے کی خواہش اور قابلیت رکھتے تھے، اُنھوں نے اپنی شاخیں قائم کیں۔ اس انسان دوست اور علم نواز جماعت کے سرخیل زید بن رفاعہ کے علاوہ پانچ اشخاص تھے جو اس کی روحِ رواں تھے۔ اُن کا مسلک صحیح اور بہترین معنوں میں خُذ ما صفا تھا۔ انھوں نے کسی میدانِ فکر کو رد نہ کیا بلکہ ہر گلشن کی گلچینی کی۔ اگرچہ اُن کے فلسفیانہ تصوّرات پر تصوّف کا ہلکا سا رنگ چڑھا ہوا، تاہم معاشرتی اور سیاسی مسائل پر اُن کے خیالات بڑی حد تک عملی اور انسان نوازانہ تھے۔ انھوں نے دنیا کو اُس زمانے کی معلومات کا ایک خلاصہ متعدد رسالوں کی صورت[1] میں عطا کیا جنھیں مجموعی

---

[1] ان رسائل کو حاجی نورالدین نے چار جلدوں میں ترتیب دے کر ۱۳۰۵ھ میں بمبئی سے شائع کیا۔

طور پر رسائل اخوان الصفا و خلان الوفا کا نام دیا گیا ہے۔ مختصراً اُن کا ذکر عام طور پر اخوان الصفا کے نام سے کیا جاتا ہے۔ یہ رسالے مطالعۂ انسانی کے ہر موضوع کو محیط ہیں۔ مثلاً ریاضیات، ہیئت، طبیعی جغرافیہ، موسیقی، جرِّ ثقیل، طبیعیات، کیمیائیات، موسمیات، ارضیات (طبقات الارض) حیاتیات، عضویات (علم الابدان) نباتیات، منطق، صرف و نحو، مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور مسئلۂ معاد۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ رسالے اس زمانے کے فلسفے اور تمام علوم متداولہ کی ایک قاموس ہیں۔ حیوانات کے جسم نامی کی قرن بہ قرن نشوونما کے بارے میں دسویں صدی عیسوی کے ان ارتقائیین، (Evolutionists) کا جو نظریہ تھا اس کا مقابلہ آج کل کے مقبولِ عام نظریے سے کیا جائے تو وہ کسی طرح ادنیٰ نہ پایا جائے گا۔ بہرحال مجھے اُن کی تصنیفات کے سائنسی اور عقلی پہلوؤں سے اتنا سروکار نہیں جتنا اُن کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ اخوان الصفا کی اخلاقیات کی بنا مطالعۂ نفس اور انسانی خیالات کے تزکیہ و تصفیہ پر تھی۔ انھوں نے ملکۂ اخلاقی کو ملکۂ دماغی سے اونچا درجہ دیا۔ جفاکشانہ ریاضتِ نفس اور ضبطِ نفس پر مبنی قوتِ روحانی کو وہ افضل المحاسن شمار کرتے تھے[1]۔ "عمل کے بغیر عقیدہ، کرنے کے بغیر جاننا عبث ہے"؛ صبر و تحمل، نرمی و شفقت، عدل، رحم، صداقت، فضیلتِ تقویٰ، دوسروں کی خاطر ایثارِ نفس، یہ ہیں وہ فضائل جن کی ہر سطر میں تعلیم دی گئی ہے۔ منافقت، ریاکاری، دغابازی، رشک و حسد، کبر و غرور، ظلم و ستم، دروغ گوئی، یہ ہیں وہ رذائل جن کی ہر صفحے پر مذمت کی گئی ہے۔ جذبات کی پاکیزگی، انسانوں سے گرمجوش محبت، انسانی ترقی پر راسخ ایمان، عالمگیر عطا و احسان جس نے بے زبان مخلوق کو بھی اپنے آغوش میں لے رکھا ہے، یہ ہیں وہ اوصاف جو تمام رسائل میں شروع سے لے کر اخیر تک رچے ہوئے ہیں[2]۔ انسانوں اور حیوانوں کے درمیان جو مناظرہ ہے اس سے بڑھ کر خوبصورت اور کریم النفسی سے مملو عبارت کونسی ہو سکتی ہے؟ اُن کا فلسفۂ اخلاق اُن کے بعد کی تمام

---

[1] ملاحظہ ہو رسالۂ سوم۔ جلد چہارم

[2] ملاحظہ ہو رسالۂ چہارم۔ جلد چہارم۔

اخلاقیاتی تحریروں کی اساس ہے[1] اُن کے مذہبی خیالات وہی تھے جو فارابی اور ابن سینا کے تھے، یعنی یہ کہ کائنات ذاتِ باری سے صادر ہوئی لیکن براہِ راست صادر نہیں ہوئی۔ سببِ مطلقِ اوّل نے عقل یا ادراکِ عاملہ کو پیدا کیا، اُس سے نفسِ نفوس پیدا ہُوا، پھر اُس سے مادّۂ اوّلی وجود میں آیا جو تمام اشیائے مادّی کا تخزمایہ یا مادّۂ حیات ہے۔ ادراکِ عاملہ نے اس مادّۂ اوّلی کو صورت پذیر کیا اور حرکت بخشی، جس سے افلاک اور سیارے ظہور میں آئے۔ اخوان الصفا کا فلسفۂ اخلاق اس مقدّمے پر مبنی ہے کہ سببِ مطلقِ اوّل اپنی اسفل ترین مخلوق کے ساتھ ایک غیر منقطع سلسلے کے ذریعے مربوط ہے، کیونکہ نفسِ نفوس، جس نے انسانوں کی صورت میں انفرادیت پائی، ہمیشہ اس جدّوجہد میں منہمک رہتا ہے کہ پاکیزہ زندگی، ضبطِ نفس اور ذہنی سرگرمی کی بدولت کمال کی منزلِ مقصود کو پالے یعنی اپنے منبع و مصدر کی طرف مراجعت کرے۔ یہی وہ معاد ہے جس کی تعلیم ہادیٔ اسلام نے دی، یہی وہ سکون اور قرار ہے جس کا وعدہ صحیفۂ آسمانی نے کیا۔ یہ تھا اخوان الصفا کا طریقۂ تعلیم۔ ہم اُن کی نفسیات کے بارے میں چاہے کوئی رائے قائم کریں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے جو اخلاقی تعلیم دی اس سے بلند تر تعلیم اور کسی نے نہیں دی۔ یہ تعلیم اُن علمائے دینیات کی تعلیم سے بالکل مختلف تھی جنھوں نے متشدّد مستنجد کو اس پر آمادہ کیا کہ اخوان الصفا کی قاموس العلوم کو بغداد میں نذرِ آتش کر دے۔ کچھ مدّت کے بعد بغداد خود منگولوں کے ہاتھوں نذرِ آتش ہو گیا۔

لیکن ارسطو کا فلسفہ جو مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا، اخلاق سے بڑھ کر عربوں کے قطعیت پسند مزاج سے موافقت رکھتا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر ارسطوی منطق اور مابعد الطبیعیات نے سب سائنسدانوں اور عالموں کے تصوّرات پر بڑا اثر کیا۔ افلاطونیتِ جدیدہ نے، جو وجدان و ذوق اور ایک مبہم سے صوفیانہ استغراق پر مبنی تھی، اُس وقت تک اُن میں نفوذ نہ کیا جب تک شیخ شہاب الدین سہروردی نے اُسے مقبولیت نہ بخشی۔ لہٰذا

---

[1] مثلاً ناصر الدین طوسی کی "اخلاقِ ناصری" اور حسین واعظ کاشفی کی "اخلاقِ جلالی" اور "اخلاقِ محسنی"

سببِ اوّل کا جو تصوّر ارسطو نے پیش کیا تھا وہ اس زمانے کی زیادہ تر فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی تصانیف میں رچا ہُوا دکھائی دیتا ہے اور یہ ارسطو کے اثرات کا ہی نتیجہ تھا کہ قدامتِ مادّہ کے عقیدے کی طرف عرب متکلّمین کے ایک گروہ کا میلان تھا۔ ان لوگوں کو دہریہ کا لقب دیا گیا (دہر بمعنی فطرت) کریمر (Kremer) کے قول کے مطابق "ان فلسفیوں کا بنیادی خیال وہی تھا جو آج کل طبیعی سائنس کے پھیل جانے کی وجہ سے مقبول ہے" لیکن وہ خدا سے منکر (Atheists) نہ تھے، جیسا کہ اُن کے دشمنوں نے اُن کے بارے میں کہا ہے۔ خدائی سے انکار کے معنی ہیں مرئی اور مادی کائنات سے باہر اور ماورا کسی قوّت یا علّت کے وجود کو تسلیم نہ کرنا۔ یہ لوگ اُن معنوں میں منکرینِ خدا نہ تھے۔ اُن کا کہنا صرف یہ تھا کہ مسبّب الاسباب پر نہ کسی قسم کی صفات محمول کی جا سکتی ہیں نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کائنات پر اس کا فعل کس طریقے سے واقع ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ تعطیل یا لاادریت (Agnosticism) کے نظریے کے پیش کرنے والے تھے۔

ان واقعات سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ اسلام محمدی میں کوئی بات ایسی نہیں جو ترقی یا عقلِ انسانی کی نشوونما کے منافی ہو۔ پھر ایسا کیونکر ہُوا کہ بارھویں صدی عیسوی کے بعد مسلمانوں کے یہاں فلسفہ تقریباً کُلّی طور پر ختم ہو گیا اور ایک عقلیت سوز قدامت پرستی نے اُن پر غلبہ پا لیا؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ مسئلۂ قضاء و قدر، اگرچہ وہ قرآنی تعلیمات کا صرف ایک پہلو تھا، مسلمانوں کی اکثریت کا بنیادی عقیدہ بن گیا ہے؟ جہاں تک فلسفے کے مسلمانوں کے یہاں محو ہو جانے کا تعلق ہے، ایران میں شاہانِ صفوی کے تحت ابن سینا کے مسلک کا جو احیاء ہُوا وہ غالباً یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ عقلیت اور آزادیٔ فکر مسلمانوں کے یہاں بالکل مُردہ نہیں ہو گئی لیکن میں نے جو سوال اُٹھائے ہیں اُن کا اطلاق عامۃ المسلمین پر ہوتا ہے اور میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ جس صورتِ حال سے یہ سوال متعلق ہیں وہ کیونکر پیدا ہوئی۔

عباسی خلیفہ متوکّل کی تخت نشینی سے پہلے اسلام کا وہی حال تھا جو سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں عیسائیت کا تھا۔ اسلام اُس وقت دو بڑے بڑے مخالف

فرقوں میں بٹا ہوا تھا، ایک نقل کا دوسرا عقل کا۔ اربابِ نقل اس کے قائل تھے کہ فطری اور مافوق الفطرت دونوں قسم کے امور میں انسان کو مقدم نظائر سے ہدایت حاصل کرنی چاہیئے۔ اربابِ عقل کا عقیدہ یہ تھا کہ اُسے اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرنا چاہیئے۔ البتہ جس حد تک نظائر قابلِ عمل ہوں اُس حد تک اُن سے بھی ہدایت حاصل کرنی چاہیئے۔ ان دو فرقوں کے اختلافات اتنے شدید تھے کہ اُن میں موافقت پیدا کرنا ناممکن تھا۔ اربابِ عقل زیادہ تر اہلِ فقہ تھے۔ "یہ وہ طبقہ ہے جسے ہر زمانے اور ہر ملک میں بجا طور پر تنگ خیال، خود رائے اور اپنے مفادات کے بارے میں متقشف سمجھا گیا ہے۔ جمہور اِن اِمام اس طبقے کے حامی اور تابع تھے۔ عہ لشپ کا جو مذہب ہوتا ہے وہی بنیے کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن بنیے کا فلسفہ کسی طرح پروفیسر کا فلسفہ نہیں ہوتا۔ اس لیے بشپ کی تو عزت کی جاتی ہے لیکن پروفیسر کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ عقل وہ چیز ہے جس کی خصوصی ملکیت کا انسان دعویدار رہے۔ یہ وہ واحد امتیاز ہے جو حدود وعائد کرتا ہے چنانچہ عوام النّاس حسب ونسب یا دولت کی بزرگی کو تو بخوشی تسلیم کرتے ہیں لیکن عقل کی بزرگی کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔"[1]

جیسا کہ میں پہلے کے ایک باب میں ذکر کرچکا ہوں، پیغمبرِ اسلامؐ نے جو قانونی احکام یا فیصلے صادر کیے وہ ایک نیم متمدّن اور پرانی وضع کے معاشرے کی ضروریات پر مبنی تھے۔ آپؐ کے بعد حضرت علیؓ نے دینِ اسلام کے حقائق کی توضیح کی۔ قرآن میں تشریعی احکام بہت کم تھے اور جتنے تھے وہ بھی ایسے تھے کہ اُن کی تعمیل حالات کے مطابق کی جاسکتی تھی۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اُن کی توضیح و تشریح زیادہ تر حضرت علیؓ اور اُن کے شاگرد حضرت ابن عبّاس نے کی۔

حضرت علیؓ اور حضرت ابن عبّاسؓ کی وفات کے بعد اُن لوگوں نے جو اُن کے خطبوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ اپنے طور پر فقہ کی درس گاہیں کھول لیں۔ چنانچہ اربابِ فقہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ لوگ دینی اور شرعی مسائل پر بحث کرتے تھے، تاویلوں

---

[1] Lewes, *History of philosphy*, vol, ii,p. 50

کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے تھے اور مذہبی آداب و رسوم اور زندگی کے روزانہ معاملوں پر روشنی ڈالتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ عوام کے ضمیر کے محافظ و امین بن گئے۔ ہر مسلمان کو قدرتی طور پر یہ دریافت کرنے کا شوق تھا کہ شارعِ اسلامؐ نے مختلف حالات میں کیا کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روایتوں کا انبار لگ گیا۔ لیکن دبستانِ مدینہ کے سوا کہیں بھی کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ آنحضرتؐ کے ابتدائی جانشین ایک معیّن اصول پر کاربند تھے۔ وہ یہ کہ اگر انھیں عہدِ نبویؐ یا خلافتِ علوی کی کوئی نظیر مل جاتی جس کی توثیق اہلِ بیت نے کی تھی اور جس کا اطلاق زیرِ غور حالات پر ہو سکتا تھا، تو وہ اُسے اپنے فیصلے کی بُنیاد بناتے۔ اگر ایسی کوئی نظیر نہ ملتی تو وہ اپنے ذاتی اجتہاد پر اعتماد کرتے۔ قانون اُن کے نزدیک استقرائی اور تجربی تھا۔ چنانچہ وہ ہر صورتِ حال کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق حکم لگاتے تھے۔ ابتدائی خلفائے بنی اُمیّہ کے زمانے میں کوئی مقرّرہ قاعدہ نہ تھا۔ صوبوں کے عمّال اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور بزورِ شمشیر انھیں منواتے تھے۔ انفرادی ضمیر کے معاملات کو فقیہوں پر چھوڑ دیتے تھے لیکن بعد کے اُموی خلفاء کے تحت متقنّنوں اور فقیہوں کو بڑا اقتدار حاصل ہو گیا، خاص کر اس وجہ سے کہ عوام میں اُن کا بول بالا تھا۔ جب عبّاسی مسند نشین ہوئے تو اس وقت امام جعفر صادق کی درسگاہ میں دو ایسے شخص تحصیلِ علم کر رہے تھے جن کا شمار بعد میں سنّی مذہب کے ائمۂ مجتہدین میں ہوا یعنی امام ابوحنیفہ اور امام مالک بن انس۔ ابوحنیفہ عراق کے باشندے تھے اور مالک مدینے کے۔ دونوں نہایت متقی و پرہیزگار اور کریم النّفس تھے اور دونوں کے دل میں دین کی بنیادوں کو وسیع تر بنانے کا دلولہ تھا۔ دونوں اہلِ بیت کے شیدائی تھے اور اس وجہ سے دونوں نے تکلیفیں اُٹھائیں۔ امام ابوحنیفہ نے کوفہ واپس آکر ایک درسگاہ کھولی جس کی بناء پر حنفی مذہب کی عظیم عمارت کھڑی ہوئی۔ انھوں نے بیشتر روایات کو غیر صحیح قرار دے کر رَدّ کر دیا اور صرف قرآن پر اعتماد کیا۔[1] نظائر و اشباہ سے کام لے کر انھوں نے سیدھے سادے

---

[1] اس میں شبہ نہیں کہ حضرات حنفیہ کے ہاں احادیث کے اخذ و رد کے سلسلہ میں اپنے ہی اصول اور پیمانے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ فقہ حنفی کی اساس (باقی حاشیہ صفحہ ۶۲۷ پر ملاحظہ فرمائیں)

احکام کو ہر طرح کے حالات پر اطلاق کے قابل بنا دیا۔ ابو حنیفہ دنیا دار آدمی نہ تھے اور انھوں نے مدینہ و بغداد کے سوا کوئی شہر نہ دیکھا تھا۔ نتیجۃً وہ ایک قیاسی مقنن تھے۔ بہر حال اُن کے خیالات کو اُن کے دو شاگردوں نے منضبط کیا، یعنی ابو یوسف نے، جو بعد میں بغداد کے قاضی القضاۃ بنے اور محمد الشیبانی نے۔ امام مالکؒ کا طریق کار جُدا تھا۔ اُنھوں نے ہر طرح کے استنباط اور استخراج کو رَد کر دیا۔ اس کے بجائے اُنھوں نے مدینے میں، جہاں رسولِ خدا کی باتیں ابھی تک لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ تھیں، آنحضرتؐ کی زندگی کے ہر حقیقی یا قیاسی واقعے کے بارے میں معلومات جمع کیں اور اُنھیں اپنے نظریوں کی اساس بنایا۔ ان کا مسلک "جادۂ پامال"[1] کی راہ نوردی تھا۔ سیدھے سادے عربوں اور افریقی قبائلیوں کے لیے امام مالکؒ کے صریح احکام جو اُن کے قدیم الوضع معاشروں کے حسبِ حال تھے، ائمہ فاطمیہ کی مدلل آرا اور امام ابو حنیفہ کے قیاسی نظریوں کی بہ نسبت زیادہ قابلِ قبول تھے۔ امام مالکؒ کے کچھ عرصہ بعد امام شافعیؒ آئے۔ وہ امام ابو حنیفہ اور امام مالکؒ کی بہ نسبت دنیا کے معاملات سے زیادہ واقفیت بھی رکھتے تھے اور ابو یوسف اور محمد الشیبانی کی بہ نسبت منطقی مُوشگافیوں کے کم دلدادہ بھی تھے۔ اُنھوں نے وہ مواد لے کر جو امام جعفر صادق، امام ابو حنیفہ اور امام مالکؒ نے فراہم کیا تھا ایک اخاذ مسلک کی بنیاد رکھی جسے متوسط طبقے کے لوگوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا مسلک اصلی حنفی مسلک کی بہ نسبت ایک روز بروز بڑھتی ہوئی اور رلی جلی آبادی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں سے تطبیق کی تو کم صلاحیت رکھتا تھا، پھر بھی اس میں اصلاح پذیری کا اتنا مادہ تھا کہ اگر قرونِ مابعد کی ظاہر پرستی اس کی علمی افادیت کو تباہ نہ کر دیتی تو وہ بہت منفعت بخش ثابت ہوتا۔[2] بہر حال اس طرح عقیدہ و قانون کے چار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲۶) صرف قرآن ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ حنفی کی عمارت کو تین واضح بنیادوں پر استوار کیا ہے۔ قرآن، سنت مشہورہ، اور قیاس۔ (م ح ن)

[1] اُن کی کتاب فقہ موطا کے یہی معنی ہیں۔

[2] شافعی مذہب ہندوستان کے تعلیم یافتہ حنفی طبقوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔

مختلف مذاہب، جو ایک دوسرے سے بڑی حد تک ممتاز تھے، دنیائے اسلام میں رائج ہو گئے۔ فاطمی مذہب زیادہ تر شیعوں میں رائج تھا جو اسلامی مملکت کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے، مالکی مذہب جزیرہ نمائے عرب کے بہت سے عربوں میں، بربروں میں اور ہسپانوی مسلمانوں میں مقبول تھا۔ شافعی مذہب متمول طبقوں میں متداول تھا اور حنفی مذہب کے پیرو ایشیائے کوچک، شام اور مصر کے معزز طبقے تھے۔ حنفی مذہب کو خلافت کے زمانے میں جو حیثیت حاصل تھی وہ اُس حیثیت سے مشابہ تھی جو فریسیّت[1] کو یہودیوں میں حاصل رہی تھی، دارالسلطنت کے دربار کی سرپرستی نصیب تھی، اس لیے وہ واحد مذہب تھا جس میں اتنی وسعت تھی کہ ایک مخلوط آبادی کی ضرورتیں پوری کر سکے۔ فاطمی مسلک کے قبول کرنے میں یہ خدشہ تھا کہ جانشینانِ بنی کو بہت وقعت مل جاتی۔ مالکی اور شافعی مسالک ایک وسیع المشرب مملکت کے تقاضوں کے لیے موزوں نہ تھے اور اگر انھیں اختیار کیا جاتا تو مملکت کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے۔ چنانچہ یہ ہُوا کہ جامعوں اور مدرسوں میں تو عقلیت کا طوطی بولتا تھا لیکن منبروں پر اور عدالتوں میں حنفیت کی جلوہ گری تھی۔ الٰہیاتی مسائل میں حنفیت مسلکِ صفاتیہ کی طرف مائل تھی، لیکن وہ بادشاہِ وقت کے خیالات کے مطابق اپنی آرا میں ردّ و بدل کر لیتی تھی۔ اس زمانے میں اس کی یہ ایک امتیازی صفت تھی۔ یہ حالات تھے جن میں امام احمد بن حنبل (جو عموماً امام حنبل کے نام سے مشہور ہیں) منظرِ عام پر آئے۔ وہ انتہائی درجے کے متشرع تھے اور کسی قسم کے اختلافِ رائے کے متحمل نہ ہوتے تھے۔ انھیں نہ حنفی مسلک کی فریسیانہ آزاد منشی پسند آئی، نہ مالکی مسلک کی تنگ خیالی، نہ شافعی مسلک کی پیش پا اُفتادہ روش۔ چنانچہ انھوں نے ساری مملکتِ اسلامیہ کے لیے ایک نیا مسلک ایجاد کیا جو تمام و کمال حدیث پر مبنی تھا۔ امام ابوحنیفہ نے بیشتر متداول حدیثوں کو مسترد کر دیا تھا۔ امام ابن حنبل نے اپنے نظامِ فقہ میں بہت سی متناقض، مستبعد اور عقل کو خیرہ کر دینے والی روایتیں شامل کیں جو اصل بے جوڑ تھیں اور بدیہی طور پر گھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس وقت سے ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے طرفداروں میں

---

[1] Pharisaism

ایک شدید چپقلش شروع ہو گئی۔ ابن حنبل نے صفاتیہ کے انتہا پسندانہ خیالات کو قبول کیا۔ ان کا دعوےٰ تھا کہ ذاتِ باری کو آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے، اس کی صفات اس کی ذات سے علیحدہ ہیں، یہ بیان کہ خدا عرشِ بریں پر متمکن ہے لغوی معنوں میں صحیح ہے، انسان کسی لحاظ سے مختار نہیں، ہر فعلِ انسانی بلا واسطہ فعلِ الٰہی ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ انھوں نے علومِ عقلی و تجربی کو مذموم قرار دیا[1] اور عقلیت کے برخلاف اعلانِ جہاد کیا۔ عامۃ النّاس نے اُن کی وضاحت و بلاغت اور جوش و خروش سے مرعوب ہو کر اُن باتوں پر آمنّا و صدقنا کہا۔ حنفی فقیہوں نے بھی، جن کا اقتدار جاہل عوام میں ہر دلعزیز ہونے پر موقوف تھا اور جو اس قدر و منزلت پر رشک کرتے تھے جو سائنسدانوں اور فلسفیوں کو ہارون و مامون کے دربار میں حاصل تھی، اس نئے مُصلح کی ہاں میں ہاں ملائی۔ چنانچہ منبروں پر سے عقلیت کے حامیوں اور فلسفہ و سائنس کے خادموں پر آتشِ جہنم کے شعلے برسنے لگے اور بغداد کے کوچہ و بازار میں آئے دن خونریز جھڑپیں ہونے لگیں۔ بالآخر معتصم اور واثق نے سختی سے ان مذہبی دیوانوں کے تشدد کی روک تھام کی۔ امام ابن حنبل کو قید خانے میں ڈال دیا گیا، جہاں اُن کی وفات ہوئی۔ اُن کے جنازے میں ایک لاکھ چالیس ہزار مرد و عورت شریک ہوئے۔[2] حنبلی مذہب کو پیرو کاروں کی کوئی کثیر تعداد تو نصیب نہ ہوئی، لیکن اس نے حنفی مذہب سے مل کر اُسے ایک نئی شکل دے دی۔ چنانچہ اس کے بعد سے حنفی مذہب امام ابوحنیفہ اور امام ابن حنبل کی تعلیمات کا ایک مخلوط مجموعہ بن گیا۔

متوکل کے تخت نشین ہونے کے وقت مختلف فرقوں کی صورتِ حال حسب ذیل تھی:-

علمائے معقولات امورِ مملکت کے ناظم و مہتمم تھے۔ وہ اختیار و اعتبار والے تمام عہدوں پر

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے حضرت الامام کی تصریحات کی روشنی میں اس حقیقت کی وضاحت فرما دی ہے کہ آپ نے صرف اس علم الکلام اور فلسفہ کی تردید کی ہے جو غلط، گمراہ کن اور غیر واضح تھا۔ مطلقاً علومِ عقلیہ یا علومِ تجربیہ کی نہیں۔ (م ح ن)

[2] ضمیمہ دوم ملاحظہ کیجئے۔

مامور تھے، وہ کالجوں کے پروفیسر تھے، شفاخانوں کے نگران تھے، رصدگاہوں کے منتظم تھے تجارتی کاروبار کے سربراہ تھے؛ غرض انھیں مملکت کے علم و دانش اور مال و دولت دونوں کی نمائندگی نصیب تھی عقلیت تعلیم یافتہ لوگوں، اربابِ دانش اور ذی اثر طبقے کا مسلک غالب تھی مسلکِ صفاتیہ معاشرے کے نچلے طبقوں میں مقبول تھا، چنانچہ بشیر قاضی، مدرس اور وکیل اس کے پیرو تھے۔ متوکل نے جو ایک جفا پیشہ حکمران اور رندِ میخوار تھا اور جس پر وقتاً فوقتاً دیوانگی کے دورے بھی پڑا کرتے تھے مصلحت اس میں دیکھی کہ مؤخرالذکر طبقے کے ساتھ اتحاد کرے۔ اس سے اُسے عوام کا ہر دلعزیز خلیفہ بھی اور کٹّر ملّاؤں کا ممدوح بھی بننے کی اُمید تھی۔ چنانچہ اس نے ترقی پسندوں کو تمام سرکاری عہدوں سے خارج کرنے کا فرمان جاری کیا۔ کالج اور یونیورسٹیاں بند کر دی گئیں۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور علمائے معقولات کو بغداد سے شہر بدر کر دیا گیا۔ متوکل نے اسی پر قناعت نہ کی بلکہ حضرت علیؓ اور اُن کے فرزندوں کے مقبرے بھی مسمار کرا دیئے۔ متعصب فقہا، جواب اسلام کے موبد اور مربّی بن گئے تھے، امورِ سلطنت کے مختارِ کار ہو گئے۔ متوکل کی موت اور منصور کی مسند نشینی نے ایک بار پھر ترقی پسندوں کو غلبہ بخشا۔ لیکن اُن کی ظفر مندی مختصر المیعاد ثابت ہوئی۔ بے رحم اور خونخوار معتضد باللہ کے تحت ملائیت اور قدامت پرستی نے از سرِ نو اقتدار پر مکمل قبضہ کر لیا۔ اس نے علمائے معقول کو بُری طرح ستایا۔ اُن کی تعلیم یہ تھی کہ عدل اعمالِ انسانی کی رُوحِ رواں ہے۔ خدا خود عدل کے ذریعے کائنات پر حکمران ہے بلکہ عدل اس کی ذات اور اس کا جوہر ہے۔ خیر و شر کا معیار انفرادی ارادہ نہیں بلکہ نوعِ بشر کی صلاح و فلاح ہے۔ یہ نظریے بلا کے انقلاب انگیز تھے، کیونکہ اُن کا ہدف خلیفہ کا حق غلط کاری تھا۔ اس سے بدتر باتیں تو ٹام پینؔ[1] بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ اس کے برعکس ملّاؤں کی تعلیم یہ تھی کہ "خدا بادشاہ ہے، چونکہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی"۔ اس بارے میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ ان مخالف نظریوں میں سے کونسا سچا تھا؟ بہرحال

---

[1] Tom Paine

اب عباسیوں کے تحت عقلیت کا دور ختم ہو چکا تھا۔ بغداد سے شہر بدر ہو کر اس نے قاہرہ میں پناہ لی۔ لیکن وہاں اُسے پناہ تو کیا ملتی، اُس کی حالت اور بھی بُری ہو گئی۔ عباسیوں کو قاہرہ اور قاہرہ کی ہر چیز سے انتہائی نفرت تھی اور بغداد کے مسلم پاپاؤں کو عقلیت کے نام سے بھی چڑھ تھی۔ چنانچہ فقہ کا ایک دارالعلوم قائم کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ جو سائنسدان اور فلسفی ابھی تک ملائیت کے حلقۂ اثر کے اندر رہتے تھے، اُن کی تصنیفات کی چھان بین کی جائے اور یہ دریافت کیا جائے کہ ان تصنیفات میں کفر و الحاد اور بدعت کا عنصر کہاں تک موجود ہے۔ جن جن تصنیفات میں عقلیت کا شائبہ بھی پایا گیا وہ جلا کر راکھ کر دی گئیں اور اُن کے مصنّفین کو سزائیں دی گئیں بلکہ بعض کو قتل کر دیا گیا۔ اب عالمِ اسلام کی ہیئت کذائی وہی ہو گئی جو قدامت پرست عیسائیت کی تھی۔ اس سے پہلے ایک وقت تھا جب ملکی طاقت کی مخالفت کے باوجود عقلیت کے لیے یہ ممکن تھا کہ عوام کے دلوں پر سکہ بٹھا لیتی۔ ملاؤں نے جب کبھی علمائے عقلی سے مناظرہ کیا شکست کھائی اور اگرچہ ایسے موقعوں پر وہ اکثر تلوار اور سنگ و خشت کے دلائل سے بھی کام لیتے تھے پھر بھی مناظرے میں اُن کی ہار کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور اُن کے پیروؤں پر پڑتا تھا۔ ایسے میں رجعت پسندوں کو ایک غیر متوقع معاون مل گیا۔ اب تک ان کے اسلحہ خانے میں صرف روایت کے ہتھیار رہتے۔ اس معاون نے انھیں ایک نیا حربہ مہیا کیا۔ امام ابوالحسن الاشعری[1] ان مشہور ابوموسیٰ الاشعری کی اولاد سے تھے جن سے عمرو بن العاص نے حضرت علیؓ کی برطرفی کا اعلان کرایا تھا۔ ان کی تعلیم معتزلہ کے طریقے میں ہوئی اور انھوں نے معتزلہ کی منطق، فلسفہ اور طرزِ استدلال سب کچھ سیکھا۔ ایک دن انھوں نے بصرے کی جامع مسجد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے معتزلہ کے عقائد ترک کرنے اور صفاتیہ کے عقائد اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ان کے مُوثر اور بلیغ طرزِ کلام

---

[1] امام اشعری ۲۶۰ھ (مطابق ۸۷۳ء) میں بصرے میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزارا۔ چالیس سال کی عمر تک وہ معتزلہ کے پیرو تھے۔ اعتزال سے انحراف کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ رمضان کے مہینے میں ایک رات رسولِ خدا نے انھیں خواب میں اس کی ہدایت کی۔

سے لوگ مرعوب ہو گئے اور جو لوگ ڈانواں ڈول تھے وہ فوراً اُن کے پیچھے ہو لیے۔ بہت جلد علمائے خلافت میں انھیں چوٹی کا درجہ حاصل ہو گیا۔ فقہا اُن کی ہر بات مانتے تھے، عوام اُن کے گرویدہ تھے اور خلیفہ اُن کی عزت کرتا تھا۔ امام اشعری نے ملائیت کو وہ چیز عطا کر دی جس کی حاجت اُسے مدتوں سے محسوس ہو رہی تھی، یعنی معتزلہ، فلاسفہ اور ائمۂ فاطمیہ کے عقلی نظریوں کے ردّ و ابطال اور قدامت پسندانہ دینیات کے اثبات کے لیے ایک منطقی نظام یا کم از کم ایک ایسا طریقِ استدلال جسے منطقی کہا جا سکتا تھا۔

ہم امام اشعری کے عقائد کا ایک خلاصہ پیش کرتے ہیں جو شہرستانی سے ملخّص ہے اور جس سے عام مسلمانوں کے موجودہ ذہنی جمود کے اسباب کا پتہ چلتا ہے۔ "ان کا اعتقاد تھا کہ خدا کی صفات ازلی اور اس کی ذات میں موجود ہیں لیکن وہ محض اس کی ذات نہیں، بلکہ اُس پر ایک اضافہ ہیں...... وہ ایک قدیم کلام کے ذریعے بولتا ہے اور ایک قدیم ارادے کے ذریعے چاہتا ہے، کیونکہ خدا ابداہتًہ ایک بادشاہ ہے اور ایک بادشاہ کی حیثیت سے امر و نہی کا اختیار رکھتا ہے اس لیے وہ امر و نہی صادر کرتا ہے........ خدا کا حکم قدیم ہے، اُس کے اندر موجود ہے اور اس کی ایک صفت ہے۔ خدا کا ارادہ غیر منقسم، ازلی و ابدی اور تمام ایسی چیزوں کو محیط ہے جو ارادے کی تابع ہیں، چاہے وہ خود اس کے اعمال ہوں یا اس کے بندوں کے افعال، مؤخر الذکر اس صورت میں کہ وہ خدا کے خلق کیے ہوئے افعال ہوں، نہ کہ بندوں کے مکتسب افعال۔ خدا ہر چیز کا اخلاقاً ارادہ کرتا ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، نافع ہو یا مُضر۔ خدا چونکہ علم بھی رکھتا ہے اور ارادہ بھی، لہٰذا وہ بندوں کے ایسے افعال کا ارادہ کرتا ہے جن کا اُسے علم ہوتا ہے اور جو لوحِ محفوظ میں مندرج ہیں۔ یہ مقدّم علم ہی اس کا حکم ہے، اس کا فیصلہ ہے اور اس کی مشیت ہے۔ اس میں کوئی ردّ و بدل ممکن نہیں۔ ایک مکتسب فعل وہ فعل ہے جس کا قابلیتِ مخلوقہ (یعنی توفیق) کے ذریعے ہونا مقدّر ہے اور جو قابلیتِ مخلوقہ کی شرائط کے تحت واقع ہوتا ہے۔" سیدھے سادے الفاظ میں امام اشعری کی تعلیم یہ تھی کہ ہر فعل یا تو خدا کی طرف سے صادر ہوتا ہے یا اس کا کسی شخص سے ارتکاب خدا کی طرف سے مقدّر ہوتا ہے۔ یہ شخص چونکہ اکتساب کی قابلیت رکھتا ہے اس لیے وہ اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ مؤخر الذکر قسم کا فعل اولاً خدا

کا فعل ہوتا ہے اور ثانیاً بندے کا۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک خط لکھنے بیٹھے تو اس کا خط لکھنے کی خواہش کرنا اس حکمِ ازلی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں وقت ایک خط لکھے۔ پھر جب وہ قلم ہاتھ میں لیتا ہے تو یہ بھی ایک حکمِ ازلی کا نتیجہ ہوتا ہے، وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ جب وہ خط لکھ چکتا ہے تو یہ ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو اس کے اکتساب کی بدولت ظہور میں آیا۔ شہرستانی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک پتے کی بات کہتا ہے۔ وہ یہ کہ ابوالحسن کے قول کے مطابق قابلیتِ مخلوقہ میں ایجادِ عمل پر اثر انداز ہونے کی کوئی طاقت شامل نہیں۔ امام اشعری کے مزید عقائد حسبِ ذیل تھے:۔

"خدا اپنے بندوں پر ایک بادشاہ کی طرح حکومت کرتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا اور جو حکم چاہتا ہے دیتا ہے۔ اگر وہ سارے بندوں کو دوزخ میں ڈال دے تو اس میں کوئی خطا نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر وہ سارے بندوں کو داخلِ جنّت کر دے تو اس میں کوئی ناانصافی نہ ہوگی، کیونکہ ناانصافی ایسی چیزوں کے بارے میں حکم دینے کو کہتے ہیں جو حکم دینے والے کے قبضۂ اختیار میں نہیں ہیں، یا چیزوں کے مقررہ علائق میں خلل پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ خدا حاکمِ مطلق ہے جس پر کوئی ناانصافی محمول نہیں ہو سکتی اور جس کی طرف کوئی غلطی منسوب نہیں کی جا سکتی......عقل کی رو سے کوئی چیز خدا پر واجب نہیں — نہ نافع عمل، نہ مفیدِ خلائق کام، نہ کریمانہ اعانت......کسی کام کا بندوں پر فرض ہونا اسے خدا پر واجب نہیں بنا دیتا۔"

امام اشعری کے عقائد بیان کرنے کے بعد شہرستانی اُن کے سب سے سربرآوردہ شاگرد ابومحمد بن کرّام کے عقائد بیان کرتا ہے جس کی تعلیمات کی کثیرالتعداد لوگوں نے متابعت کی۔ شہرستانی ابومحمد کو صفاتیہ میں شمار کرتا ہے۔ ابومحمد کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کی صفات اس کی ذات سے جدا ہیں، خدا آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق بندوں کے افعال کو وقتاً فوقتاً خلق کرتا ہے۔

اگر ہم ابن عساکر[1] کی تصنیفات کا ذکر نہ کریں تو امام اشعری کی تعلیمات کا بیان نامکمل رہ

---

[1] ابی القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عبداللہ بن الحسن (باقی حاشیہ صفحہ ۶۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

جائے گا۔ شہرستانی نے اشاعرہ کے عقائد کا جو خلاصہ پیش کیا اس میں اس کا طرزِ بیان فلسفیانہ اور منصفانہ ہے۔ اس کے برخلاف ابن عساکر مختلف مسالک میں توازن قائم رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ امام اشعری کی طرح وہ بھی عقلی علماء کے نظریوں کو کفرِ محض تصور کرتا ہے اور ان کی تعلیمات کی شدت سے مذمت کرتا ہے۔ بہرحال اس نے امام اشعری کے اس تاکیدی حکم کی جو تصریح کی کہ دین کے ایمانیات کو بلا حیل و حجت تسلیم کرنا لازمی ہے، اس کی مدد سے ہمیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی ذہنی نشوونما کے ایک ابتدائی مرحلے میں کیا رجحان بروئے کار آئے اور انھوں نے کس طرح بالآخر مسلمانوں کی ترقی کو روک دیا اور صدیوں کے لیے ان کے قوائے عقلی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ دین کے مسائل کے بارے میں کسی قسم کا سوال فقدانِ ایمان اور ایک ناقابلِ معافی گناہ سمجھا جاتا تھا اور تحقیق کو تو ایک شیطانی کارروائی تصور کیا جاتا تھا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ: "خدا ہر چیز کو دیکھتا ہے"۔ اس سے یہ قیاسی نتیجہ نکالا گیا کہ خدا کی آنکھیں ہیں اور مومن پر لازم ہے کہ وہ اس پر چون و چرا کے بغیر ایمان لائے۔ یہ تھا امام اشعری کا طریقِ استدلال اور یہی آج تک ان کے مسلک کے تابعین کا طریقِ استدلال ہے۔

امام اشعری اور ان کے ممتاز شارح اور مفسر ابن عساکر کے درمیان اڑھائی صدیوں کا فصل تھا۔ اس مدت کے دوران اسلام میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ جب تک امام اشعری نے اپنا نیا مسلک ایجاد نہ کیا اس وقت تک اقتدار کے لیے جو کشمکش تھی وہ دو مسالک کے درمیان تھی یعنی عقلیت اور ملائیت کے درمیان۔ امام اشعری نے ملائیت کو ایک ایسے حربے سے مسلح کیا جو اسے پہلے میسر نہ آیا تھا۔ جیسا کہ ابن عساکر نے کہا ہے: "امام اشعری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۳) علی شافعی المعروف بہ ابن عساکر، جو اپنی جید تاریخ دمشق کی وجہ سے مشہور ہے۔ سنہ ۴۹۹ھ میں پیدا ہوا اور اس کی وفات ۵۷۱ھ میں ہوئی۔ وہ ایک کٹر شافعی تھا اور امام اشعری کو اسلام کا بہت بڑا مجتہد اور مؤید خیال کرتا تھا۔ اس کی کتاب کا نام ہے "تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی حسن الاشعری"

پہلے متکلّم باللسان تھے جنھوں نے اربابِ عقل اور دوسرے بدعت پسندوں کا مقابلہ خود ان کے منطقی اصولوں کے مطابق دلائل و براہین سے کیا"۔ اُن کے نظریے چونکہ ملائیت اور عقلیت، تقلید اور بدعت کے درمیان تطبیق کی ایک کوشش تھے اس لیے انھیں انتہا پسند علمائے دین کی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن لوگوں نے دیکھا کہ عقلیت کو مامون اور اس کے دو جانشینوں کے دور میں جو جاہ و اقتدار حاصل ہو گیا تھا اُسے ختم کرنے کا یہ ایک نہایت مفید وسیلہ ہے۔ آلِ بویہ کے ابتدائی حکمرانوں نے بھی عقلیت کی حمایت کی تھی اور اُن کے زیرِ سرپرستی اس کا اثر و نفوذ وسطی ایشیا میں پھیل گیا تھا۔ ابن عساکر کا قول ہے: "فنا خسرو[1] (عضد الدولہ) کے زمانے تک معتزلہ کو عراق میں بہت اقتدار حاصل تھا"۔ عضد الدولہ کے عہدِ حکومت میں اشعریت کو دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور وہاں سے وہ عوام میں پھیل گئی۔ پانچویں صدی ہجری تک اکثر اشاعرہ کو معتزلہ کی ایک شاخ سمجھا گیا، کیونکہ امام اشعری ابتدا میں معتزلہ کے پیرو تھے۔ اس اشتباہ کی وجہ سے بارہا ایسا بھی ہُوا کہ قدامت پسندوں کے ہاتھوں امام اشعری کے تابعین کو تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔

سلجوقی خاندان کے بانی سلطان طغرل کے عہدِ حکومت میں امام اشعری کے تابعین پر الحاد و بدعت کا شبہ ہُوا اور انھیں زباں بندی اور جلاوطنی کی سزائیں دی گئیں۔ سلطان

---

[1] الملک فنا خسرو نے قصرِ خلافت کے ناظم کی حیثیت سے ۳۶۷ھ سے ۳۷۲ھ تک بغداد پر حکومت کی۔ ابن عساکر سے روایت ہے کہ ایک موقع پر جب وہ قاضی القضاۃ کے مکان پر علما کے ایک جلسے میں شریک ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ مسلک اشاعرہ کا ایک عالم بھی جلسے میں موجود نہیں۔ اس نے سبب پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ بغداد میں اشعریہ کے فرقے کا کوئی عالم نہیں۔ اُس نے قاضی القضاۃ کو تاکید کی کہ کوئی عالم باہر سے بُلوایا جائے۔ چنانچہ اُس کے حکم پر امام اشعری کے ایک ممتاز شاگرد ابن الباقلانی کو بغداد بُلایا گیا۔ فنا خسرو نے اپنے لڑکوں کی تعلیم اُس کے سپُرد کی۔ خواہ یہ روایت صحیح ہو یا غلط، حقیقت یہ ہے کہ اشعریوں کا ستارہ عضد الدولہ کے عہد میں بلندی پر آیا۔

خود امام ابو حنیفہ کا مقلد اور حنفی مسلک پر سختی سے کار بند تھا۔ اس نے مسجدوں میں جو خطبے دیئے ان میں اُس نے ملحدوں پر تبرا بھیجنے کا حکم دیا۔ ابن عساکر کی روایت کے مطابق سلطان طغرل کے وزیر[1] نے، جو معتزلہ کا معتقد تھا، ان تبروں میں اشاعرہ کو بھی شامل کیا اور امام اشعری کے سربرآوردہ تابعین کو تکلیفیں پہنچائیں۔

طغرل بیگ کی وفات پر اشاعرہ کے دن بدلے اور الپ ارسلان کے تخت نشین ہوتے ہی اور نظام الملک کے عروج میں آتے ہی اشعریت کو از سرِ نو غلبہ حاصل ہو گیا۔ نظام الملک اہلِ سنت کا حامی تھا۔" اس نے جلاوطن علماء کو واپس بلوایا، ان کی عزت و تکریم کی اور ان کے ناموں پر دارالعلوم اور مدرسے کھولے۔" چنانچہ یوں ایک ایسا شخص جو مسلمانوں میں علوم و فنون کی فیاضانہ سرپرستی کے لیے سربرآوردہ تھا غیر شعوری طور پر ایک ایسے رجحان کا معاون بن گیا جو تمام دوسرے اسباب سے بڑھ کر مسلمانوں کے قوائے عقلی کو عقیم بنانے کا ذمہ دار ہے۔

ابنِ عساکر نے اشعری مسلک کی ترقی کی جو رُوداد بیان کی ہے وہ جوش و خروش سے مملو ہے۔ "عراق سے وہ ایوبیوں[2] کے تحت شام میں اور مملوکوں کے تحت مصر میں پھیلا۔ عراق ہی سے اُسے ابن تومرت[3] مغربی افریقہ لے گیا اور وہ مغرب (مراکش) میں جڑ پکڑ گیا۔" "ابن حنبل کے چند مقلدین اور ابو حنیفہ کے مٹھی بھر تابعین کے سوا اسلام میں کوئی فرقہ ایسا نہ رہ گیا جو اشعری کے پیروؤں کا مقابلہ کر سکتا۔" ابن عساکر کا قول ہے: "اپنے مذہبی خیالات میں ابن حنبل اور الاشعری کا ملاً متفق تھے۔ نہ کسی فرعی معاملے میں، نہ ارکانِ عقیدہ میں اور نہ روایات کے قبول کرنے کے بارے میں اُن میں کوئی اختلاف تھا۔۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ حنبلیوں نے ہمیشہ بدعتی لوگوں کے مقابلے میں اشعریوں پر اعتماد کیا ہے۔ صحیح العقیدہ

---

[1] ابو نصر منصور۔ ملقب بعمید الملک۔

[2] صلاح الدین اور اس کے جانشین۔

[3] شمال مغربی افریقہ میں موحد خاندان کا بانی۔

لوگوں میں صرف اشاعرہ متکلّمین تھے۔"

امام اشعری کی تعلیمات کے بڑے بڑے اصولوں کو واضح کرنے کی خاطر ابن عساکر مختلف فرقوں کے عقائد کا مقابلہ کرتا ہے۔

چند دوسرے فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد وہ امام اشعری کے الفاظ میں معتزلہ عقائد کو بیان کرتا ہے ("جن میں وہ راہِ حق سے گمراہ ہو گئے") وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ معتزلہ اس خیال کی تردید کرتے تھے کہ خدا کو جسمانی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے یا یہ کہ یوم حساب کو حشرِ اجساد ہو گا۔[1] وہ عذابِ قبر کے مسئلے کا بھی ابطال کرتے ہیں۔" وہ اس پر بھی اعتقاد نہیں رکھتے کہ رسُولِ خدا اپنی اُمّت کی شفاعت کریں گے۔ اُن کا خیال ہے کہ بندوں کے گناہوں کی معافی یا تخفیف صرف خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نہ خدا کے رحم نہ اس کے عدل پر بشری شفاعت کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نبی پر مکشوف ہوا، اور شریعت کے قوانین انسانی ضروریات کے مطابق وضع کئے گئے۔"

معتزلی عقائد کو بیان کرنے کے بعد ابن عساکر اشاعرہ کے عقائد کو بالتفصیل بیان کرتا ہے۔ اُن کی تعداد چوبیس ہے لیکن امام اشعری کے دینیاتی عندیے کو اور عقلی اسلام سے انھیں جو زبردست اختلاف تھا اس کو واضح کرنے کے لیے اُن میں سے چند ایک کا مجمل ذکر کافی ہے، توحیدِ الٰہی اور نبوتِ محمدؐی پر ایمان کا اقرار کرنے کے بعد، جن پر تمام مسلمان متفق ہیں، مسلکِ اشاعرہ اپنے عقائد کو یوں بیان کرتا ہے:۔

"ہم اقرار کرتے ہیں کہ جنّت اور جہنّم حق ہیں، یوم حساب کا آنا یقینی ہے، لاریب خدا مُردوں کو قبروں سے اُٹھائے گا اور انسانوں کی آنکھوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا۔[2] ہم اقرار

---

[1] یہ عقیدہ یوں ہے کہ تدفین کے تیسرے دن دو فرشتے جن کے نام منکر اور نکیر ہیں، قبر میں آتے ہیں اور اپنے عصاؤں کی ضربوں سے مُردے کو اُٹھا دیتے ہیں۔ پھر وہ اس کی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں اُس سے سوال کرتے ہیں اور ایک نامۂ اعمال میں اُس کے جواب درج (باقی حاشیہ ۶۴۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

کرتے ہیں کہ کلام اللہ (یعنی قرآن) اور اس کا ہر لفظ غیر مخلوق ہے؛ دنیا کا کوئی واقعہ چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا، خدا کے ارادے کے بغیر ظہور میں نہیں آتا، اُس کی مرضی کے بغیر کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ قادرِ مطلق اپنے بندوں کے اعمال اور اُن کے نتائج وعواقب سے واقف ہے۔ وہ اُن افعال سے بھی واقف ہے جو وجود میں نہیں آتے۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام اعمالِ انسانی کا مُوجد خدا ہے اور اُس نے اُنھیں اوّل روز ہی سے مقدّر کر دیا ہے۔ انسان میں یہ استطاعت نہیں کہ خود (یعنی خدا کی مدد کے بغیر) کوئی چیز ایجاد یا خلق کر سکے، وہ اس کی قابلیت نہیں رکھتا کہ مشیتِ الٰہی کے بغیر کوئی ایسا کام کر سکے جو اس کی رُوح کے حق میں نفع بخش ہے یا کسی ایسے کام سے بچ سکے جو اُس کے لیے مُضر ہے۔"

"ہم رسُولِ خدا کی شفاعت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ خدا اُن مومنوں کو جن سے گناہ سرزد ہوئے ہیں عذابِ نار سے نجات بخشے گا۔" "ہم یوم حشر پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ دجّال کا ظہور ہو گا، ہم اقرار کرتے ہیں کہ منکر نکیر قبر میں مواخذہ کریں گے۔ ہم معراجِ نبی[ل] کے معتقد ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ تمام بُرے خیالات شیطان کے پیدا کئے ہوئے وسوسے ہوتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام برحق کے خلاف بغاوت کرنا گناہ ہے[ک]۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۷) کرتے جاتے ہیں۔ وہ گویا مقدمے سے پہلے واقعات کی تفتیش کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ جو بداہتہً مصری خیالات سے ماخوذ ہے، اشاعتِ اسلام سے پہلے عربوں کی لوک کہانیوں میں رچا ہُوا تھا۔

ل معراجِ نبوی پر اعتقاد مسلمانوں میں عام ہے۔ اشاعرہ اور قدامت پسندوں کا عقیدہ ہے کہ رسُولِ خدا جسمانی طور پر زمین سے آسمان پر گئے تھے لیکن عقلی علماء کا خیال یہ ہے کہ معراج رُوحانی تھا، یعنی رسُولِ خدا کی رُوح کو مرحلہ بہ مرحلہ ایسا صعود بخشا گیا کہ بالآخر اُسے رُوحِ کُل سے ربطِ مطلق حاصل ہو گیا۔

ک مقلد سُنّیوں کا جو یہ عقیدہ ہے کہ خلیفہ کی بیعت کرنے کے بعد اُس سے سرکشی کرنا گناہ ہے، یہ اُسی کا نتیجہ تھا کہ تمام مسلم حکمرانوں نے خلیفہ کے ہاتھوں اپنی تخت نشینی (باقی حاشیہ صفحہ ۶۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں)

مسلمانوں کی ترقی کے بارے میں امام اشعری کا جو نقطۂ نگاہ تھا اُسے اُوپر کا خلاصہ شہرستانی کے فلسفیانہ تجزیے کی بہ نسبت زیادہ واضح کرتا ہے۔

معتزلہ کا مقابلہ خود اُن کے حربے سے کرنے کی خاطر امام اشعری نے اُس کی ٹکر کا ایک علمِ کلام ایجاد کیا۔ یہ مسلمانوں کا حقیقی مدرسی علمِ دین ہے۔ اگرچہ اسے معتزلہ کے ایجاد کیے ہوئے علمِ کلام کی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ بہت سی بنیادی باتوں میں اُس سے مختلف ہے۔ مثلاً بیشتر معتزلی تصوری[1] تھے۔ اس کے برخلاف اشعری متکلّمین یا تو وجودی[2] تھے یا ایک قسم کے اسمی[3]۔ جہاں اشاعرہ کا عقیدہ تھا کہ جہالت کی طرح کی ایک منفی صفت ایک وجود واقعی ہے وہاں معتزلہ یہ کہتے تھے کہ وہ محض ایک صفت کی نفی ہے یعنی تعلیم کا عدم۔ اشعری متکلّمین کا عقیدہ تھا کہ قرآن غیر مخلوق اور قدیم ہے۔ اس کے مقابلے میں معتزلہ کا دعوےٰ تھا کہ قرآن خدا کا وہ کلام ہے جو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت رسولؐ اللہ پر القا ہوا۔ ورنہ ناسخ و منسوخ بے معنی ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ بعد کی بعض آیتوں نے پہلے کی بعض آیتوں کو منسوخ کر دیا تھا۔

اس طرح اشعریت مشرق پر چھا گئی۔ جب روشن خیال بُویَد قصرِ خلافت کے منصرم بنے تو عقلیت کا بغداد میں پھر چرچا ہوا لیکن اشعریت نے عوام کے دلوں پر جو تسلط جما لیا تھا وہ اس کے قبضے ہی میں رہا اور اعتزال کو اپنا پُرانا اقتدار پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ بُویَد عقلیت پسند تھے لیکن سلجوقی علم و فن کی تربیت کرنے کے باوجود مسلکِ اشعریہ کے معتقد تھے۔ رینان[4]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳۸) کرانے کی درخواست کی، چاہے خلیفہ خود کتنا ہی کمزور کیوں نہ تھا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ اُن کی رعایا کے لیے اُن کے خلاف بغاوت یا اُن کی حکم عدولی شرعاً ممنوع ہو گئی۔

[1] Conceptualists

[2] Realists

[3] Nominalists

[4] Averroismet Everrosm

کہتا ہے کہ چونکہ اسلام تاریخ کے ایک اتفاق کی بدولت ہسپانیوں، بربروں اور ایرانیوں جیسی مذہب پرست قوموں کی ملکیت بن گیا اس لیے اُس نے اُن سے ایک شدید قسم کی اذعانیت کا رنگ پکڑ لیا۔"کیتھولک مذہب پر ہسپانیہ میں جو افتاد پڑی وہی اسلام پر پڑی اور اگر وہ مذہبی احیاء جو سولھویں صدی کے اختتام اور سترھویں صدی کے آغاز میں ہُوا قومی ترقی کو روک دیتا تو یورپ پر بھی وہی اُفتاد پڑتی"۔ یہ قول بالکل صحیح ہے۔ ایرانی ہمیشہ اپنے بادشاہوں کو خدا تصوّر کرتے تھے۔ ترک، منگول اور بربر اپنے سرداروں کو خدا کے جانشین سمجھتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ان قوموں کے یہ تصوّرات نہ بدلے۔ ہسپانیوں کے دلوں میں جو تعصب عیسائی پادریوں نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا عرب صدیوں تک اُسے دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ وزیر منصور نے اپنی ہوسِ اقتدار پوری کرنے کے لیے عقلیت کے خلاف آوازِ بلند کی تو جس ہجوم نے بعد میں بنسی خوشی عیسائی بدعتیوں کو سرِعام نذرِ آتش کیا، اُسی نے قرطبہ کے بازاروں میں مسلم فلاسفہ کی تصنیفات کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا۔ صلاح الدین کی فوج ظفر موج اشعریت کو اپنے ساتھ مصر لے گئی۔ اُدھر عقلیت اپنے پُرانے دشمن کے ہاتھوں اپنے آخری مورچوں سے ہٹائی جا رہی تھی، اِدھر امام غزالی[1] رح نے، جن کی تصنیفات کا سب سے بڑا ہدف فلسفے کا مطالعہ تھا، قدامت پرستی کو کمک پہنچائی۔ امام ابوحامد محمد ابن محمد الغزالی بلاشک وشبہ اعلٰی درجے کی قابلیت اور بے داغ سیرت کے مالک تھے۔ انھوں نے دشت فلسفہ کی سیاحی بھی کی تھی اور سائنس کے سمندر کی غوّاصی بھی، بلکہ فکرِ آزاد کا شوق بھی پورا کیا تھا۔ یکایک اُن کے دل میں یہ ولولہ پیدا ہُوا کہ کوئی ایسی مضبوط چٹان ڈھونڈ نکالیں جو اُن کی تھپیڑے کھا کھا کر تھکی ہوئی رُوح کے لیے جائے قرار بنے۔ یہ وہی

---

[1] ۱۰۵۸ء میں فردوسی کی جائے ولادت طوس میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔ ان کی مشہور ترین تصانیف یہ ہیں:۔ "احیاء العلوم"۔ "المنقذ من الضلال"۔ "تہافۃ الفلاسفہ"۔ ابن رشد نے "تہافۃ التہافۃ الفلاسفہ" کے نام سے موخرالذکر کا رد لکھا۔ ملاحظہ ہو گیارھواں باب۔

ولولہ تھا جو اُن کے بعد آنے والے طالبانِ حق کے سینوں میں بھی پیدا ہُوا۔ اس ولولے نے انھیں فلسفی سے صوفی بنا دیا۔ "المنقذ من الضلال" میں جو یا تو اُن کے زبانی خطبات کا مجموعہ ہے یا برادرانِ ملّت کو مخاطب کر کے لکھی گئی، وہ قدرے سادہ لوحی سے بیان کرتے ہیں کہ انھیں علم کا کتنا شوق تھا اور اس کی تلاش میں انھوں نے کیونکر جگہ جگہ کی خاک چھانی، ہر دریا میں غوطے لگائے اور ہر مضمون سے واقفیت بہم پہنچائی اور بالآخر کیونکہ اُن خیالات سے توبہ کی جو ابتدائے عمر ہی سے اُن کے دل میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ وہ رسُولِ اکرمؐ کے اس ارشاد کا حوالہ دیتے ہیں کہ ہر بچّہ فطری حقیقت کا علم لے کر پیدا ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اُن کے دل میں اس حقیقت کو دریافت کرنے کی آرزو تھی۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ کیونکر تشکّک نے اُن پر قبضہ کر لیا اور کیونکر انھوں نے دین و ایمان کی بندیوں پر یعنی صوفیانہ ذکر و فکر اور مجاہدہ و ریاضت میں پناہ لے کر اس سے چھٹکارا پایا۔ ان خطبوں میں امام صاحب نے فلاسفہ پر زبردست حملہ کیا ہے۔ وہ انھیں تین گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۱۔ دہریہ، جو مادّے کو قدیم تصوّر کرتے ہیں اور صانعِ عالم یعنی خدا کے وجود سے منکر ہیں۔

۲۔ طبیعیون، جو ایک خالقِ کائنات کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس بات کے بھی قائل ہیں کہ جب روحِ انسانی جسم سے علیحدہ ہو جائے تو معدوم ہو جاتی ہے اور اس لیے نہ کوئی یومِ حساب ہے اور نہ انسانی اعمال کی جزا و سزا۔ یہ دونوں گروہ امام صاحب کے نزدیک کافر ہیں۔

۳۔ الٰہیون (افلاطون و سقراط) "انھوں نے پہلے دونوں گروہوں کی کُلّیتہً تردید کی ہے اور اس طرح خدا نے سچے مومنوں کو اس مجادلے سے بچایا ہے۔"

بایں ہمہ افلاطون و سقراط کی تکفیر واجب ہے اور اسی طرح اُن مسلم فلاسفہ کی جنھوں نے اُن کی پیروی کی ہے، بالخصوص ابن سینا اور فارابی کی، کیونکہ ان سب کا فلسفہ اس قدر اُلجھا ہُوا ہے کہ اس میں حق کو باطل سے جُدا نہیں کیا جا سکتا تاکہ باطل کی تردید کی جائے۔ ان لوگوں کی جو تصنیفات ہمیں ملی ہیں اُن کی بناء پر علم کو تین شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک

شاخ کے عالموں کو کافر اور دوسری شاخ کے عالموں کو اہلِ بدع کہنا لازم ہے۔ تیسری شاخ کے عالموں کی بابت کچھ کہنا ضروری نہیں"۔ لیکن اس سادگی کے باوجود امام غزالیؒ کی تحریروں میں بہت سی عملی فراست ہے۔ وہ دانشمندی کو اعتقادِ محض پر فوقیت دیتے ہیں اور اس متعصبانہ اذعانیت کی مخالفت کرتے ہیں جو ہر قسم کی عقلی تحقیق اور علم کو رد کر دیتی ہے کیونکہ یہ اذعانیت ان فلاسفۂ الٰہیین میں پائی جاتی تھی جن سے انھیں چڑ تھی، وہ اس اذعانیت کو اسلام کی دوستیٔ ناداں کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے شخصی آزادی، ضبطِ اخلاقی، تزکیۂ نفس، عملی احسان و مروّت اور نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں جو باتیں کہیں اور اپنے وقت کے مُلّاؤں کی اخلاق سوز اور بے مصرف زندگیوں کی جس طرح مذمت کی یہ سب چیزیں اُن کی نیک سیرتی کی گواہی دیتی ہیں[1]۔

اس وقت سے عقلیت اور مقلدیت میں ایک پیہم آویزش شروع ہو گئی۔ ابن سینا کی جو تصنیفات اور اخوان الصفا کے جو رسالے سرکاری یا نجی کتب خانوں میں تھے وہ سب کے سب ۱۱۵۰ء میں خلیفہ مستنجد کے حکم سے جلا دیئے گئے۔ ۱۱۹۲ء میں حکیم الرکن عبدالسلام پر دہریت کا الزام لگایا گیا اور اس کی کتابیں عوام اور ملاؤں نے مل کر سرِ بازار جلائیں۔ جس ملا نے اس تقریب کی صدارت کی اُس نے ایک کرسی پر کھڑے ہو کر فلسفے کے خلاف ایک دھواں دھار وعظ دیا۔ لوگ کتابیں اُٹھا اُٹھا کر اُسے دیتے جاتے تھے اور وہ اُن کے کفر کے بارے میں چند کلمات کہہ کر اُنھیں آگ میں پھینکتا جاتا تھا۔ ابنِ میمون کا ایک شاگرد اس عجیب و غریب منظر کے تماشائیوں میں تھا۔ اُس کی روداد پڑھنے کے قابل ہے:۔

"میں نے اس عالم کے ہاتھ میں ابن الہیثم کی ہیئت پر تصنیف دیکھی۔ لوگوں کو وہ دائرہ دکھا کر جس سے مصنف نے کرۂ سماوی کو ظاہر کیا تھا، عالم نے بڑے غیظ و غضب سے کہا "ہیہات! ہیہات! غضب! غضب!"

اور یہ کلمات کہہ کر کتاب کو آگ میں جھونک دیا"۔ بہرحال نہ امام غزالیؒ کی شخصیت

---

[1] ملاحظہ ہو گیارھواں باب۔

نہ بادشاہانِ وقت کی تقلید پروری (اگرچہ اُن میں سے بعض درپردہ عقلیت پسند تھے) عقلیت کو بالآخر جامد تقلید پر غالب آنے سے روک سکتی، اگر اس اثناء میں منگول آکر تقلید کا پلہ بھاری نہ کر دیتے۔ "ایک خان، ایک خدا۔ جس طرح خان کا فرمان اٹل ہے اُسی طرح خدا کا حکم بھی اٹل ہے"۔ جب اس نظریے کی پشت پر لاکھوں تلواریں تھیں تو کیا اس سے بہتر کوئی برہانِ قاطع ہو سکتی تھی ؟ عقلیت، فلسفہ، سائنس، علوم و فنون سب بربریت کے اس سیلاب میں بہہ گئے اور ہمیشہ کے لیے بہ گئے۔ روشنی کی وہ شعاعیں جو ہم نے ہلاکو کے جانشینوں کے تحت مغربی ایشیا میں چمکتی دیکھی ہیں وہ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں تھیں۔ ملکی تدبیر نے انتہائی تعصب سے کام لے کر عالمِ اسلام میں عقلیت اور فلسفے کو عود کر آنے سے روک دیا۔ فقیہہ اور مقنن نہ صرف خود صاحبِ اقتدار تھے، بلکہ آمریت و جابریت کی پشت پناہ بھی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ملائیت اور تقلید پرستی نے بیشتر مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا اور رفتہ رفتہ اُن کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے۔ وہ ملائیت کی عینک لگائے بغیر کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے۔ ہادیٔ اسلام نے عقل سے کام لینے کی تلقین کی۔ آپؐ کے متبعین نے اُس سے کام لینے کو گناہ قرار دے دیا ہے۔ آپؐ نے انسان پرستی اور انسانوں سے غلوآمیز عقیدت کی ممانعت کی۔ اہلِ سنّت نے سلف اور اپنے ائمۂ اربعہ کو اور اخباری شیعوں نے اپنے مجتہدین کو ولایت کا درجہ دے دیا ہے۔ دونوں نے ان بزرگوں کی تعلیمات سے کسی قسم کے انحراف کو گناہ قرار دے رکھا ہے چاہے وہ انحراف ہادیٔ اسلامؐ کی اپنی تعلیمات سے اور عقل کے تقاضوں سے کتنی ہی مطابقت کیوں نہ رکھتا ہو۔ پیغمبرؐ نے کہا تھا کہ "بھوت پریت اور اس قسم کی چیزیں اسلام سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں"۔ آپؐ کے پیرو ان چیزوں پر راسخ ایمان رکھتے ہیں آپؐ نے انھیں کافروں کے ملکوں میں جا کر علم کی تلاش کرنے کی تاکید کی تھی لیکن انھیں اپنے ملک میں بھی علم دیا جائے تو وہ اُسے وہاں بھی قبول نہیں کرتے۔

صفویوں کے عہد میں عقلیت اور فلسفے نے دوبارہ زندگی پائی۔ اوّلین عبّاسیوں کے عہد کی سی توانائی کے ساتھ تو نہ سہی۔ بارھویں صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی تک ایران پر بہت بُرا وقت گزرا تھا اور اس تاریک دور میں شیعہ ملاؤں نے سُنّی فقیہوں سے بھی بڑھ کر

وہی اقتدار حاصل کر لیا تھا جو عیسائیت میں پادریوں کو حاصل تھا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اُئمہ فاطمیہ کے جانشینوں کی حیثیت سے وہ قوانینِ شریعت کی تشریح کے واحد اور مطلق مختار تھے۔ ملّا صدرہ نے (جن کا تذکرہ میں اصولی عقائد کی، یعنی دینِ محمدیؐ کی جیسا کہ پیغمبرؐ کے اوّلین جانشینوں نے اُسے سمجھا اور قبول کیا، تجدید کے سلسلے میں کر آیا ہوں) اپنے ہم وطنوں میں فلسفہ اور سائنس کے مطالعے کو دوبارہ رواج دینے کی کوشش کی۔ یہ ایک آسان کام نہ تھا، لیکن انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور فراست سے اخفیں نبٹایا۔ ابن سینا کا فلسفہ پھر سے زندہ ہو گیا اور ایران کے سیاسی تغیّرات، انقلابوں کے دورِ اقتدار کے کُشت و خون اور قاچاریوں کے تخت نشین ہونے کے باوجود اس کا تسلّط شائستہ طبقوں پر ابھی تک قائم ہے۔ سینائی فلسفے کی ایک بہترین کتاب عبدالرزّاق بن علی بن الحسین لاہیجی نے شاہ عبّاس ثانی[1] کے عہدِ حکومت میں "گوہرِ مراد" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب میں اس نے ابنِ سینا کے خیالات کا خلاصہ پیش کیا ہے اور حضرت علیؓ، اُن کے جانشینوں اور امام فخرالدین رازی، نصیرالدین طوسی، امام تفتازانی اور دوسرے حکماء اور طبیعیات دانوں کی آراء کے حوالے سے اُن کی تشریح بھی کی ہے۔

عبدالرزّاق کی بعض رائیں بڑی دلچسپ ہیں۔ مثلاً معتزلہ اور اشاعرہ سے بحث کے ضمن میں وہ کہتا ہے، "معتزلہ نے علمِ کلام اس مقصد سے ایجاد کیا کہ دین کے احکام اور معاشرے کے تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کریں اور عقلی اصولوں سے قرآن کی آیات کی اور ایسی روایات کی جو بظاہر غیر معقول معلوم ہوتی ہیں تفسیر و توضیح کریں۔ اُن کا مخالف فرقہ کسی حد تک تعصب اور کسی حد تک مصلحت کی بناء پر قرآنی آیات اور احادیث کو لغواً قبول کرنے کا قائل تھا اور اس نے ہر قسم کی تاویل کو ممنوع قرار دیا، معتزلہ کی تاویلوں اور ان کی تمام رایوں کو بدعت کہا، معتزلہ کو مستبدعین

---

[1] اس بادشاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عظیم پیش رو شاہ عباس اوّل کی طرح تمام مذاہب سے رواداری برتتا تھا۔ اس معاملے میں اپنے اصولِ عمل کو وہ اکثر ذیل کے الفاظ میں بیان کیا کرتا تھا: "لوگوں کے دلوں کا محاسبہ میرا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ خالقِ کائنات اور مالکِ کُل کی عدالت کے معاملوں میں میں کبھی دخل نہیں دوں گا۔"

کا لقب دیا اور اپنے آپ کو معتزلہ کے مقابلے میں اہلِ سنت والجماعت کے نام سے موسوم کیا۔ اُن میں سے بہت سے خدا کو ایک وجودِ جسمانی سمجھنے کے گناہ میں مبتلا ہو گئے ہیں اور سب کے سب تشبیہ کی معصیت میں ڈوبے ہوئے ہیں ——— یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ اُنھوں نے تاویل کا دروازہ بند کر دیا ہے اور خدا کے تخت نشین ہونے سے متعلق آیتوں اور رویتِ الٰہی کے بارے میں روایتوں کی تفسیر لُغوی معنوں میں کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ان سے تجسیم اور تشبیہ استنباط کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس شروع شروع میں منطقی دلائل پیش کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا، وہ صرف قرآن اور احادیث کے لُغوی الفاظ پر اعتماد کرتے تھے۔ انھیں یہ طریقہ ابوالحسن الاشعری نے سکھایا جو معتزلہ کے کبائرِ ائمہ میں سے ایک یعنی ابو علی جُبّائی کا ایک ممتاز شاگرد تھا۔ ابوالحسن نے منطق اور استدلال میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ اس نے مذہب اعتزال کو ترک کر کے اہلِ سنّت والجماعت کا مسلک اختیار کیا اور اس فرقے کو جو اس کے زمانے تک کوئی اثر و نفوذ نہ رکھتا تھا، ترقّی دینے کی سعیِ بلیغ کی۔ اُس وقت سے یہ فرقہ اُسی کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس نے اہلِ اعتزال کے نمونے پر قواعد و ضوابط مرتّب کیے .... جابر خلفاء نے اس مذہب کے قواعد کو اپنی مصلحتوں کے موافق پا کر اس کی حمایت کی۔ چنانچہ اس طرح اشعریت اہلِ اسلام میں پھیل گئی۔ لیکن چونکہ اعتزال کے قواعد اصولِ عقلیہ پر مبنی تھے، اس لیے وہ بہت سے طالبانِ حق کے دلوں میں جاگزیں ہو گئے اور چونکہ معتزلہ نے فلسفہ اور سائنس کی تصنیفات کا غائر مطالعہ کیا تھا لہٰذا وہ مابعد الطبیعیاتی اور الٰہیاتی مسائل پر بحث کرتے وقت اُن سے دلائل پیش کرتے تھے۔ جب اشاعرہ کو اس کا علم ہُوا تو چونکہ وہ ہر ایسی چیز کو جو صدرِ اسلام میں معمول نہ تھی بدعت سمجھتے تھے، اس لیے اُنھوں نے فوراً کُتبِ حکمت کے مطالعے کو خلافِ شرع اور مضرِ دین قرار دے دیا۔ یہ اُسی فرقے کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ فلسفہ اہلِ اسلام میں اِس قدر غیر مقبول ہو گیا کہ علمائے معتزلہ نے بھی اس سے اجتناب شروع کر دیا۔ لیکن فلسفے کی اس مخالفت کے اصلی مؤسس اشاعرہ ہی تھے کیونکہ فی الحقیقت فلسفہ کسی صورت بھی دین اور اسرارِ قرآن و احادیث کے منافی نہیں

انبیاء اور اُن کے اوصیاء نے حکمت کے حقائق کی تشریح کی ہے اور یہ حقائق تمثیلاً قدسی ہیں "......... "انسان کے مختارِ عمل ہونے کے بارے میں تین مذاہب ہیں ۔ پہلا نظریہ جبر کا ہے اور یہ اشاعرہ کا مذہب ہے : ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی اعمال بلا واسطہ خدا کے خلق کردہ ہیں اور ان میں انسانی ارادے کو کوئی دخل نہیں ۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آگ جلائے تو وہ آگ کو بھی خدا کی جلائی ہوئی کہتے ہیں " پھر اس نظریے کی اخلاقی مضرت کو بے نقاب کرنے کے بعد عبدالرزاق کہتا ہے : " دوسرا مذہب یعنی تفویض کا نظریہ بعض اہلِ اعتزال نے اختیار کیا ، جو اس کے قائل ہیں کہ انسان نیک و بد میں تمیز کرنے کی قابلیت اور ان میں سے ایک پر عمل کرنے کی پوری پوری قوت رکھتا ہے ۔ تیسرا مذہب ائمۂ فاطمیہ کا اور فلاسفہ وعلمائے عقلی کی اکثریت کا ہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ انسانی افعال بلا واسطہ خدا کے خلق کردہ ہوتے ہیں لیکن خدا بتاتا ہے کہ کونسا کام نیک ہے اور کونسا بد "........

عیسائیت میں ، جو کلیسا صحیح العقیدہ ہونے کا مدعی ہے اُس کی جو موجودہ حالت ہے ہمارا دل بے اختیار چاہتا ہے کہ اس کا مقابلہ اس فرقے کی موجودہ حالت سے کریں جو اسلام میں اسی طرح کی حیثیت کا مدعی ہے ۔ چوتھی صدی سے لے کر ، یعنی جب سے اس کی بنیاد رکھی گئی ، لُوتھر کی بغاوت تک کیتھولک مذہب نے اپنے آپ کو سائنس ، فلسفہ اور علم و تعلیم کا جانی دشمن ثابت کیا ۔ اس نے بدعت کے الزام پر لاکھوں انسانوں کو نذرِ آتش کیا ۔ جنوبی فرانس میں فکرِ آزاد کی پہلی تتلاہٹوں کا گلا گھونٹ دیا اور عقلی دینیات کی تمام درسگاہیں جبراً بند کر دیں لیکن لُوتھر اور کیلون کے رخنۂ عظیم کے بعد کیتھولک مذہب پر یہ منکشف ہُوا کہ نہ سائنس کی تربیت نہ فلسفے کا مطالعہ اہلِ ایمان کو کافر بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ اُس نے اپنی بنیادوں کو وسیع کیا اور اب اس کے دائرے میں بڑے بڑے عالی ظرف اور وسیع الخیال لوگ ہیں ۔ سائنس دان بھی ، ادیب بھی ، عالم بھی ۔ باہر کے کسی آدمی کو وہ اصلاح یافتہ عیسائی کلیساؤں سے بھی زیادہ آزاد خیال دکھائی دیتا ہے ۔ اسلام نے پانچ صدیوں تک نوعِ انسانی کی آزادانہ نشوونما کی اجازت دی ، لیکن اس کے بعد اس میں ایک رجعت پسندانہ تحریک شروع ہو گئی اور انسانی فکر کے دھارے کا رُخ یکایک بدل گیا ۔ سائنس اور فلسفے سے شغف رکھنے والے لوگ

دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیئے گئے۔ کیا سنّی مذہب کے لیے کلیسائے روم سے سبق لینا ناممکن ہے؟ کیا اس کے لیے یہ محال ہے کہ کلیسائے روم سے عبرت پکڑ کر اپنے آپ کو زیادہ وسیع اور کثیر الاطراف بنائے؟ تعلیماتِ محمدی میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کو مانع ہو۔ اسلام کا پروٹسٹنٹ مسلک اپنے ایک مرحلے میں یعنی اعتزال کے دور میں اس کی راہ پہلے ہی سے ہموار کر چکا ہے۔ اہلِ سُنّت کا عظیم مذہب اپنے پُرانے طوق و سلاسل کو کاٹ کر کیوں نہیں پھینک دیتا اور آزاد ہو کر ایک نئی زندگی کا آغاز کیوں نہیں کرتا؟

گیارھواں باب

اسلام کی صوفیانہ اور مثالی رُوح

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ

وہ صوفیانہ فلسفہ جو جدید فارسی کی رُوح رواں ہے صریحاً اس مخفی معنویت کی پیداوار ہے جو مسلمانوں کا ایک اہم طبقہ قرآن کے الفاظ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اسلامی تصوف کا اصلی سرچشمہ نفوسِ قدسی کا وہ سرشار جذبہ ہے جو رسولِ خدا کے کلام سے اکثر ٹپکتا تھا اور وہ سوز و گداز اور ذوق و شوق سے بھری ہوئی وجد کی سی کیفیت جو آپ کی عبادات کی خاصیت تھی۔ آپ کی زندگی میں عملی فرائض کی انجام دہی کو دینی فکر و نظر پر ترجیح دی گئی۔ اس لیے اسلام کے متفکرانہ اور صوفیانہ عنصر کو مکمل نشوونما کا موقع نہ ملا۔ یہ متفکرانہ اور صوفیانہ عنصر ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے لیکن یہ افراد اور اقوام کے طبعی خصائص کے مطابق مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے اور اس کا دارومدار بڑی حد تک اس پر ہوتا ہے کہ ان میں مجردات اور محسوسات کو باہم خلط کرنے کا رُجحان کہاں تک ہے۔ ہندو متناہی کے لامتناہی میں جذب ہو جانے کو سعادتِ اُخروی تصور کرتا ہے اور اس منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کی خاطر ایک ہی مقام پر ساکن رہتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل بے حسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ لامتناہیت کا جو احساس اس پر مستولی ہے اُس کے باعث اس کے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وحدت اور دیوتاؤں یا اپنے آپ میں اور دیوتاؤں میں تمیز کر سکے۔ بالآخر وہ خدا کو ان مختلف صُوَرِ منظری سے خلط ملط کر دیتا ہے جن میں اس کے عقیدے کے مطابق خدا اپنے آپ کو آشکارا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ خیال جیسا کہ بھگوت گیتا سے ظاہر ہے اس نتیجے پر ختم ہوتا ہے کہ خالق و مخلوق ہم ذات ہیں۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہمہ اوست کا عقیدہ کیسے عجیب طور پر اپنی انتہائی

شکل میں مادی چیزوں کی پرستش بن جاتا ہے جو الہیت کے ہر دوسرے تصور سے پہلے وجود میں آئی۔ اپنے عہدِ طفلی میں نفسِ انسانی خالص خوف کے سوا کسی روحانی جذبے سے آشنا نہیں ہوتا۔ دنیا کے اولین دور کا جنگل جسے انسان نے ابھی ہاتھ نہیں لگایا، اونچے اونچے پہاڑ جو بھیانک دیوؤں کی طرح راستہ روکے کھڑے ہیں، رات کا اندھیرا جس میں ڈراؤنی اور انجانی شکلیں منڈلاتی پھر رہی ہیں، درختوں کی پھننگوں میں چیختی دھاڑ مچاتی ہوئی ہوا — یہ سب چیزیں ابتدائی انسان کے طفلانہ دل پر خوف اور ہیبت طاری کر دیتی ہیں۔ چنانچہ جو مادی چیز بھی اُسے اپنے یا اپنے قریبی ماحول سے زیادہ طاقت ور اور خوفناک دکھائی دیتی ہے وہ اُسی کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ مادی چیزوں کو خیالی ہستیوں میں تبدیل کرنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ان خیالی ہستیوں کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ یہ مختلف خیالی ہستیاں ایک عالمگیر اور محیطِ کُل خیال میں ضم ہو جاتی ہیں۔ بُت پرستی سے اُوپر کی طرف پہلا قدم مادی وحدت الوجود ہے۔

افلاطونیت جدیدہ نے، جو خود مشرقی فکر کی پیداوار تھی، عیسائیت کو متاثر کیا تھا اور غالباً عشائے ربانی کا تصور اسی کا نتیجہ تھا۔ جوہینز سکوٹس (Johannes) (Scotus) اور ایکھارٹ (Eckhart) کے سوا قرونِ وسطیٰ کے نام یورپی صوفیہ نے صرف اس مسئلے کے خلاف جہاد کیا تھا۔ صحیح معنوں میں تصوف بڑا محدودیت کی ایک بلند ہمت آرزو ہے مسلمانوں کے نظریۂ "نورِ باطن" کی بدولت وجود میں آیا۔ عالمِ اسلام کے اشرف نفوس کا جو یہ خیال تھا کہ قرآن کے الفاظ میں کوئی عمیق تر مطلب پنہاں ہے یہ خیال قرآن کے ظاہری متن کی سخت گیری سے فرار کی خواہش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کا سرچشمہ یہی ایمان تھا کہ عام مفسرین عباراتِ قرآنی کا جو مفہوم بیان کرتے ہیں اُن میں اُس سے کم نہیں بلکہ زیادہ معانی ہیں۔ ایک تو یہ ایمان اور دوسرے ذاتِ باری کے ہر چیز میں ساری ہونے کا گہرا احساس، جو قرآن کی تعلیمات اور صاحبِ قرآن کی ہدایات سے پیدا ہوا اور اُن سے پوری پوری مطابقت رکھتا تھا — ان دونوں نے مل کر مسلمانوں کے یہاں وہ استغراقی اور عینی فلسفہ پیدا کیا جسے تصوف کا نام دیا گیا ہے اور جسے غالباً افلاطونیت

جدیدہ کے خیالات نے جو مسلمانوں میں رائج تھے پھیلنے میں مدد دی۔ مشرق میں امام غزالیؒ اور مغرب میں ابنِ طفیل اسلامی تصوّف کے سب سے بڑے علم بردار تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، امام غزالیؒ نے ہر اس نظامِ فلسفہ کو جو علم کی بنا تجربے یا عقل پر رکھتا تھا ناقص پاکر تصوّف کا دامن پکڑا تھا۔ ان کے اثر و نفوذ کی بدولت تصوّف مشرقی مسلمانوں میں پھیل گیا اور مشرقِ اسلامی کے سب سے بڑے ذہنوں نے فلسفے کو شوق سے قبول کیا۔ مولانا جلال الدین رُومیؒ[1] جن کی مثنوی صوفیا کی حرزِ جان ہے، سنائی جسے خود رُومی نے اپنا اُستاد مانا ہے[2] فریدالدین عطّار، شمس الدین حافظ، خاقانی، سعدی، نظامی، یہ سب اسی دلبستان کے رُکن ہیں۔

لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ امام غزالیؒ مسلمانوں میں پہلے شخص ہیں جس نے "نورِ باطن" کا تصور پیش کیا۔ عرفانِ الٰہی اسلام کے مایۂ خمیر میں مضمر ہے۔ قربتِ الٰہی کی نیت حقیقی عبادت کا ایک لازمی مقدمہ ہے۔ معراجِ نبویؐ کے معنی ہی تھے محدود کا لامحدود سے کامل ربط۔ صرف یہی نہیں کہ خدا اُن لوگوں کے دلوں سے کلام کرتا ہے جو خلوصِ نیت سے اُس کی مدد اور ہدایت کے طالب ہوں بلکہ ہر قسم کے علم کا منبع عقلِ کُل ہے۔ انبیا پر علم کا القا وحی کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ اور خدا تعالےٰ اکثر اپنے خاص الخاص بندوں کو فی سریرۃ قلبی اکسی متوسل کے بغیر علم بخشتا ہے۔ اسلام کی اصطلاح میں اُسے علم لدنی کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے "وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا" (کہف۔ ۶۵) خدا سے رابطۂ قربی کا یہی تصور ایک مشہور حدیث میں بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق خدا تعالےٰ فرماتا ہے:

"میری زمین اور میرے آسمان مجھ کو احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن میں اپنے مومن متقی اور

---

[1] رومی کا ایک اخلاقی قصہ۔ جس کا موضوع خدمتِ بشر ہے، لی ہنٹ (Leigh Hunt) نے اپنی ایک نظم میں بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔

[2] ضمیمہ سوم ملاحظہ کیجیے:

متورع بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔"[1]
مَاوسعنی ارضی ولا سمائی ولکن وسعنی قلب عبدی المؤمن التقی النقی الورع ..."
اور دلِ انسانی نشاطِ عبادت میں اس خدائی وعدے کا جواب یوں دیتا ہے: " سَمِعَ اللہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ۔"
یہی مادرائیت دوسری حدیثوں میں پائی جاتی ہے۔ حضرت علیؓ اپنے مواعظ میں نورِ باطن پر بحث کرتے ہیں۔[2] حضرت فاطمۃ الزہرا اپنے خطبات میں اس کا ذکر

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ دوم۔ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن (Dr.Renold Nicholson) نے بھی اپنی کتاب "صوفیائے اسلام" Studies in Islamic Mysticism میں یہ روایت نقل کی ہے۔ یہ تصنیف، جو ایک ایسے عالم کی لکھی ہوئی ہے جو صوفیانہ ادب سے واقفیت میں یورپ بھر میں کوئی ہمسر نہیں رکھتا، انسانی تصوف کا ایک عمدہ خلاصہ پیش کرتی ہے۔

[2] "نہج البلاغۃ" کی دو شرحیں ہیں، ایک ابن ابی الحدید کی اور دوسری فارسی میں نعمت اللہ کاشانی کی۔ ابن ابی الحدید اپنی شرح کے دیباچے میں اپنا پورا نام یوں دیتا ہے " ابو حامد عبدالحمید بن ہبۃ اللہ بن محمد بن محمد بن حسین بن ابی الحدید"۔ وہ مدائن میں ذی الحج ۵۸۶ھ (دسمبر ۱۱۹۰ء) میں پیدا ہوا۔ وہ معتزلی بھی تھا اور شیعہ بھی اور دیباچے میں اس کا صریحاً تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ اوّل درجے کا فقیہ، عالمِ متبحر، متکلّم اور شاعر تھا۔ خلفاء ناصر اور ظاہر کے تحت وہ الیوان میں کسی عہدے پر مامور تھا۔ ابن خلکان (ڈی سلین De-Slane، جلد سوم، صفحہ ۵۴۳، سوانح ضیاء الدین ابن الاثیر) اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے " فقیہہ عزّالدّین ادیب"۔ لیکن وہ ابن الحدید کی عظیم تصنیف یعنی شرحِ " نہج البلاغۃ" کا نام نہیں لیتا۔ وہ یہ بھی نہیں بتاتا کہ ابن ابی الحدید معتزلی اور شیعہ تھا۔ ابن ابی الحدید اپنی شرح کے آغاز میں، جہاں وہ کہتا ہے کہ خدا کا شکر بجالانا اور اس کی عبادت کرنا انسان کا فرض ہے، رویت الباری فی الآخرت یعنی روزِ قیامت خدا کے جسمانی آنکھوں سے دیدار کے بارے میں اشاعرہ کے عقیدے کی تردید کرتا ہے۔ ابن ابی الحدید نے ۶۵۵ھ (۱۲۵۷ء) میں بغداد میں وفات پائی یعنی منگولوں کی تاختِ بغداد سے ایک سال پیشتر (فارسی ایڈیشن، تیاسا ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا)۔

کرتی ہیں[1] اور سیّد الشہداء امام حسینؓ کی مناجاتیں تو اس کی تجلّی سے لبریز ہیں[2]۔ لیکن ان ابتدائی تحریروں میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ رسول اللہؐ نے یا آپؐ کے وصیِ رُوحانی نے تلاشِ حق کی خاطر کاروبارِ دنیا کو ترک کرنے اور رُہبانیت اختیار کرنے کی تلقین کی۔ اس کے برعکس رسول اللہؐ نے تو سختی سے رُہبانیت کی مذمت کی[3]۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی تصوّف اس جادۂ ممنوع پر گامزن ہو گیا۔ رُوحانی کمال[4] حاصل کرنے کی کوشش میں بہت سے مسلمانوں نے یہ نکتہ فراموش کر دیا ہے کہ انسانی زندگی کا دارومدار پیہم عمل پر ہے۔ یہ کیونکر ظہور میں آیا اس کی رُوداد دلچسپی سے خالی نہیں۔

نہ عیسائیت میں نہ اسلام میں تصوّف کوئی نیا مسلک ہے۔ یونانی دنیا میں بھی تھا اور یہودی بھی اس سے ناآشنا نہ تھے۔ آریائی ہندوستان میں تو یہ حدود سے تجاوز کر گیا اور اس پر لاتعداد صورتوں میں عمل ہوتا تھا۔ ہندوستان سے چل کر یہ مغربی اور وسطی ایشیا میں پہنچا، جہاں اُس نے عجیب و غریب رُوپ دھارے۔ جہاں کہیں اس نے رنگ جمایا وہاں اس نے لوگوں کو یہی سکھایا کہ خارجی دُنیا سے کوئی واسطہ نہ رکھیں، خاندانی رشتوں اور ذمّہ داریوں کے بندھن توڑ دیں اور ہر چیز سے منہ موڑ کر صرف ایک چیز سے لَو لگائیں۔ اس کا سارا نچوڑ ہی ترکِ دنیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کا پیغام صوفیوں کی صدیوں پُرانی تعلیم کی ایک صدائے بازگشت تھا۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے اس کے برخلاف خدمتِ بشر کو وہ عبادت کہا جو خدا کے

---

[1] "لمعۃ البیضا"

[2] صحیفۂ کاملہ

[3] آنحضرتؐ اور متقدمین صحابہؓ ذرات کا بیشتر حصّہ عبادت میں اور دن کا بیشتر حصّہ لوگوں کے کاموں میں صرف کرتے تھے۔ یہی حال پانچویں اُموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا تھا جو بہت سے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت ولی کے لقب کے زیادہ مستحق ہیں۔

[4] یعنی صوفیہ کی اصطلاح میں "انسانِ کامل" بننے کی کوشش میں۔

نزدیک سب سے زیادہ مقبول ہے۔ آپ کا پیغام پُرانے تصورات کی عین ضد تھا۔

بدقسمتی سے حضرت علیؓ کی شہادت[1] اور خلافتِ راشدہ کے ختم ہوجانے کے بعد عالمِ اسلام میں جو ہنگامے برپا ہوئے، مدینے کی تباہی نے جو مصیبتیں مسلمانوں پر نازل کیں اور دمشق کے اُموی خلیفوں کے تحت جو بے لگامیاں معاشرے میں عام ہوگئیں، ان سب اسباب نے سنجیدہ مزاج مسلمانوں کو اس پر مجبور کیا کہ گوشۂ اعتکاف میں بیٹھ کر یادِ خدا میں مصروف رہیں۔ تقوے سے توکّل تک صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ چنانچہ اس کے بعد مسلکِ تصوّف کی جو نشوونما ہوئی وہ ایک قدرتی سلسلۂ واقعات تھی۔ خرقۂ درویشی کا توبہ اور ترکِ دنیا کے امتیازی لباس کے طور پر اختیار کرنا ایک پُرانی رسم ہے جو قرونِ اُولیٰ سے چلی آرہی[2] ہے۔ رُوحانی ترقی کے بارے میں صوفیہ کا جو نظریہ ہے وہ مکمل ترکِ نفس اور ذکر و فکرِ الٰہی میں پورے انہماک پر مبنی ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ اس انجذاب اور توجہِ قلب سے[3] وہ ذاتِ باری کا قرب اور حق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس

---

[1] ملاحظہ کیجیے صفحہ ۱۳۰ ، ۱۳۱ ، ۱۳۲ Short History of the Saracens

[2] عیسائیت میں بھی ٹاٹ کے جامے یا بالوں کے پیراہن کا یہی مصرف تھا۔ خرقہ تکیے کے غلاف کی طرح کا ایک لمبا سا لبادہ ہے۔ "صوف" کے معنی ہیں اُون اور صوفیوں کو یہ نام اسی لیے دیا گیا کہ وہ اُونی کپڑے پہنتے ہیں۔ لفظِ "صوفی" اہلِ صُفّہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، جو مسجدِ نبوی کے باہر پڑے رہا کرتے تھے اور جنھیں رسُولِ کریمؐ اپنے ہاتھ سے کھانا تقسیم کیا کرتے تھے۔ اخوان الصفا سے بھی اُسے کوئی مناسبت نہیں۔

[3] روایت ہے کہ ابوسعید بن ابوالخیر، جو زمرۂ صوفیہ میں بلند مقام رکھتے ہیں، ہندو یوگیوں کی طرح اپنے نفس کو اپنی ناف پر مرکوز رکھا کرتے تھے۔ ابوسعید بن ابی الخیر کی ایک نہایت عمدہ سوانحِ عمری ڈاکٹر نکلسن (Dr.Nicholson) نے اپنی کتاب Studies in Islamic Mysticism میں دی ہے۔ پروفیسر ای جی براؤن Professor E.G. Browne کی Literary History of Persia بھی ملاحظہ کیجیے۔ (باقی حاشیہ صفحہ ۶۵۳ پر ملاحظہ فرمائیں)

عقیدے نے جہاں بہت سے پارسا اور خدا پرست لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی زندگی دین کے لیے وقف کر دیں؛ وہاں اس نے انوکھے اور بے ڈھنگے خیالات کا ایک طوفان بھی برپا کر دیا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ اور ائمۂ بیت النبیؐ کو اعلیٰ درجے کا علمِ باطن عطا ہُوا تھا۔ ابونصر سراج اپنی کتاب "اللمعہ"[1] میں حضرت جُنید بغدادی[2] کے حوالے سے کہتا ہے کہ اگر حضرت علیؓ جنگ و جدل میں مصروف نہ رہتے تو اللہ نے انھیں علمِ لَدُنی کی جو دولت بے پایاں بخشی تھی اس سے وہ دنیا کو مالا مال کر دیتے۔[3] خواجہ فریدالدین عطارؒ اپنے "تذکرۃ الاولیاء"[4] میں امام جعفر صادقؒ کو اولیائے متصوّفین میں سب سے اُونچا درجہ دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ تقریباً ہر صوفی ولی کا رُوحانی سلسلہ حضرت علیؓ سے اور اُن کی وساطت سے آنحضرتؐ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵۳) کہتے ہیں کہ ابوسعید بن ابی الخیر ابن سینا کے ہم عصر تھے۔ اُن کی وفات ۱۰۴۹ء میں ہُوئی۔

[1] "اللمعہ فی التصوف" Studies in Islamic Mysticism کے فاضل مصنف نے حال ہی میں بڑی کاوش اور علمیت سے کام لے کر اس کتاب کی تالیف کی ہے۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی (نفحات الانس، کلکتہ ایڈیشن، صفحہ ۲۱۹) کے قول کے مطابق السرّاج کو صوفی اولیاء میں بڑا اُونچا مقام حاصل ہے۔ جامی کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کا ریاضیات دان اور علومِ مجرّدہ کا عالمِ متبحّر بھی تھا۔ السرّاج کی وفات ۳۷۸ھ (۹۸۸ء) میں ہوئی، یعنی امام غزالیؒ کی وفات سے ایک سو سال پہلے۔

[2] "اللمعہ" صفحہ ۱۲۹۔ حضرت جُنید اسلام کے اوّلین صوفیاء میں تھے۔ اُن کی وفات ۲۹۷ھ (۹۱۰ء) میں ہوئی۔ انھوں نے فرمایا: "صوفیوں کا نظام عقائد دین کے ایمانیات اور قرآن سے ایک راسخ رشتے میں مربوط ہے (ابن خلکان)

[3] وہ حضرت علیؓ کو "رموز دانِ خدا" کہتا ہے۔

[4] ملاحظہ ہو صفحہ ۵۷۸ خواجہ فریدالدین عطّار ۵۴۵ء (باقی حاشیہ صفحہ ۶۵۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

سے جا ملتا ہے۔ صرف چند ایک کا سلسلہ حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے۔

پہلی دو اسلامی صدیوں میں جو مقدّس لوگ تھے وہ اتنے صوفی نہ تھے جتنے اربابِ زُہد تھے۔ اُنھوں نے دنیا ترک کر کے زہد و تقویٰ اختیار کیا تھا۔ اُن کے ممتاز نمائندے ہیں، امام حسن بصریؒ[۱]، ابراہیم بن ادہمؒ[۲]، معروف کرخیؒ[۳]، جنیدؒ[۴]، رابعہؒ[۵] (جن کا نام اسلام کی مقدّس خواتین کی فہرست میں ممتاز ہے) بایزید بسطامی اور متعدد دوسرے صوفیہ۔ تیسری صدی ہجری میں، یعنی حضرت جنیدؒ کے زمانے میں، تصوّف فلسفۂ اسلامی کی ایک مسلّمہ شاخ بن چکا تھا لیکن چونکہ اس میں فکری بے راہ روی کی بہت گنجائش تھی اس لیے اُس نے مختلف لوگوں کے ذہنوں میں غیر اسلامی شکلیں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ پیدا اسنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵۴) (۵۰۱۱ء) میں پیدا ہوئے اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ منگولوں کے ہاتھوں ۶۲۷ھ (۳۰ - ۱۲۲۹ء) میں شہید ہوئے۔

[۱] بانیٔ اعتزال واصل بن عطا، امام حسن بصری کا شاگرد تھا۔ امام صاحب کی وفات ۱۱۰ھ (۷۲۸ء) میں ہوئی۔

[۲] ابواسحٰق ابراہیم ابن ادہم ابن منصور کی بابت "تذکرۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ وہ بلخ کے شہزادے تھے۔ اُن کے والد ایک رئیس التجّار تھے۔ اُنھوں نے ترکِ دُنیا کر کے اپنی ساری دولت غریبوں میں لُٹا دی اور زُہد و ریاضت کی زندگی بسر کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔ اُنھوں نے ۱۶۱ھ میں وفات پائی۔

[۳] معروف کرخی کا باپ عیسائی تھا۔ وہ امام علی رضا ابن امام موسیٰ کے ہاتھ سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور اُن کے شاگرد تھے۔ امام صاحب اُن سے پدرانہ شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے (" علی موسیٰ رضا از دستِ رضا بود") معروف کرخی امام صاحب کے مکان کے باہر ایک بلوے میں مشہد میں جاں بحق ہوئے۔

[۴] حضرت جنیدؒ کے وقت تک کیتھولک مذہب کے راہب خانے اور جماعت گاہیں بن چکی تھیں۔

[۵] حضرت رابعہ بصری کی وفات ۱۰۶ھ میں ہوئی۔ انھیں صوفیائے اسلام (باقی حاشیہ صفحہ ۶۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں)

خیالات و تصوّرات کے گڈمڈ ہو جانے سے جو ڈانواں ڈول رجحانات پیدا ہوئے۔ ابونصر سرّاج اُن کی مذمت کرتا ہے۔ مسلکِ تصوّف کے بعض راہ نوردوں نے تو یہ اعلان کر دیا کہ کامل عرفان عارف کو شرع کی تمام پابندیوں سے آزاد کر دیتا ہے[1]۔

ابونصر سرّاج نے امام غزالیؒ سے بھی پہلے صوفیانہ فلسفے کو منظّم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی کوششوں کے باوجود تصوّف اپنی پُرانی عارفانہ اور قلندرانہ روشوں پر گامزن رہا۔ بہرحال اُن پانچ صدیوں میں جو وفاتِ نبوی اور امام غزالیؒ کے خروج کے درمیان گزریں ایسے متعدد افراد منصۂ شہود پر آئے جن کا احترام علم و فضل، زہد و تقویٰ اور اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک امام غزالیؒ کے اُستاد امام الحرمین تھے۔

مشرقی تصوّف میں جو ربط و نظم اور خوبصورتی و دلکشی ہے وہ بڑی حد تک امام غزالیؒ کی مرہونِ منّت ہے۔ وہ بہت بروقت دنیا میں آئے، کیونکہ سُنّی مذہب چند در چند وجوہ کی بنا پر جن سے میں آگے چل کر بحث کروں گا تجدید کا محتاج تھا۔

امام اشعری نے ۳۲۰ھ میں وفات پائی۔ امام غزالیؒ اس کے ۱۲۰ سال بعد، یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے اور اُنھوں نے چالیس برس کی عمر میں احیائے دین کا کام شروع کیا۔ چھٹی صدی ہجری اسلام کی تاریخ کا نازک ترین وقت تھی۔ ایک طرف تو دینِ محمّدیؐ عیسائیت سے ایک جان جوکھوں کی جنگ میں گتھم گتھا تھا اور دوسری طرف ایک اندرونی دشمن اس کے چشمۂ حیات کو مسموم کر رہا تھا۔ حسن بن صبّاح اپنے آپ کو فاطمی خلیفہ نزار کا، جسے اس کے پیرو امام مجسّم سمجھتے تھے، نائب کہتا تھا اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵۵) میں بڑا اُونچا رُتبہ حاصل ہے۔ اُن کے بعد اور خواتین بھی ولایت سے مشرف ہوتی رہیں، جن کا سلسلہ پاک بی بی پر ختم ہوتا ہے جنھوں نے گزشتہ صدی کے لگ بھگ لاہور میں وفات پائی۔

[1] یہ صوفی جو ہندوستان میں درویش کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں، بے شرع کہلاتے ہیں۔

اس بنا پر اپنے پیروؤں سے بے چون و چرا اطاعت کا تقاضا کرتا تھا۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ تعلیم دیتا تھا کہ اُس کی ذات جادۂ حق ہے۔ اُس کے مُرید حشیش کے نشے میں وُحشت اُس کے احکام سے سرِمُو انحراف کئے بغیر اُن کی تعمیل کرتے تھے اور ہوش میں آنے پر انھیں بطور انعام ان نعمتوں کا تھوڑا سا مزہ چکھا دیا جاتا تھا جن کا وعدہ وہ اُن سے آئندہ کی زندگی میں کرتا تھا۔ دُنیا کے ہر گوشے سے جمع کی ہوئی حسین عورتیں اُس کی وہ حورانِ بہشتی تھیں جو اس کے مریدوں کو غلامی کا طوق پہناتی تھیں۔ اُس کے کارکن وسطی اور مغربی ایشیا کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں موجود تھے اور مختلف مقاصد کے تحت، لیکن سب کے سب ایک زبردست محرک کے زیرِ اثر، اس کے تفویض کئے ہوئے کاموں کو انجام دیتے تھے۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں اس ہلاکت پیشہ فرقے کا کوئی نہ کوئی رکن بھیس بدل کر مصروفِ کار نہ تھا۔ نہ دین کی خدمت، نہ علمی فضیلت، نہ پارسائی، نہ نیک سیرتی کسی شخص کو اُن مخربینِ اسلام کے ہاتھوں سے بچانے کی کفیل تھی[1] لاتعداد بہترین اور افضل ترین مسلمان ان دشمنانِ انسانیت کے ہاتھوں جاں بحق ہوئے۔ ان کی تبلیغ صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ یہودی، عیسائی، زرتشتی اور ہندو بھی اُن کے دامِ تزویر میں گرفتار ہو گئے۔ کیا مرد اور کیا عورتیں بلکہ بچے بھی آسمانی نعمتوں کے فوراً مل جانے کے لالچ میں پڑ کر دین سے منحرف ہو گئے۔ ان

---

[1] حسن بن صباح کے فرقے کے تباہ کارانہ رجحانات کا مقابلہ اٹھارھویں صدی کے عیسائی الیومی ناتی (Illumnati) سے کیجئے۔ پروفیسر ای جی براؤن professor E.G. Browne اپنی Literary History of Persia میں ممتاز لوگوں میں سے جو اسمٰعیلیوں کے خنجروں کا شکار ہوتے چند ایک نام گنواتا ہے۔ موسیو گوئیار (M.Guyard) کی کتاب Un grand Maitre Des Assasins au Temps de Saladin کا پہلا باب بھی ملاحظہ کیجئے نیز مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کی لکھی ہوئی حسن بن صباح کی سوانحعمری دیکھئے۔

دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کرنے کی خاطر ضروری ہو گیا تھا کہ اسلام کا تحفظ کرنے والی قوتوں کو نئی زندگی بخشی جائے مسلکِ اشاعرہ ایک جامد ظاہریت اور پابندیٔ مراسم بن کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف ردِ عمل یوں ہوا تھا کہ عوام میں تصوف بے پناہ طور پر پھیل گیا تھا جو کوئی فرائضِ دینی کو ایک بارِ گراں سمجھتا وہ تصوف کی طرف رجوع کرتا جس میں تکالیفِ شرعی سے آزادی تھی۔ لوگوں کے ذہنوں پر خارجی اور داخلی دشمنوں کا ایسا خوف چھایا ہوا تھا کہ فلسفیانہ استدلال سے ان کی ڈھارس نہ بندھ سکتی تھی۔ اخلاقی ضابطے ڈھیلے پڑ گئے تھے اور بلند خیالی کا فقدان تھا۔ اسلام کی زندگی کا یہ نازک مرحلہ تھا جس میں امام غزالیؒ نے مسلمانوں کو صوفیانہ طریقت اور خدا سے براہِ راست لو لگا کر معرفتِ حق حاصل کرنے کی دعوت دی۔ مضطرب اور پریشان دلوں نے اس پر لبیک کہا۔ اس دعوت نے تمام کشمکش رفع کر دی اور صحیح العقیدگی کو حسن صباح کے اسلام کش مبلغوں کی تفرقہ انگیز تعلیمات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا حربہ عطا کر دیا۔[۱]

مشیتِ ایزدی کا یہ ایک قاعدہ ہے کہ جب کبھی کوئی مذہب نری ظاہریت بن کر رہ جاتا ہے تو روحِ انسانی کے اعماق سے کوئی ایسی نئی لہر اٹھتی ہے کہ جس سے اس مذہب میں ایک نئی روحانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ The Forerunners and Rivals of Christianity کا مصنف ایسے لوگوں کے نام گنواتا

---

[۱] پروفیسر گولڈزیہر (Goldziher) نے اپنی کتاب Le Dogme et la loi de l, Islam میں "رہبانیت و تصوف" کے عنوان سے جو فاضلانہ باب لکھا ہے وہ میری نظر سے اس وقت گزرا جب میری کتاب کا یہ باب مطبع میں جا چکا تھا۔ امام غزالیؒ کے ظہور کے جو اسباب میں نے بیان کئے ہیں میں دیکھتا ہوں کہ وہ اس مشہور محقق کے خیالات سے من حیث العموم مطابقت رکھتے ہیں۔ نیز ملاحظہ کیجیے پروفیسر ڈی بی میکڈانلڈ (DB.Mcdonald) کا فاضلانہ مضمون جو Journal of the American Oriental Society, vol. xx میں چھپا۔

ہے جنھوں نے فلسطین کے قدیم مذہب میں زندگی پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن وہ یسُوع ناصری ہی تھا جس نے اسرائیل کے قومی خدا کی جگہ "روحِ کل" کی پرستش کی دعوت دے کر یہودیت میں نئے سرے سے جان ڈال دی۔

امام غزالیؒ سے پہلے ائمۂ بیت النبیؐ کے علاوہ وجدانیت کے اور بھی معلّم گزرے ہیں مثلاً اُن سے پیشتر سراج اور قشیری تھے۔[1] لیکن امام غزالیؒ نے ان کی شروع کی ہوئی عمارت کی تکمیل کی اور سُنّی مذہب کو اشعریت کی اذعانیت سے نجات دلائی۔

امام غزالیؒ نے اپنی جو سرگزشتِ حیات بیان کی ہے وہ روحانی نشوونما کی ایک دلچسپ رُوداد ہے۔ اُس میں وہ اپنے امتحانوں اور ابتلاؤں، اپنے شبہوں اور وسوسوں، اپنی اُمیدوں اور آرزوؤں اور بالآخر اپنے تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا حال سُناتے ہیں لیکن سفر کی آخری منزل توکّل تھی یعنی ایک قسم کا روحانی سکون واطمینان جس میں شک کے سمندر کے تھپیڑے کھانے والے اکثر دوں کو امان ملتی ہے۔

امام غزالیؒ[2] ۴۵۰ھ (۱۰۵۸ء) میں طوس[3] میں پیدا ہوئے جو صوبۂ خراسان میں مشہد کے قریب ایک مقام ہے۔

انھیں یقیناً ایک خاص طور پر مردانہ اور آزادہ رو طبیعت عطا ہوئی ہو گی، کیونکہ جیسا کہ وہ "منقذ" میں بیان کرتے ہیں، انھوں نے عنفوانِ شباب ہی میں تقلید ترک کر دی تھی جو تمام مذاہب میں صحیح العقیدگی کا معیار ہے۔ تقلید کو ترک کرنا اور دینی فکر کی اقلیم میں ذاتی رائے کے ایک نئے راستے پر چل نکلنا ایک ایسا کام ہے جسے تمام زمانوں اور تمام مذہبوں میں متحکم پیشہ علمائے دین نے ایک گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے۔ سنّی مذہب میں صحیح العقیدگی کے معنی تھے فقہ کے

---

[1] القشیری (ابوالقاسم) نے ۴۶۵ھ (۱۰۷۲ء) میں وفات پائی۔

[2] ابو حامد محمد الغزالیؒ ملقب بہ حُجّۃ الاسلام و زین الدّین۔

[3] طوس فارسی کے سب سے بڑے شاعر فردوسی کا بھی مقامِ ولادت تھا۔ مشہد شیعوں کا ایک متبرک شہر ہے کیونکہ وہاں آٹھویں امام علی بن موسیٰ رضا کا مرقد ہے۔

ائمۂ اربعہ میں سے کسی ایک کے اصولوں کی پیروی کرنا۔ امام غزالیؒ نے قابلِ تعریف جرأت سے کام لے کر ذاتی تحقیق کے بغیر کسی حکمی مسلک کا اتباع کرنے سے انکار کر دیا[1]۔ بہر حال چونکہ انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو شافعی کہا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ شافعی مسلک کی کم و بیش پیروی کرتے تھے بلکہ ابن خلکان تو انھیں مسلکِ شافعی کے علماء میں شمار کرتا ہے۔ "ان کے آخر عمر میں مسلکِ شافعی میں اُن کے پائے کا کوئی عالم نہ تھا"۔ اپنی عمر کے بیسویں سال میں امام غزالیؒ طوس سے نیشاپور چلے گئے۔ نیشاپور منگولوں کی تاخت و تاراج سے پہلے جو ۱۲۵۶ء میں واقع ہوئی، علم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ وہاں انھوں نے دارالعلوم نظامیہ میں داخل ہو کر، جو چند سال پیشتر قائم ہوا تھا، امام الحرمین الجوینی کی شاگردی اختیار کی۔ جب تک امام الحرمین زندہ رہے یعنی ۴۷۸ھ / ۱۰۸۵ء تک امام غزالیؒ امام الحرمین کی شاگردی میں رہے۔ امام الحرمین کی وفات کے وقت امام غزالیؒ اٹھائیس برس کے تھے اولوالعزم، کوئی کارِ نمایاں کرنے کے لیے بے تاب اور تمام علوم متداولہ پر حاوی۔ چنانچہ وہ ملک شاہ سلجوقی کے جلیل القدر وزیر نظام الملک[2] کے دربار میں پہنچے۔ نظام الملک نے علوم و فنون کی فیاضانہ سرپرستی کی بدولت علماء و حکماء کا ایک درخشاں حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ اس نے امام غزالیؒ کی قدردانی کی اور کچھ عرصے تک اپنے مقربین میں رکھنے کے بعد انھیں بغداد کے ایک مدرسے میں معلّم مقرر کر دیا۔ سلجوقی اپنے عروج کے زمانے میں جس وسیع سلطنت پر حکمران تھے اس میں جس طرح سرکاری منصب دار، جن میں مدرس اور معلّم بھی شامل تھے، ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے وہ دنیائے اسلام کے ذہنی اتحاد اور اس کے مختلف حصوں کے باہمی ارتباط کا ایک بیّن ثبوت ہے۔

---

[1] یہ حال ہی کی بات ہے کہ ہندی مسلمانوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا ہے جو فخریہ طور پر اپنے آپ کو غیر مقلد کہتا ہے۔

[2] ابو علی الحسن۔ وہ بھی طوس کا باشندہ تھا اور "سیاست نامہ" کا مصنف ہے۔ موسیو شارل شیفر (M.Ch.Schefer) نے اس کتاب کا فارسی متن اور اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا ہے۔

بغداد میں امام غزالیؒ چھ سال تک فرائضِ معلمی انجام دیتے رہے۔ انھوں نے اتنی شہرت پائی کہ مملکت کے گوشے گوشے سے ہر طبقے کے طلبا، دینیات، الٰہیات اور منطق پر آپؒ کے خطبے سننے کے لیے آنے لگے۔ ۴۸۸ھ کے اخیر میں وہ درس و تدریس سے دل برداشتہ ہو کر بغداد سے چلے گئے۔ جن مضامین کا وہ درس دیتے تھے اُن کے غائر مطالعے نے اُن کے دل میں مدرسی علما کی تعلیمات کے بارے میں شکوک راسخ کر دیئے۔ امام اشعری نے صرف پندرہ دن تک گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر عقلیت اور مقلدیت کے محاسن کا موازنہ کیا تھا اور اس کے بعد وہ صریح نتائج پر پہنچ گئے تھے۔ امام غزالیؒ نے اپنی رُوح کے لیے ایک جائے قرار ڈھونڈنے میں دس سال صرف کیے۔ وہ جائے قرار انھیں ارشاداتِ نبوی میں ملی جن کی صحیح تفسیر کا ملکہ اُن کے قول کے مطابق صانعِ کائنات نے طالبِ حق کے دل میں ودیعت کیا ہے۔ اپنی طویل سیاحت کے دوران وہ ہر مرکزِ علم میں گئے اور ہر ایسی درسگاہ اور خانقاہ کی زیارت کی جس میں علما و اصفیا دینی یا دنیوی علوم کی تحصیل میں مصروف تھے۔ یروشلم پر صلیبی محاربوں کا طوفان ٹوٹنے سے ایک سال پہلے امام غزالیؒ اُس مقدّس شہر میں تھے۔[1] ان کا طویل ترین قیام دمشق میں تھا جہاں وہ دریا کے مغربی کنارے پر کی ایک مسجد میں درس دیتے رہے۔ مسجد میں اُن کا جو حجرہ تھا وہ آج زاویۂ امام غزالیؒ کے نام سے موسوم ہے۔ جب وہ اپنی جہاں گردی ختم کر کے نیشاپور لوٹے تو اُن کی عمر کا اڑتالیسواں سال تھا۔ وہ بہت کچھ گرم و سرد زمانہ چکھ چکے تھے، لیکن جس چیز کی تلاش میں وہ سرگرداں رہے تھے وہ اُنھیں مل گئی تھی، یعنی خدا کا علم اور رُوح کا سکون۔ جن دنوں وہ بغداد میں مدرسی کر رہے تھے اُنھی دنوں، یعنی ۴۸۸ھ (۱۰۹۲م) میں اُن کا جلیل القدر اور فیاض مربی نظام الملک حسن بن صبّاح کے ایک فدائی کے ہاتھوں جاں بحق ہو گیا تھا۔ ملک شاہ بھی اپنے وفادار خادم اور اپنی سلطنت کے رُکنِ رکین کی وفات کے چھ مہینے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکا تھا۔ ملک شاہ کا بیٹا سلطان سنجر طغرل اور الپ ارسلان کی سمٹی ہوئی سلطنت پر حکمران تھا اور نظام الملک کا بیٹا فخر الملک اُس کا وزیر تھا۔ فخر الملک اپنے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے اسکندریہ کی سیاحت بھی کی۔

برگزیدہ باپ کی طرح علم پرور تھا۔ اُس نے فوراً امام غزالیؒ کو نیشاپور کے دارالعلوم میمونہ نظامیہ میں ایک اعلیٰ منصب مدرّسی پر مامور کر دیا۔[1] یہاں ایک جیّد اور کثیر التخلیق دماغ کی وہ حیرت انگیز سرگرمیاں شروع ہوئیں جو اسلام کے جذباتی اور صوفیانہ پہلو پر اپنا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت کر گئی ہیں۔

"منقذ من الضلال"[2] بدیہی طور پر اسی زمانے میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں جو محض ایک مقالہ ہے، امام غزالیؒ نے طالبانِ حق کو تین اصناف میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا گروہ اشعری متکلمین کا ہے۔ ان لوگوں کے تصورات رائے اور قیاس پر مبنی ہیں۔ امام غزالیؒ نے اُن پر کڑی تنقید کرکے اُن کے نحکمانہ نظریات کو ردّ کیا ہے۔ دوسرا گروہ باطنیہ اور اسمٰعیلیہ کا ہے، جن کا یہ دعوےٰ ہے کہ انھوں نے ایک امام معصوم سے سینہ بسینہ تعلیم پائی ہے۔ فلسفیوں کے خیالات کا جائزہ لینے کے بعد، جن میں وہ اخوان الصفا کو بھی شامل کرتے ہیں، امام غزالیؒ نے تعلیمیہ (یعنی اسمٰعیلیہ) کی دھجیاں اُڑائی ہیں اور انھیں منافیِ اسلام ثابت کیا ہے۔ اُن کا جو یہ دعوےٰ ہے کہ وہ ایک زندہ امام کے پیرو ہیں اُس کا جواب امام غزالیؒ یوں دیتے ہیں: "جب پیغمبرِ خدا موجود ہیں تو ہم کسی اور رہنما کی پیروی کیوں کریں؟"[3] پھر وہ کہتے ہیں کہ اگر اُن زندیقوں کے مخالف (یعنی علمائے منقولات) براہین و دلائل میں اتنے بودے نہ ہوتے تو انھیں اتنی کامیابی حاصل نہ

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ فخرالملک نے پرانے دارالعلوم نظامیہ کو وسعت دے کر اس نئے نام سے موسوم کیا۔

[2] "المنقذ من الضلال" Schmoider, کے Essai sur les Ecoles Philosophiqueschez les Arabs. کے ساتھ شامل کرکے چھاپی گئی ہے۔ انڈیا آفس کا نسخہ۔

[3] یہ وہی بات ہے جو سنائی نے اپنے مشہور شعر میں کہی ہے :—

احمدِ مرسل نشستہ کے روا دارد خرد
کے اسیرِ سیرت بوجہل کا فر داشتن؟

ہوتی۔ چوتھا گروہ صوفیوں پر مشتمل ہے یعنی اہلِ وجدان اور اربابِ مکاشفہ و مشاہدہ۔ جہاں دوسرے لوگ ذاتِ باری کا استنباط عقلی استدلال سے کرتے ہیں، وہاں یہ لوگ جلوۂ حق کے عینی مشاہدے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ ابن الاثیر مورخ جس نے اپنی عظیم تصنیف امام غزالیؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد موصل میں لکھی، کہتا ہے کہ "احیاء العلوم"[1] امام غزالیؒ نے نیشاپور لوٹنے سے بہت پہلے لکھی۔ اس بارے میں کچھ اختلافِ آراء ہے لیکن اس پر تمام اہل الرائے کا اجماع ہے کہ یہ امام غزالیؒ کی تصنیفات میں سب سے اہم ہے۔ یہ کتاب ایک قاموس العلوم ہے جس میں تصوف کے فلسفے اور اخلاقیات کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

امام اشعری نے اسرارِ وجود کی چھان بین کو ممنوع قرار دیا تھا۔ اگرچہ امام غزالی بھی فلاسفہ

---

[1] احیاء علوم الدین۔ قاہرہ کا ایڈیشن۔ انڈیا آفس کا نسخہ۔ جن موضوعوں سے یہ کتاب بحث کرتی ہے ان کے ایک اجمالی خاکے ہی سے واضح ہو جائے گا کہ اس کا دائرۂ بحث کتنا وسیع ہے اور اس کے مصنف نے کتنی محنت سے کام لیا اور اس کی دماغی استعداد کس پائے کی تھی۔ کتاب کی پہلی جلد علم کی فضیلت پر ایک مقالے سے شروع ہوتی ہے جسے شواہدِ عقلیہ و نقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ پھر عقل کے شرف اور نفس اور عقل، اسلام اور ایمان کے فرق پر ایک بحث ہے۔ جو لوگ ایک ہی قبلے کی طرف سربسجود ہوتے ہیں اُن سب سے رواداری کی تلقین کی گئی ہے۔ دوسری جلد کے مباحث میں انسانوں کے ایک دوسرے کے بارے میں فرائض اور والدین اور اولاد کی ایک دوسرے کے بارے میں ذمہ داریاں، نفس اور رُوح، قلب اور عقل کی تعریف اور الہام و تعلّم میں جو فرق ہے اس کی توضیح کی گئی ہے۔ اس جلد میں انھوں نے تصوف کے سارے فلسفے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس بحث کا عنوان اُنھوں نے یہ قائم کیا ہے: "طریق الصوفیہ فی استکشاف الحق و طریق النظار"۔ تیسری اور چوتھی جلد کا تعلق زیادہ تر اخلاقیاتِ اسلام سے ہے۔ امام غزالیؒ غرور، غصہ، انتقام، لالچ اور کنجوسی کی مذمت کرتے ہیں اور مروت، حلم، عفو، رحم، سخا اور مہربانی کو سراہتے ہیں۔ اہلِ تشیع کے یہاں بھی "احیاء العلوم" کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بحار الانوار میں عقل اور علم پر جو مقالہ ہے اس میں "احیاء العلوم" سے سند چینی کی گئی ہے۔

اور فلسفہ عقلیت اور اس کے مقاصد کو اُسی تحکمانہ انداز سے راندۂ درگاہ گردانتے ہیں، پھر بھی وہ اُن کے مقدّمے کی سماعت کرنے کے بعد ایسا کرتے ہیں، وہ اُن کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں اور اس جائزے کی روشنی میں انھیں ناقص پاتے ہیں یعنی اس لحاظ سے ناقص کہ امام غزالیؒ کے نزدیک نوعِ انسانی کی جو منزلِ مقصود ہونی چاہیئے اُن میں اُسے حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں لیکن اس کے باوجود وہ فلاسفہ اور علمائے معقولات کو مسلمانوں کا ہم قبلہ ہونے کی حیثیت سے دائرۂ اسلام میں داخل تسلیم کرتے ہیں۔ مقامِ تعجب ہے کہ بعد کی قرنوں کے اکابرِ صوفیہ شاذونادر امام غزالی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جلال الدین رُومی عطّار اور سنائی کو تو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے لیکن غزالیؒ کے فلسفۂ ماورائیت کے بارِ احسان کا نام بھی نہیں لیتا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ امام غزالیؒ نے جذباتی اسلام میں جو حرکت پیدا کی اُس کی قوّت زندگی و موت کی اُس جنگ میں زائل ہو گئی جو مسلمانوں کو دو صدیوں تک صلیبی جنگجوؤں کے ساتھ لڑنی پڑی؟ تباہی بغداد کے بعد جو تاریکی مدّتوں تک عالمِ اسلام پر چھائی رہی وہ اوّلاً عیسائیوں کے مغربی ایشیا پر حملہ آور ہونے کا نتیجہ تھی اور ثانیاً منگولوں کے اُس بے پناہ سیلاب کا جس نے وسطی ایشیا کو غرقاب کر کے تہذیب و تمدّن کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ بعید از قیاس نہیں کہ امام غزالیؒ کی وفات کے فوراً بعد گلشنِ اسلام پر جو خزاں آئی اس نے امام غزالیؒ کے قول و عمل کی مثال کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ پھر بھی تقرّبِ الٰہی پر ایمان، اپنے تمام حوصلوں اور ولولوں کو لیے ہوئے، اُن کے صاحبِ تب و تاب شاگردوں کے دلوں میں زندہ رہا، اور جہاں فلاسفہ اور علمائے معقولات عقل کے ذریعے خدا کا علم حاصل کرتے تھے وہاں عارفین نے مشاہدۂ حق کا دعوےٰ کیا۔ امام غزالیؒ کے متصوّفانہ مکتب کے جذباتی حصّے کو درویشوں کے تکیوں میں پناہ ملی۔ زاویے، رباط[1] اور خانقاہیں[2]

---

[1] "رباط" سے "مرابوط" بنا ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں مُرابطہ نے مراکش اور ہسپانیہ میں ایک زبردست سلطنت قائم کی۔

[2] مینِنسکی (Meninski) خانقاہ کی یوں تعریف کرتا ہے:

(باقی حاشیہ صفحہ ۶۶۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

چاروں طرف وجود میں آگئیں جہاں کہیں اللہ والے لوگوں نے جو عقل سے ماوراء ایک باطنی بصیرت کے مدعی تھے، ڈیرا ڈالا وہیں مریدانکے اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ ان لوگوں نے سلسلے قائم کئے اور اپنے مریدوں کو تصوف کی رموز سے آشنا کیا۔ ان میں بہت سے مخلص اور راست باز تھے اور بہت سے پاکھنڈی۔ اول الذکر کی مثال اور تعلیمات کا اثر جب تک قائم رہا مفید ثابت ہوا۔ مؤخر الذکر کا اثر ان کے منافی اسلام رجحانات کی وجہ سے مخربِ اخلاق نکلا۔

امام غزالیؒ علم کلام پر بھروسا نہ کرتے تھے اور انھوں نے اُسے خلافِ عقل کہہ کر اس کی مذمت کی لیکن وہ علوم قطعیہ یعنی حساب، ہندسہ اور اُن کے فروعات کو مضبوط دلائل پر مبنی، ناقابلِ تکذیب اور شک و نزاع سے ماورا تصور کرتے ہیں۔ نیشاپور میں انھوں نے اور کتابوں کے علاوہ "مقاصد الفلاسفہ" اور "تہافتہ الفلاسفہ" لکھیں۔ دونوں کتابیں فلسفہ اور فلاسفہ کی مخالفت میں ہیں اور دونوں میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فلسفیانہ استدلال عبث ہے اور فلسفے کی تعلیمات تسلی بخش نہیں۔

جب ماہ محرم ۵۰۰ھ میں شیخ الجبل حسن بن صباح کے ایک فدائی نے امام غزالیؒ کے سرپرست اور دوست فخر الملک[1] علی کو قتل کر دیا تو امام صاحب کو بہت قلق ہوا اور وہ اپنے آبائی شہر طوس میں واپس چلے گئے جہاں انھوں نے اپنے شاگردوں کے لیے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۴) Domus propter Deus Extructa in — usum Sophorum aut Religiosorum - ciebivium (رچرڈسن) (Richardson) کہتا ہے کہ وہ ایک راہب خانہ ہے یا ایک مذہبی عمارت جو منزوی صوفیوں کے لیے بنائی گئی۔ یہ خانقاہیں جنوبی ہند کے ہندو مٹھوں سے بڑی مشابہت رکھتی ہیں، دونوں میں مُرید یا چیلے مذہبی تعلیم کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

[1] فخر الملک نے سنجر کی سلطنت کا انتظام جس دانشمندی اور رعایا پروری سے کیا اس کی بدولت لوگ اس سے اتنی محبت اور اس کی اتنی عزت کرتے تھے کہ تاریخ نے اُسے "جمال الشہداء" کا لقب دیا ہے۔

مدرسہ اور اپنے مریدوں کے لیے ایک خانقاہ بنوائی تھی یہاں وہ درس بھی دیتے رہے اور وہ کتابیں بھی لکھتے رہے جنھوں نے انھیں عالمِ اسلام کی ایک برگزیدہ شخصیت بنا دیا ہے۔ اس صوفیٔ عظیم کی وفات چودہ جمادی الثانی ۵۰۵ھ (۱۸ دسمبر ۱۱۱۱ء) میں ہوئی۔

اُن کے صوفیانہ میلانات کے باوجود ان میں ایک ایسی مردانہ وار ہمت و جرأت تھی جس کا اثر ان کی وفات کے مدتوں بعد تک قائم رہا۔ چونکہ وہ امام شافعی کے پیرو تھے اس لیے وہ امام ابوحنیفہ کے سخت مخالف تھے، جن کی قیاسی استدلال اور تعقلی استنباط کی حوصلہ افزائی انھیں بہت ناپسند تھی[1]۔ اس صوفی منش امام نے ایک تو اپنے فلسفۂ توکل سے اُمتِ مسلمہ کی رگوں میں خون کی گردش سست کر دی اور اُن کے قوائے نشو و نما میں اضمحلال پیدا کر دیا، لیکن دوسری طرف اس نے مسلکِ اشاعرہ کو وہ بلند خیالی عطا کی جو اس میں پہلے موجود نہ تھی۔

جس مذہب میں بھی اہلِ کلیسا اور اربابِ فقہ نے اقتدار حاصل کیا ہے اُس میں تقلید کو عائد کرنے اور بدعت کو روکنے کی خواہش نے ایک لعنت کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسلام اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں، اگرچہ اس نے کافروں پر اتنی سختی نہیں کی جتنی اہلِ بدع پر کی ہے ۔ کیا مجذوب لوگ یا ایسے لوگ جو نفس کُشی اور ریاضت کی افراط کے باعث ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور کیا علمائے عقلی اور مصلحین، ان سب کو اذیتیں پہنچائی گئیں۔ تصوف کی تاریخ میں سب سے دردناک داستان منصور حلاج کی ہے[3]۔ فرید الدین عطار فردوسی کی طرح ولدادۂ اہلِ بیت بھی تھا اور درجۂ اوّل کا صوفی بھی۔ "مظہر العجائب"[4] میں وہ اپنی مصیبتوں کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ وہ بتاتا

---

[1] امام ابوحنیفہ کے تابعین کو اسی بنا پر "اہل الرّائے والقیاس" کہا جاتا تھا۔

[2] البیرونی کی "انڈیکا" (Indika) کا مشہور و معروف مترجم ڈاکٹر شاشو (Dr Sachau) لکھتا ہے، "اگر عربوں میں اشعری اور غزالیؒ پیدا نہ ہوئے ہوتے تو عرب قوم کا ہر فرد گلیلیو Galileo اور نیوٹن (Newton) ہوتا۔"

[3] "تذکرۃ الاولیاء"

[4] مظہر العجائب امیر المومنین حضرت علیؓ کا لقب تھا۔

ہے کہ کیونکہ وہ اپنی جائے ولادت سے شہر بدر کیا گیا، کیونکہ اس کا مال و متاع ضبط کر لیا گیا اور پھر کیونکہ وہ اُس کے بعد مختلف بلاد و امصار میں پھرتا رہا۔ متعدد صوفیہ ایسے تھے جنھیں سزائے موت دی گئی، متعدد ایسے تھے جنھیں موت کے بعد سزا ملی یعنی اُن کی تصنیفات نذرِ آتش کر دی گئیں اور قرطبہ میں امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" کو اسی طرح نوازا گیا، اور کہاں؟ — قرطبہ میں، جو کسی زمانے میں اسلامی ثقافت و شائستگی کا مرکز رہ چکا تھا[1]۔ لیکن یہ ظلم و ستم تصوف کو پھیلنے سے نہ روک سکا۔ ہر مقدس شخص جس کے گرد چند مرید جمع ہو گئے ولی بن گیا۔ اولیاء کو صاحبِ کشف و کرامت سمجھا گیا۔ اگرچہ ابتدائی ایام کے ممتاز ترین صوفیہ مثلاً جنید بغدادی اور بایزید بسطامی نے جنھیں اب اولیاء اللہ کی صفِ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے، کرشمہ نمائی اور شعبدہ بازی کو مذموم قرار دیا، پھر بھی "تذکرۃ الاولیاء" اور "نفحات الانس" میں اولیاء کے بے شمار ایسے اعمال بیان کئے گئے ہیں جو عام انسانی تجربے سے باہر ہیں۔ ان خارقِ عادت کاموں کو کرامات کہا جاتا ہے کیونکہ وہ خدا کی طرف سے ودیعت کی ہوئی خاص قوتوں کے ذریعے ظہور میں آئے۔ آج کل ہم غالباً انھیں نفسیاتی اثر انگیزی پر محمول کریں گے ہپناٹزم (Hypnotism) اور مسمریزم (Mesmerism) جنھیں "تاثیر الانظار" کا نام دیا جاتا تھا اور اشراق یا ابلاغِ نفسی Telepathy[2] مدتوں سے مشرق میں معروف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اولیاء کے بعض کرشمے غیر شعوری ہپناٹزم کا نتیجہ تھے۔

تصوف عراق اور ایران سے شروع ہو کر بہت جلد ہندوستان پہنچا جہاں اُسے سازگار فضا میسر آئی۔ شمالی ہندوستان میں بھی اور دکن میں بھی بہت سے صوفیاء و اولیاء گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی ہی میں تقدس اور اعمالِ حسنہ کی بدولت بڑی شہرت پائی۔ اُن کے مزار آج تک مسلمانوں کی، بلکہ ملاحظہ طلب بات ہے کہ ہندوؤں کی بھی زیارت گاہیں بنے ہیں۔

---

[1] یہ علی بن یوسف تاشفین (متوفی ۱۱۴۳ء) کے عہدِ حکومت کا واقعہ ہے۔

[2] تطعت اقتدائی کتب "قانونِ اسلام" میں ذریاتی حاشیہ ۶۶۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

یہ اولیاء اُن مریدوں اور عقیدت مندوں کو جو اُن کے قائم کئے ہوئے مدرسوں اور خانقاہوں میں جمع ہوتے تھے اسلامی معرفت اور صوفیانہ طریقت کی تعلیم دیتے تھے۔ اپنے جانشینوں کی طرح یہ سجادہ نشین کہلاتے تھے اور حقیقت میں رُوحانی معلّم تھے مغرب میں روحانی معلّم کو شیخ کہتے ہیں اور ہندوستان میں پیر یا مُرشد۔ پیر کی وفات پر اس کے جانشین کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ مُریدوں کو درویشی اور تصوف کا محرمِ اسرار بنائے۔ بیعت لینے اور رُوحانی علم عطا کرنے کا یہ کام اُن وظائف میں سے ہے جن کی ذمہ داری سجادہ نشین پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے مورث کے مزار کا متولّی و مہتمم اور اُس کے رُوحانی سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جو درگاہیں جابجا دکھائی دیتی ہیں وہ مشہور و معروف درویشوں کے مرقد ہیں جو اپنی زندگی ہی میں اولیاء اللہ تسلیم کئے گئے۔ ان میں سے بعضوں نے خانقاہیں بنائی تھیں جہاں وہ رہتے بھی تھے اور صوفیانہ عقائد کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جن کے پاس کوئی خانقاہ نہ تھی لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے مرقد زیارت گاہیں بن گئے۔ ان میں زیادہ تر صوفی تھے لیکن بعض بلاشک و شبہ میاں روشن بایزید[1] کے پیرو تھے، جو اکبر کے عہد میں گزرا اور جس نے ایک علیحدہ باطنی سلسلہ قائم کیا جس میں سربراہ کو ایک خاص طور پر ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو درویش یا فقیر کہتے تھے، اس مفروضے کی بنا پر کہ وہ دُنیا کو ترک کر چکے تھے اور خدا کے ادنیٰ خادم تھے۔ اُن کے پیرو انھیں شاہ کے معزز لقب سے پکارتے تھے۔ اگرچہ فارسی کا لفظ "درویش" اپنے ماخذ و معنیٰ کے لحاظ سے اسلامی لفظ ہے، درویش ہمیشہ سے مغربی ایشیا میں موجود رہے ہیں۔ عبرانیوں کے عام پیشوا جنھیں نبی کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے محض آجکل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶۷) جس کا ترجمہ ہرکلٹ (Herklot) نے کیا ہے، ان اولیائیں سے بہت سوں کے حالات بیان کرتا ہے اور ان رسومات و اوہام کا بھی ذکر کرتا ہے جو ہندی صوفیہ میں رائج تھے۔

[1] یہ روشن بایزید مشہور و معروف بایزید بسطامی (متوفی ۲۶۱ھ مطابق ۸۷۴ء - ۸۷۷ء) سے مختلف تھے۔

کے درویشوں کا نمونۂ اصلی تھے۔ یوحنا اصطباغی جس نے ہیرڈ (Herod) کی بیوی کے حضور گستاخی کی وجہ سے اپنی جان گنوائی، اُس نے بالکل وہی کیا جو اُس کے بعد سینکڑوں درویشوں نے کیا ہے۔ ان سب نے بادشاہوں کو اپنے محلوں اور بھرے درباروں میں ٹوکا اور للکارا۔ ہندوستان کے صاحبِ ولایت درویشوں میں جو لوگ سب سے مشہور ہیں اُن میں ایک شاہ نظام الدین اولیا ہیں، جو غزنی سے آئے اور جن کا مزار دہلی کے مضافات میں ہے، جہاں اُنھوں نے سالوں قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات[1] ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔ خواجہ معین الدین چشتی معلوم ہوتا ہے کہ نظام الدین اولیا سے پہلے ہندوستان آئے۔ انھوں نے ننانوے سال کی عمر پائی اور ۶۶۳ھ (۱۲۶۵ء) میں اجمیر کے مقام پر داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کا مزار سارے ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی زیارت گاہ ہے[2]۔

ایک اور ولی برہان الدین کا مزار وسطی ہندوستان کے شہر برہان پور میں ہے جس کا نام اُن کی نسبت سے رکھا گیا۔ شاہ کبیر درویش اٹھارہویں صدی عیسوی میں فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں ہوئے۔ وہ بہار کے شہر سامسرم میں مدفون ہیں۔ اُن کے اخلاف اُن کے مزار کے سجادہ نشین ہیں۔ دہلی کے پٹھان بادشاہ علاؤالدین خلجی کے درباری شاعر امیر خسرو

---

[1] علاؤالدین خلجی کے عہدِ حکومت میں۔ علاؤالدین ان کا مُرید تھا۔

[2] خواجہ معین الدین (جنھیں عموماً ہندوستان کے اربابِ تصوّف میں مولانا حضرت سلطان المشائخ کے نام و لقب سے یاد کیا جاتا ہے) ابراہیم ادہم کے سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابراہیم ادہم کی وساطت سے ان کا سلسلۂ طریقت امام حسن بصری سے، اُن کے ذریعے حضرت علیؓ اور اُن کے ذریعے سرورِ کائنات رسُولِ خدا سے جا ملتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی سلسلۂ چشتیہ کے بانی ہیں۔ تین سو سال بعد اسی سلسلے کے ایک بزرگ شیخ سلیم چشتی اکبرِ اعظم کے مرشد بنے اور اکبر نے اپنے بیٹے اور ولی عہد جہانگیر کا نام اُنھیں کی نسبت سے سلیم رکھا۔ اسی طرح مولانا جلال الدین رُومی جنید بغدادی کے ذریعے اپنا سلسلہ آٹھویں امام بیت النبی حضرت موسیٰ رضا سے، اور اُن کے ذریعے حضرت علیؓ اور رسُولِ خدا سے جوڑتے تھے۔

کو بھی صوفی اولیاء میں شمار کیا جاتا ہے[1]۔

مغرب میں بھی اسی طرح ہر طرف درویشوں کے حلقے قائم ہو گئے۔ ان سب سے مشہور اور غالباً سب سے زیادہ صاحبِ نفوذ سلسلۂ قادریہ ہے، جس کے بانی سُنّی ولی شیخ محی الدین عبدالقادر گیلانی تھے[2]۔ ایک اور سلسلے کی بنا مولانا جلال الدین رُومی نے ڈالی۔ اس سلسلے کا نام مولویہ ہے اور اس کے پیرو زُہد و ورع میں ممتاز ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور سلسلہ نقشبندیہ ہے جس کے ہندوستان میں ہزاروں تابعین ہیں۔

لیکن ولایت صرف معدودے چند لوگوں کے حصّے میں آتی ہے اور ان سے بھی کم لوگوں کے حصّے میں یہ سعادت آتی ہے کہ زُہد و اتقا میں بھی منہمک رہیں اور آتے دن کی زندگی کے فرائض بھی ادا کریں۔ عامۃ الناس کے لیے دنیا کو ترک کرنے اور خدا کے ذکر و فکر میں ہمہ تن محو رہنے کی دعوت دماغی جمود و تعطّل کی ترغیب ہوتی ہے مسلم اقوام کے موجودہ انحطاط کی

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ سوم

[2] شیخ عبدالقادر گیلانی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے تھے اور ان کی طرف بہت سی کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ کُردوں کے محافظ ولی ہیں اور ہندوستان کے سُنّی صوفیہ ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ انھیں عموماً غوثِ اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ Les Confréries Religieuses Musulmanes کے مصنّفین MM Dupont et Cappolani, vol.i,p.393 کے قول کے مطابق سلسلۂ قادریہ مشرق میں بہت وسیع اثر و نفوذ رکھتا ہے اور اس کے پیرو جاوا اور چین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے زاویے مکّہ اور مدینہ میں بھی ہیں۔ Confreries کے مصنّفین لکھتے ہیں:

"خدمتِ خلق کی خاطر ترکِ نفس، وجد و حال جو بیہوشی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اعلیٰ درجے کی خدمتِ نوعِ بشر بلا امتیازِ مذہب و ملّت، انتہائی جُود و سخا، زبردست پاکبازی، ہر کام میں عجز و انکسار اور شفقت و احسان۔ ان خوبیوں نے شیخ عبدالقادر گیلانی کو اسلام کا سب سے محبوب اور ہر دلعزیز ولی بنا دیا ہے۔"

ذمہ داری میں اشعری مسلک کی ظاہری پابندیٔ شرع اور صوفیہ کی تعلیمِ توکّل دونوں برابر کی شریک ہیں۔ جس قسم کی صوفیانہ تعلیم ذیل کے اشعار میں دی گئی ہے اس کا نتیجہ ذہنی مفلوجیت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا[1]

گلگول کو تاجِ خسروانی سمجھے دنیا ئے دنی کو محض فانی سمجھے
دریائے حقیقت کو وہی جا دے پر جو قصۂ عمر کو کہانی سمجھے

اب ضروری ہے کہ امام غزالیؒ کا صوفیانہ حُبِّ الٰہی اور صوفیانہ طریقِ زندگی کے بارے میں جو تصوّر تھا اُس کی طرف رجوع کیا جائے۔ امام غزالیؒ کا یقیناً یہ دعوےٰ نہ تھا کہ رموزِ کائنات کا علم انہی تک محدود ہے اور اُن کے عقائد میں اتنی باطنیت و سرّیت بھی نہ تھی جتنی بعد کے صوفیہ کے مسلکوں میں پیدا ہو گئی۔ انھوں نے علّامہ سرّاج کی طرح ایک لائحۂ حیات مرتب کیا جسے وہ قربِ الٰہی اور مشاہدۂ حق کی سعادت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ خیال کرتے تھے لیکن چونکہ انھوں نے اس طریقے پر جو زور دیا اس کا دار و مدار اُن کے نظریۂ کائنات پر ہے اس لیے ضروری ہے کہ ہم مؤخر الذکر کے بنیادی خصائص کے بارے میں کچھ کہیں۔ انھوں نے جو یہ کہا کہ ساری فطرت اور ساری موجودات بلاواسطہ قادرِ مطلق کی تخلیق ہے یہ قرآن کے ارشادات کی ایک صدائے بازگشت تھا۔ جب وہ من حیث الکُل کائنات کے بارے میں اپنا تصور پیش کرتے ہیں تو اُن کے نظریے کا احاطہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے کائنات کو دو اصناف میں تقسیم کیا یعنی مرئی اور غیر مرئی۔ مرئی دنیا (جسے وہ عالم المُلک کے نام سے موسوم کرتے ہیں) مادّے کی دُنیا ہے اور یہ دنیا ارتقاء اور تغیّر و تبدّل کے قانون کی تابع ہے یہاں وہ معتزلہ کے ہم نوا ہیں۔

غیر مرئی دنیا کو جس کا ادراک انسانی حواس نہیں کر سکتے، وہ دو ذیلی اصناف میں تقسیم کرتے ہیں: اوّل عالمِ جبروت[2] جو مادۂ خالص اور رُوحِ خالص کے مابین ہے۔ وہ کلّیتہً مادّہ بھی

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمۂ سوم۔

[2] فرہنگ میں ہے "سالکین (یعنی طالبانِ حق) کے محاورے میں (باقی حاشیہ صفحہ ۶۷۲ پر ملاحظہ فرمائیں)

نہیں اور کلیتہً روح بھی نہیں، بلکہ دونوں کے خواص کا حامل ہے۔ قوائے فطری اس ذیلی صنف میں داخل ہیں۔ اگر امام غزالیؒ آج کل زندہ ہوتے تو غالباً وہ جدید سائنس کے بعض انکشافات مثلاً ریڈیم کے خواص کو عالمِ جبروت میں جگہ دیتے۔ اُن کے نظریے کا سب سے دلچسپ حصّہ اُن کا خالص رُوح کی دنیا (یعنی عالمِ ملکوت) کے بارے میں تصور ہے۔ عالمِ ملکوت عالمِ امثال (عالمِ معانی) ہے۔ رُوحِ انسانی اس عالم کی رہنے والی ہے۔ وہ ایک شرارے کی طرح اپنے مرزبوم سے آتی ہے اور اپنے جسدِ ارضی سے جدا ہوتے ہی جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی جاتی ہے[1]۔

یہ تقسیم امام غزالیؒ نے قرآن سے اخذ کی۔ انھیں قیاسی استدلال سے جو نفرت تھی وہ انھیں دلائل و براہین کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچنے میں مانع نہ ہوئی۔ نہ ان کا نظریہ نیا تھا نہ اُن کی تقسیم نئی تھی۔ فارابی "عیون المسائل" میں اُن کی پیش قدمی کر چکا تھا۔ قرآن میں جو میزان مذکور ہے جس میں اعمالِ انسانی تولے جائیں گے، جو قلم مذکور ہے جس سے خدا کے تقدیری احکام درج کئے جاتے ہیں اور جو لوح مذکور ہے جس پر وہ درج ہوتے ہیں، ان تینوں کو معتزلہ تمثیلی اور مجازی کہتے تھے جیسا کہ اُوپر بیان ہو چکا ہے۔ امام اشعری انھیں واقعی اور جسمانی اشیاء سمجھتے تھے۔ امام غزالیؒ ایک نئی روش اختیار کرتے ہیں۔ وہ انھیں عالمِ ملکوت (یعنی عالمِ امثال یا عالمِ معانی) کی چیزیں تصور کرتے ہیں۔ یہ تھا وہ اسلوب جس سے انھوں نے ظاہریت اور مقلدیت کو اپنے نورِ باطن اور رُوحِ انسانی کی خواہشِ صعود کے نظریے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

بعض انتہا پسند صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ جب روحِ انسانی کو قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ذاتِ باری میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ اُسے وہ کبھی حلول اور کبھی اتحاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن علامہ سراج اور امام غزالیؒ دونوں نے اس وحدت الوجودی تصور کی تردید کی، اگرچہ دونوں کبھی کبھی ذاتِ باری کے قرب کو واضح کرنے کے لیے وصال یا وصلت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جب صوفی فنا فی اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اُس وقت بھی ان کا مطلب یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷۱) جبروت وہ اعلیٰ علییین ہے جو ملائکہ اور صفاتِ علاقی کا مسکن ہے۔"

[1] فرہنگ نے ملکوت کی یہ تعریف کی ہے: "صوفیہ کی اصطلاح میں یہ عالمِ معانی ہے۔"

نہیں ہوتا کہ روحِ انسانی روحِ کُل میں ضم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اپنے عظیم پیش رو کی طرح امام غزالیؒ اس کے قائل ہیں کہ انفرادی روح عالمِ ملکوت سے آتی ہے، جو ذاتِ باری سے قریب ترین ہے اور اپنے جسدِ مادّی سے جدا ہونے پر اپنے اصلی وطن کو لوٹ جاتی ہے۔ اُن کے نزدیک قرآن کے اس اعلان کا کہ "اِنّا لِلّٰہِ واِنّا اِلَیہِ راجِعُون" یہی مفہوم ہے۔

جہاں تک لوازمِ دین کا تعلق ہے معتزلہ، اشعریہ اور امام غزالیؒ کے تابعین میں کوئی اختلاف نہیں۔ اُن میں جو اختلاف ہے وہ اُس زاویۂ نگاہ کا ہے جس سے وہ ایمانیاتِ اسلام کو دیکھتے ہیں۔ حامیانِ عقل کہتے ہیں کہ خدا کا علم عقل کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ وہ عقل سے اس لیے استناد کرتے ہیں کہ قرآن نے خدائے واحد کی عبادت کی جو دعوت دی وہ عقل پر مبنی ہے۔ اشعریہ کسی چیز پر ایمان لاتے ہیں تو اس لیے کہ انھیں اس کی تعلیم دی گئی اور صوفیہ اس لیے کہ اُن کا نورِ باطن انھیں وہ چیز دکھاتا ہے۔ صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ طالبِ حق اپنے اندر گم ہو کر اور خدا سے لَو لگا کر درجہ بدرجہ ایک ایسے مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں اُسے ذاتِ باری کا دیدار نصیب ہو جاتا ہے۔ مبتدی کے لیے پہلا قدم نیّت ہے اور دوسرا قدم توبہ۔ یہ مجاہدے کا مرحلہ ہے۔ ایک طویل مدّت تک اس مرحلے میں رہنے کے بعد طالبِ حق کی روح ذاتِ باری کے حضور میں حاضر ہوتی ہے لیکن ابھی پردہ ہٹا نہیں ہوتا۔ حافظ ایک بیخودانہ انداز سے ذیل کے شعر میں اس مرحلۂ حضوری کی طرف اشارہ کرتا ہے، جسے اصطلاحاً مظاہرہ کہتے ہیں اور جس میں روح دنیا اور اُس کی بے حقیقت چیزوں کو ترک کر کے اپنے آپ کو کلّیتۂ خدا کے سپرد کر دیتی ہے:-

حضوری گر ہمی خواہی ازو غائب مشو حافظ مَتٰی مَا تَلقَ مَن تَہوٰی دَعِ الدّنیا وَ اَہمِلہا

اس کے بعد کا مرحلہ مکاشفے کا ہے جس میں پردۂ غیب اُٹھ جاتا ہے اور ذاتِ باری کی تجلّی طالب کے دل پر آشکار ہو جاتی ہے۔ آخری مقام مشاہدہ ہے جس پر پہنچ کر عاشقِ صادق کی روح اپنے آپ کو عینِ حضورِ حق میں پاتی ہے اور قریب سے اُس کے نور کا دیدار کرتی ہے۔ ابتدائی مرحلے میں بھی اپنی تمام توجہ کو ایک خیال پر مرکوز کرنے کی نفسیاتی کوشش کے باعث مرید کو رویتیں دکھائی دیتی ہیں اور ملائکہ و انبیاء کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے وہ ہدایت حاصل کرتا ہے۔ عیسائیت میں بھی وجد و بیخودی کی بالکل اسی طرح کی نفسیاتی کیفیتیں

ہر زمانے میں معروف رہی ہیں۔ صوفیہ کی اصطلاح میں انھیں حال کہتے ہیں۔ حال میں ایک سرخوشی اور ذوق وشوق کا عالم ہوتا ہے۔ حال آتے ہی طالب پر ایک از خود رفتگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ خانقاہوں میں درویش اکثر سر دھن دھن کر اپنے اوپر یہ کیفیت طاری کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں[1]۔

صوفیہ کا یہ دعوےٰ ہے کہ انھیں نورِ باطن کے ذریعے خدا کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ مدعیانِ عقلیت کہتے ہیں کہ وہ عقل کے ذریعے خدا کو پہچانتے ہیں جو خود خدا کا ایک عطیہ ہے کیا قرآن انسان کی عقل اور سمجھ بوجھ سے بار بار یہ تقاضا نہیں کرتا کہ وہ خدا کی کائنات اور فطرت کے اسرار پر غور وفکر کرے؟۔ اگر قرآن عقل سے کام لینے کو برا سمجھتا تو وہ اپنے مخاطبوں کو بار بار یہ تلقین کیوں کرتا کہ وہ قدرت کے عجائبات پر نظر ڈالیں اور خود نتیجہ نکالیں کہ آیا یہ حیرت انگیز دنیا اتفاقاً ظہور میں آگئی یا اسے ایک محیطِ کل عقل نے خلق کیا؟۔ دین اور عقل لازم وملزوم کے رشتے میں مربوط ہیں۔ اگر ہمیں قرآن میں کوئی ایسی بات دکھائی دے جو سطحی نظر میں فلسفے کے نتائج سے متصادم معلوم ہوتی ہو تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ اس کے کوئی مکتوم معانی ہیں جن کا بے نقاب کرنا عقل کا کام ہے۔ ابن رشد اپنی "فصل المقال" میں بڑی صراحت سے یہ دعویٰ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دین اور فلسفے میں کوئی اختلاف نہیں، دین وحیٔ الٰہی کے ذریعے مکشوف ہوتا ہے، فلسفہ نفسِ انسانی کی تخلیق ہے۔ چنانچہ اُس کے اور امام غزالیؒ کے اندازِ فکر میں کوئی زیادہ تباین نہیں۔ امام غزالیؒ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ زمین سپاٹ ہے محض اس وجہ سے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ "خدا نے اُسے ایک فرش کی طرح بچھا دیا ہے"۔ وہ سائنس کے تمام انکشافات کو اور ریاضی وہیئت کے تمام نتائج کو قبول کرتے تھے ستارے اور سیارے مقررّ قوانین کے مطابق گردش کرتے ہیں۔ فطرت خود اُس قدرت، رحمت اور حکمت

---

[1] جس مجلس میں درویش جمع ہو کر اپنے اوپر حال طاری کرتے ہیں اُسے مجلسِ ذکر کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ڈی۔ بی میکڈانلڈ (Dr.D. B Macdonald) نے اپنی کتاب Aspects of Islam میں ایک مجلسِ ذکر کا جو ایک مصری ناویے میں منعقد ہوئی بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔ ہندوستان میں ذکر کی محفلیں عموماً اولیاء کے عُرسوں کے موقع پر منعقد ہوتی ہیں۔

کا ثبوت مہیا کرتی ہے جس نے اُسے پیدا کیا۔ چنانچہ امام غزالیؒ، ابن سینا، ابن رُشد اور من حیث العموم علمائے عقلی سے کُلیتہً متفق ہیں۔ اگر بامعانِ نظر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ امام غزالیؒ جنھوں نے اشعریت کو ایک یخ بستہ ظاہریت بن کر رہ جانے سے بچا لیا اور اُسے ایک مرتفع جذباتیت سے وابستہ کر کے اس میں نئے سرے سے جان ڈال دی، ان حکمائے کبار کے ہم خیال و ہمنوا تھے۔

سنوسی جماعت سلسلۂ قادریہ کی طرح ایک باقاعدہ سلسلہ نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی تہذیب اور اصلاح کا جو کام وہ شمالی اور مشرقی افریقہ میں کر رہی ہے اس کے ذریعے وہ اخوان الصفّا کی تعلیمات میں ایک صوفیانہ معنویت پیدا کر رہی ہے۔ اس جماعت کے مشائخ اپنے مقلدوں اور مریدوں کو اس جدّوجہد اور ترقّی کی دنیا سے منقطع کئے بغیر انھیں علم باطن کے سبق سکھاتے ہیں۔

وہ فکرِ بلند پرواز جو پیغمبرِ اسلامؐ کے ارشادات میں، اماموں کے خطبات میں اور رموزِ باطن کے مفسّروں کی تعلیمات میں اچا ہے وہ علمائے معقولات ہوں یا فلاسفہ یا صوفیہ جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہے، اسلام کے اشرف ترین افراد کی زندگیوں کو ایک مثالی ڈھانچے میں ڈھالتی رہی ہے اور اُن کے کارناموں کا ایک الہامی محرّک رہی ہے۔ عماد الدین زنگی جیسے شجاعوں اور صلاح الدین ایوّبی جیسے حکمرانوں نے اُسے اپنا قطبِ نارا، اپنا کوکبِ رہنما پایا ہے۔ سنائی، عطّار اور جلال الدین رُومی جیسے شعراء نے جوش و خروش اور سوز و گداز کے ساتھ اُس ہمہ گیر ملکوتی محبت کے گیت گائے ہیں جو اسفل ترین مخلوق سے لے کر اعلیٰ ترین مخلوق تک ساری کائناتِ فطرت کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے اور ان کے کلام کا جو احترام ہزاروں مسلمان کرتے ہیں اُس سے زیادہ احترام وہ قرآن کے سوا کسی کا نہیں کرتے۔

لیکن جہاں تک تصوّف کے عملی اثرات کا تعلق ہے اس نے اسلامی دنیا میں بہت سے ایسے مضر نتائج پیدا کئے ہیں جیسے اس کے بِالمقابل نے عیسوی دنیا میں کئے۔ کامل طور پر موزوں طبیعتوں میں تصوّف ایک بلند عینی و مثالی فلسفے کی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن جب عوام الناس ذاتِ باری کی رموز اور اس کے ساتھ اپنے تعلقات پر سوچ بچار کرنے میں گم ہو جائیں تو

اُن کے دماغ اکثر ماؤف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ہر جاہل اور نکما شخص جس نے صحیح علم سے نفور ہوکر تحقیقی فلسفے کے میدان سے منہ موڑ لیا اور تصوّف کی اقلیم میں مداخلتِ بیجا کی اپنے آپ کو اہلِ معرفت کے زمرے میں شمار کرنے لگا۔ یہ امر کہ امام غزالیؒ کے زمانے میں فی الواقع ایسا ہُوا اُن کی اُس تلخ کامانہ شکایت سے ظاہر ہے کہ اور تو اور کسان بھی کھیتی باڑی چھوڑ کر رہبرانِ طریقت ہونے کے دعوے کر رہے تھے۔ درحقیقت عامیانہ تصوّف پر، چاہے وہ اسلام میں ہو یا عیسائیت میں، سب سے بڑا اعتراض ہی یہ عائد ہوتا ہے کہ چونکہ وہ بجائے خود کوئی مذہب نہیں اس لیے جہاں کہیں بھی اس کا چرچا ہوتا ہے وہاں لوگوں کے دماغ مختل ہوجاتے ہیں، معاشرے کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور انسان کی قوّتِ عمل مفلوج ہو جاتی ہے۔ عامیانہ تصوّف قدرتی طور پر انسان پرستی اور فطرت پرستانہ وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس کے باوجود عینی فلسفے کی اشرف صورتوں نے انسانوں کو اتنے فائدے پہنچائے ہیں کہ اُنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ابن رُشد کی عینیت نے یورپ میں آفاق گیر الوہیت کے تصوّر کو جنم دیا۔ عیسوی یورپ میں جو داخلی وحدت الوجود بہار پر آئی اور جس نے اُسے ایک ضمنیاتی مذہب کی شدید مادّیت سے نجات بخشی وہ اس امر کی مرہونِ منّت تھی کہ نفسِ مغربی میں اسلامی عینیت کا پیوند لگ گیا۔ وہ ابن رُشد کی تصنیفات کا ہی اثر تھا جس نے عالمِ مادّہ اور عالمِ نفس کے باہمی تعلّقات کے مسئلۂ عظیمہ کی طرف غور و فکر کرنے والے لوگوں کی توجّہ مبذول کرائی اور ایک محیطِ کُل رُوح کے تصوّر کو دوبارہ زندہ کیا — یعنی ایک ایسی رُوح جو "پتھروں کے اندر سوتی ہے، حیوانوں کے اندر خواب دیکھتی ہے اور انسانوں کے اندر جاگتی ہے" اور "یہ عقیدہ کہ وہ پوشیدہ اصولِ حیات جو تنظیم کی متنوّع صورتیں پیدا کرتا ہے اس ذاتِ باری کے من کی ایک موج ہے جو ہر چیز میں موجود ہے۔"

جانِ عالم گویمش گر ربطِ جاں دانم بہ تن
در دلِ ہر ذرّہ ہم پنہان و ہم پیدا ستی

ضمیمہ ۳

نمبر۱ اور نمبر۲ حذف کر دیے گئے ہیں اس لیے کہ ضمیمہ نمبر۱ میں عربی اشعار کا ترجمہ ہے، جو متن میں دے دیا گیا ہے اور ضمیمہ نمبر۲ میں قرآن شریف کی آیات ہیں، جن کا ترجمہ متن میں آگیا ہے۔

ہیئت دان علی ابنِ یونس ہر فن مولا تھا۔ ابن خلّکان لکھتا ہے کہ اگرچہ اُس نے ہیئت میں خصوصیت پیدا کی، تاہم وہ دوسرے علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا اور ایک قادرالکلام شاعر بھی تھا۔ (صفحہ ۵۵۱)

بمبئی کے جریدہ انڈین سوشل ریفارمر (The Indian Social Reformer) کے شمارہ بابت ۲۸ جولائی ۱۹۰۱ء میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں میری تحریر بعنوان "دی لبرل موومنٹ اِن اسلام" (Liberal Movement in Islam) کی داد دی گئی تھی اور ساتھ ہی ساتھ میری توجہ موسیو رینان M. Renan کے بعض دعاوی کی طرف مبذول کرائی گئی تھی جو انھوں نے اپنے ایک لکچر[1] میں کیے تھے جو انھوں نے سوربون (Sorbonne) یونیورسٹی میں مارچ ۱۸۸۳ء میں دیا تھا۔ اس لکچر میں موسیو رینان نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام سائنس کا مخالف ہے اور مسلمانوں کو سائنس سے شغف پیدا ہوا تو اس وقت جب اُن کے مذہبی انہماک میں کمی واقع ہوئی۔ وہ کہتے ہیں:

"خلیفہ عمرؓ کو جو الزام اکثر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو نذرِ آتش

---

[1] اس لکچر کا عنوان ہے "اسلام اور سائنس"، اور یہ ایک کتاب میں شامل کیا گیا ہے جس کا عنوان ہے The Poetry of the Celtic Races and Other Studies.

کردیا یہ الزام درست نہیں، کیونکہ وہ کتب خانہ اُن کے وقت تک تقریباً نیست و نابود ہو چکا تھا لیکن انھوں نے جس اصول کو تسلّط بخشا وہ حقیقی معنوں میں عملی تحقیق اور گوناگون دماغی مشاغل کے حق میں مہلک تھا۔"

اس بے سروپا اور بے محاباد عوے پر، جو اس لیے خاص طور تعجب انگیز ہے کہ (Averroes and Averroism) کے مصنف نے کیا ہے، شیخ جمال الدین افغانی نے، جو اُس وقت پیرس میں مقیم تھے، اعتراض کیا۔ موسیو رینان نے اس اعتراض کا جو جواب دیا وہ سبق آموز ہے۔ فاضل فرانسیسی کو اپنے تعمیمی دعوے کی تخصیص کرنی پڑی اور یہ عذر پیش کرنا پڑا کہ اسلام سے ان کی مراد وہ دینِ محمدی تھا جس پر مسلم جماعتوں کے ناخواندہ اور متعصب افراد اعتقاد رکھتے اور عمل کرتے ہیں۔ میں ذیل میں وہ عبارت پیش کرتا ہوں جس میں موسیو رینان نے یہ تخصیص کی ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی بدولت مسلمانوں میں اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس پیدا ہو سکے:

"اس بحث کا ایک پہلو یہ ہے جس میں میں نے شیخ صاحب کے نزدیک انصاف سے کام نہیں لیا۔ میں نے اپنے اس نظریے کی پوری پوری صراحت نہیں کی کہ تمام الہامی مذاہب مثبت طبیعی علوم کی مخالفت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اس معاملے میں عیسائیت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسلام پر تفوق کا دعویٰ کرے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام نے ابنِ رُشد کے ساتھ جو سلوک روا رکھا عیسائیت نے گلیلیو Galileo کے ساتھ اُس سے بہتر سلوک نہیں کیا۔ گلیلیو نے کیتھولک مذہب کی مخالفت کے باوجود ایک کیتھولک میں رہتے ہوئے ایک طبیعی حقیقت کا انکشاف کیا، بالکل اسی طرح جس طرح ابنِ رُشد نے ایک اسلامی ملک میں رہتے ہوئے اسلام کی مخالفت کے باوجود فلسفیانہ تحقیق و تدقیق کی۔ میں نے اگر اس نکتے پر زیادہ زور نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بارے میں میری جو رائے ہے وہ اتنی معروف ہے کہ ایک ایسے مجمع کے سامنے جو میری تصنیفات سے بخوبی واقف ہے مجھے اس کے دُہرانے کی ضرورت نہ تھی۔ میں یہ بات اتنی بار کہہ چکا ہوں کہ اس کی تکرار تحصیلِ حاصل ہے کہ اگر ذہنِ انسانی

اپنا اصلی کام انجام دینا چاہتا ہے، جو یہ ہے کہ وہ مثبت علوم کی نشوونما کرے، تو اُسے ہر طرح کی مافوق الفطرت اور خارقِ عادت چیزوں پر اعتقاد ترک کرنا ہوگا۔ اس میں نہ کوئی شدت آمیز تخریب مضمر ہے اور نہ کوئی جلد بازانہ قطعِ تعلق۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ عیسائی عیسائیت کو اور مسلمان اسلام کو ترک کر دیں۔ اس کے معنی صرف اتنے ہیں کہ عیسائی اور مسلم جماعتوں کے روشن دماغ افراد کو اپنے اندر ایک ایسی بے لاگ اور بے لگاؤ کیفیت پیدا کرنی چاہیے، جس میں مذہبی عقائد مضرت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ یہ کام آدھے کے قریب عیسائی ممالک میں ہو چکا ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ایک دن مسلم ممالک میں بھی ہو جائے گا۔ اس دن شیخ صاحب اور میں متفق الرائے ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کی دل کھول کر داد دیں گے۔ ... میں نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا کہ تمام مسلمان، بلا امتیازِ نسل، جہالت میں غرق ہیں اور ہمیشہ غرق رہیں گے۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اسلام سائنس کے راستے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے اور جو ممالک اس کے زیرِ نگیں ہیں اُن میں اُس نے گزشتہ پانچ چھ صدیوں کے دوران سائنس کو پروان چڑھنے سے روکے رکھا ہے، جو اُن ملکوں کے لیے انتہائی درجے کی کمزوری کا باعث ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میری رائے میں ان ملکوں کا احیا اسلام کی وساطت سے کبھی نہ ہوگا، بلکہ اگر ہوا تو اسلام کے تسلط میں کمی ہونے کی بدولت ہوگا، بالکل اسی طرح جس طرح عیسائی ممالک کی ترقی اس وقت شروع ہوئی جب قرونِ وسطیٰ کے استبداد شیوہ کلیسا کا خاتمہ ہو گیا۔ بعض لوگوں نے میرے لیکچر کو ایسے معنی پہنائے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مجھے اُن افراد سے عداوت ہے جن کا مذہب اسلام ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ مسلمان خود سب سے پہلے اسلام کے تختۂ مشقِ ستم ہیں۔ مشرقی ممالک کی سیاحت کے دوران مجھے بارہا یہ مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے کہ مذہبی دیوانگی کس طرح چند ایسے خطرناک اشخاص کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے جو دہشت انگیزی کے ذریعے دوسرے لوگوں پر مذہبی احکام کی تعمیل عائد کرتے ہیں۔ مسلمان کو اسلام کے چنگل سے چھڑانا اس کے حق میں ایک ایسی خدمت ہے جس سے بڑھ کر کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ جب میں مسلمان قوموں کو، جن میں بہت سے

اچھے لوگ بھی ہیں، اسلام کی قید و بند سے آزاد دیکھنے کی خواہش کرتا ہوں تو اس میں اُن سے ذاتی عناد کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ شیخ جمال الدین مجھ سے اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ میں مختلف مذاہب کا موازنہ کرتے وقت انصاف کی ترازو کو ہاتھ سے نہ دوں، اس لیے میں یہ بھی کہہ دوں کہ اگر میں بعض یورپی ممالک کے بارے میں یہ خواہش کروں کہ اُن پر عیسائیت کا جو تسلط ہے اس میں کمی ہو جائے تو میری اس خواہش میں بھی ان ملکوں کے باشندوں سے دشمنی کا کوئی عنصر نہ ہو گا۔"

یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ یورپی اہلِ علم اسلام کی بدترین صورتوں کا موازنہ عیسائیت کی بہترین صورتوں سے کیا کرتے ہیں۔ تمام مذاہب کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ آب و ہوا، اقتصادی حالات، ماحول تعلیم، قومی خصوصیات اور بہت سے دوسرے عوامل کے مطابق ان کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ جدید زمانے کی مثالیت کوش عیسائیت کا مقابلہ اسلام کی ایک زوال یافتہ صورت سے کرنا عقلِ سلیم کی توہین ہے۔ اس کتاب میں میں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام نے کیونکر انسان کی ذہنی سرگرمیوں کو فروغ دیا، کیونکر ایک جاں بلب دنیا کو نئی زندگی بخشی اور کیونکر تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا۔ یہ وہ اسلام تو نہ تھا جس کا دعویٰ آجکل کے جاہل اور کٹر لوگ یا اپنا اُلو سیدھا کرنے والے خود غرض لوگ کرتے ہیں، لیکن پھر بھی اسلام تھا یعنی اسلام اپنی بہترین، برگزیدہ ترین اور نیکوترین صورت میں۔ میں نے یہ بتانے کی بھی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں پر جو افتاد پڑی ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ امکانِ غالب ہے کہ نکتہ چیں ابتدا ہی سے اسلام کے بارے میں سوءِ ظن رکھتے ہیں یا جو آجکل کے نام نہاد مسلمانوں کی حالت سے اسلام کا اندازہ لگاتے ہیں وہ میری آرا کو تسلی بخش نہ پائیں گے۔ تاہم میں یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ میری آرا تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔

موسیو رینان کا ایک دعوے قطعی تردید کا مستحق ہے۔ وہ اپنے لکچر میں کہتے ہیں :

"یہ بات خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہے کہ اُن حکما و علما میں جنھیں عرب کہا جاتا ہے صرف ایک تھا یعنی الکندی جو عربی النسل تھا: باقی تمام کے تمام یا ایرانی تھے یا ماوراالنہری

یا ہسپانوی یا بخارا، سمرقند، قرطبہ یا اشبیلیہ کے باشندے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ عربی النسل نہ تھے، بلکہ ذہنیت میں بھی عرب نہ تھے۔" یہ عظیم فرانسیسی محقق، جس کی واقفیت کا فخر مجھے حاصل تھا، اس کا مستحق ہے کہ اُسے عزت سے یاد کیا جائے لیکن یہ تعمیمی دعویٰ حقیقت سے بہت بعید ہے۔ ابن خلکان کی مشہور تصنیف وفیات الاعیان یا تاریخ الحکما یا اسی قبیل کی اور کتابوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو اس کا بے بنیاد ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ جن اکابر و مشاہیر کے حالات ان کتابوں میں درج کیے گئے ہیں اُن کے سلسلۂ نسب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کثیر التعداد علما و حکما اور محققین اگرچہ عرب سے باہر پیدا ہوئے تاہم عربی الاصل تھے۔

غالباً موسیو رینان حضرت علیؑ کو حکیم تسلیم نہ کرتے، لیکن اُن کے اخلاف امام جعفر صادق اور امام علی رضا یقیناً زمرۂ حکما میں شمار کیے جانے کے مستحق تھے۔ امام جعفر صادق نے صرف فلسفی ہی نہ تھے بلکہ سائنس دان بھی تھے۔ جدید علم کیمیا کے بانی جابر بن حیان نے اپنے انکشافات و ایجادات کی بنیاد اس مواد پر رکھی جو امام جعفر صادق نے فراہم کیا تھا۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ حکیم الاعراب الکندی کندہ کے شاہی خاندان سے تھا، اور خالصتہً عرب۔ لیکن یہ عام طور پر معروف نہیں کہ یحییٰ بن علی منصور بھی خالصتہً عرب تھا۔ یہ بھی معروف نہیں کہ علی ابن یونس قبیلہ صدف سے تھا، جسے ابنِ خلکان بنی حمیر کی ایک اہم شاخ کہتا ہے جو مصر میں جا کر آباد ہو گئی تھی۔ الجاحظ ابو عثمان عمرو الکنانی، جو ایک معتزلی فلسفی تھا اور جس نے ۲۵۵ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی، خالص عرب تھا اور بنی کنانہ کے قبیلے سے تھا۔ ابن ماجہ نسباً تجیبی تھا۔ ابن خلکان لکھتا ہے: "تجیبی جس کا تلفظ تجیبی بھی کیا جاتا ہے، تجیب کی اولاد کو کہتے ہیں، جو اشرس بن السکون کے فرزندان عدی اور سعد کی ماں تھی۔ تجیب ثوبان بن سلیم ابن مزلس کی بیٹی تھی اور اُس کے بیٹوں کا نام اس کے نام پر رکھا گیا۔"

ابن زہر عرب قبیلہ ایاد ابن نزار سے تھا اور اسی لیے الایاذی کہلاتا ہے۔

مشہور نحوی خلیل ابنِ احمد قبیلۂ ازد سے تھا۔ ہسپانوی مؤرخ اور فلسفی ابن بشکوال مدینہ کے ایک انصاری کی اولاد میں سے تھا جو اسپین میں جاکر آباد ہوگیا تھا۔ مسعودی ایک صحابیِ رسولؐ ابن مسعود کے اخلاف میں سے تھا اور اسی نسبت سے مسعودی کہلاتا تھا۔
ابن الاثیر مشہور قبیلۂ شیبان سے تھا۔

ماہرِ سیاست مُدن و فقہ الماوردی بصرے کا رہنے والا تھا، لیکن خالصتہً عرب تھا۔ اس کی دو سب سے مشہور تصانیف احکام السلطانیہ اور السیاست المُدن ہیں، جن کی فان ہمیر (Von Hammer) نے بہت تعریف کی ہے۔

غازی، مُدبّر، اور حلیم اُسامہ قبیلۂ بنی کنانہ کا ایک فرد تھا۔

الغُرد و الدُّرد کا مصنف شریف المرتضیٰ، جو اپنے وقت کے اکابر علما میں تھا، امام علی رضا کی اولاد میں سے تھا۔

ابن طفیل قبیلۂ قیس سے تھا اور اسی لیے القیسی کہلاتا ہے۔

ابن خلدون ایک یمنی خاندان سے تھا جس نے اسپین میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ یہ خاندان حضرموت سے آیا تھا اور اسی نسبت سے ابن خلدون الحضرمی کہلاتا ہے۔

مَیں نے بطور نمونہ مشتے از خروارے چند نام گنوائے ہیں۔ شائقینِ علم کو اُن کتابوں میں جن کا حوالہ مَیں نے دیا ہے اور بے شمار نام مل جائیں گے۔

نیز ملاحظہ ہوں: وسٹن فیلڈ (Wustenfeld) کی کتاب *Geschichte der Arabischer Aerzte*. ذہبی کی تاریخ الاسلام اور کاسیری (Sasiri) کی *Bibliotheca Arabica*

یہ کہنا کہ یہ لوگ عرب نہ تھے اور ان کی رگوں میں عربی خون نہ تھا، ایک بے دھڑک دعوےٰ ہے۔ مَیں چاہوں تو ایسی ہی ڈھٹائی سے کہہ سکتا ہوں کہ چونکہ لانگ فیلو (Longfellow) چیننگ (Channing)، ایمرسن (Emerson) اور ڈریپر (Draper) امریکہ میں پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ اینگلو سیکسن نہ تھے۔

:OII

ابنِ خلکان الفارابی کو مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی کہتا ہے اور اس کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کرتا ہے:

"ابونصر محمد بن محمد طرخان بن اوزلغ الفارابی الترکی الحکیم المشہور صاحب التصانیف فی المنطق والموسیقی وغیرهما من العلوم وھو اکبر فلاسفۃ المسلمین لم یکن فیھم من بلغ رتبتہ فی فنونہ والرئیس ابوعلی سینا المقدم ذکرہٗ بکتبہ تخرج بکلامہ وانتفع فی تصانیفہ"

"ابونصر محمد بن محمد طرخان بن اوزلغ الفارابی الترکی ایک مشہور فلسفی اور منطق اور موسیقی اور دوسرے علوم میں کتابوں کا مصنف۔ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی تھا اور ان میں سے کوئی اور فنون میں اس کے رتبے کو نہ پہنچا۔ اور رئیس الفلاسفہ بوعلی ابن سینا نے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اُس کے کلام سے اکتساب کیا اور اس کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا۔"

ابوالقاسم کندرسکی اٹھارویں صدی عیسوی میں ایران کا ایک مشہور شاعر اور ابن سینا کے مکتبِ فکر کا فلسفی تھا۔

حی ابن یقظان کا انگریزی ترجمہ ۱۶۸۶ء میں چھپا تھا۔

سنائی نے ابنِ سینا اور اس کے فلسفے کو ذیل کے اشعار میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دُنیا نہ در جنّت

ہمی گویم بہر ساعت چہ در سرا چہ در صحرا

کہ یارب مر سنائی را صناعی دہ تو در حکمت

تواں کزوی برشک آید روانِ بوعلی سینا

سنائی کو دنیائے اسلام میں جو درجہ حاصل ہے وہ جلال الدین رومی کے اشعار ذیل سے واضح ہے:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او | ما در پئی سنائی و عطار آمدیم

امام ابو الحسن علی الاشعری اور امام احمد الغزالی کے اثر نے رجعت پسندی کو جو فروغ دیا وہ بے اندازہ تھا۔ البیرونی کی الآثار الباقیہ کے فاضل ایڈیٹر نے اس کا لب لباب نہایت عمدہ الفاظ میں دیا ہے: ”اگر الاشعری اور الغزالی نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ عرب قوم میں کئی گلیلیو Galileo، کیپلر Kepler اور نیوٹن Newton پیدا ہوتے۔“ یہ دونوں بزرگ سائنس اور فلسفے کی مذمت کر کے اور اس پر زور دے کر کہ دینیات اور فقہ کے علاوہ کوئی علم قابلِ تحصیل نہیں اسلامی دنیا کی ترقی کو مسدود کرنے میں سبقت لے گئے۔ اُن کی مثال آج تک جہالت اور ذہنی جمود کے جواز میں پیش کی جاتی ہے۔

اشعری ۸۸۳-۴ء (مطابق ۲۷۰ھ) میں بمقام بصرہ پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی۔ ان کا سنِ وفات تحقیقی طور پر معلوم نہیں۔ غالباً ۹۴۱ء اور ۹۵۲ء کے درمیان تھا۔ وہ ابتداءً معتزلی تھے اور عقلی نظریوں کی تعلیم دیا کرتے تھے، لیکن جب انھیں علمائے عقلی میں امتیاز حاصل کرنے کا کوئی موقعہ دکھائی نہ دیا تو انھوں نے شہرت اور اقتدار کی خاطر رجعت پسند مکتب کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اُن کا پہلے جو عقیدہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا مختار ہے اور قرآن مخلوق ہے اس سے انھوں نے مجمع عام میں توبہ کی۔ یہ واقعہ بصرے کی جامع مسجد میں جمعہ کے دن ہوا۔ وہ اپنے شاگردوں کو درس دیتے دیتے یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے یوں بہ آوازِ بلند مخاطب ہوئے: ”جو لوگ مجھے جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مَیں کون ہوں۔ جو لوگ نہیں جانتے مَیں اُن سے اپنا تعارف کراتا ہوں۔ مَیں علی بن اسمٰعیل الاشعری ہوں۔ میرا عقیدہ تھا کہ قرآن مخلوق ہے، انسانوں کی آنکھیں خدا کو نہ دیکھ پائیں گی، اور ہم خود اپنے بد افعال کے موجد اور مختار ہیں۔ اب مَیں حق کی طرف واپس آتا ہوں، ان عقائد سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ کی تردید اور اُن کی غلط اندیشیوں اور غلط بیانیوں کی قلعی کھولنے کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔“ جیسے جیسے وہ ایک کر کے اپنے سابق عقیدوں سے توبہ کرتے رہے ویسے ویسے ایک کے بعد ایک جامہ پھاڑ کر پھینکتے چلے گئے اور ہر بار یہ اعلان کرتے رہے کہ ”میں اس عقیدے کو یوں ترک کرتا ہوں جیسے اس جامے کو پھاڑ کر پھینک رہا ہوں۔“ سب سے پہلے تو انھوں نے پگڑی اتار پھینکی، اس کے بعد جُبّہ و علیٰ ہذا القیاس دوسرے کپڑے بھرے

کے زُود اعتقاد لوگوں پر اس کا بڑا اثر ہوا اور امام اشعری کی شہرت اس تیزی سے پھیلی کہ بہت جلد انھیں امام وقت تسلیم کرلیا گیا۔ ابن خلکان انھیں دین حنیف کا بہت بڑا حامی کہتا ہے۔

آخری فاطمی خلیفہ العاضد لدین اللہ کی وفات پر صلاح الدین ایوبی نے، جو اس کا سپہ سالار اور وزیر اعظم تھا، مستضئی عباسی کی خلافت کا اعلان کرکے مصر کو از سر نو بغداد کے روحانی دائرۂ اقتدار میں داخل کردیا۔ اس وقت سے مصر میں اشعری مذہب کا دور دورہ شروع ہوا۔

علمائے دینیات نے جو زیادہ تر امام احمد بن حنبل کے پیرو تھے، عباسی خلافت کے زمانۂ زوال کے دوران بغداد میں بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ وہ لوگوں کے عقائد و اعمال کے محتسب بن بیٹھے، لوگوں کے گھروں میں زبردستی گھس جاتے، آلاتِ موسیقی کو توڑ ڈالتے اور ہر طرح کی تباہ کاریاں کرتے۔

ضمیمہ نمبر ۳۔ مزید حاشیے

صفحہ ۹۳۔ "اقرء" کے معنی تلاوت بھی ہوسکتے ہیں۔

صفحہ ۲۰۴۔ اس صفحے کے ذیلی حاشیے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُسے سعدی نے اپنی ایک نظم کا موضوع بنا کر ایک یادگاری حیثیت بخش دی ہے نظم یوں شروع ہوتی ہے:

کرم کن بحالِ من اے محترم — کہ مولائے من بود زاہلِ کرم

صفحہ ۲۱۴۔ مشہد کی جو عزت شاہ کے دل میں ہے وہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے:

مشہد افضل تر زروئے زمین است — کہ آنجا نورِ رب العلمین است

صفحہ ۲۳۴۔ اسلامی رواداری۔ سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) اپنی کتاب "تبلیغ اسلام" (Preaching of Islam) میں لکھتے ہیں: "عربوں کی حکمرانی کی پہلی صدی میں عیسوی گرجاؤں سے ایسی رواداری برتی گئی اور انھیں ایسی مذہبی آزادی نصیب ہوئی جیسی بازنطینی سلطنت کے تحت انھیں پشتوں سے نصیب نہ ہوئی

تھی۔" وہ مزید لکھتے ہیں:

"بازنطینی سلطنت کے ساتھ جو طویل کشمکش رہی اس کے دوران ایسے موقعے آئے جب خلیفہ کو اپنی عیسائی رعایا کی وفاداری پر شک ہوا اور گمانِ غالب ہے کہ نکوفورس (Nikophoros) کی غداری اُن اسباب میں سے ایک سبب تھی جن کی بنا پر ہارون نے یہ فرمان جاری کیا کہ عیسائی جداگانہ لباس پہنا کریں اور بڑے بڑے عہدوں سے سبکدوش کر دیے جائیں۔"

ابو یوسف نے غیر مسلم رعایا کے حق میں ہارون الرشید سے جو سفارش کی وہ قابلِ ملاحظہ ہے: "امیر المومنین (خدا آپ کی مدد کرے) آپ پر واجب ہے کہ آپ کے نبی اور جدِّ امجد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن لوگوں کے ساتھ میثاق ہیں آپ اُن کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور اس بارے میں احتیاط رکھیں کہ اُن پر کوئی زیادتی یا بدسلوکی نہ ہو، ان پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اُن کی قوتِ برداشت سے باہر ہے اور جو کچھ ادا کرنا ان پر واجب ہے اس کے علاوہ اُن کے اموال و املاک میں سے کچھ نہ لیا جائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ جو شخص کسی ذمّی پر ظلم کرے گا یا اس پر ایسا بوجھ ڈالے گا جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں قیامت کے دن اس شخص کو موردِ الزام ٹھہراؤں گا۔"

(آرنلڈ صفحہ ۴۳۲ - اہلِ ذمہ - جب (۶۳۸ میں) یروشلم فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے ذیل کا فرمان جاری کیا:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ امان کی ضمانت ہے جو خدا کا بندہ عمر امیر المومنین، ایلیا کے باشندوں کو دیتا ہے۔ وہ سب لوگوں کو جا ہے وہ بیمار ہوں، یا تندرست، جان کی، اموال کی، املاک کی، گرجاؤں کی، گرجاؤں کی صلیبوں کی اور ہر اس چیز کی جو اُن کے دین سے تعلق رکھتی ہے حفاظت کا عہد کرتا ہے۔ ان کے گرجا نہ سکونتی مکانوں میں تبدیل کیے جائیں گے اور نہ مسمار کیے جائیں گے۔ نہ گرجاؤں کی تعداد میں اور نہ ان کے ساز و سامان میں کسی طرح کی کمی کی جائے گی، نہ اُن کی صلیبیں اور نہ ان کی

اور مملوکات ان سے لی جائیں گی، نہ دین و مذہب کے معاملے میں ان پر کوئی پابندیاں عاید کی جائیں گی۔ اور نہ اُن میں سے کسی کو کوئی گزند پہنچایا جائے گا۔"
بلاذری صفحہ ۱۳۲، کتاب الخراج صفحہ ۴۵،

Al-Makin, Historica Saracenica, p.11

پیغمبر اسلام کا اعلان:
من ظلم معاهداً او کلفه فوق طاقته فانا حجیجه -

[جو کوئی کسی ذمّی پر ظلم کرے گا یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے گا میں اُسے مورد الزام ٹھہراؤں گا]

من اذی ذمیا فانا خصمه

[جو کوئی کسی ذمّی کو اذیّت پہنچاتا ہے میں اس کی طرف سے جھگڑتا ہوں]

حضرت عمرؓ کی ہدایت حضرت عثمانؓ کو: "میں رسول اللہ کے ذمّیوں کی دیکھ بھال تمھیں سونپتا ہوں۔ اُن کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے، اُن کے دشمنوں سے اُن کی حفاظت کی جائے اور اُن کی طاقت سے بڑھ کر اُن پر کوئی بوجھ نہ ڈالا جائے۔" (ابو یوسف ص۷)

اسی قسم کی ہدایت حضرت علیؓ نے محمد ابن ابوبکر حاکم مصر کو ۳۶ھ میں کی۔

طبری - D Ohhson صفحہ ۴۴ -

صفحہ ۴۳۹ - متاخرین خلفائے عباسی کے عہد میں تین اور دیوان قائم کیے گئے - یعنی دیوان القضا (محکمۂ عدل)، دیوان العرض (تنخواہیں بانٹنے والا محکمہ) اور دیوان الطغرا (وہ محکمہ جس میں مہر شاہی رکھی جاتی تھی اور تمام دستاویزوں کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی)

صفحہ ۴۴۲-۴۴۳ - میں نے اس کتاب کے سابق ایڈیشن میں ذیل کی عبارت لکھی تھی:

"حکمرانوں پر رعایا کے بارے میں جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کو اسلام جو اہمیت دیتا ہے اور جس طریقے سے وہ لوگوں کی مساوات و آزادی کو فروغ دیتا ہے اور انھیں حاکموں کے ظلم سے محفوظ رکھتا ہے، اسے امام فخر الدین رازی نے ایک نہایت نمایاں کتاب میں جو انھوں نے حاکم و محکوم کے باہمی حقوق کے موضوع پر لکھی، بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب

کی ترتیب و توسیع بعد میں محمد بن علی بن طبا طباطبائی المعروف بہ ابن طقطقی نے کی؟
میرا یہ بیان ہندوستان کے علما کی عمومی رائے پر مبنی تھا۔ بروکل من C.Brockelmann اپنی تاریخِ ادبیاتِ عرب میں اس رائے سے متفق معلوم ہوتا ہے اور بعض دوسرے یورپی محققین نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے، مثلاً نویل ڈیورجر (Noel Deverger) اور دساسی (De Sacy) لیکن ہارٹ وِگ ڈیرن بورگ Hartwig Derenbourg اس رائے سے شدید اختلاف کرتا ہے اور بروکل من نے بھی اپنی بعد کی تصنیف The Nachtrage میں اپنی رائے تبدیل کر دی۔ بہرحال جس وجہ سے میں نے موجودہ ایڈیشن میں تاریخ الدّول کو امام فخر الدین رازی کی طرف منسوب نہیں کیا وہ یہ ہے کہ ابن خلکان نے امام رازی کی تصنیفات کی فہرست میں تاریخ الدّول کو شامل نہیں کیا۔ یہ ایک حتمی ثبوت تو نہیں کیونکہ ابن خلکان نے بارہا نہایت اہم تصنیفات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً اُس نے ابن ابی الحدید کے تذکرے میں اس کی مشہور شرح نہج البلاغۃ کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ بہرحال میں نے یہی سمجھا کہ ابن خلکان پر اعتماد کر کے نئے ایڈیشن میں عبارتِ منقولہ بالا کو قلم انداز کر دوں۔

صفحہ ۳۴۴۔ کتاب المیزان الحکمۃ میں، جو بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، عدل کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کی گئی ہے:

"عدل تمام محاسنِ اخلاق کا مدار اور تمام فضائل کی بنیاد ہے۔ عدل کو ذروۂ کمال تک پہنچانے کی خاطر باری تعالیٰ نے اپنے کو عادل کا لقب دے کر اپنے برگزیدہ ترین بندے سے اپنے آپ کو متعارف کرایا، اور نورِ عدل کی بدولت دنیا مکمل کی گئی اور اس کے نظام کو کامل بنایا گیا، جس کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا: "عدل ہی پر زمین و آسمان قائم کیے گئے"۔"

صفحہ ۵۰۶۔ اگرچہ بعض مغربی محققین نے اس روایت کی صحت پر شک کیا ہے کہ نظام الملک، عمر خیام اور حسن بن صباح ہم مکتب تھے، لیکن "شیخ الجبال" کے تازہ ترین سوانح نگار نے اس دعوے کی توثیق کی ہے کہ یہ تینوں بیک وقت امام موفق الدین کے

شاگرد تھے۔ میرا اشارہ مولوی عبدالحلیم شررؔ لکھنوی کی طرف ہے جنھوں نے حسن بن صباح کی زندگی اور مقاصد اور اس کی فتنہ انگیز تبلیغ کا ایک نہایت جامع خلاصہ اپنی کتاب میں دیا ہے۔

صفحہ ۵۰۶۔ حسن بن صباح۔ مولوی عبدالحلیم شررؔ نے بیان کیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیرو کیونکر اپنی شر آمیز تبلیغ کے سلسلے میں حشیش کا استعمال کرتے تھے اور اس وقت کے دینی و معاشرتی نظام کو درہم برہم کرنے کی خاطر کیونکر اپنے دائرے میں شامل ہونے والے مبتدیوں کے دماغوں کو ماؤف کر دیتے تھے۔ ان دشمنانِ ملت کے سرّی عقائد میں وبا کی طرح پھیلنے کی جو قوت تھی شررؔ صاحب اُسے بھی تفصیلاً بیان کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ قرامطہ کی بربادی کے بعد اسمٰعیلیہ کیونکر وجود میں آئے۔

صفحہ ۵۲۹۔ بابی۔ یہ فرقہ جو اب بہت سے فرقوں میں منقسم ہو گیا ہے، زیادہ تر غیر ممالک میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس فرقے کے لوگوں کی بڑی تعداد ہے۔ یہ لوگ بیروت، بمبئی اور کلکتہ میں بھی کافی تعداد میں آباد ہیں۔ مذہب باب کے مستند ترین محقق پروفیسر ای جی براؤن کا قول ہے کہ مذہبِ باب اور تصوّف میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان میں ایک بنیادی فرق ذہنی زاویے کا ہے: جہاں تصوّف دوسرے نظامہائے عقیدہ کے بارے میں وسیع المشربی سے کام لیتا ہے، وہاں مذہبِ باب انتہا درجہ متعصّب اور تنگ نظر ہے۔

صفحہ ۵۸۵۔ صفوی۔ حال ہی میں ایک نیا نظریہ ایجاد کیا گیا ہے، جس کے مطابق لفظ "صفوی" جو اُس خاندان کا لقب ہے جس کی بنیاد ایران میں شاہ اسمٰعیل نے ڈالی۔ شاہ اسمٰعیل کے جدِّ امجد صفی الدین کے نام سے ماخوذ ہے، نہ کہ اُن کے لقب "صوفی" سے۔ مَیں نہایت ادب کے ساتھ اس نظریے کی تردید کرتا ہوں۔ ایران کی سلطنت کے قیام سے لے کر کئی صدیوں تک یورپی سیاحوں، تاجروں اور وقائع نگاروں کا دستور تھا کہ وہ شاہانِ ایران کو "صوفیِ اعظم" (The grand sppni) کے لقب سے پکارتے تھے۔ یہ لقب وہ شاہانِ ایران کو "مغلِ اعظم" (The Grand Mogul)

اور "ترکِ اعظم" (The Grand Turk) سے ممتاز کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کا سبب واضح ہے۔ مشرقی مصنفین نے ہمیشہ لفظ "صفوی" کو لفظِ "صوفی" سے مشتق خیال کیا ہے، اسی طرح جس طرح اس خاندان کا دوسرا لقب "موسوی" امام موسیٰ کاظم کے نام پر مبنی ہے۔ رضوی سید اپنا سلسلۂ نسب امام علی بن امام موسیٰ سے متعلق کرتے ہیں۔

صفحہ ۵۹۰۔ قضاوقدر۔ قضاوقدر کے بارے میں رسولِ اکرمؐ کا جو عقیدہ تھا، اُس پر یہ حدیث نبویؐ جو عبید بن کعب سے مروی ہے، بہت سی روشنی ڈالتی ہے:

"سب سے خوشحال شخص وہ ہے جو اپنی محنت سے خوشحال بنے اور سب سے بدحال شخص وہ ہے جو اپنے اعمال کے طفیل بدحال بنے۔"

روایت ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کے سامنے حاضر کیا گیا جو ایک جُرم کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اُس نے اپنے جُرم کا یہ عذر پیش کیا کہ جُرم حکمِ الٰہی سے ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اسے دُہری سزا دی۔

امیر المومنین حضرت علیؓ سے ایک شخص نے جو جنگِ صفین میں شریک ہوا تھا پوچھا کہ آیا مسلمانوں کو قضائے الٰہی ملکِ شام میں لائی تھی۔ آپ نے حسبِ ذیل جواب دیا:

"غالباً تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ تقدیر ربّی اٹل ہے اور اللہ کا کوئی حکم بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو جزا و سزا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، ثواب کا وعدہ اور عذاب کی دھمکی دونوں بے سُود ہوتے، خدا کی طرف سے نہ گناہ گار پر نفرین اور نہ نیکو کار پر آفرین ہوتی، نہ نیکو کار بدکار کی بہ نسبت جزا کا زیادہ مستحق ہوتا اور نہ بدکار نیکو کار کی بہ نسبت سزا کا زیادہ مستحق۔ تم نے جو کچھ کہا، وہ کلمہ ہے اخوان الشیاطین کا، بُت پرستوں کا، خدائے رحیم و رحمٰن کے دشمنوں کا، اُن لوگوں کا جو باطل کی تائید کرتے ہیں، اُن لوگوں کا جو اپنے معاملات میں حق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، مثلاً تقدیر پرست اور مجوسی۔ خدا نے انسانوں کو اختیار دیا ہے اور انھیں خوف دلانے کو منع کیا ہے۔ اُس نے انسانوں پر جبراً فرائض عائد نہیں کیے اور نہ اُس نے اپنے پیغمبر محض تفنّن کی خاطر بھیجے ہیں۔ ایسا عقیدہ کافروں کا ہے۔

اور کافروں پر جہنم میں عذابِ الیم نازل ہوگا۔" اس پر بوڑھے سپاہی نے سوال کیا "یہ قضا و قدر اور یہ خاص تقدیرِ الٰہی جو ہمیں یہاں لائی وہ کیا ہے؟" حضرت علیؓ نے جواب دیا: "خدا کا حکم اور منشا۔" اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔ "اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ شفقت سے پیش آؤ۔"

حضرت امام حسن نے اہلِ بصرہ کو جو خط لکھا اس میں ذیل کی قابلِ ملاحظہ عبارت تھی:

"جو شخص خدا کو اپنے گناہوں کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے وہ راہِ حق سے منحرف ہے۔ خدا بندوں کو مجبور نہیں کرتا کہ اپنے ارادے کے خلاف اس کے احکام کی تعمیل کریں، نہ وہ انھیں اس پر مجبور کرتا ہے کہ اپنے ارادے کے خلاف گناہ کریں۔

صفحہ ۱۰۶ ۔ "معتزلہ"۔ "غیاث اللغات" اور "فرہنگ" (لکھنؤ) میں لفظ "معتزلہ" کا جو املا ہے اُس میں زے پر فتحہ ہے۔ یعنی یہ لفظ یوں ہے: مُعتَزَلہ۔ "فرہنگ" ہندوستان کے تین سب سے بڑے عالموں کی تالیف اور اپنی قسم کی بہترین اور جامع ترین لغات ہے، جسے صحیح معنوں میں انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کی تالیف میں مؤلفین نے ہر سابق لغت سے استفادہ کیا: جن میں "کشف اللغات" "صراح" "تاج اللغات" اور کئی اور لغتیں شامل تھیں۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کما حقہ تحقیق کے بغیر کیا۔ رچرڈمن کی ڈکشنری میں بھی لفظِ "معتزلہ" کا املا اس طرح کیا گیا ہے۔

"لسان العرب" میں "ز" کے نیچے کسرہ ہے، جس کے مطابق لفظ یوں ہے: مُعتَزِلہ۔

تقریباً تمام مغربی مستشرقین نے اسی املا کو قبول کیا ہے۔

جو لوگ عربی سے نابلد ہیں انھیں ایسا معلوم ہوگا کہ یہ ایک تمیزِ بلا فرق ہے۔ لیکن ان دو املاؤں میں فی الواقع فرق ہے۔ اور یہ فرق اس سوال سے پیدا ہوتا ہے کہ آیا واصل بن عطا نے خود مجلس سے قطع تعلق کیا، یا اسے امام سے اختلاف رائے کی بنا پر مجلس سے قطع تعلق کرنے کو کہا گیا۔ ابنِ خلکان کا قول ہے کہ اُسے مجلس سے خارج کیا گیا۔ پہلی صورت میں زیرِ بحث لفظ کا صحیح املا "معتزِلہ" ہوگا، دوسری صورت میں "معتزَلہ"۔ ہندوستانی علما کی رائے یہ ہے کہ واصل بن عطا کو نکالا گیا، اور اس رائے کی تائید ابنِ خلکان نے کی ہے لیکن اس کے باوجود "فتنہ عیاں"

کے مترجم ڈی سلین ((De Slane) نے انگریزی میں لفظِ معتزلہ کے ہجے معتزلہ کیے ہیں۔ مَیں نے اپنی سابقہ تصنیفات میں "غیاث اللغات" اور "فرہنگ" کی تقلید کی ہے، لیکن مغربی مستشرقین کے اتفاقِ رائے کے پیشِ نظر اور قارئین کو ذہنی پریشانی سے بچانے کی خاطر مَیں نے اس ایڈیشن میں مغربی مستشرقین کا تتبّع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بہرحال اس کے معنی یہ نہیں کہ اپنے ملک کے اربابِ علم کی رائے کے اتباع سے منحرف ہوگیا ہوں۔

معتزلہ کے عقائد۔ صفحہ ۶۰۶۔ "معتزلہ متفق الرائے ہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے، ازلی و ابدی، قادرِ کُل، عالمِ کُل، حی۔ وہ نہ جسم ہے نہ عرض اور نہ جوہر۔ وہ مکتفی بالذات ہے، حواس سے ماورا ہے، عادل ہے حکیم ہے۔ نہ وہ غلطی کرتا ہے اور نہ غلطی کا قصد کرتا ہے۔ وہ مکافات کا وعدہ کرکے انسانوں پر فرائض عائد کرتا ہے۔ وہ انسانوں کو عمل کی قوت بخشتا ہے، اُن کے رستے سے مزاحم کو دُور کرتا ہے۔ مکافات مطلقاً لازمی ہے۔ مزید بریں معتزلہ اس پر متفق ہیں کہ جب نبی کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ نبی بھیجتا ہے ضروری ہے کہ نبی یا تو ایک نئی شریعت لے کر آئے یا کسی ایسی شریعت کا احیا کرے جس کے کوئی آثار باقی نہیں رہے اور نوعِ انسانی کو ایک نئی زندگی عطا کرے۔ وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ حضرت محمدؐ نبی آخر الزمان ہیں اور ایمان اقرار بھی ہے، علم بھی ہے اور عمل بھی۔ اُن کی متفقہ رائے ہے کہ انسان کا عمل اس کے اندر مخلوق نہیں۔ وہ اصحابِ نبیؐ سے مودّت کے بارے میں ہم خیال ہیں، لیکن حضرت عثمان جن واقعات کا باعث بنے اُن کی بنا پر وہ اُن کے بارے میں متفق نہیں۔ بہرحال اُن میں سے اکثر و بیشتر حضرت عثمان سے مودت کا رشتہ رکھتے ہیں اور اُن کے کاموں کے بارے میں تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ اُن کی اکثریت معاویہ اور عمرو بن العاص سے کوئی واسطہ نہ رکھنے کے بارے میں متفق ہے اور اس پر بھی متفق ہے کہ نیک کاموں کی تلقین اور بُرے کاموں کی ممانعت ضروری ہے۔"

صفحہ ۶۶۹۔ امیر خسرو۔ اگرچہ امیر خسرو کو کبھی کبھی زمرۂ اولیا میں شمار کیا جاتا ہے وہ صحیح معنوں میں صوفی نہ تھے۔ ہندوستان کے اکثر مسلم شعرا تصوّف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اپنے کلام میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مَیں دبیر کا تذکرہ پہلے ہی کر چکا ہوں۔

انیسؔ، مُونسؔ اور اُنسؔ (تین بھائی جن کے تخلص ایک ہی مادے سے ماخوذ تھے) دبیرؔ کے ہم عصر تھے اور ان کے کلام میں بھی تصوّف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ الطاف حسین حالیؔ اور اسداللہ خاں غالبؔ دہلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ کی طرح (جسے بغاوت کی بنا پر سرکارِ انگلشیہ نے رنگون جلاوطن کردیا تھا) "وجدانی" شعرا تھے۔ غالب اپنے ایک مشہور قصیدے میں بہادر شاہ کی طرف ذیل کے الفاظ میں اشارہ کرتا ہے:

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سرتاسر کھلا؟

صفحہ ۶۶۹۔ سنوّسی۔ سلسلۂ سنوسی (اگر اسے اس لقب سے ملقّب کیا جاسکتا ہے) محمد بن علی السنوسی الادریسی نے قائم کیا تھا۔ اُن کا سلسلۂ نسب ادریس کی وساطت سے، جنھوں نے یزید کے لشکریوں کے ہاتھوں مدینہ کے قتلِ عام سے بچنے کے لیے مغرب میں پناہ لی تھی۔ اُن کی پیدائش الجزائر کے شہر مستغنم میں ۱۷۸۷ء میں ہوئی۔ وہ ایک جنّی اور جانباز مجاہد تھے۔ انھوں نے اسلامی ممالک کی بہت سیاحت کی اور اس کے دوران اس اخلاقی انحطاط کا مشاہدہ کیا جو بحیرۂ روم کے ساحلی باشندوں سے ارتباط کی بدولت عربوں اور شمالی افریقہ کے دوسرے مسلمانوں پر مستولی ہوگیا تھا۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مسلمان کیونکر اسلام کی قدیم تعلیم سے منحرف، جامد اور قسمت پر شاکر ہوگئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو ایسی صنعتوں کی طرف متوجہ کیا جن سے خوشحالی حاصل ہوسکتی تھی اور اُن کے ذہنوں میں فرائضِ دینی کا ایک نیا احساس پیدا کیا۔

سری محمد بن علی نے اپنی وفات سے پہلے، جو ۱۸۵۰ء میں واقع ہوئی، حجاز، یمن صحرائے لیبیا کے نخلستانوں، سرینائیکا اور الجزائر میں متعدد زاویے قائم کیے۔ ان میں سے جو زاویے وسطی افریقہ میں تھے انھوں نے بالخصوص بڑا قوی اخلاقی اثر مرتب کیا لیکن مراکش میں اُن کے مریدوں کو جو اخوان کے لقب سے پکارے جاتے تھے، کوئی خاص اثر و نفوذ حاصل نہ ہوسکا، کیونکہ وہاں سلسلۂ مولائے طیّب کا سکّہ جما ہوا تھا۔ سری محمد کے بعد اُن کے بیٹے محمد المہدی گدّی نشین ہوئے۔

ارتداد۔ اسلام کے شرعی قانون نے ارتداد کی جو سزا مقرر کی ہے اس کے متعلق انگلستان کے اربابِ سیاست اور اہل الرائے کی طرف سے حال ہی میں بہت چہ میگوئیاں ہوئی ہیں۔
قدیم ترین زمانوں ہی سے ارتداد کو ہر مذہب اور قانون نظام نے ایک مستوجب سزائے موت جُرم تصوّر کیا ہے، کیونکہ وہ ایک معین نظام سے انحراف و سرکشی کے مترادف ہے۔ اہلِ روما نے ابتدائی عیسائیوں کو اس لیے موت کی سزا دی کہ انھوں نے حکومت اور سرکاری مذہب کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جب عیسائیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تو انھوں نے اہلِ روما کی مثال کی تقلید کی۔ رومن کلیسا نے مرتدوں اور ملحدوں کو مرد، عورت اور بچوں کی تمیز کیے بغیر اپنی ساری قلمرو میں نہایت بے دریغی سے نذرِ آتش کیا۔ اصلاح یافتہ کلیساؤں نے بھی صحیح العقیدگی کی حمایت میں کچھ کم سرجوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ ابھی کل تک انگلستان میں بھی مرتدوں کو سزاوارِ موت سمجھا جاتا تھا۔ اگر آجکل کوئی شخص مذہب عیسوی سے رُوگرداں ہو تو اسے موت کی سزا تو نہیں دی جاتی، لیکن اسے معاشرے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے آزادیٔ ضمیر کو کبھی مذموم قرار نہیں دیا، پھر بھی مملکتِ اسلامی کے خلاف بغاوت کی سزا موت تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ اہلِ مکّہ نے مدینے میں داخلے کی اجازت حاصل کرنے کی خاطر اسلام کا زبانی اقرار کیا، لیکن جب وہ اس چھوٹی سی اسلامی مملکت کے نظامِ تحفّظ کے بارے میں ہر طرح کی معلومات فراہم کر چکے تو مکّہ جا کر اسلام سے منحرف ہو گئے۔ ایسے لوگ جب کبھی پکڑے جاتے تھے تو انھیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔ مملکت سے غداری آجکل بھی ساری دنیا میں قابلِ سزائے موت جرم تصوّر کی جاتی ہے، اور اس پر کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیے۔ اسلامی شریعت کا یہ قانون کہ مرتدوں کو سزائے موت ملنی چاہیے، اسی عالمگیر قانون پہ مبنی ہے۔ بہرحال عورتوں کو موت کی سزا نہیں دی جاتی، بلکہ صرف قید کیا جاتا ہے۔ اور بچوں کو بھی سزائے موت نہیں دی جاتی۔ انسانیت اور آزادیٔ ضمیر کے بارے میں اسلام اور عیسائیت میں یہی فرق ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ترکیہ میں ارتداد کے لیے سزائے موت سلطان سلیم ثانی کے عہدِ حکومت میں یعنی اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب منسوخ ہو گئی تھی۔

ضمیمہ ۴

مسلمان خلفا اور سلاطین کے سلسلہ ہائے نسب کے لیے میری کتاب
ملاحظہ کیجیے۔ ذیل میں ہسپانیہ کے اُموی خلفا ، بغداد کے
عباسی خلفا اور قاہرہ کے فاطمی خلفا کے نام اور سنینِ تخت نشینی کی فہرست دی گئی ہے :

خلفائے راشدین

۱۔	حضرت ابوبکرؓ	۱۱ ہجری	۶۳۲ عیسوی
۲۔	حضرت عمرؓ	۱۳ "	۶۳۴ "
۳۔	حضرت عثمانؓ	۲۳ "	۶۴۴ "
۴۔	حضرت علیؓ	۳۵ "	۶۵۶ "

دمشق کے اُموی سلاطین (خلفا)

۱۔	امیر معاویہ	۴۱ ہجری	۶۶۱ عیسوی
۲۔	یزید	۶۱ "	۶۸۱ "
۳۔	معاویہؓ ثانی	۶۴ "	۶۸۳ "
۴۔	مروان اوّل	۶۵ "	۶۸۴ "
۵۔	عبدالملک	" "	۶۸۵ "
۶۔	ولید اوّل	۸۶ "	۷۰۵ "
۷۔	سلیمان	۹۶ "	۷۱۵ "
۸۔	حضرت عمر بن عبدالعزیز	۹۹ "	۷۱۷ "
۹۔	یزید ثانی	۱۰۱ "	۷۲۰ "
۱۰۔	ہشام	۱۰۵ "	۷۲۴ "
۱۱۔	ولید ثانی	۱۲۵ "	۷۴۳ "
۱۲۔	یزید ثالث	۱۲۶ "	۷۴۴ "

۱۳-	ابراہیم	۱۲۶ ہجری	۷۴۴ عیسوی
۱۴-	مروان ثانی	۱۲۷ 〃	۷۴۵ 〃

بغداد کے عباسی خلفا

۱-	سفاح، ابوالعباس عبداللہ	۱۳۲ 〃	۷۵۰ 〃
۲-	منصور، ابوجعفر	۱۳۶ 〃	۷۵۴ 〃
۳-	مہدی (محمدؐ)	۱۵۸ 〃	۷۷۵ 〃
۴-	ہادی (موسیٰ)	۱۶۸ 〃	۷۸۵ 〃
۵-	ہارون الرشید	۱۷۰ 〃	۷۸۶ 〃
۶-	امین (محمدؐ)	۱۹۳ 〃	۸۰۹ 〃
۷-	مامون (عبداللہ)	۱۹۸ 〃	۸۱۳ 〃
۸-	معتصم باللہ (ابواسحٰق محمد)	۲۱۸ 〃	۸۳۳ 〃
۹-	واثق باللہ (ابوجعفر ہارون)	۲۲۷ 〃	۸۴۲ 〃
۱۰-	متوکل علی اللہ (جعفر)	۲۳۲ 〃	۸۴۷ 〃
۱۱-	مستنصر باللہ (محمد)	۲۴۷ 〃	۸۶۱ 〃
۱۲-	مستعین باللہ (احمد)	۲۴۸ 〃	۸۶۲ 〃
۱۳-	معتز باللہ (محمد)	۲۵۲ 〃	۸۶۶ 〃
۱۴-	مہتدی باللہ (محمد ابواسحٰق)	۲۵۵ 〃	۸۶۹ 〃
۱۵-	معتمد علی اللہ (احمد ابوالعباس)	۲۵۶ 〃	۸۷۰ 〃
۱۶-	معتضد باللہ (احمد ابوالعباس)	۲۷۹ 〃	۸۹۲ 〃
۱۷-	مکتفی باللہ (علی ابومحمد)	۲۸۹ 〃	۹۰۲ 〃
۱۸-	مقتدر باللہ (جعفر ابوالفضل)	۲۹۵ 〃	۹۰۸ 〃
۱۹-	قاہر باللہ (محمد ابومنصور)	۳۲۰ 〃	۹۳۲ 〃
۲۰-	راضی باللہ (محمد ابوالعباس)	۳۲۲ 〃	۹۳۴ 〃

۲۱- متقی باللہ (ابراہیم ابواسحٰق)	۳۲۹ ہجری	۹۴۰ عیسوی
۲۲- مستکفی باللہ (عبداللہ ابوالقاسم)	۳۳۳ //	۹۴۴ //
۲۳- مطیع للہ (فضل ابوالقاسم)	۳۳۴ //	۹۴۶ //
۲۴- طائع باللہ (عبدالکریم ابوبکر)	۳۶۳ //	۹۷۴ //
۲۵- قادر باللہ (احمد ابوالعباس)	۳۸۱ //	۹۹۱ //
۲۶- قائم بامراللہ (عبداللہ ابوجعفر)	۴۲۲ //	۱۰۳۱ //
۲۷- مقتدی بامراللہ (عبداللہ ابوالقاسم)	۴۶۷ //	۱۰۷۵ //
۲۸- مستظہر باللہ (احمد ابوالعباس)	۴۸۷ //	۱۰۹۴ //
۲۹- مسترشد باللہ (فضل ابوالمنصور)	۵۱۲ //	۱۱۱۸ //
۳۰- راشد باللہ (منصور ابوجعفر)	۵۲۹ //	۱۱۳۵ //
۳۱- مکتفی بامراللہ (محمد ابوعبداللہ)	۵۳۰ //	۱۱۳۶ //
۳۲- مستنجد باللہ (یوسف ابوالمظفر)	۵۵۵ //	۱۱۶۰ //
۳۳- مستضی بامراللہ (حسن ابومحمد)	۵۶۶ //	۱۱۷۰ //
۳۴- ناصر لدین اللہ (احمد ابوالعباس)	۵۷۵ //	۱۱۸۰ //
۳۵- ظاہر بامراللہ (محمد ابونصر)	۶۲۲ //	۱۲۲۵ //
۳۶- مستنصر باللہ (منصور ابوجعفر)	۶۲۳ //	۱۲۲۶ //
۳۷- مستعصم باللہ (عبداللہ ابواحمد)	۶۴۰ //	۱۲۴۲ //

مصر کے فاطمی خلفا

۱- مہدی عبیداللہ	۲۹۶ //	۹۰۸ //
۲- قائم بامراللہ	۳۲۲ //	۹۳۴ //
۳- منصور بامراللہ	۳۳۴ //	۹۴۵ //
۴- معزلدین اللہ	۳۴۱ //	۹۵۳ //
۵- عزیز باللہ	۳۶۵ //	۹۷۵ //

۶- حاکم بامراللہ	۳۸۶ ہجری	۹۹۶ عیسوی
۷- ظاہر الاعزاز لدین اللہ	۴۱۱ ″	۱۰۲۱ ″
۸- مستنصر باللہ	۴۲۷ ″	۱۰۳۶ ″
۹- مستعلی باللہ	۴۸۷ ″	۱۰۹۴ ″
۱۰- آمر باحکام اللہ	۴۹۴ ″	۱۱۰۱ ″
۱۱- حافظ لدین اللہ	۵۲۳ ″	۱۱۳۰ ″
۱۲- ظافر بامراللہ	۵۴۴ ″	۱۱۴۰ ″
۱۳- فائز بامراللہ	۵۴۹ ″	۱۱۵۴ ″
۱۴- عاضد لدین اللہ	۵۵۵ ″	۱۱۶۰ ″

قرطبہ کے اُموی خلفا

۱- عبدالرحمٰن اوّل (الداخل)	۱۳۸ ″	۷۵۶ ″
۲- ہشام اوّل (ابوالولید)	۱۷۲ ″	۷۸۸ ″
۳- حکم اوّل (المنتصر)	۱۸۰ ″	۷۹۶ ″
۴- عبدالرحمٰن ثانی (الاوسط)	۲۰۶ ″	۸۲۲ ″
۵- محمدؒ اوّل	۲۳۸ ″	۸۵۲ ″
۶- مُنذر	۲۷۳ ″	۸۸۶ ″
۷- عبداللہ	۲۷۵ ″	۸۸۸ ″
۸- ناصر لدین اللہ عبدالرحمٰن ثالث	۳۰۰ ″	۹۱۲ ″
۹- مستنصر باللہ حکم ثانی	۳۵۰ ″	۹۶۱ ″
۱۰- موید باللہ ہشام ثانی	۳۶۶ ″	۹۷۶ ″
۱۱- مہدی محمد ثانی	۳۹۹ ″	۱۰۰۹ ″
۱۲- مستعین باللہ سلیمان	۴۰۰	۱۰۰۹ ″
۱۳- محمدؒ ثانی (دوسری بار)	۴۰۰	۱۰۱۰ ″

۱۴- ہشام ثانی (دوسری بار)	۴۰۰ ہجری	۱۰۱۰ عیسوی
۱۵- سلیمان (دوسری بار)	۴۰۳ "	۱۰۱۳ "
۱۶- علی بن حمود (ناصر ادریسی)	۴۰۷ "	۱۰۱۶ "
۱۷- عبدالرحمٰن رابع (مرتضیٰ)	۴۰۸ "	۱۰۱۸ "
۱۸- قاسم بن حمود (مامون)	۴۰۸ "	۱۰۱۸ "
۱۹- یحییٰ بن علی بن حمود (مستعلی)	۴۱۲ "	۱۰۲۱ "
۲۰- قاسم بن حمود (دوسری بار)	۴۱۳ "	۱۰۲۲ "
۲۱- عبدالرحمٰن خامس (مستظہر باللہ)	۴۱۴ "	۱۰۲۳ "
۲۲- محمد ثالث (مستکفی باللہ)	۴۱۴ "	۱۰۲۴ "
۲۳- یحییٰ بن علی بن حمود (دوسری بار)	۴۱۶ "	۱۰۲۵ "
۲۴- ہشام ثالث (معتز باللہ)	۴۱۸ "	۱۰۲۷ "

اشاریہ

ب

پ

ز

س

ع

غ

ف

ن